

افغان نژاد امریکی مورخ تمیم انصاری کی شہرۂ آفاق تصنیف ***Destiny Disrupted*** کا اردو قالب

قافلہ کیوں لٹا؟

عالم اسلام کی تاریخ پر ایک مجتہدانہ نظر

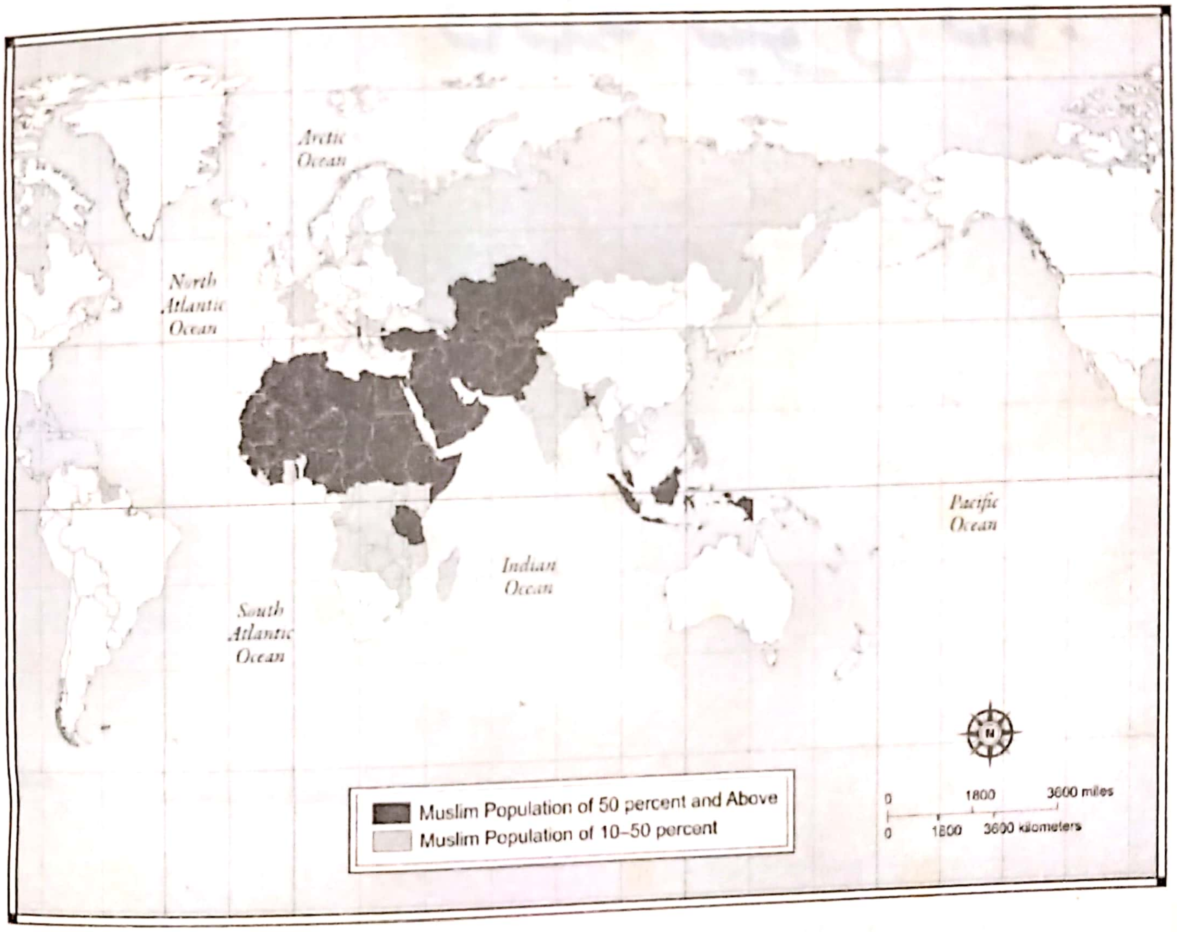
ترجمہ مقدمہ و حواشی

محمد ذکی کرمانی

قافلہ کیوں لٹا؟

دعاؤں کا طالب - دعاء کی درخواست ہے

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
اقبالؒ



موجودہ عالم اسلام

افغان نژاد امریکی مؤرخ تمیم انصاری کی شہرۂ آفاق تصنیف *Destiny Disrupted* کا اردو قالب

قافلہ کیوں لٹا؟

عالم اسلام کی تاریخ پر ایک مجتہدانہ نظر

ترجمہ مقدمہ و حواشی

محمد ذکی کرمانی

ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، نئی دہلی

عنوان کتاب ماخوذ از شعر:

تو اِدھر اُدھر کی نہ بات کر یہ بتا کہ قافلہ کیوں لٹا
مجھے رہزنوں سے گلہ نہیں، تیری رہبری کا سوال ہے
فراق جلال پوری

کتاب کا نام:	قافلہ کیوں لٹا؟
مصنف:	تمیم انصاری
مترجم:	محمد ذکی کرمانی
صفحات:	400
سن اشاعت:	2018
تعداد:	1000
قیمت:	490
سرورق:	عائشہ سید بصر
ٹائپ سیٹنگ:	محمد ذوالقرنین
باہتمام:	**ایویروز اکیڈمی**، علی گڑھ
ناشر:	**ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس**

F-155، فلیٹ نمبر: 204، ہدایت اپارٹمنٹ
شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ 110025
فون: 09891051676
ای میل: hidayatbooks@gmail.com

مطبوعہ: Thomson Press (India) Ltd.

Distributors

- ☆ **Markazi Maktaba Islami Publishers**
  Abu Fazal Enclave, Jamia Nagar, **New Delhi**
- ☆ **Maktaba Jamia Ltd.,** E.R. Road, **Mumbai**
- ☆ **Maktaba Jamia, Ltd.** Bhopal Ground, Jamia Nagar, **New Delhi**
- ☆ **Maktaba Jamia Ltd.,** University Market, AMU, **Aligarh**
- ☆ **Universal Book House,** University Market, AMU, **Aligarh**

احمد، عائشہ، ندا

اور

نئی نسل کے لیے

جو اکیسویں صدی میں مغلوب ہو کر رہنا نہیں چاہتے

مشتملات

فہرست نقشہ جات

اعتراف

اس کتاب سے میرا پہلا تعارف عزیز دوست پروفیسر احمد اللہ صدیقی کے ذریعہ جس ماحول میں ہوا تھا اسے پڑھنے کی خواہش افزودنی ہونا فطری تھا۔ اور کیونکہ اب بیرونی اداروں کی کتابیں آسانی سے حاصل ہونے لگی ہیں بہت جلد اس کتاب تک میری رسائی ہوگئی۔

بعض کتابیں مطالعہ کے دوران ہی قاری کا نقطہ نظر تبدیلی کرتی جاتی ہیں۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے میں اس کیفیت سے دوچار رہا ہوا تھا جو آج سے ۴۰ سال قبل مشہور اردو نقاد حسن عسکری کو پڑھتے ہوئے مجھ پر طاری ہوئی تھی۔ یعنی مغرب سے ہٹ کر ایک ایسے بیانیہ کا وجود اور اس کی فعالیت کا احساس جسے ہم اپنا کہہ سکیں۔ ارتقاء شخصی ہو یا قومی، ملی بیانیوں کا ادراک وہ پہلا قدم ہے جسے اٹھائے بغیر ارتقاء کا یہ سفر طے نہیں ہوسکتا۔

بیسویں صدی دراصل بیانیوں کی نقشہ گری کی کوششوں سے عبارت ہے۔ سیاست اور معاشرت کے میدان میں تو مسلمان activism کا شکار ہوئے لیکن معیشت اور سائنس کے میدان میں علمی سطح پر اس سمت میں کوششیں ہوئیں۔ زیر نظر کتاب تاریخ کے میدان میں انھیں کوششوں کا ایک حصہ ہے۔

تحقیقی کتابیں کسی واضح نتیجہ پر تو نہیں پہنچاتیں، البتہ بعض اہم سوالات اٹھا دیتی ہیں اور یہ توقع پیدا کردیتی ہیں کہ قاری کسی نتیجہ پر خود پہنچ جائیگا۔ یہ کتاب اس اعتبار سے ایک مختلف کتاب ہے۔ یہ ایک واضح بیانیہ کے گرد گھومتی، اس پس منظر میں واقعات کا تجزیہ کرتی اور پھر اسی بیانیہ پر ختم ہوجاتی ہے۔

چودہ سو سالہ تاریخ کو ایک ایسے بیانیہ کی لڑی میں پرونا جو اپنا ہو اور ایک واضح وابستگی کے ساتھ اس طرح تجزیہ کرنا کہ معروضیت کہیں قربان نہ ہو پائے، اس کا وہ وصف ہے جس نے اس کتاب اور مصنف کو ایک ممتاز مقام عطا کردیا ہے۔ یہ ایک عظیم کتاب ہے اور تمیم انصاری ایک عظیم مصنف۔ افغانستان کا تعارف ماضی قریب کے واقعات میں جس طرح ہوا ہے اس سرزمین سے ادریس شاہ، خالد حسینی اور تمیم انصاری جیسے مصنّفین کا نکلنا معجزاتی سہی لیکن بڑا ہی دل خوش کن ہے۔ امریکہ کے تحقیقی اداروں کی علمی فضا جس میں رہتے ہوئے یہ کتاب تکمیل کو پہنچی اور شائع ہوئی میرے خیال میں کل انسانیت کا سرمایہ ہے جس کی ہر ممکن طریقہ سے حفاظت ہونا چاہئے۔ میں دعا گو ہوں۔

میں نے اس کتاب کو پڑھا، سوچا اور متاثر ہوا۔ لیکن ضخامت کے پیش نظر یہ خیال بھی آیا تھا کہ میں اس کا ترجمہ کرسکوں گا۔ میرے بعض دوست جن میں طارق اکرام اللہ صاحب ابتداءً ذرا تکلف سے اس طرف توجہ دلاتے رہے اور پھر ان کی آواز میں شیخ رفیق (حیدرآباد) شامل ہوگئے تو نہ صرف جوش بلکہ اصرار بھی بڑھتا

گیا اور یوں ان دوستوں کے اصرار اور اعتماد نے بالآخر اس کے ترجمہ پر مجھے آمادہ کردیا۔ دس مئی ۲۰۱۶ء کو میں نے اس کا آغاز کیا تو وقت کا احساس بھی نہ ہوسکا اور محض دس ستمبر ۲۰۱۶ تک میں اس کا ترجمہ کرچکا تھا۔ اور اس دوران ’آیات‘ کی تیاری اور دوسرے مضامین بھی پیش نظر رہتے تھے۔

اس کتاب کا اہم ترین پہلو شاید مختلف ادوار پر مشتمل مضامین کا ایسا بامعنی نظم ہے جو بیانیہ کو ہر وقوعہ اور ہر تبدیلی کے بیان میں متحضر رکھتا اور قاری کو بیانیہ سے باندھے رکھتا ہے۔ لیکن کتاب کا سب سے زیادہ چونکا دینے والا خیال وہ ہے جب تمیم انصاری کہتے ہیں کہ سترہویں و اٹھارہویں صدی کے دوران جغرافیائی اعتبار سے منسلک دنیا کی تین عظیم سلطنتیں جو مغلیہ برصغیر، صفوی ایران اور سلطنت عثمانیہ پر مشتمل تھیں بغیر کسی فوج کشی کے بتدریج یورپیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تھیں۔ تمیم انصاری نے ان حالات کا تجزیہ کیا ہے اور مترجم نے بھی اسی فکر کو آگے بڑھایا ہے جس کا اظہار مقدمہ اور ’نظرے خوش گذرے‘ سے ہوتا ہے۔

ترجمہ کا عمل جس محویت اور ارتکاز کا طلبگار ہوتا ہے وہ مجھے بحیثیت مجموعی حاصل رہی۔ بیگم بازغہ دھرو، بیٹی عائشہ، اور بیٹا احمد اور بہو ندا اکثر و بیشتر معلوم کرتے رہے کہ کتاب کہاں پہنچی اور یوں میرے حوصلہ کو بڑھاتے رہے۔ اردو ٹائپنگ کے لئے برادر محمد ذوالقرنین کی محنت کا معترف ہوں اور پروف دیکھنے کے لئے برادر عرفان احمد صباحی کی خدمات مجھے حاصل رہیں۔ البتہ اپنی ہمشیرہ عاصمہ کرمانی کا خصوصی طور پر شکر گذار ہوں جنھوں نے اپنی خانگی مصروفیات کے باوجود اس کے لئے وقت نکالا۔ دوسرے ایڈیشن کی تیاری کو برادر محترم پروفیسر مسعود احمد کی باریک بینی نے میرے لئے بہت آسان کردیا۔ اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

طباعت کے میدان میں عزیزی ابوالاعلی سید سبحانی کے ادارے ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس نے جو معیار قائم کرلیا ہے اس نے بہت سی فکروں سے مجھ جیسے مصنّفین کو آزاد کردیا ہے۔ میں ان سب کے لیے دعا گو ہوں۔

ستمبر ۲۰۱۷ء، علی گڑھ

محمد ذکی کرمانی

مقدمہ

محمد ذکی کرمانی

اسلام کی پندرہ سو سالہ تاریخ کا سفر نہ صرف جاری ہے بلکہ ہماری دنیا کے واقعات اور رُخ کو متعین کرنے میں موثّر بھی ہے۔ یہ تاریخ خارجی عناصر اور داخلی کرداروں کے تعامل کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے جس مرکب سے ترتیب پاتی رہی ہے اس میں اسلام کے فہم اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے کرداروں کا رویّہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

فہم کس چیز کا اور رویئے کس کے؟ یہ سوال سادہ بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ اسلام کی تاریخ میں فہم سے مراد دین کے تقاضوں کا فہم ہے اور رویوں سے مراد ان تقاضوں کے فہم کی روشنی میں تشکیل پانے والے انسانی انفرادی اور اجتماعی رویئے ہیں۔

سوال کے سادہ سے پہلو کا ایک سادہ سا جواب۔ لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ قرآن کریم میں ہمارے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ ورق گردانی کرتے جائیے جانے کتنے مسائل کے جواب سے آپ قرآن کریم کو خالی پائیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسائل کے حل کے لئے بنیادیں قرآن فراہم کرتا ہے اور ان بنیادوں' کو بنیاد بنا کر جب فکر اور تدبّر کیا جائے گا تو شاید مسائل کے حل سامنے آئیں گے۔ لیکن فہم قرآن کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن کی زبان اور متعلّقہ علوم سے واقفیت کافی ہے۔ فہم قرآن کے لئے اتنا ہی ضروری اس عصر کی واقفیت بھی ہے جس عصر میں یہ فہم پیش نظر ہے۔ قرآن کریم کا فہم اگر عصر کے پس منظر میں نہ ہوگا تو رویّوں کی تشکیل بے معنی اور غیر متعلق ہو جائیگی۔ اور اس طرح فہم اور رویئے دونوں ہی عصری معنویت سے خالی ہو کر بے وزن ہو جائیں گے۔

اسلام کی پندرہ سو سالہ تاریخ اس عصری معنویت کی تلاش اور اس کی اثر انگیزی سے ہی عبارت ہے۔ واضح رہنا چاہئے کہ تاریخ محض قافلوں کے لٹنے کی داستان نہیں بلکہ ان کوششوں کی تاریخ بھی ہے جو ان لٹے ہوئے قافلوں کو دوبارہ مجتمع کرنے اور ان پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے کی گئیں جو ان کے لٹنے کی وجہ بنے تھے۔

اس پس منظر میں آج اس موضوع کا مطالعہ کس طرح ہو؟ یہ ایک دلچسپ اور انتہائی اہم سوال ہے۔ اس کوشش میں ہم بعض ضمنی سوالات سے دوچار ہوتے ہیں جنھیں سمجھنا اور کسی نتیجہ پر پہنچنا اصل سوال کے حل کے لئے ضروری ہے۔

۱۔ قرآن کریم انسان سے فی زمانہ کیا چاہتا ہے؟

۲۔ شہادت الی الناس کی حقیقت کیا ہے؟

۳۔ اس شہادت کے باب میں کیا تاریخ کوئی گواہی دے رہی ہے؟

قرآن کریم اپنے پیروکاروں کو دو طرح کی نعمتیں عطا کرتا ہے۔جن کا اعتراف و ادراک بقدر استطاعت ہی ہوتا رہا ہے۔ایک ہے روحانی تجربہ اور دوسرا ہے زندگی کے لئے اعلیٰ ترین مقاصد کا ادراک اور متعلقہ اہداف کا شعور۔تجربہ سے مراد خالقِ کائنات سے راست تعلق اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی کیفیات اور روحانی توانائی ہے۔لیکن عمومیت کے اعتبار سے بنیادی طور پر قرآن کریم اس زمین پر بسنے والے انسانوں کے لئے ہے اور انھیں بتاتا ہے کہ وہ خود کیا ہیں؟ ان کے رویئے خود اپنی ذات اور اپنے جیسے دوسرے افراد کے ساتھ کیسے ہونا چاہئیں؟ یہ کائنات کیا ہے اور اس سے انسان کا تعلق کیسا ہونا چاہئے؟ انسان اور اس کائنات کا انجام کیا ہونے والا ہے؟ قرآن بتاتا ہے کہ اس انجام کو بہتر کرنے کے لئے انسان کے رویئے کیسے ہونا چاہئیں؟ اس سلسلہ میں قرآن کی تعلیمات بنیادی طور پر ہر فرد سے متعلق ہیں لیکن وہ ساتھ ساتھ اس کی معاشرتی زندگی سے متعلق بھی ہدایات دیتا ہے اور اس زندگی کی معاشی، سیاسی اور کائنات میں موجود وسائل کے بارے میں بھی بعض وضاحتیں کرتا ہے۔کیونکہ مختلف النوع ہدایات انسان سے خدا کے ذریعہ مربوط ہوتی ہیں وہ ان ہدایات پر عمل درآمد کے اعتبار سے خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔

قرآن کریم کی بنیادی ہدایات ظلم اور عدل سے متعلق بھی ہیں جن میں وہ یہ بتاتا ہے کہ خود انسانوں کی ذات اور معاشرہ ظلم کا شکار کس طرح ہوتے ہیں اور کس طرح ظلم کا خاتمہ کر کے عدل کا قیام کیا جانا چاہئے۔قرآن کریم انسانی جان، عزت و اکرام اور اس کی مال و متاع کی حفاظت کو دین کے بنیادی مقاصد کی حیثیت دیتا ہے اور انسانی آزادی اور اس کے فکر و عمل کی آزادی کی اس وقت تک زبردست حمایت بلکہ وکالت کرتا ہے جب تک کہ وہ دوسرے انسانوں کے اسی طرح کے حقوق کو پامال نہ کریں۔قرآن کریم انسان کی اپنی صلاحیتوں اور استطاعتوں کو پوری اہمیت دیتے ہوئے اپنی ہدایات کو محض بعض ایسے دائروں تک محدود رکھتا ہے جن کے بارے میں اس کے نزدیک انسان کو بتا دینا ضروری ہے البتہ بتا دینے کے بعد انھیں تسلیم کرنا اور نہ کرنا اس کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے۔

قرآن کریم کا یہ منشاء رسول اللہؐ نے عملاً پورا کر کے دکھایا اور انسانوں کی تربیت اسی نہج پر کی۔یعنی جن بنیادوں پر انسان کو خدائے واحد سے مربوط کرنا تھا وہ رشتہ قائم کر دیا اور انسان کے بعض انفرادی و اجتماعی معاملات کو قرآن کریم کی ہدایت سے منسلک کر کے اس کی ذات اور معاشرہ کو الٰہی ہدایات پر قائم کر دیا۔اس

پورے عمل میں انسانوں کی روحانی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ان کے اخلاق کی بھی اس طرح تعمیر کردی کہ انسان اپنے انفرادی اور اجتماعی معاملات میں اعلیٰ ترین معیار پر فائز ہوگیا۔ معاشی اور سیاسی معاملات میں یہی اخلاقی تربیت کام آئی اور قرآن کریم نے جو ہدایات دی تھیں انھیں عمل میں لاکر یہ بتادیا کہ معیشت، معاشرت اور سیاست میں ان ہدایات کو کس طرح بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ اس کامیابی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ خود رسول اللہؐ کے بعد پورے سولہ سال تک ان کے جانشینوں نے نہ صرف اس معاشرہ کو اسی طرح قائم رکھا بلکہ وہ مسائل جو رسول اللہؐ کو اپنے زمانے میں درپیش نہیں تھے اس طرح حل کئے کہ معاشرہ ظلم سے محفوظ رہا اور عدل پر قائم رہا۔ انسان کی فکری اور عملی آزادی اور انسانی جان و مال کی عزت مکمل طور پر محفوظ رہی۔

خلافت ابوبکرؓ و عمرؓ اور خلافت عثمانیؓ کے ابتدائی دور پر محیط پوری مدت دراصل رسول اللہؐ کے دور کی توسیع ہی ہے۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا وہ تاریخ کا حصّہ ہے جسے دہرانے کی ضرورت ہے نہ تجزیہ کرنے کی۔ البتہ اتنا کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ سوم کا نصف آخر دور اور پھر دورِ علیؓ، معاویہؓ، اور حسینؓ و یزید تک جو کچھ ہوا، اس کی بنیادیں ہر گروہ نے قرآن کریم ہی میں تلاش کیں۔ بعض نے محض اخلاص کے ساتھ اور بعض نے اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر۔ البتہ اس ابتدائی دور کی افراتفری کے بعد معاشرہ کی مجموعی صورتحال یہ ہوگئی کہ حکومت اور سیاست کے بہت سے اہم پہلو دین کی پابندیوں اور اخلاقیات سے ماورا ہوگئے جس کے نتیجہ میں اقتدار پر قبضہ، خزانہ کے استعمال اور سیاسی مخالفوں کے ساتھ رویوں میں کسی قسم کی دینی تو بہت دور کی بات ہے عام انسانی اخلاقیات کو بھی روا نہ رکھا گیا۔ امویوں کا اپنے مخالفین کا خون بہانا، عباسیوں کا عوام کو دھوکہ دینا اور امویوں کو دھوکہ سے قتل کردینا وغیرہ ایسے واقعات ہیں کہ لگتا نہیں کہ محض چند دہائیاں قبل یہ لوگ رسالتمآب کی مجلسوں میں بیٹھے تھے اور ہدایت سے مستفید ہوئے تھے۔

اس صورتحال کے خلاف ردِّعمل بتدریج ختم ہوجانے یا اس کے موثر نہ رہنے کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اکابرین نے محسوس کیا تھا کہ اقتدار اہم ضرور ہے لیکن اسلام کی مکمل اسکیم میں اس کے حصول سے زیادہ حُکّام کی اخلاقیات کی اہمیت ہے اور اسی بنا پر اکابرین اور زعما نے خروج اور بغاوت کی حوصلہ شکنی کی جس کے نتیجہ میں معاشرہ بحیثیت مجموعی محفوظ اور اپنی جگہ قائم رہا اور انفرادی طور پر ذمہ داری محسوس کرنے والے اکابرین پوری آزادی کے ساتھ فکری اور علمی کاموں میں مصروف رہے۔ اہل اقتدار نے بھی انکے کاموں کی حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ دین جو انسانی روح اور فکر کے لئے ایک تجربہ کی حیثیت رکھتا تھا وہ بھی باقی رہا اور اس کا قانونی پہلو بھی جو نہ صرف معاشرہ پر قائم رہا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی بھی کرتا رہا۔

گویا یہ کہنا بے جا نہیں کہ خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد مسلم فکر نے سیاسی سطح پر صلح کرلی اور مصلحتوں کے پیش نظر یہ تسلیم کرلیا کہ شاید آئندہ حکمراں اور حکمرانی اس معیار پر قائم نہ رہ سکے گی جس کا اظہار خلافت راشدہ میں ہوا تھا۔ البتہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعد کے ادوار میں بھی ایسے حکمراں

آتے رہے جن کے ذاتی کردار خلفائے راشدین سے قریب تھے۔ عوام کے درمیان حکمرانوں کی پوزیشن ، شیخین کے معیار سے ہی متعین ہوتی رہی اور یوں ان سے عوام کی محبت میں کمی وبیشی کے سوتے انھیں چند عظیم کرداروں سے پھوٹتے رہے۔ اس صلح کے نتیجہ میں حکمرانوں اور اکابرین کو یکسوئی حاصل ہوئی تو بڑی تیز رفتار تہذیبی ترقی کے ساتھ سلطنت میں توسیع بھی ہوئی اس طرح عوامی وقار اور افتخار میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اقوام عالم میں عالم اسلام کو سربراہی صدیوں تک حاصل رہی۔ سلطنت کی توسیع کے نتیجہ میں اسلامی معاشرتی علوم میں زبردست ترقی ہوئی۔ اس دوران دوسری تہذیبوں کے شامل ہو جانے کے نتیجہ میں تین طرح کے اثرات عالم اسلام نے قبول کئے۔

(۱) سب سے پہلا اثر انتظامی امور کے دائرہ میں رومی اور ساسانی تجربوں سے فائدہ اٹھانا تھا جس کا آغاز اموی دور میں ہی ہو گیا تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ حکومتی سیکریٹریٹ جو دیوان کہلاتا تھا مسلمانوں نے رومیوں اور ایرانیوں سے تقریباً جوں کا توں لے لیا تھا البتہ اسے بتدریج عربی زبان میں ترجمہ کے ذریعہ عربی اسلامی ثقافت سے ہم رنگ کر لیا گیا۔ حکومتی اشرافیہ اپنے رہن سہن اور درباری آداب وطور طریق میں بھی ان دو تہذیبوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ عباسی دور میں یہ اثرات زیادہ نمایاں ہوئے۔ ویسے بھی ساسانی سلطنت اور رومی کیونکہ بہت کمزور ہو چکے تھے اس لئے ان کی سیاسی ثقافت کو اپنانے میں امویوں کے لئے اب نفسیاتی موانعات بھی نہ تھے۔ البتہ اس کے نتیجہ میں حکمران اپنے عوام سے بہت دور ہوتے چلے گئے تھے۔

۲۔ فارسی سلطنت کے خاتمہ کے بعد اور ہندوستان میں سندھ تک آجانے کے نتیجہ میں زرتشتی اور ہندوستان میں موجود مذاہب جن میں ہندومت کے علاوہ بدھ اور جین مت کی وہ روایتیں جو اس مادّی دنیا سے لاتعلقی اور روح کے بلندی کی طرف سفر کا گمان پیدا کراتی تھیں، نے بھی عالم اسلام میں بالخصوص بڑھتے ہوئے تعیش کے نتیجہ میں ان روحانی لذتوں کی پیاس بڑھائی ہوگی جن کا تجربہ انسان نے رسول اللہ کی صحبت میں اور خلافت راشدہ کے زیر سایہ کیا تھا۔ اور یوں تصوف کی روایت مسلم معاشرہ میں جڑ پکڑنے میں نہ صرف کامیاب ہوئی بلکہ جنید بغدادی کے اسے اسلامیانے کے نتیجہ میں بتدریج معیار حق بنتی گئی۔ وقت گذرنے کے ساتھ مسلمانوں کے بہترین ذہنوں کی منظور نظر ہو کر یہ اسلام کے فکر وعمل کا جزوِلاینفک بن گئی۔

۳۔ مختلف تہذیبوں سے اشتراک کا ایک اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علوم وفنون سے عالم اسلام متعارف ہوا اور بالخصوص یونانی فلسفہ اور میسوپٹامیہ اور مصر کے ممالک میں موجود فنی اور سائنسی علوم میں مسلمانوں میں دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ یہ دلچسپی ساتویں صدی عیسوی کے نصف کے بعد بنو امیہ کے بالکل ابتدائی دور میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ ابتدا میں یہ دلچسپی محض فنی علوم تک محدود رہی لیکن بنو عباس کے آتے آتے اس میں یونانی فلسفہ اور وہاں کے دوسرے علوم بھی اس حد تک شامل ہو گئے کہ عربوں نے کھوئی ہوئی یونانی حکمت اور علوم کو گویا دوبارہ زندہ کر دیا۔ ایک زندہ اور متحرک معاشرہ ہونے کی بنا پر کسی بیرونی علمی وفکری روایت سے تعامُل کرنے میں عربوں کو

ذرا بھی تکلف نہ تھا کیونکہ قرآن کریم فکر وعمل کی اس وقت کی دنیا میں ہر اعتبار سے غالب اور چھایا ہوا تھا اور انسانی دلچسپیوں کا معتبر ترین محور تھا۔ یونانی فلسفہ اور منطق عربوں کے بہترین ذہنوں کو متاثر کرتے ہوئے قرآن کریم کی تفہیم اور اس کی بہت سی علامتوں کے سمجھنے میں معاون ثابت ہونے لگی تھی اور یوں معتزلہ اور اشاعرہ کے مکاتب فکر نے عالم اسلام کی فکری روایت پر بڑے گہرے اثرات مرتب کئے اور آنے والی صدیوں میں عالم اسلام کی فکری نقشہ گری میں اہم ترین رول ادا کیا۔ اب ہم اشارۃً ان چند فکری رویّوں کا تذکرہ کرینگے جو امتِ مسلمہ کی آج کی صورتحال کا پس منظر ہیں۔

خوارج کی شدت پسندی

گوکہ خوارج کی ابتداء حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ہوگئی تھی لیکن ان کا واضح اظہار حضرت علیؓ کے زمانہ میں ہوا جب دورِ عثمانؓ کی بعض انتظامی بے اعتدالیوں کے اثرات عوام پر ظلم اور ان کے حقوق کی پامالی تک پہنچ گئے تھے۔ اسی پس منظر میں خوارج کا آغاز ہوا اور عوام کے ہاتھوں شہادت عثمانؓ کے ذمہ داروں کے خلاف کاروائی میں تاخیر کے نتیجہ میں صورتحال مزید بگاڑ کا رخ اختیار کرگئی۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانہ کے خون خرابہ کے بعض چشم دید گواہوں میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ یہ دونوں ہی نا اہل تھے۔ حقوق کی پامالی، قصاص سے پہلوتہی اور مسلمانوں کا قتل عام گناہ کبیرہ ہونے کی بنا پر خوارج کے نزدیک ان حکمرانوں کی اسلام سے وابستگی بھی مشکوک قرار پائی۔ معاشرہ میں ہر مخلص کو حکمت و دانائی عطا نہیں ہوتی جس کے نتیجہ میں متشدد خیالات کا پنپنا فطری ہے۔ حکمرانوں کا وہ معیار جو شیخین نے قائم کیا تھا آنے والے حکمران شاذ و نادر ہی اس پر فائز نظر آئے۔ چنانچہ ابتداء میں تو خوارج نے حکمرانوں اور ان افراد کو جو ان کے خیال میں کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوتے قتل کرنا دین کا تقاضہ جانا۔ لیکن یہ گروہ بتدریج ایک خفیہ گروہ میں تبدیل ہوا اور اپنے منظّم وجود کو تو کھو بیٹھا لیکن اس کی فکر کے اثرات آج تک باقی ہیں۔ پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اکیسویں صدی بھی ان سے شدید طور پر متاثر نظر آتی ہے۔ آج مسلمانوں میں جو قتل و غارتگری نظر آرہی ہے اس پر خارجی فکر کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

عقل اور نقل کی بحث

فکری دنیا میں عالم اسلام کے چار معروف ترین فقہا میں امام احمد بن حنبل کی فکر میں عقلی رویّوں کے خلاف شدت پسندی بنیادی طور پر تو معتزلہ کے خلاف تھی لیکن یہاں بھی پیش نظر مسئلہ کی جڑیں خارجی افکار میں ملنا چنداں مشکل نہیں۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یونانی فلسفہ میں دلچسپی رکھنے والے اس دور میں خاصے متحرک ہوچکے تھے اور ان کی فکری کاوشیں بنیادی طور پر حقائق کی جستجو پر مرتکز تھیں جن میں رہنما مقام قرآن کریم کے

ساتھ ہی ساتھ نو حاصل شدہ علم فلسفہ کو حاصل تھا۔ اپنی اس جستجو سے عبارت سرگرمیوں سے وہ جن حقائق کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے وہ بنیادی طور پر آج کے سائنسی علوم جیسے تھے جو ہمارے خیال میں خالد بن یزید کی ابتدائی کاوشوں کا عصری اظہار تھے۔ لیکن یونانی فلسفہ کی فکر اور منطق میں دلچسپی کے پیش نظر یہ لوگ بھی گناہ کبیرہ سے متعلق بحث میں کود پڑے اور اس خیال کا اظہار کر بیٹھے کہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ایک تیسری پوزیشن بھی ممکن ہے۔ اس نقطہ نظر کا مطلب متشدّد ذہنیت نے یہ لیا کہ ان لوگوں کے نزدیک اسلام سفید وسیاہ کی طرح واضح نہیں۔ غور وخوض کا یہ سلسلہ آگے بڑھا تو فلسفی فکر سے متاثر افراد چھنٹ کر علیحدہ ہوتے گئے اور کیونکہ ان کا نقطۂ نظر اس وقت کے بظاہر غالب نقطہ نظر سے خارج تھا اس لئے یہ معتزلہ کہلائے۔ ان کی اصل پہچان قرآن اور دین سے متعلق مسائل میں عقل کی روشنی میں غور وخوض تھی لیکن یہ عقل عمومی عقل انسانی نہ تھی بلکہ یہ یونانی فلسفہ سے لیس ہو کر اور انھیں بنیادوں پر اسلام کو سمجھنے اور اسے مرتب کرنے کی کوششیں کر رہی تھی۔ واضح رہنا چاہئے کہ یہ فکر مکمل طور پر کوئی اجنبی اور خارج سے آئی ہوئی فکر نہ تھی بلکہ فلسفیانہ طرز فکر کی روشنی میں دین اور اس سے ابھرتے ہوئے نت نئے سوالوں کو سمجھنے کی کوشش تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس اعتبار سے جب اسلام کی بنیادوں کی عصری تفہیم کرنا چاہی تو اس میں توحید کو وہی اہمیت حاصل رہی جو روایتی فکر سے عیاں تھا، البتہ فہم وتفہیم کے اس پورے عمل میں جہاں اللہ کی ذات اور صفات کی ابدیت کا مسئلہ کھڑا ہوا وہاں قرآن کریم کی لافانیت بھی زیر بحث آئی۔ یہ سوال کھڑا ہو گیا کہ عقیدہ توحید کی اصلیت تو صرف خدائے لایموت کی لافانیت پر منحصر ہے اور کوئی دوسری شئے اس مقام پر فائز نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ قرآن کو بھی مخلوق ہونا چاہئے۔ اور مخلوق کیونکہ ارتقاء پذیر ہے اس لئے قرآن کے حقائق اور تعلیمات بھی ارتقاء پذیر ہیں۔ وقت کے علماء اور بالخصوص احمد بن حنبل نے اس مسئلہ کو موت وحیات کا مسئلہ بنا لیا، قید کئے گئے، زدوکوب اور تشدد کا شکار ہوئے لیکن کیونکہ معاشرہ میں بااثر تھے اس لئے ان کی مخالفت مقتدرہ کے لئے بڑی اہم تھی۔ ان کی مخالفت کی اصل ضرب عقل پر مشتمل اس طرز فکر پر پڑ رہی تھی جس نے اس نتیجہ پر پہنچایا تھا۔ اور یوں یہ تسلیم کر لئے جانے کے نتیجہ میں کہ قرآن مخلوق نہیں ہے کوئی بڑا مسئلہ تو حل نہ ہو سکا البتہ عقل اور عقلی رویہ کا استعمال ابتداً دینی معاملات میں اور پھر بحیثیت مجموعی عام معاملات میں مقہور ومبغوض ٹھہرا۔

عملاً اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم وحکمت کی وہ تمام روایتیں جن کا ماخذ قرآن کریم نہ تھا بلکہ وہ محض عقل کی کارفرمائیوں پر مشتمل تھیں، غیر اہم ہوتی گئیں اور فکر وتدبر قرآن کریم اور اس کے متعلقات سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتا۔ اسی صورتحال پر امام غزالی نے تنقید کرتے ہوئے جب ذہین افراد کو فرض کفایہ اور فرض عین کے وسعت پذیر تصور کی طرف متوجہ کرتے ہوئے طب اور زراعت کی اہمیت اور ضرورت بتائی تو وہ دراصل اپنے دور میں ہمارے زمانہ کی Sociology of Knowledge کی اسلامی بنیادوں کو مستحکم کر رہے تھے۔ یہاں ایک بار پھر احمد بن حنبل کا حوالہ دیکر میں یہ بتاتا چلوں کہ ان کے زمانہ میں معتزلہ اور اشاعرہ میں شدتِ اختلاف

کے علمی حدوں سے آگے بڑھ جانے میں اس کا بھی ہاتھ رہا تھا کہ بعض علمی بحثوں اور نقطہائے نظر کو سیاسی حمایت حاصل ہوگئی تھی۔ سیاسی اور حکومتی حمایت کے نتیجہ میں بالعموم مفادات در آتے ہیں۔ وقت کی حکومت اگر معتزلہ کے پلڑے میں اپنی حمایت نہ ڈالتی اور محض علمی سطح پر ان مختلف نقطہائے نظر کو پنپنے کا موقع دیتی تو صرف علمی اور عقلی سطح پر ہی کوئی نقطۂ نظر غالب آ جاتا۔ معتزلہ کی وہ بحثیں جو محض مخالفوں کو زچ کرنے کے لئے کی جارہی تھیں، انکے نتیجہ میں اشاعرہ کی ضد سامنے نہ آتی اور یوں امام احمد بن حنبل جیسا ذہین شخص علوم فطرت یعنی سائنسی علوم کے ارتقاء میں پہلی رکاوٹ نہ بنتا۔

امام غزالی کے ابتدائی رویہّ کے نتیجہ میں بھی یہ علوم پنپ سکتے تھے۔ لیکن یونانی فلسفہ پر تجزیاتی تنقید میں وہ جس حد تک گئے اس سے دنیا کا ایک بڑا ذہین اور عظیم ترین مفکر مضحکہ خیزی کا باعث بن گیا۔ علّت اور معلول میں تعلق کو جس منطق کی بنیاد پر انھوں نے مسترد کیا وہ آج کے کم عمروں کو مضحکہ خیز ہی نظر آتی ہے۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ اس وقت کا عالم اسلام اس مضحکہ خیز دلیل پر آخر مطمئن کس طرح ہوگیا؟ ہمارے خیال میں اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اگر فلسفہ کے ذریعہ در آنے والی ان دلیلوں کو توڑا نہ گیا ہوتا تو علماء اور فضلاء، جو عوام پر اتنا ہی موثر تھے جتنا کہ سیاسی مقتدرہ، کا اقتدار قائم نہ رہ پاتا۔

یونانی فلسفہ پر غزالی کی تنقید بڑی معرکتہ الآرا تھی لیکن علّت اور معلول کے اس رشتہ پر ان کی رائے سے علوم فطرت کی آزادانہ کھوج پر بڑے منفی اثرات مرتب ہوئے اور یوں تحقیق و جستجو کے اس رخ کو آئندہ کبھی دینی اعتبار حاصل نہ ہوسکا۔ ایسا نہ تھا کہ غزالی کی اس رائے پر تنقید نہیں ہوئی۔ ابن رشد کی مثال سامنے ہے جو یونانی فلسفہ میں بھی اتنی ہی مہارت رکھتے تھے جتنی استعداد انھیں دینی معاملات میں حاصل تھی۔ غزالی پر ان کی تنقید عالم اسلام کے قلب کو متاثر نہ کرسکی لیکن یورپ ان سے مستفید ضرور ہوا۔

البتہ ایسا بھی نہیں تھا کہ اس دوران عالم اسلام میں سائنس یعنی علوم فطرت جیسے موضوعات پر کام ہونا بالکل بند ہوگیا ہو۔ معاشرہ کی متنوع ضروریات جس میں اپنے سکّوں کی ڈھلائی، دفاعی ضروریات بالخصوص بحری جنگوں میں استعمال کے لئے آگ لگانے والے ہتھیار وغیرہ، عربوں کے معاشرہ میں وراثت کی تقسیم، راستوں اور سمت سفر کا تعین اور ان سے بڑھ کر صحت و تندرستی وغیرہ کے مسائل مسلمانوں کی خلاّقانہ صلاحتیوں کو متوجہ کرتے رہے۔ ان میدانوں میں بھی کام ہوا جنھیں ہم آج بنیادی سائنسز کہتے ہیں۔ یہ کام کرنے والے علوم دینیہ کے بھی ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ان سب کے باوجود غزالی نے علّت و معلول کے تعلق کو زک پہنچا کر جو اپنے اعتبار سے دینی خدمت انجام دی تھی اور جس کی بنا پر وہ حجۃ الاسلام قرار پائے تھے، اس سے مسلم ذہن کبھی جانبر نہ ہوسکا۔ علوم کی دینی اور دنیوی تقسیم جو ابتداء محض امتیاز قائم کرنے اور پہچاننے کے لئے اختیار کی گئی تھی غزالی کے بعد اس نے بتدریج ایک فلسفیانہ رخ اختیار کرلیا اور قرآن و سنت پر مبنی علوم کو دینی اور باقی علوم کو دنیوی علوم کہا جانے لگا۔ غزالی کی تہافتہ الفلاسفہ پڑھ جایئے یہ تقسیم کہیں نظر نہ آئے گی بلکہ وہ حسّی بیان پر مبنی علوم کے ہمنوا

نظر آئیں گے۔ لیکن یونانی فلسفہ کے خلاف انھوں نے جس نہج پر کام کیا وہ بتدریج دین اور دنیا کی علیحدگی کا باعث بنا اور دین کی اہمیت کے پیش نظر کوئی مسلمان اس کی قیمت پر دنیوی علوم کو اپنانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ علماء اس فرق کو اگر باقی نہ رکھیں تو انھیں معلوم ہے کہ.................. چنانچہ آج بھی مسلمان اُن علوم میں خال خال ہی نظر آتے ہیں جو انسانوں کی دنیوی خیر کا باعث بھی ہیں اور قوت و غلبہ کا ذریعہ بھی۔

مزید شدت

اور یہ بات محض غزالی پر ختم نہیں ہوگئی۔ ان کے کوئی ڈیڑھ سو سال بعد دمشق کے ابن تیمیہ نے احمد بن حنبل کی روایت کو مزید آگے بڑھایا جس کے مطابق قرآن کی تفہیم میں عقل کو نہیں بلکہ لفظی اور لغوی معنویت ہی کو اہمیت حاصل ہے اور یہی طریقہ قرآن کے صحیح معنی تک پہنچنے کی ضمانت دیتا ہے۔ ابن تیمیہ کا زمانہ منگولوں کی لائی ہوئی مسلمانوں پر تباہی کا زمانہ تھا۔ یہ تباہی اتنی ہولناک تھی کہ یہ کہا جانے لگا تھا کہ اللہ نے مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اس صورتحال نے ہر شخص کو سوچنے پر مجبور کیا ہوگا اور یقیناً ہر سوچ اور فکر اس وقت کے غیر معمولی حالات سے متاثر ہوئی ہوگی۔ ابن تیمیہ کا خیال تھا کہ یہ تباہی مسلمانوں کی خود لائی ہوئی ہے کیونکہ انھوں نے اس طریقہ کو چھوڑ دیا ہے جس کی بنیاد پر اللہ نے ان کی نصرت اور کامیابی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو سلف الصالحین کے راستہ پر چلنا چاہئے جن کے یہاں جہاد کی اہمیت واضح تھی۔ لیکن خود ان کے زمانہ میں یہ جہاد منگولوں کے خلاف ہونا تھا جو اسلام قبول کر چکے تھے۔ مسلمانوں کا خود مسلمانوں کے خلاف جہاد ایک بڑا مسئلہ تھا لیکن ابن تیمیہ نے انھیں صحیح مسلمان نہ سمجھتے ہوئے ان کے خلاف جہاد کو صحیح سمجھا اور صحیح مسلمانوں کی فہرست سے وہ تمام لوگ خارج ہونے لگے جو گمراہ تھے، اور جن کے رویّہ سے ارتداد ظاہر ہوتا تھا یا جو بدعتی تھے اور فرقہ بندی میں مبتلا تھے۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو قرآن اور حدیث کے لغوی معنی سے مختلف رائے دیتے اور جس کے نتیجہ میں فکر و نظر کے مختلف گروہ تشکیل پائے تھے۔ اور اس سلسلہ میں اہم ترین بات یہ تھی کہ ابن تیمیہ بلا تکلف یہ سمجھتے تھے کہ ان کا فہم ہی صحیح ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف نظریات رکھنے والوں کے ساتھ ان کا رویہ شدت پسندی پر مبنی تھا۔ ایسے تمام علماء کو وہ نا قابل اعتنا سمجھتے اور ان سے اس طرح کے مسائل پر مکالمہ کرنے کے بھی روادار نہ تھے۔

ہمارے خیال میں ان دونوں یعنی احمد بن حنبل اور ابن تیمیہ کے زیر اثر قرآن فہمی میں عقل کا استعمال متروک ہو کر بالآخر دینی معاملات میں عقل کی بے توقیری کا باعث بنا اور میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ کیونکہ عقل کو تہذیبی عمل سے گذرنے کے لئے اس کا وحی سے تعامُل ضروری ہے جس کی حوصلہ شکنی کی بنا پر وہ ہر معاملہ میں زوال پذیر ہونے لگی۔ اور پھر وہ وقت آیا کہ دین محض تقلید کا نام رہ گیا اور منجمد ہو کر اس قابل نہ رہا کہ عصر کا ساتھ دے سکے۔ اس کا اثر خلاّقانہ صلاحیتوں پر پڑنا بھی فطری تھا جس کا اظہار صدیوں بعد کوئی سولہویں صدی عیسوی سے ظاہر ہونے لگا تھا اور مسلم اقوام بتدریج کمزور اور نحیف ہوتی چلی گئیں۔

اٹھارہویں صدی آتے آتے عبدالوہاب نجدی کی تحریک عرب میں نجد کے علاقے سے اٹھی۔ بنیادی بیانیہ یہی تھا کہ مسلمانوں کے صحیح دین پر قائم رہنے پر ہی اللہ کا وعدہ پورا ہوگا۔اس سلسلہ میں عبدالوہاب کے فکر و عمل کی بنیاد کچھ حد تک خوارج اور پھر بہت واضح طور پر امام احمد ابن حنبل اور ابن تیمیہ کے افکار میں مل جاتی ہے۔ اپنے نقطۂ نظر کو واحد صحیح اور دوسروں کو گم کردہ راہ جاننا اور قابل گردن زدنی سمجھنا اس پورے طائفہ فکر کا امتیاز رہا ہے۔لیکن عبدالوہاب نجدی کے ساتھ یہ مزید ہوا کہ ایک طاقتور عرب قبیلہ کی سیاسی اور عسکری حمایت انھیں حاصل ہوگئی اور یوں اپنے نقطۂ نظر کو بزورِقوت نافذ کرنے کا انھیں پورا موقع ہاتھ آ گیا۔دوسری طرف اس قبیلہ کو اپنے سیاسی عزائم کے حصول کے لئے دینی جواز فراہم ہوگیا۔کون نہیں جانتا کہ دوعرب خاندانوں کے ایک عظیم عرب علاقے پر قبضہ کے عزائم کے لئے دینی حمایت نے عثمانی سلطنت (اس کی اپنی کمزوریوں کے باوصف) کو کس طرح شکست وریخت سے دوچار کرتے ہوئے عالم اسلام پر مغربی غلبہ کی راہ ہموار کی۔اور امت کی بے توقیری کا یہ سلسلہ آج تک دراز ہے۔

صاف نظر آتا ہے کہ خوارج سے شروع ہوکر احمد بن حنبل، ابن تیمیہ اور پھر عبدالوہاب نجدی کی فکر اور رویّوں میں کئی باتیں مشترک ہیں۔اپنے نقطہ نظر کو صحیح ترین اور دوسروں کو گمراہ سمجھنا اور اگر سیاسی طاقت حاصل ہوجائے تو سختی اور بزورقوت اس نقطہ نظر کو قائم کرنا بلکہ مخالفت کرنے والوں کو قتل کردینے کو بھی دین کا تقاضہ سمجھنا یہ رویّے خاص طور پر عبدالوہاب نجدی کی فکر کے تحت اپنے عروج پر پہنچے۔لیکن اس سخت روی کے ساتھ بدعات سے کراہیت پرزور، دین میں سادگی اور قرآن وسنت سے راست تعلق کے نتیجہ میں بہت گنجلک اور پیچیدہ وخیالات سے آزادی کے نتیجہ میں فکر اسلامی صاف ستھرا بھی ہوا۔لیکن یہ سختیاں اپنے ساتھ محرومیاں بھی لائیں۔

تصوف اور علمی ارتقا

اسلام کا ایک مذہبی تجربہ کی حیثیت میں ہم تذکرہ کر چکے ہیں، یہ روح انسانی کی ضرورت ہے اور ہر شکل میں انسان کے لئے باعث تسکین ورغبت رہی ہے۔رسول اللہ نے مذہبی تجربہ یعنی اللہ سے راست تعلق کے قیام کے لئے صلوٰۃ کو معتبر ترین ذریعہ قرار دیا تھا۔ پانچ وقت کے ساتھ تہجّد کی نماز اس کا بہترین ذریعہ تھی۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد آپ کا زمانہ جب خلفائے راشدین کے دور تک دراز ہوا تو بھی اس میں کسی نئے تجربہ کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔البتہ بعد میں حالات کے بگاڑ نے نظام میں جو خرابیاں پیدا کردیں تو اس تجربہ کو وسیع کرنے اور نئی شکلیں دریافت کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ مختلف تہذیبوں سے متعارف ہونے کے نتیجہ میں جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں یہ روایت آگے بڑھی اور یوں رابعہ بصری، جنید بغدادی، اور حسین بن منصور حلاّج جیسے صوفی سامنے آئے اور بارہویں صدی آتے آتے امام غزالی ایک ایسے فلسفی صوفی مفکر کی حیثیت میں ابھرے جنھوں نے دینیاتی تصورات اور فلسفیانہ وسائنسی رُخ کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔

فلسفہ اور منطق میں یونانی اثرات بتدریج کم ہوئے تو نہ صرف دینی فکریات میں عقل کا رول کم ہوا بلکہ عقلی علوم بھی اس کی زد میں آئے۔ اس کا تذکرہ ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔

سائنس اور متعلقہ علوم میں جو کچھ ابتک ہوتا رہا تھا اس میں زوال آنا شروع ہو گیا۔ سائنس کے مشہور مغربی مورخ جارج سارٹن کے مطابق بارہویں صدی تک کوئی چار صدیوں پر محیط عرصہ میں ہر صدی میں دنیا کا سب سے بڑا سائنسداں کوئی عرب مسلمان ہی ہوا کرتا تھا لیکن تیرہویں صدی آتے آتے وہ عالمی برتری متاثر ہونے لگی اور اس میدان میں یہ زوال بڑھتا ہی گیا۔

تیرہویں صدی میں مشہور شاعر جلال الدین رومؔی پیدا ہوئے اور یہی دور اسپین کے محی الدین عربی کا بھی ہے۔ تصوف کو علمی سطح پر لا کر غزالی نے اسے اس قابل کر دیا تھا کہ اب مسلمانوں کی تخلیقی روایت کا اظہار صوفی عقائد کی تشکیل اور اسی نوع کی شاعری کے ذریعہ ہونے لگا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ اسلام کی دینیات میں صوفی افکار غالب ہونے لگے۔ ہندوستان میں علوم اسلامیہ کے ارتقاء کی تاریخ میں سب بڑا گھرانہ شاہ ولی اللہ کا تھا جو علوم اسلامیہ میں جتنا گہرا تھا اتنا ہی تصوف کے باب میں بھی اسے مقام حاصل تھا۔ شاید جدید ہندوستان کی نقشہ گری سے قبل کے ہندوستان کا آخری بڑا مسلمان مولانا اشرف علی تھانوی بھی اسلامی علوم کے ساتھ علمی تصوف میں بھی اتنا ہی بڑا نام تھا۔ گویا اب صورتحال یہ تھی کہ نہ صرف علوم اسلامی بلکہ طب جیسے فنی علوم بھی تصوف کے بغیر معتبر نہ تھے۔ کوئی بڑا طبیب ہوتا تو یقیناً وہ ایک بڑا صوفی بھی ہوتا۔ ہندوستان میں ہر شخص جانتا ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاء (۱۲۵۲۔۱۳۲۵) کے نام سے مشہور صوفی بزرگ کے مرید خاص امیر خسرو ایک بڑے صوفی ہونے کے ساتھ ایک عظیم شاعر، عالم اور ایک ماہر موسیقار بھی تھے جن سے موسیقی کے بعض آلات اور خیال اور ترانہ جیسی موسیقی کی اقسام بھی منسوب ہیں۔ گویا تخلیقی ذہن کی آبیاری میں بھی تصوف اپنا کردار ادا کرنے لگا۔ انسان کا ذاتی روحانی ارتقاء کیونکہ اس کا بنیادی مقصد تھا اس لئے اس کا رُخ بھی بالعموم انھیں علوم وفنون کی طرف رہا جو روح کو بلندی کی طرف مائل کرنے والے ہوئے۔ لیکن یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ تصوف نے صنعتوں کے استحکام میں بھی کردار ادا کیا۔ مثلاً عثمانی سلطنت میں صنعت وحرفت سے متعلق انجمنوں کے قیام میں صوفیوں کا کردار ایک تاریخی حقیقت ہے جس نے اسلامی عہد کے ترک دور میں ان صنعتوں کے استحکام کے ذریعہ سلطنت عثمانیہ کے معاشی استحکام میں اہم رول ادا کیا تھا۔ اس کا ایک اور انتہائی دلچسپ پہلو کشمیر میں قالین بننے کی صنعت سے متعلق ہے جس میں صوفیانہ کردار کی بڑی خوبصورت وضاحت معروف اسکالر شمس الرحمٰن فاروقی نے مشہور ناول کئی چاند تھے سر آسماں میں کی ہے۔ اس صنعت میں رنگوں کا امتزاج اور ان کی تمیز خالصتاً ایک صوفی عمل نظر آتا ہے۔

تصوف کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کتاب سے زیادہ شخصیت اور اس کے بیان کردہ تجربات حاصلات ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر سیاسی پس منظر سے علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو شیعیت بھی تصوف ہی کا

شاخسانہ نظر آتی ہے جہاں شخصیتوں کی جگہ اہل بیت وائمہ ہیں جو اپنے پیروکاروں کو خدا سے مربوط رکھتے ہیں۔ گوکہ ان کے یہاں ائمہ کا تصور قرآن سے خارج ایک تصور ہے بالکل اسی طرح جیسے تصوف میں شیخ کا تصور قرآن سے ماخوذ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن شیعی افکار میں عقل کو اہم مقام دیکر انھوں نے جس طرح فلسفہ اور سائنس کو اپنے یہاں باقی رکھا اسلامی تاریخ میں اس کا رول نمایاں نظر آتا ہے اور اس طرح سنی وشیعہ چپقلش کے باوجود مجموعی اسلامی منظر نامہ میں شیعہ اپنی جگہ بنانے میں کامیاب رہے۔

عالم اسلام میں سائنس اور فنون کے ارتقاء اور مسلمانوں کی ان میدانوں میں دلچسپی کے بارے میں ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ بعض معاشرتی مسائل اور محض جستجو کی خواہش نے بھی یقیناً انھیں متاثر کیا تھا۔ اس کی تاریخ بڑی حد تک مرتب ہو چکی اور ہو رہی ہے جس سے مسلمانوں کی ان میدانوں میں کارکردگی کے اثرات مسلم تہذیب میں واضح نظر آتے ہیں لیکن یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ مسلمانوں کی فکریات میں جو انقلابی تبدیلی غزالی اور ان کے ہمنواؤں کے ذریعہ متعارف ہوئی اس کے اثرات بتدریج ہی پڑنے والے تھے اور یوں سولھویں صدی آتے آتے مسلمانوں میں جستجو، تخلیق، اور ریسرچ، اور تحقیق کی صلاحیتیں ماند پڑنے لگی تھیں۔ اور اس صورتحال کو غالب مذہبی فکر نے مزید خراب کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

یہی زمانہ عہد اسلامی کی تین عظیم سلطنتوں کا زمانہ بھی ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ میں سلمان اعظم، ایران میں عباس اعظم اور ہندوستان کے مغلیہ عہد میں اکبر اعظم اسی دور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ وہ سلطنتیں تھیں جنکا مدِّ مقابل دنیا میں کوئی نہ تھا۔ اور اس زمانے میں عسکری طاقت ہو یا معاشی اور تہذیبی طاقت یہ تینوں سلطنتیں اپنی مثال آپ تھیں۔ لیکن میرے خیال میں اس دور کی تخلیقی قوتوں کے اظہار میں تقلید نمایاں نظر آتی ہے۔ تنوّع نہ تھا اور یوں ضروری اشیا کے استعمال ہوں یا پیداوار میں اضافے کے مسائل، ان میں حسن وخوبصورتی کا عنصر تو موجود تھا لیکن کچھ نیا کرنے کے جذبہ سے یہ محروم نظر آتا ہے۔

کوئی ایک ہزار سال کے عرصہ میں یعنی سولہوی صدی تک مسلمانوں نے علوم وفنون، سائنس، فن تعمیر اور ادب وغیرہ میں جو کچھ کیا اب وہ ٹھٹر کر رہ گیا تھا۔ اب اس میں اضافہ اور نیا پن گویا ختم ہو چکا تھا۔ نئی چیزوں کے تیئں حکمرانوں کی بے توجہی اور ان کی اہمیت سمجھ نہ پانا بھی اس کا ایک پہلو ہے۔ تاریخ سے چند دلچسپ مثالیں پیش ہیں۔

سترہویں صدی کے اوائل میں مشہور عثمانی سائنسداں تقی الدین میکینک نے عثمانی خلیفہ کی خدمت میں ایک جیبی سائز کی گھڑی پیش کی۔ اتفاق سے اسی دوران ہنگری سے آیا ہوا ایک وفد بھی خلیفہ سے ملنے آیا ہوا تھا۔ اور اپنے ساتھ ایک ایسی گھڑی لایا تھا۔ خلیفہ نے ہنگری والوں کو سلطنت میں تجارت کے لئے اجازت دے دی جبکہ تقی الدین کی تیار کردہ گھڑی اس بنا پر مارکیٹ میں نہ آسکی کہ وہ ہنگری والوں کے مقابلہ میں ذرا مہنگی تھی۔ اسی طرح ملک ہندوستان میں چوتھے مغل بادشاہ جہانگیر کے دربار میں سر طامس رو کی آمد کے ساتھ کچھ صنعتی

نمونوں مثلاً گھڑی وغیرہ، اوراورنگ زیب اوراس کے معابد کو چین سے آئی ہوئی ایک ولندیزی خاتون جولیانا جو ایک زیر ارتقاء جدید طریقہ علاج کی ماہر تھی کے ذریعہ بعض پہلوؤں سے استفادہ ممکن ہوا تھا۔ یورپی تاجر اپنی اشیاء اور حاصلات کے تعارف اور فروخت کے لئے ان مسلم علاقوں تک اپنی پہنچ بڑھانے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ اس دوران یہ ذرا بھی مشکل نہ تھا کہ یہ تین سلطنتیں ان ترقیوں کی طرف متوجہ ہوتیں جو ان یورپی ممالک میں ظہور پذیر تھیں۔ لیکن اس دور میں عظیم بادشاہوں کی نفسیات بھی دراصل کچھ لینے کی نہیں بلکہ عطا کرنے کی ہوتی ہے۔ یورپی اشیاء کو اپنے علاقوں میں برائے فروخت اجازت دیا جانا دراصل شاہی مزاج کے مطابق تھا اور وہ اقوام جو ابھی تک غیر مہذب اور کمزور تسلیم کی جاتی رہی تھیں ان کی اشیاء یا طریقوں کو اپنانا شاہی نفسیات کے خلاف تھا۔ چنانچہ بتدریج یہی ہوا کہ یورپی محض تجارتی اغراض سے ان علاقوں میں آئے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اب عسکری برتری سے کہیں زیادہ کارگر صنعتی اور تجارتی برتری ہوگی اپنے وقت کی ان تینوں عظیم سلطنتوں کے اندرون میں اپنی گہری جڑیں بنانے لگے۔

یہ زمانہ آتے آتے مسلم معاشروں میں کشف، وجدان اور مراقبوں کی عطا کی ہوئی طاقت اپنے عروج پر تھی۔ جو بدقسمتی سے روحانی فتوحات کا دعویٰ تو کر سکتی تھی لیکن وہ طاقت جو دنیا میں موجود وسائل سے تعامل کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے اس کا حصول ممکن نہ تھا۔ اور کیونکہ گذشتہ کئی صدیوں سے اس مزاج کی پرورش ہو رہی تھی اس نے عالم اسلام کے نشترِ تحقیق و جستجو کو کند کر دیا تھا۔ اس لئے جب تجارتی راستوں سے مغربی صنعتی و علمی پروڈکٹس ہمارے ممالک میں آنے شروع ہوئے تو ہم نے انھیں اپنی دولت کے عوض خریدنا ہی مناسب سمجھا اور بتدریج رنگون سے لے کر الجزائر تک پورا عالم اسلام علوم وفنون پر مبنی تجارتی حکمت عملی کے سامنے ڈھیر ہو چکا تھا۔ الجزائر کو چھوڑ کر باقی تمام مسلم ممالک بغیر جنگ لڑے یورپیوں کے قبضہ میں آتے گئے اور یہ پیغام دے گئے کہ علم وفن کی ترقی اور وسعت پذیری کی تمنا سے معمور فضا، غلبہ کے لئے ضروری ہے۔

تبدیلی کی طرف

سترہویں صدی سے عالم اسلام پر یورپیوں کا قبضہ ہونا شروع ہوا۔ اور یہ قبضہ ایسا نہ تھا کہ یورپی فوجوں نے ان ممالک پر فوج کشی کی ہو اور انھیں شکست دی ہو۔ بلکہ علوم فنون میں ترقی سے ان ممالک میں موجود قدرتی وسائل اور ذخائر کو ترقی کے لئے استعمال کرنے کی جو طاقت یورپیوں کو ملی اور نئی کامیابیوں سے انھیں جو بلند حوصلگی حاصل ہوئی اس کے نتیجہ میں اور پھر عالم اسلام میں بڑھتی ہوئی انتظامی نااہلی اور تعیش پسندی، ذہنی وفکری اضمحلال اور حوصلوں میں بتدریج کمزوری نے، یورپیوں کو ان ممالک میں آنے کے پورے مواقع عطا کئے۔ خلافت عثمانیہ میں پہلے یہ بطور تاجر آتے تھے، پھر یہ مشاور (Consultant) کی حیثیت سے آنے لگے۔ ایران اور مغل ہندوستان میں یہ تاجر کی حیثیت سے آئے اور مقامی حکمرانوں کی نااہلی کی بنا پر اور وسائل اور

تجارت کے بہتر استعمال کے نتیجہ میں اس قابل ہوگئے کہ سیاسی فیصلوں کو متاثر کرنے لگے اور بالآخر ہندوستان میں غالب ہوگئے۔ خلافت عثمانیہ کو عربوں سے مل کر تقسیم کر دیا اور ایران کے وسائل کو خرید کر اچھے معاوضے دیکر عیش پسند حکمرانوں کو عوام سے غداری پر اکسایا۔

عالم اسلام میں جو کچھ ہوا اس میں اپنی اندرونی کمزوریوں کا بڑا دخل تھا۔ اور واضح رہے کہ کمزوریوں کو دور کرنے کے کی کوششیں یا تو کی نہیں گئیں اور اگر کی بھی گئیں تو وہ حالات کی کج فہمی سے عبارت تھیں اور یوں صورتحال کو خاطر خواہ رخ پر تبدیل کرنے سے قاصر رہیں اور اس دوران عالم اسلام مختلف النوع کوششوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ کیا کیا ہوا۔

صورتحال کو بہتر کرنے کی غرض سے دو قسم کی کوششیں ہوئیں ایک میں وہ لوگ پیش پیش تھے جو اپنی قوم اور ملت سے تو محبت کرتے تھے لیکن یا تو مذہبی نہ تھے یا مذہب کو ذاتی مسئلہ سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ ملت کے مسائل کا حل صرف اس میں ہے کہ وہ طرز کہن کو چھوڑے اور دورِ جدید میں مغرب نے جن طریقوں کو اپنا کر ہمہ پہلو کامیابیاں حاصل کی ہیں انھیں طریقوں کو اپنائے۔ اس فکر کی مخالفت میں مذہبی نمائندے آگے آگے تھے۔ اس لئے جدید فکر کے یہ حاملین بتدریج مذہب مخالف ہوتے گئے۔ ترکی ہو یا عرب و ایران اور برصغیر، ہر جگہ ایسا ہی ہوا۔ تمام جدید لوگ جنھیں ترقی پسند بھی کہا گیا تھا دیکھا گیا کہ ذاتی زندگی میں دین مخالف تھے اور نہ ہی ملت کے باغی۔ لیکن حاملین دین کی دقیانوسیت نے انھیں دین اور دینی اداروں سے برگشتہ ضرور کر دیا تھا۔ البتہ ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ اس طرح کے لوگوں کو جہاں جہاں حالات درست کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے مغرب کی طرز حکمرانی اور نظریات ہی کی وکالت کی لیکن اس کے جلو میں پنپنے والی عام سماجی اخلاقیات سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ چنانچہ ان گروہوں کی برپا کی ہوئی جمہوریت بڑی تباہ کن انانیت اور تانا شاہی کا ذریعہ بنی۔ یہی ترکی میں ہوا اور یہی عالم عرب میں۔ ایران میں اور خود ہندوستان سے آزاد ہوکر پاکستان میں بھی یہی ہوا۔ چنانچہ یہاں کے حکمرانوں کو کبھی بھی عوام کی حمایت حاصل نہ ہوسکی اور نہ ہی وہ اپنے وسائل کو ملکی ترقی اور عوامی بہبود کے لئے استعمال کر سکے۔

حالات درست کرنے کی دوسری کوششیں اسلام کے حوالے سے کی گئیں۔ اٹھارہویں صدی کے جزیرۃ العرب میں محمد بن عبدالوہاب نجدی کی کوششوں کا تذکرہ ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ ان کی کوششوں کے نتیجہ میں کیا رہا؟ شاید تذکرہ کی ضرورت نہیں۔

انیسویں صدی میں جمال الدین افغانی اور سرسید احمد خاں کی کوششیں ہوں یا ترکی کے علاقے میں بدیع الزماں سعید نورسی (۱۸۷۷۔۱۹۶۰) کی کاوشیں۔ بنیادی طور پر یہ حضرات مغرب کی حصولیابیوں کو بنظر تحسین دیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ مسلمان انھیں اپنا کر ہی اقوام عالم میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے انھیں ان حصولیابیوں سے واقف ہونے کے ساتھ مذہبی فکر کو علماء کی بند گلیوں سے باہر نکالنا بھی

ضروری ہے اور مزید یہ کہ مغرب نے اپنے علوم وفنون کے سہارے جس طرح عالم اسلام کے وسائل پر ان ممالک کے حکمرانوں کی بدکرداری اور عیش پرستی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قبضہ کرلیا ہے اس سے آزادی بھی ضروری ہے۔ چنانچہ جہاں سعید نورسی نے تصوف کی روایت کو استعمال کرتے ہوئے اپنے علاقے کی دگرگوں صورتحال میں عوام کے مذہبی رجحانات کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ انھیں مستحکم کیئے رہے اور جہاں مذہب اور اس کی رسومات بھی عوامی زندگی سے تقریباً خارج کردی گئی تھیں بالآخر سیاست کو بھی اس سے متاثر کرنے میں کامیاب ہوئے۔

جمال الدین افغانی ایک انتہائی پارہ صفت شخصیت اور بڑے ہی وسیع النظر عالمی لیڈر تھے جن کے پیش نظر پورا عالم اسلام تھا۔ وہ جہاں مغرب کی کنہہ سے واقف تھے وہیں یہ بھی سمجھتے تھے کہ مغرب سے مقابلہ کے لئے تیاری نسل در نسل ہونی چاہئے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ جو ممالک مغربی استعمار کا شکار ہیں وہاں مسلمانوں کی ایسی لیڈرشپ ابھرنی چاہئے جس میں قومی غیرت کے ساتھ اپنے عصر سے بھی کماحقہ واقفیت ہو۔ وہ طبقہ علماء کو اہم سمجھتے تھے لیکن ان کی کوتاہ فکری سے بھی پریشان تھے۔ چنانچہ ان کی عملی زندگی میں جہاں درس وتدریس اور غور وفکر نظر آتا ہے وہیں خالص سیاسی مقاصد کے حصول میں شعوری کوششیں بھی واضح ہیں۔ دورِ جدید میں دینی مقاصد وتقاضوں کا فہم اور مغرب کے بڑھتے ہوئے اثرات کے پس منظر میں مسلم ملکوں کا نظم وانصرام بھی ان کی سرگرمیوں کا جز نظر آتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ ایک جدید امت واحدہ کے قیام کے حامی تھے اور اس مقصد کے لئے جو بھی راستہ اختیار کیا جاسکتا تھا اس کے لئے آخر تک کوشاں رہے۔ انھوں نے اس اعتبار سے آئندہ نسلوں کو متاثر کیا جس کا اظہار عالم عرب میں اخوان المسلموں کی علمی وسیاسی تحریک کی شکل میں ہوا اور یوں برصغیر کی تحریکِ اسلامی میں بھی اس کے اثرات واضح ہیں۔ ایران کے علماء اور وہاں کی سیاست بھی ان سے متاثر ہوئی۔ علماء اسلام کے رویّوں کے خلاف جمال الدین کی مستقل مزاحمت اور اپنے علم وفضل کی بنیاد پر مستقل علمی محاذ آرائی اور تنقید محض اس بنا پر جاری رہی کہ وہ دورِ جدید سے واقف ہونے کے باوجود اپنی اساس سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ جو اگر نہ ہوتی تو مذہبی حلقوں اور مذہب کے خلاف ان کا ردِّ عمل بھی وہی ہوتا جو ترکی میں اتاترک کا ہوا تھا۔ ان کے خیال میں مغرب جن فکری اور فنی قوتوں سے لیس ہوگیا تھا اور ہوتا جارہا تھا اس کا مقابلہ کرنے اور زیرِ تعمیر نئی دنیا میں باعزت مقام حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ غالب ہونے والی فکر کو سمجھیں اور قوت وتوانائی کے لئے اجاگر ہونے والے ذرائع میں مہارت حاصل کریں۔ اور ہماری تاریخ کے وہ مقامات اور واقعات جو علوم قرآنی میں فقہ، تفسیر اور احادیث سے آگے بڑھنے کی ضرورت کی نشاندہی کرتے اور انسانی فکر وتجربہ اور مشاہدہ پر مشتمل نتائج پر زور دیتے ہیں ان کی آبیاری کی جائے۔

حالات کے تجزیہ کے پس منظر میں سرسید نے مغربی علوم وفنون کو اپنانے اور نئی نسل کو ان کی تربیت دینے کی ضرورت کو محسوس کیا اور دینی مدرسوں کے بالمقابل مغربی طرز کی جدید تعلیم کو اپنی کاوشوں کا مرکز بنایا۔ سر سید سمجھتے تھے کہ امت مسلمہ کو دینی فکر متاثر کرتی، متحرک کرتی اور ترغیب بھی دیتی ہے اس لئے انھوں نے تفسیر

قرآن کے ذریعہ مسلمانوں کی جدید ذہن سازی کی کوششیں بھی کیں۔ان کی ان تعلیمی کوششوں کا ایک سادہ سا پہلو یہ بھی تھا کہ وقت کے نظام کو قائم کرنے اور اسے چلانے کے لئے جن کارکنوں کی ضرورت تھی وہ اسی تعلیمی نظام سے حاصل ہو سکتے تھے اور یوں برصغیر کے مسلمان جدید سیاسی نظام میں اپنی پوزیشن بحال کرنے میں کامیابی کی طرف گامزن ہو سکے۔لیکن اس تعلیمی نظام میں سب سے بڑی کمی یہ رہی کہ اس نے جہاں مغرب میں آزاد فکری اور تجربہ و مشاہدہ پر مبنی علوم وفنون کی آبیاری کے ذریعہ معاشی و معاشرتی علوم اور سائنسی ٹکنالوجی سے اپنی قوموں کو اقوام عالم میں لیڈرشپ مہیّا کی تھی عالم اسلام میں یہی نظام تعلیم محض پیروکار پیدا کر سکا۔ چنانچہ صحیح معنی میں حصول اقتدار اور قوت اور آزادی کے عظیم مقاصد حاصل نہ کئے جا سکے۔سرسید کے نظام تعلیم میں مذہب تھا ضرور لیکن وہ منجمد ہی تھا اور اس کی تعلیم بھی محض رسمی ہی تھی۔ مذہب میں تقلیدی فکر نہ صرف حاوی رہی بلکہ علوم جدید کو بھی اس نے متاثر کیا اور سائنس ہو یا سوشل سائنسز مسلمان مغرب کے جوئے کو اتار نہ سکے۔محض وفادار کارکنان پیدا کرتے رہے۔ان تمام علوم میں آج بھی مغرب ہی کو فرمانروائی اور رہنمائی کا مقام حاصل ہے مسلمان محض کاسہ لیسی کرتا نظر آتا ہے۔

ان دو حضرات ہی کے زمانہ میں ولی اللٰہی مکتبہ فکر نے جس میں علم وفکر اور تصوف کا ایک امتزاج پایا جاتا تھا۱۸۶۶ میں ہندوستان میں ایک مدرسہ کی شکل اختیار کر لی جس کے اثرات آج ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، بلکہ افغانستان، جنوبی افریقہ اور برطانیہ تک پہنچ چکے ہیں۔اس کے زعماء میں جہاں علم وفکر کی گہرائی تھی، تصوف بھی اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ بنیادی طور پر یہ مدرسہ ہندوستان میں انگریزوں اور انگریزی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات سے اسلام اور مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کی خاطر وجود میں آیا تھا۔جس کی حکمت عملی یہ تھی کہ قرآن وسنت سے متعلق وہ تمام علوم جو ماضی کے بزرگوں سے چلے آرہے ہیں۔انھیں جوں کا توں محفوظ رکھا جائے اور مسلم زندگی کے وہ تمام پہلو جو نجی نوعیت کے تھے ان میں دینی شناخت کی حفاظت کا مناسب انتظام کر لیا جائے تا کہ آنے والے دنوں میں مسلمانوں کی زندگی کا کم از کم یہ پہلو مغربی اثرات سے محفوظ رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ غلبہ واقتدار کی خواہش یہاں ختم نہیں ہوگئی تھی اور وقتاً فوقتاً اس کا اظہار بھی ہوتا رہا۔عبد الوہاب نجدی کی فکر جو غلبہ کے گرد گھومتی تھی وہ بھی ان کی سرگرمیوں کو تحریک دیتی رہی بلکہ ایک بار تو یہ اتنی غالب ہوئی کہ جب امیدوں کے برخلاف افغانستان کے شاہ امان اللہ نے دیوبندی نقشہ کے برخلاف حکومت کی تشکیل کرنی شروع کی تو ۱۹۲۰ کی دہائی میں انھوں نے انگریزوں سے ہتھیاروں اور دوسری طرح کی مددلیکر شاہ امان اللہ کو افغانستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

انفرادی زندگیاں تصوف زدہ، اجتماعی عمل میں درس وتدریس اور عزائم میں سیاسی مقاصد، ان سب نے ملکر دیوبندی تحریک کی عمومی شناخت کی تشکیل کی ہے اور خود ہندوستان کی آزادی میں بھی علماءِ دیوبند کا اس تحریک کا ساتھ دینا اسی فکر سے عبارت تھا۔ یہ بڑے اخلاص سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس زمانہ میں گمراہی سے بچنے

کے لئے ماضی کے بزرگوں کی تقلید صحیح راہ ہے۔اسی تحریک کی ایک اہم شاخ تبلیغی جماعت بھی ہے۔ جو صحیح معنی میں ایک عالمی تحریک بن چکی ہے۔ان کے یہاں حصول علم ہر ایک کے بس کی بات نہیں بلکہ عمل ہی اصل چیز ہے۔ چنانچہ عبادتیں اور ذکر وفکر ہی اس تحریک کی اصل ہے۔

دیوبندی فکر نے علماء میں جن رویّوں کی تشکیل کی اسکا ایک رخ ہم افغانستان کے شاہ امان اللہ کے خلاف ان کے ردِعمل میں دیکھ چکے ہیں۔اسی طرح جمال الدین افغانی نے جب ایران کے شیعی علماء کو تمبا کو بائیکاٹ میں شمولیت کے لیے تیار کرلیا تو ۱۹۰۶ میں شاہ مظفرالدین نے نہ صرف پارلیامنٹ قائم کردی بلکہ اپنے بہت سے اختیارات بھی کم کر لئے اور یوں تحریک کے مطالبات کو مان لینے کا عندیہ دیا اور اس طرح علماء اب اس تحریک سے علیحدہ ہو گئے۔لیکن کچھ ہی عرصہ میں بہت جلد بادشاہ نے پارلیامنٹ کو تحلیل کر دیا۔اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہ اصلاحات جدید طبقہ کی جانب سے کرائی جارہی تھیں اور ان کے سرخیل یہی جدید افراد بنے ہوئے تھے جو علماء کو بالکل بھی منظور نہ تھے۔ چنانچہ پارلیامنٹ کو تحلیل کرانے میں علماء نے بادشاہ کا بھر پور ساتھ دیا اور یوں جدید تبدیلی کی راہ میں علماء دیوار بن گئے۔اسی طرح بیسویں صدی میں عبدالوہاب نجدی کی فکر کے عرب نمائندے یورپیوں کے آلہ کار بن کر خلافت عثمانیہ سے علیحدگی اختیار کر بیٹھے اور یوں سعودی عربیہ عراق اور اردُن کی حکومتیں دنیا کے نقشہ میں ابھریں اور بالآخر اسرائیلی ریاست کے قیام پر منتج ہوئیں۔ گویا ان تمام معاملات میں علماء چاہے دیوبند کے ہوں، ایران کے یا عرب سب کا رویّہ تقریباً ایک ہی جیسا تھا۔خود ترکی میں جدید مطالبات کے خلاف ان کی طرف سے شدید ردِعمل ہوا تھا اور ہندوستان میں یہ طبقہ ہمیشہ جدید فکر کے حاملین سے نبرد آزما رہا۔

بیسویں صدی کے نصف اول کے ابتدائی دور میں علماء اور جدید فکر کے حاملین کی آپسی محاذ آرائی اور خود ان جدیدیوں کی اپنی علیحدہ علیحدہ ناکامیوں کے پس منظر میں تین شخصیتیں اہم ہیں جنھوں نے عالمی سطح پر زبردست اثرات چھوڑے۔علامہ اقبال، حسن البنا وسید قطب اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

علامہ اقبال نے بنیادی طور پر اپنی شاعری کے ذریعہ خوداعتمادی کی فضا پیدا کی اور مغرب پر انتہائی سنجیدہ علمی وفکری تنقید کے لئے بنیادیں استوار کیں۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ خود فکرِ اسلامی کی عصری جہتوں کی شناخت کے لئے موجود فکر پر گہری تنقید بھی کی۔اقبال اصلاً مسلم انسان کی داخلی قوتوں کے احیاء اور پھر خارج میں ان کے اظہار کے متمنی تھے جن کی طرف قرآن متوجہ کرتا، تصوف اس کی نظیر پیش کرتا اور عالمی اسلامی تاریخ میں جس کا اظہار ہوا۔ مذہب اور اسلام بالخصوص ایک تجربہ ہے جس سے ہر مسلمان بقدر استطاعت گذرتا ہے یہی اس کی داخلی دنیا کو آباد کرتا اور یہی اس کی اندرونی طاقت کا بہت بڑا ذریعہ بن جاتا ہے۔اپنی شاہکار نظم، قرطبہ میں وہ اپنے اس پیغام کو جو قلب ونظر اور بدن کو یکساں طور پر متحرک کرتا ہے، پیش کرتے نظر آتے ہیں۔اقبال نے نہ صرف برِصغیر بلکہ ایران کو شدت سے متاثر کیا اور وہ عالم اسلام کے ایک چہیتے شاعر بن گئے۔خود وہ کیونکہ مغرب سے راست واقف اور فکرِ جدید کو اندر سے دیکھے ہوئے تھے تو عالم اسلام کے جدیدیت پسندوں نے بھی ان سے

متعلق ہونے میں کوئی تکلف محسوس نہ کیا اور یوں ایک ایسا پلیٹ فارم تیار ہو گیا کہ جس میں قرآن کو دورِ جدید کے ایک ایسے پیغام کی حیثیت میں پیش کیا جا سکتا تھا جس پر قدیم و جدید فکر کے حاملین کم از کم غور ضرور کر سکتے تھے۔

مولانا مودودی ہوں یا حسن البنا اور سید قطب انھیں اسی سلسلہ کی ایک کڑی کے طور پر دیکھا جانا چاہئے۔ان حضرات کے افکار و خیالات جو جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون کے ذریعہ منظّم انداز میں عوام تک رسائی حاصل کر رہے تھے ان کی خاص بات یہ تھی کہ زندگی کا کوئی خاص پہلو نہیں بلکہ اسلام تمام مسائل کا حل پیش کرتا نظر آ رہا تھا۔ غالب فکر یعنی مغربی افکار اور تہذیب پر کڑی تنقید کے ساتھ اسلام بطور ایک فکر اور نظام حیات کے ابھر رہا تھا۔یعنی اسلام محض مسجدوں اور خانقاہوں تک نہیں بلکہ معاشرہ اور حکومت و سیاست، فکر و ادب اور قانون اور نظامِ اقدار کے متحرک اداروں کی شکل میں پیش ہو رہا تھا۔البتہ ایک بات تو یہ کہ جوش فکر کے غلبہ کی بنا پر یہ حضرات زبردست ناقد اور ان کے پیروکار نعرہ زن گروہ کی حیثیت سے آگے نہ بڑھ سکے اور جاہلیت کا جو تصور سید قطب اور مولانا مودودی کی فکریات سے ابھرا اس نے مغربی انسان کی ہر حصولیابی کو اسلام کے پیمانہ پر خارج از دین قرار دیا۔ غالب فکر اور تہذیب جو زندگی کے ہر ہر پہلو پر حاوی ہو چکی تھی، گمراہی اور جاہلیت کی علمبردار ٹھہری اور اس طرح مسلمان اور اسلام ایک بڑی مضحکہ خیز صورتحال سے دوچار ہو گئے ۔خود اپنے معاشروں میں ان کی پوزیشن مستحکم نہ تھی۔ روایتی دینی حلقہ حسبِ روایت ان کا مخالف ہوا۔ان کی فکریات کا ممتاز ترین پہلو دین کے غلبہ اور اس کے لئے حصول قوت کو جزوِ دین کی طرح پیش کرنا تھا۔ جنگ چاہے میدان جنگ میں ہو یا فکر و نظر کے میدان میں اس میں کامیابی دین کی صحت کی دلیل ہے یہ ان دونوں تحریکوں کا بنیادی مفروضہ ہے جس کی صحت اور اساس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن بہر حال یہ ایک استنباط ہی ہے۔ کم از کم جماعت اسلامی کی پوری فکر میں بالکل ابتدا ہی سے یہ پوری طرح حاوی نظر آتی ہے۔ یہ دونوں گروہ جہاں متحرک ہوئے برسرِ اقتدار طبقہ کے لئے ایک چیلنج بنے اور یوں جان و مال کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کی عظیم قربانیوں کے باوجود منزلِ ما دور است ۔لیکن ان تحریکات کا سب سے بڑا عطیہ امت کے لئے یہ تھا کہ قوم پرستی کے بڑھتے رجحان کے باوجود امت واحدہ کا تصور مضبوط ہوا۔قرآن اور مسلمانوں کے درمیان جو تاریخ حائل ہو گئی تھی اور درس و تدریس اور روایت کا ایک طویل سلسلہ جسے قائم رکھنے پر مصر تھا، اسے ان تحریکوں نے توڑ دیا اور اب مسلمان بالعموم قرآن سے براہ راست مستفید ہونے کے لئے کوشاں نظر آنے لگے۔ان دونوں گروہوں میں علم کو اصل اہمیت حاصل تھی۔ لیکن ایک بڑی تعجب خیز صورتحال یہ پیدا ہوئی کہ اخوان المسلمون میں سید قطب اور جماعت اسلامی میں مولانا مودودی کے بعد علمی روایت معدوم ہوتی گئی۔ میں سوچتا ہوں کہ شاید گروہ بندی اور جماعت سازی کے یہ فطری نتیجہ ہیں اور انھیں مسلک بن جانے میں بہت دیر نہیں لگتی۔ جماعتوں میں غالب نظریات سے اختلاف کرنا تو مشکل ہے ہی کسی مختلف علمی روایت کی نمو تو بالکل ناممکن ہے۔نتیجہ میں یہ تحریکات قربانیوں کے روشن چراغوں تلے مخلص کارکنوں کے کاندھوں پر سوار آج بھی موجود ہیں۔لیکن اخلاقی حالت ہو یا

فکری صورتحال مسلمانوں کی پوزیشن میں کوئی واضح تبدیلی نظر نہیں آتی بلکہ اس پہلو سے خود یہ گروہ بھی بڑی کمزوریوں کا شکار نظر آتے ہیں۔ ان دو تحریکوں نے جاہلیت جدیدہ کا جو تصور پیش کیا اس کے نتیجہ میں محض مغرب نہیں بلکہ وہ گروہ اور افراد جو عملی یا فکری طور سے ان سے اختلاف رکھتا تھا وہ اسلامیان کے اس گروہ کے نزدیک طاغوت اور جاہلیت کا ہمنوا ہو کر متحارب گروہ کا حصہ بن چکا تھا اور وقت نے دیکھا کہ ان تحریکوں سے نکلے ہوئے گروہوں نے ایسے افراد کو کفار کی مانند سمجھا اور روایتی کفار سے پہلے ان لوگوں کو قابل گردن زدنی سمجھا۔

سولہویں اور سترہویں صدی کی تین عظیم ترین سلطنتوں یعنی ہندوستان کے مغل، ایران کے صفوی اور خلافت عثمانیہ کے بعد کے ادوار میں یورپیوں کی دخل اندازی کے نتیجہ میں مسلم معاشرہ کی جو صورتحال نظر آتی ہے اور جس وجہ سے یہ صورتحال پیدا ہوئی اس کا فہم ان تحریکات کے علمبرداروں کے ذہنوں سے شاید اوجھل رہا۔ اس پہلو پر ذرا دوسرے رُخ سے غور کرتے ہیں۔

انبیا کرام کا مقصد دنیا میں دین کا اظہار اور دین کا قیام تھا ان تحریکوں نے اسی مقصد کو اپنی سرگرمیوں کا مطمح نظر بنایا۔ دیکھا جائے تو ان تحریکوں میں عصری شعور پایا جاتا تھا۔ لیکن صرف دین کے پیش کرنے اور اس سلسلہ میں دینی اعتبار سے ان کے حل کے سلسلہ میں کچھ اصولوں کی نشاندہی کرنے تک۔

رسول اللہؐ کے زمانہ میں اور پھر بعد کے دور میں بھی ایک طویل عرصہ تک صورتحال یہ رہی کہ رسول اللہؐ اور آپ کے حمایتیوں کا گروہ وحی اور اس سے مشتق علوم کی بنیاد پر اخلاق واقدار کے باب میں اپنے تمام ہم عصروں سے بہت آگے تھا۔ لیکن وہ علوم اور فنون جو دنیا کے قیام اور اہتمام وانصرام کے لئے ضروری ہوتے ہیں اور جن کی طرف قرآن کریم کچھ بالواسطہ اشارے کرتا ہے لیکن ان کو اپنے پیغام میں محور کی حیثیت نہیں دیتا رسول اللہ ﷺ کا یہ گروہ اپنے ہم عصروں سے کسی بھی طور ان میں پیچھے نہ تھا۔ مثلاً انفرادی طور پر ہر شخص ہتھیاروں اور ان کے استعمال کی تکنیک سے ایسے ہی واقف تھا جس طرح آپ کے مخالف گروہ کے افراد۔ تجارت اور اس کی حکمت عملی میں مخالف گروہ جو استعداد رکھتا تھا اسی استعداد کے حامل آپ خود بھی اور آپ کا گروہ بھی تھا۔ ملکی انتظام وانصرام اور ایک مختلف مذہبی تشخص رکھنے والے گروہوں کو کن بنیادوں پر نئی مملکت میں رکھا جائے، اس سلسلہ میں آپ کی استعداد دوسروں سے کہیں بہتر تھی۔ جنگی معاملات میں تکنیکی اعتبار سے آپ اور آپکے رفقاء کو اپنے ہم عصروں پر فوقیت حاصل ہوگئی تھی۔ آپکے وہ رفقاء جنھیں محض انفرادی اور قبائلی جنگیں لڑنے کا تجربہ تھا وہ بڑی بڑی فوجوں کے سپہ سالار بن چکے تھے اور اپنے وقت کی بڑی فوجوں اور سلطنتوں کو شکست سے دوچار کر چکے تھے۔

اللہ کے رسولؐ نے مدینہ آنے کے بعد تجارتی اصول وضوابط طے کئے اور ہفتہ واری بازار کے لئے جگہ مقرر فرمائی۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی الٰہی ہدایت قرآن کریم میں موجود نہیں تھی۔ سوائے چند اخلاقی اور روایتی ہدایتوں کے۔ گویا وحی پر مبنی علوم کے ساتھ انفرادی واجتماعی حیات ومعاشرہ کے لئے جو ضروری سیاسی،

معاشی اور حربی و عسکری وسائل تھے انھیں زندہ کیا اور منظم کیا۔ جیسا کہ اشارہ کیا گیا کہ اس اعتبار سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیاں بنیادی اعتبار سے کوئی فرق نہیں تھا۔ جنگ کے لئے جو ہتھیار دشمن استعمال کرتے تھے ویسے ہی مسلمان بھی استعمال کرتے تھے۔ جو جنگی تدبیریں مخالفین نے اپنائیں ان سے مسلمانوں کو بھی برابر کی آگہی حاصل تھی۔ اور بالکل یہی صورتحال انفرادی اور اجتماعی دوسرے مسائل میں بھی تھی۔ اور اس پس منظر میں جو قرآنی قانون بیان ہوا کہ اللہ تمہاری تعداد کی کمی پورا کریگا کہ تمہاری جماعت اپنے سے دوگنی جماعت پر غالب آجائے گی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اہل ایمان کے پاس ایمان کی طاقت کے ساتھ اگر صرف لاٹھیاں اور ڈنڈے ہونگے تو وہ مدِ مقابل کے تیر و تلوار اور خنجروں سے لیس سپاہیوں پر غالب ہونگے۔ یا وہ فن سپہ گری سے ناواقف ہونے کے باوجود مخالفین پر غالب آجائیں گے۔ نہیں! یہ شرط افرادی قوت کی کمی کے باوجود کامیابی کی ضمانت اس وقت دیتی ہے جب اہل ایمان کے پاس بھی تیر، تلوار اور خنجر نہ صرف موجود ہوں بلکہ انھیں استعمال کرنے کی تربیت بھی انھیں حاصل ہو۔

وقت گذرنے کے ساتھ اور کوئی سولہویں صدی آتے آتے یہ توازن بگڑنے لگا تھا۔ مسلمانوں کے پاس ایمانی قوت میں تو کمی آہی گئی تھی لیکن جدید ترقی کے نتیجہ میں عسکری توازن بھی بگڑنے لگا تھا۔ علمی ترقی کے نتیجہ میں نت نئے ہتھیار متعارف ہوگئے تھے۔ ان میں سے کچھ کو مسلمان صرف خرید سکتے تھے۔ انھیں تیار کرنے کا ملکہ ان کے پاس نہ تھا اور جب مقابلہ بھی انھیں قوتوں سے ہو جو ہتھیار بنا رہے تھے تو وہی ہتھیار انھیں سے خرید کر جنگ ہو یا پھر کسی بھی دوسرے میدان میں مقابلہ، نتیجہ مسلمانوں کے حق میں ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ توازن جو اللہ کے رسول کے زمانے میں اور بعد کی صدیوں تک قائم رہا وہ اب بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ اور یہ صورتحال زندگی کے ہر میدان میں ہوگئی تھی۔

علم کا تعلق اب ترقی و تجارت اور عسکری غلبہ سے قائم ہوگیا تھا۔ رسول اللہؐ نے ضمنی طور پر اور قرآن کریم نے براہ راست حربی و عسکری تیاری کے جس پہلو کی طرف توجہ دلائی تھی اس وقت معاشرہ کی کیفیت بھی یہی تھی کہ ان امور کی طرف محض ضمنی توجہ ہی دی جاسکتی تھی۔ اہل ایمان کے غلبہ کے لئے ہی نہیں بلکہ زمین پر باعزت اور آزادانہ قیام کے لئے انسانی صحت کی حفاظت اور انسانوں کی عمومی فلاح اور خیر کے لئے بھی ان امور پر توجہ دینا ضروری ہوگیا تھا۔

مذکورہ بالا اسلامی تحریکیں جنھوں نے غلبہ یا مسلمانوں کے اجتماعی قیام کے لئے اپنی کوششوں کو ہدف بنایا تھا، اس مذکورہ توازن کے قیام پر توجہ دیئے بغیر اپنے اہداف حاصل کر ہی نہیں سکتیں۔ جب بھی اور جس میدان میں بھی مقابلہ کا موقع آئے گا اہل ایمان اپنی ایمانی قوتوں پر اعلی مقام پر فائز ہونے کے باوجود مقابلہ میں ہار جائیں گے کہ شاید قانونِ الٰہی بھی یہی ہے۔

اسلامی دعوت کے ان پہلوؤں کو چھوڑ کر جن کا تذکرہ قرآن کریم وضاحت کے ساتھ کر رہا ہے اور

رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں جن پر واضح توجہ نظر آتی ہے باقی تمام امور علم کے جن سوتوں سے پھوٹتے ہیں اور جن کے نتائج کی بنیاد پر اہل ایمان مغلوب اور اغیار غالب ہیں، اب کما حقہ توجہ کے طلبگار ہیں۔ اکیسویں صدی میں غلبہ تو بڑی چیز ہے ایک آزاد وجود بھی علم وفن کی ترقی پر منحصر ہے۔ عسکری یا حربی ترقی، دواؤں کی تیاری، علاج و معالجہ کی حصولیابیاں، حمل ونقل کے ذرائع اور پیغام رسانی کی رفتار میں بے تحاشا اضافہ، مصنوعی ذہانت اور وہ تمام کام جنھیں انسانی بہبود کا نام دیا جاتا ہے ان سب کا تعلق اب علم وفن سے ہوگیا ہے۔ ترقی کے یہ تمام پہلو مل کر ہی آزاد وجود اور غلبہ کی ضمانت دیتے ہیں۔ لیکن اس پہلو سے مغرب اور مسلم اقوام کے درمیان بُعد بڑھتا ہی جارہا ہے۔ جسے دور کئے بغیر ہم اس پوزیشن میں نہیں آسکتے جہاں کم تعداد میں رہتے ہوئے بھی اپنے سے دوگنے پر غالب آسکیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی تحریکات یعنی اسلام کے احیاء اور دورِ جدید میں اس کے احیائے اقتدار کے لئے کام کرنے والوں نے اس بُعد کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی ہے۔ بلکہ اسے صرف انسانی فطری رجحانات کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک بنیادی غلطی ہے۔ یہ تمام علوم دراصل فرض کفایہ کے دائرہ میں آتے ہیں اور اسلامی تحریکات کو انھیں اسی درجہ میں رکھ کر اپنی سرگرمیوں کا حصہ بنانا چاہئے۔ میرے نزدیک غور وفکر اور بالخصوص مظاہر کائنات پر تفکر وتدبّر جس کی دعوت قرآن نے سینکڑوں جگہ دی ہے، خیر کے کاموں میں غیر مسلموں سے آگے رہنے اور مسابقت کرنے کی جو ہدایت قرآن دیتا ہے اور تکنیکی یعنی فنون کے ارتقاء کے بارے میں قرآن کریم کی عمومی توجہ وغیرہ ایسے امور میں جو اس صدی کی تحریکات کے ایجنڈے کا حصہ بننا چاہئیں۔ سرگرمیوں کا یہ دائرہ بنیادی طور پر مذہبی عمل کا دائرہ ہے۔ میرا مدّعا بھی یہی ہے کہ فکری یافت کے ساتھ تہذیبی ارتقاء کا حصول ضروری ہے جو سیاسی مقتدرہ کے بغیر بھی ممکن ہے۔ جدید دور کی سول سوسائٹی کی سرگرمیوں نے بھی یہ ثابت کردیا کہ تحریکات اسلامی کے بہت سے اہداف جو پہلے کبھی سیاسی قوت کے منت کش ہوا کرتے تھے وہ اب سول سوسائٹی کے طرز پر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

اسلامی سرگرمیوں میں ان اہداف کی شمولیت کی وکالت ایک بار پھر ہمیں اس سوال سے دوچار کردیتی ہے جس سے ہم نے آغاز کیا تھا۔ یعنی قرآن کریم ہم سے چاہتا کیا ہے؟ یعنی پیغام رسانی اور دعوت یا فرد اور دنیا پر اس کے قیام کے ذریعہ حق کی شہادت۔ راقم کے خیال میں پیغام رسانی یا دعوت سرگرمیوں کو جو رخ دیتی ہے وہ حق کی عملی شہادت کو مطمح نظر بنانے سے یقیناً مختلف ہوگا۔

تعارف

اپنے آبائی وطن مسلم افغانستان میں سنِ شعور کو پہنچتے پہنچتے عالمی تاریخ کا وہ بالکل مختلف اور دوسرا بیانیہ مجھ پر خاصا منکشف ہو چکا تھا جسے اس عمر کے یورپی اور امریکی زیرِ تعلیم بچے بس معمولاً ہی سنتے ہیں۔ لیکن یہ عمر ایسی نہ تھی کہ یہ انکشاف میری فکر اور سوچ کو متاثر کر سکے۔ اس وقت تاریخ میں میری دلچسپی تو محض ایک تفریحی مشغلہ تھی اور ویسے بھی فارسی میں سوائے خشک اور غیر دلچسپ کتابوں کے پڑھنے کے لئے کچھ تھا بھی نہیں۔ اچھا مواد صرف انگریزی ہی میں دستیاب تھا۔

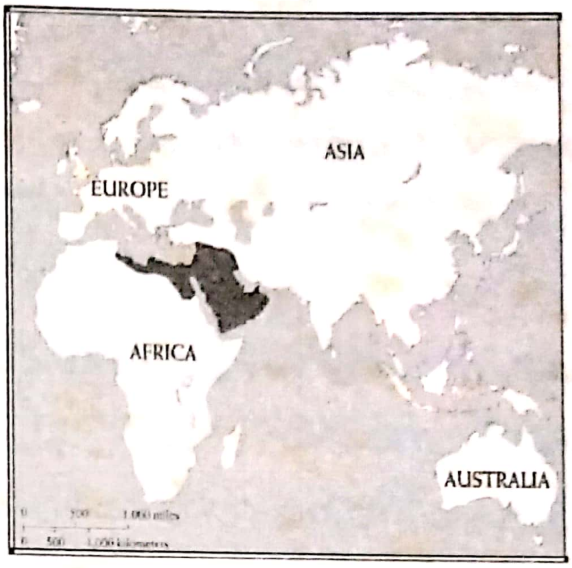
مجھے یاد ہے کہ اس وقت سب سے دلچسپ اور مزیدار کتاب کسی V.V. Hillyer کی تصنیف *Child's History of the World* لگی تھی لیکن یہ دلچسپی اس وقت تک ہی رہی جب کئی سال کے بعد شعور ذرا پختہ ہوا اور دوبارہ اس کا مطالعہ کیا۔ اب سمجھ میں آیا کہ یہ کتاب انتہائی درجہ کی یورپ زدگی کا مظہر تھی اور نسل پرستی کس کس طرح اس میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی۔ اس کتاب کے یہ میلانات بچپن میں مجھ پر یوں بھی ظاہر نہ ہو سکے تھے کہ Hillyer ایک بڑا ہی اچھا داستان گو تھا اور کہانی انتہائی دلچسپ انداز میں پیش کی تھی۔

میں کوئی نو یا دس سال کا رہا ہونگا کہ مشہور مورخ آرنلڈ ٹائنبی اپنے ایک سفر کے دوران میری جائے سکونت لشکر گاہ سے گذرا۔ شاید کسی نے ذکر کر دیا تھا کہ اس شہر میں ایک افغان بچہ کو تاریخ کا بڑا شوق ہے۔ ٹائنبی کے لئے یہ اطلاع دلچسپی سے خالی نہ تھی اور اس نے مجھے چائے پر بلا لیا۔ ایک سرخ سفید لیکن خاصے مزّین برطانوی اشرافیہ کے نمائندہ کے ساتھ بیٹھا اور اس کے مشفقانہ سوالات کے جواب میں شرمیلے انداز اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں دیتا رہا۔ اُس وقت اس عظیم مورخ کی ایک ہی بات میں نے نوٹ کی۔ وہ اپنے رومال کو آستین کے اندر رکھتا تھا۔ مجھے بڑا عجیب سا لگا تھا۔

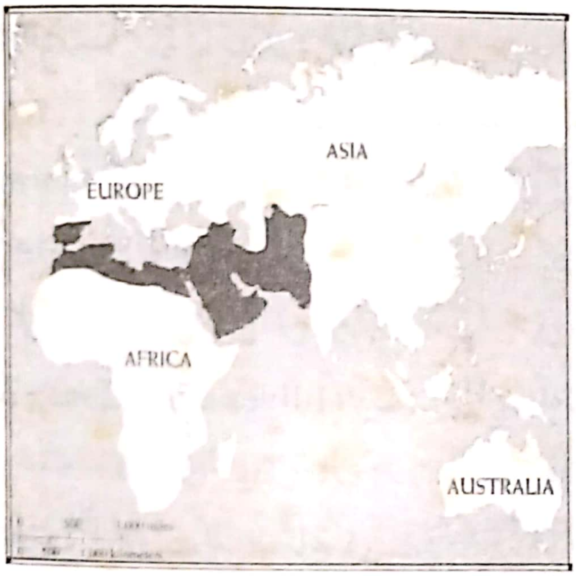
ٹائنبی رخصت ہونے لگے تو ایک تحفہ دیا۔ Hendrick William Van Loons کی *The Story of Mankind* محض ٹائٹل ہی نے چونکا دیا تھا۔ بنیادی خیال یہ تھا کہ تمام انسانوں کی کہانی ایک ہی ہے۔ کیوں؟ میں خود بھی تو انھیں انسانوں کا حصّہ ہوں۔ تو اس پوری اور بڑی کہانی میں میں بھی کہیں بیٹھا ہوا ہوں۔ شاید یہ تمام انسانوں پر محیط میری اپنی کہانی بھی ہے۔ بس میں نے اسے نگل ہی لیا۔ یہ کتاب میری پسند بن گئی اور اس کے بعد تاریخ عالم کا مغربی بیانیہ ہی میرا فکری فریم بن گیا۔ اور جو بھی تاریخ یا تاریخی واقعات اس کے بعد میرے مطالعہ میں آئے وہ اسی فریم کی وضاحت اور اس کے زیرِ اثر میری ذہنی تشکیل میں اضافہ کرتے



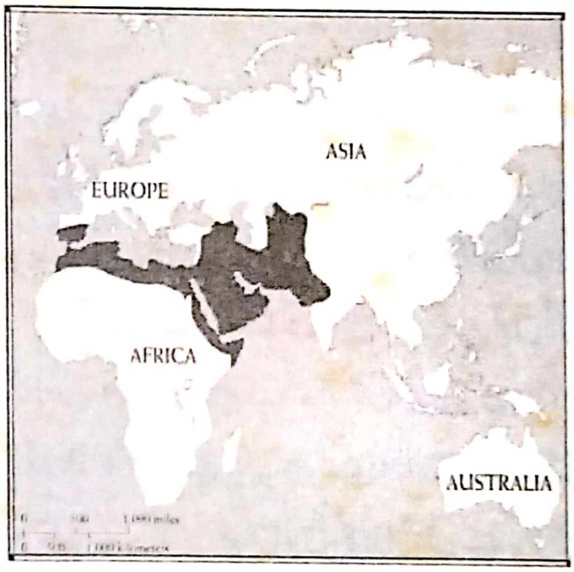
c. 632



c. 650



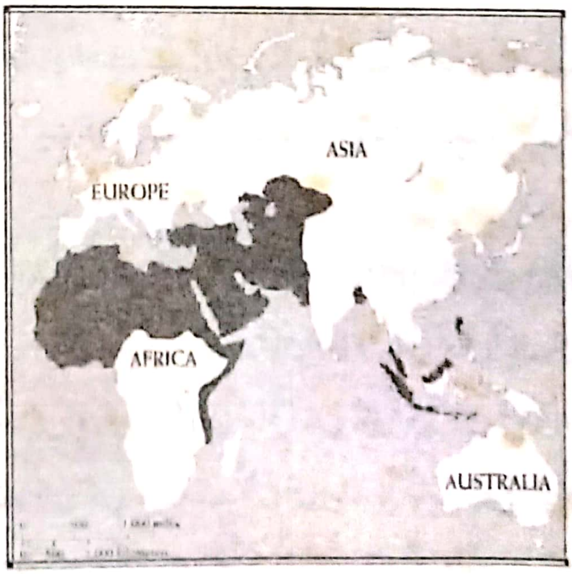
c. 750



c. 1150



c. 1550



اسلام کا ارتقاء

گئے۔ اساتذہ کے کہنے پر فارسی زبان میں تاریخ کی کتابیں میں اب بھی پڑھتا تھا۔لیکن محض امتحان میں پاس ہونے کے لئے جو ظاہر ہے کہ بہت جلد ذہن سے خارج ہو جاتی تھیں۔

لیکن تاریخ کے بعض دوسرے دبے دبے بیانیے ضرور میرے ذہن میں رہے ہونگے جب ہی تو کوئی چالیس کے بعد سن دو ہزار کے پت جھڑوں میں ایک پروجیکٹ پر کام کرتے ہوئے یہ بیانیے گویا بارش کی مانند میرے ذہن میں آنے لگے۔ ہوا یہ تھا کہ امریکہ میں ایک درسی کتاب کے اڈیٹر کی ذمہ داری مجھے دی گئی تھی۔ چنانچہ اسکولی سطح کی کتابوں کے ایک اشاعتی ادارے نے ہائی اسکول کے لئے ایک عالمی تاریخ پر نئی کتاب کی تیاری کے لئے مجھے ذمہ داری سونپی۔ مجھے بالکل نئے انداز سے لکھنا تھا اور ابتدائی مواد بھی موجود نہ تھا۔ پہلا کام اس کتاب کے مشتملات کے خاکے کی تیاری تھا جس کے بعد انسانی تاریخ کے ایک مجموعی تاثر کا تعارف پیش کرنا تھا۔ مجھے صرف کتاب کے خاکے کے بارے میں معلومات دی گئی تھیں جسے اسکولی نظامِ تعلیم کے وژن کے مطابق ہونا چاہیئے تھا۔ پبلشر کی خواہش تھی کہ کتاب میں دس یونٹ ہوں اور ہر یونٹ میں تین باب ہونے چاہئیں۔ گویا کل تیس حصّے۔

لیکن سوال یہ تھا کہ ان تیس حصّوں میں پوری تاریخ کو تقسیم کس طرح کیا جائے؟ عالمی تاریخ ہر اس احمقانہ واقعہ کی ترتیب وار تاریخ تو ہے نہیں جو کسی بھی وقت اور مقام پر واقع ہوا ہو۔ یہ تو محض انتہائی اہم اور نتیجہ خیز واقعات کی روداد ہے جنکا انتخاب اور ترتیب کہانی کے اس قوس کو ظاہر کر دیتا ہے جس سے کہانی کا دائرہ واضح ہو جاتا ہے۔ تو اصل اہمیت اس قوس کی ہی ہے۔

یہ ایک فکری الجھن تو تھی لیکن میں نے بڑے ذوق وشوق سے اس کا بیڑا اُٹھایا۔ البتہ اس سے متعلق میرے تمام فیصلوں کو مشیروں کے اس سلسلہ سے گذرنا تھا جس میں ماہرین نصاب، تاریخ کے اساتذہ، کتابوں کے تاجر، ریاستی تعلیمی ذمہ داران، پیشہ ور اسکالرز اور ان کے علاوہ دوسرے قابل افراد شامل تھے۔ ہائی اسکول کی سطح تک اس نوع کی طباعتی اور اشاعتی کاوشوں میں یہ عام طریقہ کار ہے۔ اور دیکھا جائے تو یہ اچھا ہی ہے کیونکہ اس سطح کی کتابوں کا اصل مقصد تصورات کو چیلنج کرنا نہیں بلکہ معاشرہ میں تازہ ترین معلومات کی سچائی کی وضاحت اور اس کا تعارف کرانا ہوتا ہے۔ البتہ یہ بات تسلیم کرنا چاہیئے کہ مشیروں کی یہ بڑی تعداد اس لئے ضروری تھی کہ مختلف مراحل سے گزر کر آنے والا پروڈکٹ جدید اور عصری نصاب کے معیار پر پورا اتر سکے۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو کتاب کی فروخت ہی نہ ہو سکے گی۔

لیکن جیسے جیسے ہم مختلف مراحل سے گذرے مجھے اندازہ ہوا کہ مشیروں کے درمیان ایک قسم کی کھینچا تانی پیدا ہو گئی ہے۔ ویسے تو ہم تقریباً ہر بات پر متفق ہو چکے تھے لیکن میری خواہش تھی کہ تاریخ عالم کے بیان میں اسلام کے ذکر کو زیادہ جگہ حاصل ہو جبکہ مشیروں کا یہ خیال کہ اسے کم سے کم رکھا جانا چاہیئے اور اگر زیادہ ہی ضروری ہو تو دوسرے موضوعات کے ساتھ اسے مزید لیکن ضمناً شامل کر دیا جائے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی کھل کر اپنی تہذیب کی طرفداری نہیں کر رہا تھا۔ اور نہ ہی کوئی یہ کہہ رہا تھا کہ مغرب کے مقابلہ میں اسلام بہتر ہے

یا کمتر۔ ہم سب دراصل اپنی بہترین کاوشوں کو اس مقصد پر مرتکز کئے ہوئے تھے کہ پوری تاریخ میں ان واقعات کی نشاندہی ہو سکے جنھوں نے عالم انسانیت کو مقابلتاً سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔

میرا کیونکہ ایک اقلیتی نقطہ نظر تھا جس میں ممکنہ غلطی کی شناخت ذرا مشکل تھی لیکن جب تمام کوششوں کے نتیجہ میں مشتملات کا ٹیبل تیار ہو گیا تو کل تیس ابواب میں اسلام محض ایک باب کا مرکزی موضوع بن سکا۔ اور اس میں بھی تین میں سے دوسرے دو موضوعات امریکہ کی Pre-Columbian تہذیب اور قدیم افریقی سلطنت سے متعلق تھے۔

لیکن یہ انتہائی محدود مباحثہ بھی خاصا پھیل گیا تھا۔ اسی پروگرام کے تحت جو نصابی کتاب اس سے قبل شائع ہوئی تھی وہ سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب یعنی best selling کا معیار حاصل کر چکی تھی۔ اس سے قبل *Perspective on the Past* جو 1997 میں شائع ہوئی اس میں کل ۳۷ ابواب میں سے اسلام کو محض ایک باب میں جگہ ملی تھی وہ The Middle Ages کے نام سے تھا جس میں کوئی نصف باب بازنطینی سلطنت کے تذکرہ پر مشتمل تھا۔ مختصراً ۱۱ ستمبر 2001 سے کوئی ایک سال سے بھی کم عرصہ قبل مشیران کار اس نقطۂ نظر پر متفق تھے کہ اسلام کا ظہور کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا اور نشاۃِ ثانیہ سے خاصہ عرصہ قبل ہی اس کے اثرات معدوم ہو چکے تھے۔ بلکہ اگر آپ کو ہمارے طے کئے گئے مشتملات کی فہرست دیکھنے کا موقع مل جائے تو محسوس ہو گا کہ شاید اسلام کا وجود بھی نہیں۔

اس وقت میں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ شاید میرا ہی نقطہ نظر کچھ کمزور ہے کیونکہ اسلام سے میری وابستگی تھی اور میں شخصیت اور شناخت میں اسلام سے متاثر تھا۔ اتنا ہی نہیں کہ میری پرورش ایک مسلم ملک میں ہوئی تھی بلکہ ایک ایسے خاندان سے میرا تعلق تھا جو ایک وقت میں افغانستان کا ایک معتبر اور محترم خاندان محض اپنے تقویٰ اور علوم دینیہ سے گہرے تعلق کی بنا پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ ہم لوگوں کے نام کے آخر میں 'انصاری' کا لاحقہ اہل مدینہ کے انصار قبیلہ سے ہمارے تعلق کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس شہر میں رسول اللہ کے ہجرت کرنے پر ان کے مددگار بنے تھے۔ رسول اللہ جب اہل مکہؔ کے اس فیصلہ سے جس کے تحت آپ کو قتل کر دیا جانا تھا بچ کر مدینہ آئے تو اسی قبیلہ انصار کی مدد کی بنا پر آپ کا قیام یہاں ممکن ہو سکا اور آپکا مشن بھی قائم رہا۔

کچھ ہی عرصہ قبل میرے دادا کے پردادا یہاں کے مقامی صوفی کی حیثیت سے ایک قابل احترام شخصیت تسلیم کئے جاتے تھے۔ جن کے مقبرہ پر آج بھی سینکڑوں معتقدین حاضری دیتے ہیں۔ ان کا یہ روحانی ورثہ میرے والد کے وقت تک جاری رہا اور یوں ہمارا خاندان بھی اسی اعتبار سے ایک معتبر مقام پر فائز رہا اور ہمارے اوپر یہ لازمی سا ہو گیا کہ ان تمام معاملات میں ہمارا علم عوام کے مقابلہ زیادہ اور معتبر ہو۔ ماحول ایسا ہی تھا جس میں مسلمان بزرگوں کے واقعات اور قصے کانوں میں پڑتے رہتے تھے جو بتدریج میرے اندر رچ بس گئے تھے حالانکہ میرا مزاج سیکولر فکر کا حامل ہو گیا تھا۔

امریکہ آ کر بس جانے تک یہ سیکولر ہی رہا لیکن اسلام میں میری دلچسپی یہاں آ کر بڑھ گئی گو کہ مسلم ملک میں رہتے ہوئے اسلام میرا موضوع بھی نہ تھا۔ 1979 کے بعد یہ دلچسپی اور گہری ہوتی گئی اور بالخصوص اس وقت جب میرے بھائی نے بنیاد پرستی کو اپنالیا۔ اس دوران میں نے فضل الرحمن اور سید حسین نصر کا مطالعہ تو کیا ہی بلکہ اسلامی تاریخ Ernst Gruneyam اور Albert Hourani جیسے اسکالرز سے پڑھی۔ مقصد یہ سمجھنا تھا کہ میں اور میرا بھائی آئے کہاں سے اور بنیاد پرستی کو اپنا کر میرا بھائی کس راہ پر گامزن ہو گیا ہے۔

اسلام سے میری ذاتی وابستگی کے پس منظر میں میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ممکن ہے کہ اسلام کی اہمیت کے بارے میں مبالغہ یا خوش فہمی میری رائے میں در آئی ہو اور یوں ادنیٰ سا شبہ ضرور رہا کہ کہیں میرا نقطہ نظر پورے طور پر معروضیت سے محروم تو نہیں۔ لیکن ذرا دنیا کے ان چھ نقشوں پر نظر ڈالیں جو مختلف زمانوں میں دنیا میں اسلام کی پوزیشن کی وضاحت کرتے نظر آتے ہیں۔

'عالم اسلام' سے میری مراد وہ مسلم معاشرے ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں یا حکمراں ہیں۔ البتہ مسلمان تو انگلینڈ، فرانس، اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اور دنیا کے تقریباً ہر حصہ میں موجود ہیں لیکن اس بنا پر لندن، پیرس، اور نیو یارک کو عالم اسلام کا ایک حصہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اگر محدود نقطہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو کیا گذشتہ صدیوں میں اسلام ایک اہم عالمی حقیقت نہیں رہا؟ یا کیا آج ایسا نہیں ہے؟۔ ایشیائی اور افریقی زمینیں ہوں یا یورپ اور مشرقی ایشیا کے درمیان کا موجود زبردست بفر علاقہ آخر اس سے کس بڑی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے؟ یورپ اور ریاستہائے متحدہ کا کل رقبہ بھی عالم اسلام کے مقابلہ میں کم ہے۔ ماضی میں یہ علاقہ ایک واحد سیاسی مقتدرہ رہا ہے جس کی انفرادیت اور سیاسی وحدت کی یاد آج بھی بہت سے مسلمان دلوں کی دھڑکنوں کو تیز کر دیتی ہے۔ ان چھ نقشوں پر ایک اور نظر ڈالیں تو کیا تعجب نہیں ہوتا کہ ۹/۱۱ کے باوجود کوئی آخر کس طرح تاریخ عالم کے اسٹیج پر اسلام کے اہم رول کا انکار کر سکتا ہے۔

۹/۱۱ نے شعور اور ادراک کی دنیا کو تہہ و بالا کر دیا۔ مغرب کے غیر مسلم یہ سوال کرنے لگے کہ اسلام آخر ہے کیا؟ یہ لوگ کون ہیں اور کیا کرتے رہتے ہیں؟ یہی سوالات میرے اطراف میں بھی بڑی شدت سے اٹھنے لگے۔ اسی سال کوئی بیس سال کے بعد پہلی بار مجھے پاکستان اور افغانستان جانا ہوا تو اپنے ساتھ لندن کے ایک سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی دکان سے آنجہانی Wilfred Countwell Smith جو میک گل اور ہارورڈ میں مذہبیات کے پروفیسر رہے ہیں کی کتاب *Islam and Modern History* بھی لے گیا۔ Smith کی یہ کتاب 1957 میں شائع ہوئی تھی۔ یعنی جس جدید تاریخ کا ذکر انھوں نے اس کتاب میں کیا تھا وہ کوئی چالیس سال قبل اختتام پذیر ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کا تجزیہ میرے لئے حیرت انگیز اور غیر معمولی تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس نے میرے ذہن کو خاصی اتھل پتھل سے دوچار کر دیا۔ یہ تجزیہ اس تاریخ سے برمحل تھا جو 2002 کے بعد منکشف ہو رہی تھی۔

اسمتھ نے میری بچپن اور بعد کے مطالعات پر مشتمل معلومات پر نئی روشنی ڈالی تھی۔ مثلاً کابل میں اسکول سے وابستگی ہی کے وقت سے میں جمال الدین افغانی کے نام سے بخوبی واقف تھا اور عام تصور کے مطابق میں سمجھتا تھا کہ جدید اسلامی تاریخ میں افغانی ایک عظیم المرتبت شخصیت تھے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ مجھے یہ بالکل بھی معلوم نہ تھا کہ انھوں نے کن مراحل سے گذر کر یہ شہرت حاصل کی تھی۔ بس اتنا معلوم تھا کہ وہ پین اسلامزم کے علمبردار تھے جو میرے فہم کے مطابق مسلمانوں کی بے رونق اور ماند پڑتی ہوئی شاونیت اور وطن دوستی کے احیاء کے مترادف تھی۔ لیکن اسمتھ کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ اسلامزم یعنی اسلام کی سیاسی تصویر آج 2001 میں جس کا ہر طرف چرچا ہے اس کا اصل خالق یہی دانشور تھا جسے اسلامزم کا کارل مارکس کہیں تو شاید بے جا نہ ہو۔ چنانچہ غیر مسلموں کی اکثریت اس کے نام سے ناواقف کیسے رہ سکتی تھی؟

تاریخ اسلام میں اب میری ازسرنو کھوج اپنی ذاتی شناخت کی مزید وضاحت کے لئے نہیں بلکہ میرے عہد کے مسلمانوں میں جو بھیانک اور پریشان کن تبدیلیاں آ رہی تھیں ان کے سلسلہ میں ایک زاویہ نگاہ کی تلاش اور اس کی توجیہ کے لئے تھی۔ افغانستان سے آنے والی وحشت ناک کہانیاں، ایران میں انتشار، الجزائر میں بغاوت اور اسی طرح فلپائن اور دوسرے مقامات، ہائی جیک اور سوسائڈ بمنگ کے مشرق وسطیٰ میں واقعات، سیاسی اسلام میں بڑھتا ہوا سخت گیر رجحان اور اب طالبان کی آمد، تاریخ کا ایک سنجیدہ اور دور بینی سے کیا جانے والا مطالعہ یقیناً یہ ظاہر کر سکے گا کہ آخر کیوں اور کیسے ہم اس مقام تک پہنچے ہیں۔

اور بتدریج ہی یہ سمجھ میں آیا کہ سرزمین اسلام کی تاریخ ذرا مختلف کیوں ہے۔ فرانس، مالٹا، جنوبی امریکہ کی طرح یہ دنیا کی متحدہ تاریخ کے ایک جز کی مانند نہیں جس کا یہ سب حصّہ ہیں۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اپنے آپ میں دنیا کی ایک متبادل تاریخ کی مانند ہے جسے میں نے ٹھیک اس کے ایک پبلشر کے لئے تجویز کیا تھا۔ کچھ اسی سے مماثل اور کچھ اس کے مشابہ یا پھر Mc Dougall-Littell کی اس اشاعت کی مانند جس کے لئے میں نے اسلام پر بعض ابواب لکھے تھے۔

ان دونوں مذکورہ تاریخوں کا ایک ہی علاقہ سے آغاز ہوا۔ یعنی قدیم عراق کے دو دریاؤں دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقوں سے اور بالآخر اس مقام پر واپس بھی آ گئیں۔ یعنی آج کی عالمی کشاکش جو مغرب اور عالم اسلام میں جاری ہے اور جس میں عالم اسلام زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ اس دوران یہ تاریخ مختلف لیکن حیران کن حد تک متوازی پیش منظروں سے گذرتی رہی ہے۔

ہاں! حیران کن حد تک متوازی، مثال کے طور پر اگر ماضی کو دیکھیں تو خود مغربی دنیا کے تاریخی فریم کی حامل ایک عظیم سلطنت جو باقی سبھی پر حاوی تھی قدیم سلطنت روما ہے جہاں ایک یونیورسل سیاسی ریاست کا خواب تشکیل پایا تھا۔

عالم اسلام میں پیچھے جا کر کہیں بھی دیکھیں تو ایک منفرد اور واضح عظیم سلطنت کا تصوّر نمایاں ہے جس

میں عالمگیریت اور آفاقیت کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ البتہ یہ روم میں نہیں بلکہ ابتدائی دور کی اسلامی خلافت میں ہے۔ یہ دونوں تاریخیں ایک دلچسپ مماثلت لئے ہوئے ہیں۔ مثلاً عظیم سلطنت روما محض اس بناء پر انتشار کا شکار ہوئی کہ بہت وسیع ہونے کے بناء پر اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی اور پھر منتشر ہوتی ہوئی سلطنت میں شمال کے وحشی صحرانوردوں نے تباہی مچائی۔ عالم اسلام کو اس صورتحال سے دوچار کرنے والے وسطی ایشیا سے متعلق تھے اور یہ جرمن نژاد نہیں بلکہ ترک تھے۔ ان دونوں عظیم سلطنتوں کا حال بھی ایک ہی جیسا ہوا۔ ٹوٹنے اور بکھرنے کے بعد یہاں چھوٹی چھوٹی بادشاہتیں قائم ہو گئیں جنھیں ایک مذہبی فکری دھارے نے باندھے رکھا۔ مغرب میں یہ دھارا کیتھولزم تھا اور مشرق میں اسلام کا سنّی روپ۔

عالمی تاریخ ایک ایسی روداد ہے جو یہ بتاتی ہے کہ ہم آج جس مقام پر ہیں وہاں کس طرح پہنچے ہیں؟۔ لیکن یہ روداد پوری طرح اس وقت تک واضح نہیں ہو پاتی جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو جائے کہ اس میں 'ہم' سے مراد کیا ہے اور 'مقام' کس مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مغربی عالمی تاریخ میں روایتاً یہ تسلیم کر لیا گیا کہ مقام سے مراد جمہوری یا صنعتی یا مابعد صنعتی تہذیب ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ایک دوسرے مفروضہ کے تحت عالمی تاریخ اس کے اپنے تصورات یعنی آزادی اور مساوات پر مشتمل ایک عالمی طاقت بن جانے اور کرۂ ارض کو مستقبل کی طرف گامزن کرنے سے عبارت ہے۔ یہ نقطہ نظر تاریخ کو ایک خاص رخ دیتا ہے اور منزلِ مقصود کو اسی راستہ میں کہیں متعین کر دیتا ہے جس پر آج ہمارا سفر جاری ہے۔ اور نتیجہ میں ہم ایک مفروضہ کے اسیر ہو جاتے ہیں جس کے تحت دنیا کے تمام ہی لوگ اسی راستہ کے ہم سفر نظر آتے ہیں۔ اگر کچھ لوگ شامل نہیں نظر آتے تو یا تو انھوں نے سفر کا آغاز تاخیر سے کیا ہوتا ہے یا پھر وہ سست روی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اور اسی بنا پر ان اقوام کو ہم ترقی پذیر اقوام کہتے ہیں۔

جب مابعد صنعتی دور کے مغربی جمہوری معاشرے کے اس مثالی مستقبل کو تاریخ کی منزل مقصود تسلیم کر لیا جائے تو تاریخ کے بیانیہ میں مقام کی وضاحت درجہ ذیل واقعات سے ہوتی ہے۔

۱۔ ابتداءِ تہذیب مصر اور عراق کے حوالے سے

۲۔ عہد قدیم میں یونان و روم

۳۔ عہد عتیق (دورِ تاریکی یعنی مسیحیت کا ارتقاء)

۴۔ پیدائش ثانی یعنی نشاۃِ ثانیہ اور اصلاحات

۵۔ دور تجلی یعنی جستجو اور سائنس کا دور

۶۔ انقلاب بشمول جمہوری، صنعتی اور ٹکنالوجیکل

۷۔ قومی حکومتوں کا ارتقاء (سلطنت کے لئے جدوجہد)

۸۔ جنگ عظیم اول اور دوم

۹۔ سرد جنگ

۱۰۔ جمہوری سرمایہ داریت کی فتح

لیکن ذرا غور کریں۔ ان مذکورہ واقعات کو اگر اسلامی نظر سے دیکھا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم مغربی کرتب بازی سے عبارت اس کے موقف کی تائید کر سکتے ہیں؟ یعنی ہم بھی ذرا سست روی سے، ہی سہی اسی منزل کے راہی ہیں جہاں مغرب پہنچنا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ ہمارا نقطۂ آغاز مختلف ہے اور اس نقطۂ آغاز سے قبل اور بعد کے کئی حوالوں سے ہمارا بیانیہ بامعنی ہوتا ہے اور یہ نقطہ ہے رسول اللہ کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت جس کے نتیجہ میں مسلم کیمونٹی کا ظہور ہوا۔ ہمارے نزدیک یہی کیمونٹی دراصل مہذب ہونے کی علامت ہے اور اسے بہتر سے بہتر کرنے کی جستجو ہی نے ہماری تاریخ کو ایک خاص رخ اور شکل عطا کی ہے۔

البتہ گذشتہ چند صدیوں کے دوران ایسا لگتا ہے کہ کہیں وقت کے دھارے میں کوئی اجنبی سا عنصر شامل ہو گیا ہے۔ روانی اور بہاؤ میں پانی کا راستہ کچھ ترچھا سا ہو گیا ہے۔ وسعت پذیر کیمونٹی ٹھٹھر سی گئی ہے۔ کنفیوزن کا شکار ہو گئی ہے۔ اس کی اپنی تاریخ کے دھارے میں کوئی ایسی انتشار انگیز رو شامل ہو گئی ہے جو اس کے رخ کو بدلنے کے درپے ہے۔ مسلم روایت کے امین کی حیثیت سے یہ مجبور کر رہی ہے کہ ہم اپنی تاریخ کی معنویت کو فتح و کامرانیوں میں نہیں بلکہ ناکامی اور شکست میں تلاش کریں۔ اس کے نتیجہ میں ایک ایسے ہیجان میں مبتلا ہونے کا پورا امکان ہے جو ہمارے تاریخ کے دھارے میں شامل رہنے کے لئے مہذّب ہونے کی ہماری تعریف ہی بدل ڈالے۔ اور یہ امکان بھی ہے کہ ہم تاریخ کے اس رخ پر بہاؤ کا مقابلہ کرتے ہوئے اسے اپنی تہذیب کی امانت کا حامل رکھنے میں کامیاب رہیں۔

مغرب سے تراشیدہ حال، جس کے تجربہ سے آج کی مسلم سوسائٹی گذر رہی ہے اسے اگر ہم وہ "مقام" تسلیم کر لیں جس کی توجیہ عالمی تاریخ کا بیانیہ کر سکے تو اسے درج ذیل چھوٹے چھوٹے مقامات سے گذرتا ہوا دیکھیں گے۔

۱۔ عہد قدیم۔ میسوپٹامیا اور ایران کا علاقہ
۲۔ اسلام کا آغاز
۳۔ خلافت: آفاقی اتحاد کی تلاش
۴۔ انتشار یعنی سلطنتوں کا ظہور
۵۔ تباہی۔ صلیبی جنگیں اور منگولوں کے حملے
۶۔ حیات نو یعنی تین شہنشاہیتوں کا عہد
۷۔ مغرب کی مشرق میں نفوذ پذیری
۸۔ تحریک اصلاح
۹۔ جدید سیکولر ذہن کی کامیابی
۱۰۔ اسلام کا ردّ عمل

ایڈورڈ سعید کا کہنا ہے کہ مغرب نے صدیوں سے عالم اسلام کے بارے میں ایک مستشرقانہ تصور پیدا کر دیا ہے جس میں ایک گھناؤنا تصور یہ ہے کہ وہ جیسے نظر آتے ہیں ویسے نہیں ہیں۔ اس تصور کے ساتھ ان کی زوال آمادہ شان وشوکت سے حسد انگیزی بھی شامل ہوگئی ہے۔ یہ بات اس حد تک تو صحیح ہے کہ شاید اسلام مغربی دنیا میں اسی طرح متعارف ہوا ہے۔

لیکن میرے نزدیک حیرتناک امر یہ ہے کہ مغرب میں اسلام کا اظہار کسی بھی طور ہوا ہی نہیں۔ مثلاً شیکسپیئر کے زمانہ میں ممتاز ترین عالمی طاقتیں اسلام سے وابستہ تھیں لیکن ذرا دیکھیں کہ اس کی Canons میں مسلمان کہیں نظر آتے ہیں؟ کہیں نہیں۔ اگر یہ نہ معلوم ہو کہ مور مسلمانوں کو کہا جاتا ہے تو پوری Othelo * پڑھ جایئے یہ راز کھل نہ پائے گا۔

دو عظیم دنیائیں ساتھ ساتھ موجود ہیں لیکن یہ کتنا عجیب ہے کہ ان دونوں نے ایک دوسرے کو جاننے کی کتنی کم کوشش کی ہے۔ مغربی دنیا اور عالم اسلام اگر دو فرد ہوتے تو ان کے درمیان ایک دوسرے کے تئیں جذبات کو دبانے میں ضبط کا اظہار نظر تو آتا اور کوئی ان سے پوچھ سکتا تھا کہ انھیں کیا ہوا ہے؟ کیا پہلے کبھی ان میں محبت کے جذبے جاگے ہوئے تھے؟ یا یہ ایک دوسرے کے تئیں ظلم وستمگری کے مرتکب ہوئے تھے؟

اس صورتحال کی ایک اور لیکن ذرا کم دلچسپ وجہ ہو سکتی ہے۔ تاریخ کے بڑے حصّہ میں ہمیں نظر آتا ہے کہ مغرب اور اسلام دو مختلف اور علیٰحدہ کائناتوں میں رہے ہیں اپنے اندرونی مسائل میں گھرے ہوئے۔ لیکن دونوں اپنے اپنے طور یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ تاریخ میں مرکزی حیثیت کی حامل وہی ہیں۔ ہر ایک کا اپنا ایک بیانیہ ہے۔ سترھویں صدی تک دوبارہ یہ واضح ہوا کہ یہ دونوں بیانیے ایک دوسرے کو قطع کیئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس نقطہ پر ایک کو دوسرے کے لئے راستہ مہیا کرنا ہی تھا۔ جس بنا پر یہ دونوں بیانیے باہم دگر ہوتے رہے تھے۔ لیکن جب مغربی بیانیہ کا دھارا زیادہ طاقتور ہو چلا تو وہ غالب ہو گیا اور دوسرے دھارے کو اپنے اندر دبا لیا۔

لیکن اس طرح اس بیانیے کی تاریخ ختم نہیں ہوگئی۔ اس کا بہاؤ جاری ہے بالکل پانی کی ان لہروں کی

---

* William Shakspere کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی پیدائش ۲۳ راپریل ۱۵۶۴ء میں ہوئی۔ اس کی تمام ادبی تخلیقات، ڈراموں، نظموں اور Sonnets کے مجموعے کو Cannon کہا گیا ہے۔ Othelo دراصل اس کے ایک ڈرامہ کا کردار ہے جس کے بارے میں تصور ہے کہ یہ ۱۶۰۱ تا ۱۶۰۴ء کے دوران لکھا گیا۔ Othelo کا کردار مور (Moor) نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اصطلاح ابتداء اسپین کے مسلم باشندوں اور پھر شمالی افریقی ممالک کے لوگوں کے لئے استعمال ہوئی اور پھر مغربی لٹریچر میں بالعموم عام مسلمانوں کے لئے استعمال ہونے لگی۔

شیکسپیر کے اس ڈرامہ میں Othelo کے ایک مور ہونے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زوال اسپین کے بعد بھی یہاں کے افراد، مغربی نفسیات پر اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ سولہویں صدی عیسوی میں موجود مغرب کا سب سے بڑا ادیب بھی اپنے ڈرامے میں مرکزی کردار میں پیش کرنے کے لئے انھیں ہی کو منتخب کرتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ اسے پڑھ کر مور کے مسلمان ہونے کا اندازہ نہیں ہوتا اس کا مطلب شاید یہ ہے کہ مورش اسپین بقیہ یورپ پر ایسے اثرات مرتب کرنے میں ناکام رہا تھا جن کی جڑیں اسلام میں اتری ہوئی ہوں البتہ نفسیاتی برتری خاصے طویل عرصہ تک باقی رہی۔

طرح جو مختلف سمتوں سے آتی اور ٹکراتی رہی ہیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اگر آج کی دنیا کے گرم ترین نقطوں کو تلاش کریں تو یہ کشمیر، عراق، چیچنیا، بلقان، اسرائیل اور فلسطین کے ناموں پر ابھریں گے۔ یہ علاقے کسی ایسے عظیم بُعد کی نشاندہی کرتے ہیں جو دنیا کے نقشہ پر تو نظر نہیں آتا۔ غائب ہو چکا ہے لیکن ابھرنے کے لئے بے تاب ہے اور شکست تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔

میں یہی کہانی آئندہ صفحات میں سنانے والا ہوں اور میں نے جان بوجھ کر اسے کہانی کہا ہے۔ Destiny Disrupted یعنی ''قافلہ کیوں لٹا''؟ نہ تو کوئی نصابی کتاب ہے اور نہ ہی کوئی فاضلانہ تصنیف۔ یہ تو بس اسی طرح ہے کہ جیسے میری اور تمہاری ملاقات کسی کیفے میں ہو جائے اور تم مجھ سے یہ سوال کر ڈالو کہ یہ دنیا کی متوازی تاریخ کا جو حوالہ تم دیتے رہتے ہو وہ آخر ہے کیا؟ اور جواباً میں تمہیں یہ سب بتاؤں۔ اس سلسلہ میں میری دلیل کوئی نئی نہیں ہے بلکہ اب تو لائبریریوں کی الماریوں میں پھیلی متعدد کتابوں میں اسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ان کتابوں کا عالمانہ اور محققانہ انداز، ان کی خاص زبان اور متعدد حوالے اور نوٹس اگر گراں نہ گذریں تو یہ دلیل آسانی سے مل جائے گی۔ لیکن اس کتاب کو پڑھیں تو آپکو پوری کہانی کے دائرہ کا ایک حصہ مل جائیگا۔ میں کوئی عالم تو نہیں ہوں لیکن میں نے علماء کے کاموں کی بنیاد پر ہی یہ سب کچھ لکھا ہے۔ ان عالموں نے تاریخ کے موادِ خام کو چھان پھٹک کر نتائج اخذ کئے ہیں اور اسکالرز کے تحقیقی کاموں کو جانچ کر ضمنی نتائج تک پہنچے ہیں۔

ہزار ہا سال پر محیط تاریخ میں محض پچاس سال پر محیط ایک مختصر دورانیہ کو جگہ دینے میں شاید میں دستور سے تجاوز کر گیا ہوں۔ لیکن اس دورانیہ پر میں یوں زیادہ ٹھہرا ہوں کہ یہ دورانیہ محمدؐ رسول اللہ کے پورے کردار اور انکے اولین چار جانشینوں پر محیط ہے اور یہی وہ افراد ہیں جنھوں نے اسلام کے بیانیہ کی ساخت میں بنیادی اور اہم ترین رول ادا کیا ہے۔ اس کہانی کا بیان ایک ایسا انسانی ڈرامہ ہے جس میں جذبات اور محبت کی فراوانی پائی جاتی ہے۔ یہ اُسلوب میں نے اس لئے اختیار کیا ہے کہ مسلمان اسے انھیں جذبات کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ اس کے برخلاف تحقیق کی غرض رکھنے والے شک و بے یقینی کے عناصر کو ساتھ لیکر اس کہانی کو سمجھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ غیر مسلم محققین کے بیان کو مسلم اسکالرز کے مقابلہ زیادہ معرُوضی سمجھتے ہوئے انھیں زیادہ معتبر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا مقصد صرف یہ کھوج نکالنا ہوتا ہے کہ ہوا کیا تھا؟ جبکہ میرا مقصد اس کی وضاحت ہے کہ اس ہونے کے بارے میں مسلمانوں کا کیا خیال ہے۔ یہ اس لئے اہم ہے کہ روداد کے بارے میں ان کا اپنا نقطۂ نظر ہی صدیوں سے انھیں متحرک کئے ہوئے ہے اور تاریخ میں ان کے رول کو قابل فہم بناتا ہے۔

لیکن ہشیار باش! میں اسلام کی ابتداء کے بارے میں پورے وثوق کے ساتھ ایک بات کہہ رہا ہوں۔ دوسرے قدرے پرانے مذاہب مثلاً یہودیت، بدھ ازم، ہندوازم، بلکہ عیسائیت بھی اس میں شامل کر لیں۔ ان کے مقابلہ میں مسلمانوں نے اپنی نمو پذیر تاریخ کو جمع کرنے، یاد کر لینے، اس کو پڑھنے اور اس کو محفوظ کر لینے کے لئے تمام ممکنہ طریقے بالکل ابتدا یعنی ان واقعات کے ظاہر ہوتے ہی استعمال کرنا شروع کر دیئے تھے۔ اور محض

محفوظ ہی نہیں کیا بلکہ ان واقعات کی معلومات کے پیچھے جو بھی ذرائع اور وسائل تھے ان کی تصدیق پر گواہوں کو بھی محفوظ کیا تھا۔ ایک واقعہ کے بیان پر اوّلین شخص سے لیکر آخری رپورٹر کی نہ صرف فہرست بلکہ ان کے ہر ممکن کوائف بھی محفوظ کئے گئے تھے۔ یہ حوالے اتنی محنت اور ایمانداری سے جمع کئے گئے تھے جیسے کسی کورٹ میں شواھد پیش کئے جاتے ہیں۔ اور ان کی پوری جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کی مرکزی اہمیت کی حامل کہانیوں کو ہم مجازاً یا محض اخلاقی حکایات کی طرح نہیں لے سکتے۔ کیونکہ ان کی تصدیق کے لئے ہم ثبوت نہیں مانگتے کہ یہ واقعہ ہوا تھا کہ نہیں۔ یہاں اصل اہمیت واقعہ کے ہونے کی نہیں بلکہ اس سے حاصل ہونے والے سبق کی ہوتی ہے۔ سبق کا صحیح ہونا ہی ضروری ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی کہانیاں اس طرح کا کوئی سبق سموئے ہوئے نہیں ہوتیں اور نہ ہی وہ کسی مثالی ماحول میں مثالی افراد کا تذکرہ ہیں۔ وہ ہم تک سچے اور حقیقی انسانوں کی کہانیوں کی طرح پہنچی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ تاریخ کی کثافتوں میں نفاستوں کے ساتھ حقیقی دنیا میں عملی مسائل سے وہ کیسے دوچار ہوئے اور انھیں کیسے حل کیا۔ اس سے جو بھی سبق ملتا ہے ہم وہی لیتے ہیں۔

مذکورہ بالا وثوق کے باوجود مسلمانوں کی ان کہانیوں میں ہمیں تمثیلی عناصر کی درآمد سے انکار نہیں اور اس سے بھی انکار نہیں کہ بعض کہانیاں محض ذہنی اختراع تھیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کہانیوں کو بیان کرنے والوں نے وقت، حالات اور بعض شخصیتوں کے ایجنڈے کے پیش نظر تبدیل بھی کیا ہوگا۔ لیکن بتانا یہ مقصود ہے کہ مسلمانوں نے اپنے بنیادی بیانیہ کو بالکل اسی طرح کہا اور اسی روح کے ساتھ پیش کیا ہے جس طرح تاریخ کو بیان کیا جاتا ہے۔ ان افراد اور واقعات کو ہم بالکل اسی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں جسطرح یہ کہ قدیم روم میں صلاّ (Sulla) ماریس (Marius)* کے درمیان کیا ہوا تھا۔ ان کہانیوں کا مقام دراصل واقعی تاریخ اور داستانوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ جنھیں بیان کرتے ہوئے انسانی کردار کو اگر بے دخل کردیا جائے تو مسلمانوں کو ان کے ذریعہ ملنے والا سبق اور اس کی معنویت ہی ختم ہو جاتی ہے اور نتیجہ میں مسلمانوں نے گذشتہ صدیوں میں جو کچھ کیا ہے وہ ناقابل فہم ہو جاتا ہے۔ یہ کہانی سنانے کا مقصد شاید واضح ہو گیا ہے۔ اگر اس عمل کے دوران آپ میرے ہم سفر ہیں تو پھر پیٹیاں کس لیں۔ شروع کرتے ہیں۔۔۔!

---

* Sulla قدیم روم کا ایک سیاستداں اور فوجی جرنل ہے جس کا زمانہ ۸۸ اور ۸۷ قبل مسیح میں سمجھا جاتا ہے۔ Sulla نے قانون کو روندتے ہوئے اس علاقے میں اپنی فوجیں بھیج دیں جو Marius کو دیا گیا تھا اور اس طرح جنگ میں Marius کو شکست دے دی۔ Marius نے جو اصلاحات متعارف کرائی تھیں Sulla نے انھیں کالعدم قرار دے کر روم کی جمہوریت کا خاتمہ کردیا اور مطلق العنان حکومت کی راہ ہموار کی۔ آئندہ ایسے ہی بادشاہ آتے رہے جن میں جولیس سیزر بطور ڈکٹیٹر مشہور ہے۔

باب ۱

عالم وسطیٰ

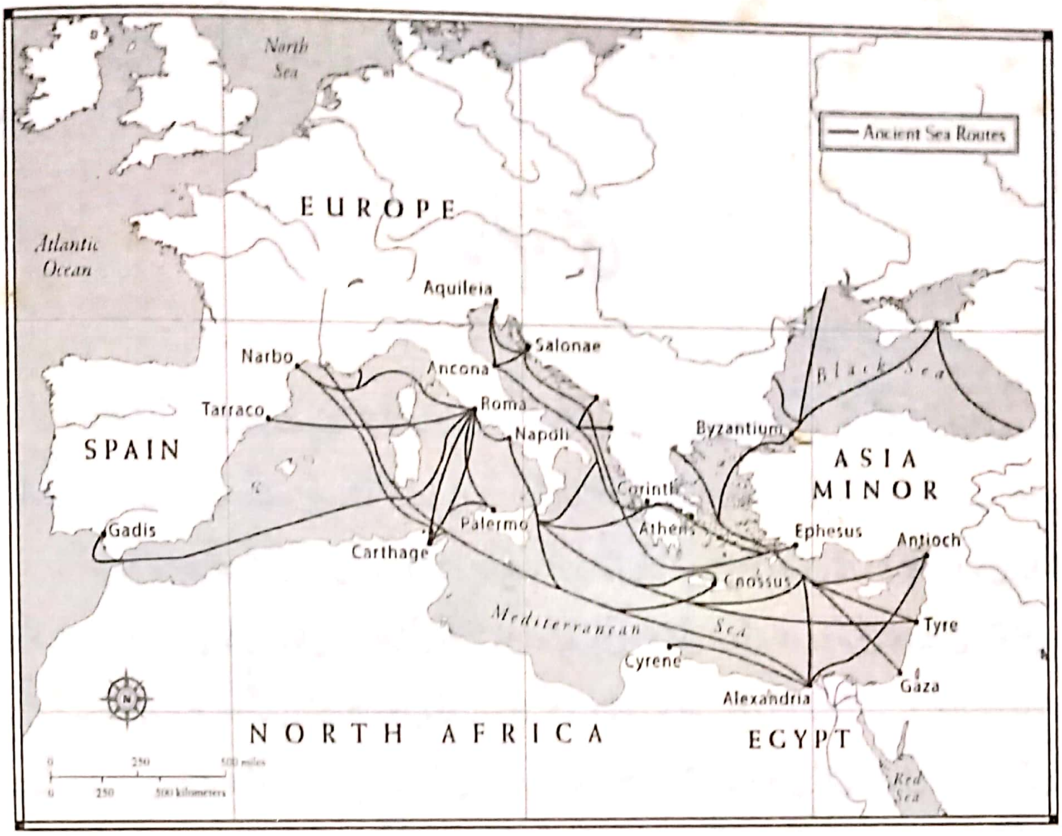
اسلام کی آمد سے بہت پہلے بحرِ اوقیانوس اور خلیجِ بنگال کے درمیان دو دنیائیں آباد تھیں۔ ہر ایک کے اپنے اپنے تجارتی اور سفری راستے تھے۔ ایک کا انحصار زیادہ تر بحری راستوں پر تھا اور دوسری کا خشکی اور میدانی راستوں پر۔

آپ اگر عہد قدیم کی بحری آمد و رفت پر ایک نظر ڈالیں تو بحرِ روم ہی عالمی تاریخ کا مرکز بن کر ابھرے گا۔ کیونکہ اس علاقہ میں مائی سینائی، کریٹیائی، فونشیائی، لیڈیائی، یونانی، رومی اور دوسری بہت سی ابتدائی دور کی خاصی متحرک ثقافتیں موجود تھیں جن کا آپس میں رابطہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ بحر روم کے قرب و جوار میں آباد لوگ دوسرے قریب میں بسنے والوں کے بارے میں سن کر تو جان ہی سکتے تھے آپس میں آسانی سے مل جل کر بھی معلومات کا تبادلہ کرتے تھے۔ چنانچہ یہ عظیم سمندر خود ہی ایک ایسی طاقت بن گیا کہ دور دراز سے مختلف افراد اس کی طرف کھنچے چلے آئے اور ایک دوسرے کی تہذیبوں، ثقافتوں اور روایتوں سے مانوس ہو کر اپنے مستقبل کی ایک ساتھ مل کر تعمیر کرنے لگے۔ اسی کے نتیجہ میں دراصل عالمی تاریخ کا وہ جرثومہ تشکیل پایا جس سے بعد میں مغربی تہذیب نے جنم لیا۔

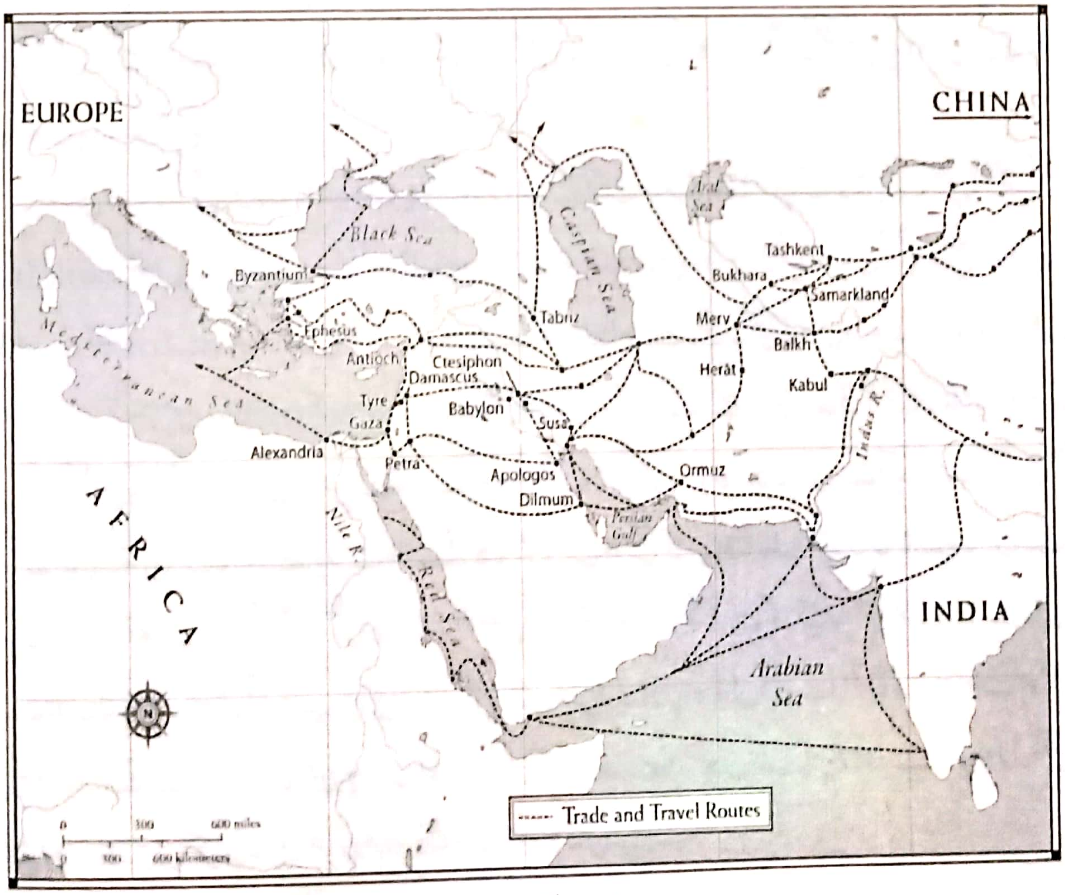
اسی طرح خشکی کے قدیم راستوں کو دیکھ کر دنیا کے ایک مرکزی مقام کی نشاندہی کرنا بھی مشکل نہیں جو ان سڑکوں اور راستوں کے اتصال کے نتیجہ میں پیدا ہوا تھا جو ہندوستان، وسطی ایشیا، ایرانی سطح مرتفع، عراق و مصر کو مربوط کرتے اور وہ راستے جو دریاؤں اور سمندروں سے گھرے ہوئے تھے۔ خلیج فارس دریائے سندھ اور دریائے آمو، کوہِ ارل، بحر کیسپین، بحر اسود، بحر روم، دریائے نیل اور بحر احمر کو ملاتے تھے۔ یہی علاقہ آخر کار عالم اسلام بنا۔

لیکن بدقسمتی سے اس دوسرے علاقے کو کوئی ایک نام نہیں دیا جا سکا۔ اس کے ایک حصہ کو آج مشرقِ وسطیٰ کہتے ہیں۔ لیکن اس نام سے پورے علاقے کا باہمی تعلق واضح نہیں ہوتا بلکہ دھندلا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک بات اہم ہے کہ مشرق وسطیٰ کا لفظ استعمال کرتے ہوئے لگتا ہے کہ جیسے ہم مغربی یورپ میں کہیں کھڑے ہوئے ہیں۔ کیونکہ اگر آپ فارسی ارتفاع پر کہیں کھڑے ہوں تو مڈل ایسٹ واقعتاً مڈل ویسٹ ہوگا۔ اس الجھن کو دور کرنے کے لئے میں اس پورے علاقے کو جو سندھ سے استنبول تک پھیلا ہوا ہے مڈل ورڈ یعنی عالم وسطیٰ کہتا ہوں اور یوں بھی یہ علاقہ بحرِ روم اور چین کے وسط میں ہے۔

چینی دنیا بھی اپنا ایک علیٰحدہ وجود رکھتی تھی لیکن مذکورہ دو دنیاؤں سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ویسے بھی



عالم روم (سمندری راستے)



عالم وسطیٰ (خشکی کے راستے)

چین کی جغرافیائی صورتحال نے اس کی اجازت نہ دی ہوگی کہ دوسری دنیاؤں سے آسانی سے مربوط ہو سکے۔ رومی علاقوں سے دوری کی ایک بڑی وجہ جہاں درمیان میں حائل وسیع فاصلے تھے تو عالم وسطیٰ سے تعلق قائم کرنے میں ہمالہ وصحرائے گوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے وسیع وعریض اور نا قابل عبور جنگل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی تاریخ کے عالم وسطیٰ کے حصہ میں چینیوں یا ان کے باج گزاروں اور حریفوں کا کوئی رول نظر نہیں آتا۔ اور اسی بنا پر اس کتاب میں بھی انکا تذکرہ بس خال خال ہی ہے۔ یہی حال افریقی Sub-Sahara کے علاقوں کا ہے جنھیں دنیا کے عظیم ترین ریگستان نے یورپ وایشیا کے علاقوں سے کاٹ رکھا تھا۔ یوں دیکھیں تو امریکیوں نے بھی اپنی ایک منفرد کائنات کی تشکیل کے ساتھ اپنی ایک عالمی تاریخ بھی مرتب کرلی تھی۔ ویسے جغرافیائی صورتحال کے پیش نظر اوروں کے مقابلہ میں امریکیوں سے یہ توقع شاید زیادہ قریب از قیاس بھی تھی۔

لیکن یہ جغرافیائی وجوہات روم، مصر، عالم وسطیٰ کو اتنا دور نہ کرسکیں جتنا کہ چین اور امریکہ کو کر دیا تھا۔ ان دونوں علاقوں کا باہمی ربط تو ہوتا تھا لیکن دو مختلف دنیاؤں کی حیثیت سے۔ بقول معروف مورخ فلپ ڈی کرٹن یہ پورا علاقہ دراصل باہمی رابطہ اور آمد ورفت والا علاقہ تھا۔ ہر علاقہ دوسرے کے مقابلہ میں آپس میں زیادہ مربوط تھا۔ روم کے ساحلی علاقوں کے کسی بھی مقام سے اس علاقہ کے کسی دوسرے مقام تک جانا بہت آسان تھا لیکن ان علاقوں سے ایران کے پرسی پولس شہر (قدیم تخت جمشید) یا دریائے سندھ تک آنا آسان نہ تھا۔ اسی طرح عالم وسطیٰ کے مختلف ذیلی علاقوں سے گذرنے والے کارواں پرانے زمانہ میں کسی مقامِ اتصال سے کہیں کا بھی رخ کر سکتے تھے۔ اور مقامات اتصال متعدد پائے جاتے تھے۔ البتہ مغرب کی سمت سفر کرتے ہوئے یعنی ایشیا مائنز اور آج کے ترکی کی طرف جاتے ہوئے جغرافیہ بدل جاتا تھا۔ یہاں اُنھیں دنیا کی تنگ ترین آبنائے باسفورس سے گذرنا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے خشکی کا راستہ مسدود ہو جاتا تھا اور کارواں یہاں سے واپس وسطی علاقوں کی طرف یا جنوب میں ساحل روم کے سہارے سہارے اپنا سفر طے کرتے تھے۔

ان علاقوں سے گذرنے والے تاجروں، مسافروں اور فاتحین کے ساتھ، افواہیں، قصے، کہانیاں، لاف گذاف اور لطیفے، تاریخی واقعات اور مذہبی اساطیر اور اشیاء کے ساتھ ثقافتی ورثہ بھی منتقل ہوتا رہتا تھا۔ تجارت اور مسافرت کے یہ راستے دراصل انسانی جسم میں دوڑتی ہوئی باریک نسوں کا کام کرتے ہیں جن کے ذریعہ تہذیبی خون ادھر سے اُدھر پہنچتا رہتا ہے۔ وہ معاشرے جن میں اس طرح کی نسوں کا جال موجود ہوتا ہے وہ دوسرے معاشروں کے بیانیہ کو اپنے یہاں ایک مقام دے دیتے ہیں۔ اور اس عمل میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی کہ کون اچھے لوگ تھے اور کون برے۔

چنانچہ اس طرح رومی علاقوں اور عالم وسطیٰ نے تاریخ عالم کا اپنا اپنا ایک منفرد بیانیہ مرتب کرلیا تھا۔ روم میں آباد لوگ خود کو انسانی تاریخ کا مرکزی کردار گردانتے جس کے لئے ان کے پاس دلائل بھی تھے۔ لیکن عالم وسطیٰ کے لوگ بھی اتنے ہی مضبوط دلائل کی بنیاد پر ایسا ہی تصور اپنے بارے میں رکھتے تھے۔

یہ دونوں تاریخیں ایک دوسرے میں مدغم ہوئی ہیں سوائے ان علاقوں کے جنھیں آج اسرائیل کہا جاتا ہے، جنھیں آج لبنان کہتے ہیں یا جنھیں آج شام اور اردن کہتے ہیں۔ یعنی مختصراً وہ علاقہ جو آج سب سے زیادہ شورش زدہ ہے۔ یہ علاقہ اس دنیا کا مشرقی کگر ہے جس کی شناخت سمندری راستوں سے ہوتی تھی اور اس دنیا کا مغربی کگر خشکی کے راستے جس کی پہچان تھے۔ رومی دنیا کے نقطۂ نظر سے یہ علاقہ ہمیشہ سے عالمی تاریخ کا ایک حصّہ رہا ہے اور اس میں اصل اہمیت اور شناخت بحرِ روم کے گرد گھومتی ہے۔ دوسرے نقطۂ نظر کے مطابق یہ ہمیشہ سے عالم وسطیٰ کا حصہ رہا ہے جس میں عراق اور فارس کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ یہ علاقہ واقعی کس دنیا سے تعلق رکھتا ہے کیا اس سلسلہ کی دلیل ایک عرصہ سے اور آج بھی بے لگام نہیں ہوتی جا رہی ہے؟

عالم وسطیٰ قبل از اسلام

اوّلین تہذیبیں دریاؤں کے کنارے ظاہر ہوئیں گو کہ سالانہ سیلابوں کے خطرات سے ہمیشہ ہی دوچار رہتی ہونگی۔ چین میں ہوانگ ہو کی وادی، ہندوستان میں وادیِ سندھ، نیل کی وادی افریقہ میں یہ وہ مقامات ہیں جہاں کوئی چھ ہزار سال قبل صحرانورد شکاری اور چرواہے آباد ہونا شروع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اولین شکل دیہاتوں ہی کی وجود میں آئی ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے زراعت کا بھی آغاز کیا۔

شاید انسانی تہذیب کی سب سے زیادہ متحرک طشتری فرات اور دجلہ کے درمیاں کا وہ علاقہ تھا جو میسوپوٹامیہ کہلاتا تھا جس کے لفظی معنی بھی دریاؤں کے بیچ ہی کے ہیں۔ اتفاق یہ ہے کہ ان دریاؤں کے درمیان میں جو ایک تنگ سی پٹی ہے وہ آج کے عراق کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ اکثر و بیشتر جب ہم Fertil Crescent کو تہذیب کا گہوارہ کہتے ہیں تو اس کا اشارہ دراصل عراق ہی کی طرف ہوتا ہے۔ پس یہیں پر سب کچھ ہوا تھا۔

میسوپٹامیہ کو دوسری تہذیبوں سے ممتاز کرنے والا ایک خاص جغرافیائی وصف ہے۔ یہ دونوں دریا جو اس کی پہچان ہیں ایک ایسے علاقے سے گذرتے ہیں جو مسطح اور قابل بود باش ہے اور کسی بھی سمت سے اس میں داخلہ ممکن ہے۔ اس کے برخلاف نیل کے مشرق کی طرف جھاڑیوں کا زبردست سلسلہ ہے اور مغرب کی جانب ناقابل رہائش صحارا ہے اور اوپر کی طرف سنگلاخ اونچی اور ڈھلوان چٹانیں اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ جغرافیہ نے جہاں مصر کو تحفظ فراہم کیا وہیں اسے دوسری ثقافتوں سے تعامل سے روک بھی دیا اور یوں ایک طرح کا جمود مصری ثقافت کا حصہ بن گیا۔

میسوپٹامیہ کے ساتھ ایسا نہ تھا۔ یہاں ابتدا ہی سے ایک خاص طرز و ترتیب نے گھر کر لیا جو کوئی ہزار سال تک بار بار ظاہر ہوتا رہا۔ صحرانوردوں اور شہروں میں بسنے والوں میں وقتاً فوقتاً پیدا ہونے والی ایک مستقل کشمکش کے نتیجہ میں چھوٹی بادشاہتیں ختم ہو کر بڑی سلطنتیں بنتی رہیں۔ یہ طرز و ترتیب کس طرح ظاہر ہوتی رہی یہ

خاصا دلچسپ ہے۔

جو کسان مستقل طور پر آباد ہو جاتے وہ اپنی زراعتی ضروریات کے لئے آبپاشی کا کوئی نظام قائم کر لیتے اور یوں متموّل دیہاتوں اور قصبوں کے ساتھ تعاون کا ذریعہ بنتے۔ پھر ایک وقت آتا کہ کوئی طالع آزما شخص یا بااثر راہب، یا ان دونوں کا باہمی اتحاد ان چھوٹے چھوٹے دیہاتوں اور قصبوں کو ایک متحدہ نظام کے تحت لے آتا اور یوں ایک بڑی طاقت ظہور میں آجاتی۔ اس طرح بڑی سلطنتیں اور بادشاہتیں قائم ہو جاتیں۔ پھر کوئی دوسرا صحرا نوردوں کا گروہ کھڑا ہوتا اور اس وقت کے بادشاہ کو چیلنج کرتا اور بادشاہت پر قابض ہو جاتا اور یوں اپنی سلطنت کو اور وسیع کر لیتا۔ لیکن پھر وہی وقت دہراتا۔ یہ بادشاہ کمزور ہو جاتا۔ عیاشی کا شکار ہو جاتا بالکل اسی طرح جس طرح کے لوگوں اور باشاہوں کو شکست دے کر یہ ان پر قابض ہوا تھا۔ ایسے موقع پر دوسرا طاقتور بادشاہ کھڑا ہوتا۔ انھیں فتح کر لیتا اور اس بادشاہت کو اپنے قبضہ میں کر لیتا۔

فتح، استحکام، وسعت، زوال، فتح یہ گویا ایک طرز تھا ان تمام معاشروں کا جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس طرز کو چودہویں صدی عیسوی کے ایک عظیم مسلم مورخ ابن خلدون نے ایک قانون کی شکل میں پیش کیا۔ جو اپنے وقت کے اس طرح کے مشاہدات کی بنیاد پر اس نے اخذ کیا تھا۔ ابن خلدون کے خیال میں اس طرز کی شناخت کے ذریعہ اس نے تاریخ میں موجزن نبض پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

ایک ہی وقت میں مختلف مقامات پر یہ قانون کارفرما ہوتا رہتا تھا۔ ایک سلطنت یہاں بنی دوسری وہاں ابھری دونوں ترقی کرتے ہوئے پھیلتیں یہاں تک کہ وہ آپس میں برسرِ پیکار ہو جاتیں تا آنکہ ایک دوسرے پر غالب آجاتی اور نتیجہ میں ایک واحد بڑی سلطنت وجود میں آجاتی۔

کوئی پچپن سو سال قبل فرات کے کنارے درجنوں آباد شہر ایک آپسی رشتے میں بندھ گئے جسے سُمر (Sumer) کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی سُمریات تہذیب میں فنِ تحریر ایجاد ہوا۔ کوزہ گری کے لئے چرخی، پہیّہ چھکڑا گاڑی اور نمبروں کی ابتدائی شکل بھی یہیں سے ایجاد ہوئی۔

پھر یوں ہوا کہ دریا کے منبع کے قریب بسنے والے عقاد لوگ جو تنومند بھی تھے اور طاقتور بھی اس علاقہ پر قابض ہو گئے۔ ان کے سردار کا نام سارگون (Sargon) تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہی شخص وہ اولین فاتح ہے جسے تاریخ نے بنام یاد رکھا ہے۔ یہ ایک انتہائی جنگجو غصہ ور اور خود برداختہ شخص تھا۔ ایک غریب اور ابتداءً ایک نامعلوم شخص جس نے اپنی باقیات ایسی دستاویزوں کی شکل میں چھوڑی جو مٹی کی بنی ہوئیں تھیں اور ان پر مہر بھی لگی ہوئی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ ''یہ کھڑا ہوا تو اسے میں نے ضرب لگائی اور وہ کھڑا ہوا تو اسے بھی میں نے ضرب لگا دی''۔ سارگون نے اپنی فتوحات کا سلسلہ جنوب میں اتنا دور تک جاری رکھا کہ اس کی فوجوں نے اپنے ہتھیاروں کو سمندر کے پانی میں ہی صاف کیا۔ وہاں پہنچ کر وہ یوں گویا ہوا۔ ''اب وہی بادشاہ میری ہمسری کا دعویٰ کرے جس نے میرے برابر فتوحات کی ہوں۔ جتنے علاقہ پر میں نے قبضہ کیا وہ بھی اتنا ہی

قبضہ کرے"[1]۔ مطلب کہنے کا یہ تھا کہ ذرا دیکھیں تو میری برابری کون کرسکتا ہے۔اس کی بادشاہت آج کی نیوجرسی سے بھی چھوٹی تھی۔

وقت گذرا تو بلند میدانوں کی جانب سے صحرا نوردوں کا دوسرا گروہ کھڑا ہوااور عقاد کے علاقوں پر قابض ہوگیا۔پھر وہ بھی ہٹا دیئے گئے اور دوسرے لوگ برسرِ اقتدار آئے اور پھر دوسرے اور پھر دوسرے۔ غطائی، کسائی، ہُرّین، اُموری وغیرہ۔اور تبدیلیوں کا یہ سلسلہ اپنے آپ کو دہراتا رہا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر نیا حکمراں بنیادی طور پر ایک ہی علاقے پر قابض نہیں تھا بلکہ ہر تبدیلی کے ساتھ تھوڑا تھوڑا علاقہ اس سلطنت میں بڑھ جایا کرتا تھا۔

آنے جانے کے اس تسلسل میں آموریوں کے آنے کی گھڑی فیصلہ کن ثابت ہوئی کہ انھیں کے دور میں مشہور شہر بابل کی بنیاد ڈالی گئی جو سلطنت بابل کا دارالخلافہ بھی قرار پایا۔بابلیوں کے بعد آشوری برسرِ اقتدار آئے جنھوں نے بابل سے بھی بڑے شہر نینوا سے حکمرانی کی۔ان کی سلطنت عراق سے مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب تیز ترین سفر گھوڑے سے ہوتا ہو تو اس اعتبار سے یہ بڑی وسیع وعریض سلطنت رہی ہوگی۔تاریخ میں آشوری اپنے ظلم اور بے رحمی کے لئے مشہور ہیں۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ یہ لوگ اپنے دوسرے ہم عصروں کے مقابلہ میں زیادہ خراب تھے لیکن انھوں نے اُسی حکمتِ عملی پر عمل کیا تھا جسے بعد میں بیسویں صدی میں اسٹالن نے آزمایا۔ پوری پوری آبادیوں کو ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہوں پر آباد کیا تا کہ اس طرح جب لوگ بے گھر ہوکر دوسری جگہوں پر بھیج دیئے جائیں گے اور اپنے وسائل سے کٹ کر اجنبیوں کے ساتھ رہنا پڑیگا تو اطمینان اور یکسوئی ختم ہوکر دکھ اور کنفیوزن کا شکار ہونگے۔اور بغاوت کے بارے میں سوچ بھی نہ سکیں گے۔

یہ حکمت عملی کچھ وقت تک تو کارگر ہوسکتی تھی۔لیکن ہمیشہ کی ضمانت نہیں دے سکتی تھی۔آشوریوں کو آخر کار اپنی ہی رعایا کے ہاتھوں جنھیں کلدانی کہتے ہیں شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ بابل شہر کو انھوں نے ازسرِ نو تعمیر کیا اور تاریخ میں اپنے لئے ایک روشن باب کھول دیا۔اسٹرونومی، طب، اور ریاضی میں ان کے کام ان کی فکری تاریخ میں بڑے مقام کی یادگار ہیں۔ وہ وقت کے ناپنے اور اسے تقسیم کرنے والوں میں شاید اولین تھے۔ان کے بنائے ہوئے سسٹم کی بناپر ہی سال کے مہینوں کی تعداد بارہ ہے۔ گھنٹے 60 منٹ کے ہوتے ہیں اور منٹ میں 60 سیکنڈ۔وہ شہری منصوبہ بندی کے بڑے زبردست ماہر اور ماہرین تعمیرات تھے۔اسی کلدانی خاندان کے ایک بادشاہ نے بابل کا مشہور لٹکا ہوا باغ (Hanging Garden) بنوایا تھا۔جو آج بھی دنیائے قدیم کے سات عجوبوں میں شمار ہوتا ہے۔

لیکن انھوں نے بھی آشوریوں کی حکمت عملی استعمال کی۔آبادی کو مکمل طور پر دوسری جگہ آباد کرنا اور تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی پر یہ بھی قائم ہوئے۔ان کے ایک بادشاہ نیبوشدنظار Nebuchad Nezzar نے پہلی بار یروشلم کو تاراج کیا اور عبرانیوں کو قیدی بنالیا۔اسی خاندان کے ایک دوسرے بابلی بادشاہ بلشازار نے

اپنے محل میں منعقد ایک دعوت شبینہ میں جسم سے آزاد ایک حرکت کرتا ہوا ہاتھ دیکھا جو اس کے محل کی دیوار پر آگ سے کچھ الفاظ لکھ رہا تھا۔ Mene mene tekel upharsin اس کے خوشامدی درباری ان لفظوں کے سرو پیر سے بھی واقف نہ تھے۔ شاید یا تو وہ شراب کے نشے میں دھت تھے یا پھر ان کے لئے یہ زبان ہی اجنبی تھی۔ معلوم ہوا کہ جو عبرانی قیدی بنائے گئے تھے ان میں دانیال نام کا قیدی اس کے سمجھنے میں مدد کرسکتا ہے۔ چنانچہ اسے بلا بھیجا۔ اس زبان کے معنی بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ تمہارا وقت اب قریب ہے تمہیں جانچا گیا لیکن کھرے نہ اترے۔ تمہاری یہ سلطنت اب تقسیم ہوجائیگی۔ کم از کم انجیل کے باب دانیال میں یہ قصہ اسی طرح بیان ہوا ہے۔

بلشازار کے پاس اتنی فرصت کہاں تھی کہ اس پیشین گوئی پر غور کرتا۔ وقت آ پہنچا اور پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی ۔ اور ایک دن شہر بابل خون میں لت پت ہوگیا۔ بلند میدانوں کی جانب سے آئے تازہ ترین فسادیوں کا یہ گروہ اہل فارس اور میدیوں (medes) کے اتحاد سے وجود میں آیا تھا۔ ان دونوں ہندی یورپی قبائل نے مل کر بابل کے عہد ثانی کو ختم کر کے اہل فارس کی سلطنت قائم کردی۔

عالم وسطیٰ میں جو ایک سلسلہ بڑی سے بڑی سلطنت قائم کرنے کا چل رہا تھا اس مقام پر آ کر کم از کم ایک طویل عرصہ کے لئے تھم گیا اور جب اہل فارس تھک کر بیٹھے تو پھر مزید فتوحات کے لئے کچھ بچا بھی نہیں تھا۔ تہذیب کے دونوں گہوارے یعنی مصر اور میسوپوٹامیہ اسی سلطنت کا حصہ بن گئے۔ ان کی بالا دستی ایشیا مائنر، جنوب میں نیل اور مشرق میں ایران کے بلند علاقوں اور افغانستان سے ہوتی ہوئی دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ خوشبو دوست اور شائستگی پسند ایرانیوں کو فتوحات کا سلسلہ جاری رکھنے میں شاید اس لئے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی کہ سندھ کے مزید جنوب میں جنگلوں کا ایک طویل سلسلہ تھا اور شمال میں افغانستان کے آگے درختوں سے بیزار ایک دشوار گذار اور طویل میدانی سلسلہ تھا۔ جس میں تیز تند ہوائیں چلتی تھیں یا تُرک صحرا نورد چرواہے اپنے جانوروں کے بڑے بڑے ریوڑوں کے ذریعہ اس بے جان خطہ ارض کو زندگی کے وجود سے روشناس کراتے تھے۔ اور یہ بھی کہ یہ چرواہے اس علاقے میں کسی اور کی عملداری بھی نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ اہل فارس نے اکتفا کرلیا کہ وہ ان وحشیوں سے اپنی سلطنت کو محفوظ رکھیں گے۔ اور یوں قلعوں کا ایک سلسلہ تعمیر ہوا تاکہ فصیل کے اس طرف قائم محفوظ خطۂ ارض کے مہذب اور شائستہ لوگ سکون و اطمینان کے ساتھ فنِ حیات کی حنا بندی کرسکیں اور تزئین کاری سے آراستہ کرسکیں۔

کوئی 550 قبل مسیح میں جب اہل فارس کے ہاتھ میں زمام کار آئی تو یہ علاقہ پہلے ہی سے کافی حد تک مستحکم ہو چکا تھا۔ ملحق خطّوں اور علاقوں میں اُن سے قبل کے فاتحین نے مختلف قبیلوں کو لا کر بسایا اور انھیں ایک وحدت میں پرو دیا تھا اور ایک نظم کا پابند بنایا تھا جو مرکزی بادشاہت کے تحت رہتے۔ جو کبھی Elam سے کبھی اُر سے کبھی نینوا سے اور کبھی بابل سے اس پورے علاقہ پر حکمرانی کرتے۔ یہ پوری صورتحال اہل فارس کو ورثہ کے

بطور ملی اور انھوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ویسے بھی خون خرابہ انھیں خاصا تھکا چکا تھا۔

یہ سب تو تھا ہی لیکن یہ سلطنت بعض اور وجوہات کی بنا پر بھی منفرد اور نمایاں نظر آتی ہے۔ اوّل یہ کہ اہل فارس اپنے پیش رو آشوریوں کے بالکل برعکس تھے۔ وسیع وعریض علاقوں پر کامیاب حکمرانی کا انھوں نے بالکل دوسرا نظریہ وضع کیا تھا۔ اکھاڑ پھینکنے اور تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کی جگہ انھوں نے آباد کرنے اور مستحکم کرنے کی حکمت عملی اپنائی۔ عبرانیوں کو غلامی سے آزاد کیا اور کنعان (Canan) واپس جا کر بسنے میں ان کی پوری مدد کی۔ فارسی بادشاہوں نے کثیر ثقافتی اور کثیر آبادی کو ایک بڑی چھت کے تحت رکھنے کی حکمتِ عملی اپنائی۔ انھوں نے اپنی عظیم سلطنت میں افراد کو نظم کے تحت رکھنے کے لئے مختلف لوگوں کو اپنے اپنے طور طریقوں اور معاشرتی روایت کے تحت زندگی گذارنے کے پورے مواقع فراہم کئے۔ اپنے لیڈر منتخب کرتے اور ان کی حکمرانی میں رہتے۔ بس انھیں مرکزی بادشاہت کو ایک مخصوص ٹیکس ادا کرنا ہوتا تھا اور کچھ مرکزی قوانین اور احکام کی پابندی کرنی ہوتی۔ مسلمانوں نے بعد میں اسی طریقہ کو اپنایا اور ترکان اسلام تک یہی سلسلہ جاری رہا۔

دوسرے یہ کہ اہلِ فارس نے محسوس کیا کہ سلطنت کو سنبھالنے اور اسے متحد رکھنے کے لئے عوام سے رابطہ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے تمام علاقوں کے لئے ایک جیسے ٹیکس اور قوانین اور ایک متحدہ کرنسی نافذ کی جو تجارتی مکالمات اور گفتگو میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ انھوں نے سڑکوں اور راہداریوں کا ایک زبردست جال بچھا دیا اور سفری سہولیات مہیا کرنے کے لئے راستوں پر سرائیں اور ہاسٹل قائم کئے۔ ڈاک کا ایک مستعد نظام قائم کیا جو آج کی Pony Express کی گویا ابتدائی شکل تھی۔ امریکہ کی پوسٹل سروس پر جو ایک مقولہ لکھا رہتا ہے کہ

''برف ہو یا بارش، گرمی ہو یا رات کی تاریکی، اپنی متعینہ ذمہ داری ادا کرنے میں ہمارے قاصد کسی کو خاطر میں نہیں لاتے'' یہ دراصل انھیں قدیم اہل فارس سے آیا ہے۔

بہت سے مترجمین کا تقرر کیا گیا جس کے نتیجہ میں یہ کہہ کر کسی کو چھٹکارا ملنا ممکن نہ تھا کہ جناب مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ غیر قانونی ہے کیونکہ میں فارسی نہیں جانتا۔ انھیں مترجمین کے ذریعہ بادشاہ اپنے فیصلوں اور ترقیاتی پروگراموں اور حاصلات کو مختلف زبانوں کے ذریعہ عوام تک پہنچاتے اور یوں ان کی عظمت کے اظہار سے عوام میں ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا۔ دارا اعظم جو سلطنت فارس کو مختلف بلندیوں تک پہنچانے والے بادشاہوں میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ اس نے اپنی داستان حیات مقام بہشتون میں تین زبانوں فارسی، ایلاتی اور بابلی میں چٹانوں پر کندہ کرائی تھی۔ جس میں کوئی پندرہ ہزار الفاظ دارا کی فتوحات اور دوسرے کارناموں پر محیط تھے۔ ان باغیوں کا تذکرہ بھی تھا جنھوں نے اس کی حکومت کو گرانے کی کوشش کی اور ناکام ہوئے۔ انھیں جو سزائیں دی گئیں ان کا بھی ذکر تھا۔ بنیادی مقصد یہ بتانا تھا کہ خبردار بادشاہ سے نہ الجھو یہ تمہاری ناک کاٹ دیگا اور ملیامٹ کر دے گا۔ بحیثیت مجموعی فارسی حکمراں عوام کے لئے پرسکون اور باعث اطمینان تھے۔ متحرک شاہی

کارکنان امن قائم رکھتے جس کے نتیجہ میں عام آدمی اپنی تجارت اور اہل خانہ کی بہتری کے لئے اطمینان سے کام کرتا۔ اچھی فصلیں اگاتا اور عام استعمال کی اشیاء تیار کرتا۔

دارا کے بہشتون میں قدیم فارسی کی کندہ عبارت کے معنی جب دریافت ہو گئے اور انیسویں صدی میں اسے فارسی جدید میں بھی از سرِ نو دریافت کر لیا گیا تو اس کی مدد سے محققین نے باقی دوزبانوں میں کندہ پیغام کو بھی پڑھ لیا اور میسوپٹامیہ میں خطِ میخی کی قدیم لائبریریوں تک رسائی ممکن ہوسکی۔ یہ لائبریریاں اتنی مفصّل تھیں کہ کوئی بارہ سو سال قبل کے مغربی یورپ کی روزمرّہ کی زندگی کی جتنی تفصیلات ہمیں آج معلوم ہیں اُس علاقے کی تین ہزار سال قبل کی معلومات سے ہم اتنے ہی آگاہ ہیں۔

مذہب اہل فارس کی رگ و پے میں بسا تھا۔ لیکن یہ نہ تو ہندومت جیسا لاکھوں دیوی دیوتاؤں کی طرح تھا اور نہ ہی مصریوں کی جادوئی تخلیقات کی مانند جن کی جسمانی شکلیں نصف انسانی اور نصف جانوروں کی ہوتی تھیں۔ اہل یونان کی مظاہر پرستی بھی نہ تھی جن کے یہاں فطرت کی چھوٹی سے چھوٹی شئے بھی اپنا خدا رکھتی تھی جو نہ صرف انسانوں کی طرح تھے بلکہ انسانوں کی طرح کمزوریاں بھی رکھتے تھے۔ اہل فارس کی کائنات میں یہ سب کچھ نہ تھا بلکہ زرتشت کے عقائد آتش پرستی کا بول بالا تھا۔ زرتشت، حضرت عیسیٰ سے کوئی ایک ہزار سال قبل کی شخصیت ہیں ممکن ہے کہ ان سے ذرا قبل یا ذرا بعد بالکل صحیح زمانہ کا تعین کوئی نہیں کر سکا۔ انکا تعلق شمالی ایران سے تھا یا وہ شمالی افغانستان سے تھے یا اسی علاقے کے مشرق سے اس کے بارے میں بھی صحیح بات کسی کو نہیں معلوم۔ زرتشت سے ایسا کوئی دعویٰ بھی منسوب نہیں کہ وہ اپنے وقت کے پیغمبر رہے ہوں یا الوہی توانائی کا مظہر ہوں اور یہ تو خیر بہت دور کی بات ہے کہ انھوں نے اپنے اندر الوہی طاقت یا خدائی صفات کا دعویٰ کیا ہو۔ وہ اپنے آپ کو ایک فلاسفر اور حق کا متلاشی جانتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے پیروکاروں نے انھیں ایک مقدّس ہستی سمجھا۔

زرتشت کی تعلیم تھی کہ کائنات نور و ظلمات میں، پاکیزگی اور شر میں، سچ اور جھوٹ میں اور موت و حیات میں منقسم ہے، تخلیق کے لمحہ میں ہی کائنات ان مختلف اور متحارب خیموں میں منقسم ہو گئی تھی اور جب سے ہی یہ کشمکش جاری ہے اور اختتام تک یہ مقابلہ آرائی جاری رہے گی۔

زرتشت کا کہنا تھا کہ ہر انسان میں یہ متحارب اصول موجود رہتے ہیں اور وہ مکمل آزادی سے جس راہ پر اس کو جانا ہے اسے منتخب کر لیتا ہے۔ پاکیزگی کے انتخاب سے نور اور حیات کی حامل قوتیں مستحکم ہوتی ہیں اور شر کا انتخاب تاریکی اور موت کی طرف لے جاتا ہے۔ زرتشت کی کائنات فکر میں مقدّر کا تصور نہیں پایا جاتا۔ کسی بھی عظیم مقابلہ کا نتیجہ واضح نہیں ہوتا اور یہ کہ نہ صرف ہر انسان اخلاقی فیصلوں میں مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے بلکہ اس نوع کا ہر فیصلہ کائناتی نتائج کو متاثر کرتا ہے۔

زرتشت کے نزدیک یہ آفاقی ڈرامہ دو قوتوں کی کارستانی ہے۔ نہ تو ایک اور نہ ہزار۔ بس دو۔ یزداں کا تعلق پاکیزگی اور اچھائی کے اصولوں سے ہے جبکہ اہرمن تاریکی یعنی برائی سے متعلق ہے۔ آگ زرتشی فکریات

میں یزداں کی نمائندگی کرتی ہے اور اسی بنا پر بعضوں نے خیال کیا ہے کہ زرتشتی آگ کے پجاری ہیں۔لیکن اصل میں ان کی پرستش آگ کی نہیں بلکہ اس کی اصل یعنی یزداں کی ہوتی ہے۔زرتشت نے آخرت کی بات بھی کی تھی جس کے مطابق اچھائی کا انتخاب کرنے والے وہاں بطور انعام نہیں جاتے بلکہ اس راستہ کو اختیار کرنے کے نتیجہ کے طور پر وہاں جاتے ہیں۔کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ان کا جنت میں داخلہ دراصل ایسا ہی ہے جیسے ہم جوتا پہنتے وقت اس کی پشت پر لگے فیتہ سے مدد لیتے ہیں اور ہمارا پیر جوتے میں داخل ہو جاتا ہے۔فارس کے زرتشتوں نے مذہبی بتوں، تصویروں اور شبیہوں کو مسترد کر دیا تھا۔اور اس طرح مذہبی آرٹس میں مصوری کی شدت سے مخالفت کا آغاز ہوا اور یہ مخالفت مزید شدت سے اسلام میں از سرِ نو داخل ہوئی۔

زرتشت یا کم از کم ان کے پیروکاروں نے کبھی یزداں کو آقائے دانشمند کہہ کر پکارا اور کچھ نے یوں کہا کہ پوری کائنات کی تخلیق اسی کے ذریعہ ہوئی۔ پھر اس نے تخلیق کے چند لمحے بعد اپنی اس مخلوق کو دو مخالف صفتوں میں ڈھال دیا۔اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''زرتشتی دوئی'' 'توحید' کی طرف بڑھنے لگی لیکن کبھی اس مقام پر پہنچی نہیں۔اور قدیم فارسی زرتشتیوں کی کائنات فکر میں یہ دونوں مخالف خدائیاں ہی غالب رہیں جن کے اختیارات برابر تھے اور جن کے درمیان رسّہ کشی میں انسان رسّی کی حیثیت رکھتا تھا۔

زرتشتی عابد کو میگس (Magus) کہا جاتا ہے جس کی جمع میگی (magi) مشرق کے ان تین دانشمند زرتشتی عابدوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جنھوں نے مسیحی روایات کے مطابق مسیح کے بچپن میں اُنھیں مُر (ایک خوشبودار گوند) اور لوبان لاکر دیا تھا۔انگریزی لفظ magician یعنی جادوگر بھی magi ہی سے نکلا ہے۔ان عابدوں کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا اور شاید وہ بھی اپنے بارے میں یہی تصور رکھتے تھے کہ وہ معجزانہ قوتوں کے حامل ہیں۔

سلطنت کے آخری زمانہ میں فارسیوں نے رومی علاقوں میں داخل ہونے کی کوشش کی اور یوں مغرب کی عالمی تاریخ میں مختصر ہی سہی لیکن ایک بڑا چھپا کا ضرور ہوا۔شاہ دارا یونانیوں کو سزا دینے کی خاطر مغرب کی سمت سے اچانک حملہ آور ہوا۔میں نے یہاں لفظ سزا حملہ یا فتح کے بجائے استعمال کیا ہے کیونکہ اہل فارس کے نقطہ نظر میں جو بھی جنگیں انھوں نے کیں وہ دو تہذیبوں کی مقابلہ آرائی تھیں۔کسی بڑے نتیجہ تک پہنچنے کی غرض سے نہ تھیں۔اصل میں اہل فارس یونانیوں کو غیر مہذب اور اُجڈ لوگ گردانتے تھے جو عظیم تہذیب کی حامل سلطنت فارس کے مغربی کناروں پر چھوٹے چھوٹے ایسے شہروں میں رہتے تھے جو اصلاً فارس کا حصہ تھے لیکن بہت دور ہونے کی بنا پر راست حکمرانی ممکن نہ تھی۔دارا کی خواہش محض اتنی تھی کہ ان علاقوں میں آباد لوگ بس اتنا تسلیم کرلیں کہ وہ اس کی رعایا ہیں اور علامت کے طور پر ایک برتن میں وہاں کا پانی اور ڈبہ میں مٹی بھر کر بھیج دیں۔یونانیوں نے اس سے انکار کر دیا تو دارا ایک عظیم فوج لیکر انھیں سزا دینے کے لئے نکل پڑا تاکہ اسے وہ بہت دن تک یاد رکھیں۔لیکن بھاری فوج جہاں ایک اثاثہ تھی وُہیں وہ بوجھ بھی تھی۔اتنے آدمیوں کی اتنے فاصلے سے

رہنمائی اور نگرانی کرنا خود ایک بڑا مسئلہ تھا۔ مزید یہ کہ ان کی روزمرہ کی ضروریات کی فراہمی کیسے کی جائے گی دارا نے ان سوالات پر شاید غور نہیں کیا اور یہ بنیادی اصول بھی شاید اسے یاد نہیں رہا کہ یورپ کے میدانوں میں کبھی جنگ نہیں لڑنی چاہئے۔ آخر کار ہوا یہ کہ یونانیوں نے اسے ایک بڑا سبق سکھا دیا۔ لیکن اہل فارس اس سبق کو یاد نہ رکھ سکے اور بہت جلد بھول گئے اور کوئی ایک نسل ہی گذری تھی کہ دارا کے بیٹے زائرس نے اپنے باپ کا بدلہ لینے کی خاطر وہی جوکھم اُٹھایا اور وہی غلطیاں بڑے پیمانے پر کیں۔ نتیجہ کے طور پر گھر واپسی لنگڑاتے ہوئے ہوئی۔ اہل فارس کی یورپی مہمات میں یہ معرکہ آخری ثابت ہوا۔

لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوگئی تھی۔ کوئی ڈیڑھ سو سال بعد سکندر اعظم نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ یہ جو ہم اکثر سنتے ہیں کہ سکندر اعظم نے پوری دنیا فتح کر لی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ اس نے فارس فتح کیا تھا جو پہلے ہی دنیا فتح کر چکے تھے۔

سکندر کے ساتھ تاریخ کا رومی بیانیہ پوری قوت کے ساتھ عالم وسطیٰ میں متعارف ہوا۔ یورپ اور ایشیا کو ملانا سکندر کا خواب تھا اور وہ بابل کو اپنا پایہ تخت بنانا چاہتا تھا۔ سکندر نے اس مہم کے دوران بہت گہرے گھاؤ لگائے تھے جس کے نشان باقی رہے۔ فارسی قصہ کہانیوں اور اساطیر میں سکندر پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے جن میں اُسے غیر معمولی ہمت و بہادری سے متصف پیش کیا گیا ہے جو اگر مثبت نہیں تو بہت خراب شبیہ بھی پیش نہیں کرتیں۔ عالم اسلام کے بہت سے شہروں کے نام سکندر کے نام پر ہیں۔ مصر کا شہر سکندریہ تو خیر بہت واضح مثال ہے ہی لیکن ذرا غیر واضح نام قندھار ہے جسے طالبان نے اپنا پایہ تخت بنایا تو وہ مشہور ہوگیا۔ ابتداء میں یہ اسکندر تھا جو مشرق میں Alexander کا صحیح تلفظ تھا۔ لیکن زمانہ کے ساتھ 'اس' گرا اور کندار قندھار میں تبدیل ہوگیا۔

سکندر کے لگائے ہوئے زخم تو مندمل ہوگئے اور انھیں کھال نے چھپا بھی دیا اور پھر آہستہ آہستہ ایشیا میں اس کا گیارہ سالہ اقتدار قصۂ پارینہ بن گیا۔ بابل میں ایک رات اس کا اچانک انتقال ہوگیا۔ کسی کو نہیں معلوم کہ اسے فلو ہوا یا ملیریا، یا شراب زیادہ پینے سے یا پھر کسی نے اسے زہر دیا۔ اس نے اپنے جرنلوں کو مختلف علاقوں میں تعینات کر رکھا تھا انھیں جب انتقال کی خبر ملی تو جو سب سے مضبوط اور مستحکم جرنل تھے۔ انھوں نے اس علاقے پر اقتدار سنبھال لیا جس پر ان کا قبضہ تھا اور اس طرح Hellinic شہنشاہیت کی بنیاد پڑی جو کئی سو سال تک باقی رہی۔ مثلاً سلطنت بکتریا آج کے شمالی افغانستان پر مشتمل تھی وہاں کے سنگ تراشوں نے ایسے مجسمے تیار کیے جو دیکھنے میں یونانی لگتے تھے۔ اور جب ہندوستان سے بدھ مت کے اثرات اس علاقہ میں پہنچے تو اس فن کے دونوں اسٹائل کا آمیزہ تیار ہوا جسے آج گریکو بدھسٹ آرٹ کہا جاتا ہے۔

بالآخر یہ سلطنتیں کمزور ہوئیں اور یونانی اثرات معدوم ہوتے گئے۔ یونانی زبان کا استعمال بھی بتدریج متروک ہوگیا۔ اور یوں آہستہ آہستہ زیر سطح فارسی طبقہ ابھرنے لگا اور ایک اور سلطنت قدیم فارس کے تقریباً انھیں

علاقوں پر بلکہ ذرا ان سے کم پر قائم ہوگئی۔ ان لوگوں نے اپنے آپ کو پارتھیائی کہلانا پسند کیا۔ یہ بڑے جنگجو اور بہادر تھے۔ اہل روم سے جنگ کی اور مشرق کی سمت انکے بڑھتے قدموں کو روک دیا۔ ان کے شاہی دستے کے فوجیوں نے تاریخ میں پہلی بار مکمل زرہ بکتر سے لیس ہو کر عسکری گھوڑے استعمال کئے۔ کچھ ایسے ہی جیسے ہم یورپ کے جاگیرداری کے دور میں پاتے ہیں۔ یہ شاہی دستے چلتے پھرتے قلعے تھے جنکا حرکت میں آنا خاصا دشوار ہوتا تھا۔ اس لئے پارتھیوں نے دوسرے دستے بھی تیار کئے جن کے فوجی ملبوس ہلکے پھلکے تھے اور گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر سوار ہوتے تھے۔ یہ دستے جنگوں کے دوران کبھی یہ ظاہر کرتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوتے جیسے شکست کھا کر بھاگ رہے ہیں۔ مخالف فوج دھوکہ کھا کر اپنے نظم کو توڑ دیتی اور بھاگتی ہوئی فوج کا پیچھا کرتی لیکن ایک نظم کے ساتھ یہ واپس پلٹ پڑتے اور غیر منظم پیچھا کرتی ہوئی فوج کو کچلنا آسان ہوتا۔ اس انداز کو بعد میں Parthian Shot کہا جانے لگا۔ اور آج جو Parting Shot کا محاورہ ہم سنتے ہیں یہ اسی پارتھین شوٹ کی بگڑی ہوئی شکل ہے[2]۔

پارتھیائی دراصل صحرا نورد شکاری تھے جو فارس کے شمال مشرق پہاڑوں سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے ماضی کی سلطنت فارس کے تحت اپنے آپ کو ڈھال لیا تو عملاً وہ بھی اہل فارس ہی ہو گئے۔ Parthian بھی شاید Persian کی بگڑی ہوئی شکل ہی ہے۔ یہ سلطنت ویسے تو کئی صدیوں تک باقی رہی لیکن جب ختم ہوئی تو یہ اپنی کوئی مثال نہ چھوڑ سکی کیونکہ انھیں آرٹ اور کلچر میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ متحرک قلعہ جوان کی ایک فوجی اختراع ہوگی وہ اپنے سوار کے مرنے کے بعد ردّی ہو جاتا تھا۔

لیکن اس دوران انھوں نے تجارت اور تجارتی سرگرمیوں کی حفاظت اور ان کی ترقی کے لئے سہولیات فراہم کیں۔ چنانچہ سرحدوں کے اندر کارواں بلاخوف سفر کرتے تھے۔ یونانیوں میں پارتھیوں کا پایہ تخت ہیکاٹومپا ئلوز (Hecatompylos) یعنی سو دروازوں کا شہر مشہور تھا کہ اس میں اطراف سے آنے والی سڑکیں اور چھوٹے بڑے راستے یہیں آکر ملتے تھے۔ اور اس طرح سلطنت کے مختلف شہروں کے بازاروں میں مملکت کے تمام اطراف سے اڑ کر آئی ہوئی کہانیاں اور قصے بھی سننے کو مل جاتے تھے۔ اس کی سرحدیں مشرق میں یونانی بدھوں کے علاقے سے، جنوب میں ہندوؤں سے، مشرق بعد میں چین سے، مغرب کی روبہ زوال روسی حکومتوں سے اور مغرب میں آرمینی قوم سے ملتی تھیں۔ پارتھیوں کی رومیوں سے جنگ کے سوائے اور کوئی راہ و رسم نہ تھی۔ جس تہذیبی سیّال نے پارتھیوں کو Parsian بنایا وہ اس سرحد سے باہر نکل نہ سکا۔ چنانچہ رومی اور عالم وسطیٰ علیٰحدہ ہی رہے۔

پارتھیوں کے عروج کا وقت چین کے پہلی بار متحد ہو جانے سے متصل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ چین کی شان و شوکت کا زمانہ نامور 'ہان' خاندان سے متعلق ہے اور تقریباً یہی زمانہ پارتھیوں کے غلبہ کا زمانہ بھی ہے۔ مغرب کی طرف رومیوں کی وسعت کے لئے عظیم جدوجہد بھی پارتھیوں کے ابتدائی دور میں ہوئی تھی۔ جب روم

کارتھیج شہر کو اول اول تاراج کر رہا تھا تو پارتھی بابل پر قابض ہو رہے تھے۔ جب جولیس سیزر گال کو چیرے ڈال رہا تھا پارتھیوں کی طاقت عالم وسطیٰ میں اپنے عروج کو پہنچ رہی تھی۔ ۵۳ قبل مسیح میں پارتھیوں نے ایک جنگ میں رومیوں کو شکست دی۔ ۳۴ ہزار مخصوص سپاہیوں کو قید کرلیا۔ کریس مارا گیا جو سیزر اور پومپئی کے ساتھ روم کا شریک حکمراں تھا۔ کوئی تیس سال بعد پارتھیوں نے مارک انٹونی کو ایک عبرتناک شکست سے دوچار کیا اور یوں دریائے فرات دونوں سلطنتوں کے درمیان کی سرحد قرار پائی۔ پارتھی مشرق کی سمت ابھی بڑھ رہے تھے کہ مسیح پیدا ہوئے۔ عیسائیت نے پارتھیوں کو زیادہ متاثر نہیں کیا کیونکہ یہ لوگ زرتشتی تعلیمات کی رسماً ہی سہی پاسداری اور حمایت کرتے تھے۔ اور جب عیسائی مبلغین نے مشرق کا رخ کیا تو پارتھیوں نے انھیں کوئی خاص توجہ نہ دی البتہ انھیں داخل ضرور ہونے دیا۔ انھیں مذہب کی زیادہ پرواہ نہ تھی۔

پارتھیوں کے یہاں جاگیردارانہ نظام رائج تھا جس میں انتقال حکمرانی کا سلسلہ چھوٹے بڑے رؤسا تک جاتا تھا۔ وقت گذرنے کے ساتھ یہ چھوٹے اور مقامی رؤسا خاصے طاقتور ہو گئے اور اس طرح جاگیرداروں میں تقسیم در تقسیم کا عمل جاری رہا تو تیسری صدی عیسوی میں ایک صوبائی جاگیردار نے بغاوت کردی اور آخری پارتھی کا تختہ پلٹ کر ساسانی خاندان کی بادشاہت کی بنیاد رکھی۔ اور جلد ہی اس نے تمام علاقے پر قبضہ کرلیا جو پارتھیوں کی حکمرانی میں شامل تھا بلکہ کچھ اس سے زیادہ ہی۔ ساسانیوں نے ثقافتی دھارے کا رخ موڑنے کی کوشش نہیں کی بلکہ صرف حکومتی نظم اور کنٹرول کو بہتر کرنے پر توجہ دی۔ ہیلینی اثرات کی باقیات کو ختم کیا اور فارسی کلچر کو بحال کیا۔ بڑے مجسمے تعمیر کئے، وسیع و عریض عمارتیں تعمیر کیں اور بلند و بالا شہر آباد کئے۔ ان کے زمانے میں زرتشی مذہب کو پھر عروج حاصل ہوا۔ آگ و خاک، دھوپ اور اندھیرا، یزداں اور اہرمن کا بول بالا ہوا۔ جسے اب حکمراں مذہب کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ بدھ بھکشو مغرب میں افغانستان میں خوب گشت کرتے اور بدھ مذہب کی تعلیم دیتے پھرتے تھے۔ لیکن زرتشی ایران میں ان کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں اور ان کے ڈالے ہوئے بیج بار آور نہ ہوئے۔ اس لئے انھوں نے مشرق کا رخ کیا اور یوں بدھ مت چین میں متعارف ہوا۔ البتہ یورپ تک اس کے قدم نہ پہنچ سکے۔ لاتعداد فارسی قصہ کہانیاں اور قدیم دیومالائیں عہد ساسانی پر مشتمل ہیں۔ ساسانی بادشاہوں میں عظیم ترین خسرو نوشیرواں کے عدل کے قصّے مشہور ہوئے اور وہ تاریخ میں نوشیرواں عادل کے لقب سے مشہور ہوا اور ایران کے شاید تیسرے افسانوی بادشاہ کیخسرو کے ساتھ مخلوط ہو کر عام ہوا جس کی پوزیشن کچھ ایسی ہی تھی جیسی برطانوی داستانوی بادشاہ آرتھر کی کہ وہ کہیں لوٹ میں بیٹھا اور عظیم سپاہی[۳] ان کی خدمت پر مامور ہیں۔

لیکن اسی دوران رومی سلطنت منتشر ہونے لگی تھی۔ ۲۹۳ء میں شاہ ڈائیکلیٹین (Diocletian) نے اپنی سلطنت کو بہتر انتظام کی خاطر چار حصوں میں تقسیم کردیا کیونکہ وہ اب اتنی وسیع ہو چکی تھی کہ ایک مرکزی مقام سے اس کا سنبھالنا خاصا دقت طلب ہو رہا تھا۔ لیکن اس اصلاح حال کے نتیجہ میں یہ سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ دولت کے تمام تر مشرقی حصہ میں ہونے کی بنا پر رومی سلطنت کا مغربی حصہ باقی نہ رہ سکا۔ جیسے ہی

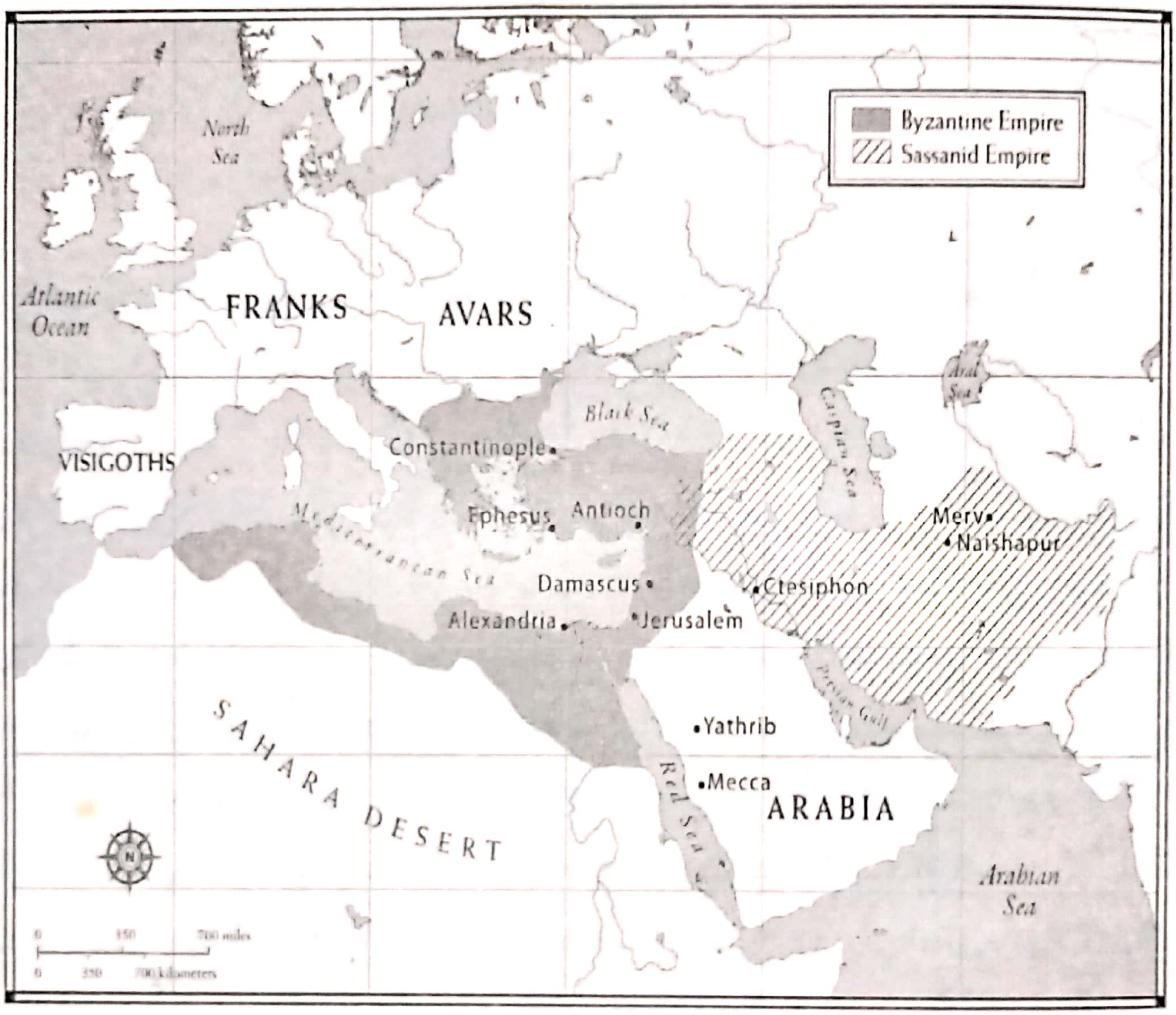
جرمن صحرانورد قبیلے اس سلطنت میں داخل ہونے شروع ہوئے حکومت کے ادارے سکڑ گئے۔ قانون کی اجارہ داری اور انتظامیہ ٹوٹ گئی اور تجارت ٹھٹھر گئی۔ مدرسے بیٹھ گئے۔ مغربی یورپین باشندوں نے لکھنا پڑھنا بڑی حد تک بند کر دیا اور یورپ اپنے دورِ تاریکی میں ڈوب گیا۔ جرمنی، فرانس، اور برطانیہ میں جو رومی شہر آباد ہوئے تھے وہ برباد ہو گئے اور معاشرہ میں اب بس غلام تھے، سپاہی تھے یا پادری۔ مقامی لوگوں کو باندھے رکھنے والی قوت محض عیسائی مذہب کا ادارہ تھا جسے روم کے بشپ کی مدد حاصل تھی اور جسے اب جلد ہی پوپ کا لقب ملنے والا تھا۔

سلطنت روم کے مشرقی بازو جس کا مستقر قسطنطنیہ تھا اپنی جگہ قائم تھا جسے مقامی لوگ اب بھی روم ہی کہتے تھے۔ لیکن بعد کے مورخین کو یہ کچھ نیا سا لگنے لگا تھا چنانچہ انھوں نے اُسے پس دیدگی کے طور سے ہی اسے بازنطینی سلطنت کا نام دیا۔

راسخ العقیدہ یا تقلید پسند مسیحیت کا مرکز یہی علاقہ تھا۔ مغربی مسیحت کے برخلاف یہاں کے چرچ کے پاس پوپ کی طرح کی کوئی شخصیت نہ تھی۔ ہر وہ شہر جہاں عیسائیوں کی معقول تعداد پائی جاتی تھی وہاں ایک سرکردہ بشپ ہوا کرتا تھا۔ اور یہ تمام سرکردہ بشپ مساوی درجہ کے حامل تھے۔ جبکہ قسطنطنیہ کا بشپ اعظم ذرا زیادہ عالی مرتبت خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن بادشاہ ان سب کے اوپر تھا۔ مغربی علوم، ٹکنالوجی اور دانشوری کی روایت بازنطینی شہر تک محدود تھی جہاں مصنّفین اور آرٹسٹ کتابیں اور مصوری اور اسی طرح کے دوسرے کام کرتے تھے۔ لیکن جب روم بازنطینی سلطنت قرار دیا گیا تو مغربی تاریخ سے یہ تقریباً غائب ہی ہو گیا۔

میرے اس نقطۂ نظر سے بہت سے لوگ اختلاف کریں گے کہ یہ سلطنت بحر حال ایک عیسائی سلطنت تھی۔ اس کی رعایا یونانی زبان بولتی اور اس کے فلاسفہ۔۔۔ بہتر ہے کہ اس کے فلسفیوں کے بارے میں زیادہ کچھ نہ کہا جائے کیونکہ ہر تعلیم یافتہ مغربی سوفوسلز، ورجل، ٹیکٹس، پیریسلس، مقدونیہ کا سکندر، جولیس سیزر، اگسٹس اور اسی طرح بعض دوسرے ناموں کو اگر چھوڑ بھی دیں تو سقراط بقراط اور ارسطو سے تو واقف ہے ہی۔ لیکن ان اسکالرز کو چھوڑ کر بازنطینی تاریخ میں مہارت رکھنے والے شاید ہی کسی تین بازنطینی فلاسفہ کا نام بتا سکیں یا شاعروں کی نشاندہی کر سکیں یا جسٹینین کے علاوہ کسی دوسرے بادشاہ کا نام ہی بتا سکے۔ بازنطینی سلطنت کوئی ہزار سال تک باقی رہی لیکن شاید ہی کسی کو پانچ اہم واقعات یاد ہوں جو اس دوران اس علاقہ میں واقع ہوئے۔ قدیم رومی سلطنت کے مقابلہ میں بازنطینی سلطنت زیادہ اثرات مرتب نہ کر سکی۔ لیکن اپنے علاقہ میں یہ ایک بڑی طاقتور سلطنت تھی اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس علاقہ میں کوئی اس کا مدّ مقابل نہ تھا اور دوسری یہ کہ اس کا دارالسلطنت شاید دنیا کا واحد ناقابل تسخیر شہر سمجھا جاتا تھا۔ چھٹی صدی کے نصف تک بازنطینی سلطنت تقریباً پورے ایشیا مائنر اور آج جسے مشرقی یورپ کہتے ہیں کے علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس علاقے کی دوسری عظیم طاقت فارس کی ساسانی سلطنت سے وہ ٹکرا چکے تھے۔ ساسانی سلطنت مشرق میں ہمالیہ کے دامن تک کے علاقوں کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ ان دو سلطنتوں کے درمیان ایک ایسی پٹی تھی جس کی ملکیت میں اختلاف تھا۔ بحر روم کے کنارے

کا علاقہ جہاں دنیا کی دونوں تاریخیں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں وہاں تنازعات عام تھے۔ جنوب کی جانب یعنی دو عظیم سلطنتوں کے زیر سایہ متعدد مطلق العنان قبیلوں کو بسائے جزیرہ نمائے عرب ہے۔ اسلام کی آمد سے ذرا قبل عالم وسطیٰ کی سیاسی ہیئت اور وضع کچھ ایسی تھی جیسی گذشتہ صفحات میں بیان ہوئی۔



اسلام کی آمد پر بازنطینی اور ساسانی سلطنتیں

باب ۲

ہجرت

(سال صفرھ، ۶۲۲ء)

چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے ساحلی علاقوں کے متعدد شہر کامیاب تجارتی مراکز کی حیثیت اختیار کر چکے تھے جہاں ہمہ وقت تجارتی سرگرمیاں جاری رہتیں تھیں۔ بحر احمر پر واقع بندرگاہوں سے عرب تاجر اشیا حاصل کرتے اور اونٹوں کے کارواں ریگستانوں کو عبور کرتے ہوئے انھیں شام اور فلسطین کے علاقوں تک پہنچاتے۔ ان میں اکثر مسالے، کپڑے، اور دوسری تجارتی اشیاء ہوتی تھیں۔ یہ لوگ کیونکہ مشرق و مغرب، شمال اور جنوب ہر چہار جانب سفر کرتے تھے اس لئے نہ صرف عیسائی دنیا اور ان کے خیالات سے واقف تھے بلکہ زرتشت اور ان کی تعلیمات سے بھی آگاہ تھے۔ عربوں کے ساتھ بہت سے یہودی قبائل بھی آباد ہو گئے تھے جنھیں رومیوں نے اپنے تسلط کے بعد فلسطین سے بے دخل کر دیا تھا۔ عرب اور یہودی دونوں ہی سامی نسل سے تھے اور ابراہیم کو اپنا جدامجد مانتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس طرح ان کا سلسلہ بھی آدم سے مل جاتا تھا۔ عرب، نسل ابراہیمؑ میں اسمٰعیلؑ سے جو ہاجرہ کے بطن سے تھے اپنا سلسلۂ نسب جوڑتے تھے۔ چنانچہ توریت میں مذکور آدم وحوّا، ہابیل و قابیل، نوح اور ان کی کشتی، مصر کے یوسف کا قصہ، موسیٰ و فرعون اور اسی طرح کے دوسرے واقعات عربوں کی روایات کا بھی حصہ بن چکے تھے۔ گو کہ عربوں کی اکثریت اس وقت بتوں کی پجاری تھی لیکن یہودی بڑی سختی سے توحید پر قائم رہے تھے۔ بس اس فرق کو چھوڑ کر یہ دونوں گروہ کسی طور پر مختلف نہ تھے۔ اور کوئی امتیازی پہچان نہ تھی۔ ثقافت رہن سہن ایک جیسا ہی تھا۔ یہاں کے یہودی عربی بولتے اور انکا قبائلی نظام بھی عربوں جیسا ہی تھا۔ عربوں میں کچھ صحرائی بدّو تھے جو ریگستان میں رہتے لیکن زیادہ تر شہروں میں آباد تھے۔ محمدؐ کی پیدائش اور پرورش بحر احمر کے کنارے پر واقع شہر مکہّ میں ہوئی جس کا ماحول اور اہمیت عالمی نوعیت کی ہو چکی تھی۔

اہل مکہّ مختلف النوع اشیاء کی تجارت کرتے لیکن سب سے بڑی اور قدر و منزلت کی حامل تجارت کا تعلق مذہب سے تھا۔ مکہّ کے عظیم مندر میں سو سے زیادہ دیوی دیوتا تھے جن کے ناموں میں ہبل، منات، لات، عزّیٰ اور فلش زیادہ معروف ہیں۔ زائرین آتے، مقامات پر حاضری دیتے، رسومات ادا کرتے اور تھوڑی بہت تجارت بھی کرتے۔ اس طرح مکہ میں سیاحت نے بڑے تجارتی امکانات کھول رکھے تھے۔ چنانچہ لوگوں کے طعام و قیام کے لئے سرائیں تھیں، دکانیں تھیں اور مئے خانے بھی موجود تھے۔ طعام کے سلسلہ کی

ضروری خدمات کا انتظام بھی ہوا کرتا تھا۔

محمدؐ کی پیدائش کوئی ۵۷۰ عیسوی میں ہوئی صحیح تاریخ پیدائش نہیں معلوم کیونکہ اس وقت انھیں کوئی خاص توجہ کسی نے نہیں دی تھی۔ باپ ایک غریب آدمی تھے جنکا انتقال اس وقت ہی ہو گیا تھا جب وہ ابھی حمل میں ہی تھے۔ باپ کے انتقال کی وجہ سے ان کی ماں کنگال ہو گئی تھیں اور محمدؐ ابھی چھ سال کے ہی تھے کہ وہ بھی چل بسیں۔ حالانکہ محمدؐ قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے تھے جو مکہ کا ایک انتہائی طاقتور قبیلہ تھا لیکن کیونکہ محمدؐ بنو ہاشم سے تھے جو مالی اعتبار سے کمزور خاندان تھا اس لئے قریش کی طاقت اور اثرات اس وقت ان کے کسی کام کے نہ تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ پرورش کے دوران اپنے غیر یقینی مستقبل اور یتیم ہونے کی بنا پر یہ لڑکا خاصا حسّاس ہو گیا ہوگا۔ البتہ اسے افتادہ نہیں چھوڑا گیا اور بہت قریبی عزیزوں نے اسے سنبھال لیا۔ پہلے تو اپنے دادا کا ساتھ رہا تا آنکہ ضعیف شخص اپنی عمرِ طبعی کو جا پہنچا اور پھر چچا ابو طالب نے اپنے بیٹے کی طرح ان کی پرورش کی۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس معاشرہ میں ان کی کوئی حیثیت نہ تھی اور اپنے چچا کے گھر سے باہر شاید انھیں اس تحقیر اور بے قدری و رسوائی کا سامنا بھی ہوا ہوگا جو بالعموم یتیموں کا حصہ ہوا کرتی ہے۔ بچپن ہی میں بیواؤں اور یتیموں سے ہمدردی ان کی عمر عزیز کا وصفِ خاص بن گئی۔

جب وہ ۲۵ سال کے ہوئے تو ایک دولتمند بیوہ خدیجہ نے انھیں اپنے تجارتی کاروانوں کا نظم سنبھالنے اور ان کی تجارت کرنے کے لئے معاوضہ پر رکھا۔ عرب معاشرہ عورتوں کے تئیں شفقت و مروّت کا روادار نہ تھا لیکن ایک تو یہ کہ انھیں اپنے شوہر کی دولت ترکہ میں ملی تھی اور بڑی بات یہ کہ اس دولت کو انھوں نے محفوظ رکھا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کتنی کرشماتی اور طاقتور رہی ہوگی۔ باہمی احترام اور ہمدردی نے بہت جلد محمدؐ اور خدیجہؓ کو نکاح کے شیریں رشتہ میں باندھ دیا۔ جو کوئی پچیس سال یعنی خدیجہؓ کے انتقال تک باقی رہا۔ عربی معاشرہ ایک کثیر زوجی معاشرہ تھا اور اس میں محض ایک بیوی پر اکتفا کرنا غیر معروف تھا لیکن محمدؐ نے خدیجہؓ کی حیات میں کسی دوسری عورت کو یہ مقام نہیں دیا۔

ایک عاقل و بالغ یتیم کی حیثیت میں محمدؐ نے ذاتی طور پر ایک کامیاب تجارتی زندگی تعمیر کر لی اور اپنی معاملہ فہمی کی وجہ سے ایک اعلیٰ سفارتکارانہ صلاحیتوں کے حامل شخصیت کی حیثیت میں مشہور ہونے لگے۔ اختلافات پیدا ہو جانے پر مختلف گروہ انھیں اپنے معاملات سلجھانے کے لئے بلاتے۔ ان کامیابیوں کے باوجود چالیس سال کو پہنچتے پہنچتے انھیں ایک قسم کی تشویش اور بحران نے گھیر لیا؟ زندگی اور اس کے معنی انھیں ستانے لگے۔ انھوں نے دیکھا کہ ہر طرف دولت کی ریل پیل ہے لیکن اس کے باوجود بیوہ عورتیں بڑی تشویشناک حد تک محض دوسروں کے رحم و کرم پر زندگی گذارتی ہیں اور یتیموں کو محض پیٹ بھرنے کے لئے بھی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ محمدؐ سوچتے؟

انھوں نے ایک معمول بنالیا کہ تنہائی میں غور و خوض کی خاطر وقفہ وقفہ سے ایک پہاڑی کے غار میں

چلے جاتے۔اس غار میں انھیں ایک روز انتہائی اہم اور مہتمم بالشّان تجربہ ہوا۔اس تجربے کی بہت واضح روداد تو راز میں ہے لیکن مختلف بیانات تاریخ نے محفوظ کر لئے ہیں جو شاید محمدؐ نے مختلف اوقات میں اپنے رفقاء کے سامنے بیان کئے ہونگے۔البتہ جس پر سب لوگ متفق ہیں وہ یہ ہے کہ یہ موقع جبریل کی آمد کا تھا۔ایک بیان میں آپ نے ایک ریشمی کپڑے کا ذکر کیا جس پر کچھ لکھا ہوا تھا جو آپ پر اسوقت پیش کیا گیا جب محوِ خواب تھے[1]۔لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ ایک مکالمہ تھا جو اس وقت شروع ہوا جب آپ نے اس غار کی تاریکی اور مراقبہ کی تنہائی میں کسی دوسرے وجود کو محسوس کیا۔اچانک اس وجود نے انھیں پیچھے سے اتنی سختی سے اپنی گرفت میں لے لیا کہ سانس لینا بھی دوبھر ہوا۔پھر ایک آواز بلند ہوئی جو سننے سے زیادہ ان کے پورے وجود کو نہلا رہی تھی اور حکم دے رہی تھی کہ پڑھو۔

بمشکل تمام محمدؐ یہ کہہ سکے کہ میں پڑھ نہیں سکتا۔

آواز نے دوبارہ پڑھنے کا حکم دیا۔

پھر محمدؐ نے اپنی مجبوری ظاہر کی کہ میں نہیں جانتا پڑھنا اور نہیں جانتا کہ کیا پڑھوں۔لیکن فرشتہ، آواز، اور ہیجان۔وہ ایک بار پھر گویا ہوا۔پڑھو!اس پر محمدؐ نے مہیب اور شوکت جلال سے پُر الفاظ کو اپنے قلب میں شکل اختیار کرتے ہوئے محسوس کیا اور پھر وہ الفاظ میں ڈھلنے لگے۔

> پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا پڑھ پیدا کیا انسان کو خون کے ایک قطرے سے پڑھ تیرا رب بڑا ہی کریم ہے وہ جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ پڑھایا انسان کو وہ پڑھایا جو وہ جانتا نہ تھا۔ (العلق)

محمدؐ پہاڑی سے اتر آئے وہ خوفزدہ اور بیمار لگ رہے تھے۔سوچتے کہ کہیں کسی جن کے زیر اثر تو نہیں آ گئے وہ۔باہر انھوں نے کسی ایسے وجود کو محسوس کیا جو دنیا کے افق پر پھیلا ہوا تھا۔کچھ بیان ایسے بھی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ انھوں نے بڑی روشنی دیکھی جس کے درمیاں میں ایک انسانی ہیئت تھی جو بڑی ہی پر ہیبت اور پُر جلال تھی۔گھر پہنچے تو خدیجہؓ کو پورا ماجرا سنایا اور انھوں نے دلاسہ دیا اور پورے یقین سے کہا کہ محمدؐ آپ بالکل ٹھیک ہیں مکمل طور پر سلیم العقل اور ذی فہم ہیں اور یہ جو آپ سے آ کر ملا وہ دراصل فرشتہ تھا جو یہ بتانے آیا تھا کہ اللہ آپ پر ایک بڑی خدمت کی ذمہ داری ڈالنے والا ہے۔مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہے میں آپ پر ایمان لاتی ہوں خدیجہؓ نے کہا۔اور یوں خدیجہؓ اوّلین پیروکار ہو گئیں محمدؐ کی اوّلین مسلم۔

اوّل اوّل محمدؐ نے اپنے قریبی دوستوں اور اعزّہ ہی کو تعلیم دی۔کچھ عرصہ تک مزید کوئی وحی آپ کے پاس نہیں آئی۔جس سے وہ دلبرداشتہ سے ہو گئے۔انھیں لگا کہ شاید اللہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔لیکن وحی کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔بتدریج محمدؐ عوام کو یہ پیغام دینے لگے اور پھر پورے مکہ میں آپ کی باتیں پھیلنے لگیں۔

''خدا صرف ایک ہے۔اس کی مرضی کے آگے جھک جاؤ ورنہ انجام جہنم ہے۔'' خدا کی مرضی کے آگے جھکنے کا مطلب کیا ہے یہ بھی واضح کیا۔عیاشی، شراب نوشی، ظلم و بے رحمی سے اجتناب اور کمزور و مسکین انسانوں کی مدد،

غریبوں کی خبر گیری عدل کے لئے ہر طرح کی قربانی اور بڑی بڑی اچھائیوں کی انجام دہی۔

مکہ میں ویسے تو کئی مندر تھے لیکن ایک مکعب نما ڈھانچہ جس کے ایک کونے میں سیاہ چمکیلا پتھر نصب تھا جو کافی عرصہ قبل آسمان سے گرا تھا اور جو ممکن ہے کہ شہابہ رہا ہو۔ اس ڈھانچے کی بڑی تعظیم کی جاتی تھی۔ اسے کعبہ کہتے تھے اور مقامی روایتوں میں یہ معروف تھا کہ اس کی تعمیر خود ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ کے ساتھ ملکر کی تھی۔ محمدؐ اپنے آپ کو ابراہیمؑ کی نسل سے سمجھتے تھے اور انھیں ابراہیم کے بے لچک عقیدہ توحید کے بارے میں تمام معلومات حاصل تھیں۔ حقیقتاً محمدؐ خوب سمجھتے تھے کہ وہ جو کچھ بھی اپنے لوگوں کو بتا رہے تھے وہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ بلکہ جو ابراہیمؑ اور دوسرے بے شمار انبیاء بتاتے آئے تھے وہی ان کی دعوت بھی تھی۔ چنانچہ انھوں نے پوری توجہ کعبہ پر مرکوز کر دی اور کہا کہ مکہ میں اب یہی عبادت گاہ ہونی چاہئے کیونکہ یہ اللہ واحد کی نشانی ہے۔

'ال' عربی زباں میں انگریزی کے the کی جگہ استعمال ہوتا ہے اور 'الہٰ'، 'الہٰ' مجذوب ہو کر آیا ہے جس کے معنی خدا ہیں۔ چنانچہ اللہ کے معنی خدا کے ہیں۔ اسلام میں یہ مرکزی نکتہ ہے۔ محمدؐ کی دعوت میں یہ خدا یا وہ خدا کا مسئلہ نہ تھا۔ انکا یہ بھی کہنا نہ تھا کہ "ایمان لاؤ خدا پر جسے 'الہٰ' کہتے ہیں کیونکہ خداؤں میں وہی سب سے بڑا اور سب سے طاقتور ہے۔ وہ نہ یہ کہہ رہے تھے کہ 'الہٰ' ہی واحد اور سچا خدا ہے اور باقی سب جھوٹے ہیں۔ کوئی اس طرح کے تصور کی پرورش کر سکتا تھا اور یہ بھی سوچ سکتا تھا کہ خدا ایک خاص وجود ہے جسے ماورائے فطرت طاقت حاصل ہے۔ یا وہ Zesus کی طرح کوئی لافانی ہستی ہے جو ایک ہاتھ میں سواونٹوں کو پکڑ کر اٹھا سکتی ہے اور اپنی طرح وہ واحد ہستی ہے۔ یہ بھی ایک ہی خدا میں ایمان ٹھیرتا۔ لیکن محمدؐ جو کچھ بتا رہے تھے وہ ان تمام سے نہ صرف مختلف تھا بلکہ ان سے بڑا بھی تھا۔ محمدؐ ایسے خدا کا تصور پیش کر رہے تھے جو ہر ایک کو اسطرح محیط اور عالمگیر و کائناتی تھا کہ اس کے ساتھ کوئی مخصوص شکل کچھ خاص صفت کوئی محدود تصور اور کوئی حد وابستہ کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ خدا تو بس ایک ہے اور باقی جو کچھ ہے اس کی مخلوق ہے۔ ہر بسنے والے کے لئے یہی مقام تھا جو وہ دے رہے تھے۔

مکہ کے تاجرین کو محمدؐ رسول اللہ کی ان تعلیمات سے خوف لاحق ہونے لگا تھا کیونکہ زائرین کی آمد ان کے لئے تجارت کے بڑے مواقع فراہم کرتی تھی۔ ان کے خیال میں اگر ایک خدا کی بات چل نکلی تو دوسرے خداؤں کے ماننے والے آنا بند کر دیں گے اور یوں ان کی تجارت ختم ہو جائیگی۔ (دلچسپ بات یہ ہے کہ آج ایک ملین سے زیادہ افراد حج کی غرض سے ہر سال مکہ آتے ہیں اور کعبہ کی زیارت کے ساتھ ساتھ دوسری رسومات بھی ادا کرتے اور اس طرح یہ دنیا کا سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے)۔

اس زمانۂ زیارت کے علاوہ مکہ میں آمدنی کے ذرائع دوسرے بھی تھے۔ مثلاً شراب پینے کے بڑے مواقع، جوا، قمار بازی، جسم فروشی۔ مکہ کے طاقتور قبائلی سرداروں کے لئے یہ نا قابل برداشت تھا کہ ایک شخص ان کے ان تفریحی مشاغل میں دخل اندازی کرے جو ان کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھے۔ گو کہ محمدؐ اور ان کے ساتھیوں

کی کوئی حیثیت نہ تھی کیونکہ یہ لوگ غریب، غلام اور کمزور تھے اور ان کے لئے کوئی چیلنج نہیں بن سکتے تھے لیکن محمدؐ کے ماننے والوں میں تمام ہی لوگ غریب اور کمزور نہ تھے۔ ان میں ابوبکراور عثمان جیسے باوقار اور معاشرہ میں قابل احترام افراد بھی تھے اور جلد ہی ان میں عمر جیسی طاقتور شخصیت بھی شامل ہوگئی تھی جو ابتداء میں محمدؐ کی جانی دشمن تھی۔ شروع ہونے والا یہ سلسلہ بڑے خطرات ظاہر کر رہا تھا۔

کوئی بارہ سال تک محمدؐ کے چچا ابوطالب ان کے پشت پناہ رہے اور ان پر ہر تنقید اور مخالفت میں ان کا ساتھ دیا۔ ابوطالب کے بارے میں مسلمانوں کی اکثریت کا خیال ہے کہ انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ لیکن محمدؐ کے ساتھ ان کی مکمل وفاداری ذاتی نوعیت کی تھی اور بھتیجہ کے تئیں محبت کا اظہار تھی۔ مزید یہ کہ وہ ایک باوزن شخص تھے اور ان کے الفاظ کی بڑی اہمیت تھی۔ خدیجہؓ بھی اپنے شوہر کی رفاقت اور حمایت میں بڑی فیاض تھیں۔ جو محمدؐ کے لئے بڑے ہی اطمینان اور سکون کا باعث تھا۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ ایک ہی تباہ کن سال میں محمدؐ کی حیات کی یہ اہم اور بڑی ہستیاں انتقال کر گئیں اور اللہ کے رسول کو دشمنوں کے لئے غیر محفوظ اور بے آسرا چھوڑ گئیں۔ اسی سال مکہ کے سات بڑوں نے طے کیا کہ محمدؐ سے چھٹکارا پانے کا صرف ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے کہ انھیں قتل کر دیا جائے اس سے پہلے کہ ان کی معیشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے۔ محمدؐ کے متعدد چچاؤں میں سے ایک نے اس پورے منصوبے کی نگرانی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام سازشی محمدؐ کے عزیزوں ہی میں سے تھے۔ رشتہ داری ان کے اس فیصلہ کو نرم نہ کر سکی تھی۔

خوش قسمتی سے محمدؐ کو اس سازش کی خبر ہوگئی اور انہوں نے اپنے دو قریبی ساتھیوں کے ساتھ مل کر بچ نکلنے کا منصوبہ بنالیا۔ جن میں ایک ان کے چچازاد بھائی علیؓ جو اب ایک تنومند جوان تھے اور جو جلد ہی محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ سے نکاح کر کے ان کے معنوی بیٹے یعنی داماد بھی بننے والے تھے۔ دوسرے محمدؐ کے قریب ترین دوست ابوبکرؓ تھے جو آپ کے خاندان سے باہر پہلے ایمان لانے والوں میں سے تھے اور جو جلد ہی رسول کے معنوی باپ بھی بننے والے تھے۔

محمدؐ پہلے ہی سے یثرب کے مندوبین سے رابطہ میں تھے۔ یہ شہر مکہ سے کوئی ڈھائی سو میل دور، بحر احمر کے کنارے مکہ کے شمال میں واقع تھا۔ اور بنیادی طور پر ایک زراعتی علاقہ تھا لیکن مکہ جیسا تجارتی مرکز نہیں تھا۔ یہاں کے باشندے یہ چاہتے تھے کہ کوئی انصاف پسند شخص ان کے درمیان آجائے اور غیر جانبداری اور انصاف سے ان کے جھگڑوں کو چکایا کرے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر منصفانہ اختیار کسی ایسے شخص کو دے دیا جائے گا تو وہ ان کے درمیان امن قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیگا۔ ایک منصف اور ماہر ثالث کی حیثیت سے محمدؐ کی شخصیت پہلے ہی سے متعارف تھی۔ کیونکہ وہ پہلے ہی سے ایسے متعدد مسائل کو سلجھا چکے تھے۔ چنانچہ اہل یثرب نے سوچا کہ شاید یہ شخص ہمارے کام کا ہے۔ چنانچہ ان کے کئی آدمی مکہ آ کر رسول اللہؐ سے ملاقات کر چکے تھے اور ان کی حاوی شخصیت اور کردار کے معترف ہوگئے تھے۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا اور رسول اللہ کو مدینہ آ کر بسنے کی دعوت دی

اور خواہش کی کہ وہاں کے لوگوں کے اختلافات کو انصاف کے ساتھ حل کر دیں۔ محمدؐ نے انکی یہ دعوت قبول کر لی۔
محمدؐ کے قتل کی سازش ۶۲۲ ءعیسوی ستمبر کی کسی رات کے لئے طے ہوئی تھی۔ اسی رات محمدؐ اور ابوبکرؓ کسی طرح آبادی سے نکل گئے اور ریگستان کی راہ لی۔ علیؓ محمدؐ کے بستر میں آکر آہستگی سے لیٹ گئے تا کہ یہ محسوس ہو کہ محمد بستر میں ہی ہیں۔ جب قتل کرنے کی نیت سے لوگ اندر آئے اور بستر پر علیؓ کو پایا تو بڑے آگ بگولہ ہوئے لیکن انھیں چھوٹا سمجھ کر چھوڑ دیا اور ایک ہتھیار بند دستہ بنا کر ریگستان کے علاقے میں محمد کو تلاش کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔ محمدؐ اور ابوبکرؓ ابھی مکہ سے باہر نہ نکلے تھے بلکہ راستے میں پڑنے والی پہاڑی کے ایک غار میں پناہ لے رکھی تھی۔ روایت بتاتی ہے کہ جیسے ہی یہ دونوں اس غار میں داخل ہوئے ایک مکڑی نے غار کے دہانہ پر جالا بنالیا۔ جب یہ ہتھیار بند دستہ قریب آیا اور اس نے غار کے منھ پر جالا دیکھا تو یہ سوچا کہ اندر کوئی نہیں ہوگا اور آگے بڑھ گئے۔ اس طرح محمدؐ اور ابوبکرؓ بحفاظت یثرب پہنچ گئے۔ اس وقت ان کے بعض پیروکار پہلے ہی سے یثرب پہنچ چکے تھے۔ اور آنے والے دنوں میں باقی لوگ بھی یثرب منتقل ہو گئے۔ مکہ سے آنے والے یہ مہاجرین اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر آئے تھے۔ بہت سوں کے خاندان اور دوسرے اعزہ چھوٹ گئے جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے۔ یہ سب صحیح لیکن وہ اب ایک ایسی جگہ آرہے تھے جو محفوظ تھی اور جہاں انکے رہنما محمدؐ کو بلایا ہی اس لئے گیا تھا کہ وہ ان پر حکمرانی کریں تا کہ قبائلی سرداروں کے آپسی اختلافات ختم ہو جائیں۔ اپنے عہد کے مطابق محمدؐ مدینہ کے ان تنک مزاج قبائل کو لیکر بیٹھے اور گفت وشنید سے ایک معاہدہ تک پہنچ گئے جسے تاریخ میں میثاقِ مدینہ کہا جاتا ہے۔ اس کے تحت مدینہ ایک قسم کا وفاق تسلیم کر لیا گیا جس میں ہر قبیلہ کو اپنے مذہب اور اپنی روایت پر قائم رہنے کے حق کو تسلیم کیا گیا تھا اور اس کی ضمانت دی گئی تھی۔ اس کے مطابق تمام شہریوں پر ایسے قوانین نافذ کئے گئے تھے جنکا مقصد شہر میں امن وامان قائم کرنا تھا۔ ایک ایسا قانونی ڈھانچہ بھی منظور کرالیا گیا جس کے تحت ہر قبیلہ اپنے اندرونی معاملات کو خود ہی ٹھیک کر لیتا۔ اور جو نہ ہوسکیں ان میں محمدؐ کے ذریعہ کئے گئے فیصلوں کو تسلیم کرنا ہر قبیلے کی ذمہ داری تھی۔ اس معاہدے کو پہلا تحریری دستور کہا جاتا ہے لیکن اصل میں یہ مختلف گروہوں کے بیچ ایک قسم کا صلح نامہ تھا۔

رسول اللہؐ نے یہ بھی کیا کہ ہر ایک مقامی یعنی یثرب کے باشندہ کو مکہ سے آئے ہوئے ایک فرد کا مشیر مقرر کیا جس کی ذمہ داری تھی کہ وہ مکہ سے آئے ہوئے ایک فرد اور اس کے اہل خانہ کو مدینہ میں آباد ہونے اور ایک نئی زندگی شروع کرنے میں مدد کرے۔ اس وقت سے یثرب کے مسلمان انصار یعنی مددگار کہلائے جانے لگے۔

شہر کا نام بھی بدل گیا اور یثرب مدینۃ النبی ہو گیا۔ جس کے معنی نبی کا شہر ہوتے ہیں جواب مختصر کر کے مدینہ یعنی شہر کے لئے مستعمل ہو گیا۔ مسلمانوں کا مکہ سے مدینہ آجانا اسلامی تاریخ میں ہجرت کہلاتا ہے۔ کوئی دس بارہ سال بعد جب مسلمانوں نے اپنا ایک نیا کلینڈر ایجاد کیا تو اسے انھوں نے اسی واقعہ سے شروع کیا کیونکہ

اسلام کی تاریخ میں انکے خیال میں یہی وہ موقع تھا جس نے تاریخ کا دھارا موڑا اور مسلمانوں کے مستقبل کی نقشہ گری کی اور پورے وقت کو ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد میں تبدیل کر دیا۔

بعض مذاہب اپنے بانی کے یوم پیدائش کو اپنا نقطۂ آغاز مانتے ہیں اور بعض اس کے اس دنیا سے چلے جانے کو یہ مقام دیتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو اپنے رسول کے خدا سے تعلق قائم ہونے کے لمحہ کو حوالہ بناتے ہیں۔ مثلاً بدھ مت میں جب بودھی درخت کے نیچے سدھارت گوتم کو آگاہی حاصل ہوئی تو یہ لمحہ ان کی پہچان بن گیا۔ عیسائیوں میں حضرت عیسیٰؑ کی موت اور انکے دوبارہ زندہ ہونے کو یہ مقام حاصل تھا۔ لیکن اسلام میں رسول کی پیدائش پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ مجھے مسلمان کی حیثیت سے پرورش کے دوران یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ کب پیدا ہوئے تھے کیونکہ افغانستان میں اس دن کوئی خاص کام نہیں ہوتا۔ بعض ممالک جیسے مصر میں اس دن کو خصوصی طرح سے منایا جاتا ہے۔ لیکن کرسمس کی طرح ''محمد مس'' مسلمانوں میں کہیں بھی نہیں ہوتا۔

غار میں جس رات پہلی وحی نازل ہوئی وہ رات مسلمانوں میں ایک مقدس اور اہم ترین رات کی حیثیت سے یادگار رات بن گئی جسے طاقت کی رات یا شب قدر کہا گیا جو ماہِ رمضان کی ۲۷ ویں یا اس کے قریب کوئی رات ہوتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کے کلینڈر میں یہ واقعہ بھی ہجرت جیسے نقطۂ تغیر سے کوئی دس سال سے قبل کا ہے۔

ایک سے دوسرے مقام تک نقل مکانی کا یہ واقعہ آخر کیونکر اتنا مہتم بالشان ہو گیا؟ مسلم تاریخ میں ہجرت کی اہمیت اس بنا پر ہے کہ یہ امت مسلمہ کی پیدائش کا حوالہ ہے۔ ہجرت سے قبل محمدؐ ایک داعی تھے جن کے چند انفرادی پیروکار تھے۔ ہجرت کے بعد وہ ایک جماعت کے ایسے سربراہ ہو گئے جن کی طرف لوگ قانون سازی، سیاسی رخ، اور معاشرتی ہدایات کے لئے دیکھتے تھے۔ ہجرت کے معنی رشتوں اور بندھنوں کو توڑ لینے کے ہیں۔ جن لوگوں نے ہجرت کی اور مدینہ میں زیر تشکیل جماعت سے وابستہ ہو گئے انھوں نے اپنی قبائلی روایات اور رشتوں کو ترک کیا اور ان سے دستبردار ہو گئے تھے۔ اور ایک نئے لامحدود الحاق کا حصہ بن گئے تھے جو اصل میں ایک متبادل معاشرہ کی تعمیر کا پیش خیمہ تھا۔ ایک ایسا متبادل جو محمدؐ کے بچپن والے مکّہ سے مختلف ہونے والا تھا۔ یہ ایک بڑا ہی پروقار اور پرشکوہ منصوبہ تھا۔ جو عشق الٰہی اور پرہیز گاری میں وارفتگی کو مکمل طور پر سموئے ہوئے تھا۔

معاشرتی منصوبہ ہجرت کے بعد جس کا پورے طور پر اظہار مدینے میں ہوا یہ اسلام کا مرکزی عنصر ہے۔ اسلام یقیناً ایک مذہب ہے لیکن بالکل ابتداء ہی سے اگر ہجرت کو ابتداء مانا جائے تو یہ ایک سیاسی وجود بھی ہے۔ ہاں اسلام ایک اچھا انسان بننے کا طریقہ سکھاتا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ ہر مسلمان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ اس طریقہ پر چل کر وہ جنت حاصل کر سکے۔ لیکن انفرادی نجات پر مرتکز ہونے کے بجائے اسلام ایک پرہیز گار جماعت پر توجہ دیتا ہے۔ افراد کو جنت میں مقام اس جماعت کے رکن کی حیثیت سے اس جماعت میں شامل رہنے اور اسلام کے معاشرتی منصوبہ کے لئے برسرپیکار رہنے اور ایک ایسی دنیا آباد کرنے کی جدوجہد کرنے سے ملتا ہے جس میں یتیم اپنے آپ کو تنہا اور بے سہارا محسوس نہ کریں اور بیوائیں کبھی بے گھر نہ ہوں، بھوکی نہ

رہیں اور انھیں کسی کا خوف نہ ہو۔

جب ایک بار محمدؐ مدینہ کے رہنما ہو گئے تو لوگ ان کے پاس رہنمائی اور فیصلوں کے لئے آتے۔ ہر طرح کے مسائل اور سوالات کے لئے وہ چاہے چھوٹے ہوں یا بڑے ان سے رجوع کرتے۔ مثلاً بچوں کی تربیت کیسے کی جائے۔۔۔ ہاتھ کیسے دھوئیں؟۔۔۔معاہدہ کرتے ہوئے کیا جائز ہے؟۔۔۔ چوروں کے ساتھ کیا کریں؟۔۔۔اور یہ فہرست طویل ہوتی جائے گی۔ دوسری جماعتوں میں اس نوع کے سوالات کے جواب کے لئے ایک علیحدہ اختصاص رکھنے والی جماعت درکار ہوگی جس میں منصف ہونگے۔ قانون ساز ہونگے۔ سیاسی رہنما، ڈاکٹرز و اساتذہ، جرنیل، اور اسی طرح دوسرے لوگ ہونگے۔ لیکن مسلمانوں کی اس جماعت کے لئے رسول کی عملداری میں یہ سب کچھ موجود تھا۔

قرآن کریم کی جو آیات مکہ میں نازل ہوئیں وہ سب ہی ایک خاص طرز کی تھیں۔

> جب زمین اس طرح ہلا ڈالی جائے گی۔ جس طرح اس کا ہلایا جانا مقدر رہے اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال دے گی۔ اور انسان کہے گا ''اسے کیا ہو گیا ہے؟'' اس دن وہ اپنی داستان سنائے گی؟ کیونکہ اس کے لئے تمہارے رب کا یہی ایما ہوگا۔ اس دن لوگ الگ الگ نکلیں گے تاکہ انھیں ان کے اعمال دکھا دیئے جائیں پس جو کوئی ذرہ برابر بھی نیکی کریگا وہ اسے دیکھ لیگا اور جو کوئی ذرہ برابر بھی بدی کرے گا وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔ (الزلزال ۱ تا ۸)

مدینہ میں قیام کے دوران جو آیات نازل ہوئیں ان کی زبان میں جوش و سرشاری کے ساتھ غنائیت ہے اور لعنت آمیزی کے ساتھ یہ انداز بھی آ گیا ہے،

> اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں تاکید کرتا ہے کہ دو بیٹیوں کے حصے کے برابر ایک بیٹے کا حصہ ہوگا اور اگر دو سے زیادہ بیٹیاں ہی ہوں تو ان کا حصہ اس ترکہ کا دو تہائی ہوگا جو مال چھوڑا گیا ہو، اور اگر وہ اکیلی ہو تو اس کا آدھا ہے، اور مرنے والے کے ماں باپ میں سے ہر ایک کا اس کے چھوڑے ہوئے مال کا چھٹا حصہ ہوگا۔ اگر مرنے والے کی اولاد ہو؛ اور اگر اس کے اولاد نہ ہو اور اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں۔ تو اس کی ماں کا حصہ تہائی رہے گا اور اگر اس کے بھائی بھی ہوں، تو اس کی ماں کا حصہ چھٹا رہے گا، یہ حصے وصیت جو کر جائے پوری کرنے اور قرض چکانے کے بعد کے ہیں۔ یوں تو تمہارے باپ بھی ہیں اور تمہارے بیٹے بھی، لیکن تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون نفع کے لحاظ سے تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصہ اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے۔ اللہ سب کچھ جانتا اور سمجھتا ہے۔ (النساء۔ ۱۱)

یہ قانون سازی ہے۔ ایک بار مدینہ میں قدم جم گئے تو مسلمانوں کی اولوالعزمی نے اسے مزید بلندیوں تک پہنچا دیا۔

ہجرت کے بعد مدینہ کے مقامی عرب بتدریج اسلام قبول کرتے گئے لیکن شہر کے تین یہودی قبیلوں کی مزاحمت جاری رہی اور مزید وقت گذرنے کے ساتھ ان میں اور مسلمانوں میں مخاصمت پیدا ہوتی گئی۔ عربوں میں بھی بعض ایسے افراد جو رسول اللہ کی وجہ سے اب اہمیت کھو بیٹھے تھے ایک محتاط مزاحمت کی آبیاری کرنے لگے۔

اس دوران قبیلہ قریش نے رسول اللہ ؐ کو قتل کر دینے کی سازشیں ترک نہ کی تھیں۔ حالانکہ اب وہ کوئی ڈھائی سو میل دور قیام پذیر تھے۔ نہ صرف یہ کہ اہل قریش نے رسول اللہ ؐ کے سر کی قیمت کوئی ۱۰۰ اونٹ کا اعلان کیا بلکہ ان کی پوری جماعت کو ختم کر دینے کے درپے ہو گئے اور مدینہ پر حملہ کے ممکنہ اخراجات کے لئے مکہ کے امیر ترین تاجروں نے تجارتی مہمات تیز کر دیں۔ رسول اللہ نے اس کا مقابلہ اس طرح کیا کہ اہل مکہ کے تجارتی قافلوں پر حملہ آور ہونے کے لئے مسلمانوں کو تیار کیا۔ (اس کے ذریعہ ایک اور مسئلہ حل ہو گیا کہ جو مسلمان ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے اور اپنی بہت سی اشیاء اور سامان وہیں چھوڑ آئے تھے اور تجارت بھی رک گئی تھی ان کی ضروریات کی فراہمی کے لئے ایک راستہ نکل آیا)۔

ان حملوں کو کوئی ایک سال ہی گذرا تھا کہ اہل مکہ نے باقاعدہ حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یوں کوئی ایک ہزار ہتھیار بند افراد اس نئی طاقت کو مکمل طور پر ختم کرنے کے لئے عازم مدینہ ہوئے۔ ان کے مقابلہ کے لئے مسلمان تین سو کی تعداد میں مقام بدر پر صف آراء ہوئے اور اہل مکہ کو پوری طرح شکست دے دی۔ قرآن نے جنگ بدر کا تذکرہ اس بات کے ثبوت کے طور پر کیا ہے کہ کسی بھی جنگ کا نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے مشکلات اور مخالفتوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

جنگِ بدر سے پہلے بہت سے بدّو مکہ کے بڑے تاجروں کے محافظ دستہ کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ جنگ بدر کے بعد ان لوگوں نے اپنی وفاداریاں بدلنا شروع کر دیں۔ مدینہ میں مسلم جماعت کی بڑھتی ہوئی طاقت نے یہودیوں کو بھی متفکر کر دیا۔ یہودیوں کے تین قبیلوں میں سے ایک نے میثاق مدینہ سے علیحدگی اختیار کر لی اور رسول اللہ کے خلاف بغاوت کی سازش کرنے لگے اور رسول ؐ کے مدینہ آنے سے قبل کی صورتحال کو واپس لانا چاہا۔ لیکن بغاوت ناکام رہی اور اس قبیلہ کو مدینہ سے نکال دیا گیا۔

اب قریش کی پریشانیاں واضح تھیں۔ رسول اللہ ؐ کو ختم کرنے کی کوششیں تو درکنار انھیں لگا کہ شاید وہ اپنے لئے گڑھا کھود رہے ہیں۔ لہٰذا تین ہجری میں انھوں نے مسلمانوں کو ختم کرنے کی ایک اور کوشش کی اور اس بار پھر تعداد کے اعتبار سے وہی حاوی تھے۔ اس بار تین ہزار کی تعداد میں وہ مدینہ کی طرف بڑھے۔ مسلمان محض ۹۵۰ جنگجو ہی فراہم کر سکے۔ اب بھی ایک تین کا مقابلہ تھا۔ لیکن بدر کے موقع پر جو ہو چکا تھا اس کی روشنی میں کم تعداد کی اہمیت ہی نہ تھی۔ ان کے پاس تو بس ایک ہی دولت تھی اور جو اصل تھی۔ اللہ ان کے ساتھ تھا۔

اسلامی تاریخ کی تین مثالی جنگوں میں سے یہ دوسری جنگ اُحد کے مقام پر لڑی گئی۔ ابتداء میں تو لگا کہ مسلمان پھر فتح کی طرف گامزن ہیں۔ لیکن جب شکست کھا چکے اہل مکہ بھاگنے لگے تھے تو مسلمانوں میں

سے چند اللہ کے رسول کے ایک واضح حکم سے انحراف کرتے ہوئے میدان جنگ میں نظم وضبط کو توڑ کر دوڑ پڑے تا کہ بھاگتے ہوئے دشمنوں کے مال غنیمت پر قبضہ کر سکیں۔اس موقع پر بھاگتے ہوئے اہل مکہ نے خالد بن ولید کی قیادت میں عقب سے پلٹ کر حملہ کر دیا۔خالد ایک غیر معمولی طور پر ذہین فوجی تھے جو بعد میں اسلام لائے اور تاریخ اسلام میں عظیم فوجی جرنل کی حیثیت سے شہرت پائی۔جنگِ اُحد میں خود رسول اللہ بھی زخمی ہو گئے ستر مسلمان شہید ہوئے اور باقی بہت سے بھاگ کھڑے ہوئے۔امت تو محفوظ تھی لیکن یہ جنگ ایک قابل ذکر شکست بن گئی۔

اسلامی تاریخ کی یہ جنگیں دوسری حقیقی جنگوں کے مقابلہ میں اتنی چھوٹی تھیں کہ انھیں جنگ کہنا بھی زیب نہیں دیتا۔لیکن ہر جنگ مسلم دینیات کا حصہ بنی اور ہر ایک سے بعض معنی وابستہ ہو گئے۔چنانچہ جنگ بدر کا معنی یہ نکلا کہ جنگوں کے نتیجہ کا انحصار مادّی وسائل پر نہیں بلکہ اللہ کی مرضی پر ہوتا ہے۔لیکن جنگ اُحد نے ایک چبھتا ہوا سوال کھڑا کر دیا۔اگر بدر اللہ کی قوت کا اظہار تھی تو اُحد کی شکست کیا ظاہر کرتی ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ بھی شکست کھا سکتا ہے یا پھر یہ بات کہ وہ اتنا طاقتور نہیں جتنا رسول اللہ بتا رہے تھے۔

لیکن رسول اللہؐ نے شکست سے دوسرا معنی لیا۔اللہ نے مسلمانوں کو اس بار یوں ہارنے دیا کہ وہ انھیں ایک سبق دینا چاہتا تھا۔مسلمان کا ایک بڑا مقصد اس زمین پر ایک انصاف پسند جماعت کے قیام کے لئے جنگ کرنا ہے۔لیکن اُحد میں وہ یہ مقصد بھول گئے اور رسول اللہؐ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے لوٹ مار میں مصروف ہو گئے۔بس اسی لئے اللہ کی مدد کھو بیٹھے۔اللہ کی مدد ان کے حق میں نہیں تھی۔یہ تو انھیں اس کے احکام کی تعمیل اور اس کی مرضی پر اپنے آپ کو جھکا کر حاصل کرنا تھی۔شکست کی یہ تشریح آئندہ دنوں میں مسلمانوں کے لئے ایک ایسا نقش بن گئی جسکا مسلمان ہر موقع پر حوالہ دیتے۔تیرہویں صدی میں وسطی ایشیا کے منگولوں نے عالم اسلام کو جس طرح تاخت وتاراج کیا یا پھر جس طرح عالم اسلام مغربی طاقتوں سے مغلوب ہوا شکست اُحد کی یہ تشریح شاید پھر مسلمانوں کو اٹھ کھڑے ہونے کے لئے حوصلہ فراہم کرتی رہی۔

قریش نے اپنے اگلے حملے کے لئے دو سال تک منصوبہ بندی کی۔انھوں نے دوسرے قبیلوں سے اپنے حلیفوں کو بھی فوج میں شامل کیا اور یوں کوئی دس ہزار نفوس پر مشتمل فوج تیار کر لی۔اُس وقت اور مقام کے اعتبار سے یہ ناقابل یقین حد تک بڑی تعداد تھی۔جب رسول اللہؐ نے یہ سنا کہ اتنی بڑی فوج مدینہ پر حملہ کے لئے آ رہی ہے تو انھوں نے آبادی کے گرد ایک بڑی خندق کھدوائی۔قریش جو اونٹوں پر سوار ہو کر آئے تھے اس خندق کو پار نہ کر سکتے تھے۔قریش کو بڑی دشوار صورت کا سامنا تھا۔انھوں نے سوچا کہ اہل مدینہ کو بھوکا مار دیا جائے اور اس مقصد کے لئے انھوں نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔

محاصرہ کی اس حکمت عملی نے قریش کے ایک خفیہ منصوبہ کو جس کی کامیابی پر انھیں پورا بھروسہ تھا ناکام کر دیا۔جنگ اُحد کے بعد ایک اور یہودی قبیلہ اہل مکہ کے ساتھ ملکر مسلمانوں کے خلاف سازش کرتا ہوا پایا گیا

تھا۔ پہلے قبیلہ کی طرح انھیں بھی مدینہ بدر کردیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں تیسرے قبیلہ بنی قریظہ نے میثاقِ مدینہ سے اپنی وفاداری کا اعلان کردیا۔ لیکن جنگ خندق کے موقع اس قبیلہ کے لیڈر قریش کے ساتھ ایک سازش میں شریک ہوگئے کہ جب اہل مکہ سامنے سے مدینہ پر حملہ کریں تو بنو قریظہ عقب سے آکر مسلمانوں پر حملہ کرینگے۔ لیکن سامنے سے جب کوئی حملہ نہ ہوسکا تو مدینہ کے سازشیوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اور محاصرہ کرنے والوں کا آپس میں اتحاد بھی ٹوٹنے لگا۔ یہ لوگ بہرحال ایک اتحاد کا حصہ تھے اور محض قریش کا ساتھ دینے کی غرض سے ہی آئے تھے۔ جب کوئی جنگ ہی نہ ہوئی تو ان کی بے چینی بڑھنے لگی اور پھر جب ہوائی طوفان آگیا جو اس علاقے کے لئے بڑی زبردست پریشانی کا باعث ہوتا تھا یہ لوگ الگ ہوگئے۔ قریش نے بھی واپس جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

اس کے نتیجہ میں بنو قریظہ کی صورتحال بڑی خراب ہوگئی۔ ان کی سازش طشت ازبام ہوچکی تھی اور حلیف انھیں چھوڑ کر فرار ہوگئے تھے۔ رسول اللہؐ نے پورے قبیلہ کو اس کا ذمہ دار قرار دیا۔ اور ان کے پرانے مدنی قبیلہ کے ایک شخص کو حلیف کی حیثیت سے ان کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار دیا۔ تفتیش کے نتیجہ میں جب بنو قریظہ مجرم ٹھہرے تو منصف نے فیصلہ کیا کہ وہ بغاوت کے مرتکب ہوئے ہیں جس کی سزا موت تھی۔ ناظرین میں سے کچھ نے اس فیصلہ پر اعتراض کیا لیکن رسول اللہؐ نے اس سزا سے اتفاق کیا اور کوئی آٹھ سو مردوں پر عوام کے سامنے اس فیصلے کو نافذ کردیا۔ بچوں اور عورتوں کو ان دو یہودی قبیلوں کے پاس بھیج دیا گیا جو پہلے جلاوطن کیے جاچکے تھے۔

اس واقعہ نے پورے عرب کو دہشت زدہ کردیا۔ بنو قریظہ کے مقدمہ اور ان کے جرم کی سزا پر فیصلہ کے عمل درآمد نے مسلمانان مدینہ کے عزم اور استقلال کو واضح کردیا۔ فوجی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جنگ خندق گوکہ ایک تعطّل کی شکل میں ختم ہوئی تھی لیکن قریش کے لئے جت پانے میں یہ ناکامی تو ہار جیسی ہی شرمناک تھی۔ کیونکہ دس ہزار نفوس پر مشتمل باجے گاجے کے ساتھ ایک بہت بڑی فوج کی ناکامی نے یہ تاثر قائم کردیا تھا کہ مسلمان ناقابل شکست ہیں اور وہ محض ایک نئی اور ابھرتی ہوئی خوداعتمادی سے بھری ایک جماعت ہی نہیں بلکہ ایک غیر معمولی اور بالکل نئی قسم کی جماعت ہیں۔ مسلمانوں کا طرز حیات واضح طور پر دوسروں سے ممتاز تھا۔ ان کی پرستش کے انداز اور رسومات بھی مختلف تھیں اور ان کا رہنما بھی ایسا تھا کہ جب کوئی مسئلہ پیش آتا تو اس پر ایک عالم وجد طاری ہوجاتا اور کہیں سے مربوط ہوکر وہ مشورے دیتا۔ یہ رابطہ ایک ایسے ماورائے فطرت مددگار سے تھا جو اتنا زبردست اور قوّت والا ہے کہ مسلمان بالکل بے خوف ہوکر اپنے سے تین گنا زیادہ نفوس پر مشتمل دشمن کے خلاف جنگ میں کود پڑتے۔ سوال یہ تھا کہ یہ مددگار کون تھا؟

ابتداء میں تو ایسے لوگ جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا یہ سوچتے تھے کہ کوئی نیا اور ہمارے خداؤں سے زیادہ طاقتور خدا ہے جو مسلمانوں کی مدد کررہا ہے۔ لیکن مسلمانوں کا یہ پیغام پھیلتا گیا کہ کوئی دوسرا خدا نہیں

بلکہ وہ خدا ہے جو مالک الملک اور وحدہٗ لاشریک ہے۔ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ اگر محمدؐ ویسے ہی ہوئے جیسا کہ وہ کہتے ہیں یعنی اس پوری کائنات کے خالق سے براہِ راست رابطہ رکھنے والا اس زمین پر واحد انسان تو کیا ہوگا؟

لوگوں کو جمع کرنا اب مشکل ہوگیا اور ان سے فوجی مقابلہ آرائی کے لئے جنگجوؤں کو اکٹھا کرنا اور بھی مشکل ہوتا جارہا تھا۔ جنگِ خندق کے بعد اسلام میں داخل ہونے والے اب قطرہ قطرہ نہیں بلکہ سیلاب کے مانند ہوگئے۔ یہ تصور کرنا مشکل نہیں کہ کیونکہ مسلمان فاتح جماعت تھے اسی لئے لوگ اپنے ذاتی مقاصد کے لئے بھی ان کی طرف آرہے تھے۔ لیکن مسلمان اس بارے میں دوسری رائے رکھتے تھے انکے خیال میں معاملہ دوسرا تھا۔ محمدؐ کی صحبت میں یہ لوگ دراصل ایک واقعی مذہبی تجربہ سے روشناس ہورہے تھے اور یہ تجربہ بھی انھیں کھینچے لارہا تھا۔

محمدؐ رسول اللہ نے کبھی بھی ماورائے فطرت قوتوں کے حامل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ انھوں نے کسی مُردے کو زندہ کردینے کا دعویٰ نہیں کیا۔ پانی کی سطح پر چہل قدمی کرنے اور نابینا کو بینا کردینے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ان کا دعویٰ صرف ایک تھا کہ وہ خدا کی طرف سے بولتے ہیں۔ انھوں نے کبھی یہ بھی نہیں کہا کہ ہر وہ لفظ جو ان کی زبان سے ادا ہوتا ہے وہ خدائی لفظ ہوتا ہے۔ بعض اوقات الفاظ محض ان کے ہی ہوتے۔ سوال یہ ہے کہ لوگوں کو کیسے معلوم ہوتا کہ یہ الفاظ محمدؐ کے ہیں اور یہ الفاظ خدا کے۔

بظاہر تو یہ بالکل واضح ہوتا تھا۔ آج کے مسلمان تو قرآن پڑھنے سے ہی جان جاتے ہیں کہ یہ قرآن پڑھا جارہا ہے۔ پڑھنے کے اس طریقہ کو قرآت کہا جاتا ہے۔ اس کی ادائیگی تمام انسانی ادائیگیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں موسیقیت محسوس ہوتی ہے لیکن یہ گنگنانا نہیں ہے۔ اپنے اثر کے اعتبار سے اس میں اُفسونی تو ہے لیکن بار بار دہرایا جانے والا کوئی سرودِ روحانی نہیں۔ یہ کسی ایسے شخص میں بھی جو ادا ہونے والے الفاظ سے واقفیت ہی نہیں رکھتا خاص جذبات کو ابھارتا ہے۔ ہر شخص کا انداز قرآت مختلف ہونے کے باوجود کسی بنیادی یا ابتدائی قرآت کی 'نقل' اس سے قربت یا اس کی صراحت جیسا لگتا ہے۔ جب قرآن کو پیش کیا گیا تو یقیناً محمدؐ نے اسے ایسے ہی جذبات اور قلب ونظر کو پار کرجانے والی آواز میں پیش کیا ہوگا۔ اس لئے ترجمہ قرآن کو مسلمان قرآن نہیں سمجھتا۔ صحیح قرآن تو دراصل ایک مجموعہ ہے جس کے الفاظ و معانی ناقابل تقسیم ہیں بلکہ اس میں آواز بھی شامل ہے۔ بلکہ تحریری شکل میں اس کے الفاظ کی شکل بھی اس مجموعہ کا حصہ ہے۔ مسلمان اس طرح سوچتے ہیں کہ یہ جو افراد میں تبدیلیاں آرہی ہیں اس کی اصل وجہ محمدؐ کی ذات میں نہیں تھی بلکہ یہ قرآن کے پیغام کی طاقت تھی جو لوگوں کو تبدیل کررہی تھی۔

محمدؐ پر ایمان لانے اور نمو پذیر جماعت میں شامل ہونے میں ایک اور چیز محرّک بن رہی تھی۔ اس علاقے میں چھوٹی جنگیں عام تھیں۔ جیسا بالعموم ان علاقوں میں ہوا کرتا تھا جہاں کی آبادی صحرانورد قبیلوں پر مشتمل ہوتی اور جہاں تجارت کے ساتھ دوسروں پر حملہ آور ہونا اور لوٹ مار کرنا بھی ہوتا رہتا تھا۔ جیسے کہ کولمبس کی آمد سے قبل شمالی امریکہ کے مشرقی جنگلی علاقوں میں ہوا کرتا تھا۔ عربوں میں ایک اور روایت خون کا بدلہ لینے

کی تھی جونسل درنسل جاری رہتی تھی۔قبیلوں کے حربی اتحاد کی روایت بھی اس سلسلہ میں اہم ہے۔اس صورتحال نے اس پورے علاقہ کو ایک مستقل تشدد اور فساد میں مبتلا کر رکھا تھا۔

جب زمام کار محمدؐ کے ہاتھ میں آئی تو آپ نے عوام کو امن و آشتی سے رہنے کی تعلیم دی۔ جس کے نتیجہ میں جو لوگ ایمان لے آتے تھے اسی طرح رہنے بھی لگے۔انھوں نے مسلمانوں کے لئے تشدد کو کلی طور پر ناجائز قرار نہیں دیا۔کیونکہ دفاع کے لئے مسلمان ہمیشہ تیار رہتے اور اس میں کسی قسم کی تساہلی کا شکار نہیں ہوتے۔جنگیں اب بھی ہوتی تھیں لیکن آپس میں نہیں بلکہ ان بیرونی قوتوں کے خلاف جو ان کے رویہ سے بیزار تھیں اور اس جماعت کے وجود کے لئے خطرہ تھیں۔جو لوگ ایمان لے آتے تو اس جماعت کا حصہ بن کر وہ دراصل ''دارالسلام'' میں داخل ہوجاتے جس کا مطلب سلطنت واطاعت (خداوندی) ہے اور عملاً سلطنت امن و آشتی ہے۔ ہر وہ شخص جو اس سے باہر رہا ہوتا دارالحرب یعنی جنگ کے ماحول میں تھا۔جوامت کا حصہ بن جاتے وہ دوسرے مسلمانوں کے درمیان رہتے ہوئے اپنے آپ کو بالکل محفوظ سمجھتے تھے اور باہمی طور پر مکمل حالت امن میں تھے۔

اسلام قبول کرنے کا مطلب ایک ایسے ولولہ انگیز اور پر جوش معاشرہ کا جز بن جانا تھا جو عدل و قسط پر قائم تھا۔اور جس میں معاشرتی طور پر سب کو برابری حاصل تھی۔ ایسی جماعت کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لئے جنگ بھی ضروری تھی۔ کیونکہ خود اس کا وجود اور اس کے مقاصد کو بڑے سفّاک دشمنوں کا سامنا تھا۔لیکن جہاد کا مطلب کبھی بھی پاکیزہ جنگ اور تشدد جیسے الفاظ سے واضح نہیں ہوتا۔کیونکہ محض جنگ لڑنے پر جب کچھ کہنا ہوتا تو قرآن عربی کے دوسرے الفاظ استعمال کرتا ہے۔انگریزی میں ترجمہ کریں تو 'جہاد' کا تصور لفظ جدوجہد (Struggle) سے بہتر طور پر واضح ہوتا ہے اور اس میں وہ تمام لوازمات شامل ہوجاتے ہیں جو عدل اجتماعی کے قیام کی ولولہ انگیز جدوجہد کی بلیغ ترسیل میں استعمال ہوتے ہیں اور جس سے مغرب بھی واقف ہے۔ یہ جدوجہد ایک مہذب جدوجہد ہے اگر اس کے مقاصد عدل کے لئے ہیں اور اس مقصد کے لئے اگر عسکری جدوجہد ضروری ہوجائے تو یہ بھی ٹھیک ہے اور مقصد اس کی اجازت دیتا ہے۔

آنے والے دوسال اس طرح گذرے کہ جزیزۃ العرب کے مختلف علاقوں سے قبائل محمدؐ کی اطاعت تیزی سے قبول کرتے ، اسلام قبول کرتے اور اسطرح مسلم جماعت میں داخل ہوجاتے۔ایک رات محمدؐ نے خواب دیکھا کہ وہ مکہ واپس پہنچ گئے ہیں اور اب وہاں سب اللہ واحد کی عبادت میں مصروف ہیں۔اگلی صبح اپنے رفقاء کو زیارت کے لئے کوچ کی تیاری کا حکم دے دیا۔مکہ جانے کے لئے جو کوئی دوسو میل دور تھا، مدینہ سے آپ نے کوئی چودہ سو رفقاء پر مشتمل قافلہ کی قیادت کی۔ یہ ہتھیار بند ہوکر نہ آئے تھے اس کے باوجود کہ گذشتہ دنوں میں ان کے درمیان شدید جھڑپیں ہوچکی تھیں لیکن کوئی جنگ نہ بھڑکی۔ مسلمانوں کے لئے شہر کے دروازے بند کردیئے گئے اور اس سال مسلمانوں کا مکہ میں داخلہ ممکن نہ ہوسکا۔لیکن مکہ کے بڑوں نے مسلمانوں سے اس سال چلے جانے کا معاہدہ کیا اور یوں سال بھر بعد زیارت کی رسومات کی ادائیگی ہوسکی۔قریش اب سمجھ گئے تھے

کہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔

ایک سال بعد چھ ہجری میں مسلمان مکہ واپس آئے اور بغیر کسی تشدد کے کعبہ کی زیارت کی۔ دو سال بعد شہر کے بڑوں نے بغیر لڑے ہی مکہ مسلمانوں کے حوالہ کر دیا تو سب سے پہلا کام محمدؐ نے یہ کیا کہ کعبہ کے تمام بتوں کو مسمار کر دیا اور اس مکعب نما کو جس میں سیاہ پتھر ایستادہ تھا دنیا کا مقدس ترین نقطۂ قرار دیا۔ محمدؐ کے بعض پرانے دشمن اس پر چیں بہ جبیں ہوئے اور کچھ بڑبڑائے بھی لیکن اب ہوا کا رخ بدل چکا تھا۔ عملاً تمام ہی قبائل محمدؐ کے پرچم تلے متحد ہو چکے تھے اور معلوم و معتبر تاریخ میں پہلی بار پورے عربوں کو یکجہتی اور ہم آہنگی کے ساتھ رہنا نصیب ہوا تھا۔

۱۰ ہجری ۶۳۲ء میں رسول اللہؐ نے مکہ میں آخری خطبہ دیا۔ ان تمام کو جو موجود تھے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ 'ہر مسلمان کا جان و مال مقدس ہے۔ ہر شخص بشمول غلاموں کے حقوق کا احترام ضروری ہے۔ عورتوں کے مردوں پر ایسے حقوق ہیں جیسے مردوں پر عورتوں کے۔ مسلمانوں میں کوئی چھوٹا اور بڑا نہیں ہے سوائے اس کے کہ جو اچھائی میں آگے ہو۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ اللہ کے آخری رسول ہیں اور ان کے بعد انسانوں کے لئے کوئی وحی نہ آئے گی[۲]۔

مدینہ واپس آئے تو بیمار ہو گئے۔ بخار جلائے ڈال رہا تھا۔ اسی حالت میں آپ گھر گھر گئے۔ امہات المومنین اور رفقاء کے ساتھ تھوڑی تھوڑی دیر سب کے ساتھ کچھ وقت گذارتے اور خدا حافظ کہتے۔ آخر میں آپ کے رفیق دیرینہ ابوبکرؓ کی صاحب زادی عائشہ کے یہاں آکر ٹھہر گئے اور ان کی گود میں سر رکھے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

باہر کھڑی بھیڑ میں فکرمندی اور بے چینی عیاں تھی کہ کسی نے یہ خبر سنا دی۔ ایک دم وفا شعار عمرؓ رسول اللہؐ کے انتہائی پرشوق، پرجوش اور شعلہ فشاں ساتھی اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے ہوئے بولے کہ "اگر کسی نے بھی ایسی افواہ اڑائی تو اس کا جھوٹ کھل جانے پر وہ اپنا بازو گنوا بیٹھے گا"۔ محمدؐ چلے جائیں! ممکن نہیں!

تب زیادہ بزرگ اور پروقار ابوبکرؓ صورتحال معلوم کرنے کے لئے گئے۔ چند لمحوں میں ہی وہ واپس آ گئے اور یوں گویا ہوئے۔ "مسلمانو! جو لوگ محمدؐ کی پرستش کرتے تھے انھیں معلوم ہو کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے اور جو اللہ کے پرستار تھے انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے'۔

یہ الفاظ جیسے عمرؓ کے غصہ اور انکار کو بہا لے گئے۔ انھیں ایسا لگا کہ، اپنے دوستوں کو انھوں نے یہ بات بعد میں بتائی جیسے زمین میرے پیروں تلے سے کٹ کر نکل گئی ہے۔ عمرؓ کی چیخیں نکل گئیں کیونکہ اس شیر دل شخصیت نے یہ جان لیا تھا کہ خبر صحیح ہے اور اللہ کا رسول اس دنیا سے جا چکا ہے۔

باب : ۳

خلافت کا آغاز

(۱۱ تا ۲۴ ھ، ۶۳۲ تا ۶۴۴ ء)

مخلص مسلمان رسول اللہ کی پوری زندگی کو ایک ایسے مذہبی استعارہ کے طور پر لیتے ہیں جو وجود کو معنویت سے منور کرتا ہے۔ لیکن مذہبی واردات رسول اللہؐ کی وفات کے ساتھ ختم نہیں ہوگئی بلکہ اوّلین چاروں خلفاء کے ساتھ جاری رہی جنھیں راشدین یعنی وہ جو ہدایت یافتہ تھے کہا جاتا ہے۔ یعنی ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ۔ واقعات کا یہ سلسلہ غارِ حرا میں اوّلین نزول وحی سے جس کا آغاز ہوا، ہجرت سے لیکر رسول اللہ کے چوتھے جانشین کی وفات تک یعنی بعد کا کوئی چالیس سال کا عرصہ اسلام میں مذہب کے مرکزی پیکر اور علامت کی حیثیت کا حامل ہے۔ اس پورے سلسلہ میں عیسائیت کے ساتھ مماثلت دیکھی جا سکتی ہے جس میں عیسیٰ کی آخری ضیافتِ شب، تصلیب اور قیامت یعنی تین مراحل ہیں۔

اسلام کا اظہار جس زمانہ میں ہوا خواندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایسے لوگ موجود تھے جو روزنامچہ، ڈائری، خطوط، سرکاری دستاویزات اور اسی طرح دوسرے کاموں کو تحریر میں لاتے تھے۔ اس زمانے کا خاصا وقیع ریکارڈ مل جاتا ہے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا آغاز جس زمانے میں ہوا وہ دیومالائی دستاویز لکھنے سے آگے صحافتی دور میں داخل ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان چاروں خلفاء کی تاریخ ہمیں زیادہ تر ابن اسحاق کے حوالہ سے ملتی ہے جنکا انتقال ۱۵۱ ہجری یعنی ۷۶۸ عیسوی میں ہوا۔

ابن اسحاق کا تعلق اس طویل روایتی سلسلہ سے تھا جس میں زبانی دستاویزوں کی حفاظت کرنے میں عورتیں اور مرد سبھی شامل تھے اور جن کا کام اہم واقعات کو اکھٹا کرنا، انھیں یاد کرنا، انھیں دوبارہ سنانا ہوا کرتا تھا۔ ابن اسحاق اپنے سلسلہ کا پہلا آدمی ہے جس نے اس پوری کہانی کو تحریری طور پر محفوظ کیا۔ لیکن اس کی زیادہ تر کتابیں آج کھو چکی ہیں۔ ہوا یہ کہ ان کے کھو جانے سے پہلے دوسرے لکھنے والوں نے ان سے بہت سی معلومات حوالے کے طور پر نقل کر لیں۔ عبارت کو اپنی تحریروں میں شامل کیا۔ ان کا اختصار یہ لکھا۔ ان کا ترجمہ کیا اور تشریح بھی کی۔ آجکل کچھ محققین ابن اسحاق کے کام کی جو دوسری دستاویزوں میں کسی بھی اعتبار سے نقل کیا گیا ہے کی بنیاد پر از سرِ نو تدوین کر رہے ہیں۔

ایک مورخ جریر بن طبری نے اپنے پورے کام میں ابن اسحاق کو بڑا ذریعہ بنایا۔ انکا انتقال ہجرت

کے کوئی تین سو سال بعد ہوا تھا اور انھوں نے ۳۹ جلدوں میں رسول اللہ اور دوسرے بادشاہوں کی تاریخ لکھی۔ اس کا آغاز آدم سے ہوتا ہے اور اختتام جو ۲۹۲ ہجری یعنی 915 عیسوی میں ہوتا ہے۔ یہ تاریخ آج تک محفوظ ہے اور رسول اللہ اور آپکے جانشینوں کے بارے میں زیادہ تر معلومات ہمیں انھیں کے ذریعہ پہنچی ہیں۔ یہی ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ ان کے بالوں کی رنگت کیا تھی۔ یہ کیا کھانے کے شوقین تھے یا ان کے پاس کل کتنے اونٹ ملکیت میں تھے۔ اپنی تاریخ میں طبری نے ان حضرات کی اہم ترین تقاریر اور مکالمات کو راست اقوال کی شکل میں شامل کیا ہے۔ لیکن ان کی تاریخ پڑھنے میں آسان نہیں کیونکہ ہر واقعہ کے ساتھ ان افراد کے ناموں کی ایک طویل فہرست ہے جن کے ذریعہ یہ واقعہ ان تک پہنچا ہے۔ مثلاً زید بتاتے ہیں جسے ان کو بکر نے بتایا اور ان کو عمر نے پہنچایا.........اور آخر میں وہ واقعہ درج ہے۔ ناموں کی اس فہرست کو اسناد کہا جاتا ہے۔ ہر واقعہ کے خاتمہ پر اس واقعہ کا ایک دوسرا سلسلہ اسناد شروع ہو جاتا ہے۔ گویا یہ اس واقعہ کی دوسری سند ہے۔ لیکن طبری صرف نقل کرتے ہیں یہ نہیں بتاتے کہ کونسا سلسلہ اسناد صحیح ہے۔ یہ فیصلہ وہ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں۔ صدیوں پر محیط تاریخ اور واقعات کو تدوینی روایت میں لکھنے والوں نے اپنی دانست میں معتبر اور ضروری واقعات کو مرتب کر کے اپنا نسخہ تیار کیا۔ ان میں سے کچھ کو زیادہ عوامی مقبولیت ملی اور زبان زد ہو گئے۔ اور اس طرح بائبل کی کہانیوں جیسا ایک اسلامی مترادف تیار ہو گیا جو اکثر میرے جیسے بچوں کو گھر کے بڑے سناتے بالکل اسی طرح جس طرح گرامر اسکولوں میں مذہبی اساتذہ اپنے شاگردوں کو سناتے ہیں۔

واقعات کا یہ تاریخ نامہ محمدؐ کے انتقال کے بعد ۲۹ سال تک پہلے ہوئے عرصہ کی ایک انتہائی سرگرم اور ہنگامہ خیز انسانی سرگرمیوں کی وہ داستان پیش کرتا ہے جس میں بڑے ہی متاثر کن وشاندار اور مرعوب کن انسانی کردار پر شکوہ مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ واقعات تعجب خیز بھی ہیں اور دلوں کو توڑنے والے بھی۔ ان واقعات کے اس بیان کے دوران ممکن ہے کہ آپ کسی کے طرفدار ہو جائیں کیونکہ واقعات کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ آپ کو کسی طرف جھکا سکتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کو کسی کی نیت پر شک ہو جائے اور ان کے بارے میں آپ کوئی رائے بھی قائم کر لیں۔

دوسری طرف ان واقعات کو ایک تمثیلی حیثیت بھی مل گئی جس کے نتیجہ میں مختلف آراء، تاویلیں اور عقائد کے اختلاف پیدا ہو جانے کی بنا پر دینیاتی اختلاف رونما ہوا۔ کیونکہ واقعات کا یہ بیان صحافتی یا واقعہ نگاری کے معیار پر تو پورا نہیں اترتا اس لئے کہ بیان کرنے والوں میں آنکھوں دیکھا بیان کرنے والا کوئی موجود نہیں۔ ہمارے پاس تو صرف کہانی کی کہانی چھنتے چھناتے پہنچی اور اس پورے عمل سے گذرتے ہوئے اس میں ایک طرح کی اساطیریت بھی شامل ہوتی گئی۔ چنانچہ جانشینی کی یہ سرگذشت کچھ اس طرح ہے۔

خلیفہ اوّل (۱۱ تا ۱۳ ہجری)

محمدؐ کے انتقال نے مسلمانوں کی جماعت کو ایک فوری مسئلہ سے دوچار کر دیا۔ سوال صرف یہ نہیں تھا کہ

اب رہنما کون ہو؟ بلکہ سوال یہ تھا کہ اس کی نوعیت کیا ہو؟

جب کوئی درویش اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اس کی جگہ لینے کے لئے عوام نامزدگی نہیں کرتے کیونکہ ایسی شخصیتیں انتخاب یا مقرر کئے جانے سے نہیں بنتیں ان کا تو دراصل ظہور ہوتا ہے۔ اور اگر وہ ظاہر نہ ہوں تو عوام کے پاس سوائے مایوسی کے کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ لیکن زندگی تو جاری رہتی ہے۔ جب کوئی بادشاہ اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اس کے برخلاف کوئی ایسا نہیں کہتا کہ چلو کسی دن کوئی دوسرا بادشاہ آجائے گا۔ ان معاملات میں خلا کو پر کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔۔

چنانچہ جب محمدؐ کا انتقال ہوا تو ایسا ہی تھا جیسا ایک درویش دنیا سے چلا گیا لیکن یہ ایسا بھی تھا کہ جیسے بادشاہ چلا گیا۔ ایک طرف ان کی جگہ کوئی لے ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن دوسری طرف کسی نہ کسی کو ان کی جگہ لینی تھی۔ رہنما کے بغیر امت متحد نہیں رہ سکتی تھی۔

لیکن یہ نیا رہنما محض بادشاہ نہیں ہو سکتا۔ کچھ اس سے زیادہ کی ضرورت تھی کیونکہ مسلمانوں کی جماعت دوسری جماعتوں سے کچھ مختلف تھی۔

اس جماعت کے افراد یہ سمجھتے تھے کہ یہ امت دراصل وحی کی تجسیم ہے جس کا مقصد وجود اللہ کی رضا کا اظہار اور دنیا کو اس کے مطابق ڈھالنا ہے۔ اس جماعت کا رہنما محض عقل، بہادری اور طاقت جیسی صفات کا حامل ہو کر اس ذمہ داری کو ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ایک خاص قسم کی مذہبی دل آویزی اور طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن محمدؐ کے جانشین کو خدائی ہدایت کا ملتے رہنا تو ممکن نہ تھا کیونکہ محمدؐ یہ اعلان پہلے ہی کر چکے تھے کہ یہ سلسلہ اب جاری نہیں رہے گا۔ چنانچہ سوال یہ تھا کہ جانشین نہ تو بادشاہ ہوگا اور نہ ہی خدائی پیامبر تو پھر وہ کیا ہوگا۔؟

حیرت ہے کہ نمو پذیر مسلم جماعت نے اس قسم کے مسائل پر محمدؐ کے انتقال سے قبل سوچا بھی نہیں تھا اور انتقال کے فوری بعد سے چند گھنٹوں تک بھی اس مسئلہ نے اس کی توجہ کو راغب نہیں کیا۔ کیونکہ شاید یہ وقت ایسا تھا بھی نہیں کہ اس فکری مسئلہ پر غور کیا جاتا۔ محمدؐ کا جسم اطہر ابھی پوری طرح ٹھنڈا بھی نہیں ہوا تھا کہ ابوبکرؓ کو ایک بڑی وحشتناک خبر ملی کہ مدینہ کے قدیم باشندے اپنا رہنما منتخب کرنے کے لئے مل رہے ہیں۔ شاید وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اور مکہ کے مہاجرین علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ پورا پورا امکان تھا کہ یہ اقدام امت کے خاتمہ کا آغاز کر دیتا۔

ابوبکرؓ نے رسول اللہؐ کے چند انتہائی قریبی رفقاء کو ساتھ لیا اور مدینہ کے ان ساتھیوں سے درخواست کی کہ وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کریں۔ مسلمانوں کو پوری جماعت کے لئے ایک رہنما کا انتخاب کرنا چاہئے ہمیں کسی رسول کی نہیں کسی بادشاہ کی نہیں بلکہ بس ایسے شخص کی ضرورت ہے جو ضرورت پڑنے پر میٹنگ بلائے بحث و مباحثہ میں مدد کرے اور جماعت کو یکجا کئے رہے۔ ان دو میں سے کسی کو منتخب کرلو' انھوں نے آتش مزاج عمرؓ

اور محمدؐ کے ایک دوسرے قریبی رفیق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
عمرؓ جیسے دہشت زدہ سے رہ گئے۔ میں اور ابو بکرؓ سے پیش روی۔ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ انھوں نے ابو بکرؓ کا ہاتھ پکڑا اور بولے کہ اب رسول اللہؐ ہمارے درمیان نہیں رہے ابو بکرؓ کے علاوہ ہمارا رہنما اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ آنکھوں سے آنسو رواں اور عمرؓ نے رسول اللہؐ کے قریب ترین رفیق کا ہاتھ تھام کران سے وفاداری کا اعلان کیا۔ اور یہ کچھ ایسے معنی خیز انداز میں ہوا جس نے پورے ماحول کو شدتِ جذبات سے گرما دیا۔ سب کو ایسا لگا کہ جیسے ابو بکرؓ کے علاوہ کوئی اور اس ذمہ داری کے لئے تھا ہی نہیں۔ ایک دانا اور فہیم شخص جس سے سب لوگ محبت کرتے تھے۔ جس کی پوری زندگی عقل و فراست، ہمت و شجاعت اور دردمندی کی ایک مثال تھی جیسے جوش کا ایک ریلا بہہ نکلا اور میٹنگ میں سبھی نے متفقہ طور پر ابو بکرؓ کو ایک پرانکسار لقب خلیفہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ خلیفہ جسے مغربی اسکالرز کیلف (Caliph) کہتے ہیں دراصل نائب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

ابو بکرؓ کے اس لقب کو اختیار کرنے سے پہلے جیسے یہ لفظ موجود ہی نہ تھا۔ اس سے قبل کسی قبیلہ اور قوم پر کسی خلیفہ کی حکمرانی رہی ہی نہ تھی۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ خلیفہ کے معنی کیا ہیں اور خلیفہ کے کیا اختیار ہیں؟ چنانچہ اس لقب کو اختیار کرنے والے پہلے شخص کو ان تفصیلات پر پورا اترنا تھا۔

ابو بکرؓ مسجد گئے جہاں سب لوگ جمع تھے۔ ان کی جانشینی کا اعلان کر دیا گیا اور ایک پروقار افتتاحی تقریر میں انھوں نے کہا ''میں تم میں سب سے اچھا نہیں ہوں۔ اگر میں صحیح کام کروں تو میری مدد کرو۔ اگر مجھ سے غلطیاں ہوں تو بغیر کسی جھجک کے مشورہ دو۔ اگر میں اللہ اور رسولؐ کے احکام کی خلاف ورزی کروں تو میں تمہاری تابعداری کا استحقاق نہیں رکھتا۔ مسجد میں موجود تمام لوگوں نے انھیں اس جوش و خروش سے سراہا جس طرح کچھ دیر قبل پہلی میٹنگ میں کر چکے تھے۔

لیکن مسجد یا اس میٹنگ میں سب لوگ موجود نہیں تھے۔ جانشینی کے اعتبار سے ایک اہم امیدوار علیؓ ہو سکتے تھے جو اُس وقت رسول اللہؐ کی تدفین کی تیاری میں مشغول تھے جب جانشینی کے لئے بحث مباحثہ ہوا تھا اور جب جماعت کے بڑے اس سلسلہ میں ملاقات کر رہے تھے۔ لیکن اس بحث و مباحثے کی خبر جب ان تک پہنچی تو جانشینی کا مسئلہ طے ہو چکا تھا۔

یہ بات سمجھ میں آنا مشکل نہیں کہ صورتحال نے کیا شکل اختیار کی ہوگی۔ رسول اللہؐ کی حیات کے آخر کے چند ماہ میں علیؓ کے ذہن میں یہ بات آئی ہوگی کہ میں ہی تو رسول اللہ کا جانشین ہوں اس پر شاید کسی بحث و مباحثہ کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ وہ ہر اعتبار سے رسول اللہؐ کے قریب ترین تھے۔ رسول اللہؐ کے چچازاد بھائی تو کئی تھے لیکن علیؓ کے ساتھ بعض خصوصیات تھیں ان کے باپ ابو طالب نے رسول اللہؐ کی پرورش کی اور ایک بیٹے کی طرح پالا تھا اور یوں علیؓ اور محمدؐ گویا بھائیوں جیسے ہی ہو گئے تھے۔

لیکن علیؓ تقریباً تیس سال رسول اللہؐ سے چھوٹے تھے اور قبائلی کلچر میں اتنا بڑا بھائی اپنے بھائی بہنوں

کے لئے والد کا مرتبہ رکھتا تھا۔ اور جب علیؓ چھوٹے لڑکے ہی تھے تو محمدؐ اور خدیجہؓ کے ساتھ ہی رہتے تھے اور ان کے گھر ہی میں علیؓ کی پرورش ہوئی تھی۔ چنانچہ رسول اللہؐ کے بھائی جیسے ہونے کے ساتھ ساتھ علیؓ عملی طور پر محمدؐ کے بیٹے جیسے تھے۔ اور مزید یہ کہ اسلام قبول کرنے والوں میں خدیجہؓ کے بعد مردوں میں علیؓ نے ہی پہلے اسلام قبول کیا تھا۔

محمدؐ کے قتل کی سازش رچنے والے جب رات میں آخرِ نیند کے دوران حملہ آور ہونے کا پروگرام بنا رہے تھے تو یہ علیؓ ہی تھے جو رسول اللہؐ کا کمبل اوڑھ کر لیٹ رہے تھے اور سوتے ہوئے ہی تلوار کو جسم میں اتر جانے کا خطرہ مول لیا تھا۔ متعدد موقعوں پر اور خاص طور پر جنگوں کے دوران علیؓ ہی اسلام کے اساطیری ہیرو کی حیثیت سے سامنے آئے تھے۔ اس زمانہ میں جنگوں کا آغاز ہی انفرادی للکار سے ہوتا تھا جس میں مقابلہ ایک سپاہی دشمن کے سپاہی سے کرتا تھا۔ قریش نے جنگوں کے دوران جب مسلمانوں سے ان کے بہترین لڑاکے کو سامنے آنے کو چیلنج کیا تو محمدؐ نے علیؓ کو ہی اس کے لئے نامزد کیا۔

اُحد کے موقع پر جب لگتا تھا کہ سب کچھ لٹ چکا ہے اور بہت سے مسلمان بھاگ کھڑے ہوئے تھے تو جو لوگ محمدؐ کے گرد جمع ہو کر آپ کی حفاظت کر رہے تھے ان میں بھی علیؓ شامل تھے۔ محمدؐ کو زخم تو آئے تھے لیکن بحفاظت نکال لایا گیا تھا۔

جب یہ جماعت پھلنے پھولنے لگی اور محمدؐ ریاست کے حکمراں ہو گئے تو علیؓ کو آپ نے ہمیشہ اپنے دست راست کی حیثیت سے ساتھ ہی رکھا۔ بلکہ حجتہ الوداع کے بعد واپس آتے ہوئے آپ نے رفقاء سے خطاب فرماتے ہوئے کہا بھی کہ ''جو مجھے اپنا مولیٰ سمجھتا ہے وہ علیؓ کو بھی مولیٰ سمجھے۔'' اب سوال یہ ہے کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ رسول اللہؐ کا مطلب یہ تھا کہ میرے بعد مسلمانوں کے راہ نما علیؓ ہونگے۔

محمدؐ کے ہر ساتھی میں ایک قسم کی کرشماتی کشش پائی جاتی تھی لیکن بہت سے لوگ نوجوان علیؓ کے اندر ایک خاص قسم کا اثر دیکھتے تھے جو رسول اللہؐ ہی کے لئے مخصوص تھا۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر علیؓ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن ایک اور نکتہ تھا جس نے علیؓ کو بلند تر کر دیا تھا اور شاید یہی اہم ترین تھا۔ کم از کم بعد کے آنے والے مسلمانوں کے لئے محمدؐ کے کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ ان کی ایک ہی بیٹی سے لڑکے پیدا ہوئے جو بچپن کی عمر سے گذر کر بلوغت کی حدود تک پہنچ پائے یہ بیٹی فاطمہؓ تھیں جو علیؓ کی منکوحہ تھیں۔ چنانچہ علیؓ کے بیٹے رسول اللہؐ کے نواسے تھے اور علیؓ کی نسل رسول اللہؐ کی نسل ہونے والی تھی۔ علیؓ اور فاطمہؓ رسول اللہؐ کا خاندان تھا۔

یہ سب ایک طرف ذرا یہ تصوّر کریں کہ علیؓ گھر کے اندر خواتین کے ساتھ ہیں اور رسول اللہؐ کے جسم کو غسل دے رہے ہیں۔ پھر وہ باہر آتے ہیں۔ جوان کی بقیہ زندگی کا افسوسناک ترین دن ہے وہ اس کے دکھ کو ابھی جھیل ہی رہے ہیں کہ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت وہ رسول اللہؐ کی تدفین کی تیاریوں میں مشغول تھے ان

کے انتہائی قریبی ساتھیوں نے رسول اللہؐ کے نائب کا انتخاب کرلیا ہے اور نہ صرف یہ کہ علیؓ پر غور بھی نہیں کیا گیا بلکہ اس سلسلے میں ان سے مشورہ بھی نہیں کیا گیا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ اس سلسلہ میں مشورہ ہو رہا ہے۔ یقینی طور پر علیؓ کے دل میں یہ ضرور خیال آیا ہوگا کہ میں اس سے بہتر رویہ کا حقدار تھا۔

دوسری طرف وہ تمام نکات جو علیؓ کے حق میں تھے ایک دوسرے نقطۂ نظر کے مطابق علیؓ کے لئے مخالف فضا بنا رہے تھے۔ علیؓ رسول اللہؐ کے انتہائی قریب تھے۔ ان کے خاندان کا حصہ تھے یہ سب صحیح لیکن اللہ نے کہاں اور کب یہ کہا کہ وہ ایک خاص خاندان کو خصوصی استحقاق عطا فرما رہا ہے۔ نسلی جانشینی تو پرانے زمانے کی روایت تھی جسے اسلام ختم کرنے آیا تھا۔

اس کے علاوہ اللہ کے رسولؐ نے یہ بھی کہا تھا کہ آئندہ کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔ اگر یہ صحیح ہے تو علیؓ میں پائی جانے والی کرشماتی کشش یا اثریت کی کوئی مذہبی حیثیت نہ تھی اور اس طرح کیا یہ مناسب نہیں تھا کہ مسلمان رسول اللہؐ کے سُلب اور مسلمانوں کی رہنمائی کی ذمہ داری کو علیحدہ کر دیتے تاکہ طاقت کا غیر ضروری ارتکاز نہ ہو اور اسلام کا مساواتِ انسانی کا آفاقی پیغام اپنی اصل شکل میں محفوظ رہے۔ اس پس منظر میں دیکھیں تو علیؓ کی مذکورہ تمام صفات ایک سوالیہ نشان چھوڑ جاتی ہیں۔ ان کے پرجوش حامی انھیں کسی وقت کے لئے پیغمبر کی حیثیت میں دیکھ سکتے تھے؟

'نہیں' ابوبکرؓ کو مناسب سمجھنے والوں نے کہا۔ جماعت کو اس وقت نوجوانی کے جوش کی نہیں بلکہ ایک فہم و فراست کے مالک کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ علیؓ اس وقت تیس سال سے ذرا اوپر تھے جبکہ ابوبکرؓ ساٹھ سے اوپر ہو چکے تھے۔ اس وقت کے عرب میں ایک ساٹھ سال کی عمر کے مقابلہ میں تیس سال کے نوجوان کو رہنما منتخب کرنا قرین از قیاس بھی نہ تھا۔ ویسے بھی قبیلوں کے سردار کے لئے شیخ کے لفظ کا استعمال بزرگ شخصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ علیؓ کو یہ انتخاب تسلیم کرنے میں کوئی چھ ماہ لگے۔ اس دوران ابوبکرؓ کے بعض غیر مہذب حامیوں نے علیؓ کو دھمکیاں دیں اور ان کے اہل خانہ کے ساتھ خراب رویہ اختیار کیا جس کے نتیجہ میں بعض لوگ بیان کرتے ہیں کہ جب ایک دروازہ فاطمہؓ پر آ گرا تو وہ اسقاط حمل کا شکار ہو گئیں ورنہ رسول اللہ کا تیسرا نواسہ بھی ہوتا۔

دوسرا بیان یہ ہے کہ ابوبکرؓ کی خلافت کے چند روز بعد ہی ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی۔ یہ بیان فاطمہؓ کے ساتھ ہونے والے رویہ کا بھی انکار کرتا ہے اور اسقاط حمل کو کسی اور ناگہانی حادثہ کی وجہ قرار دیتا ہے۔ اس طرح کے اختلاف اب کسی طرح بھی حل نہیں ہو سکتے چاہے ثبوت کتنا ہی ٹھوس کیوں نہ ہو۔ محض اس دینیاتی اختلافات پر غور کیا جا سکتا ہے جو جانشینی کے اس عمل کے دوران ابوبکرؓ و علیؓ کے حامیوں میں ہوا اور اسلام میں دو فرقے سنی اور شیعہ تیار ہو گئے۔ ہر فرقہ کے پاس ان واقعات کی اپنی ایک تفسیر اور تشریح ہے۔ شیعی دینیات جو علیؓ

کی طرفداری سے عبارت ہے آج تک یہی سوچتی ہے کہ رسول اللہ کے صحیح جانشین علیؓ ہی تھے۔

جیسا بھی ہو چھ ماہ کے اندر اندر یہ اختلاف ختم ہو گیا اور سچ یہ ہے کہ بالکل صحیح وقت پر ہوا۔ایک نیا خطرہ اسلام کے وجود کو لاحق ہونے والا تھا۔ پورے عرب میں وہ تمام قبیلے جو رسول اللہ سے معاہدہ کے ساتھ یک جہت ہو گئے تھے وہ اس معاہدہ سے الگ ہونے لگے تھے۔ کہتے تھے کہ ہم نے یہ معاہدہ ابو بکرؓ یا عمرؓ کے ساتھ نہیں بلکہ محمد رسول اللہ کے ساتھ کیا تھا جو آپ کی وفات کے بعد ختم ہو گیا۔ برائے نام تو ان قبائلیوں نے اسلام قبول کیا تھا اور اب بھی وہ اپنے آپ کو مسلمان ہی کہہ رہے تھے۔وہ اب بھی خدائے واحد اور رسول اللہ کی بالادستی کو تسلیم کرتے تھے۔نماز اور روزہ کی ادائیگی اب بھی جاری تھی۔شراب نوشی اور عیاشی اب بھی کنٹرول میں تھی۔لیکن مسئلہ زکوۃ کا تھا جو حکومتِ مدینہ کو ادا کی جاتی تھی۔ یہ ادائیگی انھیں منظور نہ تھی اور حکومتِ مدینہ کو یہ رقم ادا کرنے کے لئے وہ تیار نہ تھے۔

بعض قبیلوں کے سردار کچھ اور آگے بڑھ گئے اور دعویٰ کر بیٹھے کے اب وہی اللہ کے نبی ہیں۔اور دعویٰ کیا کہ اب انھیں ہی وحی آتی ہے اور انھیں حق ہے کہ الٰہی قوانین کا اعلان کریں۔ان کم ظرفوں نے سوچا کہ جس طرز پر محمدؐ نے ایک امت قائم کر لی تھی وہ بھی اسی طرح کے اعلان کے ذریعہ مقدس اور مطلق العنان جماعتیں بنا سکتے ہیں۔

اگر ابو بکرؓ ان گمراہیوں کو برداشت کر لیتے تو یقیناً اسلام نے کوئی اور ہی رخ اختیار کر لیا ہوتا۔ یہ امت ایسے افراد پر مشتمل گروہی حیثیت اختیار کر لیتی جس میں محض انفرادی طور پر بعض اعمال اور عقائد پر عمل کرنا کافی تھا۔لیکن ابو بکرؓ نے اس کرائسس کا سامنا اس طرح کیا کہ اپنی شناخت الگ بنانے کو بغاوت قرار دیا۔محمدؐ نے کہا تھا کہ دین زبردستی کا معاملہ نہیں ہے۔اور ابو بکرؓ نے اس اصول سے بالکل ہی انکار نہیں کیا۔لوگوں کو اسلام قبول کرنے یا قبول نہ کرنے کی پوری آزادی تھی لیکن ایک بار قبول کر لینے کے بعد پھر اختلاف یا انکار ممکن نہیں۔ سیاسی انتشار کے پس منظر میں ابو بکرؓ نے ایک مذہبی اصول جاری کر دیا۔ جو آج تک اسلام پر اپنا سایہ کئے ہوئے ہے یعنی ارتداد بغاوت کے مترادف ہے۔اس پالیسی میں دراصل خدائے واحد کی وحدانیت کا ناقابل تمثیل تصور نظر آتا ہے۔جس کا اظہار امت کی ناقابل تحلیل وحدت میں ہونا ضروری ہے۔ابو بکرؓ کے اس فیصلے نے حتمی طور پر اس بات کی تصدیق کر دی کہ اسلام محض عقائد کا ایک نظام نہیں بلکہ ایک معاشرہ کی بنیاد ڈالتا ہے۔مسلم جماعت محض ایک ایسی جماعت نہیں جس طرح کی متعدد جماعتیں ہو سکتی ہیں بلکہ ایک خاص جماعت سے ہے کہ اس جیسی ایک ہی جماعت ہو سکتی ہے۔

نئے خلیفہ نے اپنی کارکردگی سے ثابت کر دیا کہ وہ فن حرب کے بھی زبردست ماہر ہیں۔مرتدین کے خلاف جنگ کوئی ایک سال چلی اور بغاوت ختم ہو کر پورا عرب پھر متحد ہو گیا۔لیکن داخلی محاذ پر مسلم جماعت کے ساتھ ان کا رویہ محبت، احسان مندی، شرافت اور نیک نفسی کا تھا۔اور عوام انہی صفات کی بنا پر ان سے محبت کرتے

تھے۔ جھکے کاندھے اور گہری آنکھوں والے ابو بکرؓ سادہ لباس میں اپنے عام انداز میں رہتے اور دولت جمع کرنے کے ذرا بھی قائل نہ تھے۔ البتہ انھیں ایک شوق ضرور تھا۔ وہ اپنے سر اور داڑھی کے سفید بالوں کو حنا سے سرخ رکھتے تھے۔ اختلاف ہو یا کوئی تنازعہ عدل کے قیام میں کوئی رو رعایت نہ تھی۔ فیصلوں میں بڑوں کی ایک مشاورتی کونسل کو شامل کرتے اور حکمرانی میں امتیاز کا اظہار نہ ہونے دیتے اور سب کے ساتھ برابری اختیار کرتے۔ مذہبی طور پر کسی بلند مقام کا دعویٰ نہ کرتے۔ جو کچھ وہ کہتے وہ عام مسلمانوں کے کہنے سے زیادہ وزن دار نہ ہوتا لیکن ان کی اصل طاقت اور اختیار و بالا دستی ان کی دانائی اور حکمت میں اور وحی سے وابستگی میں پنہاں تھی۔ ان کے حکم کو ماننا کسی کے لئے بھی اس وقت ہی لازمی تھا جبکہ وہ صحیح ہو۔ ہوشیار باش! ان کا حکم غلط ہوتا ہی نہیں تھا۔

ہجرت سے قبل کی زندگی میں وہ ایک مالدار تاجر تھے۔ لیکن مدینہ ہجرت کرنے تک وہ اپنی دولت صدقہ و خیرات میں خرچ کر چکے تھے۔ بالخصوص ان غلاموں کو آزاد کرنے میں جو اسلام قبول کر لیتے۔ انھوں نے اپنی بقیہ دولت بھی اسی کام کے لئے وقف کر دی تھی۔ خلیفہ کی حیثیت میں امت کی رہنمائی کے کام کے عوض وہ تھوڑی سی رقم لیتے اور ضروریات پوری کرنے کے لئے اپنی پرانی تجارت کرتے۔ جو ظاہر ہے کہ اب بہت سکڑ چکی تھی۔ لیکن جتنا بھی اس سے حاصل ہوتا اس سے گزر اوقات کرتے۔ بعض اوقات اپنی کسی مزید ضرورت کو پورا کرنے کے لئے انھوں نے اپنے پڑوسی کی گائے کا دودھ دوہنے کی اجرت بھی لی[1]۔ اسلامی روایات میں جو کہانیاں ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ مدینہ کی گلیوں میں نکلتے تو بچے انھیں ابّا ابّا کہتے ہوئے دوڑتے۔ وہ ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے اور کھانے کے لئے کچھ میٹھا دیتے۔ وہ ایسی ہی شخصیت تھے۔

خلیفہ دوئم (۱۳ تا ۲۴ ہجری)

خلافت کے دوسرے سال اگست کے کسی دن ابو بکرؓ نے گرم پانی سے غسل کیا اور باہر نکلے۔ ہوا میں شدت کی سردی تھی۔ رات آتے آتے شدید بخار نے آلیا۔ انھیں شاید احساس ہو گیا تھا کہ موت قریب ہے۔ بعض معززین اور بڑے جن سے اکثر اوقات مشورہ کرتے تھے کو بلا بھیجا اور کہا کہ میں عمرؓ کو اپنا خلیفہ مقرر کرنا چاہتا ہوں تاکہ بعد میں کوئی اختلاف نہ ہو۔ لیکن معززین مطمئن نہ تھے کہ عمرؓ کی تعریف میں ابو بکرؓ نے دوسرے بعض منفی پہلوؤں پر توجہ نہیں دی تھی۔ عمرؓ ایک بلند قامت شخصیت تھے، ہر ایک سے نکلتا ہوا قد، بھیڑ میں دیکھیں تو ایسا لگتا کہ گھوڑے پر سوار ہیں۔ سر پر بال ندارد، چہرہ سرخ و سفید اور بڑی بڑی مونچھیں، بڑی ہی ہمہ گیر شخصیت اور بہت تنومند و طاقتور اور پر شکوہ شخصیت کے مالک[2]۔

ایمان لانے سے قبل عمرؓ کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جھگڑالو آدمی ہیں۔ کبھی کبھی شراب بھی نوش کر ڈالتے۔ مسلمانوں اور محمدؐ سے شدید نفرت کرتے تھے۔

لیکن پھر ایمان لانے کا وقت آ گیا اور پورا واقعہ خاصا معروف ہو گیا۔ متعلقہ روایتیں کہتی ہیں کہ ایک

روز انھوں نے اعلان کیا کہ وہ آج محمدؐ کو قتل کر کے اس فساد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دینگے۔ تلوار اٹھائی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے قتل کرنے کی غرض سے نکل پڑے لیکن راستے میں ان کی عزیز بہن ایک درخت کے تلے بیٹھی دکھائی دیں۔ جن کی آنکھوں کے سامنے ایک پتہ تھا جس پر کچھ عبارت رقم تھیں 'کیا کر رہی ہو؟' 'پڑھ رہی ہوں' وہ بولیں 'کیا پڑھ رہی ہو؟

انھوں نے خوفزدہ نظروں سے دیکھا اور بولیں، میں قرآن پڑھ رہی ہوں۔ میں اب مسلمان ہوں۔ کہا' مجھے دو' جوان کے ہاتھ میں تھا عمرؓ نے اسے چھین لیا۔ یہ سورہ طٰہٰ کی چند آیات تھیں۔ عمر رضی اللہ عنہ سحر زدہ سے ہوگئے۔ لگا کہ جیسے یہ آیات انھیں سے مخاطب تھیں۔ عمرؓ کے اندر ایک تبدیلی آ گئی۔ تلوار ہاتھ سے گر گئی اور مکہ کی گلیوں میں دوڑتے ہوئے محمدؐ کے گھر تک پہنچے اور دروازہ پیٹنے لگے اور زور سے بولے'' مجھے یقین ہے کہ تم اللہ کے پیغمبر ہو مجھے یقین آ گیا ہے۔

اور یوں عمرؓ محمدؐ کے رفقاء میں شمار کیے جانے لگے۔ لیکن وہ ہمیشہ سخت اور بالخصوص سخت غصہ کی حالت میں تندخو ہی رہے۔ گو کہ ان کے اندر بہت ہی اچھا دل دھڑکتا تھا لیکن اس کے باوجود لوگ یہ سوچتے کہ جسے دیکھ کر بچے ڈر جاتے ہیں کیا ایسی شخصیت کو خلافت کی ذمہ داری دی جانی چاہیئے؟ اس نازک موقع پر علیؓ نے دخل اندازی کرتے ہوئے عمرؓ کے نام کی حمایت کی جس کے نتیجہ میں پلڑا بھاری ہو گیا اور امت نے محمد رسول اللہؐ کے بعد دوسرا خلیفہ چن لیا۔

ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے انھوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ لوگ مجھ سے ڈرتے زیادہ اور محبت کم کرتے ہیں لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ابھی تم نے میرا ایک ہی چہرہ دیکھا ہے۔ رسول اللہؐ اور ابو بکرؓ انتہائی نرم خو واقع ہوئے تھے لیکن رہنماؤں کو بعض اوقات سخت اقدامات کرنے ضروری ہوتے ہیں اور جب بھی کوئی ایسا موقع آتا تو عمرؓ ان دونوں کا ہتھیار بنتا تھا۔ میں ہمیشہ اپنی تلوار تیار رکھتا تھا تاکہ رسول اللہؐ اور ابو بکرؓ کو ضرورت پڑنے پر فوری طور پر اسے استعمال کیا جا سکے۔ لیکن اب کیونکہ عمرؓ خلیفہ ہے اس لئے ہر وقت اسے استعمال نہیں کریگا۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ رہنما کو نرم خو بھی ہونا چاہیئے۔ چنانچہ آئندہ مسلمانوں کو عمرؓ کے دونوں چہرے نظر آئیں گے۔ غلط کاروں اور ظالموں کو جو کمزوروں کو دباتے ہیں انھیں وہی پرانا عمرؓ نظر آئے گا۔ غریب اور کمزور بیوائیں اور یتیم جنھیں اطمینان کی تلاش رہتی ہے اور حفاظت چاہتے ہیں انھیں عمرؓ نرم خو نظر آئے گا۔

امت کو بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ خلیفہ دوئم ابو بکرؓ کے مقابلہ میں بلند و بالا شخصیت کے حامل ہیں۔ کوئی دس سال تک عمر نے امت کی رہنمائی کی اور اس دوران اسلامی فکریات کو ایک رخ عطا کیا۔ اس کی سیاسی فکر کو استحکام عطا کیا اور اسلامی تہذیب کی اسلامی پہچان واضح کی اور اتنی بڑی سلطنت قائم کر دی جو سلطنت روم سے بھی بڑی تھی۔ ان میں سے ایک کارنامہ بھی انھیں تاریخ میں موثر ترین شخصیت قرار دیئے جانے کا اہل تھا۔ ان کے کاموں کے مجموعہ کو دیکھیں تو ان کی تنہا شخصیت میں سینٹ پال، کارل مارکس، لورینزو ڈی میڈیسی اور نیپولین

جیسے افراد جمع نظر آتے ہیں۔ لیکن اسلام سے باہر کے لوگ انھیں بس برائے نام ہی جانتے ہیں یا بس ایک دو جملے اور یہ کہ وہ محمدؐ کے دوسرے جانشین تھے۔

شاید اس کی وجہ تصنع سے دوری ہے جو عمرؓ کا بنیادی اصول تھا۔ جس پر وہ ہمیشہ کار بند رہے اور یہ ان کی زندگی میں اتنا نمایاں نظر آتا ہے کہ جیسے عمرؓ اس اصل کی تجسیم بن گئے ہوں۔ نہ ان کا کہا ہوا قانون تھا اور نہ ان کی خواہش حکمرانی تھی۔ انھوں نے تمام اختیارات خدا کے سپرد کر دیئے تھے۔ ان کے واقعات کو ایسا ہی آفاقی شہرہ حاصل ہو گیا تھا۔ اسلام ان کے نزدیک عدل مطلق اور مساوات انسانی کا علمبردار تھا۔ اور وہ اسلام کے اس وژن کو حقیقت کا روپ دینا چاہتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مسلمانوں کو کسی بھی انسانی طاقت سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کے پاس قانونِ قرآنی موجود ہے اور رسول اللہ کی سیرت اس کی رہنما ہے اور بس اس کے علاوہ کسی اور چیز کی انھیں ضرورت نہیں۔ عمرؓ نے اعلان کر دیا تھا کہ ان کی ذمہ داری امت کو متحد رکھنا اور وحی سے مزیّن راستے پر آگے بڑھتے رہنا ہے۔

عمرؓ کبھی دولت مند شخص نہیں تھے لیکن علیؓ اور دوسرے اصحاب نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے بیت المال سے مناسب تنخواہ لے لیا کریں۔ ان حضرات کی دلیل تھی کہ اسلام کیونکہ پورے عرب تک پھیل چکا ہے جس کا نظام ایک جز وقتی خلیفہ سے نہیں چل سکتا جو اپنی بڑھتی ہوئی ضرورت کے لئے گائے کا دودھ کاڑھے اور اس کی اجرت سے اپنی ضرورت پوری کرے۔ عمرؓ نے اس درخواست کو منظور تو کر لیا لیکن ایک کمیشن مقرر کیا جو یہ بتائے گا کہ ایک عام عرب خاندان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کتنی تنخواہ کافی ہوگی۔ ان کے خیال میں یہ تنخواہ عام عرب کے لئے اوسط معیار سے زیادہ نہ ہو اور نہ ہی کم ہو۔ بس اسی ممکنہ رقم کو انھوں نے اپنی تنخواہ طے کر لیا۔ (ذرا تصور کریں کہ کیا آج کسی ملٹی نیشنل کارپوریشن کا CEO ایسا کر سکتا ہے؟)

رسول اللہ کی پیروی میں عمرؓ اکثر اپنے کپڑوں کو خود ہی پیوند لگاتے اور بعض اوقات یہ عمل اس وقت کرنا پڑتا جب وہ کوئی اہم سرکاری ذمہ داری ادا کر رہے ہوتے۔ ان کے واقعات میں ایسا بھی ملتا ہے کہ عمرؓ اپنے کاندھوں پر جنس سے بھرا بورا لئے شہر سے گذر رہے ہیں اور ضرورتمند خاندانوں کو بذات خود کھانا مہیا کرا رہے ہیں۔ ایک بار کسی نے انھیں مشقت کرتے دیکھا تو دست تعاون دراز کیا۔ عمرؓ بولے۔ ''یہاں زمین پر تو تم میرا بوجھ اٹھا سکتے ہو۔ قیامت کے دن کون اٹھائے گا''؟

کوئی بھی یہ کہہ کر کہ یہ واقعات بہت مستند نہیں ہیں اور اگر صحیح ہیں بھی تو یہ عمرؓ کا سیاسی عمل تھا جس کے ذریعہ وہ عوام الناس کا قرب اور ان کے لئے ہمدردی کرنا چاہتے تھے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ ایک غیر معمولی طور پر پاکباز کردار کے حامل تھے۔ دکھاوا بالکل نہ تھا، مخلص اور بڑی ہی پرزور شخصیت کے مالک تھے۔ بالکل ایسے ہی جیسا کہ انھیں واقعات میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے بارے میں یہ حکایات اتنے تواتر سے آئی ہیں کہ ہم انھیں صرف نظر نہیں کر سکتے۔ اپنے ہم عصروں پر ان کی حد درجہ فوقیت کی کوئی وجہ ضرور ہونا چاہئے۔ حقیقت کچھ بھی

ہو مسلمانوں میں جو معیار وہ ذہن نشین کر گئے وہ ہمارے حکمرانوں کے لئے معتبر ترین حوالہ بن گیا۔

عمرؓ نے جو لقب اختیار کیا وہ خلیفہ کے لئے ایک مستقل ضمیمہ بن گیا۔ امیر المومنین جوان کے روحانی اور عسکری رول کا مجموعہ تھا۔ ایک بڑے عسکری ماہر کی حیثیت میں وہ سکندر اور جولیس سیزر کے ہم پلہ ہیں۔ لیکن یہ صلاحیتیں انھیں کیسے حاصل ہوئیں یہ فہم سے بالا ہے۔ اسلام آنے سے قبل وہ ایک چھوٹے سے شہر کے ایک عام تاجر تھے۔ انھوں نے ابتدائی دور کی ان علامتی جنگوں میں جو اسلام کے لئے لڑی گئیں حصہ تو لیا تھا لیکن یہ جنگیں محض جھڑپیں تھیں اس سے زیادہ ان کی اہمیت نہ تھی۔ لیکن اچانک دیکھا گیا کہ عمرؓ دنیا یعنی عالم وسطیٰ کے نقشوں کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ بازنطینی یا ساسانیوں کے وسائل کا جائزہ لے رہے ہیں اور اس کا تخمینہ کر رہے ہیں۔ اس پر غور کر رہے ہیں کہ ان علاقوں کی جغرافیائی خصوصیات کس طرح کی حکمت عملی کا تقاضا کرتی ہیں اور یہ فیصلہ کر رہے ہیں کہ کس مقام پر جنگ کے لئے غنیم کو مجبور کیا جائے اور یہاں سے پیچھے ہٹا جائے۔ گویا ان کی فوجی حرکت عالمی سطح پر ہو رہی تھی۔

خوش قسمتی سے اس تاریخی موقع پر امت کو بعض انتہائی غیر معمولی فوجی کمانڈر دستیاب ہو گئے تھے۔ خالد بن ولیدؓ مرتدین کے خلاف جنگ کے ہیرو، عمرو بن العاصؓ فاتح مصر، اور سعد بن وقاصؓ جنھوں نے ایرانیوں کو شکست دی۔

عمرؓ نے جیسے ہی زمام اقتدار سنبھالی اوّل اوّل تو انھوں نے ابو بکرؓ کے دور میں شروع ہوئی جنگوں کو اپنے انجام تک پہنچایا۔ مرتدین کے خلاف جنگ کے نتیجہ میں جس میں پورا عرب شورش زدہ ہو گیا تھا بازنطینیوں نے فوجی دستے سرحد پر لگا دیئے کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر ان علاقوں پر قبضہ جمالیں۔ ابو بکرؓ نے محض انھیں دور رکھنے کے لئے اپنی فوجیں بھیجی تھیں لیکن ان کے انتقال سے قبل ہی مسلمانوں نے انھیں سرحدوں سے پیچھے دھکیل دیا۔ عمرؓ کے خلیفہ بننے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد مسلمانوں نے دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ اور اس کے بعد مسلمانوں نے بازنطینیوں کو کسی ایک جگہ جمنے نہ دیا۔ ۶۳۴ عیسوی میں یرموک کے مقام پر بازنطینیوں کی اصل فوج کو تہس نہس کر دیا۔

اسی دوران اہل فارس نے نوزائدہ مسلم سلطنت کو ٹوٹنے کے لئے اپنی جاسوسی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ چنانچہ انفرادی طور پر ان سے نپٹنے کے بجائے عمرؓ نے اس ممکنہ خطرہ کو اس کے اصل مقام ہی سے ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ ساسانی سلطنت کو ختم کر دیں۔ یہ ایک ناقابل تصور جسارت کی مانند فیصلہ تھا۔ چیونٹی جو ہاتھی کو گرانے چلی تھی۔

فتح کرنے کی اس کوشش کو عمرؓ نے جہاد کا نام دیا تو ہمارے دور کے لئے اس میں بڑے امکانات تھے اور اس پر بڑی بحثیں ہوئی ہیں۔ رسول اللہؐ کے زمانہ میں لفظ جہاد میں کسی قسم کی تشویش کا عنصر نہ پایا جاتا تھا۔ زبانی اعتبار سے دیکھیں تو اس کے معنی جنگ کرنے کے نہیں بلکہ جدوجہد کے ہیں۔ حالانکہ یہ دشمن سے محاذ آرائی کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ پرفریب وساوس کے خلاف کوششوں کے لئے، بحث ومباحثہ کرنے عدل

قائم کرنے اور اپنے اندر دردمندی اور رحمدلی پیدا کرنے جیسے دوسرے مقاصد کے لئے جدوجہد کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ لفظ جہاد قرآن میں صرف دفاعی جنگ کے لئے استعمال ہوا ہے اور یہ متعلقہ آیتیں اس وقت نازل ہوئی تھیں جب اہل قریش اسلام کو زمین سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے کوشاں تھے۔ اس صورتحال میں لڑنے کو اخلاقی بلندی کا ایک مقام دینا بالکل بھی کوئی دور کی کوڑی لانا نہیں تھا۔ اہل ایمان کا گروہ اگر زمین پر عدل قائم کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے اور یہ کام اس کے ذریعہ ہوسکتا ہے تو مخالف قوتوں کو اس گروہ کے خلاف کام کرنے دینا اور اسے روکنے کی کوشش نہ کرنا گویا شیطان کا ساتھ دینا ہے۔ اس کے برخلاف جو اس راہ میں اپنی قوتیں اور جان و مال کی بازی لگا دیں وہ اللہ کی مدد کرتے ہیں۔

لیکن مسلمانوں کو حکم دینا کہ وہ گھر بار چھوڑ کر سفر کریں اور ان لوگوں سے جنگ کریں جن سے بظاہر پہلے کوئی معاملہ ہی نہ ہوا ہو۔ ان جنگوں کو دفاعی جنگیں کس طرح کہا جاسکتا ہے؟ اگر یہ دفاعی نہیں تھیں تو انھیں جہاد کس طرح کہہ سکتے ہیں؟

اس تعلق کو قائم کرنے میں ایک نقطۂ نظر نے رول ادا کیا جو خود رسول اللہؐ کے زمانہ میں تشکیل پا چکا تھا لیکن ابوبکرؓ اور عمرؓ کے دورِ خلافت میں مسلمان مفکرین نے اس پر مزید روشنی ڈالی۔ وہ تصور یہ تھا کہ دنیا دو علیحدہ علیحدہ دائروں یعنی دارالسلام اور دارالحرب میں بٹی ہوئی ہے۔ دارالسلام امن و سلامتی کا زون ہے اور دارالحرب جنگ اور نفرت کا۔ اس نقطۂ نظر نے اسلام کو بھائی چارہ اور امن کے ایسے گہوارے کے طور پر پیش کیا جس کو افراتفری اور نفرت نے گھیر رکھا ہے۔ ایک فرد کوئی ایسا کام کرے جس کے نتیجہ میں امن وآشتی کا دائرہ وسیع ہو رہا ہو وہ چاہے جنگ اور خون خرابہ ہی کے ذریعہ کیوں نہ ہو وہ دراصل دارالسلام کے دائرہ کو وسیع کر رہا ہے۔ کیونکہ اس کے نتیجہ میں جنگ وجدل کا دائرہ بالآخر کم ہو رہا ہے۔

ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ ساتویں صدی میں جو صورتحال تھی اس میں فتوحات کے لئے جنگ کرنے کے لئے کسی جواز کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ جو بھی رہا ہو فتح کرنے کی کوشش کو جہاد کہنا اس وقت کوئی مسئلہ نہ تھا اور امت نے اس سے اصولی اختلاف نہیں کیا۔ رسول اللہؐ کا انتقال ایک زبردست سانحہ تھا جسے مسلمان برداشت کر گئے اور اپنے آپ کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ وہ دوبارہ منظّم بھی ہو گئے۔ ممکن ہے کہ عمرؓ کا خیال رہا ہوگا کہ اس صورتحال میں انھیں ایک بڑا ٹارگیٹ دینے سے انکی یکجہتی نہ صرف بڑھے گی بلکہ گہری بھی ہو سکے گی۔ *

---

* مصنف نے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں ذرا جلد بازی سے کام لیا ہے۔ جو جنگیں خلفائے راشدین اور بالخصوص شیخین کے زمانہ میں ہوئیں ان کا مقصد علاقائی توسیع کے ذریعہ شریک قبائلیوں کو ایک قسم کا لالچ دینا نہیں تھا جیسا کہ فاضل مصنف سمجھ رہے ہیں۔ یہ ایک ضمنی فائدہ تو ہوسکتا ہے لیکن مقصد نہ تھا۔ دراصل ان تمام ہی جنگوں کا آغاز رسول اللہؐ ہی کے زمانہ میں ساسانی اور روم سلطنتیں بلکہ مصری حکمران بھی، اپنے رویّوں سے کر چکے تھے۔ رسول اللہؐ اور خلفاء نے اس سلسلہ میں محض proactive ہو کر مناسب جواب دیا تھا۔

پندرہ ہجری کے قریب قادسیہ شہر کے پاس کوئی تیس ہزار عرب جنگجو ساٹھ ہزار افراد پر مشتمل ایک ساسانی فوج کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے درمیان بس ایک دریا حائل تھا۔ عرب کمانڈر سعد بن وقاص نے متعدد بار قاصدوں کو ساسانی فوج کے کمانڈر رستم سے معاہدہ کی غرض سے بھیجا۔ واقعہ نگاروں کے بیان کے مطابق ایک قاصد سے رستم نے پوچھا کہ کیا وہ مسلمانوں کی فوج کا سالار ہے۔ جواب دیا کہ ''نہیں! ہم مسلمان ہیں اور ہم میں بلند و پست کوئی نہیں''۔

رستم نے کہا کہ ''دیکھو مجھے معلوم ہے کہ تم عرب لوگ غریب ہو اور بھوکے ننگے ہو اور یقیناً اس سے ہراساں ہو کر تم جنگ کے لئے نکلے ہو تو دیکھو میں تم میں سے ہر ایک کو دو جوڑی کپڑے اور کھجوروں سے بھرا ایک بورا دونگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لیکر تمہیں واپس اپنے گھروں کو چلا جانا چاہئے''۔

مسلمان قاصد نے جواب دیا کہ ''ہم یہاں تم سے کچھ لینے نہیں آئے ہم تو خود تمہیں اسلام کی نعمت دینا چاہتے ہیں۔ تمہاری تگ و دو تمہیں دوزخ کی طرف لے جارہی ہے ہم تمہیں ایک موقع جنت کے راستہ کا دینا چاہتے ہیں''۔

یہ سن کر رستم بھی ہنس دیا۔ ''تمہاری بات سن کر مجھے ایک چوہے کا واقعہ یاد آ گیا جو کسی سوراخ کے ذریعہ اناج کے گودام میں جا گھسا تھا اور جتنا کچھ کھا سکتا تھا کھالیا۔ لیکن اس نے اتنا کھالیا تھا کہ موٹا ہو جانے کی بنا پر اس سوراخ میں دوبارہ داخل نہ ہو سکا جس سے اندر آیا تھا۔ اس کے لالچ نے اسے گودام میں مقید کر دیا۔ اور پھر بلّی نے اپنا کام تمام کر دیا۔ اے عربو! تم ہمارے گودام میں چوری چھپے گھس آئے ہو اور یہاں مقید ہو گئے ہو۔ تمہارا انجام بھی وہی چوہے کا ہونے والا ہے۔ تم سب یہاں سے بچ کر نہیں جاسکو گے''۔

اس طرح کی بات چیت کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا اور بالآخر مسلمانوں نے رستم سے کہا کہ ''اگر تم اسلام قبول کرنا نہیں چاہتے ہو تو ہمیں جزیہ ادا کرو ہم تمہیں ذرا بھی نقصان نہیں پہنچائیں گے''۔

'نقصان!' رستم نے حقارت سے کہا 'جزیہ'! اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ ''مسلمانوں کو اس علاقے کی مٹی کا ایک تھیلا دے دیں''۔ جس سے اس کا منشا، مسلمانوں کو قبروں کا تحفہ دینا تھا۔

لیکن مسلمانوں نے اس تحفہ کو بخوشی قبول کیا۔ ''تم ہمیں اپنی مٹی دے رہے ہو؟ ہمیں قبول ہے''۔ دونوں فوجوں نے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ لالچی چوہے کی کہانی سنانے کے باوجود رستم نے بڑی غلطی یہ کی کہ مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کے لئے وہ دریا پار اتر آیا۔ چنانچہ اس کی فوج کے عقب میں دریا کے علاوہ پناہ کے طور پر کچھ نہ تھا۔ جنگ قادسیہ چار دن تک چلی۔ اہل فارس ہاتھیوں پر سوار تھے اور عرب اونٹوں پر۔ تیسرے دن جنگ پورے دن رات جاری رہی اور چوتھے روز میں داخل ہوگئی اور جب ساسانی شکست خوردہ پلٹے اور دریا کو پار کرنے کی کوشش کی تو ہزاروں محض ہتھیار بند ہونے کے بوجھ کی وجہ سے ڈوب گئے۔

سپاہیوں کے ساتھ ساتھ بہت سے شعراء بشمول خواتین بھی اس جنگ میں شریک تھے جنھوں نے

قصوں اور کہانیوں پر مشتمل ایک سیر حاصل خزانہ جمع کرلیا۔اور جنگ قادسیہ تاریخ اسلام میں ایک ایسے ہی اساطیر کا درجہ اختیار کرگئی جیسا کہ مغرب میں ذرا مختصر شکل میں Trojan War ہے۔

مثلاً جیسے ہی جنگ ختم ہوئی تو کامیابی کی خبر عرب تک پہنچانے کے لئے گھڑ سوار قاصد جیسے اڑ گیا۔ جب وہ مدینہ جانے والی سڑک تک پہنچا تو عجیب سی وضع قطع میں ایک شخص دوڑ کر قاصد کے پاس آیا اور محاذ کی خبر جاننا چاہی۔

'ہاں بولو کیا کہہ رہے ہو' قاصد بولا۔

کیا خبر ہے کیا خبر ہے۔ بوڑھے آدمی نے بیقراری سے پوچھا۔لیکن قاصد نے کہا کہ سڑک پر کھڑے ہوکر بات کرنے کی فرصت نہیں اور آگے بڑھ گیا۔ بوڑھا آدمی بھی اس کے پیچھے دوڑنے لگا اور سوالات کرتا رہا۔ جب وہ شہر کے دروازے تک پہنچے تو لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔ مجھے راستہ دو، قاصد اہمیت جتاتے ہوئے بولا مجھے فوراً خلیفہ سے ملنا ہے۔ 'خلیفہ عمرؓ کہاں ہیں؟

لوگوں کی بھیڑ میں ایک قہقہہ گونج اُٹھا۔ تمہارے پیچھے یہی تو کھڑے ہیں۔ کسی شان وشوکت کے اظہار کے بغیر رہنا ہی عمرؓ کا طرز تھا۔ قادسیہ کی فتح کے بعد عربوں نے ساسانی دارالسلطنت پر قبضہ کرلیا۔اور پھر آگے بڑھتے ہی گئے۔ صدیوں پرانی ساسانی سلطنت سکڑتی گئی یہاں تک کے تمام علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا اور ساسانی حکومت ختم ہوگئی۔ محض تیس سال میں مسلمانوں نے اس سلطنت کے وجود کو ختم کردیا جو روم سے صدیوں سے برسرِ پیکار رہی تھی۔ اسی دوران دوسری افواج بحرِ روم کے کنارے رومی سلطنت کے علاقوں کو تاراج کررہی تھیں اور مصر و شمالی افریقہ تک پہنچ چکی تھیں۔ اس میں سب سے قیمتی فتح یروشلم کی تھی جو مسلمانوں کے نزدیک اپنی اہمیت کے اعتبار سے مکہ اور مدینہ کے بعد اہم ترین درجہ رکھتی تھی۔ جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سفرِ معراج کے دوران جنتوں کے سفر کے لئے رسول اللہؐ نے یہیں سے آغاز کیا تھا۔ اس شہر کی فتح سے منسوب ایک اور مشہور واقعہ عمرؓ سے متعلق ہے۔ خلیفہ کو یروشلم کی کنجیاں براہ راست لینی تھی جس کے لئے انھیں یروشلم کا سفر کرنا تھا۔ یہ سفر عمرؓ نے اپنے غلام کے ہمراہ کیا۔ اور کیونکہ اس سفر کے لئے ایک ہی گدھا تھا چنانچہ سواری کرنے اور پیدل چلنے کے لئے انھوں نے اپنی اپنی باریاں بانٹ لی تھیں۔ جب یروشلم میں یہ لوگ داخل ہوئے تو اتفاقاً سواری کی باری غلام کی تھی۔ یروشلم کے لوگ غلام ہی کو خلیفہ سمجھے اور رسمِ اطاعت کے لئے جلدی آگے بڑھے تا آنکہ انھیں یہ بتانا پڑا ''میں نہیں دوسرے والے ہیں۔ انکی کورنش بجالاؤ۔

عیسائیوں نے سوچا کہ خلیفہ فتح کی یادگار کے طور پر ان کے اس مقدس ترین کلیسا میں عبادت کرنا چاہیں گے۔ لیکن عمرؓ نے وہاں قدم رکھنے سے بھی انکار کردیا۔ ''اگر میں آج قدم رکھوں'' انھوں نے سمجھایا ''تو آنے والے مسلمان فاتحین کلیساؤں کو مسجدوں میں تبدیل کرنے کے لئے اسے بہانہ بنا سکتے ہیں اور ہم یہاں اس لئے نہیں آئے۔ اس طرح کی حرکتیں مسلمان نہیں کرتے، جیسے رہتے آئے ہو رہتے رہو۔ بس اتنا یاد رکھو کہ

آج سے تمہارے ساتھ مسلمان بھی یہاں رہیں گے۔ وہ اپنے طریقے سے عبادت کرینگے اور تمہارے لئے اچھی مثال پیش کرینگے۔ اگر تمہیں اچھا لگے تو ہم میں شامل ہو جاؤ اور اگر نہیں تو جیسے ہو ویسے ہی رہو۔ ہمیں اللہ نے بتا دیا ہے کہ دین میں زبردستی نہیں ہے''۔[۳]

عمرؓ نے یروشلم میں جو رویہ اختیار کیا اس نے مسلمانوں اور مفتوحین کے تعلقات کو ایک رخ عطا کر دیا۔ عیسائیوں کو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے زیر حکمرانی انھیں ایک خاص ٹیکس جزیہ دینا ہوگا۔ یہ خبر انھیں اچھی نہ لگی۔ لیکن اس کا اچھا پہلو یہ تھا کہ جزیہ کی رقم اس رقم سے کم ہوگی جو وہ اپنے بازنطینی امراء کو دیتے رہے تھے۔ جو ان کے دینی معاملات میں دخل اندازی بھی کرتے تھے (کیونکہ عیسائیوں کے مختلف فرقوں کی دینی رسومات میں دخل اندازی ان کے لئے اہم تھی۔ جبکہ مسلمانوں کے نزدیک یہ تمام فرقے محض عیسائی تھے)۔ کم ٹیکس اور زیادہ مذہبی آزادی کا یہ سودا انھیں خاصا اچھا لگا۔ اور اس طرح مسلمانوں کو سابقہ بازنطینی علاقوں میں مخالفت کا سامنا بہت کم یا بالکل نہیں ہوا۔ بلکہ ایسا بھی ہوا کہ بازنطینیوں کے خلاف جنگ میں یہودی اور عیسائی مسلمانوں کے ساتھ ملکر لڑے۔

عمرؓ کے انتقال کے وقت اسلامی حکومت کوئی دو ملین مربع میل سے زیادہ علاقہ پر پھیل چکی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہوا؟ روایتی مذہبی مسلمان ایک سادہ سے جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ اللہ کی دی ہوئی خصوصی اعانت تھی۔ علمی انداز میں مورخین کہتے ہیں کہ ساسانی اور بازنطینی سلطنتیں کچھ عرصہ قبل جو ایک تباہ کن باہمی جنگ لڑ کر کمزور ہو چکی تھیں اور اپنے ظاہری شکوہ کے باوجود اندر سے اتنی کھوکھلی ہو گئیں تھیں کہ کسی وقت بھی گر سکتی تھیں۔ ایک اور وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ مسلمان زیادہ بہادری اور سرفروشی سے لڑتے تھے کہ انھیں یقین تھا کہ مرنے کے بعد سیدھے جنت میں جائیں گے جہاں انھیں بہتّر (۷۲) حوریں ملیں گی۔ میں یہاں اس پر کوئی رائے زنی نہیں کرنا چاہتا لیکن مسلمانوں کی اس کارکردگی کے پیچھے کچھ اور وجوہات کی نشاندہی کرونگا۔

اس دور کے مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ وہ جس کے لئے جنگ کر رہے ہیں وہ ایک ماورا اور الہامی طور پر ایک عظیم ذات ہے۔ اور اس جواز کے ساتھ یہ جنگ نہ صرف ان کی زندگیوں کو ایک معنویت عطا کرتی ہے بلکہ ان کی موت بھی بامعنی ہو جاتی ہے۔ ایسا بارہا ہوا کہ جب لوگ یہ سمجھ جاتے کہ ان کی محنت اور ان کی جدوجہد بامعنی ہونے جا رہی ہے تو وہ سخت ترین حالات میں بڑی بڑی رکاوٹوں کا سامنا کر لیتے۔ اس معنویت کا حصول دراصل انسانوں کی ایک ایسی تمنّا اور اتنی شدید خواہش ہے کہ جس کے لئے وہ اسی طرح کوشاں رہتے ہیں جتنا وہ اپنی بنیادی ضرورت جیسے کھانے پینے اور پہننے کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے۔ انسانوں کی روزمرّہ زندگی میں یہ تمنا پوری کرنے کے مواقع کم ہی ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ للّہی ڈراموں پر مشتمل وہ بیانیے جن میں انسان بنیادی کردار کا حامل ہوتا ہے لوگوں کو بہالے جاتے ہیں۔ خلیفہ عمر کے زمانہ میں مسلم مجاہدین اپنی زندگی کے بارے میں کچھ ایسے ہی تصور کے حامل تھے۔

سلطنت کے اندر جو ترقی ہو رہی تھی اس میں یہ معیار بدرجہ اولیٰ موجود تھا کیونکہ عمرؓ اسی کو نافذ کرتے تھے

جس پر وہ خود عمل پیرا ہوتے تھے اور عمل بھی ان کا وہی ہوتا تھا جس کی دوسروں کو دعوت دیتے تھے۔ مدینہ کی زندگی میں وہ تمام اقدار لوگوں کو نظر آتی تھیں جنکے بارے میں مسلمان دعویٰ کرتے تھے جیسے موافقت، نفاست، یکجہتی، شائستگی، فیصلوں میں جمہوری شراکت، مساوات اور ہمدردی، یہ سب مدنی معاشرہ میں غالب اقدار تھیں۔ مختصراً ابتدائی دور خلافت میں مسلم معاشرہ کی یہ مثالی صفات اتنی عام تھیں کہ آئندہ دور کی تمام مسلم سلطنتیں اور عام مسلمان انھیں کی یاد کو تازہ کرتے اور اپنے کھوئے ہوئے معیار کی حیثیت سے حوالہ کے طور پر یاد رکھتے۔

دوسری طرف کے لوگ انتہائی مخالفتوں کے بالمقابل مسلمانوں کی فتوحات کی داستان در داستان سنتے لیکن عوام مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا سوچتے بھی نہ تھے۔ کیونکہ مسلمانوں کی فتح کا ان کی زندگی پر کوئی اثر نہ پڑنے والا تھا۔ ان کے حکمراں تو یقیناً اپنا خزانہ کھو بیٹھیں گے لیکن عوام جیسے تھے ویسے ہی رہیں گے۔ ان کی زندگیاں متاثر نہ ہونگی۔ اگر وہ عرب عوام سے جنگ کر رہے ہوتے اور اپنے گھروں کی حفاظت کے لئے کوشاں ہوتے تو ایسی جنگیں مشکل ہوتیں اور ممکن ہے کہ وقت کے ساتھ ان کی اصول پرستی کو متاثر کرتیں۔ لیکن اپنے گھروں سے بہت دور اِن مسلمانوں کا مقابلہ کرائے کے سپاہیوں سے تھا۔

معنی کی تلاش سے وابستہ ایک اور عامل ہے جسے کسی طور پر کم نہیں سمجھنا چاہیئے۔ جنگ کے انجام پر لوٹ مار کے مواقع مسلمانوں کو بھی حاصل تھے۔ عمرؓ کے زمانہ میں سپاہیوں کو اس کی اجازت نہ تھی کہ عام شہریوں کی غیر منقولہ جائیداد پر قابض ہوں۔ میدان جنگ کا مالِ غنیمت ان کو ملتا تھا اور مفتوح بادشاہوں کے خزانے سے بھی انھیں حصہ ملتا تھا جو اس زمانہ میں کافی تھا۔ اس طرح حاصل شدہ مال کے پانچ حصّوں سے چار حصّے سپاہیوں میں تقسیم ہوتے اور اس میں کمانڈر، پیدل وغیرہ میں کسی کو امتیاز نہ تھا۔ مال غنیمت کا ایک حصّہ مدینہ چلا جاتا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں ضرورتمندوں میں بلا تاخیر تقسیم کیا جاتا رہا اور یہی طریقہ خلافت عمرؓ تک کچھ آمیزش کے ساتھ جاری رہا۔ ان تمام عوامل کو جمع کریں تو اسلام کے اتنے کم عرصے میں پھیلنے کی کچھ تشریح ہو جاتی ہے۔

فتوحات اور تبدیلیٔ مذہب دونوں کو علیحدہ علیحدہ رکھا گیا لیکن یہ ضرور ہے کہ فتوحات کی وجہ سے تبدیلیٔ مذہب نے رفتار ضرور پکڑی۔ مذہب کی تبدیلی تلوار کے زور پر نہ تھی۔ مسلمانوں نے سیاسی اقتدار کو سختی سے پکڑے رکھا لیکن اس طرح نہیں کہ ان کی تمام رعایا مسلمان ہی ہو جائے۔ اس کے برخلاف مسلمان افواج جہاں کہیں بھی گئیں معاشرتی تبدیلی بھی ان کے ساتھ گئی۔ مسلمانوں کے معاشروں میں ظہور پذیر تبدیلیاں خیر کی حیثیت رکھتی تھیں اور بڑی تیزی سے پھیل رہی تھیں۔ کیونکہ اسلامی توسیع بھی عالمی تاریخ کے اعتبار سے ایسے اہم علاقوں میں ہوئی تھی جہاں قدیم تجارتی شاہراہیں سمندروں اور دریائی راستوں کو جوڑے ہوئے تھیں۔ ابتدائی پچاس سالوں میں اسلامی توسیع بحر ہند کی مغربی سمت میں بحر روم کے مشرق اور نیل کے علاقے میں کیسپین سمندر اور آبنائے فارس کی طرف ہوتی ہوئی اس علاقے کے باہمی ترسیل کے اعتبار سے انتہائی متحرک زون میں ہوئی۔ ربط وضبط کے پہلے سے موجود ذرائع کی بدولت مسلمانوں میں رائج یا ان سے متعلق واقعات اور تصورات

بڑی تیزی سے فرداً فرداً پھیل رہے تھے۔ یہ گپ شپ اور کہاوتوں کی شکل میں بھی پھیلتے تھے اور گلی کوچوں میں ہونے والی باتوں اور علمی مباحثوں کے ذریعہ بھی بہ آسانی پہنچ جاتے تھے۔ چنانچہ مسلمان اور اسلام ان کے لیے اجنبی نہیں رہے تھے۔ زرتشتی مذہب اس علاقے پر توحید کے ایک موہوم سے سائے کو پہلے ہی سے دراز کئے ہوئے تھا۔ بازنطینی دنیا اس علاقے کو عیسائیت سے پہلے ہی روشناس کرا چکی تھی۔ اور مدتیں گذریں کہ یہودیت توحید کے بنیادی تصور کو لیوانٹ کے علاقے میں متعارف کرا چکی تھی۔

فاتح کی حیثیت میں عمرؓ اسلام کی علاقائی توسیع کے نگراں تھے اور ایک روحانی پیشوا کی حیثیت میں مسلمانوں کے عقائد کی بنیاد کو استحکام کی طرف گامزن کر رہے تھے اور اسلامی طرز حیات کی وضاحت بھی۔ ابوبکرؓ نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ اسلام مسلمانوں کا محض آئیڈیل ہی نہیں بلکہ خود ایک ایسی جماعت کا نام ہے جو دنیا کی تقدیر بدلنے والی ہے۔ عمرؓ نے اسے شکل دینا شروع کر دیا اور آغاز اپنے ھجری کلینڈر کے نفاذ سے کیا جس کا آغاز محمدؐ کی پیدائش سے نہیں، وحی اوّل سے بھی نہیں بلکہ ہجرت یعنی مسلمانوں کے مکہ سے مدینہ کے سفر سے کیا۔ عمرؓ کے اس کلینڈر میں یہ بات پنہاں تھی کہ اسلام محض انفرادی نجات کی کوششوں کا نام نہیں بلکہ اس کا نام ہے کہ دنیا کس طرح چلے اور اس کا نظم کس طرح ہو۔ بہت سے مذہبی رہنما اپنے پیروکاروں کو بتاتے ہیں کہ دنیا میں فساد برپا ہو گیا ہے لیکن تم اس سے بچ سکتے ہو۔ لیکن اسلام نے اپنے پیروکاروں سے کہا کہ ''دنیا میں فساد پھیل گیا ہے لیکن تم اسے بدل سکتے ہو'' شاید یہ بات رسول اللہ کی تعلیمات میں جبلّی طور پر سرایت کئے ہوئے تھی۔ لیکن عمر نے اسلام کی اس راہ کی نہ صرف تصدیق کی بلکہ اسے آہنی روش پر گامزن کر دیا۔

حکمرانی میں ابوبکرؓ کی نرمی اور حلم افسانوی حدوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اپنی مرضی قطعاً نہیں بلکہ صرف قرآنی اور رسول اللہ کی ہدایات کا نفاذ ہی ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ عمرؓ نے اس رویہ کو اسلامی عقائد کا سنگ بنیاد قرار دیا۔ یہ ایک بڑا ہی بنیادی فیصلہ تھا۔ یہ طے کرنا کہ کرنا وہی ہے جو وحی کا منشاء ہے اس بات کا متقاضی تھا کہ ہر وقت اور چھوٹے بڑے مسائل میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ وحی چاہتی کیا ہے۔؟

خلافت ابوبکرؓ میں عمرؓ کے مشورہ سے قرآن کے وہ تمام اجزا جو ادھر اُدھر محفوظ تھے انھیں ایک جگہ اکٹھا کر لیا گیا۔ ابتداء میں یہ متفرق اور مختلف عناصر کو اکٹھا کرنے کا عمل تھا۔ کیونکہ جب قرآن نازل ہو رہا تھا تو جو چیز موجود ہوتی اس پر رکارڈ کر لیتے۔ ان چیزوں میں پارچمنٹ شیٹ، چمڑا، پتھر اور کبھی ہڈی بھی شامل ہوتیں۔ جب عمرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے اسے مرتب کرنا شروع کیا اور اپنی موجودگی میں ہر تحریر کو یاد کی ہوئی آیات سے جانچا۔ اور یاد کی ہوئی آیات وہی معتبر مانی گئیں جو ان لوگوں کی یاد تھیں جن پر عوام بھروسہ کرتے تھے۔ پھر لکھنے والے گواہوں کے سامنے معتبر نسخہ سے انھیں ریکارڈ میں لائے۔ اور اس طرح یہ آیات ایک مکمل مجموعہ کی شکل میں منظّم کی گئیں۔

جب بھی کوئی مشکل مرحلہ آتا تو فیصلہ کرنے کے لئے قرآن دیکھتے۔ اگر یہاں نہ مل پاتا تو مسلمانوں

سے دریافت کرتے کہ وہ بتائیں کہ اگر کسی کو یاد ہو کہ رسول اللہ نے اس سلسلے میں یا اس سے ملتے جلتے حالات میں کیا کہا تھا یا کیا تھا۔ یہاں مسلمانوں سے مراد وہ چند سو مرد اور عورتیں تھیں جو رسول اللہ کی صحبت میں رہے تھے۔ جب بھی اس طرح سے فیصلہ ہوتا تو لکھنے والے اس کو لکھ لیتے اور اس کی نقل تمام صوبائی گورنروں کو بھیج دی جاتی تا کہ وہ اسے اپنے فیصلوں میں بنیاد بنائیں۔

عمرؓ نے ایسے بہت سے فضلاء کی ایک جماعت تشکیل دی اور اسے مناسب فنڈ فراہم کر کے کل وقتی طور پر اس کام کے لئے متعین کیا کہ وہ وحی، حیاتِ رسول کے واقعات اور دوسری متعلقہ معلومات میں گہرائی حاصل کریں تا کہ جب بھی ماہرین کی ضرورت ہو تو ان حضرات سے مشورہ کیا جا سکے۔ اس ابتدائی تحریک کے نتیجہ میں مسلمانوں میں ایک ادارہ علماء کے نام سے پیدا ہو گیا۔

مسلم قانون کو ایک شکل دینے کے ساتھ ساتھ عمرؓ نے مدینہ کی معاشرت میں عقائد کے اہتمام اور اس کے اثرات پر بھی کام کرنا شروع کیا۔ ان کے کام کا یہ سخت گیری پر مشتمل پہلو ہے۔ عمرؓ کاہلی اور سست روی کو بالکل بھی برداشت نہ کرتے تھے۔ مثلاً انھوں نے شراب نوشی کو یکلخت ناجائز قرار دے دیا حالانکہ قرآن اس سلسلہ میں غیر واضح تھا اور ایسا لگتا تھا کہ قرآن نے نشہ کو حرام قرار دیا ہے نہ کہ شراب نوشی کو گو کہ بعد میں نازل ہونے والی آیات نے قطعاً حرام قرار دے دیا تھا۔

قرآن نے کوئی متعین سزا شراب نوشی کے سلسلہ میں نہیں بتائی لیکن عمرؓ نے مشابہت کے اصول کی بنیاد پر سزا مقرر کر دی۔ مشابہت کچھ اس طرح سے تھی قرآن نے بہتان تراشی کی سزا کوڑوں کی شکل میں دی تھی۔ شراب کا نشہ کیونکہ بہتان تراشی میں مدد کرتا ہے اسی لئے اس کی سزا بھی کوڑے ہی ہونا چاہئے۔ مشابہت یعنی قیاس کی بنیاد پر دلیل نے اتنا متاثر کیا کہ آئندہ آنے والے مسلمان فقہا اور مفکرین اسی کی نقل کے ذریعہ حالات نپٹانے لگے۔

غیر قانونی جنسی تعلق قائم کرنے میں پنہاں تباہی کے پیش نظر عمر نے انتہائی سخت سزائیں مقرر کیں۔ شادی شدہ جوڑوں کا دوسروں سے زنا کے جرم میں آپ نے سنگساری کا قانون نافذ کیا جبکہ یہ سزا قرآن میں نہیں بلکہ قبل از قرآن قانون موسوی کی تھی (Deuteronomy 22:22)۔ عربوں میں رائج متعہ کے رواج کو بھی عمرؓ نے ناجائز قرار دیا جس کے تحت ایک مرد کو اجازت تھی کہ وہ ایک متعینہ مدت کے لئے کسی عورت سے نکاح کر لے۔ خلیفہ وقت نے اسے جب دیکھا تو عصمت فروشی قرار دیا۔

عمرؓ کے ناقدین اُن پر عورتوں سے نفرت کے الزام عائد کرتے ہیں اور ان کے بعض فیصلے بھی اس کی گواہی دیتے نظر آتے ہیں کہ وہ مردوں کے ارتکابِ جرم کی ذمہ دار عورتوں کو ٹھہراتے تھے۔ جنسی کشش کے خلل انداز ہونے اور تفرقہ پیدا کر دینے کی صلاحیت کے پیش نظر انھوں نے عورتوں اور مردوں کے رول کو الگ الگ کیا۔ مثلاً کہا کہ ''عورتوں اور مردوں کو علیحدہ نماز پڑھنی چاہئے''۔ شاید ان کا یہ خیال تھا کہ نماز کی ادائیگی کے

دوران اُن کا دھیان شہوت کی طرف نہیں جائے گا۔

لیکن عمرؓ کے ان اقدامات کو مسلمان عورتوں کو بے اختیار کرنے سے منسلک نہ کیا جانا چاہئے۔ اس کا چلن صدیوں بعد مسلم معاشروں میں عام ہوا اور آج بھی جاری ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عورتوں کے حقوق کی مدنی دور کی شکل دورِ جدید کے تانیثی معیار کی برابری نہیں کرتی۔ قبائلی عرب اور زیادہ تر پرانے زمانے کے معاشرے عورتوں اور مردوں کی ذمہ داریوں کو علیحدہ علیحدہ ہی تسلیم کرتے تھے اور اسلام نے اسے تبدیل نہیں کیا تھا۔ البتہ عمرؓ کے زمانے میں مسلم معاشرہ میں تعلیم لڑکوں اور لڑکیوں سب ہی کے لئے لازمی تھی۔ عورتیں مردوں کے ساتھ ساتھ کام کرتی تھیں اور معاشرتی ذمہ داریوں میں برابر کی شریک تھیں۔ خطبات ہوتے تو دونوں ہی شریک ہوتے۔ دونوں ہی وعظ دیتے۔ عوامی خطابات کے لئے وہ اشعار لکھتیں، جنگوں میں نرس کی حیثیت میں شرکت کرتیں اور بعض اوقات جنگوں میں باقاعدہ شرکت بھی کرتیں۔ ملت کو جو اہم مسائل درپیش ہوتے انھیں عوام کے سامنے بحث ومباحثہ کے لئے رکھا جاتا اور اس میں عورتیں بھی اپنی رائے دیتیں۔ ایسے پروگراموں میں عمرؓ کی شرکت ایک عام شریک کی حیثیت میں ہوتی اور عورتیں ہوں یا مردان کے ساتھ بلاخوف بحث ومباحثہ کرتے۔ بلکہ مدینہ میں بازار کی نگرانِ اعلیٰ کے طور پر عمرؓ نے ایک عورت کا تقرر کیا تھا۔ جس کی ذمہ داریوں میں تعمیراتی کام کی نگرانی، تجارتی اجازت ناموں کا اجراء اور اوزان کی نگہداشت جیسی اہم اور عوامی ذمہ داریاں شامل تھیں۔ اس سب کے باوجود عمرؓ نے بعض ایسے بیج بھی بودیئے تھے جو بالآخر عورتوں کے اختیارات اور عوامی ذمہ داریوں کی ادائیگی یعنی عوامی زندگی میں ان کی شراکت اور اختیار میں شدید پابندیوں کا باعث بنے۔

ساتویں صدی عیسوی میں ہر معاشرہ میں غلامی کا رواج تھا اور اہلِ عرب کوئی استثناء نہ تھے۔ اسلام نے اس رواج کو ختم نہیں کیا۔ لیکن مالک کے اپنے غلام پر اختیارات کو محدود ضرور کردیا اور عمرؓ نے ان قوانین کو سختی سے نافذ ضرور کیا۔ کوئی مسلمان غلام نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر ایک غلام عورت مرد سے حاملہ ہوجائے تو مرد کو اس سے نکاح کرنا ہوگا اور اسطرح اس کا ہونے والا بچہ پیدائشی مسلمان ہوگا اور آزاد ہوگا۔ غلامی کے نتیجہ میں خاندان نہیں ٹوٹ سکتا اس اصول نے مالک کے پاس زیادہ راستے نہیں چھوڑے اور اب یا تو وہ پورے خاندان کو خریدے گا یا پورے خاندان کو فروخت کرے گا۔

مالک اپنی لونڈی کے ساتھ بدسلوکی نہیں کرسکتے تھے جن کے حقوق آزاد انسانوں کے سے تھے یہ بات قرآن نے بھی کہی تھی اور رسول اللہؐ نے حجتہ الوداع کے موقع پر بھی اس پر زور دیا تھا۔ عمرؓ نے حکم دیا کہ مالک جو کچھ کھائے گا وہ ویسا ہی اپنے غلام کو بھی کھلائے گا۔ بلکہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہی انھیں کھانا کھلائے گا۔ اگر عمرؓ کے احکامات اپنے منطقی نتائج تک پہنچتے تو خلافت کے اوائل ہی میں عالم اسلام سے غلامی کا سلسلہ ختم ہوگیا ہوتا۔ لیکن مسلم معاشرہ کا رویہ بتدریج اس کے خلاف ہوتا گیا۔

اور ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اچانک عمرؓ کا دور خلافت ختم ہوگیا کہ ایک ہیجان زدہ فارسی غلام نے نماز کے دوران اپنا خنجر عمرؓ کے شکم میں اتار دیا بستر مرگ پر ان کے قریب بعض صاحب الرائے بڑوں نے کہا کہ آپ بھی ابوبکرؓ کی طرح کسی کو نامزد کر جائیں تا کہ معاملات پرسکون طور پر چلتے رہیں اور کیوں نہ اپنے بیٹے کو نامزد کر دیں۔ انھوں نے ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دے ڈالا۔

''کیا تمہارے خیال میں میں نے یہ ذمہ داری اپنے یا اپنی اولاد کے فائدے کے لئے اٹھائی تھی۔''

شاید عمرؓ آخری طور پر اپنے شدید غصہ کا اظہار کر رہے تھے۔ اسی دن بعد میں کسی وقت ان کا انتقال ہوگیا لیکن جاتے جاتے وہ ایک اور انتہائی نتیجہ خیز مثال قائم کر گئے۔ انھوں نے چھ ارکان پر مشتمل ایک شوریٰ تشکیل کر دی جو آئندہ ہونے والے خلیفہ کا انتخاب کرے گی اور ان کے اس انتخاب پر وہ امت کا اتفاق رائے حاصل کرے گی۔ بعد میں آنے والے بہت سے مسلم مفکرین کے نزدیک شوریٰ کا قیام دراصل اسلام میں جمہوری روایت کے قیام کی ابتداء تھی۔ شوریٰ نے علیؓ یا عثمانؓ کو اس ذمہ داری کیلئے مناسب جانا اور شوریٰ کے کنویز نے عوام کے سامنے ان دونوں سے اس سلسلہ میں انٹرویو لیا اور دونوں ہی سے ایک بنیادی سوال کیا۔ اگر آپ خلیفہ ہو جائیں تو کار حکمرانی میں آپ قرآن، رسول کی سنت اور ابوبکرؓ وعمرؓ کے طریقوں سے مدد لیں گے؟ علیؓ کا جواب قرآن اور سنت کے لئے تو مثبت تھا لیکن اپنے سے قبل کے دور خلفاء کے بارے میں منفی تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں خود ایک دماغ رکھتا ہوں تو میں اپنے ضمیر اور فہم کی روشنی میں فیصلہ کرونگا۔ اس کے برخلاف عثمانؓ نے ہر سوال کا جواب مثبت ہی دیا اور کہا کہ میں اختراع کو پسند نہیں کرتا۔ بس اسی جواب پر کنویز نے عثمانؓ کو صحیح سمجھتے ہوئے انھیں امت کا آئندہ سربراہ مقرر کر دیا۔ عوام نے اسے تسلیم کر لیا اور علیؓ نے بھی عہد وفاداری ظاہر کر دی۔

باب : ۴

رخنہ

(۲۴ تا ۴۰ھ-۶۴۴ تا ۶۶۱ء)

عثمانؓ ایک درجہ چھوڑ کر رسول اللہؐ کے پانچویں چچیرے بھائی تھے اور ۶۸ سال کی عمر میں انھوں نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ خلافت عثمانی کے بارہ سال جس طرح طوفانی انداز میں گذرے اسے سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ عثمانؓ کون تھے اور کس طرح وہ ابھرتی ہوئی مسلمان جماعت کی قیادت کے منصب پر پہنچے جو اس وقت عالم وسطیٰ پر حکمراں تھی۔

عثمانؓ کے والد مکہ کے رئیس ترین افراد میں سے تھے اور محض بیس سال کی عمر میں عثمانؓ کو اپنے والد کی لاکھوں کی جائداد مل گئی تھی۔ تجارت کا ایک خاص ملکہ ہونے کی بنا پر عثمانؓ نے اس دولت کو کئی گنا بڑھا لیا تھا کہ ابھی وہ تیس کے دھے ہی میں چل رہے تھے اور انھیں عثمان غنیؓ یعنی عثمان مالدار کا خطاب مل چکا تھا۔

اسلام قبول کرنے سے قبل بھی وہ ایک پاکباز انسان تھے۔ نہ تو انھوں نے شراب پی اور نہ ہی تمبا کو نوشی اور نہ ہی عورتوں کے خوگر رہے۔ مکہ کے ارد گرد خوش شکل کی حیثیت میں معروف تھے۔ اور لوگ انھیں خوبصورت انسان سمجھتے تھے۔ لیکن زاہد خشک اور نرم خو انسان ہمیشہ اداس اور غمگین سا رہتا تھا۔

رسول اللہؐ نے جب دعوت پیش کرنا شروع کی تو اس کے کئی سال بعد یعنی ہجرت سے نو سال قبل آپ ایمان لائے۔ ان کے ایمان لانے کا واقعہ ایک دن شام سے شروع ہوا جب وہ اپنے ایک تجارتی سفر سے گھر واپس لوٹ رہے تھے۔ یہ بات مسلّمہ ہے کہ واپسی کے سفر میں رات گذارنے کی خاطر انھوں نے ایک جگہ قیام کیا اور رات میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے لیٹے ہوئے وہ آسمان کی سیاہ چھت پر غور کر رہے تھے کہ لامتناہی آسمان کی ہیبت نے ان کو آلیا۔ انھیں اپنا وجود بے وقعت اور حقیر سا محسوس ہوا اور یہ یقین سا ہوا کہ کوئی اسے سنبھالے ہوئے ہے۔ اس وسیع وعریض کائنات کا کوئی نگراں ہے جو بے مثال اور حیطۂ خیال وادراک سے ماورا ہے۔ اس وقت گو کہ عثمانؓ تنہا تھے لیکن ایک تیز فہم آواز ان کے کانوں تک پہنچی جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ خدا کا پیامبر دنیا میں آچکا ہے۔ واقعہ ایسے بیان کیا گیا ہے کہ عثمانؓ جیسے ہی گھر پہنچے۔ وہ اپنے دوست ابوبکرؓ کے ہاں گئے جہاں انھوں نے محمدؐ رسول اللہ اور ان کے متجسس پیغام بنام خدائے واحد کے بارے میں بتایا۔ عثمانؓ نے ایمان لانے اور اس کا اعلان کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی۔

اس کے نتیجہ میں اہل خانہ کا غصہ واضح تھا۔ اُنکا خاندان بنوامیہ، رسول اللہؐ کی مخالفت میں اہل قریش

میں سب سے آگے تھا۔ مسلم مخالفت میں آئندہ آگے آگے رہنے والے ابوسفیان، عثمانؓ کے چچاؤں میں سے تھے۔ عثمانؓ کے ایک سوتیلے باپ نے ایک بار کسی گلی سے گذرتے ہوئے رسول اللہؐ پر حملہ بھی کیا تھا اور گلہ گھونٹ بھی دیا ہوتا اگر ابوبکرؓ نے دخل اندازی نہ کی ہوتی۔ ان کی دو بیویاں بھی انھیں اسلام قبول کر لینے کے نتیجہ میں ملامت کرتی رہتی تھیں۔ چنانچہ عثمانؓ نے ان سے علیحدگی اختیار کرلی اور رسول اللہؐ کی ایک انتہائی حسین صاحبزادی رقیہؓ سے نکاح کرلیا اور جب رقیہ کا انتقال ہوا تو رسول اللہؐ نے اپنی دوسری بیٹی امِ کلثوم کو بھی ان ہی کے نکاح میں دیدیا۔

مسلمان خوش تھے کہ ایک مالدار رفیق ان کے ساتھ ہو گیا تھا اور عثمانؓ مطمئن تھے کہ جس طرح سے ہوسکتا تھا وہ ان کی مدد کر سکتے تھے اور ان کے خیال میں مالی مدد اس وقت ایک اہم ضرورت تھی۔ جب مکہ میں مسلم مخالفت اپنے عروج پر تھی تو رسول اللہ نے فیصلہ کیا کہ بعض مسلمانوں کو حبشہ چلا جانا چاہئے۔ اس پورے سفر کے اخراجات عثمانؓ نے ادا کئے۔ وہ خود بھی حبشہ ہجرت کرنے والوں میں شامل تھے اور وہاں پہنچ کر انھوں نے اپنے تجارتی تعلقات کو بخوبی استعمال کیا اور تجارت نے انھیں پہلے سے بھی زیادہ مالدار کر دیا۔

اکثر مسلمانوں کے لئے ہجرت کا مطلب انکی ہر چیز اور ملکیت کا چھوٹ جانا تھا۔ وہ زراعت سے ناواقف تھے جو مدینہ کا اصل ذریعہ معاش تھا۔ چنانچہ اکثر کنگال ہو گئے لیکن عثمانؓ کے ساتھ ویسا نہ تھا۔ مدینہ ہجرت کی تب بھی انھوں نے مکہ کے اپنے پرانے تجارتی رفقاء سے تعلق ختم نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ انکے تجارتی مفادات کی نگرانی کرتے رہے اور یوں مدینہ کی ہجرت کے بعد بھی ان کی ثروت میں اضافہ ہوتا رہا۔ کبھی کسی نے نہیں کہا کہ عثمانؓ نے بے ایمانی سے دولت کمائی ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے بارے میں تاثر اس کے برخلاف تھا۔ بس کچھ لوگ ایسی تاثیر رکھتے ہیں کہ جہاں ہاتھ ڈالیں ناکام نہیں ہوتے۔ اور عثمانؓ اسی طرح کے آدمی تھے۔ وہ کوئی بندۂ زر نہیں تھے۔ عام بھلائی کے کاموں میں بھرپور سخاوت کے ساتھ خرچ کرتے۔ مثلاً رسول اللہ کی ضروریات کے پیش نظر انھوں نے مسجد مدینہ کی توسیع کرائی اور جب اہل مدینہ کو پانی کے سلسلہ میں مشکلات درپیش ہوئیں تو ایک یہودی کا قیمتی کنواں خرید کر عام لوگوں کے لئے وقف کر دیا۔

دولت کی ریل پیل، خیرہ کن حسن، رسول اللہ کی دو بیٹیاں ان کی زوج۔ اس شخص کے پاس کیا کمی تھی۔ لیکن اس کے باوجود عثمانؓ متفکر رہتے تھے کہ کچھ نہیں کر پا رہا ہوں۔ اکثر اوقات روزہ سے رہتے، نوافل کثرت سے پڑھتے اور قرآن کی تلاوت کرتے۔ راہ خدا میں خوب خوب خرچ بھی اس لئے کرتے رہے ہونگے کہ جو برکات و فیوض انھیں حاصل ہیں وہ جاری رہیں اور مستقبل میں ان کا استحقاق حاصل رہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سوچتے ہوں کہ میرا کردار بعض ان دوسرے رفقائے رسول جیسا نہیں جو ان کے قریب ہیں۔ جنگ بدر میں وہ اپنی بیوی کی بیماری کی بنا پر شرکت نہ کر سکے۔ جنگ اُحد میں جب سُنا کہ رسول اللہ شہید ہو گئے ہیں تو انتہائی مایوسی کی کیفیت میں میدان جنگ چھوڑ دیا۔ جنگ خندق میں ان کمیوں کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس جنگ کے فوراً

بعد ہی ان کے بیٹے کا انتقال ہو گیا اور وہ اس فکر سے پریشان ہوئے کہ اللہ کی طرف سے مجھے سزائیں مل رہی ہیں۔توبہ واستغفار کی خاطر آپ نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ ہر جمعہ کو ایک غلام خرید کر اسے آزاد کر دیتے۔

رسول اللہؐ کے انتقال کے بعد عثمانؓ کو مسلمانوں میں افراتفری کا خوف لاحق تھا۔لیکن خود انھیں اپنی ذات کے بارے میں زیادہ فکر تھی۔وہ کہتے کہ اب شیطان سے ہماری حفاظت کس طرح ہو سکے گی۔فکر آخرت نے اس بندۂ خدا کو جیسے چوس لیا تھا۔ایک بار کہا کہ ہر دن یوم قیامت ہے۔ان کے کہنے کا منشا یہ تھا کہ کوئی لمحہ ایسا نہیں ہونا چاہئے جو نیکی سے خالی رہے۔چنانچہ عبادتوں میں مشغولیت اور بڑھ گئی اور اسی طرح راہ خدا میں خرچ بھی۔بس تمنا یہ تھی کہ اُس جنت میں جگہ یقینی ہو جائے جس کا وعدہ محمد رسول اللہ کر رہے تھے اور انھیں یقین بھی دلا چکے تھے۔

خلافت عثمانؓ کے آغاز میں ابھی اسلام ایک مجسم معاشرہ کی حیثیت میں اپنی پہچان بنا ہی رہا تھا۔دورِ فاروقی روحانی مہمات اور ایجادات سے بھرا نظر آتا ہے اور جب عثمانؓ کے ہاتھ میں زمام کار آئی تو اسلامی جماعت ایک وسیع وعریض مملکت کی حکومت میں تبدیل ہو چکی تھی۔اب محض یہ کافی نہ تھا کہ لوگوں کو دعوت دی جائے۔دفاع، حملہ اور مقدس جوش میں جماعت مشغول رہے۔اب عوام سے ٹیکس بھی وصول کئے جاتے تھے۔ عدالتوں کا قیام بھی ضروری ہو گیا تھا۔راستوں، شاہراہوں اور پُلوں کی تعمیر اور مرمت بھی کام کا حصہ بن چکا تھا۔ تنخواہوں کا تقرّر مختلف ذمہ داریوں کی تقسیم اور ان کی وضاحت اور اُس جیسی تمام انتظامی لیکن بے روح ذمہ داریاں زندگی کا حصہ بن چکی تھیں۔حالات اور ذمہ داریوں کا یہ تغیر اور نقل مکانی عثمانؓ کے کاندھوں پر تھیں۔

خلافت کے نصف اوّل میں ایک بڑا پروجیکٹ جو عثمانؓ کے پیش نظر رہا وہ قرآن کریم کی ایک معتبر کاپی کی تیاری تھی۔چنانچہ انھوں نے یہ کام اپنے وقت کے بڑے اسکالرز کے سپرد کیا کہ قرآن کریم کی موجود نقلوں میں شامل غیر ضروری مواد کی نشاندہی کی جائے۔اختلاف دور کریں اور ان اقتباسات کا معائنہ کریں جن میں شبہات پائے جاتے تھے۔اِن کوششوں کے نتیجہ میں بالآخر وہ کاپی کتابی شکل میں تیار ہوگئی جس میں سورتوں کی ترتیب ان کی طوالت کے اعتبار سے رکھی گئی تھی (بجائے نزول ترتیب سے)۔باقی دوسری نقلیں اور نسخے مسترد کر کے انھیں تلف کر دیا گیا۔اُس وقت سے قرآن لفظ بہ لفظ وہی ہے اور ہر مسلمان کے پاس آج تک وہی چلا آرہا ہے۔یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ اگر ترجیح یہ تھی کہ مسلمان متحد رہیں تو قرآن کو یکجا کرنا اور اس کا ایک نسخہ رکھنا کتنا ضروری تھا۔لیکن یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ اس پروجیکٹ کی بنا پر بعض لوگ ان سے ناراض ہو گئے اور بالخصوص وہ جو پہلے ہی سے عثمانؓ کی نیت پر شک کرتے تھے۔یہ ناراضگی ظاہر بھی ہوئی۔

ایک اہم قدم مسلمانوں کے مالی معاملات کی درستگی سے متعلق تھا۔رسول اللہ کے زمانہ میں حکومت کے اخراجات نہ ہونے کے برابر تھے۔جو بھی رقومات مدینہ پہنچتی تھیں وہ تقریباً فوراً ہی تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ نے کسی حد تک وہ طریقہ کار قائم رکھا۔حالانکہ ابوبکرؓ نے خزانہ قائم کیا اور عمرؓ نے فاضل بجٹ تیار کیا

جس کی مدد سے وہ سپاہیوں کو وظیفہ ادا کرتے تھے۔ اور اس طرح اسلام میں پہلی بار مستقل فوج قائم کی گئی۔ لیکن عثمانؓ کے زمانہ میں خزانہ میں تیزی سے اضافہ ہوا اور وہ حکومت کے ایک مستقل محکمہ کی شکل اختیار کر گیا۔ اور اس سے مستقبل میں بڑھتے ہوئے کئی کاموں کے اخراجات ادا کیے جاتے تھے۔

خلیفہ سوئم نے دور دراز علاقوں سے ٹیکس کی وصولیابی میں اچانک اضافہ کر دیا۔

جب مصر کے گورنر عمرو بن العاص متعین رقم بھیجنے میں ناکام رہے تو انھیں برخاست کر دیا گیا اور انھوں نے اپنے رضائی بھائی عبداللہ کو مصر کا گورنر بنا دیا۔ گو کہ عبداللہ نے ٹیکس کی دوگنی رقم جمع کی جس سے یہ ثابت ہوا کہ عثمانؓ کا فیصلہ صحیح تھا لیکن عمرو ابن العاص کا نقطۂ نظر دوسرا تھا۔ انھوں نے کہا کہ عبداللہ اونٹنی سے زیادہ دودھ بچے کو بھوکا رکھ کر نکال رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلامی حکومت ظلم و زیادتی کے ارتکاب کا اشارہ دے رہی تھی۔

عثمانؓ نے عمرؓ کے اس فیصلہ کو باقی رکھا کہ مقبوضہ علاقوں کی زمین سپاہیوں میں تقسیم نہیں کی جائے گی۔ لیکن ان کا یہ فیصلہ کہ ان علاقوں میں مسلمان زمینیں نہ خریدیں واپس لے لیا گیا۔ کیونکہ عثمانؓ معاشی آزادی میں یقین رکھتے تھے اس لئے انھوں نے معروف مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی وہ ان علاقوں میں زمینیں خریدیں اور اس کے لئے حکومت کا خزانہ کھول دیا کہ وہ قرض لیں اور ایسے علاقوں میں جائدادیں بنائیں۔

بہت جلد مسلم اشرافیہ اور بالخصوص رسول اللہ کے ساتھی مملکت اسلامیہ کے علاقوں میں بڑی بڑی جائدادوں کے مالک ہو گئے۔ عثمانؓ کی معاشی اصلاحات سے دراصل انکے اپنے قبیلے نے زیادہ فائدہ اٹھایا کیونکہ شاید انھیں سرکاری خزانے سے قرض لینا زیادہ آسان تھا۔ عثمانؓ نے اپنے رشتہ داروں اور قریبی افراد کو ایسی ذمہ داریوں پر مقرر کیا جو پوری سلطنت میں سیاسی اعتبار سے بڑے اثر و رسوخ کی حامل تھیں۔ اور اس طرح بنوامیہ ان کے دربار میں معاشی اور سیاسی اعتبار سے بہت مستحکم پوزیشن کے مالک ہو گئے۔

خلیفہ سوئم خود اپنی زندگی میں انتہائی سادگی اپناتے لیکن اپنے افسروں کے لئے یہی انداز ضروری قرار نہیں دیا۔ وہ ایک دولتمند آدمی تھے چنانچہ انھوں نے کار خلافت کے عوض کوئی تنخواہ نہیں لی۔ لیکن اپنے اقربا کو خوب مالی تعاون دیا اور عوامی کاموں پر خوب خوب خرچ کیا۔ پوری سلطنت میں ان کی انتظامیہ نے پانچ ہزار مساجد تعمیر کیں۔ انھوں نے تعمیراتی کام بہت بڑے پیمانے پر شروع کیا اور نتیجہ میں مدینہ ایک چوڑی چوڑی سڑکوں اور بلند و بالا عمارتوں اور ٹائلوں سے مزیّن ہو گیا اور ایک محل نما عمارت خود عثمانؓ کا اپنا گھر تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ابھرتی ہوئی عظیم سلطنت کے ہیڈ کوارٹر کی مناسبت سے تھا۔ لیکن اس گھر میں عثمانؓ بہت سادہ روٹی، پانی اور نمازوں پر ہی گذارہ کرتے تھے۔

عثمانؓ نے اپنی تجارتی صلاحیتوں کا اظہار پوری مملکت میں کیا اور وہ سہولیات فراہم کیں جو تجارت کے لئے ضروری تھیں۔ نئی نہریں کھودی گئیں۔ شاہراہیں تعمیر کیں۔ آبپاشی کا نظام قائم کیا اور اسے ترقی دی۔ بندرگاہوں میں نئی سہولیات فراہم کی گئیں۔ ترقی پذیر شہروں میں کنوؤں اور پانی کی سہولیات میں اضافہ کیا۔ نئے

نئے بازار بھی قائم ہوئے جن کا نظام حکومت کے آفیسروں کی مدد سے چلتا تھا۔لیکن جہاں تک مسلمانوں کی اولوالعزمی اور فراخ حوصلگی کا تعلق ہے، عمرؓ کا دور اپنی مثال آپ تھا۔البتہ دورِ عثمانی کے مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی ثروت، آسودہ حالی اور فروغ پر کوئی سوال نہیں اُٹھا سکتا تھا۔

ان کا ذاتی کردار بہت بلند و بالا تھا۔ابتداء ہی سے شراب نوشی اور شہوت جیسی کمزوریوں سے مکمل اجتناب اور اوپر سے ان کی درویش صفتی نے انھیں بہت بلند کر دیا تھا۔اگر پرہیز گاری اور تقویٰ کی پہچان ریاضت اور عبادت ہے تو بلاشبہ عثمانؓ اس وقت کے دس اعلیٰ ترین اصحاب میں شمار ہو سکتے تھے۔لیکن عثمانؓ کو بات بالکل واضح تھی کہ دولت حاصل کرنا اور مال کمانا اس وقت تک قابل اعتراض نہیں جبتک یہ آمدنی انسانی بھلائی میں استعمال ہوتی رہے۔

عثمانؓ کے سب سے زیادہ منظور نظر ان کے ایک چچیرے بھائی معاویہ تھے جنھیں عمرؓ نے دمشق اور اس کے گردونواح کا گورنر مقرر کیا تھا۔عثمانؓ اپنے ان بھائی کے نظم میں مختلف علاقے شامل کرتے رہے۔یہاں تک کہ دریائے فرات کے پانی سے لیکر مصر کے بحر روم کے کناروں تک کا پورا علاقہ ان کے زیر انتظام آ گیا۔

معاویہ ابوسفیان کے بیٹے تھے جو مکہ کے ایک بڑے رئیس اور اسلام کے خلاف دو مشہور جنگوں میں مکہ کی فوج کی قیادت کر چکے تھے۔معاویہ کی ماں ہندہ جو ہر جنگ میں اپنے شوہر کے ساتھ رہی تھیں اور اُحد میں جب مسلمان بھاگ کھڑے ہوئے تھے تو محض فاتحانہ غرور میں رسول اللہؐ کے چچا شہید حمزہ کا جگر چبانے کا مظاہرہ کر چکی تھیں۔لیکن رسول اللہ کبھی بھی کسی سے کینہ نہ رکھتے تھے۔اور جیسے ہی کوئی اسلام قبول کر لیتا تو ایک خاندان کا حصہ بن جاتا۔بنوامیہ کے ساتھ بھی یہی ہوا اور قبول اسلام کے بعد رسول اللہ نے معاویہ کو ایک باصلاحیت شخص سمجھتے ہوئے اپنے قریب ہی رکھا۔

یقیناً عمرؓ نے معاویہ کو دمشق کا گورنر مقرر کیا اور ان سے کام بھی لیا لیکن شاید عمرؓ کو تھوڑی دیر رک کر سوچنا چاہئے تھا کہ رسول اللہ نے معاویہ کو اتنا قریب کیوں رکھا تھا؟ دمشق کے طویل قیام میں نظروں سے بہت دور معاویہ نے اپنی بہترین صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے ایک ایسی مستقل فوج کھڑی کر لی جو ان کی وفادار تھی اور جس کے ہیبتناک نتائج عثمانؓ کی اچانک شہادت کے بعد ظاہر ہونا شروع ہوئے۔

عثمانؓ کے بارہ سالہ دور خلافت کے آخر میں پوری حکومت میں چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔مصر میں ان کے رضاعی بھائی اتنی سرد مہری سے عوام سے ٹیکس وصول کر رہے تھے کہ وہاں ان کے خلاف فساد پھوٹ پڑا۔مصر کے بڑوں نے خلیفہ کو خط لکھ کر درخواست کی کہ گورنر کو ہٹالیں۔جب کوئی جواب نہیں آیا تو لوگ خود ہی شکایت لیکر دربار خلافت میں حاضر ہوئے۔یہی وہ وقت تھا کہ دوسرے شمالی علاقوں کے شہری جو شدید بے اطمینانی محسوس کر رہے تھے وہ بھی مدینہ میں جمع ہونے لگے۔شاید عثمانؓ نے بہت سے لوگوں کو غیر مطمئن اور ناخوش کر دیا تھا۔

ان مسائل سے عثمانؓ گھبرا گئے۔ انھوں نے علیؓ سے درخواست کی وہ ان تمام لوگوں سے ملیں اور انھیں سمجھائیں کہ واپس چلے جائیں۔ لیکن علیؓ نے انکار کر دیا کہ شاید وہ بھی خلیفہ سوئم کی پالیسیوں اور طریقہ کار سے مطمئن نہ تھے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ اب مناسب طریقہ یہی ہے کہ وہ ان تمام لوگوں سے بات کریں اور ان کی جائز شکایات دور کرنے کے لئے اقدامات کریں۔ آخر کار عثمانؓ نے مان لیا اور مصری نمائندوں سے بات کی اور وعدہ کیا کہ اپنے بھائی کو گورنر کے عہدہ سے ہٹا دیں گے اور ان سے کہا کہ وہ واپس جائیں اور گورنر کو بتا دیں کہ ایک دوسرا شخص ان کی جگہ آ رہا ہے۔

مصری افراد مطمئن ہو کر واپس جانے لگے لیکن دوران سفر عثمانؓ کا ایک غلام بھی سفر کرتا نظر آیا جس کی بعض حرکات وسکنات نے اسے مشکوک کر دیا۔ جامہ تلاشی لی تو ایک خط برآمد ہوا جو گورنر کے نام اور اس پر بظاہر خلیفہ کے دستخط بھی تھے۔ لکھا تھا کہ ان شورش پسند نمائندوں کو گرفتار کر لیں اور جب مناسب ہو انھیں قتل کر دیں۔

نمائندے مدینہ واپس لوٹ آئے اور ظاہر ہے کہ غصّہ میں تھے۔ عثمانؓ محل سے باہر آئے اور تعجب سے بولے اتنی جلدی کیوں؟ کیا ہوا؟ انھوں نے وہ خط عثمانؓ کو دکھایا تو انھیں زبردست جھٹکا لگا۔ انھوں نے قسماً کہا کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ سچی بات یہ تھی کہ ایک فتنہ پرور چچازاد بھائی مروان دمشق کے گورنر کا عزیز اور ان کا حلیف بھی تھا اس نے یہ خط لکھا ہوگا اور عثمانؓ کے دستخط بنائے ہونگے۔ عثمانؓ اس وقت کوئی اسی سال کے ہو چکے تھے آسانی سے اس سازباز کا شکار ہو گئے۔

کچھ بھی رہا ہو پُرامن شکایت کنندگان اب طیش میں آ گئے اور ایک جم غفیر کی شکل اختیار کر لی۔ پہلے تو انھوں نے کہا کہ اپنے چچازاد بھائی کو ان کے حوالے کر دیں۔ جسے خلیفہ نے مسترد کر دیا۔ پھر انھوں نے کہا کہ عثمانؓ خلافت سے دستبردار ہو جائیں اور کسی دوسرے بہتر آدمی کو ذمہ داری دیں۔ عثمانؓ نے غصّہ میں اسے بھی مسترد کر دیا اور کہا کہ خلافت میرے لئے خدائی فریضہ ہے اور ایک ہجوم کے کہنے پر اس ذمہ داری کو چھوڑ دینا خدا سے گستاخی کے مترادف ہوگا۔ پھر وہ اپنے ذاتی کمرہ میں فروکش ہو گئے۔ لیمپ جلایا اور ایک کونہ میں جا بیٹھے اور ایسا وہ اکثر کیا کرتے تھے جب انھیں کوئی پریشانی لاحق ہوتی یا کسی مسئلہ پر شک وشبہ میں مبتلا ہو جاتے۔ قرآن جو انھوں نے ہی جمع کرایا تھا اُسے پڑھنے بیٹھ گئے۔

محل کے باہر فسادی غضبناک ہوتے گئے۔ محل کے دروازے توڑ کر اندر داخل ہو گئے خلیفہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں موجود تھے اور مرد بزرگ کا لیمپ اپنی دھیمی دھیمی روشنی بکھیر رہا تھا۔ ۳۴ ہجری میں ان فسادیوں نے اپنے رہنما کو مار کر قتل کر دیا۔ اور جانشینی کا چیستاں ایک ایسے بھیانک انتشار میں تبدیل ہو گیا جس سے اسلام کی روح بھی خطرہ سے دوچار نظر آتی تھی۔

چار دن پورا شہر فسادیوں کے رحم وکرم پر رہا۔ مدینہ کے شہری اپنے گھروں میں پناہ گزیں ہو گئے اور فساد کے ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ جب ذرا سکون ہوا تو بھی فسادیوں کا کہنا تھا کہ ہم اس وقت تک شہر

خالی نہ کرینگے جبتک کہ ایسے خلیفہ کا انتخاب نہیں ہو جاتا جس پر ہم بھروسہ کرسکیں۔ پھر بالآخر سب کی توجہ اس شخص پر تھی جسے ایک بار نہیں بلکہ تین بار خلافت نے نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ شخص جسے بعض لوگ محمد رسول اللہ کا واحد جائز حقدارِ خلافت سمجھتے تھے۔ یعنی علیؓ دامادِ رسول۔

علیؓ نے ابتداءً انکار کیا لیکن دوسرے معتبر اصحاب بھی کسی طور پر تیار نہ تھے۔ فسادی یہ اعلان کر چکے تھے کہ اگر کوئی تیار نہ ہوا تو ہم مدینہ کا امن وسکون برباد کر دیں گے تا آنکہ جلد کسی کا انتخاب نہ ہو جائے۔ چنانچہ مسجد نبوی میں پھر ممتاز مسلمانوں کا ہجوم اکھٹا ہوا اور علیؓ سے درخواست کی کہ وہ ذمہ داری لے لیں۔ علیؓ کے لئے یہ لمحہ کیسا عجیب رہا ہوگا۔

پچیس سال سے جیسے وہ دیکھ رہے تھے کہ جہاز بتدریج راستہ کھو رہا ہے۔ تین بار امت نے اس کی رہنمائی کو نظر انداز کیا تھا جبکہ اس کے پاس صورتحال کو ٹھیک کرنے کے لئے توانائی بھی تھی۔ اور تینوں موقعوں پر انھوں نے خوش طبعی سے ہی کام لیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ اور وہ کر بھی کیا سکتے تھے؟ اگر وہ باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیتے تو ملت منقسم ہو جاتی۔ انھیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ ممکنہ پریشانی بڑھنے دیں یا پھر بنے بنائے ادارہ کو لڑکھڑانے دیں۔ مار ڈالیں یا اسے مرنے دیں۔ اب جبکہ حالات اتنے بگڑ گئے کہ لوگوں نے اپنے خلیفہ کو قتل کر دیا۔ تو اس کا جانشین ایک ناممکن چیلنج کا سامنا کرنے لگا۔ اب امت یہ کہہ رہی ہے کہ آؤ علیؓ اسے سنبھالو۔

خلیفہ چہارم (۳۶ تا۴۰ھ ،۶۵۶ تا ۶۶۱ء)

علیؓ نے خلافت کی ذمہ داری قبول کر لی لیکن اپنے اوّلین خطاب میں یہ واضح کر دیا کہ یہ ذمہ داری انھوں نے بحالت مجبوری ہی قبول کی ہے۔ انھوں نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ کے انتقال کے محض پہلی ہی نسل میں اتنا کچھ ہو گیا۔ حالات کو صحیح رخ پر لانے کے لئے سخت رویہ اختیار کرنا ہوگا۔ انھوں نے امت کو واضح طور پر متنبہ کر دیا کہ مجھ سے بہت سخت رویہ کی ہی امید رکھیں۔

معاشرہ کا ایک گروپ جو اچھا خاصا موثّر تھا اس نے ان باتوں کو سنا ہی نہیں۔ بنو امیہ جو عثمانؓ کے قریبی رشتہ دار بھی تھے دمشق فرار ہو گئے۔ جہاں ان کے عزیز معاویہ خاموشی کے ساتھ فوجوں کو مجتمع کر رہے تھے۔ معاویہؓ نے ایک مشہور داستان گو ساتھ لیا اور مختلف علاقوں کا دورہ شروع کر دیا۔ جہاں جہاں معاویہؓ قیام کرتے وہ داستان گو مدینہ میں ہونے والے قتل کے واقعات ہجوم کے سامنے بیان کرتا اور انکے جذبات کو برانگیختہ کرتا۔ معاویہ خود بھی اسٹیج پر آ جاتے اور خون میں ڈوبی ہوئی ایک قمیص جس کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ شہادت کے وقت عثمانؓ اسے زیب تن کئے ہوئے تھے ہاتھ بڑھا بڑھا کر لوگوں کو دکھاتے۔ یہ ایک خالص سیاسی سرکس تھا لیکن بڑی کامیاب اور ماہرانہ کرتب بازی کے ساتھ۔ پھر وہ نئے خلیفہ سے یہ مطالبہ دہراتے کہ قاتلان عثمانؓ کو گرفتار کریں اور قرار واقعی سزا دیں۔ اور اگر نہ ہو سکے تو ذمہ داری سے دستبردار ہو جائیں۔

لیکن سوال یہ تھا کہ علیؓ ان قاتلوں کو کیسے گرفتار کر سکتے تھے، کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اس ہجوم میں کس نے عثمانؓ پر قاتلانہ وار کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ پورا مجمع ہی قاتل تھا۔ معاویہ کے مطالبہ کو پورا کرنے کا مطلب یہ تھا کہ علیؓ پورے مجمع کو گرفتار کریں۔ ویسے تو عام حالات میں بھی یہ عملی طور پر ممکن نہیں ہوتا لیکن ان حالات میں تو یہ ممکن ہی نہ تھا۔ وہ مجمع اب بھی مدینہ کی گلیوں میں حکمراں تھا۔ علی کے پاس ابھی اتنی طاقت نہ تھی کہ معاویہ کے مطالبہ کو پورا کر سکتے اور معاویہ پر حقیقت آشکارا تھی۔

لیکن اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ جن لوگوں نے عثمان کو قتل کیا تھا وہ اصلاً ظلم و جبر کا شکار ہو کر اور اپنی جائز شکایتیں دربارِ خلافت میں پیش کرنے کے لئے مدینہ آئے تھے۔ لیکن خلیفۂ وقت کے قتل کے مرتکب ہو کر انھوں نے اپنی پوزیشن بڑی خراب کر لی تھی۔ اب وہ مجرم اور خود ان پر ظلم کرنے والا گروہ اخلاقی اعتبار سے ان سے بہتر پوزیشن میں آ گیا تھا۔ اب علیؓ اس صورتحال سے دوچار تھے کہ کس کو ساتھ رکھیں یعنی قاتلوں کو یا ظالموں کو۔ علی کو بڑا ہی دلخراش فیصلہ کرنا تھا۔

علیؓ کا فیصلہ یہ تھا کہ آغاز کار بدعنوانیوں سے کیا جائے جنھوں نے پوری مملکت کو تباہی کے راستہ پر ڈال رکھا ہے۔ فتح ہو یا شکست ان کی امید بس یہی تھی۔ عثمانؓ کی پالیسیوں کو تبدیل کرنے اور صحیح راہ پر مملکت کو گامزن کر کے انھیں امید تھی کہ امت کو پھر راستے پر لا سکیں گے۔ اور اسطرح جو اعتبار اور استحقاق انھیں حاصل ہوگا اس کی بدولت وہ ضروری کام انجام دے سکیں گے جن کی شدید ضرورت ہے۔

اِدھر مسلم معاشرہ میں متموّل افراد پر مشتمل عوام کی ایک نئی کلاس پیدا ہو گئی تھی جو خاص طور پر فتوحات کے نتیجہ میں ابھری تھی اور امراء کے اس طبقہ کو علیؓ کی اصلاحی پالیسیوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور علیؓ کی یہ خواہش کہ امت اپنے راستہ پر پھر سے گامزن ہو جائے، اس طبقہ کے لئے پرکشش نہ تھی۔ علیؓ کو وہ انقلابی خطرہ سمجھتے تھے جبکہ معاویہ ان کی دولت وثروت اور خود ان کی حفاظت کے ذمہ دار بن کر ابھر رہے تھے۔ چنانچہ حالات جیسے تھے ویسے ہی رہنا اس کلاس کی ضرورت بھی بن رہی تھی۔

علیؓ نے عثمانؓ کے مقرر کردہ تمام گورنروں کے خلاف کاروائی کی اور ان کی جگہ دوسرے افراد کا تقرر کیا۔ لیکن کوئی گورنر جگہ خالی کرنے کو تیار نہ تھا۔ محض یمن کا گورنر تیار ہوا اور وہ بھی اس طرح کہ خزانے کی تمام رقم لیکر فرار ہو گیا اور یوں نئے گورنر کو کام چلانے کے لئے خزانہ بالکل خالی ملا۔

ایک نئی سمت سے پریشانی آنے والی تھی۔ ام المومنین عائشہؓ شہادت عثمانؓ کے وقت مکہ میں تھیں۔ جب امیر معاویہؓ نے اپنی سرگرمیاں تیز کیں تو عائشہؓ نے اپنی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس کی وجہ ممکن ہے کہ یہ ہو کہ عائشہؓ اور علیؓ کے تعلقات شروع ہی سے سرگرم نہیں رہے تھے۔ انھوں نے اپنی حمایت کا اعلان مکہ میں ایک تیز وتند تقریر سے کیا۔ ''لوگو! باغیوں نے معصوم عثمانؓ کی جان لے لی۔ انھوں نے مدینۃ النبی کے تقدّس کو حج کے مقدّس مہینے میں پامال کیا۔ انھوں نے اہالیانِ مدینہ کو تاراج کیا اور ان کے مال ومتاع کو لوٹا۔ خدا کی قسم عثمانؓ کی ایک انگلی

بھی تمام قاتلوں کے خون سے زیادہ قیمتی ہے۔ فساد دبایا نہیں جاسکا اور قاتلان عثمانؓ کو کیفر کردار تک نہیں پہنچایا گیا۔ ان قاتلوں کے خلاف سکون سے نہ بیٹھو۔ عثمانؓ کے خون کا بدلہ لئے بغیر اسلام کی حرمت بحال نہیں ہوسکتی۔

اس طرح جو جوش وخروش پیدا ہوا اُس کو استعمال کرتے ہوئے انھوں نے ایک فوج تیار کی اور ایک جنگی کونسل کی تشکیل کی اور نقشہ کار طے کیا۔ یمن کے فارغ شدہ گورنر نے وہ تمام رقم جو وہ یمن سے لایا تھا اس مقصد کے لئے دیدی۔ رقم کا کوئی مسئلہ نہ رہا تو انھوں نے فوج کی قیادت کرتے ہوئے بصرہ جو جنوبی عراق کا یک اہم شہر تھا پر حملہ کر دیا۔ علیؓ کے وفادار جلد شکست کھا گئے اور یوں بصرہ پر ان کا قبضہ ہوگیا۔

اس مرحلہ میں کچھ لوگوں نے یہ افواہیں پھیلانا شروع کر دیں کہ شہادت عثمانؓ میں خود علیؓ بھی ملوث تھے۔ ایماندار علیؓ کی بیچارگی دیکھیئے انھوں نے اخلاص کے ساتھ یہ تسلیم کیا کہ کسی حد تک اس جرم عظیم کے ذمہ دار وہ بھی ہیں کیونکہ جب عثمانؓ ان سے حفاظت طلب کر رہے تھے علیؓ نے اپنی تلوار کو میان ہی میں رہنے دیا تھا۔ یہ خیال کہ اگر وہ ان کی مدد کرتے تو شاید عثمانؓ بچ جاتے۔ سوچ کا یہ رُخ خلیفہ چہارم کے لئے مستقل روحانی اذیت کا باعث بنا رہا۔ علی کے دیانتدارانہ اظہارِ خیال نے افواہوں کو ہوا دی اور ان کی پوزیشن مزید غیر ہوگئی۔

علیؓ نے عائشہؓ کی فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے فوج اکٹھا کرنے کی کوشش کی کہ یہ جنگ جہاد ہے اور اسلام کی بقاء کے لئے لوگوں کو اسی طرح مجتمع ہوجانا چاہیئے جیسا کہ پہلے ہوتے تھے۔ مسلمانوں کا تذبذب اور انتشار کا شکار ہونا فطری تھا کیونکہ عائشہ بھی جہاد کے لئے کہہ رہی تھیں۔ دونوں گروہ حق کے لئے جنگ کرنے کا دعویٰ کر رہے تھے۔ دونوں ہی عدل اور اسلام کے لئے لڑنے کا دعویٰ کر رہے تھے لیکن ہر ایک گروہ مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لئے ابھار رہا تھا۔ پہلے جب دن اچھے تھے تو جہاد ایسے تو نہیں لڑا جاتا تھا؟

ایک عجب بات یہ تھی کہ عائشہؓ کے ساتھیوں میں دو صحابیء رسول طلحہؓ اور زبیرؓ بھی شامل تھے جو غالباً اس بھیڑ میں موجود تھے جو عثمانؓ کے محل پر حملہ آور ہوئی تھی۔ خود وہ قاتل نہ بھی سہی قاتلوں کے ساتھ ضرور تھے۔ لیکن وہ اس فوج کی قیادت کر رہے تھے جو قتل عثمانؓ کا بدلہ لینے نکلی تھی اور علیؓ کو اقتدار سے ہٹانا چاہتی تھی۔

علیؓ مدینہ سے نکلے تو وہ کوئی زیادہ فوج اکٹھی نہ کر سکے البتہ شمال کی طرف سفر کرتے ہوئے ان کے ساتھ بہت سے قبیلوں کے سردار شامل ہوتے گئے اور یوں ان کی فوج اب خاصی بڑی فوج ہوگئی۔ جب وہ بصرہ پہنچے تو انھوں نے ایک معتبر ساتھی کو عائشہؓ سے گفت وشنید کے لئے روانہ کیا۔ علیؓ کے نمائندہ نے جو دلائل پیش کئے ان سے عائشہؓ متاثر ہوئیں۔ اوّلین بات تو انھوں نے یہ تسلیم کی کہ ان کے خیال میں عثمانؓ کے قتل سے علیؓ کا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ لیکن ان پر الزام یہ تھا کہ انھوں نے قاتلین عثمانؓ کو گرفتار نہیں کیا۔ پھر انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اصل مجرمین ہجوم کا حصہ تھے۔ جواب بھی متحرک تھے، انکے محفوظ رہنے کے لئے بدنظمی اور افراتفری ضروری تھی۔ پھر انھوں نے یہ بھی تسلیم کرلیا کہ علیؓ سے جنگ کے ذریعہ وہ دراصل افراتفری کو ہوا دے رہی ہیں اور اس طرح وہ مجرمین کے بچنے اور ان کے بھاگ نکلنے میں مدد کر رہی ہیں۔ دن ختم ہوتے ہوتے وہ اس بات پر تیار

تھیں کہ ہتھیار ڈال دیئے جائیں۔فوج منتشر کر دی جائے اور علیؓ کے ساتھ متحد ہو جائیں جس کے لئے وہ اگلے دن صبح میں علیؓ سے ملاقات کریں گی۔

یہ بات چیت دونوں کے اخلاص کا ثبوت تھی۔علیؓ یوں کہ انھوں نے جنگ سے پہلے عائشہ سے گفت و شنید کا دروازہ کھولا۔اور عائشہ اس لئے کہ انھوں نے علمی وفکری دیانت کے ساتھ اپنی غلطی تسلیم کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی۔حالانکہ وہ شدید غصہ میں تھیں۔اور ہر چہار طرف جنگ کا ماحول گرم تھا اور لوگ ایک دوسرے کو مرنے مارنے کے لئے آوازیں بلند کر رہے تھے۔انھوں نے علیؓ کے نقطہ نظر کو سنا اور ان نکات کو تسلیم کیا جوان کی پوزیشن کو منفی طور پر متاثر کر رہے تھے۔اور یہ محض اس بنا پر کہ وہ باتیں سچ تھیں۔یہ شجاعانہ کردار کی عظیم علامت تھی۔

علیؓ کے نمائندے اپنے خیموں میں واپس پہنچے تا کہ اس اچھی خبر سے سب کو مطلع کریں اور اس طرح اس رات دونوں خیموں میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں کہ اب امن قائم ہو جائے گا۔البتہ بس ایک مسئلہ تھا جس پر دونوں نے غور نہیں کیا تھا۔دونوں ہی فوجوں میں قتل عثمانؓ میں مددگار لوگ شامل تھے اور انھیں معلوم تھا کہ اگر یہ دونوں صلح پر تیار ہو گئے تو علیؓ انھیں چھوڑیں گے نہیں۔اب ایسے لوگوں کے لئے امن موت کا اعلان ہو سکتا تھا۔

اگلی صبح ان میں سے ایک گروہ نکلا اور عائشہؓ کی ابھی سوئی ہوئی فوج پر حملہ کر دیا اور جب تک علی کو خبر ہو عائشہ کی فوجیں جوابی کاروائی کر چکی تھیں۔علیؓ اور عائشہؓ دونوں نے ہی یہ سوچا کہ انھیں دھوکہ میں رکھا گیا ہے اور اس طرح وہ جنگ شروع ہوگئی جسے جنگ جمل کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں عائشہ ایک اونٹ پر سوار ہو کر میدان جنگ میں اپنی فوجوں کی قیادت کر رہی تھیں۔جنگ اس وقت ہی بند ہوئی جب ان کا اونٹ کٹ گیا اور عائشہؓ گرفتار ہو گئیں۔علیؓ جیت تو گئے لیکن اس فتح میں کتنی تلخیاں شامل تھیں۔یہ تصور کرنا بہت مشکل ہے کہ ان کی ملاقات کے وقت دونوں شخصیتوں کی قلبی حالت کیا رہی ہوگی۔

ایک طرف رسول اللہؐ کی عزیز ترین زوجہ اور دوسری طرف رسول اللہؐ کے چہیتے داماد علیؓ جن کے سامنے خون میں سرخ میدان کار میں کوئی دس ہزار مسلمانوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں جن میں متعدد اصحاب رسول شامل تھے۔

جب ان دونوں نے ہونے والے واقعات اور افراد پر جائزاتی نظر ڈالی تو محسوس ہو گیا کہ ان دونوں نے دھوکہ کھایا ہے جس کے نتیجہ میں یہ دونوں آپس میں ایک قسم کے امن پر متفق ہو گئے۔بلکہ شاید ایک قسم کی دوستی کے لئے بھی راہ ہموار ہوگئی۔اور ان ہیبتناک واقعات نے جن کے لئے کوئی بھی تیار نہ تھا انھیں قریب کر دیا۔پھر آئندہ ان میں کبھی بھی جنگ نہیں ہوئی۔جنگ جمل کے بعد عائشہ مدینہ میں آرہیں اور بقیہ زندگی احادیث رسول اکٹھا کرنے اور ان کی تشریح لکھنے میں گذار دی۔اور جب زندگی کے دن آ لگے تو وہ اسلام کی معتبر ترین اور قابل احترام عالم کا درجہ پا چکی تھیں۔

علیؓ پھر مدینہ نہ گئے اور شہر کوفہ کو جو آج کے عراق میں ہے اپنی سلطنت کا مرکز بنالیا اور یوں ان شہریوں

کو ایک قسم کا انعام دیا جنھوں نے ان کا ساتھ دیا تھا۔ وہیں بیٹھ کر اپنی خلافت کے باقیات کو مستحکم کرنے لگے۔
لیکن عائشہ کے ساتھ دلخراش جنگ دراصل ان کی پریشانیوں کا محض آغاز تھی۔ ان کی پریشانیوں کا اصل باعث تو پرتول رہا تھا۔ تیغوں کو تیز اور فوجوں کو تیار کر رہا تھا۔ معاویہ فیصلہ کن معرکہ کے لئے تیاری کر رہے تھے۔

معاویہ نے باقاعدہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ علیؓ سے بیعت نہیں کریں گے کیونکہ خلافت پر ان کا حق ہے۔
دونوں فوجیں میدان میں آمنے سامنے تھیں۔ ۳۶ ہجری میں علیؓ نے معاویہ کا مقابلہ کیا۔ اسے جنگ صفین کہتے ہیں۔ اس کا آغاز اُس وقت ہوا جب معاویہ کی فوجوں نے علیؓ کی افواج کو پانی کی رسائی روک دی۔ ایک چھوٹی سی جنگ چھڑ گئی لیکن علیؓ کی افواج نے دریا کے کنارے کو حاصل کر لیا۔ اور جنگ تعطّل کا شکار ہو گئی جو کئی مہینہ تک دراز ہوتا گیا۔ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں اس میں ضرور ہوتی رہیں۔ دونوں نے احتیاط کا مظاہرہ کیا تاکہ خون بہائے بغیر ہی فتح حاصل ہو جائے کیونکہ مسلمانوں کا خون بہنے کا نتیجہ میں دونوں ہی کی دینی حیثیت ختم ہو رہی تھی۔

لیکن تعطّل ٹوٹا اور چار روز تک جنگ ہوتی رہی۔ کہتے ہیں کہ کوئی پینسٹھ ہزار افراد قتل ہوئے۔ قتل عام کے نتیجہ میں یہ آوازیں بلند ہوئیں کہ فوجیں پیچھے چلی جائیں اور دونوں کے رہنما باہمی مقابلہ کے ذریعہ جنگ کا فیصلہ کریں۔ علیؓ اٹھاون سال کے تھے اور صحت کے اعتبار سے اب بھی خطرناک مانے جاتے تھے۔ انھوں نے بلا تکلف اسے قبول کر لیا۔ معاویہ بھی علیؓ کی عمر کے تھے لیکن فربہ تھے اور اپنی صحت ضائع کر چکے تھے چنانچہ مقابلہ قبول نہیں کیا۔

علیؓ کی فوجوں نے از سرِ نو حملے شروع کر دیئے۔ اس بار معاویہ کی افواج بری طرح شکست کھا رہی تھیں لیکن معاویہ نے ایک چال چلی تاکہ کچھ موقع مل جائے۔ انھوں نے سپاہیوں سے کہا کہ وہ اپنے نیزوں پر قرآن اُٹھالیں اور قرآت قرآن کرنے والوں کے پیچھے پیچھے چلیں۔ منشاء علیؓ کو گفت وشنید کے لئے تیار کرنا تھا تاکہ مسلمانوں میں امن قائم ہو جائے۔ علیؓ کے سپاہیوں نے سوچا کہ اس طرح ہم اگر لڑائی سے نہ رکے تو یہ قرآن کی بے حرمتی ہوگی۔ انھوں نے جنگ روک دی اور علیؓ بات چیت کے لئے تیار ہو گئے۔

علیؓ نے سوچا ہوگا کہ اس میں میری پوزیشن تو متاثر نہیں ہوئی کیونکہ میں تو شروع ہی سے بات چیت کے لئے کوشاں رہا ہوں۔ لیکن علیؓ کے ذہن میں یہ رہا تھا کہ بات اس پر ہوگی کہ یہ یقینی ہو جائے کہ معاویہ شام اور مصر کے گورنر رہیں گے۔ لیکن دونوں کے نمائندے جب ملے تو اس بات پر تیار ہو گئے کہ دونوں رہنما برابر کی سطح کے ہیں اور ہر ایک اپنے اپنے علاقوں کا حکمراں رہے یعنی شام اور مصر معاویہ کے پاس رہے اور باقی علاقوں پر علیؓ کی حکومت ہو۔

علیؓ کے ذہن میں مسئلہ کا یہ حل تو نہ تھا۔ اور یقیناً علیؓ کے طرفدار یعنی شیعانِ علی جو بعد میں ایک فرقہ کا نام ہو گیا اسی اختلاف کی بنا پر پیدا ہوا۔ یہ لوگ مطالبہ سن کر مشتعل ہو گئے۔ لیکن علیؓ گفت وشنید کے نتیجہ کو اب مسترد نہیں کر سکتے تھے البتہ بے اعتباری کے اظہار سے بھی وہ نہ رک سکے۔ معاویہ نے علیؓ کو مات دے دی تھی۔ ان سب کے علاوہ ایک اور اعتبار سے علیؓ معذور تھے۔ گذشتہ چھتیس سال سے شیعان علی علی الاعلان کہہ

رہے تھے کہ علی کو اللہ کی طرف سے کچھ خاص قوتیں عطا کی گئی ہیں جن کی بنا پر وہ سربراہی کر سکتے ہیں اور ان مخصوص قوتوں کی بنا پر مسلمانوں کو اس بگڑتی ہوئی صورتحال سے نجات دلا سکتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کی اصل وجہ تو علیؓ کا رسول اللہ سے خونی رشتہ ہونا تھی لیکن گذشتہ کئی دہائیوں کے دوران جب تینوں خلفاء اسلام ایک نئے معاشرہ کی تعمیر کر رہے تھے اس دوران علیؓ کے طرز بیان اور خطبات میں بعض ایسے موضوعات زیر بحث آتے تھے جو خاصے روحانی اور عارفانہ نوعیت کے تھے۔ مثلاً اللہ کی قدرت کاملہ، اس کا لامتناہی ہونا، اس کا واحد ہونا اور لامحدود ہونا۔ بالفاظ دیگر جہاں پہلے تینوں خلفاء نے خود کو اللہ کے رسول کے فرمودات اور ان کے وژن کے سرپرست، نگراں اور محافظ کی حیثیت میں پیش کیا علیؓ نے اپنے آپ کو داخلی اور قلب انسانی میں روشن شعلہ کے نگراں کی حیثیت میں منوالیا تھا۔ چنانچہ علیؓ کے طرفداروں کے خیال میں خلافت کے دوسرے دعویدار کے بالمقابل وہ براہ راست خدا کی رہنمائی کے حامل تھے۔ علیؓ کی حمایت میں اس تصور کا کردار خاصا اہم تھا۔

اسی پس منظر کو ذہن مین رکھیں اور دیکھیں کہ علی اب معاویہ سے سودے بازی کر رہے تھے۔ وہ معاویہ جو مسلم مخالف مادّہ پرستی کا مجموعہ تھے۔ اللہ سے تعلق خصوصی اور اس سے راست ہدایت کا یہ کیسا مظہر تھا علی کی شکل میں؟

دشمن کے ساتھ مصالحت نے محبان علی کے نوجوان گروہ کو بالخصوص مایوس کر دیا۔ اسی گروہ کو بعد میں خارجی یعنی وہ جو علیٰحدہ ہو، کہا گیا۔ اس گروہ نے علی کے ساتھیوں کے معیار کمال کی تشکیل نو کرتے ہوئے اسے ایک انقلابی نوعیت کی فکر کی حیثیت میں پیش کیا۔ کہا کہ:

خونی تعلق اور نسل کی کوئی حیثیت نہیں، ایک غلام بھی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ امت کی رہنمائی کر سکے۔ قیادت پیدائشی صلاحیت نہیں اور محض انتخاب کسی کو خلیفہ نہیں بنا دیتا۔ اس کے لئے واحد معیار کردار ہے۔ جو بھی مسلمانوں کی اقدار پر سب سے زیادہ عمل پیرا نظر آئے وہی خلیفہ ہے، کسی انتخاب کی ضرورت نہیں۔ وہ عوام کو جوابدہ ہے۔ اگر وہ بال برابر بھی اس معیار سے فروتر پایا جائے تو قیادت کی ذمہ داری پر اس کا استحقاق ختم ہو جاتا ہے۔ وہ اس عظیم ذمہ داری پر قائم نہیں رہ سکتا اور کوئی بہتر شخصیت اس کی جگہ لے گی۔

خلیفہ کی ذمہ داری پر فائز ہونا اور اس سے دستبردار ہونے کا عمل کسی نہ کسی مشینری کے تحت ہوگا۔ خوارج اس سلسلہ میں خاموش ہیں۔ یہ ان کا مسئلہ ہی نہ تھا۔ انھیں تو بس یہ معلوم تھا کہ علیؓ خلافت کا استحقاق کھو چکے ہیں اور انھیں اب دستبردار ہو جانا چاہئے۔ اور کیونکہ وہ دستبردار نہیں ہوئے تو ایک خارجی نے اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چالیس ہجری میں یہ تند طبع نوجوان قتل علی کا ارتکاب کر بیٹھا۔

علیؓ کے طرفداروں نے فوراً ہی ان کے بیٹے حسن کو جانشین بنا دیا۔ لیکن معاویہ نے حسن کو ایک بڑی رقم کے عوض خلافت کے استحقاق سے دستبردار کرا دیا۔ رسولؐ کے بڑے نواسے حسن کا دل ان حالات میں ٹوٹ چکا تھا اور اس مرحلہ میں جنگ سے تھک کر دلبرداشتہ ہو چکے تھے۔ راستہ سے ہٹ گئے۔ جنگ جاری رکھنے کی ان کی کوئی خواہش نہ تھی اور ان حالات میں خلافت کا استحقاق جتانے کا مطلب یہ پیغام دینا تھا کہ وہ بھی اقتدار کے

بھوکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے کیا فائدہ ہوسکتا تھا۔ اوراس طرح سلاطین بنوامیہ کا دور شروع ہوا۔

علیؓ کی وفات سے تاریخ اسلام کا دوراول ختم ہوجاتا ہے۔ مسلمان مورخین نے رسول اللہ کے بعد چار خلفاء کو خلفائے راشدین یعنی ہدایت یافتہ خلفاء کہا ہے۔ ان کے دور میں زندگی کی دل آویزی اور اس کا حیران کن حسن مکمل طور پر آمیزش سے پاک تو نہ تھا لیکن جب مورخین انھیں راشدون کہتے ہیں تو یقیناً ان کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ اس دور کو کامل یا کامل نمونہ کے طور پر دیکھا جائے۔ وہ دراصل یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہجرت سے لیکر علیؓ کی شہادت تک جو کچھ ارتقاء ہوا اس کی مذہبی نوعیت اور اہمیت ہے۔ تسلیم کہ اس دور میں خون بہا، ملت ذہنی کرب اور روحانی اذیت میں مبتلا ہوئی لیکن یہ شورش و ہنگامہ پست ذہن اور جھوٹے لوگوں نے دولت اور خواہش نفس کے اطمینان اور اقتدار کی بھوک مٹانے کے لئے نہیں کیا تھا۔ چاروں خلفاء اور رسول اللہؐ کے قریبی اصحاب جو اس وقت امت کا مرکز سمجھے جاتے تھے ان کی بھرپور اور انتہائی مخلصانہ کوشش یہ تھی کہ وحی ہر اعتبار سے اور عملاً جاری رہے اور کام کرتی ہوئی نظر آئے۔ ان میں ہر ایک اس مقصد کے حصول کے لئے انتہائی ضروری صلاحیتوں اور ذمہ داریوں کا احساس رکھتا تھا اور فکرمند تھا لیکن ان میں سے ایک بھی اتنا بڑا نہیں تھا کہ بیک وقت تمام ضروری صفات کا حامل ہو۔ اور ایسا کر سکے جیسا رسول اللہ نے کر کے دکھایا تھا۔ آپکے جانشین دراصل ان نابینا افراد کی طرح تھے جو یہ جاننا چاہ رہے تھے کہ ہاتھی کوئی لمبی رسی ہے، دیوار ہے، یا ستون ہے یا آخر کیا ہے؟*

چاروں خلفائے راشدین کے زمانے میں جو جدوجہد ہوئی وہ دراصل دینی معنوعیت کی تلاش تھی۔ کیونکہ جن مسائل کی بناپر اس پورے دور میں ہنگامہ بپا رہا وہ اپنی اصل کے اعتبار سے دینیاتی قسم کے تھے۔ علی کے انتقال کے بعد خلافت محض ایک سلطنت بن کر رہ گئی تھی۔

---

* ہاتھی کے بارے میں رائے قائم کرنے کی نابینا لوگوں کی کوششوں کی مثال نہ صرف نامناسب ہے بلکہ حقیقت کے بھی خلاف ہے۔ مصنف نے صورت واقعہ کی وضاحت کے جوش میں ایک غلط مثال سے کام چلانے کی کوشش کی ہے۔ رسول اللہ کے جانشین نہ تو نابینا تھے اور نہ ہی وحی یعنی اسلام کا ڈھانچہ کسی ہاتھی کی مانند تھا۔ وحی اب مکہ اور مدینہ کی گلیوں سے نکل کر بین الاقوامی سطح پر ظاہر ہورہی تھی اور اس مرحلہ میں سوالات اور مسائل تبدیل ہورہے تھے۔ وہیں انسانی کرداروں میں بھی تنوع آتا جارہا تھا۔ نظریہ اب بتدریج ایک تہذیب اور ثقافت کے مرحلہ میں داخل ہورہا تھا۔ اس مرحلہ میں متنوع کرداروں کا وحی کے ساتھ تعامل اسلام کے اظہار میں بھی تنوع پیدا کرنے لگا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ بہت سے منفی کردار جن کا وجود خود نبی کریم کے زمانہ میں تسلیم شدہ ہے ان کے اثرات بھی ہونا ہی تھے۔ چنانچہ رسول اللہ کے بعد کا دور نابیناؤں کی کوشش نہیں بلکہ فکرونظر اور وحی کے نور سے منوّر اذہان کی اسلام کی نئی جغرافیائی اور فکری آبادیاں قائم کرنے کی کوشش سے عبارت ہے۔

باب : ۵

سلطنت بنو امیہ

(۴۰ تا ۱۲۰ھ، ۶۶۱ تا ۷۳۷ء)

امیر معاویہؓ نے یقیناً خود کو خلافت اسلامیہ کے خالص مذہبی دور کے خاتم کی حیثیت میں متعارف نہیں ہونے دیا بلکہ انھوں نے اپنے لئے لقب بھی خلیفہ ہی کا استعمال کیا اور کہا بھی یہی کہ جو عظیم مشن ان کے پیش روؤں کے سامنے تھا میں بھی جاری رکھے ہوئے ہوں۔ البتہ اپنی زندگی کے آخر میں انھوں نے عرب قبائل کے امراء کی ایک میٹنگ اپنا جانشین طے کرنے کے لئے منعقد کی۔ جس کی ظاہری شکل اس شوریٰ جیسی ہی تھی جو عمرؓ نے اپنے زمانہ میں قائم کی تھی۔ چنانچہ شرکاء نے یہ سوچتے ہوئے کہ اخلاص کے ساتھ انکی رائے طلب کی جارہی ہے، آزادانہ طور پر اس مسئلہ پر غور و خوض کرنا شروع کیا اور مختلف لوگوں کے اچھے اور کمزور پہلوؤں پر غور کرنے لگے۔ اچانک خلیفہ کا ایک حاشیہ بردار کھڑا ہوا اور سب پر قہر آلود نظریں ڈالتے ہوئے بولا کہ تا حال، خلیفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، یہ تمام اہل ایمان کے کماندار ہیں اور ان کو اگر موت آجائے تو یہ ہیں۔ اس نے یزید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو بادشاہ کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اور اگر تم میں سے کسی کو اعتراض ہے تو پھر یہ ہے، اس نے اپنی تلوار باہر نکالتے ہوئے کہا[1]۔

امراء کی سمجھ میں پورا معاملہ آگیا تھا۔ مسلمانوں میں جمہوری طریقوں سے جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ لوگ سب کرتے رہے اور مناسب انداز میں آوازیں بھی بلند کیں اور اشارے بھی کرتے رہے لیکن بالآخر انھوں نے پوری فرمانبرداری کے ساتھ یزید کو آنے والے خلیفہ کی حیثیت میں تسلیم کر لیا اور جب اسی رات وہ واپس اپنے گھر پہنچے تو سب کو اس کا یقین ہو گیا تھا کہ جانشینی کا مسئلہ آئندہ کبھی زیر بحث نہیں آئے گا۔

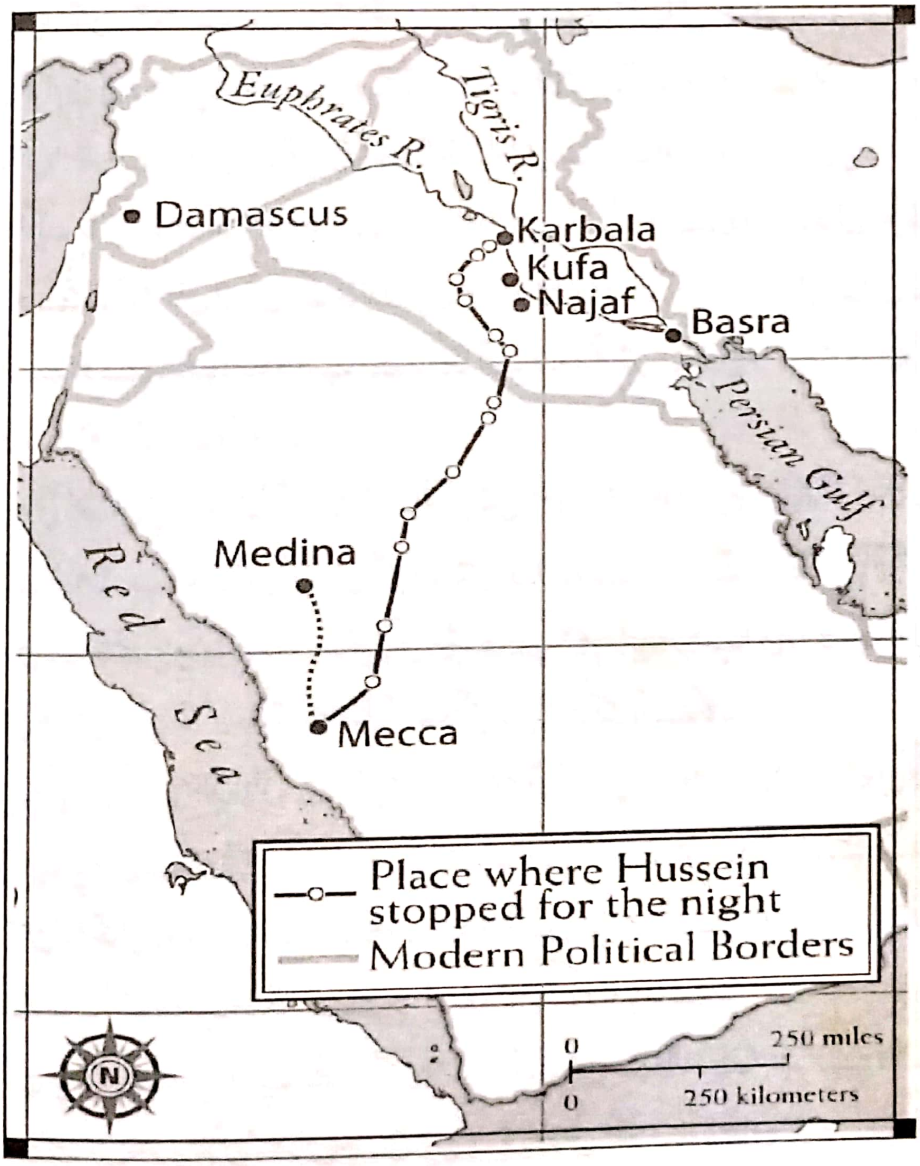
جب یزید نے تخت سنبھالا تو اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے والد نے ممکنہ باغیوں کو محض دبا دیا ہے ختم نہیں کیا۔ چنانچہ اس نے ان تمام پر گہری نظر رکھی جو ممکنہ طور پر اس کے اقتدار کو چیلنج کر سکتے تھے۔ بالخصوص علیؓ کے اقربا۔ حسن کا انتقال ہو چکا تھا البتہ انکے چھوٹے بھائی حسین حیات تھے۔ چنانچہ احتیاط کے طور پر بادشاہ یزید نے یہ فیصلہ کر لیا کہ آئندہ جب وہ حج کے لئے جائیں تو انھیں قتل کرا دیا جائے۔

حسین چالیس کے اوپر ہو چکے تھے۔ انھیں احساس تھا کہ اُن کے والد سے محبت کرنے والے انھیں صحیح معنوں میں خلیفہ سمجھتے ہیں اور پر جوش مسلمان چاہتے ہیں کہ جو روحانی انقلاب آیا تھا وہ زندہ رہے۔ لیکن یہ عظیم ذمہ داری اپنے کاندھوں پر کون اُٹھائے۔ حسین نے سیاست کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا تھا اور عبادت و

ریاضت اور غور وخوض کی زندگی گذار رہے تھے۔ بس اپنے نانا کے مشن کے پیش نظر۔

لیکن جب انھیں اپنے قتل کی سازش کا پتہ چلا اور یہ معلوم ہوا کہ یزید کے لوگ انھیں کعبہ میں ہی قتل کر دینا چاہتے تھے تو حسین سے یہ برداشت نہ ہوسکا۔ ان کے پاس نہ تو فوج تھی اور نہ ہی فوجی تجربہ جبکہ یزید کے پاس سب کچھ تھا۔ جاسوسوں کا ایک جال، خزانہ اور فوج۔ لیکن اس سب کے باوجود ساٹھ ہجری میں حسین نے اعلان کیا کہ وہ یزید کو چیلنج کرنے جا رہے ہیں۔ مدینہ سے روانہ ہوئے محض بہتّر نفوس ان کے ساتھ تھے۔

یہ کوئی فوج نہ تھی بلکہ اسے فوج کہنا زیادتی ہی ہے۔ اُن بہتّر نفوس میں حسین کی بیوی بچے کچھ شاخ بریدہ بوڑھے اقارب۔ چند ہی سپاہیانہ عمر کے مردان کے ساتھ تھے۔ سوال یہ ہے کہ اس حال میں یہ شخص کیا سوچ رہا تھا؟ کیا وہ یہ سوچ رہا تھا کہ وہ چھوٹی سی نفری سے سلطنت کا تختہ الٹ دیگا؟ کیا وہ یہ سوچ رہا تھا کہ جب وہ باہر نکلے گا تو لوگوں کے انقلابی جذبات بھڑک اٹھیں گے اور مختلف عرب قبائل ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔



امام حسین کے سفر کربلا کا راستہ

لیکن شاید ایسا نہیں تھا۔ حسین نے کوچ کرنے سے پہلے آخری خطبہ میں اپنے ساتھیوں کو بتادیا تھا کہ وہ یقیناً قتل کردیئے جائیں گے۔ لیکن وہ اس سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں کیونکہ موت اولاد آدم کے گلے میں ایسی ہی پڑی ہے جیسے کسی نوجوان لڑکی کے گلے کا نیکلیس[2]۔ انھوں نے قرآن کی آیت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ لوگوں کو چاہیئے کہ یزید جیسے ظالم حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ اگر علیؑ اور فاطمہ کا بیٹا، اور رسول اللہ کا نواسہ خود اس ظلم کے خلاف کھڑا نہ ہوا تو کون کھڑا ہوگا؟ پرانی روایتی کتابوں میں جو تذکرہ ملتا ہے اس کے مطابق حسین ایک مثالی کردار پیش کرنا چاہتے تھے۔ ابتداء ہی سے حسین کے لئے یہ ایک مذہبی اہمیت کا حامل سفر تھا۔ یعنی ایک مذہبی خودکشی۔

جب یزید کو معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ کے سب سے چھوٹے نواسے حرکت میں ہیں تو اس نے ایک فوج انھیں بیخ دینے کی غرض سے روانہ کردی۔ گوکہ یزید کی سلطنت کو حسین سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ لیکن وہ ایسے تمام ممکنہ خطروں کو جو خدا کی عائد کردہ ذمہ داری سمجھ کر اس کے خلاف اٹھنا چاہتے ہوں ایک سخت پیغام دینا چاہتا تھا۔ یزید کی فوج حسین کے چھوٹے سے گروہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی۔ نفری کے اعتبار سے دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ روایتوں میں فوج کی تعداد چار سو سے لیکر چالیس ہزار تک بتائی گئی ہے۔

تعداد کچھ بھی رہی ہو سلطانی فوج نے حسین کے قافلہ کو ایک ریگستان میں جالیا جو جنوبی عراقی سرحد کے قریب ایک شہر کربلا میں تھا۔ اس علاقے کے موسم کا جائزہ لیں تو بالعموم یہاں درجہ حرارت ۱۱۵ ڈگری سے زیادہ ہی ہوتا ہے۔ کسی ایسے جھلسا دینے والے دن یزید کی فوجوں نے حسین کے اس چھوٹے سے گروہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ گوکہ دریائے فرات بہت قریب تھا لیکن پانی تک پہنچنے کے راستے بند کردیئے گئے۔ حسین نے وہ کیا جو ان کے والد نہ کرسکے تھے۔ انھوں نے کسی بھی نوعیت کے معاہدہ اور لین دین کو ٹھکرادیا۔ ''اللہ نے انھیں مسلمانوں کی رہنمائی کی ذمہ داری دی ہے وہ اس سے روگردانی نہیں کرسکتے۔'' حسین نے کہا۔

حسین کے ساتھیوں میں ایک ایک جنگجو مقابلہ کے لئے نکلے اور ایک ایک قتل ہوتے گئے۔ عورتیں بچے اور بوڑھے محض پیاس کی وجہ سے مارے گئے۔ جب آخری آدمی بھی جاچکا تو فاتح فوج کا جرنل ٹوٹ پڑا حسین کا سر قلم کیا اور بادشاہ کو روانہ کردیا۔

جب یہ سر یزید کے پاس پہنچا تو وہ ایک بازنطینی سفیر کی ضیافت میں مصروف تھا۔ رات کی ضیافت کا پروگرام تباہ ہوگیا۔ اس دوران بازنطینی سفیر نے یزید سے پوچھا کہ ''مسلمان ایسا کرتے ہیں''؟ ہم عیسیٰ کے پیروکار باغی کے ساتھ ایسا رویہ اختیار نہیں کرتے''۔ یزید یہ گفتگو سن کر آگ بگولہ ہوگیا اور اس رومی سفیر کو جیل میں ڈلوادیا۔ بعد میں شاید اس نے سوچا کہ اس طرح سر کو رکھنا خود اس کی کردارکشی کا باعث ہوگا تو اسے کربلا واپس بھجوادیا تاکہ جسم کے ساتھ اس کی تدفین ہوجائے۔

یزید نے یقیناً سوچا ہوگا کہ مسئلہ ختم ہوگیا ہے اور ہوا بھی یہی کہ اولاد علی کی طرف سے کوئی مسئلہ نہ کھڑا

ہو۔لیکن یزید غلطی پر تھا۔کربلا میں حسینؓ کے قتل کا ارتکاب کر کے اس بادشاہ نے دراصل ایک شعلہ بھڑکا دیا تھا۔ جنگل میں آگ کی مانند جوش وخروش اور سرشاری سے لوگ علیؓ کے مشن کو اختیار کرنے لگے۔شیعت پیدا ہو چکی تھی۔شیعیت کیا ہے؟اکثر سننے میں آتا ہے کہ یہ بھی اقتدار کے لئے ایک خاندانی کشمکش تھی۔جیسے کہ بارہویں صدی کے انگلستان میں ماؤد* (Maud) اور اسٹیفین (Stephen) میں ہوئی تھی۔اگر واقعی اس کی یہی نوعیت ہوتی تو علیؓ کے بعد یہ ماند پڑ گئی ہوتی۔ذرا سوچیں کہ آج کون ہے جو اپنے آپ کو موآدی یا اسٹیفینی کہلواتا ہے۔؟ تخت انگلستان کا اصل وارث ان دو میں سے کون تھا آج کون پرواہ کرتا ہے؟ لیکن علیؓ کے انتقال کے بعد محبان علیؓ میں اضافہ ہوتا گیا۔ان کی صفیں پھیلتی گئیں۔علیؓ کے انتقال کے وقت جو لوگ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے ان کے مشن کو اختیار کرنے لگے اور ان کی شخصیتوں کی پہچان اس یقین اور اس کے اظہار سے ہونے لگی کہ علیؓ ہی خلیفہ اوّل کے اصل مستحق تھے۔لیکن یہ سب کیسے ہوا؟

اس کا جواب یقیناً یہ ہے کہ خلافت محض ایک خاندانی جدو جہد نہیں تھی۔اس میں بڑے بنیادی مذہبی مسائل شامل تھے کیونکہ مسئلہ صرف یہ نہ تھا کہ خلیفہ کون ہو؟ بلکہ سوال یہ تھا کہ خلیفہ کیسا ہونا چاہئے۔محبان علیؓ ان میں وہ صفات دیکھتے تھے جو دوسروں میں نہیں تھیں۔ان کے خیال میں انھیں بعض ایسی صفات عطا ہوئی تھیں جن کی بنیاد پر وہ ایک عام انسان سے ماورا تھے اور یہ صفات ایسی ہی تھیں جیسی انھوں نے محمد رسول اللہؐ میں دیکھی تھیں۔یہ تو نہیں کہا گیا کہ وہ بھی ایک پیغمبر ہیں کیونکہ کم از کم اس وقت اس قسم کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔چنانچہ علیؓ کو ایک دوسرا لقب دیا گیا۔کہا کہ علیؓ امام تھے۔

بنیادی طور پر امام اس شخص کو کہا جاتا تھا جو جماعتوں میں نمازوں کی قیادت کرتا تھا۔مسلمانوں کی اکثریت آج بھی یہی سمجھتی ہے۔احترام کی خاطر یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔زیادہ سے زیادہ جیسے عزت مآب یا محترم جیسے الفاظ کیونکہ اتنا ہی تو ہوتا ہے کہ ہر بار جب مسلمان با جماعت نماز ادا کرتے ہیں تو ایک اس نماز کی قیادت کرتا ہے اور اس مقام پر جو بھی کھڑا ہوتا ہے وہ وہی کرتا ہے جو کسی دوسرے نے کیا ہوگا۔اس کا کام محض یہی تو ہے کہ وہ تمام نمازیوں کے سامنے تنہا کھڑا ہو اور اس طرح پوری رسم کے دوران نمازیوں کے عمل اور ادائیگی میں یکسانیت اور ہم آہنگی قائم رہے۔مسجد میں ایک امام ہوتا ہے اور جب وہ نماز کی قیادت نہیں کر رہا ہوتا تو اکثر و بیشتر وہ مسجد کی صفائی کی ذمہ داری بھی ادا کرتا رہتا ہے۔

---

* بارہویں صدی کے انگلستان کی تاریخ کے یہ دو کردار ہیں۔شاہ ہنری اول کے دو جائز اولادیں بیٹی ماؤد (Maud) اور بیٹا ولیم تھیں۔بیٹا جب ایک حادثہ میں موت کا شکار ہو گیا تو شاہ ہنری نے اپنی بیٹی ماؤد کو اپنا جانشین مقرر کیا۔لیکن اس کے چچا زاد بھائی (اسٹیفن) نے یہ دعویٰ کیا کہ شاہ ہنری نے مرتے وقت اپنا ارادہ بدل دیا تھا اور اسے جانشین مقرر کر دیا تھا۔اس طرح اس نے سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ماؤد اور اسٹیفن کے اختلافات میں جنگ کی نوبت آ گئی اور ۱۱۴۱ء میں Lincoln کی جنگ واقع ہوئی۔اس طرح یہ جانشینی کی جنگ تھی۔شیعی تشخص کے ارتقاء کا اس سے موازنہ مترجم کے نزدیک مناسب نہیں۔

لیکن جب شیعہ یہ لفظ امام استعمال کرتے ہیں تو یہ لفظ ایک خاصے بڑے مقام کا حامل ہو جاتا ہے۔ شیعہ کے نزدیک دنیا میں ہر وقت ایک امام موجود رہتا ہے اور یہ ایک سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں شیعوں کے یہاں آغاز اسطرح سے ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہؐ کے اندر اللہ نے صریحاً اور حسی طور پر واضح ایک صوفیانہ مواد ودیعت کر دیا تھا جو ایک قسم کی توانائی یا نور کی شکل میں رہا ہوگا جسے یہ لوگ محمدؐ کی برکت کا نام دیتے ہیں۔ جب رسول اللہؐ کا انتقال ہو گیا تو یہ برکت علیؓ کو منتقل ہو گئی اور اسطرح وہ پہلے امام مانے گئے۔ علیؓ کے انتقال کے بعد وہی روشنی انکے بیٹے حسنؓ کو منتقل ہوئی جو دوسرے امام ہوئے۔ بعد میں یہ روشنی انکے چھوٹے بھائی حسینؓ کو ملی جو تیسرے امام کہلائے۔ جب کربلا میں حسینؓ شہید ہوئے تو یہ تصور امامت برگ و بار لایا اور ایک مضبوط دینیاتی روایت کی شکل میں ابھرا جسے اس وقت کے عمومی نقطۂ نظر کے غلبہ کی بنا پر ضروری غذا نہ مل سکی۔

یہ عمومی نقطۂ نظر کیا تھا؟ جس کی نمائندگی ابوبکرؓ اور عمرؓ کے رویوں سے بھی ہوئی تھی۔ وہ یہ تھا کہ محمدؐ صحیح معنوں میں ایک پیغمبر تھے جنھوں نے ایسی تعلیمات پہنچا دیں جو یہ بتاتی ہیں کہ زندگی کیسے گذاریں۔ یہ پیغام انتہائی عظیم تھا۔ قرآن پہنچانے کے علاوہ رسول اللہؐ کی مذہبی حیثیت محض انکی سنت یعنی وہ اعمال جو ان کے طرز حیات سے مترشح تھے اور جنھیں دوسرے وہ لوگ جو خدا کی مدد اور اس کی حمایت کو اپنی زندگی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اپنائیں۔ جن لوگوں نے اس نقطۂ نظر کو تسلیم کیا بالآخر سنی کہلائے اور آج مسلمانوں میں ان کی تعداد ہر دس میں نو سنیوں پر مشتمل ہے۔

شیعوں کا خیال تھا کہ محض اپنے ذاتی اعمال کی بنیاد پر جنت کا حصول ممکن نہیں۔ محض تعلیمات اور ان پر عمل کافی نہیں۔ وہ دراصل یہ تسلیم کرنا چاہتے تھے کہ ہدایت الٰہی کی ترسیل اس دنیا میں آج بھی جاری ہے اور یہ ترسیل بعض ایسے منتخب افراد کے ذریعہ ہو رہی ہے جو دوسرے اہل ایمان کو روحانی نجات کی برکت سے مستفید کر سکتے ہیں جو دنیا کو آلائشوں سے پاک اور اسے دلسوزی اور شوق کی گرمی سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔

جب حسینؓ کربلا گئے تھے تو ان کی فتحیابی کا کوئی امکان نہ تھا۔ ان کی امید صرف ایک الٰہی معجزہ تھا۔ لیکن وہ جس مستقل اصول کو مجسم بنائے ہوئے تھے وہ تو خود ہی ایک معجزہ تھا۔ انھوں نے اور ان کے رفقاء نے موت کو خوش آمدید کہہ کر کسی معجزہ کے امکان کو علامتی طور پر مسترد کر دیا تھا۔ لیکن بالآخر کربلا میں یہ شیعی معجزہ رونما ہوا حسینؓ کی شہادت ایک معجزہ تھی۔

آج تک شیعہ قتل حسینؓ کے سوگ کو ہر سال نوحہ گری کی شکل میں یاد کرتے ہیں۔ ماتم کدوں میں جمع ہوتے اور شہادت کے واقعہ کو کہانی کی شکل میں دہراتے ہیں۔ یہ ایک مذہبی بیانیہ بن جاتا ہے جس میں کشفی سطح پر حسین ایک تلافی کرنے والے کردار میں نظر آتے ہیں۔ حسینؓ نے خدا کے بعد اہم ترین پوزیشن حاصل کر لی ہے۔ اور وہ گنہ گاروں کے لئے شفاعت کے منصب پر فائض نظر آتے ہیں۔ جو انھیں تسلیم کر لیں اور انھیں معیار مان لیں تو ان کی حفاظت یعنی جنت میں ان کا مقام محفوظ ہو جاتا ہے۔ چاہے ان کی زندگی کا ریکارڈ کتنا ہی

داغدار اور بے راہ روی سے عبارت کیوں نہ ہو۔ حسین نے شیعوں کو اس معجزہ کے لئے بیک ڈور فراہم کردیا جس کی وہ توقع کرتے آئے تھے۔ حسین میں یقین تمہیں سیم وزر، اقتدار یا عشق میں خوش قسمتی کو نہیں بلکہ جنت کے حصول کو ممکن کرسکتا ہے۔ شیعوں کے لئے یہی معجزہ ہے۔

اب یہ دیکھتے ہیں کہ معاویہؓ کے برسر اقتدار آنے پر سیاسی بساط پر کیا کچھ ہوا۔ بنوامیہ کے آنے کے بعد اسلام ایک مذہبی واردات کی حیثیت میں تو ختم ہوگیا لیکن اسلام بطور مذہب اور ایک سیاسی سلطنت کی صورت میں پھلنے پھولنے لگا۔ اگر مغربی تاریخی روایت کے تناظر میں ہی دیکھا جائے تو اموی دور مسلمانوں کی عظمت کا آغاز ہے۔ مغربیوں کے مطابق مسلمانوں کی تاریخ کا سنہرا دور یہیں سے شروع ہوتا ہے اور خود اموی دور کے خاتمہ کے کافی عرصہ بعد تک جاری رہا۔

درویشانہ کمزوریاں معاویہؓ میں کتنی بھی رہی ہوں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک بڑے ہی زبردست سیاسی مدبر تھے۔ اور اس صلاحیت ہی کی بنا پر وہ مختلف النوع اذیتوں میں مبتلا علیؓ پر فتحیاب ہوگئے تھے اور بادشاہت قائم کرسکے تھے اور ان روایتوں اور طریقوں کو مستحکم کیا تھا جو اسلامی سلطنت صدیوں تک مستحکم رکھنے میں کامیاب رہی۔

لیکن حالات نے جو بھی رخ اختیار کیا ایک تیسری آنکھ اس پر طنز کرنے میں حق بجانب ہے۔ کیا اسے کوئی بھلا سکتا ہے کہ جب محمد رسول اللہؐ کے پیغمبرانہ کردار کا آغاز ہوا تو مکہ کے رؤسا میں بنوامیہ مخالفت میں سب سے آگے تھے۔ رسول اللہؐ نے آغاز دعوت میں جب ان مالداروں کی سرزنش کی جو ناداروں، غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کی خبرگیری سے کتراتے اور ان سے صرف نظر کرتے تھے تو اصل ضرب انھیں اموی ذمہ داروں پر پڑی تھی۔ وہ جب تک مکہ میں رہے امویوں نے اہل ایمان اور خود رسول اللہؐ کو پریشان کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ہجرت سے قبل رسول اللہؐ کے قتل کی سازش رچنے میں وہ برابر کے شریک تھے اور مسلمانوں کے مدینہ چلے جانے کے بعد اسلام کو ختم کرنے کی جو کوششیں ہوئیں ان میں بنوامیہ کا رول قائدانہ تھا۔

لیکن ایک بار جب یہ واضح ہو چلا کہ اب جگ ناتھ اسلام ہی ہے تو اموی افراد اسلام قبول کرنے لگے اور امت مسلمہ کا حصہ بن کر نئے معاشرہ میں بھی بلند مقام حاصل کرلیا اور یہاں پھر اشرافیہ کا حصہ بن گئے۔ اسلام سے قبل تو وہ محض ایک شہر کے رؤسا میں شمار کئے جاتے تھے لیکن اب وہ ایک عالمگیر سطح کی سلطنت کے رؤسا میں تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اس صورتحال میں ایسے بہت سے ہونگے جو اپنے ماضی کے منفی رویوں پر شرمندگی محسوس کرتے ہونگے کہ آخر اس نئے مذہب میں کیا خرابی تھی؟

فرمانروائی کے باب میں انھیں عمرؓ اور عثمانؓ سے بعض انتہائی طاقتور پالیسیاں ورثہ میں ملی تھیں۔ عمرؓ کے زمانہ میں اسلام کی خاطر منکرین کے خلاف جارحانہ جنگوں کو مذہبی رنگ جہاد کی شکل میں ملا تھا۔ جہاد کی اس تعریف کے نتیجہ میں ان نئے مسلمان فرمانرواں کو یہ موقعہ مل گیا کہ وہ سرحدوں پر مستقل جنگ جاری رکھیں۔ اس

پالیسی سے وابستہ مفادات سے انکار ممکن نہیں۔

ایک بڑا فائدہ تو یہ تھا کہ جارحیت اور تشدد سلطنت کی سرحدوں میں محدود ہو گیا اور داخلی علاقہ امن و سکون کا گہوارہ بنا رہا۔ اس کے نتیجہ میں یہ نظریہ اور مستحکم ہوا کہ دنیا دو حصوں میں تقسیم ہے ایک حصہ امن کا گہوارہ یعنی اسلام ہے اور دوسرا جنگ زدہ ہے جس میں باقی سب شامل ہیں۔ یہ تصور خلافت کی ابتداء میں جڑ پکڑنے لگا تھا۔

سرحدوں پر نہ ختم ہونے والی جنگوں نے اس نظریۂ امن و جنگ کو حقیقت کی شکل دینے میں اس طرح مدد کی کہ پہلے تو اس بیانیہ کو کہ سرحدیں عموماً جنگ و جدل کی آماجگاہ ہوتی ہیں اور اندرون میں امن رہتا ہے ایک حقیقت کے روپ میں پیش کیا اور دوسرے عملاً اسے ثابت کیا۔ تمام عرب قبائل کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے اغیار کے خلاف متحد کر کے اور ان کی اسلام سے قبل کی آپسی رنجشوں کو کم کر کے جہاد میں انھیں شامل کیا جس کے نتیجہ میں عالم اسلام نسبتاً ایک امن کا گہوارہ بن گیا۔

یہ صورتحال اسوقت زیادہ سمجھ میں آجاتی ہے جب ہم ان لوگوں پر نظر ڈالتے ہیں جنھوں نے اسلام کی ابتدائی توسیعی جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ کسی علاقہ پر قبضہ کی خاطر اور ایک ماسٹر پلان کے تحت بادشاہ کوئی فوج روانہ کرتے۔ یہ تمام جنگیں قبائلی فوجوں نے لڑیں جو بالعموم اپنی مرضی اور حالات کے تحت اور دینی جوش کے تحت رضا کارانہ طور پر شامل ہوتے تھے۔ اس میں خلیفہ کا حکم اور اس کی خواہش زیادہ شامل ہوتی۔ اگر سرحدوں پر مسلمان علاقائی توسیع کے لئے نہ لڑ رہے ہوتے * تو ممکن ہے کہ یہ قبائلی مالِ غنیمت کی تلاش میں پڑوسیوں سے ہی نبرد آزما ہو رہے ہوتے۔

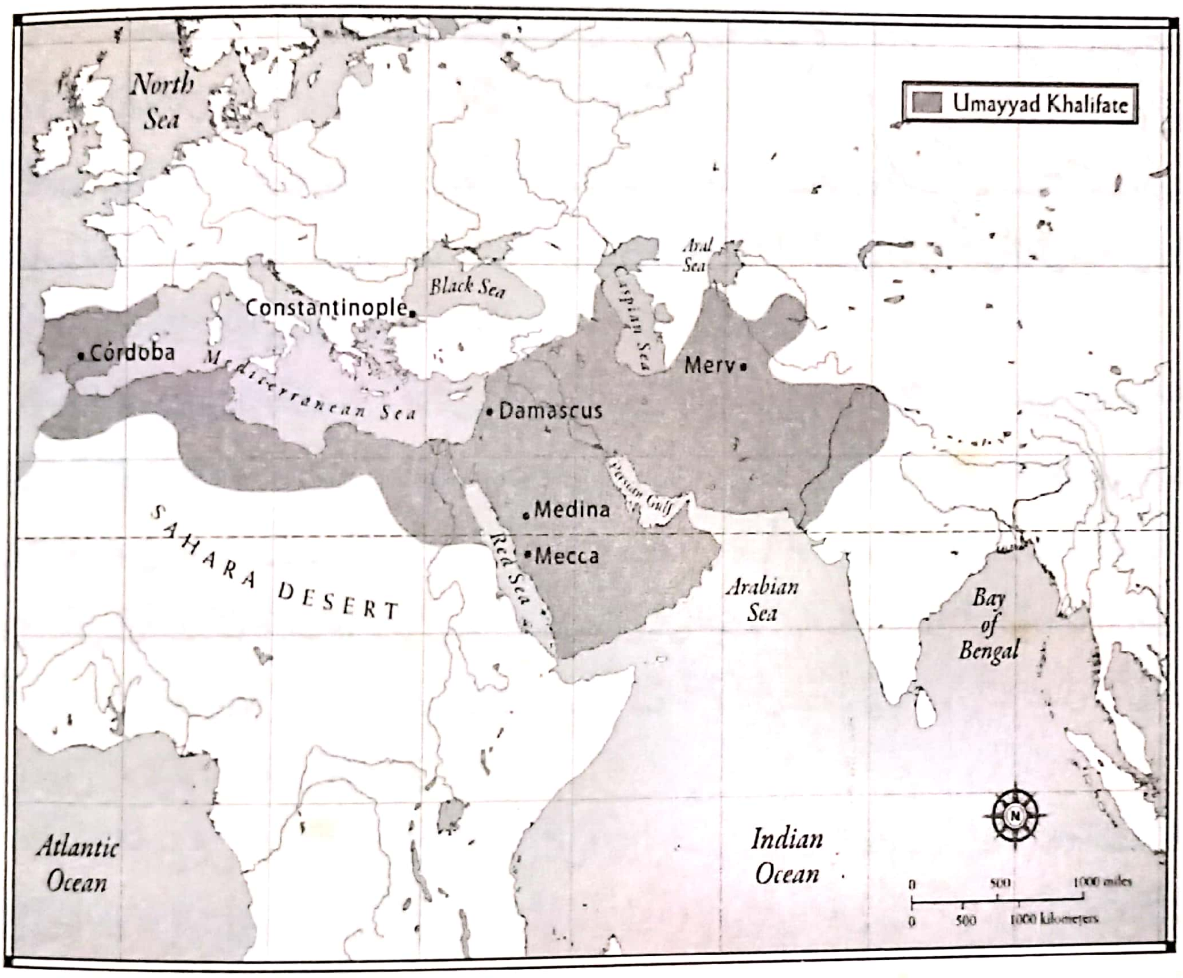
جنگوں میں مسلسل فتحیابی نے مسلمانوں میں اسلامی عقیدے کے استحکام کے لئے بھی کام کیا۔ ابتداء ہی سے مسلمانوں کو سیاسی اور عسکری سطح پر جو ناقابل یقین کامیابیاں ملیں انھوں نے اسلام کی حقانیت کو انتہائی بنیادی معجزہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ عیسیٰ نے اندھوں کو بینائی دی ہوگی اور مردوں کو زندہ کھڑا کر دیا ہوگا۔ موسیٰ کا عصا اژدھے میں بدل گیا ہوگا اور بنی اسرائیل کے خروج کے لئے بحر احمر نے راستہ دیا ہوگا۔ نظر آنے والے اس طرح کے معجزے ان پیغمبروں کی حقانیت ثابت کرتے تھے۔

لیکن محمدؐ کی ان ماورائے فطرت معجزوں سے کوئی نسبت نہیں رہی۔ انھوں نے اپنے پیروکاروں کو کبھی بھی ایسی قوتوں کے اظہار سے متاثر نہیں کیا جو قوانین فطرت سے انحراف کرتے ہوں۔ آپ کی زندگی میں محض

---

* یہاں اصل بات یہ ہے کہ یہ قبائلی ایک خاص نظم یعنی خلیفہ کی اجازت کے بغیر کوئی اقدام نہ کر سکتے تھے اور مالِ غنیمت کی تلاش میں قدروں کی پامالی ممکن نہ تھی۔ گو کہ یہ انسانی معاشرہ تھا اور ممکن ہے کہ اس معاملہ میں ان قبائیلیوں سے کوئی زیادتی بھی ہو جاتی ہو لیکن معلوم ہو جانے پر اس کی تلافی ہوتی اور ایسے کردار سزا اور جوابدہی سے بچ نہ سکتے تھے۔ مصنف کا یہ کہنا کہ ممکن ہے کہ مالِ غنیمت کی تلاش میں یہ ایک دوسرے سے ہی نبرد آزما ہو رہے ہوتے، ذرا مبالغہ سا لگتا ہے۔

معراج کا واقعہ ہے۔ جس میں آپ ایک سفید براق پر سوار ہو کر شہر یروشلم سے جنتوں کے سفر پر روانہ ہوئے اور یہ معجزہ بھی ایسا نہیں تھا کہ کسی بھرے مجمع نے اس کا مشاہدہ کیا ہو۔ یہ ان پر ہوا تھا لیکن کسی نے اسے دیکھا نہیں۔ آپ نے ہی اسے اپنے ساتھیوں سے بیان کیا۔ جس نے چاہا اس پر یقین کیا اور نہیں بھی کیا۔ البتہ آپ کے پورے مشن پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ کیونکہ آپ نے اسے اپنے پیغام کی حقانیت کے ثبوت کے طور پر پیش نہیں کیا۔



اُموی سلطنت

لیکن محمدؐ کے پاس قرآن خود اور اس کی متاثر کرنے کی قوت کے علاوہ ایک دوسرا معجزہ تھا۔ وہ تھا ان کی جنگی فتوحات جن میں ان کے پاس نفری قوت ایک کے مقابلہ تین کے ہوتے ہوئے بھی مقابلہ آپ کے حق میں رہا۔ اور یہ معجزہ آپ کے بعد ابتدائی خلفاء کے زمانہ میں جاری رہا جب بڑی تیز رفتاری سے عالم اسلام کی سرحدیں تمام رکاوٹوں کو ہٹاتی ہوئی پھیلتی رہیں۔ خدائی مدد کے علاوہ کسی طرح سے ان کامیابیوں کی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔

بنوامیہ کے دور میں بھی یہ معجزے جاری رہے۔ فتوحات اتنی تیزی اور حیران کن انداز میں اب نہیں آئیں اور اس طرح کی فتوحات کے امکانات اس طرح بھی کم ہوتے گئے جیسے جیسے مسلمانوں کی افواج کی تعداد مد مقابل کے سامنے اتنی کم نہ رہی جتنی کہ ابتدائی دور میں ہوا کرتی تھی اور اگر ایسا ہوتا بھی تو بس شاذ و نادر ہی۔ کچھ بھی ہو

فتوحات جاری رہیں اور علاقائی توسیع ہوتی رہی۔ ایسا کبھی نہ ہوا کہ جو علاقہ ایک بار قبضہ میں آیا وہ چھن گیا ہو۔ جب تک یہ ہوتا رہا اسلام کی حقانیت ثابت ہوتی رہی۔ جوش وخروش میں اضافہ ہوتا اور فتوحات حاصل ہوتیں۔ یہ پھر حقانیت کو ثابت کرتیں اور پھر جوش کو غذا ملتی۔ فتوحات کا حصول یقین میں اضافہ کرتا۔۔۔۔ اور یوں ایسا ہوتا رہا۔

ان مستقل جنگوں کے کچھ ظاہری فائدے بھی تھے۔ ان میں ایک آمدنی میں اضافہ تھا جسے مسلمان کچھ اس طرح بیان کرتے کہ اللہ سے بے خوف حکمراں اپنی رعایا پر ظلم کرتے اور اس وقت تک انھیں لوٹتے رہتے جب تک ان کا خزانہ لبالب بھر نہ جاتا۔ مسلمان پہنچتے اور ان ظالم حکمرانوں کو بے تاج کر دیتے اور رعایا کو ان کے ظلم اور لالچ سے آزادی مل جاتی۔ اور خزانہ مسلمانوں کے حصے میں آجاتا۔ ظاہر ہے کہ آزاد عوام کو خوشیاں حاصل ہوتیں اور مسلمان دولت مند ہو جاتے۔ ہر ایک مطمئن ہو جاتا سوائے مفتوح بادشاہ یا شاہزادوں کے۔

مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ مرکزی حکومت کو ادا کر دیا جاتا۔ جو ابتدائی دور میں پورے کا پورا عوام میں تقسیم کر دیا جاتا اور اس تقسیم میں اس کا اہتمام ہوتا کہ جو سب سے زیادہ ضرورتمند ہوا سے پہلے ملے۔ لیکن ہر خلیفہ کے ساتھ سرکاری خزانہ بڑھتا رہا۔ جب اموی دور شروع ہوا تو یہ تمام دولت سرکاری خزانہ میں جانے لگی اور سرکاری اخراجات میں اس کا استعمال ہونے لگا۔ شاندار اور بلند و بالا عمارتیں، زبردست عوامی نوعیت کا کام اور شاہ خرچ اوقاف۔۔۔ اس طرح جنگوں سے حاصل شدہ مال و دولت نے اُموی حکومتوں کو معاشرہ میں ایک ایسی قوت کی حیثیت سے متعارف کرا دیا جو بحیثیت مجموعی مثبت تھی۔ عوام پر شاہ خرچیوں کے لئے حکومت کی بڑھتی ہوئی استطاعت اور وہ بھی ٹیکس میں کسی قسم کے اضافے کے بغیر۔

اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ خلیفہ سوئم عثمانؓ نے بعض ایسی روایتیں مسلم معاشرہ میں متعارف کرا دیں تھیں جن سے اُموی حکمرانوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔ انھوں نے مسلمانوں کو اس کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی کہ وہ اپنی دولت کو جس طرح اور جہاں چاہیں خرچ کر دیں۔ بس بنیادی اصول یہ تھا کہ یہ اخراجات اسلامی اخلاقی تعلیمات کے تحت اور اسی دائرے میں ہونا چاہیں۔ چنانچہ عثمانی فیصلہ کی روشنی میں امویوں نے عوام کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ سرکاری قرض سے بھی مفتوحہ علاقوں میں جائدادیں خرید سکتے ہیں۔ البتہ یہ فائدہ وہی اٹھا سکتے تھے جو گہرے اور موثر تعلقات کے حامل تھے۔ یہ صورتحال گو دورِ عثمانی میں بھی تھی لیکن اموی دور میں تعلقات کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی۔ اسلام نے کیونکہ سود حرام قرار دے دیا تھا اس لئے ایسے تمام قرض بلا سودی ہو گئے جو جس کو بھی مل جاتے اس کے لئے سرمایہ کاری کی بہترین شکل ہوتی۔

عمر کے زمانے میں حکم عام تھا کہ مسلم افواج اپنے کیمپوں میں ہی قیام کریں اور مفتوحہ آبادیوں سے اپنے آپ کو دور رکھیں گی جس کے متعدد مقاصد تھے۔ ایک یہ مقصد تھا کہ مقامی لوگوں کے حقوق پامال ہونے کے امکان سے محفوظ رہیں۔ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمان اقلیت مقامی آبادی کی اکثریت میں گھل مل کر کہیں اپنی شناخت نہ کھونے لگے اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کہیں مسلمان مقامی آبادی کی اخلاق باختہ تفریحات سے متاثر نہ ہونے لگیں۔ اُموی دور میں یہ فوجی علاقے فصیل بند عرب شہروں کی شکل اختیار کر گئے جس میں آباد نئی اشرافیہ چاروں

طرف پھیلے ہوئے مقبوضہ علاقوں میں بڑی بڑی جائدادوں کی مالک تھی جس سے وہ آمدنی حاصل کرتی تھی۔

یہ واضح رہنا چاہئے کہ اسلامی معاشرہ میں یورپی جاگیرداروں جیسا نظام نہیں تھا جو دراصل خود کفیل معاشی یونٹس ہوا کرتے تھے اور پیداوار محض اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے کی جاتی تھی۔ لیکن اُموی علاقے دستکاری کی آوازوں سے پُرشور رہتے جو خاصی پیچیدہ تجارتی راہداریوں سے آپس میں مربوط تھے۔ جاگیروں سے ہونے والی آمدنی منجمد نہیں رہتی تھی بلکہ تجارتی اشیاء میں لگادی جاتی اور اس میں اضافہ ہوتا رہتا۔ یہ اشیاء دور دراز علاقوں میں پہنچائی جاتیں اور وہاں سے دوسری تجارتی اشیاء اندرون ملک پہنچتیں۔ فوجی علاقے بڑے تجارتی علاقوں کی شکل اختیار کرنے لگے اور یوں نرم رو ہو کر عوام کے لئے کھُل گئے تھے۔ عالم اسلام زندگی سے بھرپور شہروں سے آباد ہو گیا تھا۔ یہ ایک شہری دنیا تھی۔

امیر معاویہؓ کا جہاں تک تعلق ہے ان کے بارے میں متقی اور پرہیز گار مسلمانوں کی رائے اچھی نہ تھی اور بالخصوص خلفاء راشدین کے مقابلہ میں۔ لیکن ایک سیاستداں اور معاشی منتظم کی حیثیت میں انھوں نے اناڑی ہونے کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ سخت گیری اور شفقت کے امتزاج سے انھوں نے انتشار آمادہ قبائلی سرداروں کا تعاون حاصل کرلیا تھا اور یہ زیادہ تر ترغیب دلا کر اور دلنشینی سے ہوا تھا۔ فوج اور پولیس کی طاقت کا استعمال باغیوں کے خلاف یا قانون کے نفاذ کے لئے ہوتا تھا۔ اس سے نہ صرف انھیں فائدہ ہوا بلکہ مہذب زندگی کا راستہ بھی ہموار ہو گیا۔

سخت گیری اور مشفق مزاجی کے امتزاج کا نمونہ دیکھنا ہو تو اس تنبیہ میں دیکھیں جو معاویہ کے منہ بولے بھائی زید نے بصرہ کے گورنر کی حیثیت سے اپنے شہریوں کی تھی۔ ''تم رشتوں کو دین پر ترجیح دیتے ہوا پنے باغیوں کو معاف کر دیتے ہو اور انھیں چھپاتے ہو اور خود تمہاری حفاظت کے لئے جاری کئے جانے والے احکام کو جنھیں اسلام محترم ٹھہراتا ہے تم تار تار کر دیتے ہو۔ دھیان رکھو کہ رات میں کوئی رینگتا نظر نہ آئے۔ میں ہر اس شخص کو جو رات کا اندھیرا اترنے کے بعد سڑکوں پر نظر آئیگا قتل کر دونگا۔ خیال رہے کہ رشتہ داری کی بنیاد پر کوئی اپیل نہیں کی جائیگی اور میں ہر اس زبان کو کاٹ کر پھینک دونگا جو ایسا کرے گی۔ میں خدا کی عطا کردہ طاقت اور اختیار سے تم پر حکمراں ہوں اور اسی کی دی ہوئی دولت سے تمہاری ضروریات پوری کرتا ہوں۔ فرمانبرداری تمہاری ذمہ داری ہے اور یہ کہ میں راست باز اور ایماندار رہوں یہ تمہارا حق ہے۔۔۔۔۔۔ میں تین باتوں میں ناکام نہیں ہونگا۔ جو شخص مجھ سے ملنا چاہے گا میں اس کے لئے ہر وقت موجود رہونگا۔ تمہارے وظائف میں وقت کی پوری پابندی سے ادا کر دونگا اور تمہیں بہت دور دراز علاقوں میں اور بہت طویل عرصہ کے لئے باہر نہیں بھیجونگا۔ تمہارے دلوں میں جو میرے لئے نفرت اور غصہ بھرا ہوا ہے اس سے بے قابو نہ ہونا یہ تمہارے لئے نقصان کا باعث ہوگا۔ میں بہت سے سروں کو ملتے دیکھ رہا ہوں۔ ہر شخص یہ خیال رکھے کہ یہ سر اس کے شانہ پر قائم رہے''[۳۲]

بنوامیہ دنیوی اعتبار سے سخت لوگ تھے لیکن انھوں نے دینی اداروں کی آبیاری کی علماء اور مذہبی مفکرین کی

حوصلہ افزائی کی، مسجدیں تعمیر کیں اور ایسے قوانین جاری کیئے جن کے نتیجہ میں اسلامی طرز حیات کو عروج حاصل ہوا۔

اموی دور کے عالم اسلام میں محض عربی روح سے متاثر ہو کر قوت نمو ہی سرایت نہیں ہوئی بلکہ اسلامی معاشرت کا نفوذ بھی ہوا۔ نو دولتیوں نے وقف کے مذہبی اداروں کو کثرت سے گرانقدر کثیر عطیات دیئے۔ ظاہر ہے کہ معاشرہ کے دباؤ نے بھی انھیں اس عمل کی طرف ابھارا ہوگا لیکن اس طرح کے اخراجات پر اسلام نے جو وعدے کیئے ہیں وہ بھی کارفرما رہے ہونگے۔ ہر شخص کو اپنا اور اپنی سوسائیٹی کا اکرام عزیز ہوتا ہے اور کوئی بھی دولتمند شخص اوقاف کی سرپرستی کے ذریعہ معاشرہ میں باعزت اور محترم تسلیم کیا جاسکتا تھا۔

اصولاً ایک بار کوئی وقف قائم ہو جائے تو واقف بھی اسے ختم نہیں کرسکتا کیونکہ ایک بار پیدا ہو جانے پر یہ خود ہی اپنی ملکیت تھا اور خود مختار وجود کا حامل تھا۔ آج کے دور میں خیراتی مقاصد کے لئے جو غیر منافع بخش کارپوریشنز قائم کی جاتی ہیں وقف کا ادارہ اسی کا مسلم نمونہ تھا۔ مسلم قانون کے تحت وقف پر کوئی ٹیکس نہیں لگتا۔ لوگوں سے رقومات اکٹھی کی جاتیں اور ضرورتمندوں میں تقسیم کردی جاتیں، مساجد کی تعمیر اور ان کی نگہداشت پر بھی یہ رقم خرچ ہوتی۔ مدارس، یتیم خانے اور اسپتال بھی اسی طرح چلتے۔ ابھرتی ہوئی اشرافیہ کے مذہبی اور خیراتی جذبوں کے اظہار کا یہ ایک ذریعہ بھی تھے۔ اور دولت کی ریل پیل ہوتے ہوتے صحتمند اور مطمئن زندگی گذارنے کا ذریعہ بھی۔

لیکن وقف کے انتظام کے لئے کوئی ذمہ دار ضروری تھا جو اس کو سرگرم رکھتا، اس کی پالیسی طے کرتا اور سرمایہ کا انتظام کرتا۔ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری کسی بھی شخص کو نہیں دی جاسکتی تھی۔ مذہبی طور پر معتبر ہونے کے لئے وقف کے کارکنوں کا متقی اور پرہیزگار ہونا اور مذہبی امور سے واقف ہونا ضروری تھا۔ کارکنان جتنے مذہبی اعتبار سے معروف ہوتے اتنا ہی باوقار وہ وقف ہو جاتا تھا اور اس وقف کے قائم کرنے والوں کی عزت اور وقار میں اتنا ہی اضافہ ہو جاتا تھا۔

کیونکہ اوقاف کے تحت زمینی جائیدادیں، عمارتیں اور وقف کیا ہوا سرمایہ ہوتا تھا اس لئے اس کا انتظام مسلم معاشرہ میں نقل و حرکت کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا۔ (البتہ ایسا بھی ہوا کہ محض ٹیکس سے بچنے کے لئے بہت سے امراء نے وقف کو استعمال کیا)۔ کوئی اگر مذہبی علوم میں مصروف ہو جائے تو اس کا قوی امکان تھا کہ اسے کسی وقف میں اچھی پوزیشن مل جائے گی۔ جس سے اگر دولت نہیں تو معاشرہ میں اعلیٰ مقام ضرور مل جاتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ مذہبی علوم کے ماہر ہونے کے لئے کسی اعلیٰ خاندان کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ محض عقل، تقویٰ و سخت مطالعہ کے لئے پختہ ارادہ کافی تھا۔

دوسری طرف عربی زبان کا جاننا ضروری تھا کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک قرآن کریم کے عربی زبان میں ہونے کی بنا پر یہ ایک مقدس زبان بن گئی تھی۔ قرآن چاہے وہ لکھا ہوا ہو یا زبانی اس دنیا میں یہ تاثر دیتا تھا کہ ہم خدا کے سامنے ہیں۔ جبکہ قرآن کے ترجموں کی یہ حیثیت نہیں۔ تمام تصنیفات عربی زبان میں تھیں اور پھر یہ بھی کہ مسلمان ہونا ضروری تھا۔ مزید یہ کہ بنو امیہ نے بہت جلد عربی زبان کو سرکاری دفاتر کی زبان کا درجہ بھی دیدیا جبکہ اس سے قبل مشرقی علاقوں میں فارسی مغرب میں یونانی بقیہ دوسرے علاقوں میں علاقائی زبانیں مستعمل

تھیں۔ چنانچہ اُموی دور میں پوری سلطنت کے عربیانے اوراسلامیانے کا عمل کارفرما نظر آتا ہے۔

جب اسلامیانا کہا جاتا ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ کے زیرِ حکمرانی علاقوں میں آباد عوام اپنے پرانے مذہب کو تیزی سے چھوڑ رہے تھے۔ زرتشتی، عیسائی، لامذہبیت کے حامل یا اور دوسرے اسلام قبول کررہے تھے۔ کچھ لوگوں نے یقیناً جزیہ سے بچنے کے لئے اسلام قبول کیا ہوگا لیکن تمام واقعات کوایسا کہنا صحیح نہیں کیونکہ مسلمان ہونے کے بعد ہر ایک کوزکوٰۃ ادا کرنا لازمی تھی جبکہ غیر مسلم اس سے مستثنیٰ تھے۔

ممکن ہے کہ کچھ لوگوں نے اپنے کیریر کی خاطر ایسا کیا ہو لیکن یہ بھی مبالغہ ہوسکتا ہے کیونکہ قبول اسلام کے نتیجہ میں مذہب سے وابستہ کیریر کے امکانات وسیع ہوسکتے تھے۔ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہتے ہوئے زمین کی ملکیت، صنعتی کارخانے، اشیاء کی فروخت اور تجارت کے امکانات وغیرہ سب کھلے ہوئے تھے۔ خود حکومت کے آفسوں میں بھی انھیں کام کے مواقع میسّر تھے۔ بشرطیکہ وہ مناسب صلاحیتیں رکھتے ہوں۔ مسلم اشرافیہ ان لوگوں کی صلاحیتوں کے اعتبار سے ان غیر مسلموں کوملازمت دینے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ اگر علم الادویہ سے واقفیت ہے تو ایک طبیب کی حیثیت سے آپکی جگہ موجود تھی۔ اگر تعمیر کے فن میں واقف ہوں تو معمار کی ملازمت موجود تھی۔ اسلامی سلطنت میں رہتے ہوئے چاہے کوئی عیسائی یا یہودی ہو، یعنی ابراھیمی سلسلے سے متعلق ہو یا اسلام سے خاصا دور زرتشتی مذہب سے متعلق ہو، مال اور شہرت کے حصول میں کوئی بھی چیز رکاوٹ نہ تھی۔

لیکن جہاں جہاں مسلمانوں کی حکومتیں رہیں اکثر لوگوں نے اسلام اس لئے قبول کیا کہ اس میں انھیں سچائی نظر آئی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس وقت کے عالم وسطیٰ میں کسی بھی طاقت یا تحریک کے پاس نہ تو وہ شہہ زوری تھی اور نہ ہی خود اعتمادی اور نہ ہی اسلام کی بے مہر کامیابی کا پراسرار تاثر اور مقناطیسیت تھی۔ اس صورتحال میں کون ایسا ہوگا جو چاہے کہ امت کا جز نہ بنے۔

اور یہ ذرا بھی مشکل نہ تھا۔ ایک شخص کومحض لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ یعنی اللہ کے سوا کوئی بھی لائق پرستش نہیں اور محمد اس کے رسول ہیں، کہنا تھا۔ محض اتنا کہہ کر کوئی بھی شخص اس فتح مند کلب کی رکنیت حاصل کرسکتا تھا۔

لیکن یہ بظاہر سادہ سی ادائیگی اپنے اندر سب کچھ لئے ہوئے تھی۔

'کوئی الٰہ نہیں مگر اللہ' الفاظ کے اس مجموعہ پر لاتعداد ہزاروں جلدوں پر مشتمل تشریح لکھی جاچکی ہے۔ لیکن ابھی تک کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کے حتمی معنی کیا ہیں۔

اور اس پر مزید کہ محمد اللہ کے رسول ہیں جو اس بات کا اعلانیہ ہے کہ محمدؐ نے رسول کی حیثیت سے جو کچھ حکم دیا وہ منظور ہے۔ روزانہ پانچ وقت کی نمازیں، سور کے گوشت کو حرام سمجھنا، ماہ رمضان کے روزے، مہذب اور سنجیدگی اور بہت کچھ۔۔۔ بہت کچھ۔ یہ سب ہم نے تسلیم کیا ہے۔

باب : ٦

عہد عباسی

(۱۲۰تا۳۵۰ھ، ۷۳۷تا۹۶۱ء)

متعدد نسلوں تک یزید کے جانشین حکمراں رہے۔ ان کے دور میں عالم اسلام بندھا ہوا رہا۔ مغرب میں اسپین تک اور مشرق میں ہندوستان عالم اسلام کا حصہ بنے۔ اسی دور میں اسلامی عقائد کی تشریح ہوئی اور مجموعہ قوانین تحریری شکل میں محفوظ کیا گیا۔ مذہبی علماء کی کثیر تعداد نے ان سے اکتساب فیض کیا اور آج جس طرح امریکہ میں دستور کی بنیاد پر قانون ساز قوانین بناتے ہیں اسی طرح اس دور کے علماء سیاستداں، عدلیہ کے انتظامی افسران کے ساتھ ملکر ایک اسلامی معاشرہ کی تعمیر میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے۔

مغربی مورخین بالعموم اس طریقہ کی تعریف کرتے ہیں۔ بنوامیہ کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مہذب دنیا کو ایک مہتم بالشان صفت یعنی استحکام عطا کیا۔ جس نے انسانوں کی اگلی نسل کو منصوبہ بندی کرنے کی ترغیب دی، تاجروں کو بڑے بڑے منصوبوں میں طویل مدتی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی۔ طلبہ مطالعہ کے طویل پروگراموں میں شرکت کرنے لگے کیونکہ انھیں یہ معلوم تھا کہ فارغ ہونے کے بعد ان کا حاصل کردہ علم سود مند ہوگا۔ اس استحکام ہی کی بدولت علم کے جویا اس قابل ہو سکے کہ مطالعہ اور تحقیق میں ڈوب جائیں اور کائنات کی گہری کھوج کے ذریعہ اس کے رازوں کو افشاں کریں۔ اور انھیں اس کا ڈر نہ رہے کہ اس دوران ان کے اہل خانہ پر کوئی ٹھگ حملہ آور ہو جائے گا اور انھیں موت کی نیند سلا دے گا۔

لیکن یہ جو سب کچھ حاصل ہوا اس کی ایک قیمت ادا کرنی پڑی تھی جو استحکام کی ایک مجموعی قیمت ہوتی ہے اور جس کے نتیجہ میں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ کل آج سے بہتر ہوگا۔ جس کے نتیجہ میں 'امیر' امیر تر ہوئے غریبوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ شاندار اور خوبصورت عمارتوں سے مزین شہر وجود میں آئے لیکن ان کے ساتھ ساتھ غریب آبادیاں بھی بڑھیں۔ عدل ایک قیمتی شئے ہوگئی جسے صرف امیر ہی خرید سکتے تھے۔

اب ایک سلسلہ اور کھڑا ہوا۔ نئے نئے علاقے جب تیزی سے اسلامی مملکت میں شامل ہوئے تو ان کے ساتھ مختلف نسلیں اور برادریاں مسلمانوں کے زیر سایہ آگئیں اور یہ سوال کھڑا ہوا کہ اس صورتحال میں ان سب کے لئے مسلمانوں کا تصور مساوات اور بھائی چارگی کس طرح زیر عمل رہے۔

بنوامیہ نے اسلامیانے اور عربیانے کی پالیسی کو ضرور فروغ دیا تھا لیکن ہر علاقہ میں مساوات کے ساتھ اس کے انطباق کا انتظام نہ ہو سکا۔ شمالی افریقی علاقوں میں عربیانے کا عمل بڑی تیزی سے آگے بڑھا اس

کی ایک وجہ شاید یہ رہی ہوگی کہ اس علاقہ کی مقامی ثقافت خود فونیشیائی نو آبادیاتی اثرات کے نتیجہ میں انتشار کا شکار ہو چلی تھی، رومیوں نے اس پر ایک لاطینی تہہ چڑھا دی تھی۔ ونڈال (Vandal) وحشی اپنے ساتھ جرمن چمک دمک لائے تھے اور بالآخر عیسائیت نے یہاں کی ثقافت میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ شمالی افریقہ کی اپنی کوئی واحد زبان یا ثقافت نہیں تھی جو اسے متحد رکھ سکتی۔ چنانچہ جب عرب اپنے ایک انتہائی مخصوص اور گہرے یقین اور اعتماد کے ہمراہ اس علاقے میں وارد ہوئے تو ان کے مقابلہ کے لئے کوئی مقامی سلسلہ وحدت تھا ہی نہیں۔ جس کے نتیجہ میں یہ پورا علاقہ مکمل طور پر عربوں میں ضم ہوگیا اور جو کچھ بھی تھا اسے اپنے میں جذب کرلیا۔

مصر اور عراقی علاقے بھی خاصی آسانی سے جذب ہو گئے کیونکہ ان اقوام کی کثیر تعداد اور عرب بہت حد تک مشترک بیانیہ کے حامل تھے۔ مثلاً ابراھیمؑ، نوحؑ، آدمؑ، ان سب کے اجداد میں شمار ہوتے تھے۔ زیادہ تر لوگ عقیدہ توحید کو پہلے ہی سے تسلیم کیے ہوئے تھے۔ اسی طرح عبرانی، آرامانی زبانیں، عربی کی طرح سامی زبانیں تھیں۔

لیکن فارس کے علاقے کا معاملہ مختلف تھا۔ اہل فارس سامی النسل نہیں بلکہ ہندی یورپی نسل تھے۔ جن کی قدیم تہذیب، قابل فخر تاریخ اور زبان مغلوب ہونے کو تیار نہ تھی۔ اہل فارس کے بہت سے لوگوں نے اسلام تو قبول کیا لیکن وہ عرب نہ بن سکے۔ جنھوں نے اسلام قبول کرلیا وہ معاشرہ کے لئے بہت سے مذہبی تضادات کا چیلنج ساتھ لائے۔ اسلام کا تو دعویٰ یہ تھا کہ امت میں سب برابر ہیں۔ امت میں شامل ہونے کا مطلب ایک بھائی چارے میں شمولیت تھی جس میں سب برابر اور مساویانہ حقوق کے مالک تھے۔ اس نئے مذہب کا ایسا ہی دعویٰ تھا اور اس بنا پر یہ ایک زبردست تحریک بن گیا تھا۔ لیکن عربوں کی اکثریت پر مشتمل اموی دور کی مسلم سوسائٹی اسلام کے اس دعویٰ اور وعدے کو نبھا نہ سکی۔ عرب اب حکمراں تھے اور اشرافیہ میں ان کا شمار تھا۔ سب کو مساوی مقام دینا تو بڑی بات ہے اُموی معاشرہ میں ایسے اداروں اور روایات کی افزائش ہوئی جو عام لوگوں میں پائے جانے والے مختلف امتیازات کو طبقات میں منقسم رکھتی۔ مثلاً خالص عربی خون والے ممتاز ترین تھے۔ ان کے نیچے وہ مسلمان تھے جن کے والدین میں ایک عرب اور دوسرا غیر عرب تھا۔ پھر وہ غیر عرب مسلمان آتے تھے جن کے والدین غیر مسلم تھے۔ پھر وہ غیر مسلمین تھے جو کسی ایک توحیدی عقیدے کے سلسلہ سے وابستہ تھے۔ اور یہ سلسلہ پست ترین طبقہ تک جاتا تھا جن میں وہ مشرکین شامل تھے جن کے والدین مشرک تھے۔ بظاہر ان کے کچھ بھی حقوق نہ تھے۔

ان طبقوں کی کشاکش اور بالخصوص عرب نو دولتیوں پر مشتمل اشرافیہ اور فارس سے آئے ہوئے سابق اشرافیہ کے درمیان شکایتوں کے نتیجہ میں زیریں سطح رنجشیں عالم اسلام کے اس حصہ میں در آئیں۔

عالم اسلام کے شعور پر ایک اور سایہ لرزاں رہا۔ مسلمانوں کی تاریخ کو تقدس کا رنگ دینے والے اس کے معماروں نے ایسی متعدد مثالیں قائم کر رکھی تھیں جو سادگی اور جفاکشی میں اپنی مثال آپ تھیں۔ اور یہ تاریخ ان موجودہ حکمرانوں کے لئے ایک مسئلہ تھی۔ ان کی سادگی اور حلم نے انھیں دینی شخصیتوں کے اعلیٰ مقام پر فائز کر رکھا تھا۔ اسی بنا پر معاشرے کے عوامی طبقہ میں یہ تاثر قائم ہوتا گیا کہ شان وشوکت کے موجودہ اظہار میں کہیں

کچھ خرابی ضرور ہے۔ یہ دولت منداور تفریحات کو چاہنے والی وہ سوسائٹی تو نہیں ہوسکتی جس کی تشکیل کے لئے اللہ نے محمد رسول اللہ کو بھیجا کہ وہ خدائے واحد کی عبادت کریں اور عدل پر قائم رہیں۔ رؤساکے ذہن کو شاید ہی کبھی یہ معیار پریشان کرتا ہو۔ البتہ غرباء کے لئے یہ خاصی پریشانی کا باعث تھا۔ جب وہ دربار خلافت کی شان وشوکت اور عیش وعشرت کی کہانیاں سنتے اور عرب امیرزادوں کو خوشبو میں لپٹے ریشمی ملبوسات پہنے گھوڑوں پر سوار گلیوں سے نکلتے دیکھتے تو یقیناً ان کے ذہنوں میں محمدؐ اوران کے رفقاء کی وہ تصویر بھی نمایاں ہوجاتی ہوگی جس میں وہ ایسے سادہ کمبل اوڑھے ہوتے جو ان کے لئے بستر بھی تھے اور اوڑھنی بھی۔ انھیں عمرؓ یاد آتے ہونگے جو خود اپنے جوتے گانٹھتے اور صاف کرتے اور ان یادوں میں پھر یہ بھی شامل ہوجاتا کہ بنوامیہ نے اقتدار کیسے حاصل کیا تھا اور کس طرح کے حالات پیدا کردیے تھے جن کے نتیجہ میں شیعہ اور خوارج دو مستقل اختلافی تحریکیں پیدا ہوگئی تھیں۔

خوارج تھے تو کم لیکن ان کی تحریک بڑی بنیاد پرستی پر مشتمل تھی۔ ان کے نظریات پاکبازی کے بڑے سخت اور معقولیت سے خاصے متجاوز معیار کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ عالم اسلام کی قیادت کے منصب پر وہی فائض ہوسکتا ہے جو دینی تعلیمات پر انتہائی توجہ سے عامل ہو۔ سیکولر قیادت خوارج کے معیار پر کبھی بھی پوری اتر ہی نہیں سکتی۔ صحیح تر بات یہ ہے کہ کہیں بھی اور کوئی بھی حکمراں ان کے معیار پر پورا نہیں اتر سکتا تھا۔ چنانچہ وہ ہر حال میں اور نتائج سے بے پرواہ ہوکر انقلاب کے خواہاں رہے۔ جب بھی کوئی اقتدار میں ہوگا کوئی نہ کوئی ضرور اپنے آپ کو مظلوم تصور کریگا اور مظلومین کا موجود ہونا بغاوت پر اکسانے کے لئے خوارج کے عقائد کے تحت جواز بن جاتا۔

وقت کے ساتھ خوارج ایک منظم گروہ کی حیثیت سے کمزور ہوتے چلے گئے اس کی بنیادی وجہ ان کی انتہاپسندی تھی جو روز افزوں آسودہ حالی کے درمیان قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ معاشرہ کے پچھڑے ہوئے لوگوں میں بے اطمینانی ضرور رہی ہوگی لیکن خوارج کی بے کیف جدوجہد جوان کی اس بے اطمینانی کا مداوا نہیں کرسکتی تھی انھیں راغب نہ کرسکی۔ البتہ شیعہ وقت کی انتظامیہ کے لئے مسلسل ایک مسئلہ بنے رہے اور کربلا میں حسین کی شہادت کے بعد یہ تحریک زور پکڑتی گئی۔

شیعی اماموں نے براہ راست چیلنج کرنا تو بند کردیا لیکن امامت اور خلافت کے معنی اور مفہوم کو وہ بتدریج ممتاز کرتے گئے اور امامت کے تصور میں دینیاتی رنگ آمیزی سے انھوں نے اپنی مذہبی پوزیشن کو مضبوط اور معتبر بنالیا۔ البتہ شیعہ باغی افراد امام کے نام پر منظم جدوجہد کرتے رہے اور علیؓ کی اولاد میں کسی کو برسر اقتدار لانے کی خواہش انھیں بغاوتوں کے لئے اکساتی رہی۔ وہ مسلسل یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ خلافت پر بنوامیہ کا حق نہیں اور اسلام کے یہ حکمراں قانونی جواز نہیں رکھتے۔

شیعی خطرات میں اضافہ ہونے کی ایک وجہ وہ مخصوص حالات تھے جو اموی دور میں اہل فارس کے اسلام میں داخل ہوجانے کے نتیجہ میں پیدا ہوگئے تھے۔ مثلاً اہل اسلام میں شیعہ ایک دبائے گئے مذہبی گروہ تصور کئے جاتے تھے۔ اسی طرح اہالیان فارس اسلام میں دبائے گئے نسلی اعتبار سے پامال گروہ تھے۔ شیعوں کا

وطیرہ تھا کہ وہ وقت کی غالب مذہبی مقتدرہ پر پھبتیاں کستے تو فارسی مسلمان عرب سیاسی مقتدرہ پر پھبتیاں کستے۔

نتیجہ کے طور پر ان دونوں میں ایک قسم کی یگانگت پیدا ہوگئی۔ فارسی مسلمان شیعی نقطۂ نظر کو اپنانے لگے اور شیعہ احتجاجی اہل فارس سے اپنے نئے کارکنان بھرتی کرنے لگے۔ ان دونوں لہروں کی آمیزش نے باغیانہ جذبات کے اظہار کی حوصلہ افزائی کی جو سلطنت کے مشرقی علاقوں میں زیادہ عام ہونے لگے کیونکہ یہاں اموی پولس اتنی مضبوط اور مستحکم نہ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ عرب مخالف جذبات روز افزوں ہونے لگے۔

۱۲۰ ھجری کے قریب ایک دن دمشق سے کوئی پندرہ سو میل کے فاصلہ پر آباد ایک شہر مرو (Merv) جو سلطنت بنو امیہ کی ایک دور دراز چوکی تھی ایک اجنبی شخص ابھرا اور اس مشرقی آبادی میں امویوں کے خلاف احتجاج کرنا شروع کر دیا اور بظاہر کشفی صفات سے مزیّن ایک مذہبی بیانیہ کی شکل میں بتانے لگا کہ عنقریب حق و باطل میں ایک معرکہ ہونے کو ہے۔

اس شخص کے بارے میں کوئی کچھ نہ جانتا تھا اس کا صحیح نام بھی کسی کو معلوم نہ تھا۔ اسے لوگ ابو مسلم کہنے لگے۔ جو ظاہر ہے کہ مصنوعی نام تھا۔ یہ مسلم ابو مسلم بن مسلم کا مخفف تھا جس کے معنی "مسلمان مرد ایک مسلمان باپ کا بیٹا ایک مسلمان بیٹے کا باپ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے کوشاں تھا کہ لوگ اس کے مسلمان ہونے پر یقین کر لیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ابو مسلم ایک پیشہ ور انقلابی تھا جسے عراق میں قائم ایک خفیہ گروہ نے باقاعدہ طور پر شہر مرو میں متعین کیا تھا۔ عراق میں قائم یہ گروہ ہاشمی کہلاتا تھا جو دراصل ایک عقیدہ اور سیاسی مقاصد کی حامل پارٹی کا مرکب تھا جس کی بنیادی رکنیت غالباً تیس سے زیادہ کبھی نہیں ہوئی۔ یہ نام رسول اللہ کے خاندان بنو ہاشم سے مستعار تھا۔ اور قیاس یہ ہے کہ وہ رسول اللہؐ کے خاندان کو عالم اسلام کا اقتدار سونپنا چاہتے تھے۔ یہ ان چند تند خو باغی گروہوں میں سے ایک تھا جو اس زمانہ میں حکومت سے نالاں تھے اور اس کے خلاف سرگرم تھے۔ بنیادی طور پر سب کا پیغام ایک ہی تھا بس ذرا ذرا مختلف رنگ لئے ہوئے یعنی یہ کہ مسلمان راہ سے ہٹ گئے ہیں، تاریخ اپنے مرکز سے دور ہوگئی ہے، پیغمبر کا مشن تہہ و بالا ہوگیا ہے۔ اور اموی حکومت ختم ہو جائے اور اس کی جگہ رسول اللہؐ کے خاندان کا کوئی فرد حکومت سنبھال لے تو سب مسائل حل ہو جائیں گے اور امت دوبارہ صحیح راہ پر گامزن ہو جائے گی۔ میں یہ بات واضح کرتا چلوں کہ اس بیانیہ کا مسلمانوں کی تاریخ میں وقتاً فوقتاً اور بار بار اختراع ہوتا رہا ہے اور اس کی ایک شکل آج پھر سامنے ہے جس میں بنو امیہ کی جگہ 'مغرب' آ گیا ہے۔

افسوسناک صورتحال یہ تھی کہ بنو ہاشم میں اب کوئی شخص ایسا نہ تھا جو رسول اللہؐ کے خاندان سے ہو اور آپ کے مشن کو آگے بڑھا سکے۔ لیکن ابو العباس ضرور تھا جو اس بات کا مدعی تھا کہ وہ رسول اللہؐ کے ایک چچا عباس بن عبد المطلب کی اولاد سے ہے۔ چنانچہ یہ نہ صرف رسول اللہ سے خونی رشتہ رکھتا بلکہ ہاشمی عزائم کی بار آوری کے لئے بھی تیار تھا۔

رسول اللہؐ کے حقیقی چچا عباس بالکل آخر میں اسلام لائے تھے۔ اور خود ان کے زمانے میں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا تھا کہ وہ رسول اللہؐ کے جانشین ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ عباس کسی انقلابی تحریک کے لئے کوئی

بہت موزوں آبا و اجداد نہ تھے۔ علیؓ اور فاطمہؓ کے راست جانشین یقیناً بہتر متبادل تھے لیکن وہ علیؓ کے حقیقی یا قیاسی جانشین بنو ہاشم کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھے چنانچہ یہ کام ابوالعباس کو کرنا ہی تھا۔ بعض اوقات جنگیں ایسی بے اختیار شخصیتوں کے نام بھی لڑی جاتیں ہیں جنھیں آپ نہ جانتے ہوئے بھی استعمال کرتے ہیں۔

چنانچہ وہ فارسی اور شیعی عناصر جو مرکز سے دور دراز علاقے خراسان، جو ایران کی راہ سے افغانستان تک پھیلا ہوا تھا، کے لوگ جو شر انگیزی پر مائل تھے انھیں اس تحریک میں شامل کرنا ابومسلم کے لئے زیادہ مشکل نہ ہوا۔ اپنی تقریروں میں ابومسلم بہت واضح طور پر یہ کہنے سے بچتا اور کترا تا رہا کہ انقلاب کے بعد خلیفہ کون ہوگا۔ وہ لوگ جو علیؓ کے جانشینوں کے لئے خلافت کے خواہشمند تھے شاید یہ سوچتے تھے کہ محض حفاظتی مسائل کے پیش نظر اس کا نام نہیں لیا جا رہا اور نہ کوئی نہ کوئی موجود ہے جو وقت پر ظاہر ہو جائیگا۔

ابومسلم جس کی شخصیت کرشماتی تھی اور جو بہادر بھی تھا اور تند خو بھی بہت جلد اور بڑی تیزی سے منظر عام پر آیا اور عباسی انقلاب کے سربراہ کی پوزیشن اختیار کرتا گیا۔ خراسان میں اس نے انقلابی لڑاکوں کی کثیر تعداد تیار کی، انھیں تربیت دیکر ہاشمی نقطۂ نظر کا وفادار بنایا۔ یہ اپنی سیاہ پوشاک اور ایک سیاہ جھنڈے سے پہچانے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے ہتھیاروں کو سیاہ رنگ دے دیا تھا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ بنو امیہ کی فوج نے سفید رنگ کو اپنی پہچان قرار دے رکھا تھا۔ ایک ایسے گروہ کے لئے جو اس جدوجہد کو سچ اور جھوٹ کے معرکہ کے طور پر پیش کر رہا تھا۔ سیاہ رنگ کا اختیار کرنا خاصا تعجب خیز ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ اہل فارس سفید رنگ کو ماتمی رنگ یعنی موت کے رنگ میں دیکھتے ہیں اور آج بھی طالبان نے اپنی یونیفارم کے لئے سیاہ رنگ کو ہی استعمال کیا ہے۔

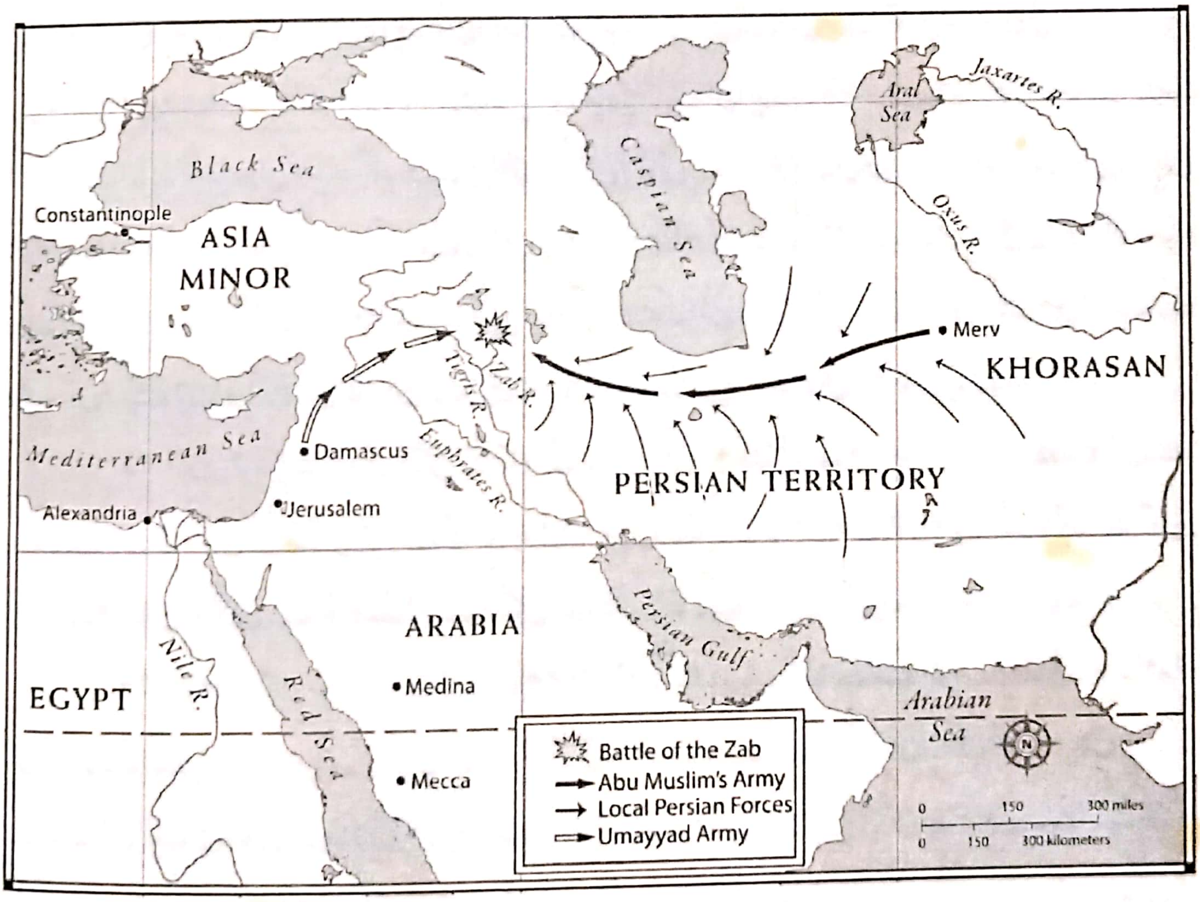
۱۲۵ ہجری (۷۴۷ عیسوی) میں ابومسلم کے یہ سیاہ پوش لڑاکے مغرب کی سمت بڑھنے لگے۔ فارس سے گذرتے ہوئے انھیں کسی خاص مزاحمت کا سامنا نہ ہوا جہاں کے لوگ ظالم اموی حکمرانوں کے خاتمہ کے شدید خواہاں تھے۔ ان علاقوں سے گذرتے ہوئے انھیں رضا کار ملنے لگے اور یوں یہ تحریک اور زور پکڑ گئی۔

۷۵۰ عیسوی میں سیاہ اور سفید فوجوں کا عراق میں عظیم دریائے زاب کے کنارے مقابلہ ہوا۔ تعداد میں کم ہونے کے باوجود سیاہ پوش لڑاکوں نے شاہی فوج کو شکست دے دی اور آخری اموی خلیفہ کو جان بچانے کے لئے محض ایک ہی سال میں جنوبی مصر کی طرف راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ لیکن عباسی جاسوسوں نے اسے پکڑ کر قتل کر دیا۔ بنو ہاشم نے ابوالعباس کو نئے خلیفہ اسلام کی حیثیت میں تسلیم کر لیا۔ البتہ تبدیلی کے اس پورے عمل پر کسی نے سوال نہیں اٹھایا۔ جسے خدا تراشیدہ عمل نہیں کہا جا سکتا تھا۔ نہ ہی یہ انتخاب تھا اور نہ ہی کسی گروہ کے اہل دانش نے ملکر مشورہ سے کوئی فیصلہ کیا تھا۔ بلکہ محض ایک شخص نے اپنے انتہائی منظّم گروہ کے کارکنان کی مدد سے ابوالعباس کو خلافت کی مسند پر بٹھا دیا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا ستم ظریفی تو دیکھئے کہ دعوے کے مطابق امارت جانشینانِ رسولؐ کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی اور توقع تھی کہ مسلمانوں کا معاشرہ پھر راہ یاب ہو سکے گا۔

ابومسلم کی زندگی کا یہ انتہائی دل خوشکن دور تھا۔ اس کی زندگی بھر کی سخت محنت بالآخر ثمر آور ہو چکی تھی۔ اس

نے سوچا ہوگا کہ امویوں کے بے دخل ہو جانے کے بعد معاملات ٹھیک ہو جائیں گے لیکن بہت جلد مایوسیوں نے آ گھیرا۔ کیونکہ کٹھ پتلی بادشاہ اپنے آپ کو اب محض کٹھ پتلی سمجھنے کو تیار نہ تھا۔ جو تحریک ابو العباس کو ابتک بے اختیار بادشاہ سمجھتی آ رہی تھی اور عوام کے سامنے اسے پیش کرتی رہی تھی۔ اب اس تحریک پر اس کی پکڑ بہت مضبوط ہو چکی تھی اور گذشتہ چند سالوں کے دوران ابو العباس نے اس تحریک میں اپنی جگہ مضبوط کر لی تھی۔ ابو مسلم جب اپنی محنت سے اسے زمام اقتدار سونپ چکا تو عباس نے اسے مکمل طور پر بے دخل کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

نئے خلیفہ کو معلوم تھا کہ معاویہ نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے سختی اور نرمی کے امتزاج سے کام لیا تھا اور اپنے مخالفوں کو عنایات اور بخششوں اور دل فریبی کے ذریعہ کُند کیا تھا۔ اسی پالیسی کو دہراتے ہوئے نئے خلیفہ نے بنو امیہ کے رؤسا اور اشرافیہ کو ایک بڑی دعوت میں ایک ساتھ کھانا کھانے کے لئے مدعو کیا تا کہ انھیں اپنے اخلاص کا یقین دلا سکے۔



ابو مسلم اور عباسی انقلاب

لیکن اسے دعوت طعام کہنا صحیح نہیں کیونکہ اس سے ایسا لگتا ہے کہ وہ واقعی اموی سرداروں کے ساتھ بیٹھ کر اسی طرح نان گوشت کھانا چاہتا تھا جیسے کبھی رسول اللہؐ عمرؓ کے ساتھ بیٹھ جاتے تھے۔ اس طرح کی دعوتیں اب ختم سی ہو گئی تھیں۔ اموی سرداروں کو نرم و گداز گدوں پر بٹھایا گیا اور کارکنان خوبصورت برتنوں میں بہترین

اور لذیذ اشیائے طعام لئے انھیں پیش کرنے لگے۔ ہنسی مذاق زوروں پر تھا اور مکالموں میں جوش وخروش نمایاں۔ اور ایک دوستانہ فضا ماحول پر چھا گئی تھی۔ بس سب لوگ کھانا شروع ہی کرنے والے تھے کہ یکا یک کارکنوں نے اپنی عبائیں اتار پھینکیں جن کے لبادے میں وہ کارکناں طعام نہیں بلکہ ہتھیار بند قاتل تھے۔ انھوں نے اموی سرداروں کو اچانک آلیا اور جنھوں نے کچھ کرنے کی کوشش کی انھیں لگا کہ اب تاخیر ہو چکی ہے باہر نکلنے کے تمام دروازے مقفل کئے جا چکے تھے۔ تمام موجود اُموی سردار قتل کر دیئے گئے۔ ابوالعباس اس واقعہ کے بعد السفّاح کے لقب سے موسوم کیا جانے لگا۔ جس کے معنی ہیں ذبح کرنے والا اور اس لقب میں شاید اُسے تسکین بھی ملتی تھی کہ اس نے جو کچھ کیا تھا وہ شاید باعث فخر تھا۔

لیکن اس حرکت سے وہ کچھ فائدہ نہ حاصل کر سکا۔ جلد ہی وہ چیچک میں مبتلا ہو کر موت کا شکار ہوا اور اس کے بھائی منصور نے تخت سنبھالا۔ منصور کو تھوڑی سی مخالفتوں کا سامنا ضرور ہوا لیکن ابو مسلم نے اپنی فوج کی مدد سے اس کے اقتدار کو سنبھال لیا۔ جس کے بعد وہ خراسان واپس چلا گیا۔ ابو مسلم عسکری طاقت رکھنے کے باوجود خلافت کا کبھی دعویدار نہ ہوا۔ شاید اس نے عباسی خلافت کو خداداد تسلیم کر لیا تھا۔ خاصی اصول پسند شخصیت تھی ابو مسلم کی۔

لیکن ابو مسلم میں کوئی بات ایسی ضرور تھی جو منصور کو گوارا نہ تھی اور شاید یہ خاص بات ابو مسلم کی عوامی مقبولیت تھی۔ دو باتیں تھیں ایک تو اس کی عوامی پوزیشن اور دوسری ایک منظّم فوج۔ کوئی حکمراں ایسے مقبول آدمی کو برداشت نہیں کر سکتا جس کی اپنی فوج بھی ہو۔ ایک دن منصور نے ابو مسلم کو اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے عوام نے ایک نتیجہ نکالا کہ جو کوئی عباسی حکمراں رات کے کھانے کی دعوت دے تو اس رات ضرور کوئی مصروفیت نکال لینی چاہیے۔ دونوں لوگ اسی رات دریا کے کنارے ایک مقام پر فروکش ہوئے، منصور نے ابو مسلم کی بے غرض مدد اور تعاون کی دل کھول کر تعریف کی اور شکریہ ادا کیا لیکن دوسری رات ابو مسلم کے ایک محافظ ہی کے ذریعہ اس کا گلہ کٹوا دیا اور بے جان جسم کو دریا کے حوالہ کر دیا۔

اور یوں مسلم خلافت میں دوسرے سلسلہ نسب کا آغاز ہوا۔ عباسیوں کے پروپیگنڈہ ماہرین اس تبدیلی کی معنویت اور اہمیت کو بنیاد بنا کر ایک بیانیہ تشکیل کرنے لگے۔ انھوں نے اسے امت کے لئے ایک انقلابی رخ قرار دیا اور کہا کہ اب ہر چیز بدل دی جائیگی۔ لیکن اس کے برعکس ہر چیز بہت بڑی حد تک ویسی ہی رہی جیسی تھی۔ البتہ بعض بہتر کاموں میں اگر مزید بہتری آئی تو خرابیوں میں بھی اضافہ ہوا۔

بنوامیہ شان وشوکت اور عیش وعشرت میں رنگے ہوئے تھے لیکن بنوعباس نے جب اقتدار سنبھالا تو انھوں نے بنوامیہ کو اس میدان میں بونا ثابت کر دیا۔ وہ اکھڑ مزاجی اور سادگی کے مرقع نظر آنے لگے۔ بنوامیہ کے دور میں مسلم سلطنت میں خوشحالی اور آسودہ حالی کی فراوانی تھی جبکہ بنوعباس کے دور میں اس میں زبردست اضافہ ہوا۔ بنوامیہ کی طرح بنوعباس سیکولر حکمراں تھے جو جاسوسوں، پولیس کی قوت اور پیشہ ور فوج کی مدد سے

اپنے اقتدار اور دبدبہ کو قائم رکھتے تھے۔

بنوعباس کے اقتدار میں آنے میں کیونکہ شیعہ فرقے کی بے اطمینانی کو بڑا دخل تھا تو یہ خاصا قرین از قیاس تھا کہ بنوامیہ کے مقابلے میں بنوعباس کے ساتھ ان کا رویہ مختلف رہے گا۔ لیکن یہ قیاس قطعاً غلط ثابت ہوا۔ عباسیوں نے بہت جلد پہلے سے موجود طرز کو اپنا لیا اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ قدیم اسلامی منتظمہ یعنی تمام بڑے بڑے علماء اور مفکرین خاصے مستحکم ہو چکے تھے اور معاشرہ پر ان کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔ انھیں کے نقطۂ نظر کو اپنا لینا سیاسی اعتبار سے ایک زیادہ بہتر اور عاقلانہ فیصلہ تھا۔ عباسیوں ہی کے دور میں مروجہ اسلامی رجحان کو سنی کا لقب دیا گیا کیونکہ اسی دور میں اس گروہ کی ممتاز حیثیت واضح ہوئی۔

عباسی انقلاب کے ابتدائی دنوں میں سادہ لوح شیعہ یہ سوچتے تھے کہ سفاح اور اس کے خاندان کے لوگ بہت جلد کسی شیعہ امام کو تخت پر بٹھا دینگے اور یوں ہاشمی پروپیگنڈے میں جس امنِ موعود کی پیش گوئی کی تھی کہ اس کی ابتداء ہو جائیگی۔ اس کے برخلاف اولادِ علیؓ کی تلاش میں مزید سرگرمی آ گئی۔ بلکہ ایک خانگی خادم کے بقول جب اس خاندان کے تیسرے خلیفہ کا انتقال ہوا تو اس کے جانشین کو محل میں ایک ایسے خفیہ کمرہ کا علم ہوا جو ایک تہہ خانہ میں کھلتا تھا جس میں اولادِ علیؓ کے جن افراد کو گرفتار کیا گیا تھا اور قتل کر دیا گیا تھا ان کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ فاطمہؓ کی اولاد ہوں کیونکہ ان کے انتقال کے بعد علیؓ نے اور کئی شادیاں کی تھیں۔

اس کے باوجود بنوامیہ کے دوسرے تمام بہتر پہلوؤں کو بنوعباس نے بہترین کرنے کی بھی کوشش کی۔ بنوامیہ کے دور نے خوشحالی، آرٹ، فکر و خیال، ثقافت اور تہذیب کی بہترین یادگاریں چھوڑی تھیں۔ عباس کے دور میں تیز رفتاری سے یہ اپنے عروج کو پہنچیں۔ جس کے نتیجہ میں ان کے دور کی پہلی دو صدیاں مغربی اور بعض مورخین کے نزدیک اسلام کا سنہرا دور کہلانے کی مستحق تھیں۔

مثلاً منصور نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی حکومت کے لئے ایک نئے پایہ تخت کی بنیاد ڈالی جسے بغداد کا نام دیا گیا۔ اس کی تعمیر ۱۴۳ ہجری (۷۶۵ عیسوی) میں مکمل ہوئی۔ یہ شہر آج تک باقی ہے گو کہ گذری ہوئی صدیوں میں کئی بار تباہ ہوا اور تعمیر کیا گیا۔ اور آج بھی یہ تباہی کے مرحلہ سے گذر رہا ہے۔

منصور نے کئی سال اپنی سلطنت کے مختلف علاقوں کا دورہ کرنے میں گذارے تب اس مقام کو پایہ تخت کی تعمیر کے لئے منتخب کیا۔ یہ دریائے فرات اور دجلہ کے درمیان اس علاقے میں واقع ہے جہاں یہ دونوں دریا اتنے قریب آ جاتے ہیں کہ ایک دریا کے کنارے سے شروع ہو کر دوسری دریا کے کنارے تک شہر پھیل گیا ہے۔ اس جگہ کے ٹھیک درمیان میں منصور نے ایک دائرہ نما دیوار تعمیر کی جس کا محیط ایک میل، ۸۹ فیٹ بلند اور بنیادیں ۱۴۵ فٹ چوڑی تھیں۔ عظیم ٹیلہ کی مانند یہ شہر دراصل ایک مجموعۂ محل تھا جو دنیا کی عظیم ترین سلطنت کا نیا اعصابی مرکز بن رہا تھا۔

اس گول شہر کی تعمیر میں کوئی پانچ سال لگے۔ کوئی ایک لاکھ نقشہ نویس، فنکار اور مزدوروں نے اس کی

تعمیر میں حصہ لیا۔ جن کے رہنے کے لئے زیر تعمیر شہر کے چاروں طرف گھر بنائے گئے تھے اور اس طرح اس شاندار اصل اور مرکزی شہر کو ایک دوسرے ذرا غیر منظّم دائرے نے گھیر لیا تھا جنکی روزمرہ کی ضروریات کی فراہمی کے لئے دکانیں بھی تھیں۔ مختلف خدمات کا انتظام بھی تھا جن کے کارکنان کی آبادی اس غیر منظّم دائرہ کو گھیرے ہوئے تھی جو اصل اور مکمل طور پر دائرہ نما شہر کو گھیرتی تھی۔

محض بیس سال کے عرصہ میں بغداد دنیا کا سب سے بڑا اور شاید ابتک کا سب سے بڑا شہر بن گیا۔ یہ پہلا شہر تھا جس کی آبادی ۱۰ لاکھ سے زیادہ تھی[۲]۔ اب یہ دریاؤں سے باہر وسعت اختیار کر چکا تھا بلکہ دجلہ اور فرات اس شہر کے درمیان سے گذرتی تھیں۔ ان دریاؤں کے پانی کو نہروں کے ایک جال نے مختلف علاقوں تک پہنچا دیا تھا جن میں آج کی سٹی بسوں کی مانند کشتیاں یہ خدمت انجام دیتی تھیں۔ جیسا کہ آج وینس میں ہوتا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ اس زمانے میں عوام نہروں پر بنے پلوں کو پیدل یا گھوڑوں پر سوار ہو کر پار کرتے تھے۔

بغداد دنیا کا مصروف ترین اہم شہر ہونے کے ساتھ ساتھ اس وقت کا سب سے بڑا شہر بھی رہا ہوگا۔ دو عظیم دریاؤں کے بحر ہند میں گرنے کے نتیجہ میں اس شہر کو زبردست بندرگاہ کی سہولیات حاصل ہو گئیں تھیں اور کیونکہ یہاں خشکی کے متعدد راستے بھی آکر ملتے تھے اس لئے بحری جہازوں کے علاوہ بہت سے کارواں بھی آتے رہتے تھے۔ مختلف اشیاء لئے ہوئے دنیا کے دور دراز علاقوں کے تاجر بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ بالخصوص چین، ہندوستان، افریقہ اور اسپین وغیرہ۔

تجارتی نظم وضبط ریاست کی ذمہ داری تھی۔ ہر تاجر قوم نے اپنے اپنے تجارتی علاقے قائم کر رکھے تھے۔ ہر طرح کی تجارت کرنے والوں کو یہ سہولت حاصل تھی۔ ایک سڑک پر کپڑوں کی دکانیں تھیں تو دوسری پر صابن فروخت کرنے والے اپنی تجارت کرتے۔ ایک دوسری سڑک پر پھولوں کے تاجر تو دوسری طرف پھل فروش۔ سامان کتابت فروخت کرنے والوں کی سڑک پر خاص دکانیں وہ تھیں جہاں کاغذ فروخت ہوتا تھا۔ کاغذ ابھی حال ہی کی ایجاد تھی جو چینیوں سے حاصل کی گئی تھی۔ عباسیوں نے ۷۵۱ عیسوی میں آج کے قزاقستان میں چینیوں کو شکست دی تو اسی وقت سے ان سے تعلقات کی راہیں کھُل گئیں۔ سُنار، ٹین کار اور قلعی گر، لوہار، زرہ ساز اور آلات حرب بنانے والے، اصطبلوں، صرّاف، پیال اور بھوسہ کا کاروبار کرنے والے، پل کی تعمیرات کے ماہرین، موچی، وغیرہ کو عظیم بغداد میں ان کے لئے مخصوص علاقوں میں اپنی اشیاء فروخت کرتے ہوئے دیکھا جاسکتا تھا۔ جو لوگ کھلی چھت کی دکانوں میں اپنی اشیاء فروخت کرتے یا متفرق اشیاء کی تجارت کرتے ان کے لئے الگ علاقے مخصوص تھے۔ ہم عصر عرب جغرافیہ داں یعقوبی دعویٰ کرتا ہے کہ اس شہر میں چھ ہزار سڑکیں اور گلیاں تھیں۔ تیس ہزار مساجد اور دس ہزار حمام پائے جاتے تھے۔

الف لیلیٰ میں جن حسین ٹائلوں، کلس، برجوں اور مینار چوں کے تذکرہ سے کہانی کو دل فریب کیا گیا ہے ان کا تعلق اسی شہر بغداد سے تھا۔ اور یہ لوک کتھائیں جو ادبیات کا ایک اہم جز بن گئیں اسی عباسی دور میں ضبط

تحریر میں آئی تھیں۔الٰہ دین اوراس کا چراغ جوان کہانیوں کا مرکزی کردار ہے دراصل چوتھے عباسی خلیفہ ہارون رشید کی شان وشوکت اور عدل گستری کے پس منظر ہی میں ابھرتا ہے۔اس خلیفہ کے متعلق جو روایتیں مشہور ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہارون رشید ایک انتہائی رحمدل بادشاہ تھا جسے عوام کی بہتری ہمیشہ دامنگیر رہتی تھی اور وہ اکثر بھیس بدل کران میں مل جاتا تا کہ ان کے مسائل کا بچشم خود اندازہ کر سکے اوران کی تکلیفوں کو دور کرنے کے لئے مناسب اقدامات کر سکے۔البتہ میرا گمان ہے کہ خلیفہ نہیں بلکہ اس کے جاسوس یہ کام کرتے تھے۔ فقیروں کا بھیس بدل کروہ عوام میں جاتے جنکا اصل مقصد عوام کی تکالیف جاننے سے زیادہ ان میں پنپنے والی ممکنہ شورشوں سے خلیفہ کو باخبر رکھنا تھا۔

اُموی دور میں خلیفہ کی عوام سے کنارہ کشی نے اسے جو ایک قیاسی وجود کی شکل دے دی تھی عباسیوں کے دور میں اس میں اوراضافہ ہوا۔خلیفہ کو دیکھنے کا موقع امراء ورؤسا اور معاشرہ کے اہم افراد کو بھی کم ہی ملتا تھا۔ اس کے سامنے کوئی مسئلہ پیش کرنا تو بڑی بات ہے عباسی خلیفہ دلالوں اور ایجنٹس کے ذریعہ حکومت کرتے تھے اور روزمرہ کے زمینی حقائق سے اپنے آپ کو جدا رکھتے تھے۔انھوں نے بازنطینی اور ساسانی درباری رسومات اور روایات کو بڑی دیدہ ریزی سے اپنالیا تھا۔درست کہ اسلام نے ساسانی اور بازنطینی سلطنت کے علاقوں کو فتح کر لیا لیکن ان مفتوحہ علاقوں کی بھٹکتی روح اسلام میں سرایت کر گئی تھی۔

باب : ۷

اسکالرز، فلاسفہ اوراہالیان تصوف

(۱۰ تا ۵۰۵ھ ، ۶۳۲ تا ۱۱۱۱ء)

ابھی تک میں نے ان بڑی سیاسی تبدیلیوں کا تذکرہ کیا ہے جو مسلم تہذیب کے عالم وسطیٰ کی تہذیب کا مقام حاصل کرنے کے دوران واقع ہوئیں۔ لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ ان بڑے واقعات کے زیرِ سطح عظیم کہانیاں جنم لے رہی تھیں جن میں عظیم تر وہ تھیں جو عقیدۂ اسلامی کے ارتقاء اور اس معاشرت سے متعلق تھیں جو اس ارتقاء کے نتیجہ میں پیدا ہوئیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مخالف اور متحارب نظریات کا ارتقاء بھی اسی زیرِ سطح تشکیلی عمل میں شامل تھا۔

قبل ازیں یہ مان لینا چنداں مشکل نہیں کہ محمد رسول اللہؐ نے اپنے متبعین کے لئے یہ واضح، مکمل اور تفصیلی ہدایات چھوڑی تھیں کہ وہ اپنی زندگی کیسے گذاریں اور عبادات کے طریقے کیا ہوں؟ یہ ہدایات کتنی مکمل اور مفصل تھیں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ البتہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ خود رسول اللہؐ نے اپنی حیات میں پانچ عمومی ذمہ داریوں کی اہمیت بالکل واضح کر دی تھی۔ یہ وہی پانچ ذمہ داریاں ہیں جنھیں آج اسلام کے پانچ ارکان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

شہادت	:	یہ گواہی دینا کہ خدا واحد ہے اور محمدؐ اس کے پیغمبر ہیں۔
صلوٰۃ یا نماز	:	روزانہ ایک خاص قسم کی پنج وقتہ رسومات کی ادائیگی۔
زکوٰۃ	:	ہر سال اپنی دولت کا مخصوص حصّہ غربا کو دینا۔
صوم	:	طلوع صبح سے غروب آفتاب تک ماہِ رمضان میں ہر سال روزہ رکھنا۔
حج	:	اگر ممکن ہو تو زندگی میں کم از کم ایک بار شہر مکہ میں حج ادا کرنا۔

پروگرام کی سادگی اور اس کی خارجیت ملاحظہ ہو۔ پانچ ارکان میں سے محض ایک کا تعلق انسان کے اندرون یعنی عقیدہ سے ہے اور اس کا اظہار بھی عملی نوعیت یعنی گواہی دینے سے ہے۔ باقی چار ارکان مخصوص عمل ہی کی شکلیں ہیں۔ پھر واضح ہو کہ اسلام محض عقیدہ اور ایمان کا نام نہیں بلکہ اس کا ہر ہر جز عمل سے عبارت ہے۔ عقیدہ ورزش کا کورس کرنے والے کے لئے مخصوص خوراک کی مانند ہے۔ اسلام دراصل ایک ایسی چیز ہے جو کی جاتی ہے۔

رسول اللہؐ کی وفات کے وقت یہ پانچ ارکان مسلمانوں کی زندگی کا ایک مستقل جز بن چکے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی دوسرے رسوم اور طریقے معاشرہ میں جاری تھے۔ جن کے بارے میں یہ امکان تھا کہ مستقبل

میں ان کی ایک سے زائد تشریحات ہوسکیں۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ رسولؐ کی حیات میں تفصیلات متعین کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ سوالات اور مسائل کی وضاحت کرنے کے لئے پیغمبر بذات خود موجود تھے۔ نہ صرف یہ کہ ان سے روز ہی تعلیم حاصل ہوسکتی تھی بلکہ احکامات کسی بھی وقت مل سکتے تھے۔

اور حقیقتاً بھی رسول اللہؐ سے وحی کے ذریعہ ہدایات مسلسل ہی ملتی رہیں جن میں نہ صرف ضروری اصول اور احکامات ہوتے تھے بلکہ نئے مسائل اور خصوصی حالات کے لئے عملی ہدایات بھی ہوتی تھیں۔ پیش قدمی کر رہی کسی فوج کی اطلاع ملتی تو رسول اللہؐ کو اللہ کی طرف سے یہ ہدایات مل جاتی تھیں کہ مسلمانوں کو مقابلہ کے لئے تیار رہنا چاہئے اور یہ بھی کہ یہ مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ جنگ کے خاتمہ پر ہاتھ آنے والے قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ کیا انھیں قتل کر دیا جائے یا غلام بنایا جائے؟ ان کے ساتھ اہلِ خانہ جیسا سلوک کیا جائے یا آزاد کر دیا جائے؟ اس طرح کے مواقع پر ربّانی ہدایات آتیں اور رسول باقی لوگوں کو ان سے باخبر کر دیتے۔

سب جانتے ہیں کہ نماز کی ادائیگی کے دوران مسلمان مکہ کی طرف رخ کرتے ہیں لیکن ہمیشہ سے ویسا نہ تھا۔ پہلے پہل مسلمان یروشلم کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ مسلم معاشرہ جیسے جیسے پختہ تر ہوتا گیا تو ایک وقت یہ حکم نازل ہوا کہ آئندہ مسلمان مکہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرینگے اور اس وقت سے مکہ ہی مسلمانوں کا قبلہ ہے۔

اور قبلہ اب مکہ ہی رہے گا کیونکہ محمدؐ اس دنیا سے رخصت ہو چکے اور نہ ہی کوئی نیا رسول آنے والا ہے جس کو یہ اختیار حاصل ہو کہ نمازیوں کے رخ میں تبدیلی لا سکے۔ مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب نبیؐ باحیات تھے تو اسلام کے پروجیکٹ کو ایک حیات آمیز توانائی حاصل تھی اور یہ مستقل طور پر ارتقاپذیر تھا اور منکشف ہو رہا تھا۔ کسی بھی وقت ضرورت کے اعتبار سے تبدیلی آسکتی تھی۔

لیکن رسولؐ کی وفات نے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال کھڑا کر دیا کہ انھیں اب کیا انجام دینا ہے؟ اور کس طرح انجام دینا ہے؟ نماز کی ادائیگی کے دوران ہاتھ باندھے رکھیں یا کھلا چھوڑ دیں۔ نماز کی تیاری میں وضو کرتے ہوئے پیر پنڈلی تک دھوئے جائیں یا محض ٹخنوں تک دھونا ہی کافی ہوگا؟

اور یقیناً مسلمان ہونے کے لئے پانچ ارکان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ انفرادی فرائض مثلاً روزے، زکوٰۃ و خیرات اور شہادت کے علاوہ کچھ معاشرتی یعنی اجتماعی ذمہ داریاں بھی ہیں جو معاشرے کے تئیں ایک فرد پر واجب ہوتی ہیں۔ ایک اچھے شہری کے لئے وہ رویّے جن کے نتیجہ میں جماعت رضائے الٰہی کا ایک آلہ کار بن جاتی ہے۔ مثلاً شراب کے خلاف یقینی طور پر حکم موجود تھا۔ جماعت کے دفاع میں جان و مال سے بازی لگانا بھی تھا جسے عرف عام میں جہاد کہا جاتا ہے۔ جماعت کی بہتری کے لئے ہر ایک کو قربانی دینے کی ہدایات تفویض کی گئی تھیں کیونکہ اس کے بغیر جماعت کا باقی رہنا ممکن نہ تھا۔ اور ویسے بھی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے آپ کو ایک نئی دنیا کا ایسا نمونہ سمجھتی تھی جسے دیکھ کر دوسرے لوگ اپنی زندگی کی تشکیل کرینگے۔ چنانچہ جو بھی معاشرہ کی بہتری اور اسے صحتمند رکھنے کے لئے کام کرتا ہے وہ دراصل اللہ کا کام کرتا ہے اور جو اس ذمہ داری

سے کتراتا ہے اس کی بداطواری عیاں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ معاشرہ کی صحت کے لئے کیا ضروری ہے اور اس سلسلہ میں کتنا تعاون درکار ہے؟

محمدؐ جب رخصت ہو گئے تو مسلمانوں کو اپنے فرائض پر متوجہ ہونا پڑا۔ اپنے عقیدہ کی حفاظت کی خاطر تفصیلات کو باضابطہ تحریر میں لانا ضروری تھا کہ کہیں یہ بے راہ ہو کر انحراف کا شکار نہ ہو جائے یا پھر طاقتوروں کی تلوّن مزاجی سے متاثر نہ ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اولین دونوں خلفاء نے قرآن کے ایک ایک ٹکڑے کو یکجا کیا اور تیسرے خلیفہ نے اس کا واحد مصدقہ نسخہ تیار کیا۔

لیکن حقیقی زندگی کے بہت سے سوالات کو قرآن موضوع نہیں بناتا۔ کتاب کے بیشتر حصہ میں وہ عمومی انداز میں مخاطب ہوتا ہے۔ جیسے گناہوں سے باز رہو، صحیح رویہ اختیار کرو، حوصلہ رکھو، تم سے سوال کیا جائے گا، جہنم نہایت ہی بری جائے قیام ہے اور جنت مسرتوں سے بھرپور ہے، اللہ نے جو کچھ دیا ہے اس پر شکر کرو، اللہ پر بھروسہ رکھو، اللہ کا فرمانبردار بن کر رہو، اللہ کے سامنے جھک جاؤ اور اس کے حکم کو تسلیم کرلو۔ مختصراً کتاب مقدس کچھ اس طرح کے احکامات دیتی ہے۔ اور جہاں قرآن مخصوص ہو جاتا ہے وہاں تعبیر کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

اور تعبیرات ہی اصل پریشانیوں اور دقتوں کا اعلانیہ ہوئیں۔ اور اگر ہر شخص قرآن کے غیر واضح حصوں کی تعبیر کرنے لگے تو نتائج بہت مختلف ہو سکتے تھے۔ اس طرح لوگوں کے اعمال مختلف رخ اختیار کرتے اور عوام میں اختلاف بڑھ جاتا۔ جتنے لوگ اُتنے ہی رویّے۔ اور ایک روز یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تقسیم کا یہ عمل اتنا بڑھتا کہ عظیم دنیا میں یہ مختلف گروہ اپنی پہچان کھو بیٹھتے اور وحی ربانی کا وجود بھی اس دنیا سے مٹ جاتا۔

اسکالرز اور علماء

چنانچہ یہ ضروری تھا کہ غیر واضح قرآنی حصوں کے تئیں مسلمان ایک متحدہ فہم اپناتے اور جلد اپناتے۔ یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ وحی کے متعلق انتہائی جوش و خروش ابھی ملت کی یادوں میں موجود تھا جو متحدہ فہم کے ارتقاء کے لئے ضروری تھا۔ اس زمانے میں کسی کی بھی یہ خواہش نہ تھی کہ وہ اپنا ایک ایسا ذاتی فہم پیش کرے جو محض اس کے اپنے ذہن اور منطق کو ہی مطمئن کر سکتا ہو۔ اگر محض منطق اور عقل ہی کافی ہوتی تو پھر وحی کی ضرورت ہی کیوں تھی۔ ابتدائی خلفاء نے اس سلسلہ میں کسی خصوصی اختیار اور صلاحیت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ مخلص لوگ تھے اور کلام الٰہی میں کسی قسم کی مداخلت کے روادار نہ تھے۔ اور ان کی اس عجز اور منکسر المزاجی نے انھیں وہ عظمت عطا کی جو آج ان کی پہچان بنی ہوئی ہے۔ وہ وحی کی تعلیمات کو لفظ اور روح سے متجاوز کرنے کے قائل نہ تھے۔ اور اسے بالکل خدائی منشا کے مطابق رکھنا چاہتے تھے۔

ابتداء ہی سے تفہیم کے مسائل میں مسلمانوں کی توجہ رسول اللہؐ سے متعلق یادداشتوں پر مرکوز رہی اور انھیں پر انکا انحصار رہا اور انھیں کے ذریعہ مسلمانوں نے قرآن کے فہم میں درپیش پیچیدگیوں کا حل تلاش کیا۔ اصل میں یہ عمرؓ تھے جنھوں نے اس سلسلہ میں ایک رخ کو شکل عطا کی۔ چنانچہ جب بھی کوئی ایسا مسئلہ سامنے آتا

جس کے لئے قرآن میں کوئی واضح ہدایت نہ ہوتی تو عمرؓ یہ سوال اٹھاتے کہ کیا رسول اللہؐ کو کوئی ایسی صورتحال پیش آئی تھی؟ اور آپ نے کس طرح فیصلہ کیا تھا؟

اس کے نتیجہ میں تمام لوگوں میں یہ جوش پیدا ہوا کہ رسول اللہؐ کے اعمال و اقوال کے متعلق جو بھی خبر مل جائے اسے محفوظ کیا جائے۔ اقوال اور ملفوظات جمع کرنے کے اس عمل ہی کے نتیجہ میں سلسلہ احادیث وجود میں آیا۔ لیکن رسول اللہؐ کو بہت سی باتیں کہتے ہوئے سب لوگوں نے سنا تھا۔ سوال یہ تھا کہ ان میں معتبر کیا ہے؟ آپکے بعض اقوال ایک دوسرے کی ضد نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس میں من گھڑت باتیں بھی شامل کر دیتے ہوں۔ انھیں کیسے جانچا جائے۔ ایسا بھی ہوا کہ بعض لوگوں نے براہ راست کوئی بات رسول اللہؐ سے نہیں سنی تھی بلکہ کسی دوسرے معتبر شخص نے اسے بیان کیا تھا۔ یعنی ان کا یہ دعویٰ تھا کہ بیان کرنے والا شخص معتبر تھا۔ اس سلسلہ میں سوال کھڑے ہو سکتے تھے کہ اصل بیان کرنے والا کیسا تھا؟ کیا وہ قابل اعتبار تھا؟ دوسرے بیان کرنے والے افراد کیسے تھے؟ کیا وہ سب معتبر تھے؟ بالفاظ دیگر معتبر اور ذمہ دار کی صفات کے معنی کیا ہیں؟ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ عمرؓ نے اس طرح کے سوالات کے حل کے لئے ایک کل وقتی کمیٹی تشکیل کی تھی اور اس طرح اسلام کو علماء اور اسکالرز کی بڑی تعداد کے میسّر آجانے سے قبل ہی ایک انتہائی نتیجہ خیز اقدام عمرؓ کر چکے تھے۔ بعد میں تو پیشہ ور اسکالرز کی تعداد ایک فوج کی مانند ہوگئی جنھیں اسکالرز یا اہل قلم کہا گیا۔

لیکن احادیث میں جس تیز رفتاری سے ارتقاء ہوا وہ اسکالرز کے ایک چھوٹے سے گروہ کے کنٹرول سے باہر تھا۔ ہر روز کئی احادیث منظر عام پر آجاتیں۔ عہد بنو امیہ کے آتے آتے رسول اللہؐ کے ہزاروں بیانات، اقوال، اور فیصلے عوام میں پھیل چکے تھے۔ ان کی چھان پھٹک اور منتشر ذخیرے سے معتبر احادیث کو نکال لانا بہت مشکل کام تھا جس کے لئے ہزاروں اسکالرز کو تنخواہوں پر رکھا گیا تھا۔ ان اخراجات کی نگرانی محکمہ انصاف کے ذمہ تھی۔ لیکن رؤسا بھی اس خدمت میں خدا کی خوشنودی کے لئے آزادانہ حصہ لیتے تھے۔ البتہ آزاد اسکالرز نے بھی اپنے طور پر اس کام میں حصّہ لیا۔ جنھیں شہرت مل جاتی طلبہ ان کی طرف دوڑے چلے آتے اور اس کے ساتھ ساتھ ان طلباء اور اسکالرز کے ساتھ مالی معاونت کرنے والے بھی سامنے آتے رہتے۔ اس طرز کے غیر رسمی گروہ ترقی کرتے کرتے علمی اداروں کی شکل اختیار کر لیتے اور بعض اوقات یہ اوقاف کے معاون اور وابستہ کار کی شکل میں کام کرتے۔ حدیث کو بسا اوقات اقوال کہہ دیا جاتا ہے جو گمراہ کن ہوسکتا ہے۔ محمد رسول اللہ کے اقوال کی نوعیت شیکسپیئر اور اور آئنسٹائن کے اقوال یا مقامی طور پر معروف حکایتوں جیسی نہیں۔ وہ محاوروں یا حسب حال ہونے کے لئے یاد نہیں رکھی جاتیں۔ کسی مقامی دانا یا شیکسپیئر کے اقوال کو محفوظ کرنے میں کوئی اسوقت تک دلچسپی نہیں لے گا جب تک کہ وہ واقعی دلچسپ، پر مغز اور گہرائی کے حامل نہ ہوں۔ لیکن حدیث کے لئے اہم ترین معیار یہ جاننا تھا کہ کیا واقعی یہ رسول اللہؐ کا قول ہے۔ کیا واقعی رسول اللہؐ نے یہ کہا تھا۔ تسلیم! کہ بعض احادیث ظرافت کا پہلو بھی لئے ہوئے ہوتیں اور بعض تنبیہی ہدایات۔ ان میں الفاظ کا اختصار بہت معرکۃ الآرا

ہے۔ مثلاً ”ایک کا کھانا دولوگوں کے لئے کافی ہوتا ہے اور دولوگوں کے کھانے میں تین لوگ کھا سکتے ہیں۔
“۔۔۔ بہت سی احادیث معمولی اور اتفاقی اظہار خیال کی شکل میں ہوتی ہیں جو رسول اللہؐ نے روزمرہ کی زندگی میں بھی کہہ دیئے ہونگے۔ ایک حدیث ایسی ہے جس میں رسول اللہؐ نے ایک شخص کو جس کی ڈاڑھی کے اکا دکا بال تھے انھیں کاٹ ڈالنے پر کہا تھا کہ اسے یہ بال نہ کاٹنا چاہیئے تھے۔ یہ بات کسی عام شخص نے کہی ہوتی تو لوگ اسے بھول جاتے اور زیادہ اہمیت نہ دیتے لیکن یہ کیونکہ محمدؐ کا قول تھا اس لئے اسے یاد رکھا گیا کہ شاید اس میں راہِ حیات کے لئے کوئی ہدایت رہی ہو اور اسطرح اللہ کی رضا کا حصول بھی ممکن ہو جائے۔

حدیث کی غیر مشروط صحت اور معیار کو کیونکہ فیصلہ کن اہمیت حاصل تھی اس لئے احادیث کے معیار کو جانچنا ایک باقاعدہ فن کی شکل اختیار کر گیا جس میں اصل کام یہ ہوا کہ احادیث کو بیان کرنے والوں کے سلسلے اور اس سلسلہ کی ہر کڑی کی صحت اور معیار کو جانچا گیا۔ حدیث کی صحت کا معیار یہ تھا کہ اس کے بیان کرنے والے صحیح اور معتبر لوگ تھے۔ بیان کرنے والوں کا سلسلہ وہاں تک پہنچنا ضروری تھا جس میں کسی نے یہ حدیث رسول اللہؐ سے براہ راست سنی ہو۔ اس کے بعد ہی کسی حدیث کو سنجیدگی سے حدیث کے طور پر لیا جاتا۔ مثالی صورتحال تو یہ ہوگی کہ راست بیان کرنے والا شخص رسول اللہؐ کے قریبی ساتھیوں میں سے کوئی ہو۔ اور رسول اللہؐ کے یہ رفقاء جتنا ان کے قریب ہونگے اتنا ہی اس حدیث کی صحت کا معیار بلند ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ بعد کے جو لوگ اس سلسلہ میں ہونگے انھیں تقویٰ، ایمانداری اور علم کے میدان میں بے عیب ہونا ضروری تھا۔

میں نے سنا ہے کہ حدیث کے ایک بڑے عالم بخاری، ایک حدیث کے بارے میں جانچ کر رہے تھے تو انھیں اس کی پہلی کڑی معیاری محسوس ہوئی اور دوسرا شخص بھی معیار پر پورا اتر گیا۔ لیکن جب بخاری تیسرے شخص سے ملنے گئے تو دیکھا کہ وہ اپنے گھوڑے کو مار رہا تھا*۔ بس اس منظر نے مسئلہ حل کر دیا۔ جو شخص گھوڑے کو مارے اس کے الفاظ پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اور یوں وہ حدیث مسترد کر دی گئی۔

مختصراً اسکالر کے لئے لازمی تھا کہ وہ حدیث بیان کرنے والے سلسلہ میں شامل افراد کے بارے میں ذاتی معلومات اور ان کے دقت کے حالات کا علم رکھے۔ اسے یہ بھی علم ہونا چاہیئے تھا کہ رسول اللہؐ نے کن حالات میں فرمایا تھا کیونکہ پس منظر جاننے کے بعد ہی اس حدیث کی معنویت اور مقصد کا علم ہو سکے گا۔ اس طرح علم حدیث کے نتیجہ میں ناقدانہ تاریخ نویسی کا ایک نیا میدان معرض وجود میں آیا۔ رسول اللہؐ کی وفات کے آٹھ دہائیوں کے بعد عالم اسلام کے مختلف اسکالرز نے گہری چھان پھٹک کے بعد جمع کی گئی حدیثوں کو موضوعات کے اعتبار سے مرتب کرنا شروع کیا۔ اسلامی عقیدہ ایک منظّم فکر کی شکل میں سامنے آیا اور اسلامی طرز حیات پر ایک حوالہ بن گیا۔ مثلاً اگر جاننے کی خواہش ہو کہ رسول اللہؐ نے غذا اور کھانے پینے سے متعلق یا لباس کے متعلق یا

* بعض جگہ یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ یہ شخص مذکور اپنے گھوڑے کو ایک جھوٹا لالچ دیکر اپنے پاس بلا رہا تھا اس طرح کہ وہ اپنے خالی توبڑے کو اس طرح گھوڑے کو دکھا رہا تھا جیسے اس میں کچھ کھانے کے لئے موجود ہو۔

جنگ وغیرہ سے متعلق کیا کہا تھا۔ تو یہ کتابیں اس ضرورت کو پورا کرتی تھیں ۔ یہ کام ویسے تو بنوامیہ کے آخری دور میں شروع ہوا لیکن دورِ عباسی میں اسے استحکام اور پختگی حاصل ہوئی اور صدیوں تک نئے نئے مجموعے منظر عام پر آتے رہے۔ مثلاً ابھی ایک سال قبل میرے ایک افغان شناسا نے مجھے دستی تحریر میں ایک مجموعہ بھیجا کہ شاید میں انگریزی میں ترجمہ کرسکوں۔ یہ مجموعہ احادیث اس شخص کے بقول چودہ سو سال کے بعد خود اس نے جمع کیا تھا۔

نئے نئے مجموعے منظر عام پر آتے رہے لیکن چھ مجموعوں کو تیسری صدی ہجری تک ایک قانونی حیثیت مل چکی تھی۔ یہ احادیث کیونکہ قرآنی تعلیمات کی توضیح کرتی تھیں اس لئے قرآن کے بعد اسلامی زندگی کے احکام ومسائل کے باب میں دوسری سطح کا معیار بن گئیں۔

لیکن اس کے باوجود زندگی کے بہت سے مسائل ایسے تھے جن کے جواب قرآن وحدیث میں موجود نہ تھے۔ اس صورتحال میں اختلاف کے درمیاں کسی کو بنیادی فیصلہ کرنا ہی پڑتا تھا۔ اور کیونکہ اس قسم کے فیصلہ کی اسلام میں ایک قانونی حیثیت ہے اس لئے مسلمانوں نے یہ حق محض ان لوگوں کو دیا جو علم کے اعتبار سے پختہ اور معیاری تھے۔ اور جو قرآن اور حدیث کے علم میں پیرے ہوئے تھے اور علم الحدیث میں مہارت حاصل کر چکے تھے۔ صرف اسی معیار کے اسکالرز کے بارے میں یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ ان کی دی ہوئی رائے وحی کی روح اور اس کے مزاج کے منافی نہ ہوگی۔

معیاری اور تسلیم شدہ اسکالرز بھی جب قیاس کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرتے تو بہت سختی سے اس طریقہ ہی کے تحت کرتے جو عمر نے شراب نوشی کے مجرم کی سزا تجویز کرتے ہوئے استعمال کیا تھا۔ چنانچہ ہر ایسے مسئلہ پر جو اس سے قبل کبھی پیش نہ آیا ہوا اسکالرز ماضی میں اس سے مماثل مسئلہ تلاش کرتے اور اس پر دیئے گئے فیصلہ کے متوازی فیصلہ کرتے اور قیاس کے سلسلہ میں اگر اختلاف رونما ہوتا تو وہ طریقہ اختیار کیا جاتا جس پر سب لوگ متفق ہوجاتے یعنی ملت کا اجماع ہوجاتا۔ اجماع کا مطلب ہے وقت کے معروف اور تسلیم شدہ اسکالرز کا کسی فیصلہ پر متفق ہونا۔ یہ اتفاق رائے کسی بھی تشریح کی صحت کی علامت ہوجاتا ہے کیونکہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میری امت کبھی بھی غلطی پر اجماع نہیں کریگی۔

اگر کسی اسکالر کو قرآن، حدیث، قیاس اور اجماع بھی کسی مسئلہ میں خاموش نظر آتے ہوں تو اس سلسلہ کی آخری کڑی اجتہاد ہے جس کے معنی عقل کی بنیاد پر آزادانہ سوچ کے ہیں۔ اسکالرز اور احباب قلم اس طرح کے غور وخوض کو ان معاملات میں استعمال کر سکتے ہیں جو راست وحی سے نہیں نکلتے یا تسلیم شدہ سابق فتاویٰ اور نظائر بھی اس سلسلہ میں خاموش ہیں۔

صدیاں گذرتے مزید تبدیلیاں آئیں۔ ایک بار کسی مسئلہ پر جب کسی تسلیم شدہ اور معروف اسکالر نے اجتہاد کے ذریعہ کوئی رائے دے دی تو اس کی رائے بھی قانون کا مقام اختیار کرگئی اور جو اسکالرز بعد میں آئے ان کے لئے یہ ضروری ہوگیا کہ وہ قرآن، حدیث، اسناد، قیاس، اجماع کے ساتھ اجتہاد کے نتیجہ میں روز

افزوں آراء کا بھی پورا پورا علم رکھیں تب ہی نئے اسکالرز کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اجتہاد کریں۔

اس طرح تیسری ہجری تک ایسے زبردست اور ماہرین تعمیرات کے ضابطہ کے مانند ایسے ضوابط اور مجموعہ ہائے قوانین تیار ہو گئے اور ممانعات، ہدایات، فرائض، سفارشات، انتباہ، پیشہ ورانہ رہنمائی، قوانین، سزائیں اور انعامات کی تشکیل کر لی گئی جو زندگی کے معاشرتی وسیاسی مسائل سے لیکر ادنی ترین سوالات مثلاً انفرادی پاکیزگی، غذا اور جنسی اعمال تک کو محیط تھی۔ انھیں کو شریعہ کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ دراصل راستہ اور طریقہ کے نسبتی الفاظ سے مستعار ہے اور شریعہ اسلامی، قانون سے بلند تر مقام کی حامل نظر آتی ہے۔ یہ دراصل پوری زندگی کو محیط ہے۔ اس کا ارتقاء نہیں بلکہ انکشاف ہوتا ہے۔ اور یہ قوانین فطرت کی طرح غیر منقلب اور تغیر ناپذیر ہے۔ اسکالرز اور اصحاب قلم نے جن جن قانونی نکات کی وضاحت کی ہے وہ دراصل اللہ تک پہنچنے کے راستہ کو عیاں کرتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے جنگل کی خاردار اور گتھی ہوئی جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان راستہ کی رہنمائی کے لئے لگے ہوئے رہنما پتھر، نشاناتِ راہ ہیں جو مسافروں کی مدد کے لئے لگے ہوتے ہیں۔

سنّیوں کے یہاں ذرا مختلف چار ضابطے تشکیل ہوئے اور شیعوں نے اپنے لئے ایک اور ضابطہ طے کر لیا جو سنی ضابطوں سے اپنی روح اور وسعت کے اعتبار سے مماثل تھا۔ یہ ضابطے اپنی تفصیل میں ایک دوسرے سے مختلف نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ہزار میں پانچ مسلمان بھی ان تفصیلات سے آگاہ نہیں ہوتے۔

سنّیوں میں یہ چار ضابطے ان اسکالرز کے نام سے موسوم ہیں جنھوں نے انھیں منضبط کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ چنانچہ حنفی اسکول ابوحنیفہ سے جو اصلاً افغانستان سے تعلق رکھتے تھے لیکن درس وتدریس کا کام کوفہ یعنی آج کے عراق میں انجام دیتے تھے۔ مالکی اسکول مراقشی اسکالر ابن مالک سے جنھوں نے پورا کام اور تدریس مدینہ میں انجام دی۔ شافعی اسکول مکہ کے امام شافعی سے متعلق ہے جو بالآخر مصر میں مقیم ہوئے اور آخری حنبلی اسکول سخت گیر احمد بن حنبل سے موسوم ہے جن کے بارے میں ذرا تفصیل سے آئندہ بیان کیا جائے گا۔

یہ اسکول قانون سازی میں تھوڑے مختلف طریقے استعمال کرتے تھے جس کے نتیجہ میں ان کے قوانین ایک دوسرے سے ذرا مختلف نظر آتے ہیں۔ لیکن عباسیوں کے دور سے یہ چاروں اسکول ہی صحیح العقیدہ سمجھے جاتے ہیں۔ اور کوئی مسلمان ان میں سے کسی کو بھی اپنا سکتا ہے، اس خوف کے بغیر کہ اس پر گمراہی کا الزام آئے۔ ان ضابطوں کا ارتقاء اور مختلف مسائل میں ان کا انطباق بڑا ہی وسیع وعریض اور زبردست کام تھا جس میں اسکالرز کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہوئی۔ معاشرہ میں یہ تعداد ایک باقاعدہ طبقہ کی شکل اختیار کر گئی جسے علماء کہا جانے لگا۔ یہ لفظ عالم کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں جاننے والا۔

اگر علم دین میں آپ شہرت رکھتے ہیں یعنی آپ کا تعلق طبقہ علماء سے ہے تو کسی وقت کی انتظامیہ میں آپ شریک ہو سکتے ہیں۔ آپ طلباء کو درس وتدریس دے سکتے ہیں بلکہ خود ایک اچھا مدرسہ قائم کر سکتے ہیں۔ عدالت کے منصف بن سکتے ہیں اور محض مخصوص مقدمات سننے کے لئے نہیں بلکہ وسیع اور لامحدود معاشرتی مسائل

پر بھی حکم دینے کے لئے آپکی عالمانہ عظمت کے پیشِ نظر خلافت کے طاقتور اور مقتدر رؤسا اور اشراف بھی آپ سے مشورہ کر سکتے ہیں۔ حالانکہ ایسا بھی ہوا کہ خلافت میں علماء اور منتظمہ میں تعلقات اچھے نہ رہے بلکہ علماء خود ایک متوازی طاقت کا استعارہ بن گئے۔ علماء قانون کی توضیح کرتے، عدالتوں پر ان کا کنٹرول ہوتا، نظام تعلیم ان کے ہاتھ میں ہوتا اور مسلمانوں کے معاشرتی اداروں میں ان کا گہرا اثر ورسوخ ہوتا۔ پوری مہذب دنیا میں ان کا بہت بڑا مقام تھا اور معاشرتی طاقت حاصل تھی جو کچھ افراد اور بعض رویوں کے تئیں ملت اسلامیہ کے رویوں کی تشکیل کرتی تھی۔ ملت کی پسند اور ناپسند علماء کی آراء کی روشنی میں طے ہوتی۔ میں معاشرتی طاقت کا بار بار حوالہ دے رہا ہوں کیونکہ مسلمانوں کے معاشرہ میں معاشرتی دباؤ کی بڑی اہمیت ہے۔ مسلمان اصلاً ایک معاشرتی وجود ہے اس لئے یہ دباؤ بعض اوقات سیاسی قوت سے بھی زیادہ اہم اور موثر ترین قوت کی طرح ظاہر ہوتا ہے۔ سیاسی قوت تو محض دولت پر کنٹرول، اور قوت واقتدار کے دوسرے آلات کی اجارہ داری جیسے طریقوں سے ہی کام کرتی ہے۔

ایک بات واضح کر دوں کہ علماء نہ تو اُس زمانے میں اور نہ ہی آج کسی کے ذریعہ مقرر کئے جاتے ہیں۔ اسلام میں پوپ یا اور کوئی آفیشیل ادارہ نہیں پایا جاتا۔ لیکن پھر کس طرح کوئی علماء میں شامل ہو جاتا ہے؟ یہ اُس زمانہ میں ایک تاریخی عمل تھا۔ نہ تو کوئی لائسنس تھا اور نہ کوئی سند اور نہ ہی کوئی بورڈ جسے ٹانگ دیا جاتا کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہو سکے کہ یہاں ایک عالم رہتا ہے۔ یہ دراصل ایک خود انتخابی اور خود درستگی کے عمل سے گذر کر تشکیل پانے والی ایک کلاس ہے جو مستحکم طور پر قائم عقیدہ کے دریا کی حد میں رہتی ہے۔ کوئی اکیلا عالم اس دریا کے رخ کو نہ تو تبدیل کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے رُخ کو موڑ سکتا ہے۔ یہ بہت قدیم بہت مستحکم اور انتہائی منظم ہونے کی بناء پر کوئی اس وقت تک علماء کے گروپ میں شامل نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ عقیدہ کو اپنے اندر اس حد تک جذب نہ کر لے کہ خود اس کی ذات عقیدہ کی علامت بن جائے۔ جب ایک شخص عقیدہ پر سوال اٹھانے کی پوزیشن میں آئے تو وہ اس عمل سے گذر چکا ہو کہ وہ سوال اٹھانے کی پوزیشن میں ہی نہ رہے اور اس کا داعیہ بھی ختم ہو جائے۔ اختلاف کرنے والے وہ ناقابل اصلاح لوگ جو عقیدہ پر سوالیہ نشان اٹھانے سے کبھی نہیں چوکتے وہ غالباً مذکورہ بالا عمل سے گذرے ہی نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ آغاز میں ہی اس دھارے میں بہہ جاتے ہیں اور اپنا وجود کھو دیتے ہیں۔ خودنموئی کے جس عمل سے گذر کر علماء کا ارتقاء ہوتا ہے وہ انھیں بنیادی طور پر ایک محتاط اور مائل بہ تحفظ گروہ بنا دیتا ہے۔

فلاسفہ

اسلام میں محض علماء ہی دانشور نہ تھے گو کہ انھوں نے عقائد کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا تھا لیکن فکر و خیال کے حامل مسلمانوں کا دوسرا گروہ ایک بڑے ہی وسیع وعریض پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا جس کا بنیادی مقصد ماضی کے تمام فلسفوں اور دریافتوں کی اسلامی وحی کی بنیادوں پر تشریح کرنا اور انھیں ایک واحد سسٹم میں مربوط کرنا

تھا تا کہ کائنات وفطرت اور انسان کا تصور واضح ہو سکے اور ان کے درمیان انسان کی پوزیشن متعین ہو جائے۔ اس پروجیکٹ نے دانشوروں کے ایک گروہ کی تشکیل کی جسے عالم اسلام میں فلاسفہ کہا گیا۔

اسلام کے وسیع علاقوں تک پھیلنے کے نتیجہ میں دوسری اقوام کے تصورات اور ان کے کارناموں سے اسلام کا رابطہ ہوا جس میں ہندوستان کے ہندو، وسط ایشیا کے بودھ، اہل فارس اور یونان شامل تھے۔ اس زمانے میں روم اپنا مقام کھو چکا تھا اور قسطنطنیہ اپنی دولت وثروت کے باوجود انحطاط کا شکار ہو کر زمین کے ایک بے کار ٹکڑے کی مانند ہو گیا تھا جہاں فکری سرگرمی پست درجہ کی تھی۔ چنانچہ بنیادی فکر کا ارتقاء اگر کہیں تھا اور جاری بھی تھا تو وہ یونانی زبان میں تھا اور مصر کے شہر اسکندریہ میں جمع ہو چکا تھا۔ اور یہ شہر اب عربوں کے ہاتھوں میں آچکا تھا۔ اس شہر میں ایک بڑی لائبریری تھی اور متعدد چھوٹی لائبریریاں تھیں۔ اس طرح یہ شہر یونان ورومن دنیا کی دانشوری کی روایت کے دارالحکومت کا مقام حاصل کر چکا تھا۔

یہیں مسلمانوں کا پلوٹینس (Plotinus) کے کام سے تعارف ہوا جس نے یہ تصور پیش کیا تھا کہ دنیا کی ہر شئے آپس میں اسی طرح مربوط ہے جس طرح ایک زندہ شئے اپنے اجزاء سے مربوط ہوتی ہے۔ یہ تمام اجزاء یکجا ہوتے ہیں تو ایک غیر مرئی واحدہ تشکیل پاتا ہے جس سے ہر چیز بنی ہے اور جس کی طرف ہر چیز کو پلٹنا ہے۔

وحدت کے اس تصور میں مسلمانوں کو یقیناً رسول اللہؐ کے دیئے ہوئے تصور خدا کی وحدانیت کی پر جوش بازگشت سنائی دی ہوگی۔ جب مسلمانوں نے اس فلسفی کے تصورات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس نے اپنے سسٹم کی تشکیل میں سخت منطق استعمال کی تھی۔ جس کی ابتداء چند مفروضوں پر مشتمل اصول تھے۔ اس سے یہ امید پیدا ہوئی کہ وحی اسلامی کو بھی اسی طرح منطق کی بنیاد پر سمجھا جا سکتا ہے۔

مزید تحقیق سے اندازہ ہوا کہ Plotinus اور ہم عصر تو محض ایک عظیم سلسلہ کے تازہ ترین شارحین تھے جس کا کوئی ہزار سال پہلے آغاز ہوا تھا اور جس میں Plotinus سے بھی کہیں بڑھ کر ایتھینیا کا فلسفی افلاطون تھا۔ افلاطون کی دریافت نے مسلمان محققین کے لئے تو یونانی دانشوری کے باب میں نئے نئے دروازے کھول دیئے اور ماقبل سقراط سے ارسطو اور اس سے بھی قبل کے فلسفیوں سے یہ لوگ متعارف ہوئے۔

عباسی اشرافیہ نے ان تصورات میں بڑی دلچسپی دکھائی اور جو شخص بھی یونانی، سنسکرت، چینی یا فارسی زبانوں میں پائی جانے والی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر سکتا اس کے لیے کثیر معاوضہ کے ساتھ کام کے مواقع تھے۔ پیشہ ور مترجمین بغداد میں جمع ہونے لگے اور مختلف زبانوں سے عربی میں تراجم سے لائبریریاں بھر گئیں۔ یونانی علوم کا دوسری زبانوں کے علوم سے براہ راست موازنہ کرنے کے میدان میں مسلمان اوّلین قوم تھے۔ مثلاً یونانی ریاضی کا موازنہ ہندوستانی ریاضی سے یا یونانی اور ہندی طب کا موازنہ، اور اسی طرح اہلِ فارس واہل چین کی Cosmology کا موازنہ اور مختلف ثقافتوں میں مابعد الطبیعات کا موازنہ۔ مسلمانوں نے اس موازنہ سے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ قدیم تصورات ایک دوسرے میں کیا مماثلت رکھتے ہیں اور کس طرح ایک دوسرے کی توثیق

کرتے ہیں۔ اور وحیِ اسلامی کے ساتھ ان کی مطابقت کس نوعیت کی ہے۔ مزید یہ کہ زمین و آسمان کو ایک ہی اسکیم میں کس طرح محصور کیا جا سکتا ہے کہ پوری کائنات کی تشریح ممکن ہو سکے۔ اور یہ بھی کہ روحانیت کا عقل کے ساتھ انسلاک کیسے ممکن ہے۔ مثال کے طور پر اس سلسلے کی ایک اسکیم میں کائنات کو ''وجود'' خاص سے لہروں کے ایک سلسلہ کے ذریعہ صادر ہوتا ہوا سمجھا گیا ہے۔ یہ لہریں روزمرّہ کی زندگی پر بلا کسی واسطے کے اترتی ہیں جیسے

ناقابل تقسیم وجود

↓

عقل اوّل (First Intelligence)

↓

روح کائنات

↓

ابتدائی یعنی غیر مہذّب مادہ

↓

فطرت

↓

کسی جگہ پر وقوع پذیر مادہ

↓

عناصر

↓

معدنیات، نباتات اور ذی روح یعنی حیوان

افلاطون نے مادّی دنیا کی توضیح کچھ اس طرح کی تھی کہ یہ دراصل ایک ''حقیقی دنیا'' کا غیر حقیقی یا فریب آمیز عکس ہے۔ یہ دنیا غیر متغیّر اور لافانی شکلوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ ہر حقیقی یعنی نظر آنے والی کرسی محض ایک واحد 'مثالی' کرسی کی نامکمل شکل ہے۔ جو اس عالمگیر کلیت میں کہیں موجود ہے۔ افلاطون کی پیروی میں مسلم فلسفیوں نے وضاحتوں کے سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ہر انسان حقیقی اور غیر حقیقی وجود کا مجموعہ ہے۔ ان کے مطابق پیدائش سے قبل روح افلاطونی عالمگیریت (universals) میں مقیم ہوتی ہے۔ زندگی میں یہ جسم سے متعلق ہو جاتی ہے جو مادہ کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ جبکہ موت کے نتیجہ میں یہ دونوں علیحدہ ہو جاتی ہیں۔ جسم دنیائے مادہ میں منتقل ہوتا ہے اور روح اللہ کی طرف جو اس کا ابتدائی مقام ہے۔

افلاطون سے بہت گہرے تعلق کے باوجود مسلمان فلاسفہ ارسطو سے بھی بہت متاثر رہے اور خاص طور سے اس کی منطق، مختلف اقسام کی تشکیل میں اس کا طریق کار، اور مخصوصات پر اس کی گہری اور زبردست پکڑ نے انھیں اس کا دلدادہ بنا لیا تھا۔ ارسطو ہی کی پیروی میں مسلمان فلاسفہ نے منطق کی مدد سے زمرہ بندی اور مراتب میں تقسیم کا عمل بھی انجام دیا۔ مسلمان فلاسفہ کے طریقہ کار کو سمجھنے کے لئے ایک مثال دی جاتی ہے۔ الکندی نے مادّی دنیا کو پانچ بنیادی اصولوں مادّہ، شکل، حرکت، زمان، اور مکان کی بنیاد پر واضح کیا۔ ان میں سے ہر ایک کی مزید شاخیں کیں اور ان کا تجزیہ کیا۔ مثلاً حرکت کی چھ اقسام کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ یہ نمو (generation)، خرابی (Courruption)، اضافہ، کمی، وصف میں تبدیلی اور جگہ (Position) میں تبدیلی پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ہر حقیقت کے مختلف اجزائے ترکیبی کو قابل فہم اور جدا حصوں کی شکل میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔

تمام عظیم مسلم فلاسفہ نے عقلیت کو روحانیت سے مربوط کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارا جوہر اصولوں اور تصورات سے تشکیل پاتا ہے جنھیں صرف عقل ہی سمجھ سکتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ علم کا مقصد روح کی پاکیزگی ہے جو حواس سے تصوراتی اصولوں تک اور مخصوص سے عالمگیر سچائیوں تک محیط ہے۔ الفارابی کا مخصوص نقطہ نظر یہ تھا کہ طلبہ کو فطرت کے مطالعہ سے آغاز کرانا چاہئے اس کے بعد منطق کا مطالعہ، اور پھر سب سے زیادہ تصوراتی موضوع یعنی ریاضی کی تعلیم حاصل کرنا چاہئے۔

یونانیوں نے جیومیٹری ایجاد کی، ہندوستانی ریاضی دانوں نے یہ بہترین تصور پیش کیا کہ صفر کو بھی ایک عدد تسلیم کیا جائے۔ اہل بابل نے Place Value یعنی کسی نمبر میں متعین جگہ کی کیا قیمت ہے کا تصور واضح کیا اور مسلمانوں نے ان تمام تصورات کو ایک واضح سسٹم کی شکل میں پیش کیا۔ کچھ اپنے تصورات بھی شامل کئے، الجبرا کی ابتداء کی اور اس طرح جدید ریاضی کی بنیاد رکھی۔

دوسری طرف فلاسفہ کے عملی معاملات میں دلچسپی نے انھیں اس نوع کے مسائل کی طرف بھی متوجہ کیا۔ مثلاً مختلف علاقوں کی علاج و معالجہ کی روایت اور عملی تجربوں کی معلومات کو جمع کرنے اور انھیں مختلف اقسام میں مرتب کرنے کے دوران ابن سینا نے بیماری اور علاج کے علم کو تقریباً جدید مقام پر لا کھڑا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اناٹومی کی معلومات میں بھی انھیں گہری نظر حاصل ہوئی۔ مثلاً دوران خون کا تصور اور دل کا عمل اور ان کے دوسرے اجزاء کے کام کے بارے میں ان کی معلومات خاصی جدید معیار کی تھیں۔ بہت جلد عالم اسلام اسپتالوں کے اعتبار سے نہ صرف اس وقت کی پوری دنیا میں بلکہ آنے والی کئی صدیوں تک ممتاز اور قابل افتخار پوزیشن پر فائز رہا۔ محض اہل بغداد کو اس طرح کی کوئی سو سہولیات میسّر تھیں۔

عہدِ عباسی کے ان فلاسفہ نے کیمسٹری کی بنیاد رکھی اور جیالوجی، آپٹکس، بوٹنی اور بظاہر ان تمام علوم پر جنھیں آج سائنس کہا جاتا ہے ابتدائی اور تعارفی کتابیں تصنیف کیں۔ ان مضامین کو مسلم فلاسفہ نے کوئی علیحدہ

نام نہیں دیا۔ جیسا کہ مغرب میں سائنس کو کافی طویل عرصہ تک نیچرل فلسفہ کہا جاتا رہا۔ مسلمانوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اپنے بعض قیاسات اور تحقیقات کو کوئی نیا نام دیں۔ البتہ ابتداء ہی میں نیچرل اشیاء کے مطالعہ میں مقداری طریقہ کی اہمیت کو انھوں نے محسوس کر لیا تھا۔ اور آج یہی طریقہ کار سائنس کو دوسرے علوم سے ممتاز کرتا ہے۔ انھوں نے مشاہدہ کے ذریعہ معلومات جمع کرنے اور ان کی بنیاد پر نظریات قائم کرنے کو بھی اہم قرار دیا جو ان کی سائنسی سرگرمی کا دوسرا اہم کارنامہ تھا۔ انھوں نے سائنسی طریقہ کار کو موضوع نہیں بنایا اور پہلے کوئی مفروضہ یعنی hypothesis قائم کر کے اسے متعلقہ تجربات کے ذریعہ صحیح یا غلط ثابت کر کے علم میں اضافے کے لئے کوئی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو اس کا پورا امکان ہے کہ عالم اسلام میں عہد عباسی ہی میں یورپ کے مقابلہ میں سات صدیاں قبل سائنس کا آغاز ہو چکا ہوتا۔ ایسا نہ ہونے کی دو وجوہات تھیں جس میں سے ایک مذہب اور سائنس کا باہمی تعامل ہے۔ ابتدائی مراحل میں سائنس اور دینیات کو آپس میں الجھنے سے روکنا بنیادی مشکلات کا شکار ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک دوسرے کو کچھ دینے کے لئے کچھ نہ کچھ رکھتا ہے۔ جب گلیلیو نے اپنے نظریے کو کہ زمین سورج کے اطراف گردش کرتی ہے، متعارف کرایا تھا تو مذہب کے ذمہ داروں نے اس پر گمراہی کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا۔ آج کے اس دور میں بھی بلکہ خود مغرب میں ایسے عیسائی روایات پرست نظریہ ارتقاء کے مقابلہ پر بائبل کے نظریہ پیدائش کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ جیسے یہ دونوں نظریات ایک مسئلہ کو سلجھانے کے لئے باہم ہمسری اور مسابقت کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ قابل بھروسہ نتائج اور جستجو کے لئے اپنے طریقہ کار کو کافی وشافی سمجھنے کی بنا پر سائنس مذہب کو چیلنج کرتی ہے اور تجربہ و عقل کو بنیاد بناتی ہے نہ کہ وحی کو۔۔۔۔۔ مغرب میں یہ دونوں میدان شاید اب صلح کر چکے ہیں کہ دونوں میدانوں اور تحقیق کے دائروں کو ممتاز اور علیحدہ رکھا جائے یعنی فطرت کا اصول سائنس کے دائرہ میں اور اخلاقیات کا میدان مذہب اور فلسفہ کے دائرہ میں۔

نویں اور دسویں صدی کے عراق میں (قدیم یونان کی طرح) سائنس کا علیحدہ سے کوئی وجود نہ تھا کہ دونوں کو الجھنے سے محفوظ رکھنے کی کوئی شعوری کوشش کی جاتی۔ فلاسفہ کی کوششوں کے نتیجہ میں سائنس پیدا ہو رہی تھی لیکن انھیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کوئی نئی چیز پیدا کر رہے ہیں۔ مذہب ان کا میدان جستجو تو تھا ہی وہ دینیات کو اپنی دانشوری کا اختصاص سمجھتے تھے۔ وہ دراصل حتمی حقیقت کی فطرت کو سمجھنا چاہتے تھے جو ان کے خیال میں مذہبی اور فلسفیانہ جستجو کا بنیادی اور اعلیٰ ترین نصب العین بھی تھا۔ ان کی تحقیقات جو چاہے نباتات میں ہوں یا آپٹکس میں یا علاج و معالجہ میں وہ سب بذات خود منظور نہ تھیں بلکہ اس اعلیٰ مقصد کے حصول کے سلسلے سے تھیں۔ چنانچہ یہ فلاسفہ ان مذکورہ میدانوں میں اپنی جستجو کے نتائج کو بلا جھجھک ان سوالات سے متعلق کر ڈالتے تھے جنھیں دور جدید کے لوگ دینیاتی تصور کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جنھیں ہم کسی کیمیسٹ یا معالج کے دائرہ کار سے خارج سمجھتے ہیں۔ جیسے یہ سوال:

اگر کوئی شخص گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر بیٹھے تو کیا وہ غیر مسلم ہو جاتا ہے یا محض ایک فاسق

(یعنی برا مسلمان)

بظاہر یہ الفاظ کا کھیل نظر آتا ہے لیکن یہ ایک اہم مسئلہ تھا کیونکہ عالم اسلام قانونی مسائل کے پیش نظر مسلم گروہ اور غیر مسلم گروہ میں تقسیم ہو گیا تھا۔ قوانین کا ایک مجموعہ مسلمانوں پر انطباق کے لئے تھا جبکہ دوسرا مسلمانوں کے اِن غیر مسلموں سے روابط سے متعلق تھا۔ چنانچہ یہ جاننا ضروری تھا کہ کوئی شخص مسلم جماعت کا حصہ ہے یا اس سے باہر ہے۔

بعض فلاسفہ نے اس سوال پر غور کرتے ہوئے کہا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب مسلمان ایک تیسری ایسی حالت میں پہنچ جاتا ہے جو ایمان اور غیر ایمان کے درمیان کی حالت ہے۔ لیکن سخت گیر اور غیر لچکدار رویّہ کے حامل علماء نے اس تیسری پوزیشن کے تصور کو پسند نہیں کیا کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح اخلاقیات سفید و سیاہ کی طرح واضح نہ رہیں گی بلکہ ان کا تصور دھندلا جائے گا۔

ایمان کی اس تیسری حالت کے تصور کے نتیجہ میں ایک نیا دینیاتی مکتبہ فکر ابھرا جو معتزلہ کہلایا۔ یہ لفظ عربی زبان میں علیحدگی پسند کو کہا جاتا ہے اور اس گروہ کے لئے یہ اصطلاح اس لئے مستعمل ہے کہ ان لوگوں نے علماء کے غالب نقطہ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے علیحدہ نقطۂ نظر کی بنیاد ڈالی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان ماہرین دینیات نے مختلف امور میں باہم مربوط مذہبی تصورات کا مجموعہ تیار کر لیا جو فلاسفہ کے لئے خاصہ دلچسپ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام کا مغز تو عقیدہ توحید یعنی اللہ کی وحدانیت ہے یعنی اس کا ایک ہونا اور اسکی آفاقیت ہے۔ اسکے نتیجہ میں انھوں نے یہ نکتہ اخذ کیا کہ قرآن لافانی اور غیر مخلّق نہیں ہو سکتا جیسا کہ علماء رائے رکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن بھی اللہ کے ساتھ ساتھ الوہی خصوصیات سے متصف ایک دوسری ہستی ہے جو ظاہر ہے کفر ہے۔ چنانچہ انھوں نے دلیل دی کہ قرآن بالکل اسی طرح اللہ کی مخلوق ہے جیسے انسان، چاند، ستارے، اور سمندر۔ یقیناً یہ عظیم کتاب ہے لیکن بہر حال کتاب ہی ہے۔ اور اگر یہ محض ایک کتاب ہے تو پھر اس کی تشریح کی جا سکتی ہے۔ بلکہ ترمیم (ذرا سانس روکیں) بھی کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ توحید کا تقاضا ہے کہ یہ نہ سوچا جائے کہ اللہ کے ہاتھ ہیں، اس کے پیر ہیں اور آنکھیں وغیرہ ہیں۔ حالانکہ قرآن ان اصطلاحوں میں بات کرتا ہے۔ چنانچہ اس طرح قرآن کے تجسیمی حوالوں کو محض علامتی اور استعاراتی حیثیت دی جائے گی۔

انھوں نے خدائی صفات کا بھی انکار کیا۔ مثلاً عدل، رحم، اور قوت جیسی صفات سے اللہ کو آراستہ کرنے کا مطلب ہے کہ ہم اللہ کو حصوں میں تقسیم کر کے اسکا تجزیہ کر رہے ہیں جو ظاہر ہے کہ توحید کے منافی ہے۔ خدا تو واحد اور ناقابل تقسیم ہے ایک ایسا عظیم مجموعہ ہے جسے انسان کا ذہن اپنے تصور میں لا ہی نہیں سکتا۔ انسان جنھیں صفات الٰہی کہتا ہے وہ تو دراصل وہ دریچے ہیں جن کے ذریعہ انسان خدا کو دیکھتا ہے۔ ہم اللہ کو جن صفات سے متصف مانتے ہیں معتزلہ کے نزدیک وہ دراصل خود ہمیں بیان کر رہی ہوتی ہیں۔

اللہ کے اس تصور کی روشنی میں معتزلہ نے یہ نقطۂ نظر اپنایا کہ اچھا اور برا، صحیح اور غلط دراصل اللہ کی ناقابل تغیر حقیقت کے پہلو ہیں۔ اور انھیں بالکل اسی طرح معلوم کیا جا سکتا ہے جس طرح ہم قوانین فطرت معلوم کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ کوئی رویّہ اس لئے اچھا نہیں ہے کہ الٰہی صحیفہ اسے اچھا کہتا ہے۔ بلکہ صورت یہ ہے کہ صحیفہ نے اس کا حکم اسلئے دیا ہے کہ وہ ہے ہی اچھا اس کا حکم اسلئے ہی دیا گیا کہ وہ صحیفہ کے حکم سے پہلے ہی اچھا تھا۔ اور اس کی اچھائی کی کوئی وجہ رہی ہوگی جو خود اس کی ذات کا حصہ ہوگی اور یہ وجہ ایسی ہوگی جسے عقل معلوم کر سکے۔ چنانچہ معتزلہ کے نقطۂ نگاہ سے عقل اپنی ذات میں ایک معقول آلہ ہے جس سے ہم اخلاقی، نیکی اور سیاسی سطح کے حقائق کو وحی کے بغیر بھی معلوم کر سکتے ہیں۔

اہل دینیات کے درمیان یہی اختلافات دراصل سائنس کے ارتقاء کے لئے مضمرات لئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ سائنس ہی تو تحقیق وجستجو کا وہ رویّہ ہے جو وحی سے بالکل آزاد رہ کر کام کرتا ہے۔ معتزلہ عقل کے اخلاقی اور نیکی کے اصول معلوم کرنے کا ذریعہ ہونے کی بات کر رہے تھے۔ اس زماں ومکان میں انسانی رویوں کے اصول ہوں یا اصول فطرت یہ سب دراصل اسی عظیم تر میدان تحقیق کا حصہ ہیں جسے حقیقت مطلق کی تلاش سے موسوم کیا جاتا ہے۔

فلسفی سائنسداں بالعموم معتزلہ طرز فکر سے وابستہ ہو گئے کیونکہ یہ بلا شبہ ان کے طرز تحقیق کی توثیق کرتا تھا۔ بعضوں نے عقل کو وحی پر ترجیح بھی دی۔ مثلاً ابوبکر ذکریا رازی کے خیال میں ماضی کے انبیاء سے منسوب معجزے محض قصے ہیں اور اسی طرح جنت ودوزخ کا کوئی طبعی وجود نہیں ہے بلکہ محض ذہنی درجات اور سلسلوں کا نام ہے۔

یہ تصور کرنا چنداں مشکل نہیں کہ اس نوع کے اختلافات نے فلسفیوں اور علماء کے رشتوں کو خاصی مشکل میں ڈال دیا ہوگا۔ کیونکہ فلسفیوں کے ان تصورات کے نتیجہ میں علماء غیر اہم اور غیر ضروری ہوتے جا رہے تھے۔ مثلاً جب کوئی ذہین شخص خود ہی عقلی بنیاد پر فیصلہ کر سکتا ہے کہ کونسا قانون صحیح اور کونسا غلط ہے تو اسے ان علماء کے مشوروں کی کیا ضرورت رہے گی جنھوں نے رسول اللہؐ سے منسوب تمام ارشادات زبانی یاد کر رکھے تھے۔

اس چیلنج کا مقابلہ علماء کر سکتے تھے اور اس اعتبار سے بہتر پوزیشن میں تھے کیونکہ قانون، نوجوان نسل کی تعلیم، نکاح وغیرہ جیسے معاشرتی ادارے اور اسی طرح بہت سے دوسرے معاملات ہیں جہاں علماء دخیل تھے اور انھیں کنٹرول کرتے تھے اور سب سے اہم یہ کہ انھیں عوام کا اعتماد حاصل تھا۔ لیکن معتزلہ بھی اس اعتبار سے علماء سے کم نہ تھے۔ بلکہ دیکھا جائے تو وہ ایک قدم آگے تھے۔ انھیں حکمراں طبقہ اشرافیہ اور حکومت وقت کے بڑے ذمہ داروں کی بھی حمایت حاصل تھی۔ یہاں تک کہ ساتویں عباسی خلیفہ نے تو معتزلہ کے نقطۂ نظر کو سرکاری پالیسی کا مقام دیدیا تھا۔ عدلیہ میں داخل ہونے کے لئے فلسفہ کا امتحان پاس کرنا ضروری تھا جبکہ سرکاری عملہ کے لئے عقل کے استعمال کی قسمیہ یقین دہانی اور وفاداری کا اظہار ضروری تھا۔

لیکن معتزلہ نے اس سے اور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور ملی ہوئی سہولیات اور طاقت کو اپنے مخالفین کے خلاف استعمال کرنا شروع کیا۔

یہاں میں حنبلی مکتبہ فکر کے بانی احمد بن حنبل کا دوبارہ تذکرہ کررہا ہوں جو راسخ العقیدہ مکاتیب فکر میں سب سے زیادہ متشدد رویوّں کا حامل مکتبہ فکر مانا جاتا ہے۔ ابن حنبل بغداد میں ۱۶۴ ھجری میں پیدا ہوئے۔ یہ عباسی دور کے آغاز سے محض ۳۶ سال بعد کا ہے۔ ان کے شعور کی تشکیل اس دور میں ہونا شروع ہوئی جب عباسیوں کے دکھائے ہوئے خوابوں کا واہمہ ٹوٹنا شروع ہوا اور عوام کو معلوم ہوا کہ عباسی بھی اتنے ہی دنیادار ہیں جتنا بنوامیہ تھے۔ وہ عوام کی توجہ کا مرکز دراصل اپنی تبلیغ کی بنا پر بنے۔ جس میں وہ کہتے تھے کہ اسلام راستہ سے ہٹ چکا ہے اور دنیا جہنم کے راستے پر گامزن ہو چکی ہے اور امت کی یہ ذمہ داری ہے کہ اسے ٹھیک کرے۔ صورتحال سے نجات کا ایک ہی راستہ ہے کہ تمام گمراہیوں اور بدعات کو مٹا دیا جائے اور دور اول کی جماعت کے راستہ پر یعنی رسول اللہ کے دور مدینہ کی طرف مراجعت ہو۔ اس سے بڑھ کر جو بات انھوں نے کہی وہ یہ تھی کہ صحیح اور غلط کا فیصلہ انسان کے بس میں نہیں۔ ان کی روح کی حفاظت کی ضمانت رسول اللہؐ کے قدموں پر چلنے اور وحی پر سختی سے اعتماد میں ہی مضمر ہے۔ فقہ اسلامی کے دوسرے مکاتب کے یہاں نئے نئے مسائل کے حل کے سلسلہ میں قیاس کو بڑا مقام حاصل تھا۔ ابن حنبل نے بڑی سختی سے اسے غیر اہم قرار دیا اور کہا کہ بس قرآن اور حدیث ہی اس سلسلہ میں کافی ہیں۔

انھیں دربار شاہی میں طلب کیا گیا اور ایک دوسرے معروف عالم دینیات کے ساتھ اس مسئلہ میں مناظرہ کرنے کے لئے کہا گیا کہ قرآن خلق ہے یا نہیں۔ اس موضوع کے مضمرات دراصل اخلاق اور نیکی کے جانچنے اور پرکھنے میں عقل کی اہمیت سے متعلق بحث کے لئے بڑے فیصلہ کن ہو سکتے تھے۔ فلسفی نے احمد بن حنبل پر منطق کا وار کیا تو احمد بن حنبل نے قرآن کے ذریعہ اس کا جواب دیا۔ فلسفی نے انھیں منطقی گتھیوں میں الجھایا تو احمد بن حنبل نے اپنے نقطہ نظر کو اللہ کے حوالہ کے ذریعہ ان گتھیوں سے آزادی حاصل کی۔ ظاہر ہے کہ اس میں جیت کسی کی نہ ہو سکی کیونکہ دونوں فریقوں نے کسی ضابطہ کی پابندی کے حوالہ سے یہ مناظرہ نہیں کیا تھا۔ جب احمد بن حبنل نے اپنے نقطہ نظر کو چھوڑ دینے سے انکار کیا تو انھیں پیٹا گیا لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے نقطہ نظر کو بدلنے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ وہ جیل میں ڈال دیئے گئے اور اس کے باوجود وہ اصولوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ وہ عقل کو وحی پر فوقیت دینے کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ کبھی اور کسی حالت میں بھی نہیں۔

نتیجتاً اقتدار نے مزید دباؤ بڑھایا۔ انھوں نے احمد بن حنبل کو اتنی سختی سے مارا کہ ان کے جوڑ اپنی جگہ سے ہٹ گئے اور باہر نکل آئے۔ سخت زنجیروں میں جکڑ ڈالا گیا اور سالوں جیل میں ڈالے رکھا۔ احمد بن حنبل اپنے اصولوں کو چھوڑنے کو تب بھی تیار نہ ہوئے۔ یہ سخت سزائیں ان کے اصولوں کو کمزور کرنے کے بجائے عوامی مقبولیت کا باعث بنتی گئیں۔ عوام الناس جو عباسیوں کی دولت اور ان کی شان وشوکت کے رویوّں سے پہلے ہی نالاں تھے

اب بے چین ہونے لگے اور جب عوام الناس میں بے اطمینانی بڑھی تو زبردست عباسیوں کو بھی متوجہ ہونا پڑا۔ کیونکہ جب بھی کوئی خلیفہ موت کا شکار ہوتا تو جانشینی میں اختلاف کا واحد حل عوام الناس کی پر جوش حمایت ہی کے ذریعہ سامنے آتا۔ جب عمر رسیدہ اور نحیف و کمزور ابن حنبل جیل سے آزاد ہوئے تو عوام کی بڑی تعداد نے بڑے احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور گھر تک ان کے ساتھ رہے۔ اس صورتحال میں شاہی دربار، اسلامی فلسفہ اور یونانی تصورات جن سے یہ فلسفہ تشکیل پایا تھا کے بارے میں محتاط ہو گیا۔ آنے والے خلیفہ نے معتزلہ کی اہمیت کم کر دی اور ابن حنبل کو احترام اور نوازشات سے نوازا جو اس بات کا اعلان تھا کہ اب معتزلہ کی قدر و منزلت رو بہ زوال ہے اور ان کے ساتھ ساتھ فلسفہ کی بھی۔ اس کے ساتھ ان علماء کی اہمیت میں اضافہ ہوتا گیا جو راسخ العقیدہ فکر سے وابستگی رکھتے تھے۔ اور یوں وہ میدان ہائے فکر و دانش جو وحی سے بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر متعلق نہ تھے منجمد ہو گئے اور وحی کے حوالہ کے بغیر جستجو اور تحقیق کی مسلم دانشوروں کی صلاحیت شدید متاثر ہوتی گئی۔

اہل تصوف

تقریباً ابتدا ہی سے اور خاص طور پر اس وقت سے جب اسکالرز اسلامی قانون کی تدوین میں مصروف تھے، یہ سوال پوچھا جانے لگا کہ ''کیا وحی میں بس اتنا ہی ہے۔ یعنی بس قوانین کا ایک مجموعہ؟'' یہ میرے احساس میں کیوں شامل نہیں ہو پا رہی۔ کیا اسلام میں مزید کچھ اور نہیں؟ اللہ کے احکامات بجا لیکن بعض لوگوں کی خواہش تھی کہ خدا ان میں اترے ان میں ظاہر ہو اور ابھی اور اسی جگہ وہ اسے ایک زندہ تجربہ کی حیثیت میں محسوس کریں۔ وہ چاہتے تھے کہ وحی کے ذریعہ ایک تغیّر اور کایا پلٹ ہو اور ماورائیت کا احساس حقیقت کا روپ دھارے۔ بعض لوگوں نے روحانی مشقوں کے تجربے کرنا شروع کر دیئے جو متعین فرائض کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھے۔ مثلاً قرآن کی تلاوت میں مسلسل اور بے محابا مشغول رہنا یا گھنٹوں اسمائے الٰہی کا ورد کرتے رہنا۔ بغداد میں جنید نام کے ایک صاحب تھے جن کی عادت تھی کہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد چار سو رکعات نماز روزانہ ادا کرتے۔ اور شاید بڑھی ہوئی عیش و عشرت کے خلاف ردِّ عمل کے طور پر بعضوں نے رضا کارانہ طور پر غربت اختیار کر لی اور روٹی اور پانی پر گذارا کرتے۔ گھر کا ساز و سامان چھوڑ دیا۔ ایسے سادہ کپڑے پہنتے جو بہت موٹی اون کے بُنے ہوئے ہوتے۔ ایسی اون کو عربی میں صوف کہا جاتا ہے اور اسی بنا پر یہ لوگ عوام میں صوفی کے نام سے منسوب ہو گئے۔

صوفیوں نے کوئی نیا عقیدہ پیش نہیں کیا اور نہ ہی وہ کسی مسلک کے داعی تھے۔ یقیناً وہ دنیاوی عزائم بدعنوانی اور لالچ کے مخالف تھے لیکن نظری اعتبار سے تو ہر مسلمان ان خرابیوں کا مخالف تھا۔ صوفی دوسروں سے مختلف یوں تھے کہ وہ پوچھتے تھے کہ ''دل کی صفائی کس طرح ممکن ہے''؟ اس مقصد کے حصول کے لئے صحیح ریاضتیں اور عبادتیں کیا ہیں۔ اصل سوال یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ باقی سب سے بے نیاز ہو کر اللہ کا کیسے ہُوا جائے؟ انھوں نے ایسے طریقوں پر توجہ دی جو ان تمام سے توجہ ہٹا سکیں جو میرے اور اللہ کے درمیان حائل

ہوتی رہتی ہیں اور محض عبادتوں کے درمیان ہی نہیں بلکہ مجموعی زندگی میں اللہ کی طرف التفات کو متاثر کرتی ہیں۔ کچھ لوگ خود ان کے اندر کی منفی خواہشات کے خلاف نبرد آزما ہوتے۔ اور رسول اللہ کی اس حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے جس میں آپ نے عظیم تر جہاد اور کم تر جہاد میں فرق کیا تھا اعلان کیا کہ داخلی جہاد جو انسان کی انا کو شکست دینے والا ہو، وہی جہاد عظیم ہے (امت کے دشمنوں کے خلاف جدوجہد کمتر درجہ کا جہاد ٹھہرا)۔

بتدریج ان لوگوں کے بارے میں یہ بات پھیل گئی کہ ان میں سے کچھ نے مادّی حدود کو پار کر کے خدا کا راست تجربہ کر لیا ہے۔

مثال کے طور پر بصرہ شہر میں ایک شاعرہ رابعہ بصری رہتی تھیں جن کی زندگی آج خاصے افسانوی رنگ میں رنگ گئی ہے۔ بنو امیہ کے آخری دور میں پیدا ہوئیں اور جب عباسیوں کا دور آیا تو وہ جوان ہو چکی تھیں۔ جب وہ چھوٹی ہی تھیں اور اپنے والد کے ساتھ سفر کر رہی تھیں تو کارواں پر ڈاکو حملہ آور ہوئے۔ والدین مارے گئے اور انھیں غلام بنا لیا گیا۔ اس طرح یہ بصرہ کے کسی امیر کے گھر میں ایک باندی کی حیثیت میں وارد ہوئیں۔ داستان کہتی ہے کہ رابعہ کا مالک اس کے اطراف میں ایک پرنور روحانیت محسوس کرتا جس سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک رات جب وہ عبادت میں کھوئی ہوئی تھی مالک نے دیکھا کہ رابعہ کے جسم کو ایک ہالہ گھیرے ہوئے ہے۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کے گھر میں ایک مقدّس وجود ہے اور وہ ایک قسم کے خوف سے دوچار ہو گیا۔ مالک نے رابعہ کو آزاد کر دیا اور اچھی طرح سے اس کی شادی کرنے کا عہد کیا۔ اس نے عہد کیا کہ وہ اس کو شہر کے کسی معزز خاندان سے وابستہ کر دیگا۔ بس رابعہ کو یہ بتانا تھا کہ وہ کس شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے؟ مالک اس سلسلہ میں ضروری بات چیت فوراً شروع کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

لیکن رابعہ نے کہا کہ وہ کسی سے شادی نہیں کر سکتی کیونکہ وہ پہلے ہی سے کسی کے عشق میں گرفتار ہے۔

''عشق'، مالک متعجب ہوا تھا'' کس سے؟؟

'اللہ سے' اور پھر رابعہ کی شاعری میں گرفتار کر لینے والے جذبات کا ایسا اظہار ہونے لگا کہ یہ سابقہ مالک بھی اس کا تاحیات شاگرد بن گیا۔ رابعہ کی زندگی کا زاہدانہ تفکر اور صوفیانہ استغراق و محویت کچھ اس طرح سے شاعرانہ جذبات کے ریلے میں ظاہر ہوا کہ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ یہاں عشق کا محور اللہ ہے تو کوئی انھیں جسمانی و نفسیاتی جذبات کا اظہار سمجھے گا۔

میرے آقا، ستاروں کی ضوفشانی جاری
اور انسانوں کی آنکھیں بند
شاہوں کے دروازوں میں قفل پڑ چکا ہے۔
عاشقاں اپنے معشوقوں کے ساتھ تنہا
اور میں ہوں یہاں تیرے ساتھ تنہا[1]۔

مجھے نہیں معلوم کہ رابعہ نے کتنے اشعار کہے۔ کیونکہ جو کچھ محفوظ ہے وہ زیادہ نہیں۔ لیکن اپنے عہد میں رابعہ کی شہرت دور دور تک تھی۔ بہت سے لوگ بصرہ محض اس لئے آتے تھے کہ رابعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ بہت سوں کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ رابعہ کو اللہ سے اتحاد کی کنجی حاصل ہو چکی ہے۔ خود اس کے خیال میں یہ کنجی اللہ کا خوف نہیں بلکہ عشق تھا۔ بے دھڑک اور عاقبت نا اندیش عشق، بے لگام اور لا متناہی عشق۔

کہنا تو آسان لیکن عشق کس طرح ممکن ہے؟ اس میں گرفتاری کیونکر؟ عشق کے پیاسے تو بس اُس کے گرد جمگھٹا لگائے رہتے۔ اس امید کے ساتھ کہ شاید اس کی توجہ کا شکار وہ بھی ہو جائیں۔ بعضوں کے بقول انھیں یہ توجہ ملی بھی جسے سنکر مزید گرفتاران راہ اس کے دروازے پر حاضری دینے لگتے۔ انھیں طالب علم تو نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہاں نہ تو کتابیں تھیں، نہ علم و دانش نہ ہی مطالعہ، بصرہ کی رابعہ درس نہیں دیتی تھی۔ وہ تو صرف شعاع ریز ہو کر درخشاں ہوتی اور اس کے قریب میں موجود لوگ بدل جاتے۔ تصوف کا یہی وصف بن گیا یعنی مرشد اپنے مرید کو حصول آ گہی کا طریقہ راست پہنچا دیتا۔

اس وقت تک تمام مسلم صوفیا میں اعتدال اور سنجیدگی غالب تھی۔ تلاوت اور ریاضت میں ان کا انہماک گہرا تھا۔ انکا اخلاق خشیت الٰہی کے گرد گھومتا تھا۔ رابعہ نے اس میں عشق کو مرکزی حیثیت دیکر شامل کیا اور یوں خدا سرشار صوفیوں کا ایک طویل سلسلہ قائم ہو گیا۔ البتہ ایک بات واضح رہنی چاہئے کہ یہ تمام صوفیا، مسلمان پہلے اور صوفی بعد میں تھے۔ یہ تاکید اس لئے ضروری ہے کہ آج کے بہت سے صوفی محض گانے اور رقص میں مبتلا ہو کر خوشی اور بشاشت کا محض احساس پیدا کر لیتے ہیں۔ صوفی جذبات کے احیاء کے لئے متلاشی نہ تھے اور نہ ہی بلندیوں کا حصول ان کے پیشِ نظر تھا۔ ان کی روحانی ریاضتوں کا آغاز اسلام کی معلوم اور معروف عبادتوں سے ہوا تھا بعد میں مزید شامل ہوئیں۔

صوفیوں کی طرف لوگوں کی توجہ کچھ مقاصد کے پیش نظر ہوئی۔ وہ کہیں پہنچنا چاہتے تھے۔ کسی صوفی بزرگ کی صحبت میں رہنے کا مطلب کسی طریقہ کار سے آ گہی کا حصول تھا۔ صوفیوں کے یہاں اسے ''طریقہ'' کہا جانے لگا تھا۔ جو اس میں شامل ہو جاتے وہ کچھ واضح مقامات سے گذرتے جس میں ایک اپنی خودی کا فنا کرنا اور دوسرا خدا میں غرق و استغراق کا مرحلہ تھا۔ فقہا اور راسخ العقیدہ علماء صوفیا کو بہ نظر تحسین نہیں دیکھتے تھے۔ اور خاص طور سے ان صوفیا کو جو خدا میں غرق اور استغراق کے قائل تھے۔ کیونکہ ان صوفیا نے جو زبان استعمال کی وہ گمراہی کی طرف گامزن لگتی تھی۔ ان کے دعوے معقولیت کے حد سے آگے بڑھنے لگے۔ مشہور صوفیا کے بارے میں عوام میں یہ خیال عام ہو گیا کہ انھیں جادوئی طاقتیں میسّر ہیں۔ علماء اور صوفیا میں شدّتِ اختلاف دسویں صدی عیسوی میں اپنے عروج پر پہنچا جس میں سب سے بڑا کردار ایک فارسی صوفی منصور بن حلاّج نے ادا کیا تھا۔

حلاّج کے معنی ہیں سوت دھننے والا۔ یہ انکے والد کا پیشہ تھا اور انھوں نے ابتداء اس آبائی پیشہ ہی سے کی۔ لیکن اللہ میں استغراق کی خواہش نے کیونکہ اُن کے دل کو دبوچ لیا تھا اس لئے وہ کسی صوفی سلسلہ کے بزرگ

کی تلاش میں گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ ایک دفعہ وہ کعبۃ اللہ کے سامنے سال بھر تک بغیر حرکت کئے اور بغیر کوئی آواز نکالے کھڑے رہے۔ سال بھر تک! ذرا تصوّر کریں کتنی توجہ کے ساتھ وہ مستغرق رہے ہونگے۔ بعد میں انھوں نے ہندوستان اور وسطی ایشیا کا سفر بھی کیا۔ جہاں بھی گئے شاعری جاری رہی اور عجیب وغریب خطبات پیش کئے اور لاتعداد افراد ان کے پیروکار ہوکر کارواں میں شامل ہوگئے۔

لیکن سنجیدہ صوفیا ان سے دور رہنے لگے اس کی بڑی وجہ وہ الفاظ تھے جو وہ ادا کرتے رہتے تھے۔ مثلاً کہا کہ ''میرے سر کا صافہ بس اللہ کے گرد لپٹا ہوا ہے''۔ اور بالآخر جب کوئی اُن کی بات سمجھ نہ پاتا تو کہتے ''انا الحق'' حقیقت یہ ہے کہ ان کے الفاظ یہ تھے کہ ''میں سچ (حق) ہوں''، لیکن حق اللہ کے ننانوے ناموں میں سے ایک تھا۔ چنانچہ حلاّج ابتک جو کچھ کہتے آرہے تھے اس کی روشنی ہی میں اس قول کو بھی سمجھا گیا۔

اور یوں بات حد سے آگے بڑھ گئی۔ راسخ العقیدہ علماء نے ان کے خلاف کاروائی کا مطالبہ کیا۔ عباسی خلیفہ علماء کو کیونکہ خوش رکھنا چاہتے تھے تاکہ وہ فلسفیوں کے خلاف ان کی حمایت جاری رکھیں۔ چنانچہ حلاّج کو کوئی گیارہ سال تک قید میں ڈال دیا گیا۔ لیکن حلاّج دنیا سے اتنا دور جاچکے تھے کہ اس سزا کی انھوں نے کوئی پرواہ ہی نہ کی۔ قید کے اندر بھی خدا کی سرشاری پر مشتمل اپنی شعری تخلیقات لکھتے رہے۔ کبھی عیسیٰ مسیح سے اپنے آپ کو جوڑتے اور کبھی شہادت کا حوالہ دیتے۔ ایک بات یقینی ہے کہ انھوں نے کبھی کسی بات سے رجوع نہیں کیا۔ آخرکار راسخ العقیدہ علماء کا گروہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اب تمام امکانات ختم ہوچکے ہیں۔ اب ایک ہی طریقہ بچا ہے جسے بہت بار آزمایا جاچکا ہے۔ یعنی پیغام کو غیر معتبر ثابت کرنے کا آزمایا ہوا طریقہ یہی ہے کہ پیغام دینے والے ہی کو ختم کردینا چاہئے۔

حکومت نے محض قتل ہی نہیں کیا بلکہ انھیں لٹکا دیا۔ بازو کاٹ ڈالے، سر قلم کیا اور بالآخر ان کے مردہ جسم کو نذرِ آتش کردیا۔ لیکن یہ سب کارگر نہ ہوسکا۔ حلاّج تو دنیا سے رخصت ہوئے لیکن تصوف برگ و بار لاتا رہا۔ کرشماتی صلاحیتوں سے آراستہ افراد سامنے آتے رہے۔ سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اور مہذب دنیا کے کونے کونے میں۔ ان میں کچھ تو سنجیدہ صوفی تھے جیسے جُنید اور کچھ خدا سرشاری سے آراستہ جیسے رابعہ یا حلاّج۔

مختصر یہ کہ گیارہویں صدی کے وسط تک مسلمانوں کو تین طرح کے بڑے ثقافتی پروجیکٹ درپیش رہے جن پر اسکالرز، ماہرین دینیات، فلاسفہ، سائنسدان اور صوفیاء تندہی سے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ سرگرمیاں عقیدہ اور قانون کی صراحت، طبعی کائنات میں پائی جانے والی مثالوں اور نمونوں کی شناخت اور کارفرما اصولوں کی دریافت، اور اللہ سے ذاتی تعلق قائم کرنے کے طریقوں کی کھوج پر مشتمل تھیں۔ کہیں کہیں یہ تینوں گروہ ایک دوسرے میں مدغم بھی ہوتے نظر آتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی یہ تینوں میدان باہم مقابل نظر آتے ہیں اور ان کے فکرودانش پر مشتمل ان کے اختلافات کبھی کبھی اتنے بڑھ جاتے کہ سیاسی اور دولت سے متعلق مفادات میں خون خرابہ تک نوبت پہنچ جاتی۔ انھیں حالات میں خراسان میں فارسی بولنے والے والدین کے یہاں دنیا

کے عظیم دانشوروں میں سے ایک دانشور پیدا ہوا جسے ہم ابو حامد محمد الغزالی کے نام سے جانتے ہیں۔

لگ بھگ بیس سال کی عمر میں ہی غزالی اپنے وقت کے بڑے عالم کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے۔ صورت یہ تھی کہ کسی کو کتنی بھی حدیثیں یاد ہوں لیکن جب بات غزالی کی ہوتی تو وہ آگے ہی نظر آتے۔ ان کے زمانے میں بعض علماء نے معتزلہ سے مقابلہ آرائی کے پس منظر میں دینیات کی تدوین کی تھی جسے اشعری مکتب کہا جاتا تھا۔ اس فکر کے مطابق عقائد کے معاملات میں عقل کا کوئی رول نہیں ان معاملات میں مکمل انحصار وحی پر ہوگا۔ عقل کا کام محض وحی کی مدد کرنا اور اسے کمک پہنچانا ہے۔ اکثر اشاعرہ علماء معروف ومعتزلہ سے عوامی مناظرہ کرتے رہتے تھے۔ لیکن معتزلہ کیونکہ بعض ایسی یونانی چالوں سے واقف تھے جو بحث ومباحثہ میں مدِ مقابل کو زیر کرنے میں کارگر تھیں۔ مثلاً منطق اور علم البیان (Rhetoric) جیسے علوم۔ چنانچہ اشعری اکثر و بیشتر پریشان رہتے اور کنفیوزن کا شکار ہو جاتے تھے۔

غزالی ان کے مددگار کی حیثیت سے ابھرے، انھوں نے سوچا کہ فلاسفہ کو ناکام کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ خود ان کے طریقہ کار کی جانکاری حاصل کی جائے۔ ان کی چالوں کو ان کے خلاف استعمال کیا جائے۔ غزالی نے قدیم یونانی علوم کا ڈوب کر مطالعہ کیا۔ علم منطق میں مہارت حاصل کی۔ یونانی رسالوں کو گویا ہضم کر لیا اور یوں انھوں نے مقاصد فلسفہ نامی ایک کتاب تصنیف کی جو زیادہ تر ارسطو کی فکر پر مشتمل تھی۔ اس کتاب کے مقدمہ میں غزالی نے لکھا کہ یونانیوں کا نقطہ نظر غلط تھا اور اسے ثابت کریں گے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ اس کتاب میں وہ یہ بھی بتائیں گے کہ یونانی فلسفہ کیا ہے؟ تا کہ قارئین کو یہ معلوم ہو سکے کہ میں کس کی تردید کر رہا ہوں۔

غزالی کی معقولیت قابل تعریف ہے۔ انھوں نے مار گرانے کے لئے اپنے سامنے گھاس پھونس کا آدمی کھڑا نہیں کیا۔ ارسطو کے خیالات پر غزالی کا بیان اتنا سلیس، واضح اور اتنا فاضلانہ تھا کہ ارسطو کے بڑے بڑے خوشہ چین بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "واہ آخر کار ارسطو سمجھ میں آ ہی گیا"۔

غزالی کی کتاب اندلس پہنچی اور وہاں سے عیسائی یورپ میں متعارف ہوئی جہاں جو پڑھنا جانتے تھے ان لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ مغربی یورپ کے لوگ روم کے زوال کے بعد یونانی قدیم علوم کو بھول سے گئے تھے۔ بہت سے لوگوں کے لئے یہ ارسطو سے انکا پہلا تعارف تھا۔ البتہ اس دوران اس کتاب پر غزالی کا وہ مقدمہ غائب ہو گیا تھا جو انھوں نے ارسطو کی نقد پر لکھا تھا۔ چنانچہ یورپی لوگوں کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ غزالی ارسطو کے ناقد ہیں۔ بعضوں نے تو یہ تک سوچ لیا کہ یا کتاب خود ارسطو نے قلمی نام سے لکھی ہے۔ جو کچھ بھی ہوا غزالی کی اس کتاب کے نتیجہ میں ارسطو کے گرد عظمت و بلندی کا ایک ہالہ سا بن گیا اور بعد میں آنے والے عیسائی مفکرین نے عیسائیت اور ارسطو کے خیالات میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے بڑی محنت اور مشقت اُٹھائی۔

اس دوران فارس میں غزالی نے اپنی کتاب مقاصد فلسفہ کے بعد وعدہ کے مطابق دوسری

زبردست کتاب تہافتہ الفلاسفہ تصنیف کی۔ اس کتاب میں انھوں نے بیس ایسے نکات پیش کئے جن پر یونانی فلسفہ اور اسلامی فلسفہ کا انحصار تھا اور پھر قیاسی منطق کے ذریعہ ہر نکتہ کو تار تار کر دیا۔ غزالی کی سب سے موثر اور نتیجہ خیز دلیل میرے خیال میں وہ تھی جہاں انھوں نے مادّی مظاہر میں علت و معلول کے رشتوں پر بحث کی ہے۔ غزالی کے نزدیک کوئی ایسا رشتہ نہیں پایا جاتا۔ غزالی کہتے ہیں کہ ہمارے خیال میں آگ روئی کو جلاتی ہے یہ اس بنا پر ہے کہ جب بھی روئی میں آگ لگتی ہے تو وہاں آگ ضرور ہوتی ہے۔ ہم دراصل غلطی سے قربت کو موجبیت سمجھ لیتے ہیں۔ غزالی کہتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ روئی خدا کے حکم سے جلتی ہے کیونکہ وہی تو ہر چیز کا پہلا اور واحد سبب ہے۔ آگ تو بس وہاں موجود ہوتی ہے۔

یہاں میرے خیال میں غزالی کا نقطۂ نظر مضحکہ خیز ہے۔ کیونکہ ارسطو کے لئے معنویت کا اظہار خود انھوں نے کیا تھا میں خود ان کے لئے اسی معیار کی معقولیت کا اظہار نہیں کر پا رہا۔ مجھے ان سے اختلاف ہے۔ لیکن ہر ایک کو نہیں۔ غزالی نے موجبیت کے خلاف جو کیس بنایا وہ اٹھارہویں صدی کے اسکاٹس فلاسفی ڈیوڈ ہیوم نے بھی پیش کیا تھا۔ اسی طرح ۱۹۷۰ میں بھی میں نے وہی دلیل پڑھی جو ایک امریکی زین بدھسٹ Alan Watts نے پیش کی تھی جس میں علت معلول کو ایک ایسی بلّی سے تشبیہ دی تھی جو ایک کھڑکی میں پتلے سے سوراخ سے آتی جاتی رہتی ہے۔ اگر ہم دوسری سمت سے اس سوراخ کے باہر دیکھیں تو پہلے ہمیں بلی کا سر نظر آئے گا اور پھر اس کی دم۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بلّی کا سر دُم کا موجب ہے (لیکن میرے خیال میں ایک اعتبار سے ایسا ہے لیکن یہاں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا)۔ آپ اسے جس طرح بھی لیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ غزالی کی Causalty یعنی موجبیت پر تنقید سائنس کی پوری فکر کو منفی طور پر متاثر کرتی ہے۔ اگر واقعتاً کوئی چیز کسی دوسری چیز کی موجب نہیں ہوسکتی تو دنیائے فطرت میں بامعنی سلسلوں کے مشاہدہ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر اللہ ہی واحد سبب ہے تو اس دنیا میں کس معنی کی تلاش کے لئے ہمیں صرف اللہ کی مرضی کو جاننے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یعنی واحد شئے جسے ہمیں جاننا چاہئے وہ وحی الٰہی ہے۔ جس کے مزید معنی یہ ہوئے کہ واحد قابل سماعت گروہ علماء کا ہے۔

غزالی نے اس کی اجازت تو دی کہ ریاضی، منطق، اور نیچرل سائنس کے ذریعہ صحیح نتائج تک رسائی ہوسکتی ہے۔ لیکن جب بھی یہ نتائج وحی سے متغائر ہونگے غلط ٹھہریں گے۔ لیکن سائنس اگر اسی وقت صحیح ہے جب وہ وحی کے نتائج کے مطابق ہو تو پھر سائنس کی آخر ضرورت ہی کیا ہے۔ تمام تر سچائیاں ہمیں وحی سے حاصل ہوسکتی ہیں*۔

---

* زیادہ صحیح بات ہمارے خیال میں مصنف کے خیال سے ذرا مختلف ہے۔ ہمارے پاس غزالی کی تہافتہ الفلاسفہ کا انگریزی ترجمہ Incoherance of Philosopher ہے جس میں غزالی ذرا مختلف نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں انسانی کاوش کا کوئی نتیجہ اگر بالکل واضح طور پر قرآن سے مختلف نظر آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی ذہن قرآن کے نقطہ نظر کو سمجھ نہیں سکا ہے اور وقت گذرنے کے ساتھ یہ فہم صحیح تر نقطہ نظر تک پہنچ جائیگا۔ یعنی قرآن کے ہمارے فہم پر واضح طور پر علمی یعنی سائنسی نتیجہ کو ترجیح دی جائیگی۔

کچھ فلسفیوں نے پلٹ کر وار کرنا چاہا۔ مثلاً ابن رشد نے تہافتہ التہافہ تصنیف کی جو غزالی کی تہافتہ الفلاسفہ کے جواب میں تھی۔ لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہ پڑ سکا کیونکہ جب مطلع صاف ہوا تو معلوم ہوا کہ غزالی فتحیاب ہو چکے تھے۔ اس کے بعد یونانی فکر پر مشتمل مسلم فلسفہ اپنی توانائی کھو چکا تھا اور نیچرل سائنسز میں مسلمانوں کی دلچسپی ماند پڑ چکی تھی۔

غزالی کے علمی کام کی بنا پر انھیں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی۔ بغداد میں قائم مشہور اور انتہائی باوقار نظامیہ یونیورسٹی میں انھیں صدر کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔ یہ یونیورسٹی اپنے وقت کی Yale تھی۔ راسخ العقیدہ محکمہ نے انھیں اپنے وقت کے سب سے بڑے مذہبی صاحب منصب کی حیثیت میں تسلیم کیا۔ لیکن غزالی کے اپنے مسائل تھے۔ وہ ایک معتبر مذہبی شخصیت تھے لیکن بلند مناصب اور تحسین آفرینی کے درمیان انھیں یہ احساس تھا کہ ابھی تک وہ اصل خزانہ سے محروم ہیں۔ وحی پر انکا ایمان تھا۔ رسول اور کتاب کا احترام و محبت ان میں رچا بسا تھا۔ شریعت سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ لیکن خدا کو وہ ابھی محسوس نہیں کر رہے تھے۔ اور یہی وہ بے اطمینانی اور اضطراب تھا جس نے تصوف کو جنم دیا تھا۔ غزالی اچانک ایک روحانی انتشار کا شکار ہو گئے۔ اپنے تمام عہدوں و مناصب سے دستکش ہوئے۔ ساز و سامان چھوڑا اور تمام دوستوں و احباب سے دوری اختیار کر لی اور گوشہ نشین ہو گئے۔

جب وہ کئی ماہ بعد واپس آئے تو اعلان کیا کہ ''علماء صحیح تھے لیکن صوفیا صحیح تر تھے۔ قانون بہرحال قانون ہے اور اس کو تسلیم کرنا ہی ہے لیکن اللہ تک رسائی کے لئے کتابی علوم اور اچھے اخلاق کافی نہیں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قلوب کھلیں اور صرف صوفیا کو ہی قلوب کھولنے کا گُر معلوم ہے''۔ غزالی نے اس کے بعد پھر دو کتابیں لکھیں۔ کیمیائے سعادت اور احیاء علوم الدین جن میں انھوں نے راسخ العقیدہ دینیاتی نظریے اور تصوف کو باہم مربوط کیا اور یہ بتایا کہ شریعت اور طریقت یعنی صوفیوں کا خدا کے ساتھ یکجائی کے حصول کا طریقہ کس طرح ایک دوسرے کی معاونت کرتے ہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ غزالی سے قبل عالم اسلام میں تین فکری تحریکات ایک دوسرے کے مدِّ مقابل تھیں۔ غزالی کے بعد ان میں دو متحد ہو گئیں اور تیسری تحریک بتدریج ختم ہو گئی یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ فلسفیوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ غزالی نے انھیں غلط ثابت کر دیا ہے جس کے نتیجہ میں وہ سمٹ گئی اور بالآخر ختم ہو گئی اور نہ ہی میں یہ کہہ رہا ہوں کہ غزالی کے انھیں غلط ٹھہرانے پر عوام الناس فلسفیوں کے مخالف ہو گئے۔ عوام میں ساری مقبولیت ثبوت اور دلیل کی محتاج ہوتی ہے جبکہ فلسفہ میں کسی بات کو واضح طور پر غلط یا صحیح ثابت کیا ہی نہیں جاتا۔

میں یہ کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں بعض لوگ فلسفہ اور نیچرل سائنس سے دور رہنا چاہتے تھے۔ بعض پہلے ہی سے یہ سمجھتے تھے کہ عقل خطرناک چالوں سے لیس ہونے کی بنا پر ذہنی انتشار کا باعث ہوتی ہے۔ غزالی نے ایسے لوگوں کو وہ ہتھیار فراہم کر دیے جن کے استعمال کے نتیجہ میں ان کا عقل کے خلاف بے استدلال نقطہ نظر ذرا

باوقار نظر آنے لگا۔ اور فلسفہ وعقل کے خلاف ان کی اعلانیہ ملامت اب ہوشیاری و حاضر جوابی سے عبارت نظر آنے لگی۔

بعد کے وقتوں میں اس طرف لوگوں کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ دراصل اخلاقیات اور کردار کی صالحیت ایسے میدان ہیں جہاں ان کا اظہار مختلف رنگوں میں ہوتا ہے اور اس طرح لوگ اپنے اپنے مزاج کے مطابق ہزار ہا رویّے اختیار کر لیتے ہیں۔ بالکل مماثل اور ایک جیسا ایمان دو لوگوں کے بیچ میں بھی ممکن نہیں۔ البتہ جب حالات دگرگوں ہوں اور افکار و خیالات پر انتشار غالب ہونے لگے تو نازک خیال نفاست اور باریک بینی میں لوگوں کی دلچسپیاں ختم ہو جاتی ہیں اور ابہام و پیچیدگیوں کو برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ابہام سے پاک عقیدہ مضبوط اصولوں اور قوانین کے ارتقاء کا باعث ہوتا ہے اور معاشرتی استحکام پیدا کرتا ہے کیونکہ اس کے نتیجہ میں عوام کو مشترک اصولوں اور ایمان کے اجزاء کے ساتھ یکجا اور مربوط ہونا آسان ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ بھی نہ معلوم ہو کہ کل کیا آنے والا ہے تو ایسے میں متحد رہنا ہی ترجیح ہو جاتی ہے۔

اسی دوران لگتا ہے کہ کسی مقام پر اسلام میں عورتوں کی حیثیت میں بھی تبدیلی در آئی۔ میرا مطالعہ بتاتا ہے کہ ابتدائی دور میں مسلمان عورتیں بعد کے ادوار کے مقابلہ میں زیادہ آزاد تھیں اور ان کا عوامی رول بھی کہیں زیادہ تھا۔ بلکہ آج کے دور میں بھی عورتیں اس ابتدائی دور کے مقابلہ میں پچھڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مثلاً رسول اللہؐ کی پہلی اہلیہ خدیجہؓ ایک خاصی موثّر اور ایک کامیاب تاجر خاتون تھیں۔ سب سے چھوٹی اہلیہ عائشہؓ نے قتل عثمانؓ کے بعد ایک بڑی جماعت کی سربراہی کرتے ہوئے میدان جنگ میں بھی قیادت کی تھی۔ عورت کے اس رول پر کسی کو تعجب نہ ہوا تھا۔ ابتدائی دور کی مثالی جنگوں میں عورتیں نرسوں اور مددگار کی حیثیت کے علاوہ کبھی سیاسی حیثیت میں بھی شامل رہی تھیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جنگ یرموک میں رومیوں کے خلاف بیوہ امِ حکیم تلوار نہ ہونے پر ٹینٹ کے ایک بڑے ڈنڈے ہی سے جنگ کر رہی تھیں[۲]۔ تفصیلی بیانات میں ان خواتین کا تذکرہ بھی ملتا ہے جنھوں نے جنگوں کا آنکھوں دیکھا حال اشعار کی شکل میں محفوظ کر لیا تھا گویا اس زمانہ میں وہ آج کے جنگی نامہ نگاروں کی حیثیت سے بھی کام کر رہی تھیں۔

یقیناً خواتین ان اہم نشستوں میں موجود رہی ہونگی جن میں بعض معاشرتی معاملات پر بحث ہوئی تھی۔ کیونکہ خلیفہ عمرؓ کے ساتھ اس نوع کی ایک بحث جس میں عورتوں نے حصّہ لیا تھا تاریخ میں محفوظ ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ عمرؓ[۳] نے مدینے کے بازار کے منتظم کی حیثیت سے ایک خاتون کا تقرر کیا تھا۔ اس کے علاوہ اوائل اسلام میں عالمِ خواتین کی خاصی تعداد بہت واضح اور موثّر کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔ پہلی صدی ہجری میں حفصہ، امِ دردہ، امرہ بن عبدالرحمن اور دوسری خواتین علم حدیث میں معتبر حوالہ کی حیثیت میں ابھریں۔ بعض خطاطی کے فن میں مشہور ہوئیں۔ ان خواتین کے درس و تدریس میں عورتیں اور مرد سب ہی شریک ہوتے تھے۔ عوامی خطبات بھی ان کی سرگرمیوں کا حصہ تھے۔

ظاہر ہے کہ ان خواتین پر عوامی زندگی بند نہیں تھی۔ ان کی عوامی شناخت بھی تھی اور امتیاز بھی حاصل تھا۔ محض خاتون خانہ بنا کر رکھنا اور عوامی زندگی سے انکا دیس نکالا ایسا لگتا ہے کہ بازنطینی اور ساسانی اثرات کے پیش نظر مسلمانوں میں رائج ہوا۔ جن کی اشرافیہ میں عورتیں بلند مقام کا نشان تسلیم کی جاتیں تھیں عربوں کی اشرافیہ نے بھی اسی روایت کو اپنا لیا شاید مقصد یہ رہا ہو کہ بازنطینی اور ساسانی حکمرانوں کے ماضی کے رویوں سے یگانگت ظاہر کی جائے۔ عام عورتوں نے عوامی سطح پر اپنی پوزیشن کو غالباً چوتھی صدی ہجری یعنی ایک ہزار عیسوی میں منفی طور پر متاثر ہوتے ہوئے محسوس کیا ہوگا کیونکہ اسی دور کے علماء کی نگارشات میں صنفی رول سے متعلق بعض تاثرات سے یہی پتہ چلتا ہے۔ لیکن اصناف کے رول اور سرگرمیوں میں واضح علیحدگی کے تصورات عہد عباسی کے آخری دور میں زیادہ سامنے آئے اور وہی قوتیں جو اسلامی دانشوری کی روایت سے سائنس جیسے علوم کو نچوڑ دینے کی ذمہ دار تھیں اور جنھوں نے اخلاقی اور معاشرتی تحقیق و جستجو سے عقل کو در بدر کر دیا تھا، عورتوں کی پوزیشن کو محدود کرنے میں بھی انھیں کا رول نظر آتا ہے۔

غزالی کی احیاء علوم الدین کا چوتھائی حصہ، شادی، نکاح، خاندان اور دونوں اصناف کے لئے صحیح اور مناسب رویوں کی وضاحت پر مشتمل ہے۔ ایک باب میں وہ کہتے ہیں کہ عورت کو چاہئے کہ وہ اپنے گھر کی چہار دیواری میں رہے اور کپڑا بننے میں مصروف رہے۔ گھروں میں بہت زیادہ آنے جانے سے بچے، پڑوسیوں سے بات چیت زیادہ نہ کرے اور بس ضرورت ہی کے وقت ان سے ملنے جائے۔ شوہر کی غیر حاضری اور اس کی موجودگی میں اس کی نگہداشت کرے اور تمام معاملات میں اس کی خوشی کو ملحوظ رکھے۔ اس کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہ جائے اور اگر اجازت سے باہر جائے تو استعمال شدہ کپڑوں میں اپنے آپ کو ڈھانپ کر جائے۔۔۔ یہ خیال رکھے کہ باہر کے اجنبی اس کی آواز نہ سن لیں اور اسے پہچان نہ لیں۔۔۔۔۔ وہ ہر وقت تیار رہے کہ اس کا شوہر جب جہاں چاہے اس سے لطف اندوز ہو سکے[46]۔ غزالی نے عورتوں کے تئیں ان کے شوہروں کی ذمہ داریوں پر بھی بحث کی ہے۔ لیکن ان سب کو ملا کر دیکھیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ایک ایسی معاشرتی دنیا کا تذکرہ کر رہے ہیں کہ جس میں عوامی اور پرائیویٹ کی بڑی سخت تقسیم نافذ ہے۔ جہاں عورتوں کا تعلق پرائیویٹ اداروں سے ہے اور عوامی حلقے اور دائرے خالصتاً مردوں کے لئے مختص ہیں۔

تبدیلیوں کا خطرہ اور تشویش اور استحکام کی تمنا کے نتیجہ میں روایتی طور پر معلوم معاشرتی رویوں کی طرف نگاہ اٹھتی ہے۔ عالم اسلام میں پدرانہ نظام کی شکل میں جو روایات در آئی تھیں ان کی جڑیں عرب قبائل ہی میں نہیں بلکہ قبل از اسلام بازنطینی اور ساسانی معاشروں میں موجود تھیں۔ غزالی کے تصورات کی اثر پذیری کو اس لئے بھی موافقت ملی کہ ان کے انتقال کے بعد کی صدیاں عالم اسلام میں بڑھتے ہوئے انتشار و تشویش اور خوف و اندیشوں کا شکار ہو گئیں۔ جنھوں نے پوری تہذیبی زندگی کو بے کیفی اور سکتہ سے دوچار کر دیا تھا۔ عدم استحکام اور ناپائیداری کا یہ وقت مستقبل کے لئے بڑے زبردست خطرات اپنے ساتھ لانے والا تھا۔

باب : ۸

ترکوں کی آمد

(۱۲۰ تا ۴۸۷ھ، ۷۳۷ تا ۱۰۹۵ء)

مسلم معاشرہ میں بے چینی ،تشویش اورخوف کی وجہ کیا تھی؟ جواب سیاسی تبدیلیوں کے واقعات کے ساتھ ساتھ ان فکری تحریکات میں ملے گا جن کا تذکرہ میں نے گزشتہ صفحات میں کیا ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد کی ابتدائی دوصدیاں یا عہد عباسی تک عالم اسلام کے عوام یہ سوچنے میں حق بجانب تھے کہ وہ عالمی تہذیب کے مرکز میں رہ رہے ہیں۔ یورپی تہذیب کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ ہندوستان چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں منقسم ہو چکا تھا۔ بدھ مت سکڑ کر چین میں محدود ہو گیا تھا۔ مانا کہ Cathy یعنی قدیم چین میں Tang اور Sung خاندانوں کی حکومتوں کے دور میں شاندار نشاۃ ثانیہ دیکھنے کو ملا جس کا دور عالم وسطیٰ میں مسلمانوں کی شان وشوکت کے دور کا ہم عصر ہے۔ لیکن چین کیونکہ مسلم علاقوں مثلاً عراق اور مصر سے بہت فاصلے پر تھا اس لئے عالم وسطیٰ کو متاثر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

اگر مسلم علاقہ دنیا کا دل تھا تو یہاں اندرون میں موجود عالمی تاریخ کی قوت متحرکہ مسلمانوں کے معاشرہ اوران کی پہچان کی تکمیل اوراسے عالمگیر شناخت دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس وقت کے تمام بڑے مسائل جیسے راسخ العقیدگی اور شیعی تصورات کے آپسی اختلافات ،فلسفہ، اور دینیات کا اختلاف ،فارس نژاد اور عربوں کا مسئلہ۔۔۔۔۔ یہ سب اسی حیطہ فکر میں سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک غیر جانبدار مشاہد کہہ سکتا تھا کہ دنیا آگے بڑھ رہی ہے۔ مکہ اور مدینہ میں معجزانہ انداز میں جو کچھ ظہور پذیر ہوا اور جس طرح سے بھی ہوا وہ اتنا وقت گذر جانے کے بعد آج بھی موجود تھا بلکہ جاری تھا۔ اسلام کے اثرات نے بڑی گہرائی میں جا کر معاشروں کو تبدیل کیا تھا۔ جس کے اثرات ہر سطح پر واضح تھے۔ ہندوستان پر ہندو گرفت کمزور پڑ رہی تھی۔ افریقی سہارا میں بھی مقامی افراد اسلام کو تسلیم کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ اب بس کچھ ہی وقت میں اسلام ان علاقوں کا بھی مقدر بن جائیگا اوران علاقوں کو بھی اپنے نور سے بھر دے گا۔

لیکن عدل اور تقویٰ پر مشتمل ایک عالمگیر معاشرے اور کمیونیٹی کا قیام نہ صرف پہنچ سے باہر رہا بلکہ ہاتھوں سے پھسلنے لگا تھا۔ اپنی قوت اور اقتدار کے عروج پر پہنچنے کے بعد خلافت انتشار کا شکار ہونے لگی۔ بلکہ اگر پلٹ کر دیکھا جائے تو مورخین یہ کہیں گے کہ انتشار تو عروج پر پہنچنے سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا۔ اس کا آغاز تو عباسیوں کی کامیابی سے ہی ہو گیا تھا۔

شدید ردِعمل کے جلو میں آئی کامیابی کے نتیجہ میں عباسیوں نے بنوامیہ کے چنیدہ افراد کو بہانے سے اکٹھا کیا اور ان سب کو ختم کردیا۔ لیکن سب ختم نہ ہوسکے۔ اور ایک نوجوان اموی سردار کسی طرح سے اس پارٹی سے نکل کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ آخری اموی نوجوان جسے تاریخ عبدالرحمٰن الداخل کے نام سے جانتی ہے بھیس بدل کر دمشق سے فرار ہوا تو شمالی افریقہ کی جانب رخ کیا اور اس وقت تک سفر جاری رکھا جب تک وہ عالم اسلام کے آخری اور دور دراز نشان اندلس یعنی اسپین تک پہنچ گیا۔ مزید آگے گیا ہوتا تو مسیحی یورپ کی تاریکیاں اور وحشتیں اس کی منتظر تھیں۔

عبدالرحمٰن نے اسپین کے عوام کو متاثر کیا۔ بعض خوارج نے جو سخت گیر اور باغیانہ تیور رکھتے تھے اور چھپتے چھپاتے پھر رہے تھے عبدالرحمٰن کو اپنی تلوار کی حمایت کا یقین دلایا۔ اسپین بغداد سے بہت دور تھا اور یہاں کسی کو بغداد کی نئی حکومت کا زیادہ علم نہ تھا چنانچہ اُن سے وابستگی اور وفاداری کی بھی کوئی خاص فضا نہ تھی۔ اندلسی بنوامیہ کو صاحب اقتدار گروہ تسلیم کرتے تھے اور عبدالرحمٰن کی شکل میں ایک حقیقی اُموی موجود تھا جو اِن کی حکمرانی کے لئے آمادہ اور ان سے تعاون مانگ رہا تھا۔ عام حالات ہوتے تو عبدالرحمٰن کو زیادہ سے زیادہ اسپین کا گورنر مقرر کردیا جاتا اور وہاں کے عوام اسے تسلیم بھی کرلیتے۔ چنانچہ انھوں نے اسے اپنا رہنما تسلیم کرلیا اور اسطرح اندلس یعنی اسپین ایک آزاد اور خلافت سے علیحدہ ایک مملکت کی شکل میں ابھرا۔ اس طرح مسلمانوں کی کہانی اب دو مرکزوں سے رقم ہونے لگی تھی۔

ابتداً تو یہ محض ایک سیاسی علیحدگی تھی۔ لیکن جیسے جیسے خلافت کمزور ہوتی گئی انھوں نے اعلان کردیا کہ محض بغداد ہی سے آزاد نہیں ہیں بلکہ وہ اب خلیفہ بھی ہیں۔ چند سو میل کے اطراف لوگوں نے کہا ''جی جناب آپ یقیناً خلیفۃ المسلمین ہیں۔ آپ کے چہرہ مہرہ کو دیکھ کر ہر کوئی یہی کہے گا۔ اس طرح خود خلافت جو کسی حد تک ایمان پر مشتمل ایک واحد عالمی نوعیت کی جماعت تھی اب دو حصّوں میں تقسیم ہوگئی۔

بنوامیہ کا یہ دعویٰ کسی حد تک وزن رکھتا تھا کیونکہ اندلس کا دارالسلطنت قرطبہ دور دراز یورپ کا عظیم ترین شہر تھا۔ اپنے عروج میں اس کی آبادی نصف ملین افراد پر مشتمل تھی۔ جس میں سینکڑوں حمام، ہسپتال، اسکول، مساجد، اور دوسری عوامی استعمال کی عمارتیں پائی جاتی تھیں۔ قرطبہ کی سب سے بڑی لائبریری میں پانچ لاکھ کتابیں تھیں۔ اسپین میں دوسری شہری آبادیاں بھی تھیں جن میں بیک وقت پچاس ہزار نفوس رہتے تھے جبکہ مسیحی یورپ کی کوئی آبادی، پچیس ہزار افراد سے زیادہ نہ تھی۔ اب عظیم روم محض ایک گاؤں جیسا تھا اوہائیو کے شہر ڈائی ٹن سے بھی چھوٹا جہاں کسان اور اوباش قسم کے لوگ رہتے اور تباہ شدہ علاقوں سے اپنی روزی روٹی کا انتظام کرتے تھے۔

سیاسی تقسیم نے ابتداء میں تو تہذیبی ترقی کی رفتار کو متاثر نہیں کیا۔ اندلس دوسری مہذب دنیا کے ساتھ گہرے اور مضبوط تجارتی رشتوں میں بندھا ہوا تھا۔ یہاں سے لکڑی، اناج، معدنیات اور دوسرا خام مال بحراوقیانوس کے پار شمالی افریقہ اور عالمی وسطیٰ جاتا اور وہاں سے دستکاری سے تیار شدہ سامانِ تعیش، چینی کے

برتن، فرنیچر، قیمتی کپڑے، گرم مسالے وغیرہ اندلس سے آتے۔

عیسائی ممالک اس کے مقابلہ میں شمالی اور مشرقی ممالک کے ساتھ برائے نام ہی تجارت کرتے تھے۔ اس کی وجہ کوئی آپسی مخاصمت اور دشمنی نہ تھی بلکہ سچ بات یہ ہے کہ ان ممالک کے پاس نہ تو ایسی چیزیں پیدا ہوتیں یا بنتی تھیں کہ دوسرے ممالک انھیں خریدیں اور دوسری طرف ان کے پاس اتنا سرمایہ بھی نہ تھا کہ دوسرے ممالک سے سامان خرید سکیں۔

اندلس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن بہت سے عیسائی اور یہودی بھی آباد تھے۔ مسلم اسپین اور بغداد کی خلافت میں مخاصمت تھی لیکن ان کی پالیسیاں اور معاشرت ویسی ہی تھیں جیسی دوسرے مفتوحہ مسلم علاقوں میں پائی جاتی تھیں۔ عیسائی اور یہودی آبادی کو اپنے اپنے مذہبی ادارے، نظام عدل اور اپنی رسوم ورواج پر عمل کی مکمل آزادی تھی۔ اگر ان میں سے کسی کا کسی مسلم کے ساتھ جھگڑا ہو جاتا تو فیصلہ اسلامی عدالت میں ہوتا اور مسلم حاکم اسے حل کرتا لیکن ان کے آپسی جھگڑے خود ان کی اپنی عدلیہ ان کے اصول وقوانین کے تحت کراتی۔

غیر مسلم جزیہ ادا کرتے تھے لیکن ان پر زکوٰۃ واجب نہ تھی اور نہ ہی فوجی خدمات ضروری تھیں اور مزید یہ کہ سب سے بڑی سیاسی پوزیشن کے بھی وہ اہل نہیں تھے۔ لیکن اس کے علاوہ باقی تمام ذمہ داریوں کے لئے دروازے کھلے ہوئے تھے اور وہ کوئی بھی پیشہ اپنا سکتے تھے۔ عیسائی مسلمان اور یہودی خاصی یگانگت اور آپسی تال میل کے ساتھ رہتے۔ بس سیاست میں سب سے بڑی پوزیشن ان کے لئے نہ تھی اور شاید مسلمانوں کا رویہ احساس برتری سے عبارت تھا۔ غالباً مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ ان کی تہذیب اور ثقافت اور ارتقاء تہذیب کے بلند ترین مقام پر ہے۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ آج امریکی اور مغربی یورپ کے لوگ تیسری دنیا کے لوگوں کے ساتھ برتاؤ کرتے ہیں۔

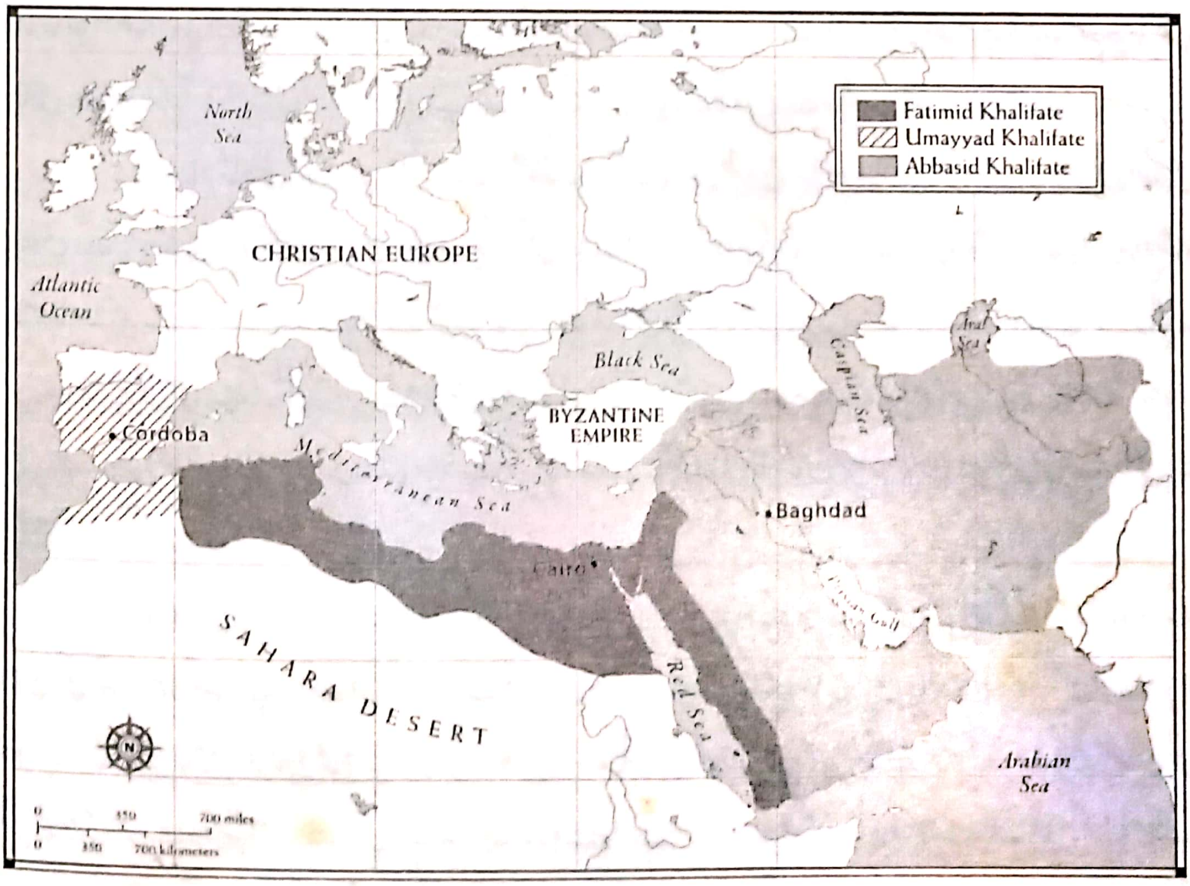
سانچو بادشاہ کی کہانی یہ بتاتی ہے کہ مختلف قومیتیں کس طرح ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ دسویں صدی عیسوی کے آخر میں شمالی اسپین کے عیسائیوں پر مشتمل ایک علاقے لیون کی بادشاہت سانچو کو ملی۔ رعایا اس بادشاہ کو موٹا سانچو کے نام سے موسوم کرنے لگی۔ ظاہر ہے کہ کوئی بادشاہ اس طرح کے لقب کو پسند نہیں کرے گا۔ غریب سانچو کو ممکن ہے کہ طبّی تعبیر کے مطابق موٹا کہا جاسکتا ہو لیکن باشاہت کے سردار اس وسیع مفہوم کو تسلیم نہ کر سکے۔ بلکہ انھوں نے سانچو کی اس ساخت کو کسی اندرونی کمزوری کا نشان قرار دیکر اسے حکمرانی کے لائق نہ سمجھتے ہوئے تخت سے محروم کر دیا۔

اسی دوران سانچو کو ایک یہودی حکیم جسدائی بن سریوت کے بارے میں علم ہوا کہ وہ موٹاپے کے علاج کی قدرت رکھتا ہے۔ جسدائی قرطبہ کے حکمران کا ملازم تھا۔ چنانچہ سانچو اپنی والدہ اور لواحقین کے ہمراہ جنوب کے لئے عازم سفر ہوا کہ اپنے مرض کا علاج کرا سکے۔ مسلم حکمراں عبدالرحمن سوئم نے سانچو کو مہمان کی طرح بڑی عزت واحترام سے خوش آمدید کہا۔ اور اسے اپنے ساتھ اپنے محل میں اسوقت تک قیام کرایا جبتک جسدائی نے اس کے بدن کو نچوڑ نہ دیا۔ جس کے بعد سانچو لیون واپس آگیا اور دوبارہ تاج پہنا اور عبدالرحمن سوئم کے ساتھ دوستی کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔[1]

ایک مسلمان حکمراں کے یہاں ایک عیسائی بادشاہ کا علاج ایک یہودی معالج کے ذریعہ ہوا۔ بس مسلم اسپین کی یہی مختصر کہانی ہے۔ جب یورپ کے لوگ اسلام کے عہدِ زرّیں کی بات کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں خلافت اسپین ہی ہوتی ہے۔ اسپین کے یورپ کا حصّہ ہونے کی بنا پر ان کی واقفیت اسی ملک کی تاریخ سے زیادہ ہوتی ہے۔

لیکن بغداد کے مقابلہ کا شہر صرف قرطبہ ہی نہ تھا۔ دسویں صدی میں ایک اور شہر پنپنے لگا تھا جو عباسی خلافت کی عظمت اور برتری کو چیلنج کر رہا تھا۔ جب عباسی خلفاء نے سنی اسلام کو اپنانے کا اعلان کیا تو فطری طور پر شیعی اختلاف اور ان کا بغاوتی رنگ ابھرنے لگا۔ اور ۳۴۷ھ (۹۶۹ء) میں ٹیونیشیا کے شیعی جنگجوؤں نے مصر پر اقتدار سنبھال لیا اور خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس دعوئ میں یوں جان پڑ گئی کہ وہ رسول اللہؐ کی بیٹی فاطمہؓ کی نسل سے تھے اور اسی بنا پر وہ فاطمی ہی کہلائے۔ ان کے حکمرانوں نے اپنے لئے ایک بالکل نیا دار الخلافہ تعمیر کیا جسے قاہرہ کہا گیا۔ عربی میں اس کے معنی فتح کے ہوتے ہیں۔ آج مغرب میں اس شہر کو Cairo کہتے ہیں۔

مصری خلافت کو شمالی افریقہ کے وسائل اور دریائے نیل کی زرخیزی میسّر تھی اور بحر اوقیانوس کے ذریعہ ہونے والی تجارت پر کنٹرول کے لئے جغرافیائی اعتبار سے انھیں فوقیت حاصل تھی۔ اور بحر احمر کے راستہ یمن تک پھیلے ہوئے علاقے پر وہی غالب تھے اور اس طرح ان کے اثرات بحر ھند تک پھیلے ہوئے تھے۔ ایک ہزار عیسوی تک قاہرہ، بغداد اور قرطبہ کو بھی مات دے چکا تھا۔



تین خلافتیں

قاہرہ میں فاطمیوں نے دنیا کی اولین یونیورسٹی الازہر قائم کی جو آج تک قائم ہے اور روبہ ترقی ہے۔ ابھی تک میں نے دوسری دو خلافتوں کے بڑے شہروں، انتہائی معروف بازاروں، آزاد پالیسیوں اور بہت سی کلچرل اور علمی وفکری سرگرمیوں کے بارے میں جو کچھ بیان کیا وہ اس خلافت کے لئے بھی صحیح ہے۔ مالی اعتبار سے مضبوط تو تھی ہی، خلافت مصر مذکورہ عالمی سطح کی ایک متحدہ ثقافت اور تہذیب و معاشرت میں ایک اور تقسیم کی نمائندگی کرتی تھی۔ چنانچہ ہزار عیسوی آتے آتے یہ عالمی کمیونٹی تین حصّوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔

ہر خلافت اپنے آپ کو ہی واحد اور صحیح خلافت ہونے کا دعویٰ کرتی تھی۔ خلافت کی اصطلاح میں ''واحد اور صرف'' کا تصور تو صحیح ہے لیکن خلیفہ حقیقتاً اب سیکولر بادشاہ بن چکے تھے۔ چنانچہ 'واحد اور صرف' کا دعویٰ کرنے کے باوجود یہ تینوں خلافتیں وسیع سیکولر حکومتوں کی طرح قائم رہیں۔

پہلے پہل تو عباسیوں کے پاس سب سے زیادہ وسیع وعریض علاقہ تھا اور ان کا دارالخلافہ بھی امیر ترین تھا۔ لیکن وسیع وعریض ہونے کی بنا پر جو انتظامی مسائل ہوتے ہیں انھوں نے ان تین خلافتوں میں اسے کمزورترین کر دیا تھا۔ جیسے روم پھیلتے پھیلتے اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ اس کا انتظام ایک حکمراں کے بس میں نہیں رہا تھا۔ یہی حال خلافت عباسیہ کا بھی ہو گیا تھا۔ خلافت کے احکام کی بجا آوری کے لئے جو ایک بڑی افسر شاہی وجود میں آگئی تھی وہ بتدریج مستقل شکل اختیار کر گئی اور خلافت اس مشنری کے سایہ میں دب گئی اور آہستہ آہستہ یہ عوام کی نظر سے اوجھل ہو گئی۔

رومن بادشاہوں کی طرح، عباسی خلفاء نے بھی اپنے آپ کو محافظ دستوں میں محصور کر لیا تھا۔ روم میں یہ محافظ دستے Proctorian Guard کہلاتے تھے۔ جن میں بڑی تعداد اُن جرمن لوگوں کی تھی جو شمالی سرحدی علاقوں کے وحشی لوگوں میں سے بھرتی کئے گئے تھے۔ انھیں وحشیوں سے رومن صدیوں سے جنگ آزما رہے تھے اور یہ مہذب علاقوں اور آبادیوں کے لئے مستقل خطرہ بنے رہتے تھے۔

عباسی خلافت میں یہی سب کچھ ہوا۔ ان کے یہاں شاہی محافظین مملوک کہلاتے جس کے معنی ہوتے ہیں غلام۔ یہ عام طور پر غلام نہیں تھے بلکہ بلند درجہ پر فائز جنگجو غلام تھے۔ اہل روم کی طرح عباسی خلافت کو بھی اس کی شمالی سرحدوں میں بسنے والے وحشیوں سے خطرہ لاحق تھا۔ مغربی ممالک میں شمالی علاقوں کے یہ وحشی جرمن نسل کے تھے۔ جبکہ عباسیوں کے لئے یہ ترک نسل کے تھے۔ (آج کے ترکی میں اس وقت ترک نہ تھے بلکہ اس علاقہ میں کافی عرصہ کے بعد جا کر آباد ہوئے۔ ان کا آبائی وطن وسط ایشیا میں شمالی ایران وافغانستان کے میدان تھے)۔ جیسا کہ رومیوں نے جرمنوں کے ساتھ کیا اسی طرح عباسیوں نے ان میں سے کچھ ترکوں کو غلام بازاروں سے خرید کر اپنے یہاں لا کر رکھا اور انھیں باڈی گارڈ کی حیثیت میں مقرر کیا۔ ایسا اس لئے کیا گیا کہ خلیفہ کو عربوں اور ایرانیوں پر جن کے درمیان وہ رہتا تھا اب اعتماد نہیں رہا تھا۔ کیونکہ لوگ مقامی تھے اور ان کی جڑیں گہری تھیں، رشتہ داریاں تھیں اور بہت سے ایسے مفادات بھی تھے جن کے لئے وہ کام کرتے یا کر سکتے تھے۔ خلیفہ ایسے محافظ چاہتا تھا جن کا مقامی لوگوں میں کسی سے تعلق نہ ہو اور جن کی وفاداریاں صرف اور صرف خلیفہ تک

ہی محدود ہوں۔ان کا گھر بھی صرف دربار تک محدود ہو اور صرف مالکوں ہی کے وفادار بھی رہیں۔چنانچہ غلام بچوں کو خرید کر لایا گیا۔ان بچوں کی مسلمانوں کی طرح پرورش اور خصوصی مدرسوں میں ان کی عسکری تربیت کی جاگئی۔یہ بچے جب بڑے ہوتے تو ایک خصوصی دستہ میں بھرتی کر لئے جاتے جو خلیفہ کی پہچان بن گیا تھا۔اور اب کیونکہ خلیفہ بالعموم عوام کو نظر نہیں آتا تھا اس لئے یہ محافظین ہی زیادہ تر لوگوں کے لئے خلیفہ کا چہرہ بھی بن گئے تھے۔

یقیناً وہ مغرور، متشدّد اور لالچی تھے کیونکہ ایسے ہی ان کی تربیت کی گئی تھی۔خلیفہ کی حفاظت کرنے کے دوران انھوں نے عوام اور خلیفہ میں فاصلہ پیدا کر دیا تھا۔انکی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے خلیفہ اپنے عوام میں غیر مقبول ہوتا گیا اور نتیجتاً محافظوں کی ضرورت اور بڑھ گئی اور ایک وقت وہ آیا کہ خلیفہ کو ان تکلیف دہ مملوک محافظوں سے عوام کو علیحدہ رکھنے کے لئے ایک نیا شہر سامرہ، صرف انھیں کے لئے بسانا پڑا اور وہ خود بھی انھیں کے درمیان رہنے لگا۔

اُسی دوران ایک فارسی خاندان بنام بُوائد نے دربارِ خلافت کا قرب حاصل کرلیا اور خلیفہ کے مشیروں میں رسائی حاصل کر لی اور بتدریج کلرک، معاون اور مددگار کی حیثیت میں شامل ہوگئے اور جلد ہی افسر شاہی کو کنٹرول کر کے حکومت کے روزمرہ کے معاملات میں دخیل ہوگئے۔وزات یعنی مملکت کے اعلیٰ ترین منتظم کا عہدہ موروثی تسلیم کرالیا جو باپ سے بیٹے کو منتقل ہونے لگا۔کچھ اسی طرح کی صورتحال یورپ کی جرمن سلطنت میں بھی پیدا ہوئی تھی جہاں شاہی محل کا بڑا آفیسر مملکت کی حکمرانی کرنے لگا تھا۔خلفاء کی طرح بوائد بھی ترکوں کے بچوں کو خرید کر بغداد لائے اور ان کی تربیت کا انتظام کیا۔بڑی بڑی رہائشگاہوں میں یہ بچے رہتے اور ان پر پورا کنٹرول بوائد کا ہی ہوتا۔بالآخر یہ بچے بڑے ہوکر بوائد کے ذاتی محافظوں میں شامل ہوجاتے۔ایک بار جب بوائد نے اپنا ایک نظام ترتیب دے لیا تو کسی کو مخالفت کی ہمت نہ ہوسکی۔یہ ترک نسل کیونکہ بچپن ہی سے یہاں آباد ہوگئی تھی تو ان کو اپنے والدین، اقربا اور بھائی بہنوں کا کوئی علم نہ تھا۔ان کی تمام فرمانبرداریاں، وفاداریاں اور محبتیں سب انھیں لوگوں سے وابستہ تھیں جن کے ساتھ رہ کر یہ پلے بڑھے تھے یا ان کے ساتھ تھیں جو انھیں کنٹرول کرتے اور ان کی تربیت کرتے تھے۔اس طرح اسلامی معاشرت میں بوائد ایک اور موروثی سلسلہ بن گیا۔ خلیفہ محل میں رہتا اور اس کے نام سے حکمنامے یہ لوگ جاری کرتے اور اس طرح دربار اور تاج کے زیرسایہ پرتعیش اور بااثر زندگی گذارتے۔عرب خلافت کے دارالسلطنت میں اس طرح اہل فارس کی حکمرانی ہوگئی۔

یہ فارسی وزراء مملکت کے دوسرے علاقوں پر تو حکمرانی نہیں کر سکتے تھے بلکہ شاید انھیں اس کی کوئی پرواہ بھی نہ تھی۔وہ مطمئن تھے کہ مقامی آبادی رؤسا و اشرافیہ بغداد سے دور ہی رہیں۔وہ چاہے کتنے ہی طاقتور ہوجائیں اس کی انھیں پرواہ نہ تھی۔چنانچہ دور دراز صوبوں کے گورنر چھوٹے موٹے بادشاہوں کی طرح رہنے لگے۔اور اہل فارس کی چھوٹی چھوٹی موروثی حکمرانیاں ماضی کی ساسانی قلمرو میں پھیل گئیں۔

آپ سوچ سکتے ہیں کہ غلاموں کو قاتل بنانے کی تربیت دینا، انھیں ہتھیار فراہم کرنا اور پھر انھیں رہائش کے دروازوں کے باہر تعینات کرنا کتنی خرابیوں کا باعث ہوگا اور ان کے پیش نظر کسی کو بھی ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا۔لیکن اس علاقے میں ہر ایک نے ایسا ہی کیا۔اہل فارس کا ہر وہ چھوٹا علاقہ جو مرکز سے علیحدگی اختیار کرلیتا وہ ترکی مملوک

کا دستہ مہیا کر لیتا جو مملکت کی حفاظت کرتے اور پھر بالآخر فارسی بادشاہ کو بھی کنٹرول کرنے لگتے۔

محض اتنا ہی نہیں پوری بادشاہت کو ترک وحشیوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا کہ وہ مہذب آبادیوں کے علاقوں میں داخل ہو کر فساد اور بربادیوں کا سلسلہ شروع نہ کر سکیں۔ بالکل اسی طرح جیسے رومی جرمن وحشیوں کو دور رکھنے کی جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ بالآخر ترک بحیثیت مجموعی اتنے طاقت ور ہو گئے کہ اندرون اور بیرونِ خلافت انھیں دبایا نہ جا سکا۔ بعض دور دراز کی چھوٹی چھوٹی مملکتوں میں اپنے مالکوں کو قتل کر کے ترک مملوکوں نے خود اپنی خاندانی حکومتیں قائم کر لیں۔

اسی دوران جبکہ سلطنت کمزور ہو رہی تھی اور معاشرہ بکھر رہا تھا وحشیوں نے شمالی سرحدوں میں دخل اندازی شروع کر دی۔ بالکل اسی طرح جرمن وحشیوں نے دریائے Rhine پار کر کے رومی علاقوں میں داخل ہو کر انھیں تاراج کیا تھا۔ وحشی ترک تھوڑا تھوڑا کر کے جنوبی علاقوں میں آئے اور آہستہ آہستہ ان کی تعداد بڑھنے لگی۔ یہ لوگ بہت سخت جنگجو تھے۔ نئے نئے اسلام میں داخل ہونے اور اپنے سادہ سے اکھڑ پن میں بڑے سخت گیر تھے۔ تباہ و برباد کرنا ان کا طرز حیات تھا شہروں کو تاراج کرتے اور فصلوں کو برباد کرتے۔ شاہراہیں غیر محفوظ ہو گئیں۔ ڈاکوؤں کی جز وقتی ٹیمیں عام ہو گئیں۔ تجارت کم ہو گئی اور غربت وافلاس عام ہو گیا۔ ترک مملوک ان ترک قبائیلیوں سے سخت جنگیں کرتے رہے۔ یوں ہر طرف ترک طاقت ہی زیر جنگ تھی۔ غزالی کے زمانے میں پوری سلطنت میں انھیں وجوہات اور اسی ماحول کی بنا پر عوام میں بے اطمینانی، خوف اور ذہنی انتشار بڑھ گیا تھا۔

البتہ دور کناروں پر روشنی کی ایک کرن ضرور نظر آ رہی تھی اور یہ تھی سامانیوں (Samanids) کی فارسی نسل کی حکومت۔ یہ آمو دریا (دریائے (جیجون) کے دونوں کناروں پر آباد شہروں سے وسعت پذیر تھی اور آج کے افغانستان کی شمالی سرحد تھی۔ اس سلطنت کے عظیم شہروں بلخ اور بُخارا میں قدیم فارس کا ادبی کلچر از سرِ نو ارتقاء پذیر تھا اور زبان فارسی ایک علمی زبان کی حیثیت سے اب عربی کا مقابلہ کرنے لگی تھی۔

لیکن سامانیوں نے بھی مملوک رکھے تھے۔ ان میں سے ایک مملوک جرنیل نے یہ طے کر لیا کہ وہ اب حکم سنے گا نہیں بلکہ احکامات جاری کیا کریگا۔ چنانچہ سامانیوں کو تاریخ نے خیر باد کہا اور غزنویوں کو خوش آمدید۔ یہ نئے حکمران غزنوی کہلائے کیونکہ انھوں نے کابل کے جنوب مشرق میں واقع شہر غزنی کو اپنا دارالسلطنت بنایا تھا۔ غزنوی سلطنت کو اپنا عروج درازِ عمر فاتح محمود کے زمانے میں دیکھنے کو ملا جسے بجا طور پر اسلامی مشرق کا شارلمان کہا جا سکتا ہے۔ محمود کے انتقال کے وقت اس کی سلطنت ایک طرف کیسپین تو دوسری طرف دریائے سندھ تک پھیل چکی تھی۔ جس طرح شارلمان اپنے آپ کو سب سے بڑھ کر عیسائی فرمانروا'' گردانتا تھا اسی طرح محمود کا بھی اپنے بارے میں ''سب سے بڑھکر مسلمان فرمانروا'' ہونے کا احساس تھا۔ اس نے خود کو عالم اسلام کے معاون حکمران کی حیثیت دے رکھی تھی۔ اور سلطان کا خطاب اختیار کیا تھا جس کے معنی فوجی قوت کے اعتبار سے دایاں ہاتھ کے ہیں۔ اس کے خیال میں عربی خلیفہ کو ابھی تک امت مسلمہ کے روحانی باپ کی حیثیت حاصل

تھی۔لیکن اس کے باوجود محمود ایک اہم فوجی لیڈر بھی تھا جو نافذ کنندہ یعنی نافذ کرنا بھی جانتا تھا۔اس کے وقت سے بیسیویں صدی تک عالم اسلام میں کم از کم ایک سلطان ضرور رہا ہے۔

خود سلطان محمود کی صلاحیتیں اتنی تھیں کہ وہ اپنے شاہی دربار میں ایسے تعلیم یافتہ فارسیوں کو ملازم رکھتا جو پڑھ لکھ سکتے ہوں۔اس نے اہل علم کے لئے بڑے بڑے انعامات کا اعلان کر رکھا تھا جس کے نتیجہ میں کوئی نوسو شعراء، مورخ، ماہرین دینیات، فلسفی اور دوسرے علماء اس کے دربار سے وابستہ ہو گئے تھے۔جس سے اس کی عزت واحترام میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

ان میں ایک عالم فردوسی بھی تھا جو اس وقت شاہنامہ لکھ رہا تھا جس میں بالکل ابتداء سے آمد اسلام تک اہل فارس کی شعری زبان میں رزمیہ تاریخ بیان کی جانے والی تھی۔محمود نے اس سے بڑا ہی بیش قیمت وعدہ کیا کہ جب وہ اس نظم کو مکمل کر لیگا تو اسے ایک شعر کے عوض سونے کا ایک ٹکڑا بطور انعام دیگا۔جب فردوسی نے ایک فرد واحد کے ذریعہ تصنیف کردہ اس وقت کی سب سے بڑی نظم سلطان کے سامنے پیش کی تو ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل تھی۔یہ دیکھ کر سلطان کو غصہ آ گیا اور پوچھا کہ کیا میں نے سونا کہا تھا؟ میرا مطلب چاندی تھا۔ یعنی ایک شعر کے عوض ایک ٹکڑا چاندی۔'' رنجیدہ فردوسی دربار سے جلد ہی اٹھ گیا اور اپنی یہ طویل نظم دوسرے حکمرانوں کو پیش کی۔روایت ہے کہ جب سلطان محمود کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اپنے غلاموں کو ایک گاڑی سونے سے بھر کر فردوسی کے یہاں بھیجا لیکن جب یہ لوگ اس کے خاص دروازے تک پہنچے تو فردوسی کا انتقال ہو چکا تھا اور لوگ اسے تدفین کے لئے لے جا رہے تھے[۲]۔

شاہنامہ دو داستانوی بھائیوں اور ان کی اولاد کے درمیان کشمکش کی داستان ہے جن میں ایک کا نام ایران اور دوسرا توران کے نام سے مشہور تھا۔عموماً ایسا سمجھا جاتا ہے کہ یہ دونوں اہل فارس اور ترکوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ایران شریف النفس تھا جبکہ توران شریر۔چنانچہ اس میں کوئی تعجب نہیں کہ شاہنامہ آج ایران کا فوجی رزمیہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور میرے خیال میں محمود نے انعام کے طور پر سونا دینے میں جس تکلف کا اظہار کیا تھا اس کی وجہ نیت میں کمزوری نہ رہی ہوگی بلکہ محمود خود کیونکہ ترک تھا اسے شاید اچھا نہ لگا ہو کہ ترکوں کو تاریخ کے شریروں کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔

فردوسی نے عربوں کے خلاف بھی نفرت کا اظہار کیا تھا اور خاصے اشعار ان کی ابتدائی دور کی بربریت کے بیان کے لئے مخصوص کئے تھے۔ان کے مقابلہ میں اسلام کی آمد پر اہل فارس کی تہذیب وثقافت کی بڑی تحسین کی تھی۔شاہنامہ سے عربوں کی گرتی ہوئی ساکھ کے ساتھ ساتھ اسلام میں اہل فارس کی تہذیب وثقافت کی قدر افزائی اور بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔صحیح بات یہ ہے کہ عربوں کے تئیں فردوسی کا رویہ کچھ مخصوص نہ تھا بلکہ اس عہد کے ایک دوسرے شاعر نے بھی کچھ ایسا ہی لکھا ہے۔

''عرب جس زمانہ میں اپنی بنجر زمینوں میں جھینگر کھاتے تھے مشہد شہر میں کتوں کو پینے کے لئے برف کا پانی میسر تھا''[۳]۔

سلطان محمود فنون لطیفہ کی سرپرستی ہی میں اوّل نہیں تھا بلکہ وہ اس بات پر بھی فخر کرتا تھا کہ اس نے متعدد ہندو مندروں کو تہس نہس کر دیا تھا اور اس طرح کیا تھا کہ کثیر تعداد میں ان سے وابستہ خزائن اس کے ہاتھ لگے تھے۔ اس لوٹ کو وہ اپنے وطن لایا اور شہر غزنی کی سجاوٹ کے لئے اسے استعمال کیا۔ نوسو ماہرین فن وادب جو اس نے دربار سے وابستہ کرر کھے تھے ان کی سرپرستی میں خرچ کیا۔ ہندوستان پر حملے اور ہندوؤں کے قتل عام کی وجہ سے اس کے خیال میں وہ عالم اسلام کا ہیرو بن گیا تھا۔

محمود کے بیٹے مسعود نے دریائے ہلمند کے کنارے سردیوں کے زمانہ کے لئے دارالخلافہ تیار کیا۔ یہ جگہ میرے اپنے بچپن کے شہر لشکر گاہ سے کوئی ایک میل دریا کے کنارے رہی ہوگی۔ بڑے ہوتے ہوئے میں اکثر سوچتا کہ مسعود نے دریا کے درمیان واقع اس جنگلی جزیرہ پر ہرنوں کا شکار کیا ہوگا جس میں میں اور میرے ہم عمر گھومتے پھرتے تھے۔ میرے وقتوں میں ان جنگلوں میں جنگلی بلّیاں، گیدڑ اور جنگلی سور بھی آبسے تھے۔

مسعود جسامت کے اعتبار سے زبردست تھا۔ گھوڑوں کے لئے وہ بہت بھاری پڑتا تھا۔ اس لئے عام طور پر وہ ہاتھی کی سواری کرتا تھا۔ جن کے لیے دریائے ہلمند کے کنارے دلدلی زمین میں اُگنے والے بانسوں کے سلسلہ میں باڑے بنائے گئے تھے۔ سمجھنے میں غلطی نہ ہو۔ اس کی جسامت بازوؤں میں سمٹ آئی تھی اور جنگ کے لئے وہ صرف تلوار ہی لے کر جاتا تھا جو اتنی بھاری تھی کہ اسے صرف وہی اٹھا سکتا تھا اور ایک اتنی ہی بڑی اور بھاری کلہاڑی بھی ہوتی تھی جسے اٹھانا کسی اور کے بس میں نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عظیم سلطان محمود بھی اپنے اس بیٹے سے ڈرتا تھا۔

جب باپ کا انتقال ہوا تو مسعود اس وقت بغداد میں تھا۔ درباریوں نے اس کے بھائی کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ مسعود یہ سن کر بہت جلد ایک فوجی جتھا اکٹھا کرتے ہوئے واپس آیا اور بلا تاخیر اسے تخت سے اتار کر اس کی دونوں آنکھیں نکلوا دیں تاکہ آئندہ ایسی کوئی غلطی کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔ مسعود نے سلطنت کی زمام سنبھالی اور اپنے والد کی طرح فنون لطیفہ اور جنگ کو ایک موثر ثقافتی مظہر کی طرح پیش کیا جس میں شان وشوکت کے ساتھ سیم وزر اور خون آشامی بھی تھی۔ اس وقت شاید ایسا لگتا ہوگا کہ اس سلطنت کو کبھی زوال نہ ہوگا۔

لیکن مسعود کے دور میں چار بار اوغز (Oghuz) قبائل شمال کی جانب سے دریائے ہلمند کے پار غزنوی سلطنت پر حملہ آور ہوئے۔ سلجوقی خاندان کی قیادت میں یہ خراسان تک پہنچے۔ تین بار سلطان مسعود نے باہر نکل کر انھیں شکست دی لیکن چوتھی بار اس کی فوج کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۰۴۰ء میں لشکر گاہ اور مغربی علاقے سلجوقیوں کے قبضے میں چلے گئے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مسعود کس جسامت اور قامت کا جنگجو تھا چنانچہ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اس کی فوجوں کو شکست دینے والے کس معیار کے رہے ہونگے۔ شکست خوردہ مسعود پسپائی اختیار کر کے اپنے والد کے بسائے ہوئے شہر میں حکومت کے خاتمہ تک رہا۔ لیکن غزنوی دور کی شان وشوکت اب کہاں؟ سلجوقی آچکے تھے۔

سلجوقی مغرب کی سمت بڑھے اور سلطنت بغداد کو کاٹ کاٹ کر چھوٹا کرتے رہے۔ یہ سلجوقی سردار لکھنے

پڑھنے والے نہ تھے اور نہ ہی اس میں انھیں کوئی دلچسپی تھی۔ لیکن ایک مضبوط وتوانا تلوار زن اتنا تو سونا اکٹھا کر ہی سکتا تھا کہ اس کے عوض سو کلرکوں کی خدمات حاصل کر لے اور وہ اس کے لئے پڑھنے لکھنے کا ضروری کام کر دیا کریں۔ شہر تاراج ہوئے، لوگوں سے رقومات حاصل کی گئیں لیکن رہائش کے لئے انھوں نے ٹینٹ کو ترجیح دی۔ جنھیں ایستادہ کرنے میں ایک مستقل زیر سفر گروہ کے لئے جتنی شان وشوکت ممکن تھی انھوں نے اس کا استعمال کیا۔ اس دوران اپنے بڑے شہروں میں شاندار تعمیرات بھی کرائیں۔ سرحدوں سے نکل آنے کے بعد انھوں نے اپنے اس مذہب کو بھی خیر باد کہہ دیا جو جادوگری جیسی روایتوں پر مشتمل تھا۔ انھوں نے اسلام قبول کیا لیکن یہ کام چلاؤ قسم کا اسلام تھا عقائد اور اخلاقی تعلیمات سے زیادہ لینا دینا نہ تھا۔ یہ اسلام ایسا تھا کہ جب اپنے لوگ اور دوسرے لوگوں کا امتیاز کرنا ہو تو اس کی رٹ لگائی جا سکے۔

۱۰۵۳ عیسوی میں ایک نوجوان سلجوقی شہزادہ کو صوبہ خراسان کا گورنر بنا کر بھیجا گیا جس کا نام الپ رسلان یعنی بہادر شیر تھا اور اس کے فوجی دستہ کے سپاہی بھی اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ الپ ارسلان اپنے ساتھ اپنے فارسی سکریٹری کو بھی لے گیا جو کچھ عرصہ بعد نظام الملک کے نام سے مشہور ہونے والا تھا۔ الپ ارسلان جب کسی بھیڑ میں کھڑا ہوتا تو نہ صرف اپنے چھ فٹ سے زیادہ قد کی بنا پر بلکہ اپنی طویل مونچھوں کی بنا پر بھی پہچان لیا جاتا تھا۔ اس کی مونچھیں اتنی طویل تھیں کہ وہ انھیں اپنے شانوں پر ڈال لیا کرتا تھا۔ اور اس طرح جب وہ اپنے سفید گھوڑے پر سواری کرتا اور اسے تیز رفتاری سے دوڑاتا تو اس کی یہ لمبی اڑتی ہوئی مونچھیں لہراتے ہوئے لگام نما جھنڈے محسوس ہوتے۔

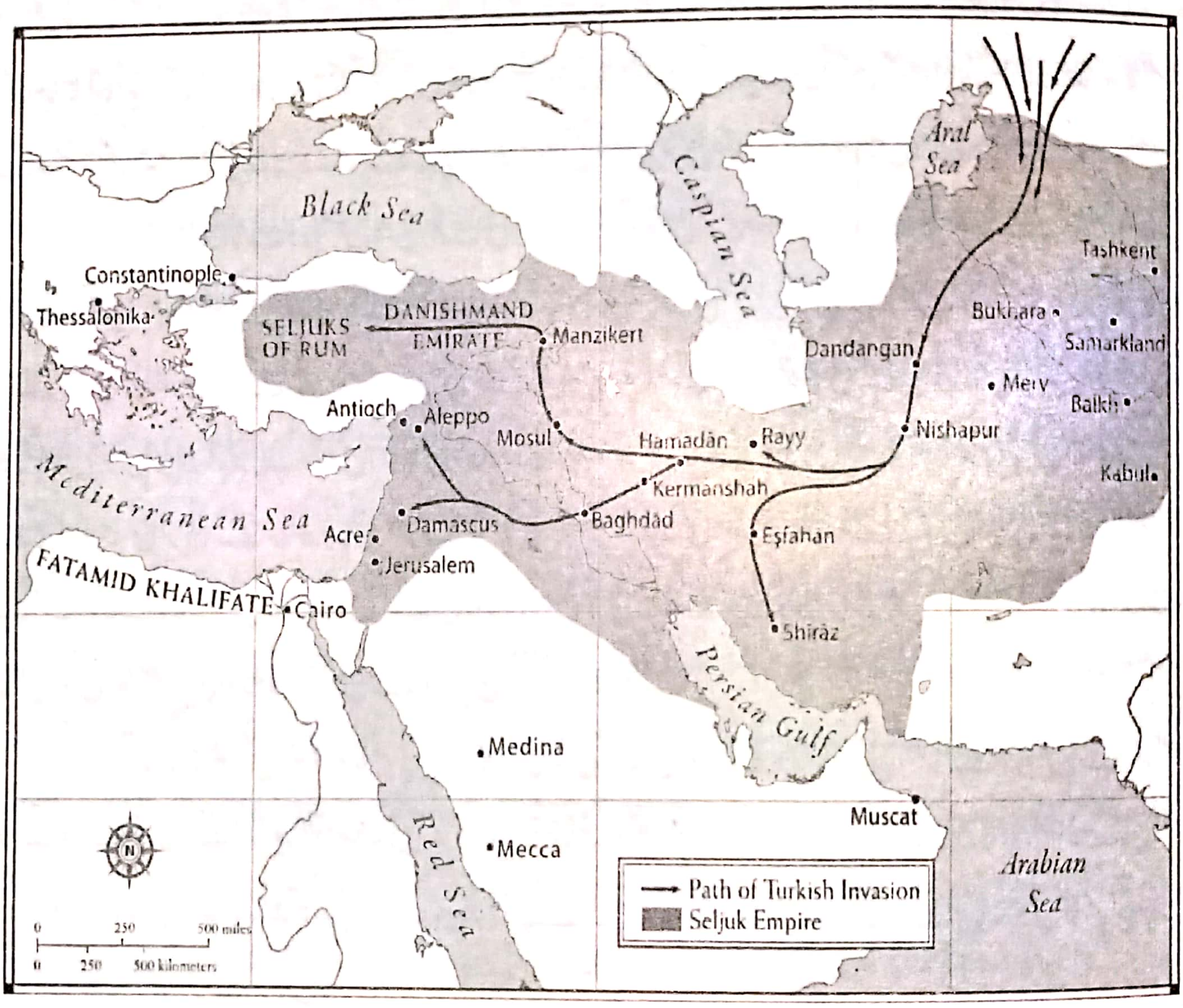
فارسی نژاد اس کے سکریٹری نے خراسان کا نظم ٹھیک کر لیا اور معیشت بھی تیزی سے رفتار پکڑنے لگی۔ جس کے نتیجہ میں الپ ارسلان کی عزت وتوقیر میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ جب بوڑھا سلجوقی سلطان وفات پا گیا تو بھائیوں، بیٹوں اور بھتیجوں میں جانشینی کے لئے جنگ شروع ہو گئی۔ اس صورتحال میں الپ ارسلان بہت جلد فاتح ہو کر نکلا جس میں اس کے مشیر نظام الملک کے مشوروں کا بڑا دخل تھا۔ سلطنت کا تاج سر پر رکھنے کے بعد الپ ارسلان نے نقشوں کی جانچ شروع کی کہ اب کونسے علاقے پر لشکر کشی کی جائے۔

سلجوقی سلطنت کا کیشیا کے علاقے تک دراز ہو گئی تو وہ مغرب کی سمت بڑھا اور آخر کار اس کی فوجیں ایشیا مائنر تک جا پہنچیں جس کا زیادہ تر حصہ قسطنطنیہ کے تحت تھا جسے مسلمان اب بھی روم ہی کہتے تھے۔

۱۰۷۱ عیسوی میں منزیکرٹ (Manzikert) شہر کے باہر الپ ارسلان اور بازنطینی بادشاہ رامانوس ڈائیوجینس (Romanus Diogenes) کی فوجوں کا ٹکراؤ ہوا اور ایک لاکھ سے زیادہ رومی فوج تہس نہس کر دی گئی۔ رومی بادشاہ کو الپ ارسلان نے خود ہی قید کیا جس نے مغربی دنیا کو دکھ کی لہر سے دوچار کر دیا۔ اور پھر الپ ارسلان نے جو کیا وہ سوچا نہیں جا سکتا تھا۔ شاہ روم کو آزاد کر دیا گیا اور واپس جاتے ہوئے اسے الپ ارسلان نے تحفے تحائف بھی دیئے البتہ یہ بھی بتایا کہ آئندہ کوئی ایسی حماقت نہ کی جائے۔ الپ ارسلان کے اس رویہ سے جہاں سلجوقیوں کی طاقت اور غلبہ کا اظہار ہو رہا تھا وہیں عیسائی بادشاہ کو بے توقیری اور شرمندگی کا منھ دیکھنا پڑا۔ اس وقت ایسا لگا کہ سلجوقیوں کی یہ ایک ایسی بڑی فتح تھی جیسی شاید آئندہ حاصل نہ ہو سکے لیکن ممکن ہے

کہ یہ ان کی سب سے بڑی غلطی بھی رہی ہو۔ آنے والے چھبیس سال تک جس کا اندازہ کوئی نہ کر سکا۔

اگلے سال الپ ارسلان کا خراسان میں انتقال ہوا تو اس کا بیٹا ملک شاہ جانشین بنتے ہی والد کی راہ پر چل نکلا اور نظام الملک کی مشاورت میں اسی طرح کا کام کرتا رہا جیسا الپ ارسلان کرتا تھا۔ ملک شاہ نے ہی شام اور ارض مقدس کو ترکوں کے لئے کھول دیا۔



سلطنت سلاجقہ: ترکوں کا عالم اسلام پر حملہ

دونوں سلجوقی سلاطین اور ان کے فارسی وزیر کے درمیاں مفاہمت نے دونوں کے کام اور مفادات کی بخوبی حفاظت کی۔ سلطان فتوحات کے لئے مشہور رہا اور نظام الملک مفتوحہ ممالک کے نظم و نسق کو سنبھالے رہے۔ سلطان جن علاقوں کو فتح کرتا وہ اپنے عزیزوں کے حوالہ کر دیتا جو اس علاقے کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے۔ یہ ترک جو ابھی میدانوں سے تازہ تازہ ہی وارد ہوئے تھے، ٹیکس اور لوٹ کے مال میں فرق نہیں سمجھتے تھے۔

نظام الملک نے ٹیکس کے سسٹم کو مضبوط کیا اور معائنہ کاروں کی ایک ایسی بڑی اور مستعد ٹیم تیار کی جو ہر جگہ جا کر یہ دیکھتے تھے کہ ٹیکس دینے والے کہیں حکومت کو دھوکہ تو نہیں دے رہے۔ جنگوں سے حاصل ہونے والی آمدنی سے ایک ایسی پولس فورس تیار کی جس کا خاص مقصد مسافروں کی حفاظت تھا تاکہ تاجر سامان تجارت کے لوٹ لئے جانے کے خطرہ سے بے فکر ہو کر سفر کریں۔ ایک دن کی مسافت کے فاصلہ پر حکومت کی جانب سے مسافر خانے قائم کئے گئے تاکہ مسافر بآسانی قیام کر سکیں۔ اس عظیم وزیر نے اسکولوں اور کالجوں کا جنھیں مدرسہ کہا جاتا تھا ایک جال بچھا دیا تاکہ مستقبل میں بننے والے افسروں کو ایک ہی جیسی تعلیم اور مشترک عقائد کا علم مل سکے۔ مشترکہ تعلیم کو یقینی بنانے کے لئے یہ پورا نظام راسخ العقیدہ سنی علماء کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔

یہ تمام اقدامات دراصل اس وقت کی مرکز گریز قوتوں کے خلاف جدوجہد کا حصہ تھے۔ نظام الملک کا خیال تھا تین اہم نسلی قوتوں کو ملا کر ایک مضبوط اور توانا امت مسلمہ کی تشکیل ممکن ہے جس میں ترک ملٹری قوت اور متعلقہ نظم کی حفاظت کر سکتے ہیں، عرب دینی عقائد کی بنیاد پر امت میں اتحاد کی نگرانی اور اہل فارس باقی میدانِ کار بشمول فنون لطیفہ، تہذیب، عمومی انتظامی معاملات، فلسفہ، شعریات، مصوری، تعمیرات اور سائنس کو سنبھال سکیں گے تاکہ دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے حسن و جمال میں بھی اضافہ ہوتا رہے۔ اس طرح ایک نیا حکمراں طبقہ تشکیل پا سکے گا۔ جس میں ترک سلطان اور اس کی فوج، عرب خلیفہ وعلماء اور اہل فارس پر مشتمل افسر شاہی شامل ہوگی جو مفکرین اور علوم وفنون کے ماہرین پر مشتمل ہوگا۔

نتیجہ کے طور پر جو استحکام پیدا ہوگا اس میں کسان اور تاجر دولت پیدا کرینگے۔ جس سے حاصل ہونے والے ٹیکس کے ذریعہ حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ فوجوں کو طاقتور رکھا جا سکے گا اور مملکت میں امن اور نظم وضبط بحال رکھا جا سکے گا۔ چنانچہ یہ بہت اہم ہوگا کہ کسانوں اور تاجروں کے لئے ایسا ماحول قائم کیا جائے کہ وہ دولت اکٹھا کرتے رہیں۔

لیکن دوسری طرف نظام الملک کا ایک خطرناک دشمن امت کے اتحاد کی اس کی کوششوں کو پارہ پارہ کرنے کی سازشیں کر رہا تھا۔ اس بے رحم ذہانت کا نام حسن صباح تھا جس نے قاتل فدائین کا ایک گروہ تیار کر لیا تھا۔ میں اس گروہ کو مسلک نہیں بلکہ Cult اس لیئے کہہ رہا ہوں کہ مسلک میں تصورات وخیالات اور عقائد کو عام سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ Cult ان کے لئے یوں مناسب ہے کیونکہ خود یہ ایک ایسی شاخ سے پھوٹنے والی شاخ تھی جو اس شاخ سے نکلی تھی جسے شیعیت کہا جاتا ہے۔ جو خود اسلام کی ایک شاخ تھی۔

شیعوں کے یہاں ایک مرکزی شخصیت جس کی ہدایت کو تسلیم کرنا لازمی ہے، کا تصور ان کے ایمان کا جز ہے جسے وہ امام کہتے ہیں۔ اور جو دنیا میں ایک وقت میں ایک ہی ہوتا ہے۔ جب ایک امام اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کا افضل بیٹے کو منتقل ہو جاتا ہے اور اس طرح اب وہ نیا امام بن جاتا ہے۔ یہاں دقت یہ

ہے کہ امام کے انتقال کے بعد کس بیٹے کو ذمہ داری ملے یہ سوال مسائل پیدا کرسکتا ہے۔ اختلاف کے نتیجہ میں مسلک میں تفریق پیدا ہو جاتی ہے اور یوں ایک نئی شاخ وجود میں آجاتی ہے۔

جس طرح پانچویں امام کے بارے میں اختلاف کے نتیجہ میں زیدی فرقہ وجود میں آیا۔ چھٹے امام کے بعد یہ اختلاف خاصا سنجیدہ بن کر ابھرا اور اسمٰعیلی فرقہ بنا جو شیعیت میں خاصہ عرصہ تک غالب فرقہ کی حیثیت سے رہا۔ ہمیں معلوم ہے کہ مصر کے خلفاء جو فاطمی کہلاتے تھے دراصل اسمٰعیلی شیعہ ہی تھے۔

گیارہویں صدی کے آخر میں اسمٰعیلی فرقہ خود ہی ایک تقسیم کا شکار ہوا۔ ایک اقلیتی گروہ نے جو فاطمیوں کی عیش پسندی اور شاہانہ انداز سے ناخوش تھا علیٰحدگی اختیار کرلی اور ایک نیا انقلابی گروہ تشکیل کیا۔ جس کا مقصد امیروں اور غریبوں کی برابری، کمزوروں کو باصلاحیت بنانا اور بالعموم اسلامی مقاصد کو بروئے کار لانا تھا۔ اس تحریک کے قائدین نے اپنا ایک کارگذار جس کا نام حسن صباح تھا فارس بھیجا تاکہ وہاں سے اس تحریک کے لئے ہمدرد کارکن بھرتی کرے۔

فارس میں صباح نے ایک طاقتور حلقہ پیدا کیا۔ اور آج کے شمالی ایران میں کوہ البرز میں واقع قلعہ، الاموت (Alamut) پر قابض ہو گیا۔ اس قلعہ تک رسائی ایک ایسی پگڈنڈی کے ذریعہ ہی ممکن تھی جس پر ایک فرد سے زیادہ کا چلنا ممکن نہ تھا۔ یہ اس کی ایک محفوظ ترین پناہ گاہ تھی کیونکہ کسی فوج کا یہاں تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ صباح نے اسے کس طرح سے فتح کیا تھا یہ کسی کو نہیں معلوم۔ بعض روایتیں بتاتی ہیں کہ اس میں دھوکہ دہی کی گئی تھی اور بعضوں کا خیال ہے کہ اس میں غیر مادّی قوتوں کا استعمال ہوا تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس نے قلعہ کے کارکنوں کو اپنے نقطۂ نظر کا وفادار بنالیا تھا اور پھر بہت کم رقم کے عوض اسے خریدلیا۔ جو کچھ بھی رہا ہو قلعہ الاموت میں صباح نے فدائین کی تربیت کا پروگرام تیار کیا اور انھیں منظم کرنے لگا۔

اس گروہ کو تاریخ میں حشیشین (Assassins) بھی کہا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ نام انھیں اس بنا پر دیا گیا کہ یہ سیاسی قتل کیا کرتے تھے۔ اصل بات اس کے برخلاف ہے۔ سیاسی قتل کو آج Assassination اس بنا پر ہی کہتے ہیں کہ اس گروہ کا یہی طریقہ کار تھا۔ کئی صدی بعد مارکو پولو نے دعویٰ کیا کہ صباح کے کارندے کسی کو قتل کرنے سے پہلے حشیش نوشی کیا کرتے تھے۔ تاکہ یہ عمل ان کے لئے آسان ہو جائے اور اسی بنا پر انھیں حشیشین کہا گیا اور اس سے Assassins کا لفظ بنا۔ البتہ مجھے اس اصطلاح کی بازیافت میں شک ہے جس کی میں وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

صباح ایک دہشت گرد قسم کا انسان تھا اور قتل کو زیادہ تر پروپیگنڈے کے لئے استعمال کرتا تھا۔ اس کے پاس نہ تو مالی وسائل اتنے تھے اور نہ ہی تربیت یافتہ سپاہی کہ جنگ کے ذریعہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ یا تو انفرادی طور پر یا پھر چند لوگوں کو معمور کرکے بعض ایسے متعین افراد کو قتل کراتا جس کے نتیجہ میں عوام میں دہشت اور اس گروہ کا خوف پیدا ہو جاتا۔ حشیشین (اساسین) مہینوں اور کبھی سالہا سال تک قتل کی منصوبہ

بندی کرتے۔ بعض اوقات ممکنہ مقتول سے دوستی بھی کر لیتے۔ اس کے وفادار اسٹاف میں شامل ہو جاتے اور اعتماد قائم کر لیتے۔

اس طویل منصوبہ اور اس پر عمل درآمد میں حشیش نوشی پر سوالیہ نشان اٹھتا ہے اور یہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایک لبنانی مصنف امین مالوف کے خیال میں اَساسن فارسی زبان کے لفظ اساس سے مشتق ہے جس کے معنی بنیاد کے ہوتے ہیں۔ مذہبی تفرقہ اندازی کے مرتکبین کی مانند صباح نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وحی خرابی کا شکار ہو گئی ہے۔ اور میں اپنے پیروکاروں کو اس کی اصل اور بنیاد کی طرف رہنمائی کرتا ہوں۔ فرقہ بندی کا ہر خواہش مند وحی کی اصل یا اس کے اصل پیغام کے بارے میں اپنی ایک رائے رکھتا ہے۔ لیکن صباح کا نقطہ نظر علماء اسلام کی بڑی اکثریت کے نقطہ نظر سے بہت دور تھا۔ مثلاً اس کے مطابق محمدؐ اللہ کے پیغمبر ضرور تھے لیکن اللہ کا واقعی مظہر علیؑ ہیں اور اسی طرح ان کے بعد آنے والے ائمہ۔

صباح نے یہ بھی تعلیم دی کہ ایک سطحی یا خارجی معنی رکھنے کے ساتھ ساتھ قرآن کے کچھ داخلی یا مخفی معنی بھی ہیں اور ان کی بھی مختلف سطحیں ہیں۔ خارجی معنی مذہبی شعائر متعین کرتے ہیں اور مذہب کا یہ ظاہری اظہار یعنی قوانین، اخلاقی تعلیمات وغیرہ عوام الناس کے لئے ہیں۔ کیونکہ وہ اندر کی گہرائی تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مخفی قرآن کی ہر آیت، ہر لائن، اور ہر لفظ کے کچھ مخفی معنی ہیں۔ ان معنی میں وہ مخفی کوڈ چھپا ہوا ہے جو صرف متجسس ذہن ہی کو کھلتا ہے اور اس تخلیق شدہ کائنات کے اسرار کو سمجھنے میں اس کی مدد کرتا ہے۔

حشیشین بنیادی طور پر ایک خفیہ منظم گروہ تھا۔ عام زندگی میں وہ کسی پر اپنی شناخت یا اپنے عقائد کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ چنانچہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ان کی تعداد کیا ہے۔ یا کسی بازار میں چلتے ہوئے یا کسی مسجد میں یا پھر کہیں اور واقعی حشیشین کون ہے یہ پہچاننا ممکن نہیں تھا۔ جو لوگ شامل ہوتے ان کو تربیت اور تلقین عقیدہ کے ایک سخت کورس سے گذرنا ہوتا لیکن جب وہ اس گروہ میں شامل ہو جاتے تو ان کے درجاتِ علم کی بنیاد پر ان کے منصب اور درجہ کا اظہار ہوتا۔ نو واردان کی درجہ بدرجہ ترقی ہوتی اور جو قرآن کے علم میں جیسے جیسے گہرا ہوتا جاتا وہ ان درجات میں بلند ہوتا جاتا تا آنکہ وہ اس اساس تک پہنچ جاتا جس پر ان کے پورے اور تمام تر فکر کی تعمیر ہوتی تھی اور اس درجہ کے لوگ صباح کی اندرونی اور خاص مشاورت کا حصہ ہوتے۔

قتل کے معاملہ میں وہ بڑے ہی رازدارانہ انداز میں کام کرتے لیکن یہ عمل کرتے ہوئے وہ اس کا خیال رکھتے کہ یہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے سامنے ہو۔ ان کا اصل مقصد کسی مخصوص شخص کو منصب سے ہٹانا نہیں ہوتا تھا بلکہ پوری سوسائٹی کو یہ باور کرانا تھا کہ وہ جب چاہیں جسے چاہیں اور جہاں چاہیں ختم کر سکتے ہیں۔ صباح تمام لوگوں کے دلوں میں ایک قسم کا شک پیدا کر دینا چاہتا تھا کہ عزیز ترین دوست ہو، بہت قریب سے جاننے والا ہو، فرمانبردار اور قابل اعتبار نوکر ہو، بلکہ رفیق زندگی ہی کیوں نہ ہو حشیشین ہو سکتا ہے۔ اور اسی طرح وہ ان لوگوں کی پالیسیوں پر کنٹرول کرنا چاہتے تھے جن کے پاس اس کے برعکس وسائل تھے اور جو علاقوں کا نظم سنبھالتے

تھے اور فوج بھی رکھتے تھے۔

وہ ایجنٹس جو کسی کے قتل کا عمل انجام دیتے تھے انھیں فدائین یعنی قربانی دینے والے کہا جاتا تھا۔ جب وہ کھلے عام کسی قتل کی منصوبہ بندی کرتے تو انھیں معلوم ہوتا تھا کہ قتل کرتے ہی انھیں بھی قتل کر دیا جائیگا۔ لیکن وہ اس انجام سے بچنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت سے ہم آغوش ہونا ان کی رسم قتل کا ایک جز تھا۔ وہ چاقو باز خودکُش تھے۔ موت سے ہم کنار ہو کر وہ یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ جان کا خوف بھی انھیں اس عمل سے باز نہیں رکھ سکتا۔

حشیشین نے اس وقت کے پریشان اور ذہنی طور پر منتشر معاشرہ کو مزید خوفزدہ کر دیا تھا۔ سنی اور شیعہ آپس میں جھوج رہے تھے۔ بغداد کے عباسی خلفاء قاہرہ کی فاطمی خلافت سے متصادم تھے۔ ترکوں کے حملہ نے کوئی سو سال سے پورے معاشرہ کو درندہ صفت کر دیا تھا۔ اور اب قاتلوں کے اس گروہ نے سوسائٹی کو مستقل طور پر ایک خوفناک خواب سے دوچار کر دیا تھا۔

حشیشین نے بعض انتہائی اہم اور عوامی اہمیت کے حامل افراد کو قتل کر کے اپنی اہمیت اور سفاکی سے عوام کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ انھوں نے بعض سلجوقی منصب داروں اور معروف سنی اسکالرز کو نشانہ بنایا۔ دو خلفاء کو قتل کیا۔ زیادہ تر یہ لوگ اس شہر کی سب سے بڑی مسجد میں اور بالخصوص جمعہ کی نماز کے وقت قتل انجام دیتے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا اس کا گواہ ہونا یقینی ہو جائے۔

اور پھر ۱۰۹۲عیسوی میں حال ہی میں ریٹائر ہوئے نظام الملک کو قتل کر دیا گیا اور کوئی ایک ماہ کے اندر ہی نظام الملک کے آقا سلطان ملک شاہ یعنی الپ ارسلان کے بیٹے کو ختم کر دیا۔ محض دو ماہ کے اندر اندر دو ایسے اہم افراد جو اس گئی گذری حالت میں بھی مسلم سلطنت کے اتحاد کو باقی رکھے ہوئے تھے حشیشین کا شکار ہو گئے۔ قتل کے نتیجہ میں سلجوقی شہزادوں، بیٹوں، اور بھتیجوں میں اقتدار کے لئے رسہ کشی شروع ہو گئی اور یوں سلطنت کا مغربی حصہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ایشیا مائنر سے سینائی تک عملاً ہر شہر پر کسی شہزادہ کا قبضہ تھا۔ یروشلم، دمشق، حلب، انطاکیہ، تریپولی اور اُرفا اب عملاً آزاد ریاستیں تھیں جو محض رسماً سلطان بغداد سے منسلک تھیں۔ ہر معمولی شہزادہ اپنے مال و متاع سے اسطرح چمٹا ہوا تھا جیسے کتا کسی حاصل شدہ ہڈّی سے اور دوسرے شہزادوں کو اس شک سے دیکھتا کہ وہ اس پر قبضہ نہ کر لیں۔

۱۰۹۵عیسوی میں عالمگیر امت مسلمہ کا تصور سیاسی سطح پر ناکام ہو چکا تھا۔ قرآن کریم اور احادیث کی بنیاد پر علماء بس برائے نام ہی معاشرہ کو تھامے ہوئے تھے۔ فلاسفہ بکھر چکے تھے، گو کہ مکالمہ میں وہ اب بھی کچھ نہ کچھ شامل کر رہے تھے لیکن ان کی آوازیں اب نحیف تر ہوتی جا رہی تھیں۔ یہ وہ دنیا تھی جس میں غزالی تھے اور کام کر رہے تھے۔ اس دنیا میں عقل پر بھروسہ کرنا بآسانی ایک غیر عاقلانہ عمل تعبیر کیا جا سکتا تھا۔

اور پھر تباہی کا آغاز ہوا۔

باب: ۹

عظیم تباہی

(۴۷۴ تا ۷۸۴ ھ، 1081 تا ۱۳۸۱ء)

مغرب کی سمت سے حملہ

صحیح بات تو یہ ہے کہ تباہیاں دو آئیں۔ایک چھوٹی اور دوسری بڑی۔چھوٹی مغرب کی سمت سے آئی تھی۔اُس وقت مسلمان مغربی یورپ کے بارے میں بہت کم جانتے تھے بس اتنا ہی جتنا بعد میں یورپ کے لوگوں کو افریقہ کے اندرون کا علم ہوا تھا۔مسلمانوں کے نزدیک بازنطین اور اندلس کے درمیان کا علاقہ ماقبل تاریخ کا ایک جنگل تھا جس میں اتنے پرانے زمانے کے انسان بستے تھے کہ ابھی تک سور کا گوشت کھاتے تھے۔ جب مسلمان عیسائیوں کا حوالہ دیتے تو ان کے ذہن میں بازنطینی چرچ ہوتے جو خود ان کے زیر انتظام علاقوں میں قائم تھے۔انھیں یہ تو علم تھا کہ مزید مغرب میں ایک زمانہ میں ترقی یافتہ تہذیب ہوا کرتی تھی۔اور کسی کو بھی اٹلی اور بحرروم کے ساحلی علاقے میں ماضی کی اس تہذیب کی بعض باقیات نظر آسکتی تھیں۔ان علاقوں سے مسلمان یوں بھی واقف تھے کہ وہ یہاں اکثر حملے کرتے رہتے تھے۔لیکن زمانۂ جاہلیت ہی میں یہ سب ختم ہو چکا تھا اور جب اسلام دنیا میں جلوہ گر ہوا تو بس اس تہذیب کی یادیں ہی بچی تھیں۔

مغرب کے بارے میں مسلمانوں کا نقطہ نظر کوئی بہت غلط نہ تھا۔یورپ ایک طویل عرصہ تک خاصی ہولناک صورتحال کا شکار رہا۔ صدیوں تک جرمن قبائل حملہ آور رہے۔ ہُن،افار، (Avars)، مجربین (Magyars)، مسلمان،نورسیمین (Norsemen) اور دوسری اقوام کے حملے ہوتے رہے اور یوں یہ علاقہ انتہائی پستی تک پہنچ گیا کہ بس زندگی کے بنیادی اور ضروری وسائل ہی مہیّا تھے۔یورپ میں تقریباً ہر شخص کسان تھا۔ ہر کسان کمرتوڑ محنت کرتا اور صبح سے شام تک محض اتنا حاصل کر پاتا کہ وہ خود بھوکوں نہ مرے اور ملٹری افسروں اور مذہبی رہنماؤں کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ مذہبی رہنما شادی نہیں کر سکتے تھے لیکن ان کے طبقے میں ملٹری کی اشرافیہ کے افراد شامل ہوتے رہتے تھے۔اشرافیہ کی اولاد میں چرچ سے منسلک ہو جانے والوں کو چھوڑ کر زیادہ تر لڑکے علم و تعلیم کے بجائے فن سپہ گری اختیار کرتے تھے۔

گیارہویں صدی میں کسی وقت ایسا ہوا کہ چھوٹی چھوٹی تکنیکی اختراعات کے نتائج معنویت اختیار کرنے لگے۔ یہ اختراعات معمولی سی تھیں اور پہلے سے موجود بھی تھیں لیکن اسوقت تک بہت توجہ حاصل نہ کرسکی تھیں۔ان اختراعات میں ایک ایسا بھاری ہل بھی تھا جس سے درختوں کی جڑیں بھی کٹ سکتی تھیں اور دوسرے

پرانے ماڈل کے مقابلہ مغربی یورپ کی نم لیکن بھاری مٹی میں یہ ہل خاصی گہرائی تک جاسکتا تھا۔اس اختراع کے نتیجہ میں کسانوں کو جنگلات صاف کر کے ان زمینوں کو بھی قابل کاشت بنانے کا موقع مل گیا جو ابھی نا قابل کاشت سمجھی جاتی تھیں۔اس طرح کسانوں کے پاس قابل کاشت زمینوں میں اضافہ ہوگیا۔

دوسری اختراع گھوڑے کے ایسے کالر کی تھی جو دراصل پرانے جوئے (Yoke) کی ایک بہتر شکل تھی جس کے ذریعہ جانوروں کو زمین جوتنے میں استعمال کرتے تھے۔ پرانی شکل میں صرف بیلوں ہی کا استعمال ہوسکتا تھا کیونکہ وہ انھیں کی ساخت کے اعتبار سے بنایا گیا تھا۔اسے گھوڑوں میں استعمال نہیں کر سکتے تھے کیونکہ جس پٹی کے ذریعہ اسے گردن سے باندھا جاتا تھا وہ جب کھنچتی تو گھوڑے کو سانس لینے میں بڑی دقت آتی تھی۔ لیکن اس تبدیل شدہ جوئے کو گھوڑوں میں استعمال کیا جاسکتا تھا۔گھوڑوں کے ذریعہ کھیتوں کی جتائی کی رفتار پچاس فیصد زیادہ تھی چنانچہ اتنے ہی وقت میں ایک کسان زیادہ کھیت جوت لیتا تھا۔

ایک تیسری اختراع اور ہوئی اور وہ تھی کھیتوں سے باری باری فصل کا حصول۔کسانوں میں یہ خیال عام تھا کہ ایک کھیت سے سال بہ سال فصل لینے سے اس کی قوت نمو میں کمی آجاتی ہے چنانچہ کسان کھیتوں کو وقتاً فوقتاً خالی چھوڑ دیتے تھے۔لیکن پیٹ تو آرام نہیں کرسکتا۔اس لئے یورپی کسان اپنے کھیت کو دو حصوں میں تقسیم کر لیتے۔ ہر سال ایک حصہ میں زراعت کرتے اور دوسرے کو خالی چھوڑ دیتے۔اگلے سال خالی حصّے میں بیج بوتے اور دوسرے حصے کو خالی چھوڑ دیتے۔

لیکن صدیوں کے تجربہ سے یورپی کسانوں پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ کھیتوں کو دوسرے سال خالی چھوڑنا ضروری نہیں۔ بلکہ تین سال میں سے ایک سال بھی اگر خالی چھوڑیں تو بھی زمین منفی طور پر متاثر نہیں ہوگی۔اوراس طرح کسان اب اپنے کھیتوں کو تین حصوں میں تقسیم کرتے۔دو حصوں میں ہر سال بیج بوتے اور تیسرے حصے کو خالی چھوڑ دیتے۔اوراس کے نتیجہ میں ہر سال ۱/۶ قابل کاشت زمین کا اضافہ ہو جاتا۔

ان چھوٹی چھوٹی اختراعات نے مل کر کیا کیا؟ ظاہر ہے کہ کوئی بہت بڑی تبدیلی تو نہیں آئی البتہ اتنا ضرور ہوا کہ کبھی کبھی ذرا ضرورت سے زیادہ کاشت ہونے لگی۔ جب فصل زیادہ ہوتی تو وہ متعین دنوں میں عام راستوں پر لے جاتے اور دوسرے کسانوں سے ان کی دوسری فصل بدل لیتے۔اس طرح انھیں جو اشیاء حاصل ہوتیں ان کی اقسام اور تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔کسانوں کو فرصت کے اوقات ملنے لگے اور انھیں پیٹ بھرنے کے لئے کمر توڑ محنت سے بھی فرصت ملنے لگی جسے انھوں نے دستکاری کی وہ اشیاء جو وہ بنا سکتے تھے کی خرید وفروخت کرنے کے لئے استعمال کیا۔شہروں کے مضافات میں جہاں متعین دنوں میں بازار لگتا تھا اب وہ مستقل شکل اختیار کر گئے۔شہروں میں ایسے لوگوں کی آمد ورفت بڑھی جو کوئی فن جانتے تھے اور اپنے فن پاروں کی تجارت کے ذریعہ رقم حاصل کرنا چاہتے تھے۔جب رقم آئی تو کچھ ایسے افراد بھی سامنے آئے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ محض

خرید و فروخت کی خاطر سفر کرتے اور پورا وقت اس میں لگاتے۔ اس طرح اندرونِ یورپ میں سرمایہ استعمال ہونے لگا۔ دولت میں اضافہ ہوا تو یورپی امراء نے سفر کے مختلف وسائل بھی حاصل کرنا شروع کر دیئے۔

لیکن سوال یہ ہے وہ سفر کہاں کا کرتے تھے؟ معلوم ہے کہ دنیا کا یہ حصہ مذہب اور مذہبی رسومات اور اوھام پرستی و ضعیف الاعتقادی میں مبتلا تھا۔ تو یہ لوگ مقبروں اور مزارات کی زیارت کے لئے سفر کرتے اور ممکنہ معجزوں کے متلاشی رہتے۔ محدود ذرائع کے مالک مقامی مقابر ہی پر اکتفا کرتے۔ البتہ بڑے وسائل رکھنے والے مقامات مقدسہ کی زیارت کے لئے سفر کرنے جاتے۔ ایسے سفر نہ صرف طویل ہوتے تھے بلکہ خطرات سے بھی پر ہوتے تھے۔ اور کیونکہ کوئی بین الاقوامی کرنسی موجود نہیں تھی اس لئے لین دین میں سونا اور چاندی ہی استعمال ہوتی تھی اور یوں ایسے مسافر ڈاکوؤں اور لٹیروں کے ترجیحی شکار بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ اس قسم کے اسفار اجتماعی ہوتے اور کارواں کی شکل میں ہوا کرتے تھے۔ کرائے کے محافظ ساتھ ہوتے اور یوں یہ مہمات گروہی شکل میں فلسطین کے لئے عازم سفر ہوتیں۔ فلسطین میں ان مقامات کی زیارت کرتے جہاں عیسیٰ اور ان کے حوارین چلے پھرے تھے، کام کیا تھا، رہے تھے اور وفات پائی تھی۔ وہ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے۔ جنت کی جستجو میں مزید آگے بڑھتے، اپنے بیماروں کے لئے شفا کی امیدیں بڑھاتے۔ ان مقامات سے کچھ یادگار بہترین اشیاء بھی خریدتے۔ مقدس بزرگوں کی باقیات اور اپنے اعزہ و اقربا کے لئے یادگار نشانیاں خریدتے اور زندگی کی اس عظیم مہم کی خوبصورت یادوں کو لئے وطن واپس ہوتے۔

پھر یوں ہوا کہ فلسطین روادار فاطمیوں اور کاہل عباسیوں کے ہاتھوں سے نکل کر سلجوقیوں کے ہاتھوں میں چلا گیا جو اسلام میں ابھی تازہ تازہ ہی داخل ہوئے تھے اور طبیعتوں میں کٹر پن اور جوش پایا جاتا تھا۔ ان لوگوں کے جوش کا اظہار، سنجیدگی، شرافت، سخاوت، اور اس طرح کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے میں نہیں بلکہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں اور بالخصوص دور دراز سے اور قدیم اور غیر مہذب علاقوں سے آنے والے لوگوں کے ساتھ درشت اور سخت رویوں کے اظہار سے ہوتا اور وہ اس میں کسی سے پیچھے رہنا نہیں چاہتے تھے۔

عیسائی زائرین مسلمانوں کے اس حقارت آمیز رویہ سے سخت نالاں تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ انھیں جسمانی اذیتیں دی جاتیں، ظلم کیا جاتا، یا انھیں مار ڈالا جاتا تھا ایسا کچھ نہیں تھا۔ ان کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا جاتا اور انھیں ذلیل کیا جاتا تھا کہ وہ یہ سمجھ لیں کہ وہ دوسرے درجے کے لوگ ہیں۔ ہر قطار میں انھیں بالکل آخر میں جگہ ملتی تھی۔ اپنے مزارات پر حاضری کے لئے انھیں خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا۔ ہر چھوٹی چیز کی ایک قیمت ہوتی۔ دکانداران سے صرف نظر کرتے، افسران ان سے سخت رویہ اختیار کرتے۔ چھوٹی سے چھوٹی ذلتوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے گئے تھے۔

جب وہ واپس وطن لوٹتے تو یہ سب تکلیفیں قسمیں کھا کھا کر تو بتاتے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہاں

کی خوشحالی، عظیم الشان مکانات اور عام لوگوں کے پہننے کے لئے ریشم و ساٹن کے ملبوسات، لذیذ کھانے، مسالے اور خوشبو، اور سونا ہی سونا، اپنے ان مشاہدات کا بھی تذکرہ کرتے۔ چنانچہ غصہ اور حسد کے جذبات دونوں ہی کو جلا ملتی۔

۱۰۷۱عیسوی میں ماؤزی کرٹ (Mauzikert) کی شکست جس میں شاہ قسطنطین قیدی بنالیا گیا تھا یوروپیوں کے لئے ایک بڑی زناٹے دار خبر تھی جس نے بازنطینیوں کی طرف سے ایک پیغام بھی پورے عالم عیسائیت میں بھیج دیا تھا۔ اس پیغام کا ماحصل یہ تھا کہ یورپ کے بادشاہ اور سردار عیسائیت کے نام پر اس کی حمایت کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ قسطنطنیہ کے اسقف اعظم نے اپنے مغربی شدید مدِّ مقابل یعنی پوپ کو ایک فوری پیغام بھیجا کہ اگر قسطنطنیہ گر گیا تو محمدؐ کے یہ کفار سیدھے روم کا رخ کرینگے۔

اسی دوران یوروپی معیشت ٹھیک ہو رہی تھی، آبادی بھی بڑھ رہی تھی البتہ ان لوگوں نے دو طرح سے اپنے رسوم و رواج کو وقت کے ساتھ ڈھلنے سے باز رکھا تھا۔ سرمایہ میں اضافہ کے لئے محنت اور مزدوری کرنا اب بھی اشرافیہ کا کام نہ تھا۔ ان کا کام محض زمینیں حاصل کرنا اور جنگوں میں حصہ لینا تھا۔ دوسری چیز یہ تھی کہ جب کوئی زمین دار فوت ہو جاتا تھا تو اس کی پوری جائداد بڑے بیٹے کے حصّے میں آتی تھی اور اس طرح چھوٹے بیٹوں کو اپنی قسمت سنوارنے کے لئے جو کچھ وہ اچھے سے اچھا کر سکتے تھے خود ہی کرنا ہوتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ بالکل مخالف دوسرا رویہ بھی جاری تھا وہ یہ کہ بادشاہ یا شہزادے اپنی مملکت کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیتے اور یوں مملکتیں چھوٹی ہو جاتیں۔ ایک اعتبار سے یہ طریقہ کار مذکورہ بالا پہلے طریقوں کو ہی مستحکم کرتا تھا۔ مثلاً فرانس اسی طرح تقسیم ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا جو کاونٹی کہلاتی تھیں۔ بلکہ اور مزید چھوٹی ریاستیں وجود میں آگئیں جنھیں کاسٹلان (Castellan) کہا جاتا تھا اور انکے پاس محض ایک قلعہ اور اس کے ارد گرد کے وہ علاقے جن پر یہ کنٹرول کر سکتے تھے، ہوتے تھے۔ کیونکہ قلعہ کو اولادوں میں تقسیم کرنا ممکن نہ تھا چنانچہ اس طرح بڑے بیٹے کو پوری جائداد کے منتقل ہو جانے کا اصول جاری رہا۔ اسی طرح Knights وجود میں آتے تھے۔

چنانچہ ہر نسل میں اشرافیہ کی ایک بڑی تعداد ایسی پیدا ہوئی جس کے پاس جنگ کے علاوہ اور کوئی پیشہ تھا ہی نہیں۔ لیکن حملہ آور ہونے کا زور اب ذرا کم ہو رہا تھا اس لئے جنگیں بھی اتنی نہیں رہیں کہ اشرافیہ کے لئے مصروفیت فراہم کر سکیں۔ Viking جو کہ بیرونی حملہ آوروں کی آخری بڑی لہر تھی اب خطرہ نہیں رہے تھے کیونکہ گیارہویں صدی آتے آتے یہ یورپ میں باقاعدہ بود و باش اختیار کر چکے تھے۔ 'وہ' اب 'ہم' بن چکے تھے گو کہ سسٹم اب بھی نائٹ اور مزید نائٹ پیدا کر رہا تھا۔

زائرین واپس آتے تو اپنی دشواریوں اور ذلتوں کا تذکرہ کرتے جو انھیں اس مذہبی سفر میں جھیلنا پڑتی تھیں۔ بالآخر ۱۰۹۵عیسوی میں پوپ اربان ثانی نے فرانس کی ایک مونٹیسری جو کلاری مونٹ کہلاتی تھی کے

کھلے میدان میں ایک شعلہ زن تقریر کی جس میں فرانسیسی جرمن اور اٹالین اشرافیہ کی ایک بڑی تعداد موجود تھی اور کہا کہ عیسائیت زبردست خطرہ سے دوچار ہے۔ تقریر میں پوپ نے ان خطرات کا ذکر کیا جن سے عیسائی زائرین مقامات مقدسہ کی زیارت کے دوران دوچار ہوتے تھے۔ اور ان سے اپیل کی کہ اٹھیں اور بھائیوں کی مدد کے لئے یروشلم سے ترکوں کو باہر نکال دیں۔ پوپ اربان نے کہا کہ لوگ اس مقصد عظیم کے لئے مشرق کا سفر کریں، صلیب نما سرخ پیوند سر پر لگائیں جو اس مقصد سے ان کی وابستگی کا نشان ہوگا۔ یہ مہم Crusades (صلیبی) کہلائی جو فرانسیسی لفظ croix سے نکلا اور کراس یعنی صلیب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اسی نام سے ہی اس پوری مہم کو مورخین نے Crusades یعنی صلیبی جنگوں کا نام دیا ہے۔

یروشلم پر زور دیگر اور زیارتوں سے منسلک کر کے مشرق سے اس جنگ کو پوپ اُربان نے مذہبی رنگ میں رنگ دیا۔ مزید یہ کہ اپنے اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے اس نے اعلان کیا کہ جو کوئی بھی مسلمانوں کو قتل کرنے کی اس مہم میں حصہ لے گا اس کے بہت سے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ صرف اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے کہ اس ماحول نے ہزارہا بے قرار، اجڈ اور نفسیاتی اعتبار سے مایوس یورپی سرداروں کو کس طرح متاثر کیا ہوگا۔ ''نوجوانو مشرق کی طرف بڑھو'' پوپ بلا رہے تھے۔ اپنے آپ کو قتل کرنے کی مشین کی طرح آشکار ہونے دو۔ سوسائٹی نے تمہیں اسی مقصد کے لئے تو تیار کیا ہے۔ بغیر کسی خوف وندامت کے اپنی جیبوں کو سونے سے بھر لو۔ اس علاقے کو حاصل کرو جس کے حصول کے لئے پیدا ہوئے ہو اور امید رکھو کہ اس دنیا سے جانے کے بعد جنت تمہاری منتظر ہے۔''

چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں پہلی کروسیڈ مسلم علاقوں میں پہنچی تو مقامی باشندوں کو ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ ان سے کیا معاملہ کیا جائے۔ ابتداء میں تو وہ سمجھے کہ یہ مداخلت کار بلقان کے کرائے کے سپاہی ہیں اور شاہ قسطنطنیہ کے لئے کام کر رہے ہیں۔ پہلا مسلمان حکمران جس نے ان کا مقابلہ کیا وہ ایک سلجوقی شہزادہ، قلیج ارسلان تھا جو مشرقی اناطولیا کا حکمران تھا اور اس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ سے تین روز کی مسافت پر واقع شہر نیقیہ (Nicaea) تھا۔ ۱۰۹۶ عیسوی کی گرمی کے دنوں میں ایک دن شہزادہ ارسلان کو اطلاع ہوئی کہ اس کے علاقے میں کچھ عجیب وغریب بود باش کے جنگجو سپاہی نظر آئے تھے۔ لیکن بقیہ بس ساتھ میں اکٹھا ہو جانے والی بھیڑ جیسے تھے۔ تقریباً سبھی کے سروں پر انکے لباس میں سرخ رنگ کا صلیب نما کپڑا ٹکا ہوا تھا۔ ارسلان نے ان کا پیچھا کیا اور ان پر نظر رکھی۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ اپنے آپ کو فرینک (Frank) کہتے تھے جبکہ مقامی ترک اور عرب آبادی نے انھیں الفرانج (فرنج) کہا۔ ان دخل اندازوں نے برملا کہا کہ وہ دور دراز علاقوں سے مسلمانوں کو قتل کرنے اور یروشلم پر قبضہ کی غرض سے آئے ہیں لیکن پہلے وہ نیقیہ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ جس راستے سے وہ لوگ آنے والے تھے اس پر ارسلان نے ایک منصوبہ بنایا اور چھاپا مارا۔ اور چیونٹیوں کی طرح انھیں مسل دیا۔

بہت سے لوگ تو مارے گئے اور کتنے ہی گرفتار ہوئے اور باقی ماندہ بازنطینی علاقوں کی طرف فرار ہو گئے۔ یہ سب کچھ اتنا آسان تھا کہ ارسلان نے مزید توجہ نہ دی۔

ارسلان کو یہ اندازہ نہ تھا کہ یہ لوگ ایک ایسی تحریک کا خستہ حال اور گنوار و غیر منظّم ہراول دستہ ہیں جو آنے والی کئی صدیوں تک بحر روم کے ساحلی علاقوں کی مسلم آبادیوں کو پریشان کرنے والے ہیں۔ پوپ اُربان تو اشرافیہ کو مونیٹسری سے دعوت دے رہا تھا جبکہ ایک آوارہ گرد پیٹر دی ہرمٹ (Peter the Hermit) یہی پیغام عام لوگوں کو گلی کوچوں میں دے رہا تھا۔ پوپ اُربان معاشرہ کے شرفاء و نائٹس سے مخاطب تھا لیکن اسکی دعوت تمام عیسائیوں کے لئے تھی اور یہ بھی کہ جو بھی عیسائی کروسیڈ کرنے جائے گا اس کے گناہ معاف ہو سکتے تھے۔ چنانچہ پیٹر دی ہرمٹ آبادی کے ہر طبقہ کے افراد کو شامل کر رہا تھا جس میں کسان بھی تھے، دستکار بھی تھے، تاجر طبقہ تھا، بلکہ عورتیں اور بچے بھی۔ اس کے یہ رضا کار باقاعدہ فوج کی شکل میں منظّم ہونے سے قبل ہی چل پڑے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس فوج کو منظّم ہونے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بنیادی طور پر وہ خدا کے کام کے لئے نکلے تھے۔ خدا خود ہی ان کا انتظام کرلیتا۔ ہزاروں کی تعداد میں یہ موچی، چمار، قصائی، کسان، اور اس طرح کے دوسرے افراد تھے جنھیں شہزادہ ارسلان تباہ کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔

اگلے سال ارسلان کو اطلاع ملی کہ فرنج پھر آرہے ہیں تو اس نے کندھے جھٹک کر اس خطرہ کو غیر اہم قرار دیا۔ لیکن صلیبیوں کی یہ فوج واقعی فوجی سرداروں اور تیر اندازوں پر مشتمل تھی اور تجربہ کار فوجی کمانڈروں کی نگرانی میں تھی۔ ارسلان کی فوج نے جس طرح اس فوج کا مقابلہ کیا وہ ایسا ہی تھا جیسے ہلکے پھلکے شہسوار ٹینکوں پر تیروں کی بارش کر رہے ہوں۔ مغربی یورپ کے یہ فوجی سردار آج کے ٹینکوں کے مانند تھے۔ ترکوں نے پیدل دستوں کا تو خوب مقابلہ کیا لیکن ان کے پیچھے جو نائٹس موجود تھے انھوں نے دفاعی ٹکڑیاں بنالیں۔ جنھیں تیر بھی پار نہ کر سکے اور اس طرح یورپی فوجوں کی حرکت جاری رہی۔ انھوں نے ارسلان کے شہر کو فتح کرلیا اور اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ جو اپنے ایک بھائی کے یہاں پناہ گزیں ہوا۔ نائٹس کا ایک حصہ ارفہ (Edessa) کی جانب پیش قدمی کرتا رہا اور باقی بحر روم کے ساحلی شہر انطاکیہ کی طرف بڑھے۔

انطاکیہ کے باشاہ نے دمشق کے بادشاہ سے مدد کی اپیل کی جس کا نام ''دقوق'' تھا۔ شاہ دمشق مدد کا خواہاں تھا لیکن اسے یہ خوف لاحق تھا کہ اس کی غیر حاضری میں اس کا بھائی رضوان شاہ حلب و دمشق پر قبضہ نہ کرلے۔ موصل کا حکمراں مدد کے لئے تیار ہوا لیکن راستہ میں کسی اور سے جنگ چھڑ گئی۔ وہ مدد کے لئے پہنچا تو سہی لیکن تاخیر ہو چکی تھی۔ لیکن یہاں پہنچ کر اس کی جنگ دقوق یعنی شاہ دمشق سے ہوگئی کیونکہ وہ بھی مدد کے لئے تو آ گیا تھا لیکن تاخیر سے ہی آیا تھا۔ چنانچہ یہ دونوں مسلم قوتیں انطاکیہ کی مدد کے بغیر واپس ہو گئیں۔

مسلمانوں کی طرف سے صلیبیوں کے جواب کی کہانی شہر در شہر مسلمان حکمرانوں کے آپسی اختلاف سے عبارت ہے۔ جب انطاکیہ مفتوح ہوا تو عیسائی فوجوں نے شہریوں کی دفاعی کوششوں کا بھرپور بدلہ لیا۔ بے دریغ قتل عام کیا اور پھر جنوب کی سمت شہر معارا کی طرف کوچ کر گئے۔

نیقیہ اور انطاکیہ میں جو کچھ ہو چکا تھا اس سے معارا کے لوگ خوفزدہ تھے۔ انھوں نے بھی قریبی عزیزوں کو مدد کے پیغامات بھیجے لیکن وہ لوگ خوش تھے کہ یورپی بھیڑئے معارا کے درپے ہیں۔ ہر ایک کو امید تھی کہ فرنج کے جانے کے بعد یہ شہر ہمارے قبضہ میں آ جائیگا۔ اس طرح معارا کو تنہا ہی فرنج کا سامنا کرنا تھا۔

عیسائی نائٹس نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور شہریوں کو انتہائی پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ لیکن اس دوران وہ خود بھی انتہائی تکلیفوں کا شکار ہو گئے۔ کیونکہ قرب و جوار کی ہر چیز کو وہ کھانے کے لئے استعمال کر چکے تھے اور اس طرح وہ بھوکوں مرنے شروع ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ حملہ آوروں کو کھلانے کے لئے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ دور دراز علاقوں میں طویل محاصروں کے ساتھ یہی مسائل تھے۔

بالآخر فرنج قائدین نے معارا کے لوگوں کو پیغام بھیجا کہ وہ شہر کے دروازے کھول دیں تو انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائیگا۔ شہر کے بڑوں نے ان کی درخواست کو قبول کرنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن جیسے ہی یہ صلیبی شہر میں داخل ہوئے انھوں نے قتل عام کے علاوہ بھی بہت کچھ کیا۔ انھوں نے ہولناک بربادی کے دوران نوجوان مسلمانوں کو ابال کر سوپ بنایا۔ مسلمان بچوں کو تھوک میں ڈال کر میخوں میں چھیدا اور کھلی آگ میں انھیں بھون کر کھا لیا۔

یہ ایک خوفناک پروپیگنڈہ سا لگتا ہے جسے ہارے ہوئے مسلمانوں نے تراشا تا کہ صلیبیوں کو بدنام کیا جا سکے۔ لیکن انسانوں کو کھانے سے متعلق صلیبیوں کے بارے میں اطلاعات فرینکش اور عربی ذرائع سے بھی ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر Radulph of Caen نے جو اس کا چشم دید گواہ ہے ابالنے اور بھوننے کے بارے میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح Albert of Aix جو معارا کی فتح پر موجود تھا، لکھا ''نہ صرف ہمارے فوجی مردہ ترکوں اور مسلمانوں کو کھانے میں نہیں جھجکتے بلکہ انھوں نے کتوں کو بھی کھایا[2]۔'' اس بیان سے جو چونکا دینے والا نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک ترکوں اور مسلمانوں کو کھا جانے سے زیادہ خراب بات کتوں کا کھا لینا تھا۔ مزید میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ کم سے کم لکھنے والا یہ فرنج ترکوں اور اپنے آپ کو مختلف نوع سمجھتا تھا۔

لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ اس دردناک انجام سے دوچار ہونے کے باوجود مسلمان متحد نہ ہو سکے۔ جس کی متعدد مثالیں ہیں۔ حمص (Homs) کے حکمران نے فرنج کو گھوڑوں کا تحفہ پیش کرتے ہوئے انھیں یہ مشورہ بھی دیا کہ اب وہ کس علاقے پر حملہ کریں۔ ترپیولی کے حکمراں نے فرنج کے ساتھ مل کر اپنے شیعہ مخالف کو زیر کرنے کے لئے مشورہ دیا۔ اس مشورہ کے برخلاف فرنج نے ترپیولی ہی پر قبضہ کر لیا۔

جب صلیبی پہلے پہل آئے تو مصری وزیر الافضل نے بازنطینی بادشاہ کو یہ کمک پہنچانے پر مبارکباد دی

اور ان کی کامیابی کے لئے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مصر سلجوقیوں اور عباسیوں سے جھوجھتا رہا تھا اور الافضل کو یہ توقع تھی کہ یہ نو واردان اس کے لئے معاون ثابت ہونگے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور جب آئی تو تاخیر ہو چکی تھی کہ خود مصر کو بھی یہ لوگ تباہ کر سکتے ہیں۔ انطاکیہ کی تباہی کے بعد فاطمی وزیر نے فرنجیوں کو لکھا کہ وہ ان کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ جب فرنج تریپولی کی طرف بڑھے تو الافضل نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یروشلم پر فاطمی خلیفہ کے اثرات مضبوط کرنے کی خاطر فرنجیوں کو لکھا کہ اگر یہ علاقہ ہمارے قبضہ میں آ گیا تو ہم انھیں یروشلم میں باعزت اور قابل احترام زائرین کی طرح خوش آمدید کہیں گے۔ اور ان کی حفاظت کی جائے گی۔ انھوں نے یروشلم کا اپنا گورنر بھی نامزد کر دیا۔ لیکن فرنجیوں نے جواباً لکھا کہ انھیں اپنی حفاظت میں دلچسپی نہیں بلکہ ان کی اصل دلچسپی تو یروشلم میں ہے[3]۔

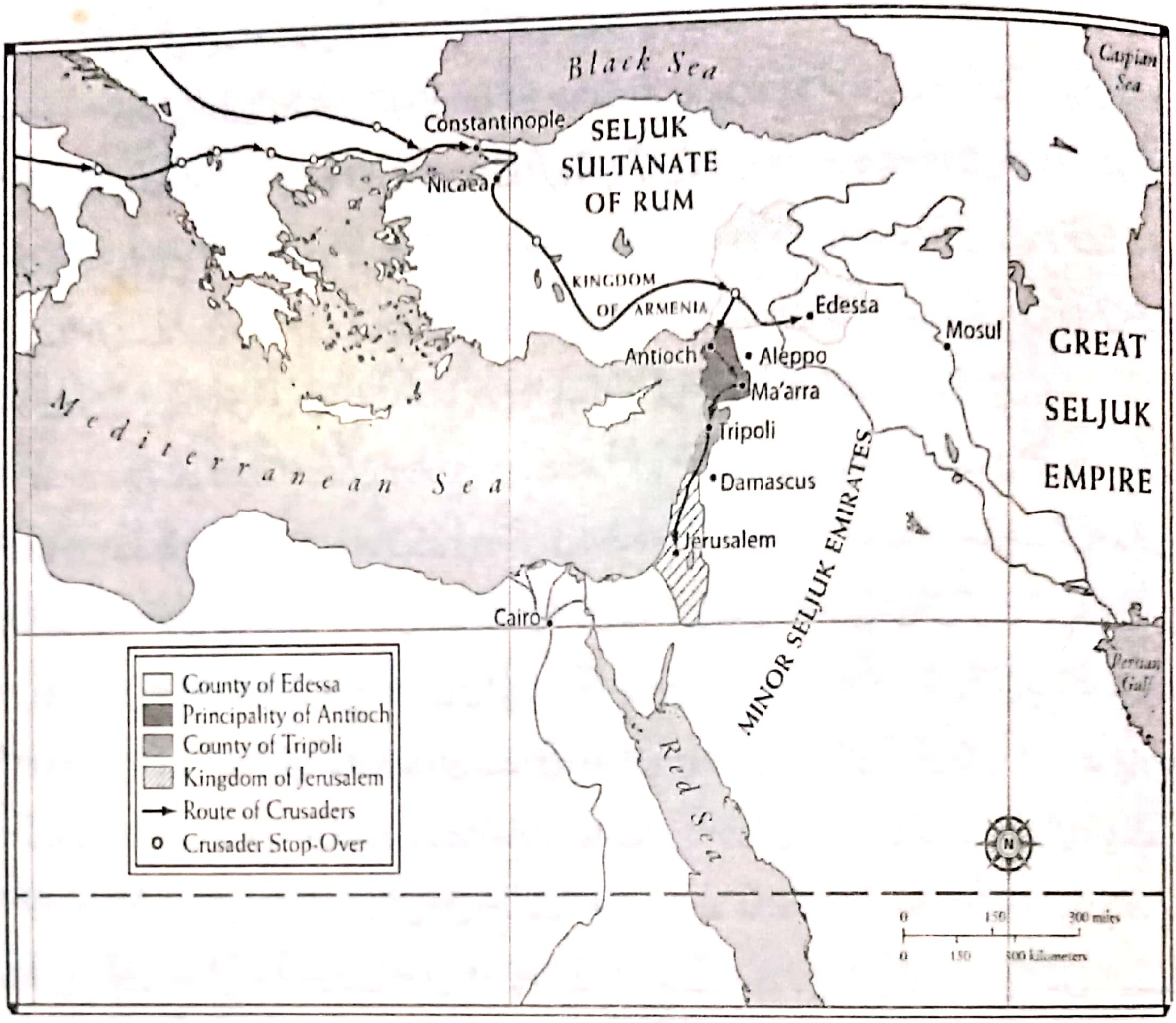
فرنج فوجیں آگے بڑھتی رہیں اور انھیں کوئی مخالفت پیش نہیں آئی کیونکہ پورا ملک خالی ہو چکا تھا۔ فرنجیوں کا خوف و دہشت افواج سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے سفر کر رہا تھا۔ دیہاتی آبادیاں ان کے آتے ہی علاقے خالی کر گئیں اور چھوٹی چھوٹی شہری آبادیاں یروشلم کے شہر میں جمع ہو گئیں جس کی بلند و بالا دیواریں محفوظ سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن چالیس دن کے محاصرہ کے بعد انھوں نے وہی چال چلی جو اس سے قبل وہ معارا میں چل چکے تھے۔ دروازے کھول دو شہریوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائیگا۔ اور یہاں بھی اس چال نے کام کیا۔

شہر کو حاصل کر لینے کے بعد فرنج نے جس بربریت اور خون خرابے کا ارتکاب کیا اس کے سامنے ظلم کی گذشتہ داستانیں معمولی نظر آنے لگیں۔ ایک صلیبی نے اس کامیابی کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ سروں، ہاتھوں اور پیروں کے ڈھیر لگا دیئے گئے۔ اس منظر کو اس نے دل خوش کن منظر قرار دیا۔ اس نے لکھا کہ فرنجیوں کے گھوڑے گھٹنوں گھٹنوں اور ان کی لگامیں دہانے تک مسلمانوں کے خون میں ڈوب کر چل رہے تھے[4]۔ معروف برطانوی مورخ ایڈورڈ گبن جس نے سلطنت روما کے زوال کا روزنامچہ لکھا ہے کہتا ہے کہ محض دو روز میں ستر ہزار افراد قتل کئے گئے اور بظاہر شہر کا کوئی مسلمان باقی نہیں بچا تھا۔

شہر کے یہودیوں نے مرکزی اور وسیع و عریض سائناگوگ میں پناہ لے لی اور جب وہ اندر گناہوں سے توبہ کر رہے تھے تو صلیبیوں نے تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیے اور عمارت کو آگ لگا دی۔ یروشلم کی تمام یہودی آبادی اس ایک ناگہانی عمل میں جل کر ختم ہو گئی۔

شہر کے مقامی عیسائی بھی اس صورتحال سے نہ بچ سکے۔ کسی بھی مقامی عیسائی کا تعلق رومی چرچ سے نہ تھا بلکہ وہ دوسرے مشرقی چرچوں مثلاً یونانی، آرمینیائی، کوپٹک، اور نیسٹورین چرچوں سے منسلک تھے۔ فرنج ان عیسائیوں کے عقائد کو گمراہی تصور کرتے تھے۔ اور خیال یہ تھا کہ یہ لوگ گمراہ مسلمانوں سے بھی بدتر ہیں۔ چنانچہ ان کی جائدادوں سے انھیں محروم کر دیا گیا اور انھیں شہر بدر کر دیا گیا۔

یروشلم پر قبضہ فرنجی حملہ کا عظیم ترین لمحہ تھا۔ فاتحین نے یروشلم کو ایک سلطنت کی حیثیت دی۔ مملکت



کروسیڈس یعنی صلیبی جنگیں

یروشلم، ان چار سلطنتوں میں عظیم ترین تھی جو انھوں نے انطاکیہ، اُرفا (Edessa) اور تریپولی میں قائم کی تھیں۔

ان چار صلیبی مملکتوں کے قائم ہوجانے کے بعد ایک قسم کا تعطل قائم ہوگیا جو دسیوں سال تک قائم رہا۔ اس دوران طرفین میں کبھی کبھی ٹکراؤ ہوجاتا تا جن میں کبھی فرنج کامیاب رہے اور کبھی مسلمان۔ وہ مسلمانوں پر حملہ آور ہوتے اور خود ان پر بھی حملہ ہوتے۔ وہ آپس میں بھی ٹکراتے۔ بالکل اسی طرح جیسے مسلمان آپس میں ٹکراتے رہتے تھے۔ کبھی وہ کسی مسلمان حکمراں سے عارضی معاہدہ کرلیتے تاکہ اپنے فرنج دشمن کے اوپر فائدہ اٹھاسکیں۔

اس طرح غیر فطری معاہدے بنتے اور بگڑتے رہے۔ ایک جنگ میں انطاکیہ کے عیسائی بادشاہ تانکریڈ (Tankred) کا ٹکراؤ موصل کے مسلم امیر جوالی (Jawali) سے ہوا جس میں انطاکیہ کی ایک تہائی فوج ترک جنگجوؤں پر مشتمل تھی جو اسے حلب کے مسلم فرمانروا نے مہیا کرائی تھی۔ حلب کے باشاہ نے حسن صباح کے اساسنز سے معاہدہ کررکھا تھا جو صلیبیوں سے بھی معاہدہ میں جڑے ہوئے تھے۔ دوسری طرف جوالی کی فوج میں اُرفا کے بادشاہ بالڈون کی طرف سے قرض پر دیئے گئے فرنچ نائٹس لڑ رہے تھے۔ شاہ بالڈون اور شاہ

ٹانکریڈ[۵] میں دشمنی تھی۔ صورتحال کا اندازہ ان مثالوں سے واضح ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں میں حیرت انگیز حد تک اتحاد ناپید ہو چکا تھا۔ ایک حد تک تو مسئلہ یہ تھا کہ مسلمان جس تشدد اور بربریت کا شکار ہو رہے تھے اس میں انھیں مذہبی منافرت کا پہلو نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سمجھتے کہ یہ جنگیں ان پر مسلمانوں کی حیثیت میں نہیں بلکہ انفرادی طور پر اور شہروں اور ریاستوں کے خلاف ہو رہی ہیں۔ انھوں نے فرنج کے ظلم و بربریت کو دیکھ لیا تھا لیکن اس میں انھیں کوئی معنویت نظر نہیں آئی تھی بس جیسے زلزلے آتے ہیں تو تباہی آتی ہی ہے۔ اگر سانپوں کا ایک جھنڈ نکل پڑے تو خطرات ہوتے ہی ہیں۔

صحیح ہے کہ یروشلم کے قتل اور خونریزی کے بعد بعض مبلغین نے اسے مذہبی جنگ کی حیثیت دے کر مسلمانوں کے جذبہ مزاحمت کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ علماء اور مصنفین نے خطبات اور تصانیف میں صدیوں بعد لفظ جہاد استعمال کیا۔ یہ لفظ مسلمانوں کے لئے نئی اور عجیب و غریب سی اصطلاح بن چکی تھی کیونکہ صدیوں قبل اس کا استعمال ہونا ہی متروک ہو گیا تھا جس کی ایک وجہ تو اسلام کا وسیع و عریض علاقوں میں پھیل جانا تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد سرحدوں سے اتنی دور رہتی تھی کہ کوئی ایسا دشمن تھا ہی نہیں جس سے جہاد کیا سکتا ہو۔ اسلام کا یہ ابتدائی تصور کہ یہ دنیا سے متصادم ہے اب اس تصور میں بدل چکا تھا کہ اسلام ہی دنیا ہے۔ جنگوں کی اکثریت جن کے بارے میں اس دور کے مسلمانوں نے سنا ہوگا اور یاد رہی ہونگی وہ بنیادی طور پر علاقوں پر قبضے، وسائل اور قوت کے حصول جیسے چھوٹے مقاصد کے لئے لڑی گئیں تھیں۔ ایسی جنگیں جن کے بارے میں نظریاتی اور بامقصد جدوجہد کا تصور ابھرتا ہوگا وہ کبھی بھی اسلام بمقابلہ غیر اسلام نہیں بلکہ کس کا اسلام حقیقی اسلام ہے کے مقصد کے لئے لڑی گئی تھیں۔

عالم اسلام کی اس صورتحال میں کچھ تفرقہ تو ہونا ہی تھا۔ سانپوں بھری اس دلدل میں جب فرنج گر ہی گئے تو بکھرے مسلمانوں نے ان کو بھی اس ڈرامہ کا حصہ بنا لیا۔ صلیبی جنگیں شروع ہونے سے پہلے اساسنز سے سب ہی کو نفرت تھی اور ہر طاقت انھیں شکار کرنے پر تلی ہوئی تھی جن میں شیعہ بھی تھے اور سنی بھی۔ سلجوقی ترک بھی تھے اور مصر کے فاطمی بھی اور عباسی خلافت بھی ان کی دشمن تھی۔ کیونکہ صلیبی جنگوں کا نشانہ بھی یہ سب ہی تھے اور یوں دونوں یعنی صلیبیوں اور اساسنز کا نشانہ گویا مشترک تھا۔ اس لئے وہ حقیقتاً ایک دوسرے کے ساتھی اور مددگار ہو گئے تھے۔

فرنجی حملوں کی پہلی صدی کے دوران جب بھی مسلمان اتحاد کی طرف گامزن ہوتے اساسنز کسی ایسی شخصیت کو قتل کر ڈالتے جس سے اس ابھرتے ہوئے اتحاد میں رخنہ پڑ جاتا۔ اساسنز بعض انتہائی اہم شخصیات کو قتل کر کے انتشار میں اضافہ کرنے میں کامیاب رہے۔

۱۱۱۳ء میں موصل کے گورنر نے مسلمان رہنماؤں کی ایک کانفرنس فرنجیوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کے لئے منعقد کرنا چاہی۔ میٹنگ کے آغاز سے پہلے گورنر جب مسجد جا رہے تھے تو ایک بھکاری نے ان کا

راستہ روکا اور بظاہر کچھ صدقہ مانگا اور پھر اچانک ہی سینے میں چاقو اتار دیا۔ اتحاد قائم کرنے کی یہ قیمت تھی۔

۱۱۲۴ عیسوی میں ایک اساسن نے ایک سب سے بڑے مبلغ کو قتل کر دیا جو جہاد کی دعوت دے رہے تھے۔ دوسرے سال بظاہر صوفیوں کے ایک گروہ نے اس طرح کے دوسرے ایسے ہی مبلغ کو قتل کر دیا جو جہاد کی طرف بلانے میں بہت موثر رول ادا کر رہے تھے۔ یہ اس زمانہ کی اولین شخصیتیں تھیں جنھوں نے دعوت جہاد کو زندہ کیا تھا۔

۱۱۲۶ عیسوی میں اساسنز نے حلب اور موصل کے طاقتور بادشاہ البروسکی کو قتل کر دیا۔ جنھوں نے ان دو شہروں کو متحد کر کے شام میں ایک متحدہ مملکت اسلامیہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ بروسکی نے احتیاطاً کپڑوں کے نیچے آہنی لباس پہننا شروع کر دیا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اساسنز اس کے گرد موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی جھوٹے صوفیوں نے حملہ کیا ان میں سے ایک چلّایا کہ سر کو نشانہ بناؤ۔ انھیں آہنی لباس کے بارے میں علم تھا۔ بروسکی گردن کی زخم سے ہی فوت ہوئے۔ انتقال کے فوراً بعد اس کے بیٹے نے حکومت سنبھالی اور ممکن ہے کہ وہ اس مملکت کو بچا لے جاتا لیکن اساسنز نے اسے بھی قتل کر دیا اور یوں شہر کے تخت کے چار دعوے داروں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔

صلیبی جنگوں کی ابتداء میں اس قسم کے قتل حیرت انگیز تعداد میں ہوئے۔ کچھ کے بارے میں یہ ثابت ہی نہ ہو سکا کہ وہ اساسنز کی کارستانی تھی۔ لیکن جب دہشت انگیزی عام ہو جائے تو دہشت گردوں کو خود ہی قتل عام کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ وہ کسی بھی قتل کو اپنا کارنامہ بتا کر اپنے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ بظاہر تو وہ اپنے کاموں کا مفصل رکارڈ رکھتے تھے لیکن وہ انتہائی رازدارانہ طور پر رہتے اور اپنا کام کرتے تھے۔ کسی بیرونی فرد کے لئے ان تفصیلات تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ اور جب ۱۲۵۶ عیسوی میں منگولوں نے اس گروہ کا خاتمہ کیا تو ان کے پاس رکارڈ مکمل طور پر برباد ہو گئے اور اس طرح تاریخ سے بھی مٹ گئے۔ چنانچہ کسی کو نہ معلوم ہو سکا کہ کتنے قتل اساسنز سے منسوب کئے گئے تھے وہ واقعی انھیں کی کارستانی تھی۔ افواہوں سے پتہ چلتا ہے کہ اساسنز نے اپنے وقت پر بڑا زبردست اثر ڈالا تھا۔ لیکن ہمیں صلیبی جنگوں پر ان کے اثرات کا علم کبھی نہ ہو پائے گا کیونکہ یہ رکارڈ ختم ہو چکا۔

فرنجیوں کے خلاف ہوا کا رخ کس طرح بدلا اس میں بعض مسلمان لیڈروں کے ایک سلسلہ کا گہرا دخل ہے۔ جس میں ایک اپنے پیشرو سے زیادہ موثر اور عظیم تر تھا۔ ان میں سب سے پہلا ایک ترک جرنل زنگی تھا جو موصل کا حکمراں تھا۔ اس نے حلب پر قبضہ کیا اور پھر دوسرے بڑے شہروں کو بھی شامل کر لیا اور اس طرح وہ متحدہ شام کا بادشاہ کہلانے لگا۔ گذشتہ پچاس سالوں میں ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ لیوانت یعنی میسوپوٹامیہ اور مصر کے اس درمیانی علاقے میں کسی ایک شہر سے زیادہ وسیع ایک مسلم مملکت ظہور میں آئی تھی۔

زنگی کے سپاہی اس کا بڑا احترام کرتے تھے اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ بنیادی طور پر ایک سپاہی تھا اور

اپنے آدمیوں کے ساتھ اتنی ہی سادگی اور محنت کشی سے رہتا تھا جتنا کہ عام سپاہی۔ جلد ہی وہ اسی نتیجہ پر پہنچ گیا کہ اس وقت تمام مسلمانوں کا ایک ہی دشمن ہے اور جلد ہی اس دشمن کے خلاف تیاری کرنے لگا۔ آغاز کے طور پر سب سے پہلے اس نے اپنی اندرونی کمزرویاں ختم کرنے کی کوشش کی جس کے لئے خوشامدیوں سے اپنے دربار اور فوج کو پاک کیا۔

دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ مخبروں کا ایک جال پھیلا دیا جو پورے شام میں خبروں اور واقعات کو عوام تک پہنچاتے۔ جس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ گورنر ہمیشہ چوکنا رہتے۔

۱۱۴۴عیسوی میں زنگی نے جب اُرفا فتح کیا تو وہ عالم اسلام میں انتہائی ہردل عزیز اور ہیرو بن گیا۔ یہ شہر بہت بڑا نہ تھا البتہ اس کی اہمیت یہ تھی کہ یہ فرنجیوں سے واپس لیا جانے والا پہلا کسی حد تک بڑا شہر تھا اور مزید یہ کہ اس شہر پر قبضہ کے بعد صلیبیوں کے ذریعہ قائم کی جانے والی چار ریاستوں میں سے ایک ختم ہوگئی۔ اس کے نتیجہ میں لیوانت کے پورے علاقے میں امید کی فضا پھیل گئی لیکن مغربی یورپ میں غم وغصّہ اور جنگ کی حمایت میں ماحول گرم ہونے لگا۔ اور کچھ بادشاہوں نے ملکر پھر ایک بار یورپیوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے متحد کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔ لیکن اس کے نتیجہ میں ہونے والی دوسری صلیبی جنگ انتہائی غیر موثر ثابت ہوئی۔

زنگی ان علماء اور مبلغین کی حمایت کرتا تھا جو جہاد کی دعوت دے رہے تھے۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ جہاد مسلمانوں کو متحد رکھنے میں بڑا معاون ہے۔ لیکن بد قسمتی سے زنگی جہاد کی اس تحریک کی اچھی طرح نگرانی نہ کر سکا۔ کیونکہ ایک تو وہ شراب کا عادی تھا اور دوسرے یہ کہ وہ بدگو اور تُرش رو بھی۔ یہ صفات جہاں اس کو اپنے آدمیوں میں محبوب رکھتی تھیں وہ علماء کے اس سے دور رہنے کا ذریعہ بھی تھیں۔ لیکن زنگی کی کوششوں نے فرنجیوں کے خلاف ایک ماحول پیدا کردیا۔ جو تحریک کی شکل اختیار کر گیا تھا اور جسے کوئی آنے والا شخص جہادی رخ دے سکتا تھا۔

اس کا بیٹا نورالدین زنگی ان صلاحیتوں کا حامل تھا جو اس کے باپ میں نہیں تھیں۔ باپ سے اسے سپاہیانہ صلاحیتیں ملی تھیں البتہ نورالدین ایک مہذب، سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والا اور ایک مخلص مسلمان بھی تھا۔ اس نے مسلمانوں کو ایک عقیدہ (سنّی اسلام) پر متحد ہونے کی دعوت دی اور کہا کہ جہاد کو اپنی زندگی کا مرکزی مقصد بنالیں۔ اس کی تصویر ایک ایسے شخص کی سی ہوگئی جو اپنی انا کے لئے نہیں، دولت کے لئے نہیں، اقتدار کے لئے نہیں بلکہ مسلمانوں کی بہتری کے لئے جنگ کرتا ہے۔ مسلمانوں میں ایک متحد اور واحد امت کے جذبات پیدا کرکے اس نے انھیں مستقبل کا تصور یاد دلا دیا۔ جوشِ جہاد پیدا کیا جسے کوئی عظیم تر حکمراں بڑی سیاسی کامیابی میں تبدیل کرسکتا تھا۔

یہ عظیم حکمراں صلاح الدین یوسف بن ایوب کی شکل میں سامنے آیا جو بالعموم صلاح الدین ایوبی کہلاتا

ہے۔ یہ نورالدین زنگی کے سب سے بڑے فوجی جرنیل کا بیٹا تھا۔ ۱۱۶۳ء میں نورالدین نے صلاح الدین کے چچا کو مصر فتح کرنے کی غرض سے روانہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ اسے فرنجیوں سے محفوظ رکھا جا سکے۔ فوجی جرنل نے اپنے بھتیجے صلاح الدین کو بھی اپنے ساتھ رکھا۔ جرنل مصر کو فتح کرنے میں تو کامیاب رہا لیکن جلد ہی اس کا انتقال ہو گیا اور یوں اس کی جگہ صلاح الدین نے پر کی۔ اصولاً تو اس وقت مصر فاطمی خلافت کا حصہ تھا جس کی تمام تر ذمہ داریاں وزیر کے ہاتھ میں تھیں۔ مصری حکومت نے خوشی کے ساتھ صلاح الدین کو وزیر کے طور پر قبول کر لیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ درباریوں کے خیال میں صلاح الدین کی ۲۹ سالہ کم عمری اور ناتجربہ کاری انھیں اسے استعمال کرتے رہنے میں معاون ہوتی اور وہ اسے اپنا آلہ کار بنائے رکھتے۔

اپنے چچا کی سرپرستی میں رہتے ہوئے صلاح الدین کی عظمت ذرا کم ہی کھلی تھی۔ بنیادی طور پر وہ ایک خلوت پسند اور محتاط شخصیت کا مالک تھا اور غلطیوں پر حلیمانہ رویہ اختیار کرتا تھا۔ اور جنگ کی طرف کسی میلان کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ جب اس نے مصر کی ذمہ داری سنبھالی تو اسے نورالدین کا حکم ملا کہ فاطمی خلافت بالکل ختم کر دی جائے البتہ اس حکم نے اسے ایک قسم کے کرب میں مبتلا کر دیا۔ اس وقت فاطمی خلیفہ محض بیس سالہ کمزور سا نوجوان تھا جو عملاً کسی بھی طرح سے کسی پر حکمراں نہیں تھا۔ اور اس کی حیثیت محض ایک کھٹ پتلی کی سی تھی۔ صلاح الدین ایسے بے ضرر شخص کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ صلاح الدین نے حکم کی پابندی تو کی لیکن خلافت کو اتنی خاموشی سے ختم کیا کہ خلیفہ کو اس کا پتہ بھی نہ چل سکا۔ ایک جمعہ کے دن نماز کے لئے اس نے کسی شہری سے کہا کہ خطبہ دے اور اس میں بغداد کے عباسی خلیفہ کے ساتھ عہد وفا کا اظہار کرے۔ اس پر کسی نے احتجاجاً کچھ نہ کہا اور یوں عہد پورا کر دیا گیا۔ کمزور ونحیف لیکن نوجوان خلیفہ کا جلد ہی انتقال ہو گیا جسے یہ احساس بھی نہ تھا کہ اب وہ ایک عام شہری تھا اور اس کی خاندانی حکمرانی ختم ہو چکی ہے۔ اس کی موت نے صلاح الدین کو مصر کا تنِ تنہا حکمراں بنا دیا۔

اور اب صلاح الدین کے مفروضہ حاکم سے اس کی نزاع کا سلسلہ شروع ہوا۔ نورالدین اس کے ساتھ ملاقاتوں کا پروگرام بناتا رہا اور صلاح الدین شرکت نہ کر پانے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈھتا رہا۔ کبھی والد کی بیماری اور کبھی خود پر موسم کا اثر ہمیشہ کچھ نہ کچھ ہو جاتا۔ لیکن صحیح بات یہ تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ اگر اس کی حاکم سے بالمشافہ ملاقات ہو گئی تو یہ تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ کیونکہ وہ خود حاکم کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بڑے علاقے کا حکمراں تھا۔ اس کا ملک نورالدین سے کہیں زیادہ طاقتور بھی تھا۔ صلاح الدین مسلمانوں کا ایک ابھرتا ہوا راہنما تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اس مرحلہ میں نورالدین سے جھگڑا ہو۔ چنانچہ وہ ایسا ہی ظاہر کئے رہا کہ وہ نورالدین کا تابع ہے تا آنکہ بوڑھے نورالدین کا انتقال ہو گیا۔ اب صلاح الدین نے اپنے آپ کو مصر و شام کا بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ نورالدین کے بعض وفاداروں نے صلاح الدین کو برا بھلا کہتے ہوئے اسے ایک بے وفا نودولتیہ قرار دیا اور کہا کہ وہ مغرور اور بے وقوف ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ وہ وقت کے دھارے کی

مخالفت کر رہے تھے۔ مسلمانوں کا نجات دہندہ آ چکا تھا۔

وہ ایک خفیف جسم کا مالک تھا۔ فکر مند رہتا اور آنکھوں سے افسردگی کا اظہار ہوتا لیکن جب وہ مسکراتا تو کمرہ میں روشنی پھیلا دیا کرتا تھا۔ اتنا مخیّر تھا کہ اپنے آپ کو تنگ دستی میں مبتلا کر لیتا۔ خاکساروں کے ساتھ خاکساری کے رویہ سے پیش آتا۔ لیکن طاقتور لوگوں کے ساتھ شاہانہ انداز سے ملتا۔ کسی کے اندر یہ ہمت نہ تھی کہ اسے پست ہمت کر سکے۔ جب وہ کسی پر اختیار حاصل کر لیتا تو کبھی بھی اسے دھمکانے اور ڈرانے کی کوشش نہ کرتا۔ فوجی اعتبار سے وہ غیر معمولی نہ تھا۔ اس کی اصلی طاقت اس حقیقت میں پوشیدہ تھی کہ عوام اس سے محبت کرتے اور اسے پسند کرتے تھے۔

کوئی دلخراش خبر سن کر صلاح الدین کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اپنے وسائل سے بڑھ کر اور بے پرواہو کر تواضع کرتا اور عنایات و اکرام کرتا۔ ایک بار ایک فرنجی تباہ حال عورت اس کے پاس آئی کہ لٹیروں نے اس کی بیٹی کا اغوا کر لیا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس کے پاس جائے اور کیا کرے۔ صلاح الدین نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس کی بیٹی کو تلاش کریں جو انھیں غلاموں کے بازار میں مل گئی۔ اسے واپس لایا گیا اور اس کی ماں کے حوالہ کر دیا گیا۔ اور پھر یہ دونوں فرنجیوں کے کیمپ میں لوٹ گئیں۔

اپنی ذات میں صلاح الدین ایک دُرویش صفت انسان تھا۔ بالکل نورالدین کی طرح اس کی خواہشات اپنے لئے بہت کم ہوتیں اور دوسروں کے لئے زیادہ۔ وہ مذہبی تو تھا لیکن اس میں وہ تنگ نظری نہ تھی جس نے نورالدین کی شخصیت کو مجروح کر دیا تھا۔

اساسن نے صلاح الدین کو قتل کرنے کی بڑی سخت کوششیں کی تھیں اور کوئی دو مرتبہ وہ اس کے سونے کے کمرے تک پہنچ بھی گئے تھے اور ایک بار انھوں نے اس کی گردن پر وار کرتے ہوئے اسے زخمی بھی کر دیا تھا۔ لیکن کیونکہ وہ چمڑے کا بنا ہوا گردن کا حفاظتی بند لئے ہوئے اور صافے کے نیچے ایک دھات کا ہیلمٹ بھی پہنے ہوئے تھا اس لئے محفوظ رہا۔ ان دو حملوں کے بعد صلاح الدین نے اساسن کو بالکل ختم کرنے کا تہیّہ کر لیا اور شام میں ان کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا آج تک کسی کو نہیں معلوم۔ کچھ کہتے ہیں کہ شام میں اساسن کے افسر اعلی سنون نے صلاح الدین کے ماموں کو ایک خط بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ اگر محاصرہ نہ اٹھایا گیا تو اس کے خاندان کے تمام افراد قتل کر دئے جائیں گے۔ لیکن اساسن کے اپنے ذرائع یہ کہتے ہیں کہ ایک رات جب صلاح الدین کے مخالفین اسے گھیرے ہوئے تھے اور ہر ممکن حفاظتی تدابیر اختیار کی جا چکی تھیں تو صلاح الدین کی آنکھ کھل گئی اور اس نے ایک ہیولیٰ اپنے خیمے کے قریب سے گذرتے ہوئے دیکھا تو اس کے تکیہ میں ایک پیغام نتھی تھا۔ لکھا تھا ''تم ہمارے اختیار میں ہو''۔ یہ کہانی یقیناً وضعی اور غیر مستند ہے لیکن بات یہ ہے کہ اس وقت لوگ یقین کر لیتے تھے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عوام کے ذہنوں میں اساسن کی قوت کتنی گھر کر چکی تھی۔ البتہ اس بار اساسن کا عام طریقہ کار کام نہ آیا اور ایک نہیں بلکہ دو بار صلاح الدین کے قتل میں وہ ناکام

رہے۔البتہ وہ صلاح الدین کی شکست ناپذیری کے تصور کو مستحکم کرنے میں ضرور کامیاب رہے۔

صلاح الدین بہت محتاط انداز میں قدم اٹھاتا اور کوشش کرتا تھا کہ عوام کو متحد کرنے کے بارے میں جو اس کا تصوّر ہے وہ قائم رہے اور اس کے دشمن بھی نرم ہو جائیں۔صلیبیوں سے اس نے تقریباً وہ تمام علاقے بغیر کسی خون خرابے کے واپس لے لئے جن پر انھوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔اس عمل میں ان کا گھیراؤ، معاشی دباؤ اور گفت وشنید کو بروئے کار لایا۔

۱۱۸۷ء میں جب وہ بالآخر یروشلم کی طرف بڑھا تو اس نے فرنجیوں کو یہ پیغام بھیجا کہ اس شہر کو بھی خون خرابے کے بغیر خالی کردیں۔اور یہ بھی کہا کہ جو عیسائی جانا چاہیں وہ اپنی جائداد بھی لے جاسکتے ہیں۔اور جو لوگ رہنا چاہیں وہ مذہبی طور پر آزاد ہیں اور ان معاملات میں ذرا بھی دخل اندازی نہیں ہوگی۔فرنجیوں نے بڑی ہتک کے ساتھ یروشلم چھوڑنے سے انکار کر دیا جو صلیبیوں کا اصل مقصد اور جدو جہد کا اصل انعام تھا۔چنانچہ صلاح الدین نے بزورِ قوت یروشلم پر قبضہ کر لیا اور پھر وہی رویہ اختیار کیا جو خلیفہ عمرؓ نے اپنے زمانے میں اختیار کیا تھا۔نہ کوئی خون خرابہ نہ لوٹ مار اور نہ بربادی، فدیہ کی ادائیگی پر تمام قیدی آزاد۔

صلاح الدین کے نہایت شریفانہ رویہ کے باوجود یروشلم پر قبضے سے پہلے صلیبی جنگوں سے جو فائدے فرنجیوں کو حاصل ہوئے تھے وہ تہہ وبالا ہوگئے۔یورپ پھر خوف وسراسیمگی کا شکار ہو گیا جس کے نتیجہ میں یورپ کے تین بڑے بادشاہوں نے تیسری صلیبی جنگ کی تیاری کا عزم کیا۔ایک جرمنی کا فریڈرک باربروسا تھا جو محض چندانچ گہرے پانی میں اپنے گھوڑے سے گرا اور ارضِ مقدس کے راستہ میں ہی ڈوب کر مر گیا۔ایک فرانس کا بادشاہ فلپ دوئم تھا جو ارضِ مقدس تک پہنچا اور Port of Acre کی فتح میں حصہ لیا اور پھر تھک کر واپس وطن چلا گیا۔اب صرف انگریز بادشاہ رچرڈ اول تنہا تھا جسے اس کے ہم وطن شیر دل کہتے تھے۔رچرڈ ایک سخت جنگجو تھا لیکن اس شہرت کا مشکل ہی سے حق دار تھا جو اس کے وطن میں اسے بہادری کے نمونہ کی حیثیت میں ملی ہوئی تھی۔ اس نے وعدوں کی خلاف ورزی کی اور جنگ جیتنے کے لئے جائز وناجائز چال چلنے میں اسے کوئی عار نہ تھا۔کوئی ایک سال تک رچرڈ اور صلاح الدین ایک دوسرے کو گھیرنے کی کوشش کرتے رہے۔گو کہ خاص جنگ تو وہ جیتا لیکن جب وہ ۱۱۹۲ء میں یروشلم کا محاصرہ کر رہا تھا تو بیماریوں نے اس کی توانائی کو بہت کم کر دیا اور گرمی کی شدت نے اسے سانس کے مرض میں مبتلا کر دیا۔صلاح الدین نے ازراہِ ہمدردی اسے تازہ کھانا اور ٹھنڈک کے لئے برف روانہ کیا اور منتظر رہا کہ رچرڈ کو اندازہ ہو جائے کہ یروشلم کو واپس لینے کے لئے جو افرادی قوت درکار ہے وہ اس کے پاس نہیں ہے۔بالآخر وہ اور صلاح الدین کچھ شرائط پر رضامند ہوگئے۔وہ شرائط یہ تھیں کہ یروشلم مسلمانوں کے پاس رہے گا لیکن عیسائی عبادت گاہوں کی حفاظت کی جائے گی۔عیسائیوں کو یروشلم میں رہنے اور بلاخوف و خطر عبادت کرنے کی اجازت ہوگی۔عیسائی زائر جب چاہیں انھیں آنے جانے کی اجازت دی جائیگی۔رچرڈ پھر واپس وطن لوٹ گیا اور یہ خبر پہلے سے عام کرادی گئی کہ وہ ایک قسم کی فتح کے بعد واپس آرہا ہے۔اس نے

صلاح الدین کونرم اور بہتر رویہ اختیار کرنے کے لئے مجبور کردیا ہے۔ جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ صلاح الدین نے یہ شرائط ابتداء میں ہی پیش کردی تھیں۔

اس تیسری صلیبی جنگ کے بعد کوئی خاص واقعہ نہ ہوا۔ اور اگر چاہیں تو ۱۲۰۶ء کی صلیبی جنگ کو بھی اس میں شامل کرلیں جس میں ارض مقدس تک کوئی پہنچ ہی نہ سکا تھا۔ کیونکہ راستہ ہی میں وہ قسطنطنیہ کو فتح کرنے ،اسے برباد کرنے اور اس کے چرچوں کو بے حرمت کرنے میں مصروف ہوگئے تھے۔ تیرہویں صدی کے نصف تک یہ پوری تحریک یورپ میں دم توڑنے لگی اور آخر کار ختم ہوگئی۔

روایتی طور پر مورخین کوئی دوصدیوں پر محیط صلیبی جنگوں کی تعداد آٹھ بتاتے ہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس دوران صلیبی آتے جاتے رہے اور کم تعداد میں مختصر پیمانہ پر ہی ان کی سرگرمیاں ہوتی رہیں۔ البتہ ان مذکورہ آٹھ جنگوں کے موقعوں پر ان کی تعداد بڑھ جاتی تھی جو بعض بادشاہوں یا بادشاہوں کے اتحاد کے نتیجہ میں ہوتا تھا۔ ان دوصدیوں کی صلیبی جنگیں یورپی لوگوں کے ذہنوں میں مدتوں سوار رہیں۔ کچھ خاندان ایسے بھی تھے جنھوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ ان کی نسل سے دو یا تین افراد اس قسم کی جنگوں میں ضرور شریک ہونگے۔ اور یہ نوجوان لڑکے جب اس عمر کو پہنچتے تو بس وہ اس خدمت کے لئے رخصت ہوجاتے اور اس کے لئے کسی جنگ کا اعلان بھی ضروری نہیں تھا۔

ان جنگوں کی پہلی لہر جس میں یورپی نائٹس اور سردار وغیرہ شریک ہوئے تھے وہ چار مملکتیں قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ جو ان کے بعد آئندہ آنے والے صلیبی سپاہیوں کے لئے جو فرانس سے ہوں جرمنی سے یا انگلینڈ سے کے لئے اترنے اور ٹھہرنے کے لئے ایک جگہ بھی بن گئی تھی اور فوج بھی موجود تھی جس میں وہ شامل ہوسکتے تھے۔ بعض مغربی یورپی عیسائی محض چند سالوں کی غرض سے آئے۔ مقصد کے لئے جنگ لڑیں اور خوش قسمتی رہی تو کچھ مال بھی حاصل کرلیا اور پھر واپس وطن لوٹ گئے۔ صلیبیوں نے بڑے شاندار قلعے تعمیر کئے تھے لیکن ان میں عارضی پن ضرور نظر آتا تھا۔

ہمارے دور کے بعض بنیاد پرست صلیبی جنگوں کو دراصل دو تہذیبوں کی عظیم جنگیں کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ آج کے دور کی پریشانیوں اور تکلیفوں کا پیش خیمہ تھیں۔ جدید مسلمانوں کے مغرب کے تئیں غصّہ کو بھی ان صلیبی جنگوں میں ہی تلاش کرتے ہیں۔ لیکن جو معلومات عربوں کی طرف سے آئیں ان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس وقت کے مسلمان بھی اس طرح سوچتے تھے اور بالخصوص ان جنگوں کے آغاز میں کم از کم مسلمانوں میں ایسا احساس نہیں پایا جاتا تھا۔ کوئی بھی ان جنگوں کو اسلام اور عیسائیت کا معرکہ نہ سمجھتا تھا۔ البتہ کروسیڈرس یعنی صلیبیوں کا نقطۂ نظر یہی تھا۔ مسلمان اسے دو تہذیبوں کا ٹکراؤ نہیں بلکہ عذاب سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ جب بھی فرنجیوں کی طرف دیکھتے تو انھیں وہاں تہذیب ہی نظر نہیں آتی تھی۔ ایک عرب شہزادہ اسامہ بن منقد نے فرنجیوں کو کچھ اس طرح بیان کیا۔ ''وحشی درندے جو یقیناً بہادری اور فنِ سپہ گری میں بہتر لیکن باقی کسی بھی چیز میں

نہیں۔طاقت اور جارحیت میں تو جانور بھی انسانوں سے بہتر ہوتے ہیں[6]، صلیبیوں نے مسلمانوں کو اتنا بیزار کر دیا تھا کہ وہ ان پر بازنطینیوں کو ترجیح دینے لگے تھے۔ایک بار جب مسلمانوں کو صلیبیوں کے مقاصد کا اندازہ ہوگیا تو وہ روم (یعنی بازنطینی) اور فرنجی میں فرق کرنے لگے۔صلیبی جنگوں کے بجائے مسلمان انھیں جنگ فرانج کہنے لگے تھے۔

فرنجی حملوں کا نشانہ بننے والے علاقوں کی آبادیاں خوف کا شکار تو ہوتی ہی تھیں بلکہ بری طرح دہشت زدہ بھی ہوجاتی تھیں۔البتہ ان حملوں میں انھیں اپنے عقائد اور فکر کو کوئی خطرہ نظر نہیں آتا تھا۔حالانکہ یہ صلیبی جنگیں ان مسلمانوں کے لئے جو بحرروم کے ساحلوں پر آباد تھے ایک مستقل سنجیدہ خطرہ تھیں۔لیکن یہ جنگجو عالم اسلام کے بہت اندر تک کبھی داخل نہ ہوسکے تھے اور صحیح معنی میں کوئی فوج مکہ مدینہ تک کبھی نہ پہنچ سکی سوائے سواروں کے ایک دستہ کے جس کی قیادت ایک غدّار جسے فرنجی بھی حقارت سے ایک لفنگا فرنگی گردانتے ہیں۔ بغداد کبھی بھی فرنجیوں کے حصار میں نہیں رہا اور نہ ہی فارس میں یہ لوگ داخل ہوسکے۔خراسان اور بخارا کے لوگ اور وادئ سندھ ان سے مکمل طور پر محفوظ رہیں بلکہ زیادہ تر بے خبر رہیں۔

اس سے بھی زیادہ یہ بات کہ صلیبی جنگیں مسلمانوں میں مغربی یورپ کے بارے میں کچھ تحقیق یا انھیں جاننے کی خواہش پیدا کرنے میں بھی ناکام رہیں۔کسی نے یہ جاننے کی کوشش کی ضرورت ہی نہ سمجھی کہ یہ فرنجی کہاں سے آئے ہیں یا ان کے وطن میں زندگی کیسی گذرتی ہے۔اور ان کے عقائد کیا ہیں۔اوائل ۱۳۰۰ء میں راشدالدین فضل اللہ نامی ایک شخص نے جو یہودی سے مسلمان ہوا تھا ایک رزمیہ نظم مجموعہ تاریخ لکھی جس میں چین، ہندوستان، ترک، یہودی، قبل از اسلام اہل فارس کی تاریخ، رسول اللہ ﷺ کی تاریخ، خلفاء اور فرنجی شامل تھے۔لیکن یہاں بھی فرنجیوں کے واقعات سرسری طور پر اور بغیر کسی حوالے کے ہی پیش کئے گئے تھے[7]۔مختصر یہ کہ صلیبی مہمات عالم اسلام میں یورپی ثقافتی وائرس کو متعارف نہ کراسکیں۔ بلکہ ثقافتی اثرات کا رخ دوسری جانب ہی رہا۔

اور دوسری جانب کس چیز کا رخ رہا یعنی اُدھر کیا گیا؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ دراصل ان جنگوں نے یورپی تاجروں کے لئے لیوانت اور مصر کے دروازے کھول دیئے۔جنگوں کے دوران مغربی یورپ اور عالم وسطیٰ کے درمیان تجارت میں اضافہ ہوگیا۔اور اس طرح انگلینڈ، فرانس اور جرمنی کے لئے مشرق کی اشیاء مہیّا ہونے لگیں۔جس میں جائے فل، لونگ، کالی مرچ اور دوسرے مسالوں کے ساتھ ریشم، ساٹن، اور عجیب وغریب پودے کپاس سے بنا ہوا دھاگا اور کپڑا شامل تھا۔

یورپی تاجر، زائرین اور صلیبی جنگجو جن کی شناخت ہمیشہ واضح نہیں ہوتی تھی جب واپس وطن جاتے تو عالم اسلام میں مسلمانوں کے تموّل اور دھن دولت کی فراوانی کا تذکرہ مقامی لوگوں سے کرتے اور دوسرے دور دراز علاقوں مثلاً ہندوستان اور ایک خیالی سے علاقے کے بارے میں بتاتے۔یہ کہانیاں یورپ کے لوگوں میں

ان علاقوں کے متعلق جاننے اور پہنچنے کے جذبات اور خواہشات پیدا کرنے میں کتنا کارگر رہی ہونگی اور ان کے نتائج کیا ہوئے ہونگے ۔ یہ مستقبل میں ہی چھپا تھا۔

البتہ عالم وسطیٰ میں صلیبی جنگیں تو ختم ہو چکی تھیں لیکن دوسری طرف تباہی اور بربادی کا ایک اور دور شروع ہونے والا تھا۔

مشرق کی سمت سے حملہ

منگولوں کا تعلق وسطی ایشیا کے طویل وعریض میدانوں سے تھا جن میں گھاس تو اگتی تھی لیکن درخت بالکل نہ تھے۔ زمین بہت سخت اور دریا محض چند۔ ظاہر ہے کہ یہاں زراعت کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ البتہ جانوروں کی چراگاہوں کے امکانات وسیع تھے۔ چنانچہ بھیڑوں اور گھوڑوں کے لئے غذا وافر تھی اور اس طرح منگول گوشت، دودھ، پنیر وغیرہ پر گذارا کرتے، جانوروں کا گوبر ایندھن کے طور پر استعمال ہوتا۔ خچروں کے دودھ کے خمیر سے شراب بناتے اور پیتے، اور بیلوں کو گاڑیاں کھینچنے کے لئے استعمال کرتے۔ شہر تھے اور نہ کوئی مستقل قیام گاہیں ہمیشہ حرکت میں رہتے۔ نمدے سے بنے ٹینٹوں اور جھونپڑیوں میں رہتے جنھیں جیر (ger) کہا جاتا۔ بعض علاقوں میں انھیں یرٹس (Yurts) بھی کہتے تھے۔ انھیں بآسانی اُکھاڑا جا سکتا تھا۔ اور گاڑیوں پر لاد کر کہیں دوسری جگہ لے جایا جا سکتا تھا۔

نسلی اعتبار سے منگولوں کا ترکوں سے قریبی تعلق تھا۔ زبان اور ثقافتی اعتبار سے بھی مورخین نے انھیں ترک منگول قبائل کہہ کر ہی تقسیم کیا ہے۔ البتہ انھیں ایک دوسرے سے ممیّز کرنے کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ ترک مزید مغرب میں رہتے تھے اور منگول مزید مشرق میں۔ لیکن جب ان کی آبادیاں کسی حد تک مدغم ہونے لگیں تو ان میں باہمی اختلاط بھی ہونے لگا۔

صدیوں پر محیط عرصہ کے دوران ان میدانوں میں متعدد قبائلی سلطنتیں بنتی اور بگڑتی رہیں تھیں۔ قبائلی نیم وفاق بھی وجود میں آتے رہے البتہ ایسا کوئی مرکزی اصول نہیں تھا جو انھیں آپس میں باندھے رکھے۔ رومی رِپبلک کے عہد میں ترک منگول قبائل کا ایک گروہ جو Hsiung-nu کہلاتا تھا، ایک عظیم قوت کی شکل میں ابھرا۔ یہ گروہ اتنا ہولناک اور ڈراونا تھا کہ اپنے ملک کو ان سے محفوظ رکھنے کی خاطر متحدہ سلطنتِ چین کے پہلے فرمانروا نے کوئی دس لاکھ لوگوں کو عظیم دیوارِ چین کی تعمیر پر معمور کیا۔ جب یہ ہولناک گروہ مشرق کی سرحد پار نہ کر سکا تو اس نے مغرب کا رخ کیا۔ یورپ پہنچتے پہنچتے ان میدانی خانہ بدوشوں کا نام ہُن (Hun) ہو چکا تھا۔ اتیلا کی سربراہی میں قبل اس کے کہ ان کا اپنا وجود بالکل ختم ہوتا وہ روم تک کے علاقے کو تاراج کر چکے تھے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں ترکوں کے غیر مانوس سے الخاقوں کے سلسلے اِن میدانوں پر غالب رہے لیکن جب جنوب کی سمت ان کا رُخ ہوا تو یہی مسلم شاہی خاندانوں کی شکل اختیار کر گئے جیسے غزنوی اور سلجوقی

خاندان۔

منگول صدیوں سے چینی دنیا پر حملہ کرتے آرہے تھے اور ایک کے بعد دوسرے اقتدار میں آنے والے چینی خاندان انھیں تحفہ تحائف اور سہولیات دیکر دور رکھتے رہے تھے۔ وہ یہ بھی کرتے کہ مختلف منگول سرداروں کو آپس میں لڑا دیتے یا نئے نئے سرداروں کی مدد کر کے انھیں پہلے سے قائم اور مضبوط سرداروں کے خلاف کھڑا کر دیتے۔ اس طرح انھوں نے منگولوں کو منقسم رکھا۔ حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ منگولوں کو عام خانہ بدوشوں کی مانند منقسم رہنے کے لئے بیرونی مدد کی ضرورت نہ تھی۔

پھر کوئی ۵۶۰ ھجری یعنی ۱۱۶۵ء میں ایک کرشماتی اور شاندار شخصیت تیمور پیدا ہوا۔ تاریخ میں اسے چنگیز خاں کہا گیا ہے جس کے معنی عالمگیر حکمراں کے ہیں۔ یہ ٹائٹل اس نے چالیس سال کی عمر تک پہنچنے سے قبل استعمال نہیں کیا۔

چنگیز کا باپ ایک منگول سردار تھا۔ لیکن ابھی چنگیز خان محض نو سال کا ہی تھا کہ باپ کو قتل کر دیا گیا۔ ان کے ہمدرد اور مددگار بکھر گئے اور نتیجہ میں خاندان پر برا وقت آپڑا۔ ایک طویل عرصہ تک چنگیز، اس کی ماں اور بھائی بہن بیریوں کے پھل اور کچھ چھوٹے شکار مثلاً گلہری اور چوہوں پر گذارا کرتے رہے۔ باپ کے قاتل یہ سمجھتے تھے کہ ان کی عافیت اسی میں ہے کہ چنگیز خاں کو پنپنے نہ دیا جائے چنانچہ اس کے بچپن ہی سے وہ اس کی تلاش میں رہے اور ایک بار اسے پکڑ بھی لیا۔ لیکن بچہ فرار ہو گیا۔ بڑا ہوا اور زندہ رہا کہ اس کے باپ کے قاتل پچھتائیں۔

اسی دوران ایک ایسا گروہ اس کے رابطہ میں آیا جو نوکر کہلاتا تھا۔ بعد میں وہ علاقے جن میں فارسی زبان بولی جاتی تھی یہ لفظ ان لوگوں کے لئے استعمال ہونے لگا جو معاوضہ کے عوض کسی کی مدد کیا کرتے تھے۔ لیکن چنگیز کے زمانے میں یہ بہت قریبی دوستوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ چنگیز خاں کے یہ نوکر کسی ایک قبیلہ سے متعلق نہ تھے۔ انھیں جس چیز نے باہم متحد رکھا تھا وہ ایک شخص کی کرشماتی صفت تھی جو چنگیز خاں میں موجود تھی۔ اس طرح اس گروہ میں چنگیز خاں نے بلا تفرقہ اور قبائلی وفاداریوں سے ماورا ہو کر منظّم ہونے کی صفات پیدا کر دیں۔ اور یوں یہ منگول ایک قوم کی طرح متحد ہو گئے۔

۶۰۷ ھجری یعنی ۱۲۱۱ء میں چنگیز خاں نے چین کی کمزور اور نحیف سنگ سلطنت پر حملہ کیا اور انتہائی آسانی سے اسے ختم کر دیا اور کوئی سات سال بعد یعنی ۶۱۴ ھجری میں عالم وسطیٰ کی تاریخ کا حصہ بن گئے۔

جس وقت وہ اس دنیا میں آئے تو صورتحال کیا تھی؟ جب سلجوقوں نے عالم اسلام کو فتح کیا تھا تو دوسرے ترکی قبائل بھی ان کی پیچھے آنے لگے جو اپنے پیشرو ترکوں کی باقیات کو تباہ کرتے اور اپنی سلطنت قائم کرتے۔ ایسی ہی ایک سلطنت ماوراء النہر (Transoxiana) میں ابھرنی شروع ہی ہوئی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ اس علاقے کی ایک بڑی سلطنت کا رخ اختیار کرے گی۔ یہ خوارزم شاہ کی سلطنت تھی۔ ان کا باشاہ علاؤالدین محمد اپنے آپ کو ایک بڑا فوجی منصوبہ ساز سمجھتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ منگولوں کو سبق سکھانا چاہتے۔

چنانچے اس نے اپنے علاقے سے گذرنے والے ۴۵۰ تاجروں کو جو منگولوں کی حفاظت میں گذر رہے تھے آگے جانے سے روک دیا اور الزام یہ لگایا کہ یہ منگولوں کے لئے مخبری کرتے ہیں۔ان تاجروں کو اس نے قتل کرادیا اور انکی اشیاء پر قبضہ کرلیا اور جان بوجھ کر ایک شخص کو چھوڑ دیا تاکہ وہ فرار ہو کر واپس پہنچے تو چنگیز خان کو قتل عام کی خبر کردے۔ظاہر ہے کہ وہ چھیڑ خانی کر رہا تھا۔

منگول سالار نے اپنے تین نمائندے تاوان کا مطالبہ کرنے کے لئے بھیجے۔اتنا تحمل چنگیز خاں نے شاید آخری بار دکھایا تھا۔اس وقت علاء الدین محمد نے واقعی بڑی حماقت کرڈالی۔اس نے چنگیز خان کے ایک نمائندہ کو تو قتل کردیا اور باقی دو کو وطن واپس بھیج دیا وہ بھی اس طرح کی انکی ڈاڑھیاں نُچی ہوئی تھیں۔اس زمانے میں ڈاڑھیاں نوچ لینا بڑی ہی سنگین توہین سمجھی جاتی تھی، علاء الدین یہ خوب جانتا تھا لیکن وہ اسے ناراض کرنا اور جنگ کرنا ہی چاہتا تھا۔یہ جنگ ہو ہی گئی۔۶۱۵ ھجری یعنی ۱۲۱۹ء میں عظیم تباہی کا آغاز ہو چکا تھا۔

ہم اکثر منگولوں کے غول (Hordes) کے بارے میں سنتے ہیں۔جس سے یہ تصور ذہن میں ابھرتا ہے کہ کچھ شور مچانے والے وحشی ہیں جو لاکھوں کی تعداد میں افق پر چھا گئے ہیں کہ اپنے شکار پر محض تعداد سے غالب آجائیں۔حقیقت میں Horde ایک ترکی زبان کا لفظ ہے جو ملٹری کے قیام کی جگھوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔منگول بڑی تعداد میں فوج رکھنے کے قائل نہ تھے۔انھوں نے جنگیں ترکیبوں اور چالوں سے جیتی تھیں۔خونخواری اور ٹکنالوجی کے ذریعہ جیتی تھیں۔مثلاً جب وہ فصیل شدہ شہروں کا محاصرہ کرتے تو چین کی مشینری استعمال کرتے۔ان کے پاس مخلوط نوعیت کے مرکب تیر ہوا کرتے تھے۔جو لکڑی کی ایسی متعدد پرتوں سے بنے تھے جو گوند کے ذریعہ آپس میں جڑی ہوئی ہوتیں تھیں۔یہ تیر مہذب دنیا کے تیروں سے زیادہ سختی سے چھوڑے جاتے تھے۔یہ لوگ گھوڑوں کی کمر پر بیٹھ کر لڑتے۔گھڑ سواری کی ان کی صلاحیتیں اتنی زبردست تھیں کہ ان کے مخالفین سوچتے کہ یہ کوئی نئی مخلوق ہیں جن کا آدھا جسم انسان کا ہے اور بقیہ آدھا گھوڑے کا۔ان سے قبل مہذب دنیا کو ایسے شہسوار نا معلوم تھے۔ان کے گھوڑے مضبوط، بہت تیز اور چھوٹے ہوتے تھے۔اس طرح منگول جنگجوؤں کی ٹانگوں میں ان کی کمر بخوبی پھنس جاتی تھی۔وہ ایک طرف جھکتے اور گھوڑے کے پیٹ کے نیچے سے تیر اندازی کرتے اور اس طرح گھوڑے کا جسم ان کے لئے ڈھال کا کام کرتا۔منگول دن رات گھوڑے کی پیٹھ پر وقت گذار سکتے تھے۔زین پر بیٹھے سو بھی لیتے اور کمر پر بیٹھے بیٹھے اپنی غذا بھی لیتے اور اس طرح ایک شہر کو تاراج کر کے بڑی تیزی سے وہ دوسرے شہر تک پہنچ جاتے اور یوں عوام انھیں کچھ ماورائے فطرت طاقتوں کا حامل بھی سمجھتے تھے۔بعض اوقات منگول ضرورت سے زیادہ گھوڑے ساتھ لاتے اور ان کے ساتھ انسانوں کے نقلی ڈھانچے بھی۔مقصد صرف یہ تھا کہ مخالفین انھیں زیادہ تعداد میں دیکھیں۔یہ ان کی ملٹری چالوں میں سے ایک چال تھی۔

۶۱۵ ھجری یعنی ۱۲۱۹ء میں جب مقابلہ ہوا تو علاء الدین محمد کی فوجیں چنگیز خاں کے مقابلہ میں کہیں

زیادہ تھیں۔لیکن اس کی بڑی تعداد کسی کام نہ آسکی۔چنگیز خاں نے اسے تہس نہس کر دیا اور علاء الدین جان بچا کے بھاگ کھڑا ہوا۔ہاری ہوئی فوج منتشر ہوئی تو کہیں تو وہ لٹیرے بنے مغرب کی سمت بڑھے اور بدامنی پھیلائی اور بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے آخری صلیبی جنگجوؤں کو ان کے قلعوں سے نکال باہر کرنے میں بھی معاونت کی۔یہ جو کچھ ہو رہا تھا آنے والے دنوں میں یہی ہونا تھا۔چنگیز خاں نے ماوراء النہر جو آمو دریا کے ہر دو طرف آباد تھا اور دوسرے مشہور شہروں کو جھلسا دیا۔ان میں ایک شہر بخارا بھی تھا جہاں فارسی زبان کوئی دو صدیوں سے اپنی نشاۃ ثانیہ کے دور سے گذر رہی تھی۔قدیم شہر بلخ کو زمین دوز کر دیا جو قدیم زمانے میں ''شہروں کی ماں'' کے نام سے مشہور تھا۔اس کی لائبریری کو آمو دریا میں بہا دیا جس میں ہاتھ کی تحریر شدہ لاکھوں کتابیں نذر آب ہو گئیں۔

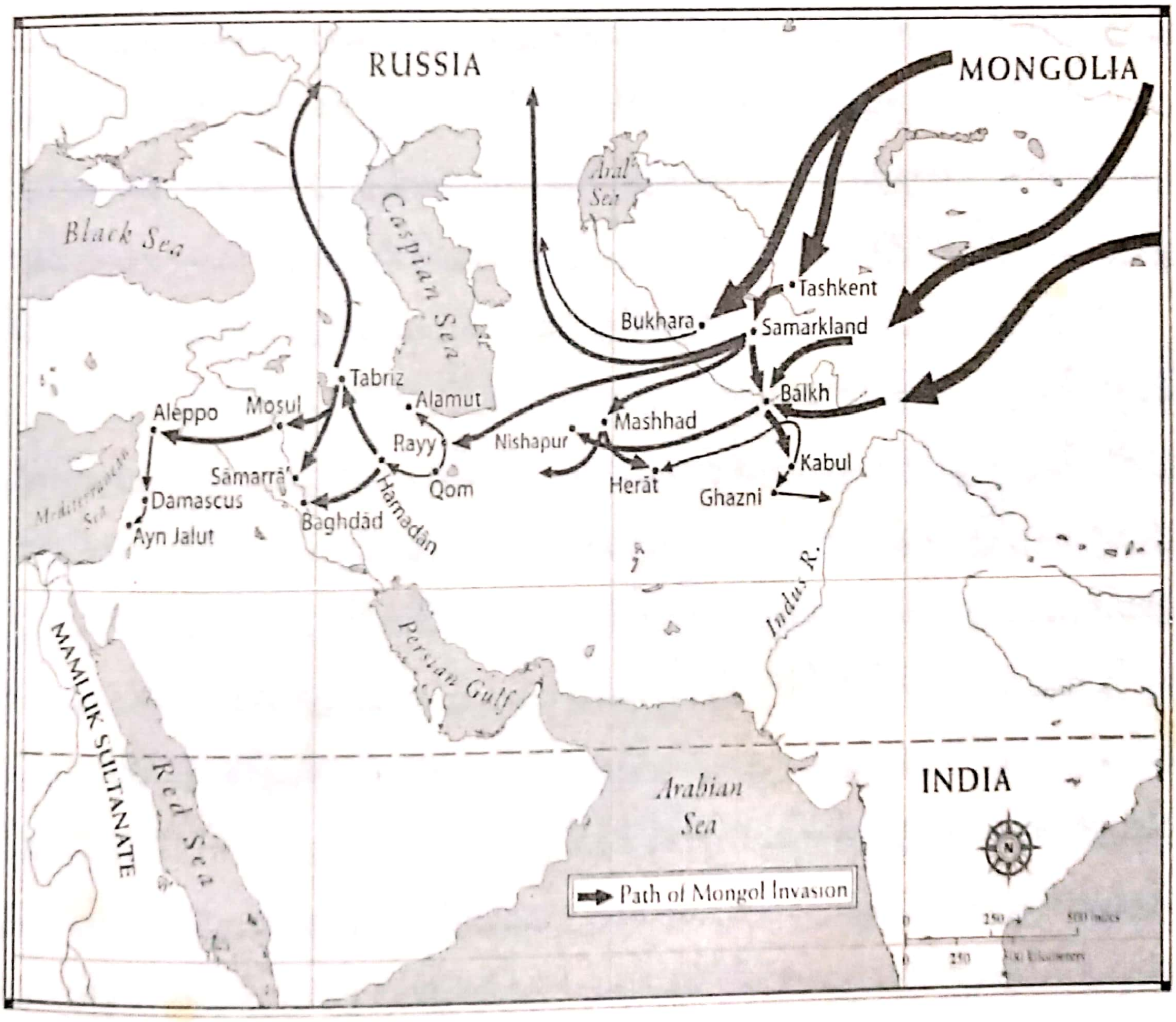
خراسان اور فارس اب اس کا نشانہ تھے جہاں منگولوں نے واقعی نسل کشی کی۔انھوں نے جو کچھ کیا اس کے لئے نسل کشی سے زیادہ مناسب اور کوئی لفظ نہیں۔واقعہ کے کچھ ہی دن بعد ایک مسلمان مورخ سیفی حیروائی نے کہا کہ منگولوں نے ۱،۷۴۷،۰۰۰ (سترہ لاکھ سینتالیس ہزار) افراد کو نیشاپور پر حملہ کے دوران قتل کیا تھا۔کتے اور بلی بھی اگر سامنے آئے تو انھیں بھی نہیں چھوڑا۔ہرات کے شہر میں ہلاکتوں کا اس کا اندازہ ۱۶،۰۰،۰۰۰ (سولہ لاکھ) کا ہے۔ایک دوسرے فارسی مورخ جزجانی کے مطابق محض ہرات میں چوبیس لاکھ افراد تہہ تیغ ہوئے۔یقیناً یہ تعداد اصل سے کافی زیادہ محسوس ہوتی ہے کیونکہ ہرات اور نیشاپور کی آبادی ۱۲۲۰ء میں اتنی نہیں رہی ہوگی [8]۔

لیکن یہ تعداد اتنی زیادہ بھی نہیں جتنی اولاً محسوس ہوتی ہے کیونکہ جب منگول عالم اسلام پر حملہ آور ہوئے تھے تو لوگ ان کے ظلم سے بچنے کی خاطر بھاگ کھڑے ہوتے تھے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔منگول کھیتوں کو جلاتے، فصل برباد کرتے کسانوں کو ان کے ذرائع وسائل سے محروم کرتے اور اپنی قتل و غارتگری کی کہانیوں کو پھیلاتے تاکہ خوف و دہشت پھیل جائے اور یہ ان کی جنگی چال کا ایک حصہ ہوتی۔وہ چاہتے تھے کہ ان کا خوف اور دہشت گردی خود ان سے پہلے پہنچ جائے تاکہ جب وہ کسی شہر پر حملہ کریں تو مزاحمت زیادہ نہ ہو۔

افغانستان کا ایک شہر جہاں انھوں نے حملہ کیا، اصل میں مجھے یاد نہیں کہ اس کا اصلی نام کیا تھا، آج اسے 'شاری غولغولا' یعنی چیخوں کا شہر کہتے ہیں۔اس میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ ملبہ مٹی اور پتھروں کا ڈھیر ہے۔چنانچہ اس کا پورا امکان ہے کہ جب منگول کسی بڑے شہر پر حملہ آور ہوتے تو وہاں پہلے سے موجود پناہ گزینوں سے اس شہر کی آبادی میلوں دور تک کافی بڑھ چکی ہوتی اور جب یہ شہر بالآخر شکست کھا جاتے تو محض ان کی اصلی آبادی ہی نہیں بلکہ پوری علاقے میں پھیلی آبادی ان کے ظلم کا نشانہ بنتی۔

کوئی نہیں جان سکتا کہ کتنے قتل ہوئے۔ظاہر ہے کہ میدان جنگ میں جا کر کسی نے گنا تو نہیں۔لیکن جو تعداد دی گئی ہے وہ حقیقی نہ بھی ہو کم از کم یہ اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ اتنی زبردست غارتگری اور خون خرابے کے درمیان زندگی کتنی مشکل رہی ہوگی۔کسی نے بھی اس طرح کی کہانی ترکوں یا سلجوقیوں کے حملہ کے بارے میں نہیں بتائی۔منگولوں کا حملہ یقیناً ایک بڑے پیمانے کی تباہی تھی۔

یہ تعداد کسی بھی چیز پر منحصر رہی ہو۔ اس میں حقیقت کا عنصر ضرور موجود تھا۔ دو تاریخی کتابیں جو تقریباً ۶۲۴ ھجری (۱۲۶۰ء) میں مرتب ہوئیں ایک بغداد میں اور دوسری دہلی میں اس تباہی اور دہشت کا حال بیان کرتی ہیں اور ان میں تقریباً یہی تعداد بتائی گئی ہے۔ یہ دونوں مورخین ایک دوسرے سے واقف نہیں رہے ہونگے۔ اور کم وبیش یہ دونوں ساتھ ساتھ ہی یہ تاریخیں مرتب کرر ہے تھے۔ ظاہر ہے کہ کسی نے بھی دوسری کتاب کو بطور حوالہ استعمال نہیں کیا ہوگا۔ دونوں وہی لکھ رہے تھے جو فضاء میں موجود تھا اور جو کچھ دہلی اور بغداد کے لوگوں کی زبان پر تھا۔



عالم اسلام پر منگولوں کا حملہ

منگولوں نے جب فارس پر حملہ کیا تو اور چیزوں کے ساتھ انھوں نے 'قنت' یعنی قدیم اندرونی نہروں کے سسٹم کو برباد کردیا جو ایک ایسے ملک میں جہاں دریا نہ ہوں زراعتی نظام کے لئے ایسی ہی تھیں جیسی زندگی کے

لئے خون کی نلیاں ۔بعض قنات تو بس ویسے ہی برباد کردی گئیں اور بعضوں میں ریت بھر دیا گیا جو ایسے ہی ختم ہوگئیں جیسے انھیں جان بوجھ کر ختم کیا گیا ہو۔کوئی ان کی مرمت کرنے والا بھی نہ تھا۔ جب ایک عرب جغرافیہ داں یاقوت الحموی مغربی ایران، شمالی افغانستان اور آمو دریا کے شمال کے علاقوں کے بارے میں منگولوں کے حملہ سے چندسال قبل کچھ لکھ رہا تھا تو اس نے ان علاقوں کو سرسبز، زرخیز اور خوشحال لکھا تھا۔حملہ کے چندسال بعد یہ سب ریگستان بن گیا اور آج تک ریگستان ہی ہے۔

چنگیز خان منگولوں کے ذریعہ کی جانے والی تباہی کو دیکھنے کے لئے بہت دن تک زندہ نہیں رہا اور ۶۵۸ ھجری (۱۲۲۷ء) میں اس کا انتقال ہوگیا۔انتقال کے بعد اس کی سلطنت، بیٹوں اور پوتوں میں تقسیم ہوگئی جنھوں نے تباہی کا سلسلہ جاری رکھا۔عالم اسلام کا قلب چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خان کے تسلط میں آ گیا اور کیونکہ اس تمام علاقہ پر ابھی قبضہ نہ ہوا تھا ہلاکو خان نے وہاں سے ابتداء کی جہاں اس کے دادا نے چھوڑا تھا۔

اس دوران ۶۵۳ ھ (۱۲۵۶ء) میں اس وقت ایک عجیب سا واقعہ ہوا۔ جب ہلاکو خان فارس کے علاقہ سے گذر رہا تھا تو ایک مسلم منصف نے جو قلعہ الاموت کے قریب ہی رہتا تھا ہلاکو خاں سے شکایت کی کہ اسے ہمہ وقت اپنے کپڑوں پر زرہ پہنے رہنا ہوتا ہے کہ کہیں اساسن اسے قتل نہ کردیں جنکا مرکز قریب ہی میں ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد فدائیں (یعنی اساسن کے خودکش ایجنٹس) نے درویشوں کے لبادہ میں ہلاکو کو قتل کرنے کی کوشش کی۔لیکن ناکام رہے۔انھوں نے ہلاکو کی داڑھی نوچنے کی کوشش کی۔ چنانچہ وہ گروہ جو کسی کو بھی قتل کردیا کرتا تھا اب اس کا سامنا ان لوگوں سے تھا جو ہر ایک کو مار سکتے تھے۔ہلاکو نے مغرب کی سمت اپنی پیش قدمی کو فی الوقت موخر کیا اور قلعہ الاموت کی طرف اس کے اس طوفان کا رخ مڑ گیا۔اور پھر اس نے اساسن کے ساتھ وہی کیا جو منگول دوسروں کے ساتھ کرتے آئے تھے یا آئندہ کرنے والے تھے۔اس نے ان کا صفایا کردیا۔اور اس مقام کو تباہ کردیا جو ان کی طاقت کا منبع سمجھا جاتا تھا۔ان کے تمام رکارڈ لائبریری اور کاغذات تباہ کردیئے گئے اور اس طرح اساسن کی اس آفت کا خاتمہ ہوگیا[9]۔

اساسن کو فنا کردینے کے بعد ہلاکو بغداد کی طرف بڑھا اور آخری عباسی خلیفہ کو ایک دھمکی بھرا خط لکھا جس میں مورخ راشدالدین فضل اللہ کے بقول اس نے لکھا تھا ''ماضی ختم ہوا۔اپنی دفاعی پشتوں کو برباد کردو۔ خندقوں کو بھردو، سلطنت اپنے بیٹوں کے حوالہ کردو۔اور تم خود میرے پاس حاضر ہو۔۔۔۔اگر تم اس مشورہ پر توجہ نہ دوگے۔۔۔۔تو تیار رہو۔۔۔۔جب میں غضب میں آکر اپنی فوجوں سے بغداد پر چڑھائی کرونگا تو چاہے تم آسمان میں چھپو یا زمین میں، میں تمہیں نکال لاؤنگا۔تمہارے علاقوں میں میں کسی ایک کو زندہ نہیں چھوڑونگا اور تمہارے شہر اور ملک کو شعلوں کی نذر کردونگا۔اگر تم اپنے پرکھوں اور خاندان کے بزرگوں پر رحم چاہتے ہو تو میری ہدایت پر توجہ دو''۔

عباسی خلافت میں زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہی ہوئے تھے۔اور اس دوران بعض خلفاء نے فوجی قوت مجتمع کر کے طاقت اپنے ہاتھ میں لینے کی بھی کوشش کی تھی۔البتہ اس وقت جو خلیفہ برسرِ اقتدار تھا وہ کچھ مغرور اور خودرائے بھی تھا۔ چنانچہ اس نے ہلاکو خاں کو لکھا ''نوجوان تم ابھی پختگی کی طرف آئے ہو اور ظاہر ہے کہ طویل عمر تک زندہ رہنا چاہتے ہو۔تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری قوت اور حکم حتمی ہے۔تم اپنی حکمت عملی، فوج اور کمندوں کے ساتھ آؤ۔لیکن تم ایک ستارے کو کیسے زیر کر سکتے ہو۔شہزادے کیا تم جانتے نہیں ہو کہ مشرق سے مغرب تک شاہوں سے فقیروں تک، بوڑھے اور نوجوان اور وہ تمام جو خدا سے ڈرتے اور اس کی عبادت کرتے ہیں اس دربار اور میری فوج کے غلام ہیں۔ میں جب ان لوگوں کو جو ادھر ادھر پھیلے ہوئے ہیں ایک ساتھ ہو جانے کا حکم دونگا تو پہلے میں ایران کی طرف ہوں پھر توران کی طرف میری توجہ ہوگی اور پھر ہر چیز کو ٹھیک ٹھیک کردونگا''۔[۱۰]

بغداد پر حملہ کا آغاز تین فروری ۱۲۵۸ء کو ہوا اور ۲۰ فروری تک بغداد نہ صرف مفتوح ہوا بلکہ زیادہ تر غائب ہو گیا۔منگولوں کی یہ روایت تھی کہ وہ شاہی خون نہیں بہاتے تھے۔ چنانچہ اس طرح کی کوئی حرکت انھوں نے نہیں کی بلکہ خلیفہ اور اس کے اہل خانہ کو انھوں نے فرش میں لپیٹ دیا اور ٹھوکریں مار مار کر انھیں قتل کر دیا۔ بغداد کے شہریوں میں بظاہر ایک کو بھی نہیں چھوڑا۔ بغداد میں کتنے لوگ قتل ہوئے یہ ابہام محض اس بنا پر رہا کہ یہ اندازہ نہ تھا کہ قتل عام کے لئے کتنے منگول موجود تھے۔مسلمان مورخین آٹھ لاکھ کی تعداد بتاتے ہیں۔ ہلاکو خود اس سلسلہ میں ذرا محتاط تھا۔فرانس کے بادشاہ کو ایک خط میں اس نے لکھا کہ بغداد میں اس نے کوئی دو لاکھ افراد کو قتل کیا ہے۔مقتولین کتنے بھی رہے ہوں شہر کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔اور یوں ہلاکو خان نے عہد کو پورا کیا۔تمام اسکول اور لائبریریاں اسپتال، محافظ خانہ تمام تر رکارڈ اور پرانی تہذیبوں کے وہ نمونے جو محفوظ کر دیئے گئے تھے۔اور وہ تمام نمونے جو عظیم اسلامی تہذیب کے دورِ زرّیں کے گواہ تھے بری طرح برباد کر دئے گئے۔

صرف مصر ہی ایک طاقت ایسی تھی کہ جس نے منگولوں کے خلاف مورچہ سنبھالے رکھا۔کوئی اور منگولوں کو ملٹری کی سطح پر شکست نہ دے سکا تھا۔۔۔ یہاں اور نہ کہیں اور۔

جب منگولوں نے قتل عام شروع کیا تھا تو صلاح الدین کے جانشین اس وقت بھی مصر میں حکمراں تھے البتہ ۱۲۵۳ء آتے آتے وہ خاصی کمزوریوں کا شکار ہو گئے جو عموماً وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ حکمراں خاندانوں میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ضعیف اور غیر معمولی مدارات کے عادی افراد تخت پر قابض تھے۔اور ان کے گرد مخالف لٹیروں نے ڈیرہ جما رکھا تھا۔ایک دن بادشاہ کا انتقال ہوا تو تاج کا کوئی وارث نہ تھا۔ چنانچہ اس کی بیوی شجرۃ الدّر نے کچھ عرصہ کے لئے سلطان کی جگہ لے لی۔لیکن پھر مملوک یعنی غلام سپاہیوں کا شاہی دستہ حرکت میں آیا اور اپنے میں سے کسی کو سلطان سے شادی کر لینے کے لئے منتخب کیا جس کے نتیجہ میں عملاً وہی سلطان بھی ہو گیا۔

یہی وقت تھا کہ ہلاکو بغداد کو تباہ کر رہا تھا۔اور جب وہ اس کام سے فارغ ہوا تو جنوب کی سمت رخ کیا اور وہی راستہ اختیار کیا جو بالعموم فاتحین اختیار کر رہے تھے۔لیکن مصر کے سب سے بڑے جرنل ظاہر ببرس نے ہلاکو کا مقابلہ عین جالوت میں کیا۔روایتیں کہتی ہیں کہ عین جالوت کے مقام پر ہی داؤد نے جالوت کو شکست دی تھی۔اور اب ۱۲۶۰ء میں ببرس اس دور کا داؤد تھا اور ہلاکو جالوت [۱۱]

داؤد پھر فاتح رہا، اتفاق دیکھئے کہ اس بار مسلمانوں نے ایک نیا ہتھیار اس جنگ میں استعمال کیا تھا۔ دستی توپ جسے آج ہم بندوق کہتے ہیں۔یہ شاید پہلی جنگ تھی جس میں بندوق کا استعمال موثر اور فیصلہ کن رہا تھا۔

قاہرہ میں اسی دوران شجرۃ الدّر اور اس کے شوہر نے کسی طرح ایک دوسرے کو حمام میں قتل کر دیا۔اس غلیظ واقعہ کی تفصیلات آج بھی دھندلی ہی ہیں۔ببرس جو عین جالوت میں منگولوں کو شکست دینے پر ہیرو بن چکا تھا جب شان و شوکت کے ساتھ وطن واپس پہنچا اور اس انتشار کو دیکھا تو اس نے مملکت کا کنٹرول خود ہی سنبھال لیا اور مملوک خاندان کی سلطنت کا آغاز ہوا۔

مملوک جیسا کہ ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں عام طور پر ایک ترک غلام ہوتا تھا جسے کم عمری ہی میں شاہی محلات میں لا کر پوری ملٹری تربیت دی جاتی تھی۔عالم وسطیٰ کی تاریخ میں اکثر دیکھا گیا کہ مملوک آقا کا تختہ پلٹ کر اپنے خاندان کی حکومت کا آغاز کرتے لیکن یہ حکومت جو ظاہر ببرس نے شروع کی تھی خاصی مختلف تھی۔ یہ صحیح معنوں میں خاندانی حکومت نہیں تھی جس میں جانشینی کے لئے باپ کے بعد بیٹے کا اصول کارفرما ہوتا۔اس کے برخلاف یہاں جب کسی سلطان کی وفات ہوتی تو بااثر مملوک کا اندرونی حلقہ یہ طے کرتا کہ ان میں سے کس کو سلطان بنایا جائے۔اس دوران نئے مملوک اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر اس اندرونی حلقہ کی رکنیت کے لئے آگے بڑھتے رہتے اور اس طرح آئندہ کسی موقع پر اہم تر رکن کو سلطان بنا دیا جاتا۔چنانچہ مصر میں کسی خاندان کی حکومت نہیں تھی بلکہ ایک قسم کی ملٹری کارپوریشن تھی جو مستقل اپنی صفوں میں نئے مملوک سے تازگی اور توانائی قائم رکھتی تھی۔یہ اصل میں صلاحیتوں سے مملو ایک طریقہ کار تھا جو یقیناً کارگر رہا۔مملوک کے زیر انصرام مصر نے عالم عرب میں رہنما کردار ادا کیا۔جس سے وہ آج تک دستبردار نہیں ہوا۔

گو کہ منگولوں نے عالم اسلام کو چشم زدن میں زیر کر دیا تھا لیکن مسلمانوں کی منگولوں پر فتح، ملٹری کے ذریعہ علاقوں کو واپس لینے سے نہیں بلکہ گفتگو اور مکالمہ کے ذریعہ انھیں اپنے میں شامل کرنے سے عبارت تھی۔ پہلا قبول اسلام ۱۲۵۷ء میں بیرک نام کے ایک خان کا ہوا۔ہلاکو خان کا ایک جانشین ٹوڈ مونگ کے، نہ صرف مسلمان ہوا بلکہ اس نے صوفی سلسلہ کو اختیار کر لیا۔اس کے بعد فارس کے منگول حکمراں خاندان میں مسلم نام لئے ہوئے متعدد حکمراں ملتے ہیں۔۱۲۹۵ء میں فارس کا تخت محمود غزن کو ورثہ میں ملا۔وہ بدھ مذہب کو مانتا رہا تھا لیکن اب اس نے شیعی اسلام قبول کیا اور اس کے دوسرے سردار بھی جلد ہی مسلمان ہو گئے۔اس کے جانشین ایک عرصہ تک ایل خانی خاندان کے مسلم حکمراں رہے۔

اسلام قبول کر لینے کے بعد غزن نے منگول شرفا اور سرداروں کو مقامی افراد کے بارے میں کچھ مشورے دیئے۔ مثلاً ''میں یہاں فارسی کسانوں کی حفاظت کی بات نہیں کہہ رہا'' اس نے سرداروں کو یقین دلاتے ہوئے کہا ''اگر مصلحت کا تقاضہ یہ ہوتو میں ہی سب کو غارت کردوں۔ چونکہ انھیں تباہ کرنے کی طاقت مجھ سے زیادہ کسی میں نہیں۔ انھیں ہم ایک ساتھ مل کر ہی لوٹتے ہیں۔ لیکن اگر کسانوں کا ہی استحصال کرنا ہے تو ان کے بیل اور بیج لے لو۔ ان کی فصلوں کو ضائع کردو۔ لیکن بعد میں کیا کروگے۔ تمہیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ جب تم ان کی بیویوں اور بچوں کو مارو پیٹو گے اور ظلم کروگے تو ذرا یہ تو سوچو کہ جیسے ہمیں ہمارے بیوی بچے عزیز ہیں انھیں بھی ہونگے۔ وہ بھی ایسے ہی انسان ہیں جیسے ہم''۔[12] یہ گفتگو ہلاکو اور چنگیز خاں کی زبان سے ادا نہیں ہوسکتی تھی۔ غزن کے یہ الفاظ تو بس ایک چھوٹا سا نمونہ تھے کہ منگولوں کی لائی ہوئی عالمگیر تباہی کے بعد اسلام اور تہذیب کو بہرحال زندہ ہونا تھا۔

باب : ١٠

حیاتِ نو

٦٦١ تا ١٠٠٨ھ مطابق ١٢٦٣ تا ١٦٠٠ء

منگولوں کی لائی ہوئی تباہی یورپ کے دورِ تاریکی کی طرح نہ تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ آہستہ روی سے آئی ہو اور بتدریج اس کے اثرات ختم ہو گئے ہوں۔ یہ ایک دردناک لیکن مختصر دھماکہ تھا۔ ایسا ہی جیسا چودہویں صدی میں سیاہ موت نے یورپ کو آلیا تھا۔ یا جیسے بیسویں صدی میں عالمی جنگوں نے پوری دنیا کو تباہی سے دوچار کر دیا تھا۔

پرنسٹن کے مورخ برنارڈ لیوس، ان کے علاوہ اور مورخین نے بھی، یہ نقطہ نظر لیا ہے کہ منگول واقعتاً اتنے خراب نہ تھے۔ یقیناً انھوں نے پورے پورے شہروں کو برباد کیا۔ لیکن تصویر کا بہتر رخ بھی سامنے ہونا چاہئے۔ انھوں نے بہت سے شہروں کو چھوا بھی نہیں اور صحیح سالم چھوڑ دیا۔ لیوس نے یہاں تک کہا کہ دورِ جدید کے معیار سے بھی دیکھیں تو منگولوں کی لائی ہوئی تباہی معمولی ہی تھی۔ اس کی دلیل کا ایک حصّہ یہ ہے کہ عالم اسلام میں اسلامی تہذیب نے بہت جلد منگولوں کو جذب کر لیا۔ ایک وہ جو فارس کا حکمراں بنا اور اخیر میں شیعی اسلام کی گود میں چلا گیا اور ایلخانی خاندان کی شفیق حکمرانی کی بنیاد ڈالی۔ اپنی رعایا کا مذہب قبول کر کے اسلام میں ہوا کے یہ تازہ جھونکے ایک نئی روح اور تصورات کے نئے جھرمٹوں کی آمد کا ذریعہ بھی بنے۔

یہ تمام صحیح لیکن یہ کچھ ایسا ہی ہے جیسے ہم کہیں کہ بیسویں صدی میں جنگ عظیم کی لائی ہوئی تباہ کاریاں آخری تجزیہ کے اعتبار سے معمولی نوعیت ہی کی تھیں کیونکہ یقیناً لاکھوں لوگ مارے گئے۔ لیکن لاکھوں لوگ بچ بھی تو گئے۔ اور پھر یہ، روس جرمنی، فرانس اور برطانیہ بالکل تباہ ہو گئے لیکن بہت جلد وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور انھیں آج دیکھیں۔

پسندیدگی کی ایک لہر چنگیز خاں اور اس کے فوراً بعد کے جانشینوں کے لئے بھی پائی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اجتماعی قتل و غارتگری جس کے وہ مرتکب ہوئے وہ ان کی جنگی حکمتِ عملی تھی نہ کہ ظلم، شہروں کی تباہی کے پیچھے بھی حکمت یہ تھی کہ دوسرے شہری اس تباہی کو دیکھ کر بغیر مقابلہ کئے ہی اپنے شہر ان کے حوالے کر دیں۔ اس طرح کا تجزیہ پڑھنے کے بعد ہر کوئی تقریباً مان ہی سکتا ہے کہ منگولوں نے غیر ضروری خون بہانے سے ہر ممکن طور پر بچنے کی کوشش کی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ چنگیز خان سے ہلاکو تک جتنے بھی مشہور منگول فاتحین گذرے۔ وہ اسی نسل اور وسط ایشیا سے تعلق رکھنے والے اور چودہویں صدی کے آخر میں ابھرنے والے فاتح تیمور لنگ کے مقابلہ میں کہیں بہتر تھے

جوخون بہانے اور لا تعداد لوگوں کے قتل میں بھی ان سب سے آگے بڑھ گیا تھا۔ تیمور بربادی اور دہشت کا آخری دھما کہ تھا جس کا آغاز چنگیز خاں سے ہوا تھا۔ جو کسی فلم میں ایسے دیوزاد کی مانند تھا جو بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ ختم ہو چکا لیکن پھر اپنی دم ہلانے لگتا ہے اور پھر اسی طرح جب وہ آخری بار دُم ہلاتا ہے تو تباہی و بربادی کا آخری زخم لگا دیتا ہے۔

خون بہانا تیمور کے لئے جنگ کی حکمت عملی نہ تھی۔ وہ اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ یہ چنگیز نہیں بلکہ تیمور تھا جو شہروں کو برباد کر کے ان کے پھاٹکوں کے سامنے قتل عام کرنے کے بعد مقتولین کے سروں کے مینار بنواتا تھا۔ یہ تیمور ہی تھا جو قیدیوں کو زندہ ہی اونچے اونچے بنے میناروں میں پھینک دیتا جن میں کوئی کھڑکی تک نہ ہوتی اور اس وقت تک انھیں دیکھتا رہتا جب تک وہ اوپری کنارے تک بھر نہ جائے۔

تیمور قتل و غارت کرتا ہوا ایشیا کو چک پہنچا اور پھر ہندوستان میں قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا۔ دہلی کی سڑکوں کو اس نے لاشوں سے ڈھک دیا جو کوئی تین مہینہ تک زندگی کے لائق نہیں رہی۔ تیمور کی لائی یہ تباہی اتنی زبردست تھی کہ دنیا کی کوئی بھی تاریخ اسے بتائے بغیر مکمل نہیں ہوتی اور کوئی بھی عالمی مورخ اس سے صرف نظر نہ کر سکا۔ لیکن یہ زیادہ توجہ اور تذکرہ کی متقاضی نہیں کیونکہ بحیثیت مجموعی یہ بے معنی قتل عام تھا۔ وہ آیا اس نے دیکھا اور اس نے قتل عام کیا اور پھر وہ مر گیا۔ اس کی سلطنت ایک دم ہی پارہ پارہ ہوگئی۔ کوئی بھی اسے زیادہ یاد نہیں کرتا بس یہ کہ وہ ذلت اور تباہی کا دوسرا نام تھا۔

جہاں تک خالص سفّا کی اور خونخواری کے عملی اظہار کا تعلق ہے چنگیز خان اپنے ہم نسل تیمور کے مقابلہ میں بہتر لگتا ہے۔ (تیمور نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ چنگیز کی نسل سے تھا حالانکہ اس کا سلسلہ نسب بہت واضح نہیں ہے)۔ ویسے بھی اصلی منگولوں کی فتوحات نے گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔ انھوں نے تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا تھا۔

اولاً تو ان کی بدولت مسلمانوں کی دینیاتی فکر میں انتشار پیدا ہوا۔ جس سے نپٹنے کے لئے وہ افکار سامنے آئے جن کے اثرات سے ہم آج تک جوجھ رہے ہیں۔ اس انتشار کی جڑیں جس نقطہ نظر میں پوشیدہ تھیں وہ مسلم دنیا کے شارحین علماء بلکہ عام مسلمانوں میں کافی عرصہ سے چلا آرہا یہ خیال تھا کہ اسلام کی جنگی فتوحات دراصل وحی کی سچائی کی علامت تھیں۔ ٹھیک ہے اگر فتح کا مطلب وحی کی سچائی ہے تو شکست کا مطلب کیا ہوگا؟ مسلمانوں کو اتنی زبردست شکستوں کا پہلے کبھی سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ دنیا کے کسی بھی حصہ میں نہیں بلکہ کسی ڈراؤنے خواب میں بھی نہیں۔ مورخ ابن اثیر نے منگولوں کی یورش کو زبردست تباہی سے تعبیر کیا ہے کہ اس جیسی تباہی دنیا شاید ہی کبھی دیکھے۔ یعنی آج سے دنیا کے آخر تک۔ ایک اور مورخ نے کچھ اس طرح سوچا کہ منگولوں کی آمد تو بس دنیا کے خاتمہ کی علامت ہے۔ کسی اور نے کہا کہ منگولوں کی فتوحات سے لگتا ہے کہ شاید اللہ نے مسلمانوں کو چھوڑ دیا ہے۔[1]

صلیبی تو چلیئے عیسائی تھے لیکن یہ منگول؟ یہ تو اہل کتاب بھی نہ تھے۔ ان کی فتوحات نے علماء کے لئے بڑی الجھنیں پیدا کر دی تھیں۔ عام لوگوں کا ایمان بھی بڑے امتحان سے گذر رہا تھا۔ اور یہ امتحان ان میں خاصی گہرائی تک سرایت کرتا جا رہا تھا۔ لوگ شاید سوچتے تو تھے لیکن اس سوچ کو کسی فکری شکل میں پیش نہیں کر رہے تھے۔

بالخصوص سقوط بغداد نے صلیبی جنگوں کے بعد میسو پوٹامیا میں ہر ہوش مند مسلمان کو جو ایک عالمگیر امتِ واحدہ کے قیام کو تاریخ کا ایک اہم مقصد سمجھتا تھا۔ ضرور یہ سوال کرنے پر مجبور کیا ہوگا کہ ہوا کیا؟ غلطی کہاں ہوئی ہے؟

اس سلسلہ میں سخت ترین رائے شامی فقیہ ابن تیمیہ کی طرف سے آئی۔ ان کا خاندان ہرّ ان سے متعلق تھا جو آج شام، عراق اور ترکی کے دوراہے پر واقع تھا جو اس وقت منگول حملہ آوروں کے بالکل راستہ میں تھا۔ حملہ آور گزرے تو یہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ساتھ میں سوائے کتابوں کے اور کچھ نہ تھا۔ دمشق میں قیام پذیر ہوئے جہاں ابن تیمیہ کی پیدائش ہوئی۔ ابن تیمیہ نے اس وقت کے معیاری اسلامی موضوعات کا علم غیر معمولی ذہانت کے ساتھ حاصل کیا اور کم عمری ہی میں انھیں فتویٰ دینے کی اجازت مل گئی۔

زبردست دہشت کا ماحول ہو تو انتہا پسندانہ نقطہ نظر کا پیدا ہو جانا فطری ہے۔ ابن تیمیہ کی جڑیں اپنے وقت ہی میں پیوست تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا خاندان جن حالات سے گذرا اور جن پریشانیوں کا وہ شکار ہوئے نتیجہ میں منگولوں کے حملہ سے ابھرنے والے مسائل کے بارے میں ان کی رائے پر جذباتیت ضرور طاری ہوئی ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے حالات سے متاثر ہونے کے بعد ہی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہو۔ لیکن شام میں جسے منگولوں نے کچل کر رکھ دیا تھا اور جو ابھی تک صلیبی جنگوں کے اثرات کو جھیل رہا تھا۔ ابھی ایسے افراد موجود تھے جو ابن تیمیہ کے خیالات کو سن سکتے تھے۔ اور اگر ابن تیمیہ پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے تو ان عوام کو یہ خیالات سنانے کے لئے کوئی اور پیدا ہو جاتا۔

ابن تیمیہ نے بنیادی طور پر تین باتیں کہیں۔ پہلی بات تو یہ کہی کہ اسلام میں کوئی کمی نہیں ہے۔ وحی میں کچھ غلط نہیں۔ اور مسلمانوں کی فتحمندی کو اسلام کی حقانیت کے ثبوت کے بطور دیکھنا ذرا بھی غلط نہیں ہے۔ ان کے خیال میں مسئلہ مسلمانوں کا ہے۔ انھوں نے صحیح اسلام کی پیروی چھوڑ دی ہے۔ اور یوں خدا نے انھیں کمزور کر دیا ہے۔ فتحمندی کے راستہ پر از سرِ نو چلنے کے لئے یہ ضروری ہے مسلمان کتاب کو دوبارہ پکڑ لیں اور اسلام کو تمام نئے افکار، تشریحات اور اختراعات سے پاک کر کے رسول اللہ اور ان کے رفقاء کار کے طریقہ کار پر چلیں۔ پرانی اقدار اور خیالات کو اپنائیں اور روزمرہ کی زندگی میں سادگی اختیار کریں۔ بزرگوں کی آراء اور فتاویٰ ہی صحیح ترین اور بہتر تھے۔ ابن تیمیہ کی فقہی آراء کی بنیاد اسی فکر پر کھڑی تھی۔

ابن تیمیہ نے وثوق سے کہا کہ جہاد مسلمانوں کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے صلوٰۃ کی ادائیگی، روزہ، دھوکہ دہی سے اجتناب اور اسی طرح کے دوسرے مقدس اور اہم رسمی اعمال۔ ابن تیمیہ نے جب جہاد کا حوالہ دیا تو ان کا واضح مطلب تلوار کا استعمال تھا۔ اُمّت کو ابن تیمیہ کے مطابق ایک خاص مقام حاصل تھا جو اس عسکریت پسندی کی بنا پر اسے حاصل ہوا تھا۔ اس سے قبل کی کسی بھی قوم کو جو ہدایتِ وحی سے سرفراز ہو وہ تمام انسانوں کے لئے نہیں تھیں۔ تمام اچھائیوں کو اپنانے کا حکم انہیں نہیں دیا گیا تھا۔ انہیں ان تمام برے کاموں سے نہیں روکا گیا تھا جو تمام لوگوں کے لئے برے ہوں۔ ان میں کچھ نے ہتھیار بند جدوجہد کو کبھی

بھی نہیں اپنایا۔ جبکہ بعض دوسروں نے ہتھیار محض اس لئے استعمال کیئے کہ اپنے علاقوں سے دشمنوں کو نکال باہر کریں یا ایسے ہی جیسے کچھ مطلوبہ لوگ ظالم کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ ابن تیمیہ کے خیال میں جہاد کا یہ محدود تصور حقیقت سے بہت دور تھا۔ جہاد کا مطلب سرگرم جدوجہد ہے۔ یعنی لڑائی محض اپنی زندگی، گھر اور جائداد کی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ اللہ کے تابعداروں کی امت کو وسیع کرنے کی خاطر۔

ابن تیمیہ نے بعض منگولوں کے خلاف جنگ میں شرکت بھی کی۔ جس منگول کے خلاف جنگ میں وہ شریک ہوئے وہ اس وقت ایمان لا چکا تھا۔ اس صورتحال میں ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے خلاف جنگ کرنا ایک سوالیہ نشان کھڑا کر گیا۔ گوکہ ابن تیمیہ کے بقول ان مسلمانوں کے خلاف جہاد کرنا بالکل جائز تھا کیونکہ یہ لوگ اصلی مسلمان نہیں تھے۔ انھوں نے عیسائیوں، یہودیوں، صوفیوں اور مسلمانوں کے دوسرے گروہوں بالخصوص شیعوں کی بھی مخالفت کی۔ ایک بار انھوں نے کسی عیسائی کو رسول اللہ کے خلاف نازیبا الفاظ ادا کرتے ہوئے سن لیا۔ اسی رات انھوں نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر اسے تلاش کر لیا اور پٹائی کر ڈالی۔

ممکن ہے کہ ان کے تشدّد پر مبنی انداز کی بعض ہم عصروں کے یہاں بھی گونج سنائی دی ہو۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ ہم ان وحشی منگولوں اور صلیبیوں کے لئے اپنی بنیادی تعلیمات کو بدل نہیں سکتے۔ آؤ متحد ہو کر ان سے جنگ کریں۔ اتحاد اور عقیدہ کی وحدت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس لئے اس طرح کی دعوت کی ان معاشروں میں جو بیرونی حملوں کا شکار ہوتے ہیں بڑی پذیرائی ہوتی ہے اور جس وقت یہ دعوت دی گئی تھی کوئی ایک صدی سے مسلمان بڑے زبردست اور ہولناک حملوں کا شکار ہوتے رہے تھے۔

ابن تیمیہ نے اس فہرست میں بعض اور گروہوں کے نام شامل کیئے جن کے خلاف جہاد ہو سکتا تھا۔ اب اس میں محض غیر مسلم ہی نہیں تھے بلکہ اس میں ملحد، مرتد اور تفرقہ باز بھی شامل تھے۔ اس فہرست میں ایسے مسلمان بھی شامل کر لئے گئے جنھوں نے اسلام میں تبدیلیاں کرنے کی کوشش کی تھی یا قرآن وحدیث کی ایسی تشریحات کیں تھیں جن سے امت میں انتشار پیدا ہوتا ہو اور جو قرآن وحدیث کے لفظی معنی سے منحرف ہوں۔

ابن تیمیہ نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ وہ اپنی تشریحات کو دوسری تشریحات پر ترجیح دے رہے ہیں یا ان پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ وہ یہی کہتے رہے کہ ان کی کوشش یہ ہے کہ جو تشریحات دیکھنے میں ناجائز نظر آئیں انھیں منسوخ کر دیا جائے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ کتاب یعنی قرآن سے رجوع کریں یعنی قرآن اور حدیث حتمی شکل میں ہیں اور ان میں انسانی تشریح کا کوئی دخل نہیں ہے۔

کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ملحدوں، بدعتیوں اور تفرقہ پیدا کرنے والوں کو ممیّز کرنے کا رویّہ ابتدائی اسلامی دور میں تو روا رکھا گیا لیکن وہ اسلامی روح کا حصہ نہیں رہا۔ جانشینی کے سوال پر دلائل کا سلسلہ چلا اور اس میں خون خرابہ بھی ہوا۔ لیکن رسول اللہ خود بھی اور ابتدائی دور کے مسلمان اس خیال کے حامل تھے کہ کوئی مسلمان ہونا چاہتا ہو تو بس وہ مسلمان ہے۔ (منافقین یعنی وہ لوگ جو اسلام کو قبول کر کے اندر سے اس کے خلاف سازشیں رچانا اور

اسے کمزور کرنا چاہتے تھے ان کا معاملہ مختلف ہے)۔ وہ تمام لوگ جو مسلمان ہونا چاہیں وہ اس گروپ میں شامل تسلیم کئے جائیں گے۔ اور پھر یہ ایک اندرونی معاملہ ہوگا کہ مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں؟ لیکن ابن تیمیہ کا زور اس بات پر تھا کہ مسلمان ہونے کا ایک طریقہ ہے اور ایک مسلمان کی یہ خاص ذمہ داری ہے کہ وہ اس طریقہ کو معلوم کرے اور پھر اس کی پیروی کرے۔ اس میں تشریحات درمیان میں نہیں آتیں کیونکہ ایک انسان کو اسلام کے بارے میں جو کچھ معلوم کرنا ہے وہ کتاب میں بالکل واضح طور پر موجود ہے۔

ابن تیمیہ نے مسلمانوں کی اولین جماعت اور ان کی زندگیوں کو ایک اساطیری رنگ دے دیا اور رسول اللہ کے ساتھیوں کو سلف صالحین یعنی پاک اور طیب لوگوں کے بنیادی گروہ کا تصور دیا۔ ابن تیمیہ کے تصورات سے جو نقطۂ نظر بنا وہ بالآخر ہندوستان اور شمالی افریقہ میں سلفی تحریک کی شکل میں ظاہر ہوا اور یہ آج تک موجود ہے۔ یہ جو اسلامسٹ کی اصلاح اکثر و بیشتر مختلف ذرائع ابلاغ کے ذریعہ خبروں اور تجزیوں میں آتی رہتی ہے دراصل اس کی تصویر کشی منگول دور ابتلا و دہشت کے زیر سایہ ہی ابھری تھی۔

اپنے عہد میں ابن تیمیہ بہت کم پیروکار تیار کر سکے تھے۔ عوام میں ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ رہی ہو کہ وہ ان مسلمانوں کو زدوکوب کرتے تھے جنھوں نے مقامی اور عوامی روایتوں اور سرگرمیوں کو اسلام میں داخل کر لیا تھا اور بعض مزاروں پر بھی حاضر ہو جایا کرتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ انسانوں بلکہ عظیم انسانوں کی تعظیم کرنا سلف صالحین کی فکر کے خلاف ہے۔

صاحب اقتدار لوگ انھیں اور بھی ناپسند کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ابن تیمیہ ان فیصلوں پر بھی تنقید کرتے تھے جو پہلے سے جاری تھے اور تسلیم شدہ تھے۔ جب انھیں علماء کی ایک نمائندہ کمیٹی کے سامنے پیش ہونے اور اپنے فیصلوں کا دفاع کرنے کو کہا گیا تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ علماء اس لائق ہیں ہی نہیں کہ ان کے سامنے پیش ہوا جائے کیونکہ یہ تشریحات اور اختراعات کے سامنے مغلوب ہو گئے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرے مسائل کے سلسلہ میں ان کا رویہ اسی طرح کا تھا کہ وہ تعاون کے قائل نہ تھے۔ یہ اختلافی مسائل غیر مسلموں کو بھی باریکی ہی سے دیکھنے کے باوجود محض ٹیکنیکل ہی نظر آئیں گے۔ مثلاً یہ سوال کہ ایک وقت میں دی گئی تین طلاقیں آخری سمجھی جائیں گی یا نا قابل تنسیخ حد تک آخری۔ صاحب اقتدار کی رائے تھی کہ یہ نا قابل تنسیخ ہیں۔ ابن تیمیہ نے کہا کہ یہ آخری ہیں لیکن نا قابل تنسیخ نہیں۔ اس مسئلہ میں دلیل اس طرح ختم ہوئی کہ مقتدرہ نے ابن تیمیہ کو قید میں ڈال دیا۔ انھوں نے طویل عرصہ قید میں گذارا۔ بلکہ قید میں ہی ان کی وفات بھی ہوئی۔

ابن تیمیہ کا نقطہ نظر پورے اسلام کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ تیرہویں صدی کے اسلام کی بھی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھی متعدد مکاتب فکر اور متعدد خیالات پائے جاتے تھے۔ البتہ جس رویہّ نے علماء اور حکومت کے افسروں کو ابن تیمیہ سے دور کر دیا تھا اسی رویّے کی بنا پر بہت سے علماء اور افسر انکے قدرداں بھی ہو گئے تھے۔ ابن تیمیہ دراصل اس فقہی مکتب فکر سے متعلق ہیں جو ابن حنبل نے عباسی دور میں قائم کیا تھا اور عقل

کی اولیت اور کفایت کے خلاف زبردست اسٹینڈ لیا تھا۔ ابن حنبل نے قرآن کے لفظی معنی اختیار کر لئے اور لفظی اعتبار سے اسے منطبق کرنے کی وکالت کرتے تھے۔ وسعت پذیر مسائل میں بھی قیاسی طریقہ کار کے مخالف تھے۔ ابن تیمیہ کا رویہ بھی یہی تھا۔ دونوں کے مزاج سختی، مبارزت پسندی اور خم ناپذیری سے عبارت تھے۔ ان دونوں حضرات کے اپنے خیالات اور فکر کی بنیاد پر قید و بند میں ڈالے جانے کی وجہ سے قید و بند کو ایک ایسے ورثہ اعزاز کا درجہ مل گیا ہے جس نے ان کے خیالات کی قدر و قیمت اور فضیلت کو پرکھنے اور جانچنے سے ذہن کو مفلوج کر دیا ہے۔

حق اور شجاعت میں مماثلت کو تسلیم کرنے کے نتیجہ میں تاریخ خاصی دلچسپ ہوتی رہی ہے۔ خود ہمارے دور میں Bill Maher جو ایک ٹاک شو کا میزبان ہوا کرتا تھا محض اس بنا پر TV نیٹ ورکس سے اسے نکال باہر کر دیا گیا تھا کہ اس نے کہہ دیا تھا کہ ۹/۱۱ کے خودکش ہائی جیکرز دلیر اور حوصلہ مند لوگ تھے۔ ذوق سلیم کا تقاضہ ہے کہ کوئی ایسا شخص جس کے خیالات اور عمل میں سرکشی یا بداخلاقی پائی جائے اس سے مثبت صفات وابستہ نہ کی جائیں۔ کیونکہ بدقسمتی سے اس مماثلت کو تسلیم کر لینے کے نتیجہ میں بعض اختلافی خیالات محض ہمت اور شجاعت سے ظاہر کئے جانے کی بنا پر لوگوں کے نزدیک جائز اور صحیح قرار پا جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ایک بزدل آدمی حق بات نہیں کہہ سکتا اور شجاع صحیح بات ہی کہے گا۔ ابن حنبل کو اسی کیفیت کا فائدہ ملا تھا اور اب ابن تیمیہ بھی اسی سے مستفید ہوئے ہیں۔

مشہور ہے کہ ابن تیمیہ نے کوئی چار ہزار پمفلٹس اور پانچ سو کتابیں تصنیف کیں اور ان کے ذریعہ انھوں نے ایک بیج بو دیا۔ یہ بیج فوراً ہی پنپنا شروع نہیں ہو گیا اور نہ ہی یہ کبھی ختم ہوا بلکہ یہ پڑا رہا۔ ثقافت اسلامی کے اندر یہ اس طرح پڑا رہا کہ اگر کبھی حالات سازگار ہوں تو یہ برگ و بار لائے۔ ساڑھے چار صدیوں کے بعد حالات بدلے اور سازگار ہو گئے۔

صدیوں پر محیط انتشار اور افتراق جس کا نقط عروج منگولوں کے ذریعہ تباہی و بربادی کی شکل میں سامنے آیا تھا اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی صورتحال پر ایک دوسرا ردِعمل سامنے آیا جو سلفیت کے مقابلہ میں نسبتاً مقبول عام بھی تھا اور بردبار بھی۔ یہ تھا تصوف کا برگ و بار لانا۔ تصوف کے اندر اتنی ہی وسیع القلبی اور منکسر المزاجی تھی جیسی ابن تیمیہ کے افکار میں لفظ پرستی اور امتناع پایا جاتا تھا۔ ابن تیمیہ کو مہذب تصوف کے مقابلہ میں وجد آفریں اور کیف آوری سے معمور تصوف نے تقریباً اتنا ہی پریشان کیا جتنا کہ مظاہر پرست اور بت پرست حملہ آوروں نے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ گمراہ لوگ تو اسلام کے لئے بیرونی خطرہ تھے جبکہ صوفی لوگ اندرونی دشمن تھے جو عیاری سے امت کو گمراہ کر رہے تھے اور توحید کے تصور کو وسعت دے کر اسے دھندلا بھی کر رہے تھے۔

تصوف اپنی بہت سی صفات کی بنا پر اسلامی علمِ باطن جیسا تھا جس کے بعض تصورات میں کچھ لہریں بدھ مت اور ہندو جوگیوں کی بھی تھیں۔ صوفی ایسے افراد تھے جو مذہب پر سسٹم اور انتظامیہ کے حاوی ہو جانے کی بنا پر بے اطمینانی کا شکار ہو گئے تھے اور پھر ایسے طریقوں کی طرف مائل ہوئے جو اللہ سے روحانی قربت کا ذریعہ بن سکیں۔

تقریباً ہر صوفی کو معلوم تھا کہ اسے کہاں پہنچنا ہے لیکن کس طرح پہنچنا ہے اس میں مختلف طریقوں کو اپنایا جاسکتا تھا۔ جب بھی یہ لگتا کہ کوئی صوفی کسی مقام پر پہنچ گیا ہے تو یہ خبر پھیل جاتی اور دوسرے متلاشی اس آگاہ کے گرد جھنڈ بنا لیتے اور اس کی رہنمائی کے خواہش مند ہوتے۔ اس امید کے ساتھ کہ اس سے براہ راست تعلق کے ذریعہ خود اُن میں ماورا ہو جانے کی جو آگ لگی ہوئی ہے وہ توانا ہو جائے گی۔ اس طرح معروف صوفیوں کے گرد ایک صوفی اخوت قائم ہوگئی۔ یہ لوگ وہیں رہتے، کام کرتے اور شیخ یا پیر کے ساتھ رہ کر اور اس کی رہنمائی میں اپنی مشقیں کرتے۔ واضح رہے کہ یہ دونوں اصطلاحیں یعنی شیخ اور پیر معمر شخص کے لئے استعمال ہوتی ہیں ایک عربی میں دوسری فارسی میں۔ شیخ کے قریب ترین بعض شاگردوں کو اپنے طور پر شیخ کا مقام مل جاتا اور جب شیخ وفات پاتے تو انھیں شاگردوں میں سے کوئی شیخ کی جگہ سنبھال لیتا۔ اسے وہی اختیار حاصل ہو جاتا اور اپنی جماعت کی رہنمائی کا سلسلہ جاری رکھتا۔ بعض دوسرے علاحدہ ہو کر اپنی اپنی جماعتیں تشکیل کر لیتے۔ لیکن اپنے شیخ کے ہی طریقوں کے تحت ہی رہنمائی کرتے۔ چنانچہ یہ صوفی اخوت بتدریج صوفی سلسلہ تک پہنچی اور صوفی طریقہ کار اور روایت شیخ سے براہ راست مبتدی تک پہنچتی ہوئی سالہا سال بلکہ صدیوں سے چلی آرہی ہے۔

کامیاب صوفی سلسلوں میں کسی ایک وقت میں ایسے اہل بصیرت شیوخ کی نشاندہی کی جاسکتی تھی جو مختلف مقامات پر اکثر اپنے مریدوں کے درمیان اور ایسی عمارتوں میں رہتے جنھیں خانقاہ کہا جاتا۔ یہاں مسافروں کو غذا وغیرہ اور اجنبیوں کو آرام بھی مل جاتا۔ اس طرح صوفی اخوت اسلام میں، عیسائیوں کے صومعوں اور راہبانہ سلسلوں کی مترادف ہوئی جن کے تحت قرون وسطیٰ کے یورپ میں مونٹیسری اور راہبات کے اقامت خانوں کا طویل سلسلہ قائم ہوا تھا۔ یہ مقامات بھی ان لوگوں کے لئے تھے جن کا نصب العین روحانی ارتقاء تھا۔

لیکن صوفی اخوت اور عیسائی موناسٹک سلسلوں میں بنیادی فرق ہے۔ ایک تو یہ کہ موناسٹک سلسلوں میں سخت قوانین نافذ تھے جن پر ہر راہب اور راہبہ کو سختی سے عمل کرنا ہوتا تھا۔ ان کی نگرانی ایک صدر راہب یا صدر راہبہ کرتی تھی۔ جبکہ صوفی سلسلوں میں آزادی تھی اور غیر رسمیت غالب تھی۔ گویا صوفی سلسلوں میں زیادہ توجہ بیرون سے نافذ ہونے والے ڈسپلن پر نہیں بلکہ باہمی رفاقت کے حصول پر تھی۔

عیسائیوں کے موناسٹک سلسلہ میں ایک بنیادی عنصر ان کا وہ عہد ہے جو وہ ترک دنیا اور نفس کشی سے متعلق کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ عیسائیت میں انفرادی نجات پر زیادہ توجہ ہے کیونکہ پیدائشی طور پر وہ گناہ زدہ ہیں اور اولین گناہ یعنی باغِ جنت میں شہوت کی دریافت کر چکے ہیں۔ اور اسی گناہ کی وجہ سے انسانیت کو اس جسم میں قید کی سزا دی گئی ہے۔ اور اس مادی دنیا میں وہ اسی جسم میں مقید رہتی ہے اور اسی میں اس کو موت بھی آتی ہے۔

راہب اور راہبائیں ان سلسلوں میں شامل ہی اس لئے ہوتے ہیں کہ وہ اس دنیا سے علیحدگی اختیار کر سکیں جو ان کو دی گئی سزا کی علامت ہے۔ ان کا زہد اور اخلاص ہوتا ہی اس لئے ہے کہ وہ اس جسم کو سزا دے سکیں کیونکہ یہ جسم ہی تمام گناہوں کی وجہ بنتا ہے۔ تجرّد ان کے نصاب میں شامل تھا کیونکہ عیسائیت میں روحانیت

شہوت کا علاج تھی۔

جبکہ اسلام میں زیادہ اہمیت انفرادی اور تنہا روح کی نجات کی نہیں بلکہ ایک بے عیب اور ایک کامل امت کی تشکیل کی ہے۔ انسان پیدائشی گناہ گار نہیں جس کی حفاظت ضروری ہو۔ بلکہ وہ ایک غلام ہے جسے فرمانبردار ہونا چاہیئے۔ وہ پیدائشی طور پر معصوم ہے اور شرافت کے اعلیٰ ترین مدارج تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن وہ ادنیٰ ترین مقام تک گر بھی سکتا ہے۔[2] صوفی سلسلہ میں ایک مرید اپنی حفاظت وسلامتی کے لئے نہیں بلکہ بلند تر مدارج کے حصول کی خاطر شامل ہوتا ہے۔ اس کی ریاضتیں اپنے جسم کو سزا دینے کے لئے نہیں بلکہ اپنی قوتوں کو اللہ کے خوف کی طرف گامزن رکھنے کے لئے ہوتی ہیں۔ روزہ نفس کشی کے لئے نہیں بلکہ اپنے ضبط نفس کی خاطر ہوتا ہے۔ ان کے یہاں تجرد اور رہبانیت میں کوئی رشتہ نہیں اور نہ ہی دنیا سے علیٰحدگی ان کے ایجنڈے میں شامل ہے۔ صوفی اور ہونے والے صوفی سب ہی عام طور پر تجارت کرتے، خرید وفرخت کرتے، شادیاں کرتے، بچوں کی پرورش کرتے اور جنگوں میں بھی شریک رہتے۔

اس صوفی اخوت میں ایک ایسا گروہ بھی گذرا جسے صوفی سورماؤں کا گروہ کہا جاسکتا تھا جس کے کچھ خاص اخلاق ہوتے تھے جنھیں فتوّاۃ* کہا جاتا تھا۔ ان سے مماثلت رکھتے ہوئے کچھ گروہ یورپ میں بھی پائے جاتے تھے جو اپنی دلیری، درباری عشق اور دلیرانہ اعزاز سے پہچانے جاتے تھے۔ ان میں کون کس سے متاثر ہوا تھا یہ اختلافی بحث ہے جس میں اس وقت ہم نہیں جاسکتے۔

جو بھی رہا ہو صوفیوں نے فُتوّاۃ کے اخلاق سے مزین دور اول کے مسلمان عظیم کرداروں کو اساطیریت پر مشتمل شاعری اور حکایتوں میں پیش کیا ہے۔ مثلاً ایسی ہی ایک کہانی میں ایک نوجوان مسافر کا واقعہ ہے جسے ایک بوڑھے شخص کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ مقتول کا بیٹا اس نوجوان کو لے کر خلیفہ عمرؓ کے سامنے آیا۔ نوجوان مسافر نے اپنے عمل کو تسلیم کیا۔ گو کہ جرم کی شدت کو کم کرنے کے ثبوت موجود تھے لیکن اس نے عذر داری سے انکار کردیا کہ وہ ایک زندگی ختم کرچکا ہے تو اس کو بھی زندہ رہنے کا حق نہیں۔ البتہ اس نے ایک درخواست کی کہ اس کی سزا کو تین دن کے لئے موخّر کردیا جائے تاکہ وہ گھر کا کچھ کام نپٹا سکے۔ جہاں ایک یتیم اس کی نگرانی میں پل رہا تھا اور اس نوجوان نے اس یتیم کی دولت کو حفاظت کی خاطر کسی جگہ دبا کر رکھ دیا تھا اور اس جگہ کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ اگر سزا ملنے سے قبل اس نے اس جگہ کو نہیں کھودا تو یتیم بچہ کے پاس کچھ نہ رہے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ

---

* فُتوّۃ ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی میں جانبازی اور جوانی میں بنیادی حوصلہ مندی کی صفات کا پایا جانا شامل ہے۔ اسے تصوف میں بھی استعمال کیا گیا جو بہادری اور بانکپن اور راستبازی سے مماثلت رکھتا ہے۔ یہ اصطلاح عثمانی سلطنت میں ایسے گروہوں اور شہری تنظیموں کے لئے استعمال ہوتی تھی جو اپنے وابستگان میں ایمانداری، امن پسندی، شرافت، فیاضی، شکایت وتلخی سے بچنا اور فیاضی جیسی صفات کی توقع رکھتی تھیں۔ اس گروہ کے ارکان تصوف اور اس کے اعمال سے آپس میں جڑے رہتے تھے۔

بالکل ہی صحیح نہیں ہے کہ گارجین کے جرم کی بنا پر یتیم بچہ نقصان اُٹھائے۔ ''اگر آپ مجھے آج جانے دیں، قاتل نے کہا، تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے تین دن بعد واپس آجاؤنگا اور سزا کے لئے اپنے آپ کو پیش کردونگا۔

خلیفہ نے کہا ''لیکن یہ اس وقت ممکن ہے کہ تم اپنے عوض کسی اور کو سزا کے لئے تیار کرلو یعنی کوئی ایسا شخص جو اگر تم نہ آئے تو وہ تمہاری جگہ سزا بھگتنے کے لئے تیار ہو۔''

یہ سن کر نوجوان قاتل چکرا گیا۔ اس علاقے میں نہ کوئی اس کا دوست تھا اور نہ ہی کوئی عزیز ورشتہ دار۔ کوئی اجنبی اس پر اتنا اعتبار کیسے کریگا کہ خود ہی اس کی جگہ موت کی سزا پانے کا خطرہ مول لے۔

اس موقعہ پر ابوذرؓ جو رسول اللہؐ کے ایک صحابی تھے کھڑے ہوئے اور اعلان کیا کہ میں اس نوجوان کے عوض سزا پانے کو تیار ہوں اور اس طرح قاتل چل دیا۔

تین دن گذر گئے لیکن نوجوان واپس نہیں آیا۔ اس پر تو کسی کو تعجب نہ تھا لیکن بچارے ابوذر کے بارے میں سب پریشان تھے۔ ابوذرؓ نے بڑی وفاداری کے ساتھ اپنا سر اس تختہ پر رکھ دیا جس پر سر کٹنے والا تھا۔ سزا دینے والا اپنے ہتھیار کو تیل لگا کر صاف کر کے سر کاٹنے کی تیاری ہی کررہا تھا کہ دھول میں اٹے ہوئے گھوڑے پر سوار پسینہ میں شرابور نوجوان آپہنچا۔ ''معاف کرنا معاف کرنا مجھے پہنچنے میں تاخیر ہوگئی'' نوجوان نے کہا'' لیکن اب میں آگیا ہوں اور سزا کے لئے تیار ہوں۔''

دیکھنے والے متعجّب تھے'' تم آزاد تھے اور جا بھی چکے تھے کوئی تمہیں تلاش کر کے یہاں واپس نہیں لاسکتا تھا۔ تم واپس کیوں آگئے''؟

''جیسا کہ میں نے کہا اور اب پھر کہہ رہا ہوں میں مسلمان ہوں۔'' نوجوان نے جواب دیا میں بھلا دنیا کو یہ کہنے کا جواز کیسے فراہم کرسکتا ہوں کہ مسلمان اپنے وعدے پورا نہیں کرتے۔''

''ہجوم ابوذرؓ سے مخاطب ہوا'' کیا تم اس نوجوان سے واقف تھے'' کیا تم اس کے بلند کردار سے آگاہ تھے۔ کیا اس لئے تم اس کے عوض سزا بھگتنے کو تیار ہوگئے۔''

''نہیں'' ابوذرؓ بولے۔ میں اس نوجوان سے زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں ملا۔ لیکن میرے ہوتے ہوئے دنیا کیسے سوچ سکتی ہے کہ مسلمان رحمدل نہیں ہوتے۔''

مقتول کے رشتہ دار گھٹنوں پر جھک گئے اور درخواست کی کہ اسے سزا نہ دی جائے اور کہا کہ ہم دنیا کو یہ کیسے کہنے دینگے کہ اسلام میں معاف کردینے پر لوگ تیار نہیں ہوتے''

تصوف کے بہت سے حامی اپنے سلسلہ کو علیؓ سے منسلک کرتے ہیں اور یہ بالکل بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ اہل تشیع سے متعلق ہوں۔ معروف بات یہ ہے کہ علی اس میدان کے مرد کامل تصور کئے جاتے ہیں۔ وہ توانائی، دلیری، پاکیزگی اور شرف واحترام کا ایک مثالی مجموعہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام کے دور اول کی کسی ایک

جنگ کے دوران جو آج اسلام کی علامت بن چکی ہیں ایک نوجوان اپنی تلوار لہراتا ہوا علیؓ کے سامنے آیا۔ علیؓ بولے۔ ''بے وقوف نوجوان تم جانتے ہو میں کون ہوں'' میں علیؓ ہوں۔ تم مجھے شکست نہیں دے سکتے۔ میں تمہیں قتل کردونگا۔ کیوں حملہ کر رہے ہو مجھ پر۔''

''لیکن میں عشق میں گرفتار ہوں'' نوجوان نے کہا ''میری محبوبہ کہتی ہے کہ میں تمہیں قتل کردوں تو وہ میری ہو جائیگی''۔

''لیکن اگر ہم لڑیں تو اس کا زیادہ امکان ہے کہ میں تمہیں قتل کردونگا'' علی نے کہا۔

کسی کے عشق میں جان دینے سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے'' نوجوان بولا۔

یہ سن کر علیؓ نے اپنا صافہ سر سے اتارا اور سر آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ دیکھو صحیح اس مقام پر تلوار مارنا۔ یہ دیکھ کر کہ علیؓ عشق کے لئے جان بھی دینے کو تیار ہیں نوجوان کا دل فروزاں ہو گیا اور عورت کا عشق بلند تر عشق کی طرف مائل ہو گیا۔ اللہ کے عشق کی طرف۔ محض ایک لمحہ میں ایک معمولی نوجوان ایک آگاہ صوفی بن گیا۔ ۳۲ ایسے واقعات نے تصوف کے ان جیالوں کو مہمیز کیا کہ ان جذبوں کو جگایا جائے۔ *

عثمانیوں کا دور (تقریباً ۷۰۰ ھجری سے ۱۳۴۱ ھجری؟ تک)

گو کہ صوفی سلسلے پورے عالم اسلام میں پھیل گئے لیکن ایشیا مائنر یا اناطولیا یعنی آج کے ترکی کے علاقے میں ان کے اثرات بہت گہرے مرتب ہوئے۔ اسی علاقے سے مابعد منگول اسلام کے احیاء کا آغاز ہوا۔

اس علاقے میں صوفی سلسلہ کے تاجروں اور فن کاروں کی انجمنوں نے جنھیں اخی (فُتوّاۃ کے لئے ترکی لفظ) کہا جاتا تھا، عام آدمی کو وقت کی ناہمواریوں اور غیر یقینیت سے محفوظ رکھنے میں بڑا رول ادا کیا کیونکہ لوگوں کو اس طرح کے کسی حفاظتی نظام کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اناطولیہ کا علاقہ ایک عرصہ سے ترک مسلمانوں اور یورپی عیسائیوں کی سرحد کا کام کرتا رہا تھا۔ سلجوقی اور بازنطینیوں کی جنگوں کے نتیجہ میں یہ علاقہ بڑی شکست و ریخت کا شکار ہوا تھا۔ البتہ ایک سلجوقی شہزادے نے اس علاقہ میں خاصی مستحکم حکومت قائم کرلی تھی جو سلطنت روم کہلاتی تھی۔ لیکن صلیبی جنگوں کے نتیجہ میں یہاں کا نظم وضبط بدنظمی کا شکار ہو گیا تھا اور پھر سلجوقیوں کی آپسی جنگوں نے یہاں کے استحکام کو مزید خراب کر دیا۔

جب صلیبی جنگیں ماند پڑنے لگیں تو مختلف ترکی شہزادوں نے ایشیا مائنر کے مشرقی علاقوں پر کم وبیش حکومت سنبھال رکھی تھی۔ لیکن یہ بس کم وبیش ہی تھی۔ اسی طرح بازنطینی بھی مغربی حصوں کو سنبھالے ہوئے تھے

---

* یہ محض کہانیاں ہیں اور تاریخ میں ان کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا۔ اور فتوۃ کے تحت جس معیار کا کردار تخیل میں تھا اسی کے تحت ان کرداروں کی تخلیق کی گئی ہے۔ کردار حقیقی نہیں اور واقعات بھی محض خیالی ہیں۔ بہادری اور راستبازی کا انتہائی اعلیٰ معیار پیش کرکے عوام کو متاثر کرنے کی غرض سے شاید ان کی تخلیق ہوئی ہوگی۔ بالکل اسی جذبہ کے تحت حصول جنت اور خدا سے تعلق پیدا کرنے کے لئے ترغیب دینے کی خاطر بہت سی احادیث گھڑی گئی ہیں۔

لیکن ان کا کنٹرول بھی بس کم وبیش ہی تھا۔ کسی ایک کا بھی دعویٰ بے نزاع اور غیر متنازع فیہ نہیں تھا۔ اس صورتحال کے نتیجہ میں ایشیا مائنر کا یہ علاقہ قانون سے آزاد تھا جس میں عیسائی اور ترک دونوں ہی بستے تھے لیکن حکمرانی کسی کی نہ تھی۔

منگولوں کے انفجار کے نتیجہ میں وسط ایشیا کے خانہ بدوش ترک گڈریوں کے تازہ غول کے غول باہر نکل پڑے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ وہ ایشیا مائنر نہ پہنچ گئے جو شاید انھیں وہ اپنے گھر جیسا لگا۔ یہیں آکر کیوں ٹھہرے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ خانہ بدوش گڈریوں کو ایسا ہی ماحول اچھا لگتا ہوگا جو کسی قانون کا پابند نہ ہو۔ خود مختار اور خود حکمرانی کے عادی اس برادری کے اپنے لیڈر اور اپنے قوانین تھے۔ دوسروں کے قوانین کی بالادستی اور حکمرانی کے ماحول میں ان کا دم گھٹتا تھا۔ ایک متنازع سرحدی علاقہ میں وہ جہاں چاہتے جاتے اپنے جانوروں کو جہاں چاہتے چراتے اور اپنی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کا وہی آزمودہ طریقہ جو انھوں نے میدانوں کی زندگی جسے گھر کہتے تھے، اپنا رکھا تھا یعنی مستقل آبادیوں میں لوٹ مار کرنا۔ یہاں بھی انھوں نے آزادی سے اسی کو استعمال کیا۔

لاقانونیت کے حامل اس علاقہ میں عیسائی اب بھی چھوٹے چھوٹے شہروں اور گاؤں کی شکل میں مستقل طور پر آباد تھے۔ کوئی حکومت راستوں کی حفاظت کی ذمہ دار نہ تھی کسی کا گھر یا دکان لٹ جائے تو کوئی پولس ان کی مدد کے لئے نہ تھی اور نہ ہی کوئی ایسا ادارہ تھا جو سیلاب، آگ لگنے یا اسی طرح کی کسی اور تباہی کے وقت ان کی مدد کو پہنچتا۔ اس طرح کا نظم وضبط ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ چنانچہ سوائے اپنی برادری یا قبیلہ کے کسی کے پاس مدد کے لئے آنے والا کوئی نہ تھا یا پھر دوست واحباب کا یا پھر صوفی بھائیوں کا حلقہ تھا۔

جب صوفیوں کا سلسلہ اس علاقہ کے عوام میں پھیلا تو گشتی اور خانہ بدوش مجذوبوں کا آنا جانا بڑھ گیا۔ ان میں سے کچھ کا تعلق فارس یا اس کے مزید مشرق سے تھا اور کچھ مقامی طور پر ہی ظاہر ہو گئے تھے۔ کچھ درویش تھے جنھوں نے رضا کارانہ طور پر غربت اختیار کر لی تھی اور اس کے ذریعہ روحانی ارتقاء کی تمنا کرتے تھے۔ یہ لوگ محنت مزدوری نہیں کرتے تھے بلکہ خیرات پر زندگی گذارتے تاکہ پورا وقت خدا پر غور وفکر کے لئے فارغ کر لیں۔

ان مجذوب سیلانیوں میں بہت سے سنکی بھی تھے جو شاید یہ سمجھتے تھے کہ اگر صدقہ وخیرات پر ہی زندگی گذارنی ہے تو پھر کوئی امتیاز بھی نہیں رہنا چاہئے۔ اس طرح کے ابتدائی سیلانیوں میں ایک گروہ جسے قلندر (Kalendar) کہا گیا ایسا بھی تھا جو مختلف علاقوں میں جتھوں کی شکل میں گھومتا پھرتا اور گانے بجانے کے ساتھ چلاتا، شور مچاتا، چلّا کر وعظ کرتا اور ڈینگیں مارتا۔ بے لگام سرکشوں کا یہ گروہ اللہ کی طرف بلاتا اور کافروں سے لڑنے کے لئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتا کہ بس لڑو اور لڑو۔ یہ اور ان کے پیروکار بال نہیں کٹواتے تھے، یہ موٹے کپڑے پہنتے امن وسکون میں خلل ڈالتے اور ہنگامہ آرائی کرتے۔ لیکن یہ جہاں بھی جاتے لوگوں میں شوق اور جذبات میں جوش پیدا کرتے اور اجنبی قسم کے تصورات پھیلاتے۔ جہاں جہاں یہ قلندر جاتے ایک قلندری اخوت نمو پانے لگتی۔

اس غیر مہذب اخوت سے محفوظ رہنے کی خاطر باعزت لوگوں نے ایک اور صوفی سے وابستگی اختیار کر لی جس کا نام بیکتاش تھا۔ اس کی زندگی میں سادگی اور زُہد نمایاں تھا البتہ صوفیانہ متانت کے ساتھ بیکتاش میں شدت بہت تھی لیکن یہ

ڈھول دھبہ نہ تھا۔ چنانچہ وہ علماء میں خاصا مقبول ہوگیا؛ پھر مولوی درویش تھے جو مفکروں اور دانشوروں کے دلپسند تھے۔ یہ ایک شاعر جلال الدین کے گرد ابھرے۔ جلال الدّین کیونکہ اصلاً بلخ میں پیدا ہوئے اس لئے افغانستان میں جلال الدّین بلخی کے نام سے معروف ہیں۔ جب چنگیز خاں ایک بڑی قوت سے ابھرنا شروع ہوا تو جلال الدّین کا لڑکپن تھا۔ ان کے والد نے محسوس کرلیا تھا کہ مشکلات آنے والی ہیں۔ اس لئے انھوں نے وہ علاقہ چھوڑ کر مغرب کی سمت میں سلطنتِ روم میں جو کچھ بھی باقی تھا سکونت اختیار کرلی۔ اسی وجہ سے دنیا کے بڑے حصہ میں اس شاعر کو جلال الدین رومی کہا جاتا ہے۔

رومی کے عالم و فاضل والد نے ایک مدرسہ قائم کیا اور رومی جب عمر کو پہنچے تو اس مدرسہ میں درس و تدریس میں مشغول ہوگئے اور حصول علم کے میدان میں ایک مقام حاصل کرلیا۔ روایتی مذہبی علوم پر کتابیں تصنیف کیں جنکی بنا پر ان کی عزت و توقیر میں مزید اضافہ ہوا۔ اور یوں طلبہ کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ ان کے خطبات میں شاگردوں کی بھیڑ ہوتی جو ان کے کسی لفظ کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔

روایت کہتی ہے کہ رومی کی زندگی میں اہم ترین مقام وہ آیا جب وہ اپنے شاگردوں کو درس دے رہے تھے خراب وخستہ حالت میں ایک اجنبی ان کے کلاس روم میں آکر پیچھے بیٹھ گیا۔ البتہ اس کی زبان چلتی رہی اور وہ خاموش نہ بیٹھ سکا۔ کبھی یکا یک کچھ گانے لگتا۔ ظاہر ہے کہ کلاس متاثر ہوئی ہوگی۔۔۔۔۔ وہ مخبوط الحواس سا لگتا تھا۔ اس اجنبی سے متعلق کہانیاں سنکر ایک نوجوان جیک کروک (Jack Kerouac) یاد آجاتا ہے جو Allen Ginsberg کے پہلی بار عوام کے سامنے Howl پڑھنے کے دوران کمرہ کے پیچھے سے Go،Go، یعنی جاؤ جاؤ چلّا رہا تھا۔* رومی کے شاگردوں نے اس فقیر کو پکڑ لیا اور کمرہ سے باہر پھینکنے کی کوشش کی لیکن استاد نے روکا اور فقیر سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

'میں شمس تبریز ہوں' اجنبی نے کہا ''اور تم سے ملنے آیا ہوں''۔

طلباء کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ رومی نے کتاب بند کی اور اپنا وہ جبہ اتارا جو علماء کے لئے مخصوص تھا اور کہا ''درس و تدریس کے میرے دن ختم ہوئے یہ فقیر اب میرا مالک ہے۔ رومی شمس کے ساتھ کلاس سے باہر نکل گئے اور پھر کبھی واپس نہ آئے۔

جلال الدین اور وہ فقیر اب جز و لاینفک ہوگئے۔ ان دونوں کے بندھن میں زبردست جوش تھا اور یہ خالص روحانی سطح کا تھا۔ اور یہ بندھن اتنا قطعی تھا کہ جلال الدین شاعری بھی اپنے مالک کے نام سے کرنے لگے۔

---

* Howl نام کی یہ نظم ۱۹۵۵ میں Allen Ginsbeg نے لکھی اور ۱۹۵۶ میں Howl and Other Poems کے نام سے شائع ہوئی۔ Howl امریکی ادب کی تاریخ میں بڑا مقام رکھتی ہے اور اس کی بنا پر مصنف کو Beat Generation کے بڑے مصنفین میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نظم میں متعدد حوالے شہوت اور شہوانی مناظر سے متعلق ہیں جو یقیناً اسلامی معاشرہ میں واہیات ہی شمار ہونگے۔ ایک بار ۱۹۵۵ میں جب Allen Ginsbeg نے اپنی یہ نظم پڑھنی شروع کی تو Jack Keroac نے ترنّم کے ساتھ Go, Go کہنا شروع کردیا۔ میرے خیال میں اس واقعہ کی رومی اور شمس تبریز کے واقعہ سے کوئی مماثلت نہیں۔ Allen اور Jack ایک دوسرے سے واقف تھے۔ جبکہ رومی اور شمس تبریز کی یہ پہلی ملاقات تھی۔

اوراسوقت سے ان کی شاعری کا جو مجموعہ تیار ہوا وہ دیوان شمس تبریز کہلایا۔شمس تبریز سے ملاقات سے قبل رومی ایک باوقار اور معزّز مصنف تھے اوران کی نگارشات ممکن ہے کہ سو سال تک پڑھی جاتیں۔لیکن شمس سے ملاقات کے بعد وہ ادبی تاریخ کے سب سے بڑے صوفی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

کئی سال گذرے کہ ایک روز شمس تبریز مخفی انداز میں غائب ہوگئے۔رومی اپنی ہزار صفحوں پر محیط مشہور اور مسلسل مثنوی ترتیب دیتے رہے۔یہ مثنوی معنوی یعنی دستاویز روحانی کے نام سے مشہور ہے۔مثنوی کے مشہور آغاز میں رومی ایک سوال اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''بانسری سے پھوٹتا ہوا نغمہ اتنا دردناک کیوں ہے؟ اور پھر خود ہی اس سوال کے جواب میں کہتے ہیں'' بانسری کا آغاز ایک نرسل یعنی سرکنڈے سے ہوا ہے جو دریا کے کنارے اگا ہوا تھا اور زمین میں اس کی جڑیں پھیلی ہوئیں تھیں۔جب اس سے بانسری بنائی گئی تو اس کی جڑوں سے اسے کاٹ دیا گیا۔اس سے نکلتی ہوئی آواز میں جو درد ہوتا ہے وہ سرکنڈے کا دردِ فراق ہے۔تعلق کے ٹوٹ جانے کی یاد اسے ستاتی ہے۔آئندہ کوئی بیس ہزار اشعار میں رومی کی سینکڑوں کہانیاں ایک ایسی نغمہ انگیز زبان میں مذہبی ہیجان پیدا کر کے یہ بتاتی ہیں کہ یہ انسانی بانسری اپنی جڑوں سے تعلق کو کس طرح قائم کرسکتی ہے۔رومی آج بھی موثر ہے۔انگریزی کے اہل زبان کے درمیان بھی اوراپنی شاعری کے ترجموں سے بھی رومی ہر شاعر کو مات دے رہے ہیں۔[4]

مختصر یہ کہ تصوف کے پاس ہر ذوق اور درجہ کے آدمی کے لئے کچھ نہ کچھ موجود تھا۔صوفیوں کے ذریعہ منگول خانہ بدوش گڈریوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ان قبائل نے اسلام کے جوش وجذبے کو پہلے جذب کیا اور اس کے یقین اور عقائد تک بعد میں پہنچے۔صوفیوں کے سلسلے،فنون اور پیشوں سے وابستہ انجمنوں مثلاً دستکاروں کی انجمن، تاجروں کی جماعتیں، کسانوں، حکومتوں سے وابستہ ملٹری اشرافیہ کی انجمنوں وغیرہ میں گتھے ہوئے تھے اوراس طرح منقسم در منقسم مختلف النوع دنیائیں باہم منسلک ہوگئی تھیں۔

بعض صوفی اخوان نے جو فُتوۃ کمالات میں معیار کو پہنچے ہوئے تھے غازی کارپوریشنز قائم کرلیں۔ غازی دراصل سپاہیانہ کردار کے حامل ولیوں کی طرف اشارہ ہے۔اور یہ عیسائیوں میں Knights Templar اور صلیبی جنگوں کے دوران ابھرنے والے دوسرے ملٹری سلسلوں جیسے تھے۔بس فرق یہ تھا کہ یہ عیسائیوں کی طرح مذہبی عہدوں پر معین نہیں کئے گئے تھے۔اسلام میں کیونکہ پوپ کی کوئی جگہ نہیں جو معین کرنے کی ذمہ داری ادا کرے۔چنانچہ غازیوں نے خود ہی اپنے آپ کو معین کرلیا تھا۔بس کسی زیادہ جاننے والے سردار کے گرد اکٹھا ہوجاتے اور کسی شیخ سے ہدایات حاصل کرتے۔انھوں نے خود ہی ایک سرپوش اور ایک جبّہ متعین کرلیا تھا جو ان کی اس گروہ سے وابستگی کی نشانی تھا۔اس میں شمولیت کے لئے انھوں نے بعض رسومات کی ابتداء کی تھی جس میں اقرار، عہد، علامتی مصنوعات اور پوشیدہ متبرک نشانیاں شامل تھیں۔یہ سب ایسی ہی چیزیں ہیں جیسی کہ کم عمری کے زمانہ میں خفیہ کلب بناتے ہوئے لڑکے کچھ چیزیں گھڑ لیتے ہیں۔

غازی سلسلہ کے ممبران نے اپنی زندگیوں کو عیسائی علاقوں میں سچائی پھیلانے کے لئے وقف کر دیا تھا اور اس سلسلہ میں ہر ممکن دلیرانہ سرگرمیاں کرتے رہتے تھے۔ یہ گروہ اکثر و بیشتر ان سرحدی علاقوں میں اپنے اثر ورسوخ پھیلاتے جن پر بازنطینی دعویٰ تو کرتے تھے لیکن ان کا کنٹرول مبہم اور مشکوک ہی تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی غازی سردار کسی علاقے پر قبضہ کر لیتا اور اپنے اس علاقے کا امیر ہونے کا اعلان کر دیتا اور وہ حکومت امارات کہلاتی۔ پہلے کبھی امیر کا لقب کمانڈر کے لئے استعمال ہوتا لیکن اب وہ شہزادے کے لئے استعمال ہونے لگا تھا۔

اس طرح مشرقی اناطولیا میں چھوٹی غازی امارات وجود میں آئیں تو بازنطینی قوت مزید سکڑ گئی اور اس طرح وہ سرحدی علاقے جہاں کسی قانون اور نظم کی عملداری نہ رہتی تھی اب مغرب کی جانب پسپا ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک طرح کا تضاد تھا۔ سرحدوں کی طرف بڑھنا غازی امارات کے لئے بڑا حوصلہ بخش تھا۔ جیسے جیسے متنازعہ علاقے کا محل وقوع آگے بڑھتا گیا غازی سردار بھی آگے بڑھتے گئے۔ مستحکم غازی امارات سے نکل کر یہ لوگ غیر منظّم اور وحشی مغرب کی جانب بڑھے ان علاقوں میں اب بھی ایسے ہی حالات تھے کہ جنگ وجدل کے ذریعہ کوئی اپنا استحقاق بڑھا سکتا تھا اور نہ لوٹ مار تو کر ہی سکتا تھا۔

البتہ ایک وقت آیا کہ یہ لوگ وحشی مغرب کی طرف مزید بڑھنے کی پوزیشن میں نہیں رہے کیونکہ اب سرحدیں قسطنطنیہ کے قریب آ چکی تھیں اور بازنطینی سلطنت کا ردِ عمل سامنے آ سکتا تھا۔ چنانچہ یہ غازی امراء مشرق کی سمت سے آتے آتے اب ان سرحدی امارات میں اکٹھا ہو گئے جو بازنطینی حکومت کے بالکل آمنے سامنے تھیں۔ اناطولیہ میں جنگ کے خاتمہ کے بعد کیونکہ سکون اور امن قائم ہو چکا تھا۔ اس لئے سرداروں کو اب اچھی ملازمتیں مل سکتی تھی۔ چنانچہ سرحدی ریاستیں مضبوط سے مضبوط ہوتی گئیں اور مشرقی امارات کمزور ہوتی گئیں۔ ان سرحدی امارات میں جو اصلاً فوجی علاقے تھے آئندہ ایک عظیم سلطنت کی بنیاد پڑنے والی تھی۔ [5]

۱۲۵۸ء یعنی اسی سال جب ہلاکو خان نے بغداد برباد کیا تھا۔ ایک لڑکا بنام عثمان اناطولیا کے ایک سربرآوردہ خاندان میں پیدا ہوا جس کی نسل عثمانی کہلائی۔ انگریزی زبان میں انھیں Ottomans کہا گیا۔ عثمانی ایک زبردست اور طاقتور سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

ایسا نہیں تھا کہ عثمان نے سلطنت خود ہی قائم کر لی تھی۔ ابتداء میں اس نے اناطولیہ میں ایک چھوٹی سی مضبوط غازی امارت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے قریبی اجداد وسط ایشیا سے آئے ہوئے خانہ بدوش گڈریے ہی تھے جو کوئی چار سو کی تعداد میں منگولیا سے بھاگ کر یہاں بسے تھے اور دیکھا جائے تو عثمان اپنی ان جڑوں سے بہت زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ گھوڑا اس کا قلعہ تھا جس کی زین اس کا تخت اور خورجی اس کا آفس۔ جہاں بھی وہ رات میں قیام کرتا وہی اس کا پایہ تخت ہوتا۔ اپنے ورثا کے لئے جو کچھ اس نے چھوڑا وہ اس کا ایک طریقہ کار اور ایک حکمت عملی تھی۔ جنگ کے زمانہ میں وہ اپنے آدمیوں کو سرحدی علاقوں میں لے جاتا اور عیسائیوں سے جنگ کر کے مال غنیمت اکٹھا کرتا اور امن کے زمانہ میں اپنے علاقے میں جو مستقل قیام کرتے اور کچھ کاروبار بھی کرتے ان سے

ٹیکس وصول کرتا۔

عثمانی جیسے جیسے مضبوط ہوتے گئے دوسری غازی ریاستوں کو اپنے میں شامل کرتے گئے۔ کبھی کبھی فتوحات کے ذریعہ اور کبھی خرید کر۔ اور اس طرح جو غازی سردار آزاد اُمراء ہوا کرتے تھے اب وہ حکومت کے طرفدار منصب دار بن جاتے۔ اپنے طور پر اب بھی انھیں طاقت حاصل تھی لیکن اپنے سے زیادہ طاقتور عثمانی سلطنت کے سربراہ کے تحت تھی۔

عثمانیوں کو جس چیز نے سب سے زیادہ فائدہ پہنچایا۔ وہ ان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ ان کے یہاں برابر انتہائی باصلاحیت جانشین آتے رہے۔ درحقیقت جانشین ہی کسی سلطنت کی کامیابی اور ناکامی میں فرق پیدا کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک مراد اوّل تھا جس نے بحر اسود (Black Sea) کے پار اپنی تگ و تاز جاری رکھیں اور یوں اپنی سلطنت کو یورپ تک پھیلا دیا۔ اس کے زمانے میں (۱۳۵۰ تا ۱۳۸۹ء) عثمانی سلطنت کا انتظام گھوڑوں کی کمر پر بیٹھ کر نہیں ہوتا تھا بلکہ اب ان کا ایک شہری دارالسلطنت تھا۔ ایک محل تھا۔ سرکاری افسروں کا عملہ تھا، ٹیکس یا پالیسی وضع کی جا چکی تھی اور خزانہ تھا۔ عثمانی حکمرانوں کے زمانہ میں اسلامی تہذیب پروان چڑھی البتہ اس کے ساتھ بعض رسومات، شان و شوکت اور مجلسی آداب انھوں نے بازنطینی دربار سے بھی لئے۔

ایک دوسرے عثمانی حکمراں بایزید اوّل (۱۳۸۹ تا ۱۴۰۲ عیسوی) نے ایک پروگرام کا آغاز کیا جو Devshirme* کہلاتا تھا۔ اس کے تحت عیسائی یورپ سے لڑکے طلب کر کے اس کے محل میں لائے جاتے اور مسلمانوں کی طرح ان کی تربیت ہوتی اور انھیں مخصوص سپاہیانہ مشق کرائی جاتی۔ یہ لوگ ویسے ہی تھے جیسے عربوں اور فارسی درباروں میں مملوک یعنی ترک نسل کے لڑکوں کو لا کر اسی طرح کی تربیت دی جاتی تھی۔ مملوک دراصل ترکی نسل سے تھے اور عربوں کے دربار میں تھے اور عیسائی لڑکے ترکوں کے دربار میں تھے۔ یہ سپاہی جو Devshirme کے تحت تربیت پاتے انھیں ینی چری (Janissaries) کہا جاتا تھا جو دراصل نئے جتھے کے لئے ترک لفظ Yeni Ceri کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

بایزید کی ینی چری نے اس کا اپنے لوگوں پر انحصار ختم کر دیا۔ یعنی ان غازی اُمراء سے جن کے آبا واجداد وسط ایشیا سے تعلق رکھتے تھے۔ ان اُمراء کے فوجی جتھے اب بھی بایزید کی فوج کا حصہ تھے لیکن پیدل فوج کے۔ ینی چری کے سپاہی ان پیدل فوجیوں کے کمانڈر کی حیثیت سے تھے۔

* Devshirme ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی اکٹھا کرنا اور جمع کرنا ہے۔ یہ ایک باقاعدہ نظام تھا جو عثمانی ترکوں نے اور خاص طور پر سلطان مراد ثانی نے جس کا آغاز کیا تھا۔ اس کے تحت بلقان کے علاقے سے عیسائی لڑکوں کو اکٹھا کر کے انھیں غلام بنایا جاتا۔ اسلام قبول کرایا جاتا اور پھر تربیت اور امتحانات کے ایک سلسلے سے گذرتے ہوئے ان کی صلاحیتوں اور ذہانت کا اندازہ لگایا جاتا۔ خاص مدرسوں میں ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہوتا جہاں انھیں عربی، فارسی اور ترکی زبان کے ساتھ فن خطاطی، دین اسلام، شہسواری اور فن سپہ گری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ فنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ علمی اعتبار سے یہ مدرسے جو شاہی محلوں میں قائم تھے عالم اسلام کے بہترین مدارس سمجھے جاتے تھے۔ اور پھر یہ نوجوان حکومت کی مختلف ذمہ داریاں سنبھالتے۔

بایزید یورپ کے مزید اندر تک گیا۔ شاہ فرانس اور شاہ ہنگری نے ملکر اسے روکنے کی کوشش کی لیکن بایزید نے ۱۳۹۶ء میں ان کی متحدہ فوج کو تباہ کر دیا۔ یہ جنگ آج کے بلغاریہ میں Nicopolis کے مقام پر لڑی گئی تھی۔ اب عثمانی امیر ایک حقیقی اور بڑی سلطنت کا امیر تھا۔ صحیح بات یہ ہے کہ بایزید کے لئے امیر کا لقب چھوٹا لگتا تھا۔ اس نے اب سلطان کے لقب کو اختیار کر لیا تھا یعنی وہ اب دارالسلام کا چیف ایگزیکیوٹیو تھا۔ یہ دراصل خلیفہ کا ایک سیکولر مترادف ہے۔ اس کی فوجی مہمات اب باقاعدہ جنگوں کی شکل اختیار کر گئی تھیں اور ہر سال وہ ایک نئی جنگ کرتا تھا۔ ایک سال مغرب کو ضرب لگا تھا تو دوسرے سال مشرق کی مزید غازی امارات کو سلطنت کا حصہ بنا کر اپنی حکومت کو پرانے مسلمان مرکزی اور اہم علاقوں تک پھیلاتا۔ آگے اور پیچھے جا کر بایزید کے حملے اس تیز رفتاری سے ہوتے تھے کہ لوگوں نے اسے بجلی کا کڑکا کہنا شروع کر دیا تھا۔ بایزید قیصر کا نمونہ تھا۔

اور پھر یہ سب کچھ تباہ ہو گیا۔ مشرق کی سمت ایک مہم کے دوران بایزید ایک ایسے جنگجو سے بھڑ گیا جو اس سے زیادہ مضبوط تھا۔ یہ تھا خطرناک تیمور لنگ۔ ہوا یہ تھا کہ بایزید کے اپنے منصب داروں میں سے کسی نے تیمور کو اناطولیہ کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اصل میں انھیں عثمانیوں کی بڑھتی ہوئی مطلق العنانی سے پریشانی تھی۔ چنانچہ انھوں نے تیمور کو لکھا کہ بایزید کا زیادہ وقت یورپ میں گذرتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ عیسائیت کی طرف مائل ہے۔ تیمور ان میں سے کسی بات کو پسند کرتا تھا کیونکہ ایک تو یہ کہ ظلم و بربریت میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا اور دوسرے یہ کہ وہ خود بھی مسلمان تھا اور چاہتا تھا کہ وہ بھی بلند پایہ فنون لطیفہ کی سرپرستی کرے۔ وہ خود کو خاصہ بڑا عالم بھی سمجھتا تھا اور اسلام کا ایک مخلص اور وفادار محافظ۔

چنانچہ ۱۴۰۲ء میں ان دونوں تہذیب و تمدن اور فنون لطیفہ کے سرپرستوں نے تمام تر احتیاط اور باریک بینی و دوراندیشی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک دوسرے کی تلواروں کے سامنے ہوئے کہ دیکھیں کہ کون ان کا شکار ہوتا ہے۔ یہ امکان تھا کہ بدترین شخص ہی فتحیاب ہو جائے۔ تیمور نے عثمانی فوج کو تہس نہس کر دیا اور بایزید کو خود ہی قیدی بنایا ایک پنجرے میں کسی جانور کی طرح قید کر دیا۔ اور اسے کھینچتا ہوا وسط ایشیا کے شہر سمرقند لے گیا اور ایک مخصوص کچھار میں رکھا۔ بایزید ناامیدی اور اس تذلیل سے اسقدر مغلوب ہو گیا کہ آخر کار اس نے خودکشی کر لی۔ مغرب کی طرف بایزید کے بیٹوں میں اس کٹی پھٹی وراثت کے لئے جو کبھی ایک عظیم سلطنت ہوا کرتی تھی خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

ایسا لگا کہ اب عثمانی ختم ہو جائیں گے اور بہت سی ترکی سلطنتوں کی طرح جو شہاب ثاقب کی طرح نمودار ہوئیں چمک دمک دکھائی اور ختم ہو گئیں، یہ بھی ختم ہو جائے گی۔ لیکن یہ سلطنت مختلف تھی۔ عثمان سے بایزید تک عثمانیوں نے محض فتوحات ہی نہیں کی تھیں بلکہ انھوں نے ایک نئے سوشل آرڈر کی بھی تشکیل کی تھی (جس کی تفصیلات ہم آئندہ صفحات میں پیش کرینگے)۔ اس مقام پر یہ کہنا ہی کافی ہے کہ تیمور کی غارتگری کے بعد بھی ان کی معاشرتی قوت اور ان کی جڑیں بہت مضبوط تھیں اور وہ حالات کو سنبھالنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ تیمور تو دس بیس سال میں رخصت ہو گیا اور اس کی سلطنت جلد ہی بکھر گئی سوائے ایک چھوٹی سی لیکن شاندار سلطنت کے جو

مغربی افغانستان میں قائم رہی۔ البتہ عثمانی سلطنت نہ صرف سنبھلی بلکہ بلندی کی طرف گامزن بھی ہوگئی۔

۱۴۵۲ء میں اس نے ایک اور بلند پرواز کی اور یہ اس وقت ہوا جب ایک نئے سلطان محمد نے تخت سنبھالا۔ محمد کو سلطنت بہت اچھی حالت میں ملی تھی لیکن وہ اپنے ساتھ ایک مسئلہ بھی لایا تھا۔ وہ محض اکیس سال کا تھا چنانچہ زیادہ طاقتور اور تجربہ کار اور بڑے لوگوں نے بھوکوں کی طرح اس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ زیادہ تجربہ حاصل ہو جانے اور ذرائع میں اور مضبوط ہو جانے کے بعد وہ ایک اچھا سلطان ثابت ہوگا۔ لیکن محمد کو معلوم تھا کہ انھیں غلط ثابت کرنے کے لئے اسے کوئی انتہائی شاندار اور قابل دید کارنامہ انجام دینا ہوگا تا کہ وہ اپنے ممکنہ مخالفوں کو خاموش کر سکے اور اقتدار پر اپنے قبضہ کو مضبوط کر سکے۔

چنانچہ اس نے قسطنطنیہ کی فتح کا ارادہ کرلیا۔

قسطنطنیہ فوجی اعتبار سے کوئی بڑا انعام نہیں تھا۔ لیکن عثمانی پہلے ہی اس کے کئی حصوں پر غالب ہوکر اسے مشرق یورپ کی طرف دھکیل چکے تھے۔ یہ دراصل ایک نفسیاتی انعام ہوسکتا کیونکہ مشرق و مغرب میں قسطنطنیہ کو زبردست علامتی اہمیت حاصل تھی۔

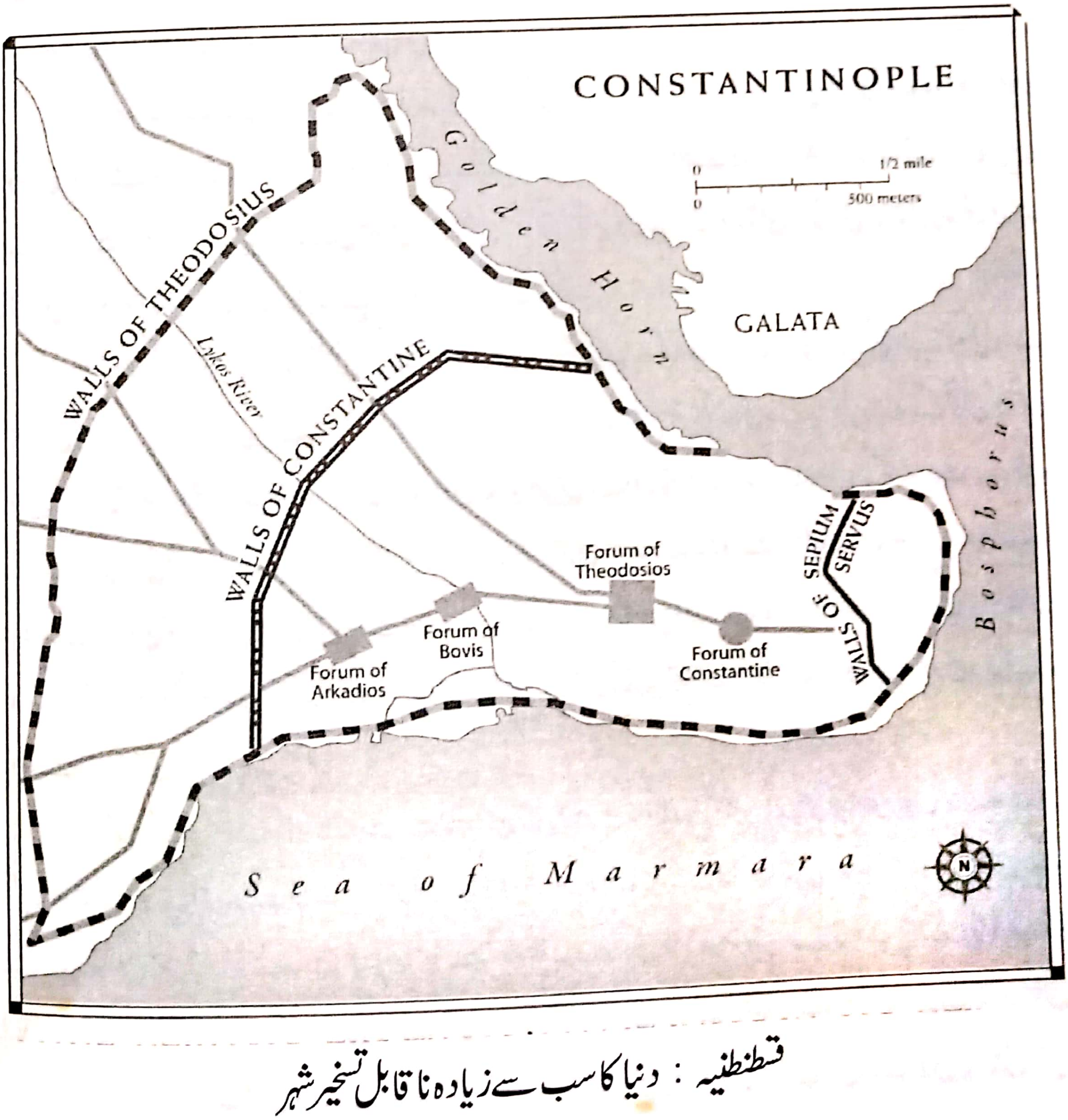
مغرب کے لئے قسطنطنیہ اس سلسلہ کی یادگار تھی جس میں روم کے آگسٹس (Augustus) اور جولیس سیزر جیسے لوگ شامل تھے۔ عیسائیوں کے لئے یہ اب بھی رومی سلطنت کا دارالسلطنت تھا جسے کونسٹینٹائن نے عیسائیت سے وابستہ کیا تھا۔ رومی تاریخ کے اس مشرقی مظہر کو بعد کے مورخین نے ہی نیا نام دیا تھا ورنہ بازنطینی خود کو رومی ہی کہتے تھے۔ اور اپنے شہر کو نیا روم سمجھتے تھے۔

مسلمانوں کا جہاں تک تعلق ہے اللہ کے رسولؐ نے ایک بار کہا تھا کہ اسلام کی حتمی فتح جب ہوگی جب مسلمان قسطنطنیہ فتح کرلیں گے۔ تیسری صدی ہجری کے معروف فلاسفر الکندی نے رسول اللہؐ کے قول کو اس طرح سمجھا کہ مسلمان قسطنطنیہ کو فتح کر کے اسلام کی تجدید کریں گے اور پھر دنیا پر غالب ہوں گے۔ بہت سے علماء کے خیال میں اس شہر کے فاتح 'مہدی' یعنی وہ جس کے آنے کی امید ہے۔ ہونگے جو ایک اساطیری وجود ہے۔ بہت سے مسلمان سمجھتے ہیں کہ وہ اس وقت ظاہر ہوں گے جب دنیا اپنے آخری دور سے گذر رہی ہوگی۔ سلطان محمد یہ صحیح سمجھتا تھا کہ قسطنطنیہ پر قبضہ سے اس کی عوامی حیثیت میں ایک انقلاب آجائے گا اور یوں پوری دنیا اسے دوسرے انداز میں دیکھے گی۔

محمد کے دربار سے وابستہ بہت سے ماہرین میں ہنگری کا ایک انجینئیر اُربان تھا جو توپیں بنانے کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ توپ اس وقت خاصا نیا اسلحہ تھا۔ سلطان محمد نے اُربان سے کہا کہ انھیں جدید خطوط پر وہ اس کے لئے کوئی خاص چیز تیار کرے۔ چنانچہ اُربان نے قسطنطنیہ سے کوئی ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر ایک فاؤنڈری (Foundary) قائم کی اور اسی نوع کے جو بھی پرانے اور چھوٹے بڑے ہتھیار تھے وہ سب یہاں لاکر ڈال دیئے۔ اس کا شاہکار ایک ایسی توپ تھی جو کوئی ستائیس فیٹ لمبی اور اتنی چوڑی تھی کہ اس میں ایک آدمی بآسانی چل

کرگذر سکتا تھا۔ اسے باسلک (Basilic) کہتے تھے جس میں بارہ سو پاونڈ وزنی گرینائٹ پتھر ایک میل دور تک داغا جا سکتا تھا۔

اس عظیم الجثہ توپ کو میدان جنگ تک پہنچانے کے لئے نوے بیل اور چار سو آدمی کام آئے۔ اندازہ ہوا کہ باسلک زیادہ ہی بڑی ہے اور اس میں لوڈنگ کے لئے بھی تین گھنٹے لگتے تھے۔ اور یہ جب بھی فائر کرتی تو واپس اتنی تیزی اور سختی سے آتی کہ جتنے آدمیوں کو سرحد پر مارتی اس سے زیادہ شاید واپس آنے میں نقصان دے سکتی تھی۔ مزید یہ کہ ایک میل کا فاصلہ طے کرنے میں یہ صحیح نشانہ بھی خطا کر سکتی تھی۔ مثلاً یہ پورا امکان تھا کہ تھا کہ قسطنطنیہ کا شہر بھی نشانہ پر نہ آسکے۔ یہ عظیم الجثّہ توپ کوئی بہت بڑا فوجی اثاثہ بھی نہ تھا۔ البتہ ایک نفسیاتی اور علامتی اثاثہ ضرور تھی تاکہ دنیا کو معلوم ہو سکے کہ عثمانی اس طرح کے ہتھیار میدان میں لا سکتے ہیں۔ باسلک کے علاوہ بھی عثمانیوں کے پاس دوسری چھوٹی چھوٹی توپیں موجود تھیں۔ ہتھیاروں اور تکنیکی ترقی کے اعتبار سے یہ اپنے وقت کی مضبوط ترین فوج تھی۔



قسطنطنیہ : دنیا کا سب سے زیادہ ناقابل تسخیر شہر

قسطنطنیہ کا محاصرہ چوّن دن تک رہا لیکن شہر نا قابل فتح تھا۔ مثلث نما شگاف پر اور گینڈے کے سینگ کی شکل کی زمین کے حصے پر واقع اس شہر کے ایک طرف آبنائے باسفورس تھی اور دوسری طرف بحرِ مارمارا (Sea Marmara)۔ انھیں سمتوں میں سمندر کے کنارے بلند دیواریں تھیں اور سمندر میں ابھری ہوئی نوکیلی چٹانیں جو اس پتلی آبنائے کی حفاظت کرتی تھیں۔ یہاں سے بازنطینی، شہر کی طرف کسی بھی آنے والے جہاز پر گولہ باری کر سکتے تھے۔ خشکی کی طرف دونوں سمندروں کو ملانے والی طویل اور مضبوط دیواروں کا سلسلہ تھا اور ہر دیوار سے وابستہ خندقیں تھیں۔ ہر خندق چوڑائی اور گہرائی میں اور اسی طرح ہر دیوار موٹائی اور اونچائی میں اپنے سے پہلے والی سے زیادہ تھی۔ جو سب سے اندر کی دیوار تھی وہ نوّے فٹ بلند اور تیس فیٹ سے زیادہ چوڑی تھی۔ ان رکاوٹوں کو پار کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی اور پھر یہ بھی کہ بازنطینیوں کے پاس ایک خاص خفیہ ہتھیار جسے وہ ''بازنطینی آگ'' کہتے تھے موجود تھا۔ یہ ایک چیپ دار اور لسیلا جلتا ہوا مادہ تھا جسے گوبھن یا منجنیق کے ذریعہ داغا جاتا اور یہ جہاں جا کر گرتا پھیل جاتا اور گوشت سے چپک جاتا۔ اس آگ کو پانی سے نہیں بجھایا جا سکتا تھا۔ شاید یہ نیپالم کی ابتدائی شکل تھی۔

لیکن عثمانی، جمے رہے، توپیں گولے اگلتی رہیں۔ اور ینی چری حملے کرتے رہے۔ محاصرہ کرنے والی زبردست فوج میں مختلف قبائل اور عرب، اہل فارس، بلکہ یورپی عیسائی بھی شامل تھے، دفاعی مورچوں پر یورش کرتے رہے لیکن آخر میں جنگ نے اس وقت پلٹا کھایا جب سب سے زیادہ نا قابل فتح دیوار کا ایک چھوٹا دروازہ کوئی بند کرنا بھول گیا۔ کچھ ترکوں نے حملہ کر کے اندر جانے کا راستہ بنا لیا۔ اس حصہ کو محفوظ کیا اور بڑا دروازہ اپنے ساتھیوں کے لئے کھول دیا اور اچانک مغربی دنیا کا سب سے زیادہ قائم رہنے والے دارالسلطنت کو آگ کے شعلے لپیٹ چکے تھے۔

محمد نے اپنی فوج کو مکمل تین دن تک شہر کو لوٹنے کی اجازت دی لیکن اس سے ایک منٹ بھی زیادہ کی اجازت نہ تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے سپاہی شہر کو نقصان نہ پہنچائیں بلکہ اسے محفوظ رکھیں کیونکہ وہ اسے اپنا دارالسلطنت بنانا چاہتا تھا۔ اس وقت سے آج تک اس شہر کو استنبول کہا جاتا ہے ظاہر ہے کہ شہر کے نام کی اس تبدیلی کو کئی صدیاں لگ گئیں۔ اور فاتح سلطان کو اس وقت سے سلطان محمد فاتح کہا جاتا ہے۔

ذرا تصور کریں کہ اگر اسلام کے ابتدائی دور ہی میں مسلمانوں نے قسطنطنیہ فتح کر لیا ہوتا اور بغداد کے بجائے عباسی خلفاء کا دارالخلافہ قسطنطنیہ ہوتا۔ بحر اسود اور بحر روم تک ان کی رسائی ہوتی اور اس طرح وہ تمام بندرگاہ ان کے قبضہ میں ہوتے جنگی ضرورت سمندری افواج کو (Aegean)* علاقوں اور بحر روم سے گذر کر یونان اٹلی، اسپین اور فرانس کے سواحل اور آبنائے جبرالٹر سے ہوتے ہوئے بحر اٹلانٹک کے راستہ انگلینڈ اور اسکنڈ نیا تک پہنچنا ذرا بھی مشکل نہ تھا۔ کیونکہ ان کے پاس بہترین زمینی فوج بھی موجود تھی اور اس طرح پورا یوروپ اسلامی سلطنت کا حصہ بن گیا ہوتا۔

---

* Aegean یعنی آڑی تہذیب دراصل Aegean Sea کے اطراف میں پھیلے ہوئے یونان میں یورپ میں تانبہ کے زمانے کی تہذیب کو کہا جاتا ہے۔ ایجین سمندر یونان اور جدید ترکی کے ساحلوں کے درمیانی حصہ میں بہتا ہے، اس علاقے میں جب Mycenean Civilization ختم ہوگئی تو اس تہذیب کا نشو ونما ہوا۔

لیکن ابتدائے خلافت کو سات سو سال گذرے کہ یورپ اب کوئی آفت زدہ براعظم نہ رہا تھا اور نہ ہی وہ پست تھا اور غربت میں گذر بسر کر رہا تھا۔ لائبیرین پینی سُولا کے کیتھولک بادشاہ مسلمانوں کو ان کی آخری پناہ گاہ سے افریقہ دھکیلنے کے در پے تھے اور کولمبس جیسے جہاز راں کو دنیا کی جستجو کے لئے وسائل فراہم کر رہے تھے۔ بیلجیم بینکنگ کا ایک مرکز بن رہا تھا اور ڈچ ایک زبردست تجارتی منصوبہ بندی میں عظیم مہارت پیدا کر رہے تھے۔ اٹلی پر نشاۃِ ثانیہ کے دروازے کھل رہے تھے اور فرانس و انگلینڈ میں عثمانیوں کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لئے ایک لاجواب بنیاد فراہم ہو گئی تھی۔ لیکن مسیحی یورپ اب آسانی سے دھوکہ میں آنے والا نہ رہ گیا تھا۔ البتہ اس زمانہ میں کسی کو یہ پتہ نہیں چل پاتا تھا کہ کون ترقی کر رہا ہے اور کون زوال کی طرف جا رہا ہے۔ عثمانیوں کی فتح نے عالم اسلام کو یہی پیغام دیا کہ اسلام پھر تازہ دم ہو کر اٹھ رہا ہے۔

استنبول جب فتح ہوا تو اس کی آبادی محض ستر ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ چنانچہ محمد فاتح نے ایسی پالیسیاں نافذ کیں کہ عوام کے یہاں آکر بسنے کی حوصلہ افزائی ہوتا کہ اس کا نیا دارالسلطنت مزید آباد ہو سکے۔ محمد فاتح نے وہ پرانا اصول بھی نافذ کیا کہ غیر مسلموں کو مذہبی آزادی حاصل ہو، وہ اپنی جائداد پر ویسے ہی قابض رہیں جیسے پہلے تھے البتہ جزیہ ادا کریں۔ اس کے نتیجہ میں ہر مذہب اور نسل کے لوگ دوڑے چلے آئے اور استنبول ایک جہانِ صغیر بن گیا۔ جہاں گونا گونی، تنوع اور رنگارنگی اس کی پہچان بن گئی۔[6]

اب عثمانی ایک ایسی سلطنت کے حکمراں تھے جن کا خاصہ علاقہ ایشیا کے علاوہ یورپ میں بھی تھا اور یوں ان کا ہر دو برّاعظموں میں دخل تھا۔ دنیا کا سب سے بڑا شہر ان کے پاس تھا۔ لیکن ان کی سب سے بڑی متاع فتح نہ تھی۔ ابھی تک کی اپنی کوئی ڈیڑھ سو سالہ حکمرانی میں انھوں نے اپنے ایک منفرد سوشل سسٹم کو شکل دی تھی اور اب وہ خانہ بدوش گڈریے، کسان، قبائلی، جنگجو، صوفی، اشرافیہ، دستکار تاجر اور اناطولیا کی دوسری متفرق آبادیاں ایک معاشرہ میں مدغم ہو گئی تھیں جو ایک گھڑی کی مانند پیچیدہ تو تھی لیکن اس کے تمام حصے آپس میں مربوط ہو گئے تھے جو ایک دوسرے کو متوازن رکھتے تھے۔ ایک حصہ دوسرے کو مہمیز کرتا اور جانچ پڑتال بھی کرتا۔ ایسا پہلے کبھی اور کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اور نہ ہی آج تک دوبارہ نظر آیا ہے۔ البتہ آج کی امریکی سوسائٹی کو اس دور کی عثمانی سوسائٹی کی پیچیدگی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن صرف پیچیدگی کے اعتبار سے۔ اگر تفصیل میں جائیں تو شیطان براجمان نظر آ جاتا ہے۔ ہماری امریکی معاشرت اس دور کی عثمانی معاشرت سے تفصیلات میں مختلف ہے اور ہر تفصیل میں مختلف ہے۔۔

وسیع النظری سے دیکھیں تو عثمانی دنیا عارضی طور پر حکمراں طبقہ اور رعایا میں تقسیم تھی۔ حکمراں طبقہ، ٹیکس عائد کرتا، نظم قائم کرتا، احکامات جاری کرتا اور ضرورت کے وقت جنگ کرتا تھا۔ جبکہ رعایا پر اشیاءِ ضروریہ کی پیداوار اور ٹیکس ادا کرنے کی ذمہ داری تھی۔ لیکن معاشرہ میں ایک اور تنظیم رائج تھی جو عمودی نوعیت کی تھی اور صوفی

سلسلوں اور مختلف قسم کی اخوتوں کے ذریعہ تشکیل پائی تھی۔ اس طرح لوگ مختلف کلاسوں اور گروہوں میں منقسم ہوتے ہوئے ایک مشترکہ شیخ کے احترام اور اس کی محبت کی وجہ سے متحد ہو جاتے تھے۔

دوسری طرف عثمانی معاشرہ بحیثیت مجموعی بڑے مذہبی گروہوں میں بھی منقسم تھا۔ جن کی اپنی علیحدہ علیحدہ عمودی اور ارضی تقسیم ہوتی تھی۔ ہر ایک میں کسی حد تک آزاد قومیں یا ملّتیں پائی جاتی تھیں جو اپنے مذہبی مراسم، تعلیم، عدل، فلاحی کاموں، اور معاشرہ کی خدمات کی ذمہ دار ہوتی تھیں۔

مثلاً یہودی ایک ملت تھے جنکا ذمہ دار استنبول کا سب سے بڑا ربّی ہوتا تھا۔ یہودیوں کی خاطر خواہ تعداد عثمانیوں کے زیر سایہ رہنے کی غرض سے عثمانی علاقوں میں آکر آباد ہو رہی تھی اور یہ چودھویں و پندرھویں صدی تک ہوتا رہا۔ اور بالخصوص یہ لوگ مغربی یورپ میں ان پر کی جانے والی ایذا رسانیوں اور عقوبتوں سے بھاگ کر عثمانیوں کے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ صلیبی جنگوں کے دوران انگلینڈ نے انھیں ملک بدر کر دیا تھا۔ انھیں مشرقی یورپ میں قتل عام برداشت کرنا پڑا تھا۔ اسپین میں انھوں نے تفتیش (inquisition)* کا دور بھی دیکھا تھا۔ اور ہر طرف ان کے خلاف امتیاز اور تفریق روا تھی۔

مشرقی آرتھوڈوکس چرچ ایک دوسری ملت تھی جس کا نگراں قسطنطنیہ کا بطریق ہوتا تھا پوری مملکت کے سلاوی (Slavic) عیسائی بھی اس کی نگرانی میں تھے۔ عثمانیوں کی یورپی فتوحات کے بڑھتے رہنے سے ان عیسائیوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔

پھر ایک آرمینیائی ملت بھی تھی۔ یہ بھی عیسائی تھے لیکن یونانیوں سے علیحدہ۔ یونانی اور آرمینیائی عیسائی عقائد کی سطح پر ایک دوسرے کو گمراہ سمجھتے تھے۔

ہر ملت کا سربراہ کورٹ میں ان لوگوں کی نمائندگی کرتا اور سلطان کو براہِ راست جوابدہ تھا۔ اس اعتبار سے مسلم بھی ایک ملت تھے اور ان کا بھی ایک بڑا ذمہ دار ہوتا تھا جو شیخ الاسلام یعنی ''اسلام کا بزرگ آدمی'' کہلاتا تھا۔ یہ عہدہ بایزید نے تیمور لنگ کے ہاتھوں اپنی شکست سے تھوڑا پہلے ہی قائم کیا تھا۔ شیخ الاسلام شریعت کی روشنی میں قانون سازی کرتا تھا اور مفتیوں کی ایک وسیع فوج کی میٹنگ کی صدارت کرتا۔ مفتی قانون کی تشریح کرتے، منصف قانون کا اطلاق کرتے اور ملاّ نوجوانوں کو دین میں داخل کرتے۔ بنیادی مذہبی تعلیم دیتے اور قریبی مقامات اور گاؤں میں مذہبی رسومات کی ادائیگی کراتے۔

---

* Inquisition اسپین کے کیتھولک بادشاہ فرڈینینڈ اور ملکہ ازابیلا کی ایما پر ۱۴۷۸ میں قائم کیا گیا تھا۔ زوال اسپین کے بعد مسلمانوں اور یہودیوں پر جو شدید ظلم ہوا اس سے بچنے کی خاطر بہت سوں نے اپنے آپ کو مسیحی کہنا شروع کر دیا تھا۔ حکمراں جاننا چاہتے تھے کہ کیا واقعی ان لوگوں نے مسیحیت قبول کی ہے یا بس ظلم وتشدد سے بچنے کی خاطر محض ظاہراً یہ کام کیا ہے۔ چنانچہ ان Converts کے اخلاص کو جانچنے کے لئے یہ ادارہ قائم کیا گیا۔ ۱۸۳۴ تک اسے باقاعدہ طور پر ختم نہیں کیا گیا جا سکا تھا۔ اسپین کے Inquisition کو تاریخ اور عام لٹریچر میں کیتھولک عیسائیوں کی عدم برداشت اور تعصب وتشدد اور جبر کا اظہار مانا جاتا ہے۔

لیکن مملکت میں صرف شریعت ہی ایک قانون نہ تھا، سلطان کا بنایا ہوا قانون بھی تھا جو شریعت کے متوازی چلتا اور انتظامی امور، ٹیکس مختلف ملتوں کے باہمی روابط، اور مختلف گروہوں یعنی کلاسوں میں رشتوں اور تعلقات اور خاص طور پر رعایا اور حکمران کلاس کے باہمی مسائل سے متعلق تھا۔

یہ عثمانی نظام بہت پیچیدہ تھا اور اس کی پیچیدگی ہی اس کے مختصر یا جلد بیان کر دینے میں مزاحم ہے۔ میں تو یہاں بس ایک اندازہ کرانا چاہتا ہوں ۔ یہ جو پورا متوازی قانونی نظام تھا اور جس میں وکلا، انتظامی افسران، منصفین جو اس کی تشکیل کرتے اور اسے منطبق کرتے تھے یہ سب وزیر اعظم کی نگرانی میں تھے جو محل کی انتظامیہ کا نگراں تھا۔ (محل میں بھی اپنی ایک پوری دنیا آباد تھی) اور یہ وزیر سلطان کے بعد سلطنت کی دوسری سب سے بڑی اور طاقتور شخصیت تھی۔

پھر تیسری طاقتور شخصیت شیخ الاسلام کی تھی جسے یہ اختیار تھا کہ وہ قوانین جو انتظامی امور سے متعلق ہوتے ان پر نظر ثانی کر سکتا تھا۔ اور اگر وہ شریعت سے ٹکراتے نظر آتے تو وہ انھیں مسترد کر سکتا تھا یا پھر از سرِ نو غور کرنے کے لئے واپس کر سکتا تھا۔

دوسری طرف یہ بھی تھا کہ شیخ الاسلام سلطان کی رضا سے کام کرتا تھا اور وزیر سلطان کے قوانین کا بندوبست کرتا تھا۔ چنانچہ اگر کبھی وزیر اعظم اور شیخ الا اسلام ٹکرا جاتے ۔۔۔ ذرا قیاس کریں کہ کسے جھکنا پڑیگا۔ اور کیا وہ۔۔۔؟

دیکھا کے یہ نظام کس طرح نقد و توازن قائم رکھتا تھا۔

نقد و توازن کے لئے ایک اور طریقہ عثمانی معاشرہ میں رائج تھا اور اس میں بایزید کے متعارف کرائے ہوئے دیوشرم یعنی ینی چری کو استعمال کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ ابتداء میں تو یہ مملوک جیسا نظام تھا بس نام بدل دیا گیا تھا۔ مملوک کے مانند انھیں سلطان کے حفاظتی دستہ کی حیثیت میں تربیت دی جاتی تھی۔ لیکن بعد میں ان کا کردار خاصا وسیع ہو گیا۔

اب یہ محض سپاہی نہ رہے۔ کچھ کو انتظامی امور کی صلاحیتوں کے لئے تربیت دی جاتی اور کچھ دوسروں کو ثقافتی نوعیت کے کاموں کے لئے تیار کیا جاتا۔ سلطان نے اب ینی چری کو انتظامیہ میں بڑے بڑے عہدوں پر تعینات کیا اور اس کے علاوہ زمینی اور بحری فوج میں بھی انھیں شامل کیا۔ بعض ثقافتی اداروں کا انچارج بھی ینی چری کو بنایا گیا۔ مشہور عثمانی ماہر تعمیرات سنان (Sinon) جو عثمانی دور کی تعمیرات کے لئے مشہور ہے ایک ینی چری ہی تھا۔ عثمانی مساجد میں ٹھوس گنبد اور اس کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے گنبدوں کی کثرت اس کی اختراع تھی۔

ابتداء میں تو ینی چری کے لئے محض عیسائی لڑکوں کا ہی انتخاب ہوتا تھا اور بالخصوص ان علاقوں سے جو فتح کئے جاتے تھے۔ لیکن محمد فاتح نے اس میں ایک اہم تبدیلی کی اور سلطنت کے افراد کو بھی ینی چری میں شامل کیا جانے لگا۔ اور اب عثمانی سلطنت کا کوئی بھی فرد مسلم ہو یا غیر مسلم بلند پایہ ہو یا چھوٹا، وہ یہ توقع کر سکتا تھا کہ اس کا کوئی ایک

بیٹا اس خاص قسم کی غلامی میں شامل کرلیا جائے۔ کیونکہ عثمانی اشرافیہ میں پہنچنے کا یہ ایک راستہ بہرحال تھا۔

ینی چری کی شکل میں عثمانیوں نے اپنی سوسائٹی میں ایک بالکل نئی طاقت و اختیار سے آراستہ ایک اشرافیہ کی اختراع کی تھی۔ اسی طرح کے دوسرے معاشروں کے برخلاف ینی چری کو شادیاں کرنے اور جائز اولاد رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ اس طرح اشرافیہ کا درجہ موروثی نہیں بن سکتا تھا۔ اصل میں ینی چری کا نظام معاشرتی مٹی میں مسلسل ہل چلاتے رہنا تھا جس کے نتیجہ میں ان کے پاس ہر سطح سے بہترین اور ہونہار نوجوان آتے رہتے تھے۔ جنھیں ہر ممکن اور سخت قسم کی فکری اور جسمانی تربیت دی جاتی اور پھر انھیں سلطنت کے مختلف انتظامی امور میں خدمات پر متعین کردیا جاتا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ قدیم اور روایتی ملٹری اور ترک اشرافیہ اور وہ خاندان جن کی نسلی جڑیں وسطی ایشیا تک پہنچتی تھیں اور جن کا قوت واقتدار میں جو حصّہ چلا آرہا تھا وہ ینی چری نے ختم کردیا یا کم کردیا۔ یہ عثمانیوں کے لئے بہتر ہی تھا کیونکہ اس طرح ان کے ممکنہ مخالفین کمزور ہو گئے۔

لیکن عثمانیوں نے ان ممکنہ مخالفین کو بالکل چھوڑا نہیں حالانکہ اگر وہ چاہتے تو انھیں یکسر چھوڑ سکتے تھے۔ نہیں! عثمانیوں کی نقد و توازن میں مہارت اور غیر معمولی قابلیت نے ان پرانے اشرافیہ کو بھی اس سسٹم میں استعمال کیا۔ یہ اشرافیہ جس مقام پر تھی اسے وہاں برقرار رکھا اور کچھ قوت واقتدار بھی انھیں دیا کہ وہ ینی چری پر نظر رکھیں کہ کہیں وہ مستقبل کے لئے نئے نئے اور بڑے بڑے خواب تو نہیں دیکھنے لگے۔

اس قدیم اشرافیہ کو کیا طاقت دی گئی؟ اولاً تو وہ سلطنت میں اب بھی جاگیرداری کے اعتبار سے سب سے بڑے تھے اور حکومت میں سب سے زیادہ ٹیکس دینے والے بھی تھے۔ لفظ جاگیردار، عثمانی معاشرہ کی صحیح تصویر نہیں پیش کرتا کیونکہ وہاں سلطان اصولاً ہر ہر چیز کا مالک تھا۔ کچھ مخصوص لوگوں کو زمین کے کچھ حصّے پٹہ پر ٹیکس فارم کی حیثیت میں دیئے جاتے۔ ان زمینوں پر ٹیکس دیا جاتا تھا۔ انھیں ترکی میں تیمار کہا جاتا تھا۔ تیمار دراصل دیہاتی جائیداد تھی جس پر تیمار کا مالک دیہات کے رہنے والوں سے ٹیکس وصول کرسکتا تھا۔ دیہات کے رہنے والے بالعموم کسان تھے جو ان زمینوں پر کاشت کے ذریعہ گذارا کرتے تھے۔ تیمار کے مالک کو یہ اختیار تھا کہ وہ ان کاشتکاروں سے جتنا چاہیں وصول کرے لیکن اس استحقاق کے لئے انھیں ہر سال حکومت کو ایک متعین ٹیکس ادا کرنا ضروری تھا۔ حکومت کو دیئے جانے والے ٹیکس سے جو بھی زائد رقم ہوتی تیمار کا مالک اسے اپنے پاس رکھتا اور اس پر کوئی پابندی نہیں تھی کہ وہ کاشتکاروں سے کتنی رقم وصول کریں۔ حکومت کے حصّہ کا انحصار اس بات پر نہیں تھا کہ تیمار کے مالکوں نے کاشتکاروں سے کتنا حاصل کیا بلکہ اس پر تھا کہ تیمار کے مالک کی نگرانی میں کتنی جائداد تھی۔ اگر زمین توقع سے زیادہ آمدنی دیتی یعنی کاشتکاری زیادہ ہوتی تو اس کا فائدہ ٹیکس دینے والے کو ہوتا تھا۔ حکومت کو نہیں۔ اگر تیمار کی کارکردگی خراب رہتی تو اس کا اثر تیمار کے مالک پر پڑتا۔ اگر وہ مسلسل کئی سالوں تک ٹیکس ادا نہ کرسکے تو موجودہ تیمار سے زمین لیکر دوسرے کو دے دی جاتی تھی۔

یہ بھی ہوتا کہ سلطان جب کسی کامیاب مہم سے واپس آتا تو اپنے سب سے اچھے جرنل کو تیمار بطور انعام

کے دیتا۔لیکن ہوتا یہ تھا کہ نئے مقبوضہ علاقوں کو چھوڑ کر سلطان تیمار کے کسی پرانے مالک سے واپس لیکر نئے آدمی کو یہ تیمار بطور انعام دیتا۔ کیونکہ تیمار واپس لیا جا سکتا تھا اس لئے جاگیردار محض نیم جاگیر دار ہی تھے یہ محض نیم موروثی ہی ہوتے تھے۔ چنانچہ اس طریقہ کار سے معاشرہ ایک سیلانی کیفیت میں رہتا تھا یعنی فائدے اور منافع رواں رہتے تھے اور عثمانی دنیا اس سیلان شدید کے ذریعہ حرکت پیہم میں رہتی تھی۔

یہ بات ذہن میں آسکتی ہے کہ اس تیماری نظام کے نتیجہ میں عثمانی اشرافیہ کسانوں کا استحصال کرتی ہوگی۔ کیونکہ حکومت کو ٹیکس ادا کرنے کے بعد سب کچھ ان کا اپنا ہوتا تھا۔ اور اس کی کوئی حد بھی مقرر نہ تھی۔ لیکن تیمار کے مالک اتنے آزاد نہ تھے کہ جو چاہیں کریں۔ کسانوں کو یہ حق تھا کہ شرعی عدالت میں عدل کے لئے اپیل کر سکیں۔ اور یہ عدالتیں ایک مکمل متوازی نظام اور معاشرہ میں ایک بالکل علیحدہ قوت و اختیارات کا سرچشمہ تھیں جن کا انتظام اور کنٹرول علماء کے ہاتھ میں تھا۔ اس طبقہ کا حصہ بننے کے لئے کوئی مختصر اور چھوٹا راستہ نہیں تھا۔ اشرافیہ میں سے بھی اگر کوئی خاندان اپنے کسی لڑکے کو اس قانونی نظام کا حصہ بنانا چاہتا تو اس کے لئے بھی وہی طویل سلسلہ اور طریقہ کار تھا جس سے گذر کر ہر عالم اس نظام تک پہنچتا تھا۔

یہ ایک طویل سلسلہ تھا اور اس میں اتنا وقت لگتا تھا کہ جب وہ اس مقام تک پہنچنے کی صلاحیت اور ہُنر پیدا کر لیتا تو اس کے تعلقات عام طور پر دوسرے علماء سے ہو جاتے اور یوں اس کی دلچسپیاں اور مفادات انھیں علماء سے وابستہ ہو جاتے اور جنکے کردار کی تشکیل عقائد کے قدیم نظام کے ذریعہ ہوتی نہ کہ اپنے قبیلہ یا خاندانی روایات کے ذریعہ۔

خاصی موثّر طاقت رکھنے کے باوجود علماء کا یہ نظام عثمانی معاشرہ میں عام مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں کوئی موثر رول ادا نہیں کر پاتا تھا۔ تصوّف اب بھی عام لوگوں میں نہ صرف مقبول بلکہ اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا تھا۔ عوام کی اکثریت کسی نہ کسی سلسلہ سے برائے نام ہی سہی وابستہ رہتی تھی۔ ایک بڑی تعداد کسی نہ کسی اخوت سے اپنے آپ کو جوڑے رکھتی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عثمانی معاشرہ کی اکثریت یا عوام عملی صوفی تھے نہیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ترک عوام کی فکر اور سرگرمیوں میں توہمات، مقبروں، تعویز گنڈوں، سحر، روحانی علاج اور ان صوفیوں اور ولیوں کا احترام جن کے بارے میں معروف تھا کہ انھیں کچھ روحانی طاقتیں حاصل ہیں خاصے مقبول تھے۔ اس کے علاوہ صوفی سلسلے اخیوں یعنی دستکاروں اور تاجروں کی انجمنوں سے بھی مربوط تھے۔ یہ انجمنیں آزاد حیثیت کی مالک تھیں۔ یہی انجمنیں اپنے ممبروں کے لئے معیارات طے کرتیں۔ نئے تجارتی کاموں کے لئے لائسنس یعنی اجازت نامے فراہم کرتیں۔ بقایا جات حاصل کرتیں، انھیں قرض فراہم کرتیں، بزرگوں کو پنشن دیتیں، انتقال پر ضروری نظم و انصرام کرتیں، صحت کے سلسلہ میں نظم چلاتیں۔ سراؤں اور پناہ گاہوں کا انتظام کرتیں، مختلف مقامات پر خیراتی لنگروں کا انتظام کرتیں، وظائف دیتیں۔ اور میلے وفیسٹیول، جلسے اور جلوس کا انتظام کرتیں اور اسی طرح دوسرے عوامی تفریحی پروگراموں کا انعقاد بھی کرتیں۔ ہر انجمن کا ایک ماسٹر،

کونسل، شیخ اور ایک داخلی سیاسی نظم اور طریقہ کار ہوتا تھا۔ ممبروں کو کوئی شکایت یا تکلیف ہوتی تو وہ افسروں کے پاس جاتے جیسے آج کسی صنعتی ادارے کے وابستگان ٹریڈ یونین کے نمائندوں کے پاس جاتے ہیں۔ اگر ضرورت ہوتی تو انجمن کے ذمہ دار اپنے ممبران کے مسائل کو لیکر قانونی کاروائی کرتے اور ممبر کی حمایت میں حکومت پر مقدمہ کرتے۔ اس طرح حکومت بھی ان انجمنوں کا نظم وضبط درست رکھنے کے لئے اپنے بنائے ہوئے معیارات نافذ کرتی اور عوامی بہبود کی خاطر اشیاء کی قیمتوں پر نظر رکھتی۔

ہر دستکار کسی انجمن سے متعلق تھا اور بہت سے ممبران انجمن کسی نہ کسی صوفی سلسلہ سے متعلق ہوتے۔ جس میں مختلف انجمنوں کے ممبران شامل ہو سکتے تھے۔ ہر صوفی اخوت کے پاس قیام کے لئے عمارتیں ہوتیں جہاں یہ ممبران اکٹھے ہوتے اور ایک دوسرے سے ملتے۔ اور یہ ملاقاتیں محض آپسی نہیں ہوتی تھیں بلکہ تاجروں سے اور مسافروں سے بھی ہوتیں جو کہیں اور جانے کے لئے یہاں ٹھیر جاتے تھے۔ یہ اخی صوفی مساکن مسافروں کی مدد اور انھیں سہولیات کی فراہمی کے مراکز کے طور پر کام کرتے تھے۔

عثمانی دور کی معاشرتی مشین کی یہ ایک ہلکی سی جھلک ہے۔ لیکن اس سے جو شکل ابھرتی ہے اس کی پیچیدگی یہاں ختم نہیں ہوتی۔ ہر سطح پر یہی شکل اور پیچیدگی کا یہی انداز ملے گا۔ ہر چیز دوسری چیزوں سے یا باہم مربوط اور مختلف طریقوں سے مربوط۔ یہ بہت اچھا نظم اس وقت تک ہی اچھا رہتا جب اس نظم کا ہر حصہ کام کر رہا ہو اور ایک باہمی توازن کو قائم رکھے۔ صدیوں بعد جب عثمانی سلطنت، ضعف و ناتوانی کی طرف بڑھی تو یہ تمام مربوط حصے اور ادارے عثمانیوں کی شناخت کو بری طرح متاثر کرنے لگے۔ کیونکہ آخری ذمہ داری میں جوابدہی تو عثمانیوں ہی کی تھی۔ ہوا یوں کہ آپس میں زبردست ارتباط کی بنا پر ایک انجمن یا ادارے کی پریشانی دوسرے درجنوں اداروں کو غیر محسوس طور پر متاثر کرنے لگی۔ لیکن یہ سب کچھ بعد میں ہوا۔ سولہویں صدی میں عثمانی سلطنت حیرت انگیز طور پر ایک بہترین مشین کی طور پر کام کر رہی تھی۔

عثمانیوں کا مشرق کی طرف پھیلاؤ ایک دوسری ابھرتی ہوئی صفوی طاقت سے رُک گیا لیکن عثمانیوں نے جنوب کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اور یوں پرانے مرکزی خطہ کو فتح کر کے بحر ہند اور بحر اوقیانوس تک اپنے اثرات کو محفوظ کرلیا۔ پھر مصر پر قبضہ ہوا اور اس طرح تاریخ سے مملوک سلسلہ ختم ہو گیا اور پھر مزید مغرب کی طرف شمالی افریقہ کے ساحلی علاقوں کو فتح کیا۔

اپنی عظمت کے عروج پر یعنی سلیمان اعظم کے دور میں (سلیمان کو مغرب نے Magnificent کا ٹائٹل دیا اور وہ خود اپنے نام کے ساتھ القانونی یعنی قانون دینے والے کا لقب استعمال کرتا تھا)۔ عثمانی سلطنت غالبًا دنیا کی سب سے بڑی قوت تھی۔ یہ یورپ وایشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں روم یعنی قسطنطنیہ بھی تھا اور مکہ بھی تھا۔ قاہرہ کا ذکر فی الحال نہیں کرتے۔ اس کا بادشاہ سب سے زیادہ افراد اور سب سے بڑے جغرافیائی علاقے کا حکمراں تھا۔ تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ عثمانی حکمرانوں نے اپنے آپ کو خلیفہ کہلوانا شروع کر دیا تھا۔

کسی نے اس لقب سے اختلاف نہ کیا۔ یقیناً اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی کہ کسی نے اسے اختلاف کے لائق سمجھا ہی نہیں۔ یہ وقت آتے آتے اس لقب کی محض رسمی حیثیت رہ گئی تھی۔ لیکن یہ قابل فکر نکتہ ہے کہ عثمانی بادشاہ نے بیک وقت ان دو القابات پر اپنا حق استعمال کیا جو عالمی اقتدار کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ تاریخ میں پہلی بار شاید ایک ہی شخص سلطان بھی تھا اور خلیفہ بھی۔ ایک عام مسلمان یہی سمجھتا تھا کہ یقیناً تاریخ آگے ہی بڑھ رہی ہے اور امت اپنے راستہ پر اور ایک عالمگیر امت بننے کی طرف گامزن ہے۔

صفوی (۹۰۶ تا ۱۱۳۸ھ)

خلیفہ اور سلطان ہی وہ اصطلاحیں نہ تھیں جن سے اسلام میں عالمی بالادستی اور اختیار کا اظہار ہوتا تھا۔ ایک دوسری اصطلاح 'امام' کی بھی تھی جو مسلمانوں کے ایک دوسرے گروہ یعنی شیعوں کے یہاں معتبر مانی جاتی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہم اہل فارس میں صفوی دور تک جا پہنچتے ہیں جس نے عثمانیوں کو مشرق کی طرف بڑھنے سے روک دیا تھا۔

صفویوں کی اقتدار تک رسائی بڑے عجیب وغریب طریقے سے ہوئی۔ ویسے ان کی جڑیں ایک صوفی سلسلے میں پیوست ہیں جو منگولوں کے حملہ کے بعد ہی تشکیل پایا تھا۔ یہ سلسلہ شمالی فارس میں ایک روحانی استاد شیخ صفی الدین کے گرد قائم ہوا اور اس طرح صفوی نام بھی منظرِ عام پر آیا۔

کوئی تین نسلوں تک یہ گروہ دوسرے صوفی سلسلوں کی طرح امن وسکون اور غیر سیاسی انداز میں کام کرتا رہا۔ جس کا بنیادی مقصد عوام کو دنیاوی خرافات سے نکال کر روحانی اخوت میں شامل کرنا تھا۔ لیکن اس کے بعد اس سلسلہ میں تبدیلی آنی شروع ہوئی۔ جب تیسرے شیخ کا انتقال ہوگیا تو ان کا بیٹا نیا شیخ تسلیم کرلیا گیا اور پھر جب اس کا بھی انتقال ہوا تو اس کا بیٹا اور پھر اس کا بیٹا اور اس طرح اس سلسلہ کی لیڈرشپ موروثی ہوگئی۔

پھر یہ بھی ہوا کہ اس دوران شیخ کے کچھ سیاسی عزائم بھی ہوگئے۔ کچھ ایسے مبتدیوں کو نامزد کیا گیا جو نہ صرف روحانی تربیت حاصل کرتے بلکہ انھیں ملٹری تربیت بھی دی جاتی، اور یہ لوگ شیخ کے حفاظتی دستے میں شامل ہوگئے۔ وہ اس کے احکام کو نافذ کرنے لگے اور پھر یہ ایک سنجیدہ ملٹری جماعت کا نظام بن گیا۔

صفویوں کے یہ محافظ اپنی شناخت کے لیے ایک خاص قسم کی سرخ رنگ کی ٹوپی استعمال کرتے جس کی بنا پر انھیں قزلباش کہا جانے لگا جو ترکی زبان میں سرخ رنگ کی ٹوپی پہننے والوں کو کہا جاتا ہے۔ ان کی ٹوپی میں بارہ تہیں ہوا کرتی تھیں جو علامتی طور پر اس سلسلے کی تیسری اور انتہائی اہم تبدیلی کی نشان دہی کرتی تھیں۔ اور یوں یہ سلسلہ اب شیعیت کی طرف مائل ہوگیا تھا۔

ٹوپی کی بارہ تہیں عام شیعوں کے بارہ اماموں کی علامت تھیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا کہ شیعوں کے یہاں حتمی مذہبی قوت اور اقتدار ہمیشہ سے وقت کے امام کو حاصل ہوتی ہے جو اس دنیا میں خدا کا نمائندہ

ہے۔امام ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے۔کبھی دونہیں ہوتے۔اوروقت کا صحیح امام رسول اللہؐ کی اولاد سے ہی ہوگا یعنی رسول اللہؐ کی بیٹی فاطمہ اور علیؓ سے۔

جب بھی امام کے ایک سے زیادہ بیٹے ہوتے تو ایک قسم کے اختلاف کا دروازہ کھل جاتا یہ دیکھنے کے لئے کہ کس بیٹے کو آئندہ امام ہونا چاہئے۔اس طرح کے اختلافات کی بنا پر پانچویں امام کی وجہ سے ایک چھوٹا فرقہ زیدیوں کا ظہور میں آیا۔اور ساتویں امام پر اسی طرح کے اختلافات نے اسمٰعیلیوں یعنی سات والوں کو جنم دیا۔

بقیہ شیعہ بارہویں نسل تک جو حضرت علیؓ سے مہدی تک پہنچتی تھی پر متفق ہو گئے۔البتہ یوں ہوا کہ پھر بارہواں امام جو ابھی بچہ ہی تھا غائب ہو گیا۔غیر شیعہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو قتل کر دیا گیا تھا۔جب کہ شیعوں کے خیال میں مرا نہیں بلکہ غائب ہو گیا تھا۔یہ شیعوں میں ایک مخصوص تصور ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کبھی عام آدمی کو نظر نہیں آسکتا۔

شیعوں کی اکثریت بارھویں امام کو امام غائب کہتی ہے۔ان کے عقیدہ کے مطابق خفیہ امام نہ صرف زندہ ہیں بلکہ ہمیشہ زندہ رہیں گے وہ اب بھی خدا سے براہ راست تعلق میں ہیں اور اب بھی دنیا کی رہنمائی کرتے ہیں گو کہ ہمیں وہ رہنمائی نظر نہیں آتی۔یہ عقیدہ یہ نہیں بتاتا کہ امام غائب چھپے ہوئے کیسے ہیں۔وہ یہ بھی نہیں بتاتا ہے کہ انھوں نے کیا پوشیدگی اختیار کی ہے۔یا کوئی ایسی چیز پہنی ہے کہ وہ دوسروں کو نظر نہیں آتے،شکل بدل لی ہے،کیا کسی غار میں جا کر چھپ گئے ہیں یا پھر کیا ہے؟۔یہ سوالات دراصل سائنسی ذہن کی پیداوار ہیں۔پوشیدگی اور اخفا دراصل انسانی عقل سے باہر کا تصور ہے جس کے لیے آلاتی تشریح غیر متعلق اور بے جوڑ ہے۔

شیعی عقیدے کے مطابق بارہویں امام تاریخ کے آخر میں ظاہر ہونگے۔اللہ کی جماعت کی تکمیل کریں گے اور اُس عہد کا آغاز کریں گے،عدل جس کا طرۂ امتیاز ہوگا اور جس کی تمنّا ہر اچھے مسلمان کے دل و دماغ میں انگڑائیاں لیتی رہتی ہے۔تاریخ کے اختتامیہ پر پہنچ کر جو مر چکے وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے،اللہ انسانی اعمال کی بنا پر جنت اور دوزخ میں جانے والوں کو علیحدہ علیحدہ کر دے گا۔اس امید پر کہ امام غائب ایک روز ظاہر ہو جائیں گے شیعہ ان کو مہدی یعنی جس کی امید تھی کہتے ہیں۔مہدی کی آمد شیعہ کے علاوہ سنی حلقوں میں بھی پائی جاتی ہے لیکن اتنی وضاحت اور شدّت سے نہیں۔ایرانیوں کی اکثریت شیعیت کی اسی شاخ سے منسلک ہے اور اس طرح بارہ اماموں کا عقیدہ جدید دور میں شیعی اکثریت کا عقیدہ ہے۔

پندرہویں صدی کے نصف میں صفویوں نے اس پیچیدہ عقیدہ کو تسلیم کر لیا اور اس طرح بارہ تہوں کی ٹوپی جسے قزلباش استعمال کرتے تھے بارہ اماموں سے منسلک ہو گئی۔اور اب صفوی ایسا گروہ بن گیا جس کا رہنما ایک مہم جو شیخ ہوتا جس کے تحت ایک ہتھیار بند فوج رہتی۔فوج کے سپاہی اپنے اس رہنما کو محض فوجی کمانڈر نہیں بلکہ جنت تک پہنچانے کا ذریعہ بھی سمجھتے تھے۔

یہ سیاست زدہ صفوی دراصل ایک معاشرتی انتشار کے ماحول میں ظاہر ہوئے تھے۔فارس ایک بار چنگیز

خان کے ذریعہ اور پھر تیمور کے ہاتھوں برباد ہو چکا تھا اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو کر ترک سرداروں کی بالادستی میں چلا گیا تھا۔ یہ ترک سردار سبھی سخت سنی تھے۔ فارس کے شیعی گروہ کافی عرصہ تک باہر سے آنے والوں کے خلاف جدوجہد کرتے رہے تھے۔ ابتداء میں تو عربوں کے خلاف، پھر اس وقت جب ترکوں نے اس پر قبضہ کیا اور اب منگولوں کے حملہ کے نتیجہ میں پھر بربادی ہوئی تو شیعوں کا یہ جنگجو صفوی گروہ بڑی آسانی سے ان تمام سے مربوط ہو گیا جو حکومت مخالف، انقلابی سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔ اس کے نتیجہ میں اس وقت کے مقامی حکمراں یقیناً پریشان ہوئے ہوں گے۔

شاہزادے نے عملی کاروائی کرنی چاہی اور اس وقت کے صفوی سلسلہ کے ذمہ دار کا سر کاٹ ڈالا گیا اور پھر کسی وجہ سے اس کے بڑے بیٹے کو بھی مروا دیا۔ ممکن ہے کہ سب سے چھوٹا بیٹا جس کا نام اسمٰعیل تھا اور جو شاید دو ہی سال کا تھا مار ڈالا جاتا لیکن اسے ایک قزلباش نے کہیں چھپا دیا۔ اتفاقاً وہ جگہ جہاں اسے چھپایا گیا تھا سرکاری قاتل کے قیام سے چند قدم کے فاصلے ہی پر تھی۔

آئندہ دس سالوں میں صفوی ایک مضبوط خفیہ تنظیم کی شکل میں منظم ہو گئے اسمٰعیل ایک جگہ سے دوسری جگہ اور پھر تیسری جگہ چھپتے ہوئے تیزی سے نوجوان ہو گیا اور اس دوران قزلباش اس کے ساتھ اتنے ہی احترام سے پیش آتا رہا جیسے کہ وہ صفوی سلسلہ کا سربراہ ہو۔ اس کا احترام کیا جاتا اور وہ لوگ یہ سمجھتے کہ اسمٰعیل میں الوہیت کا ایک نور موجود ہے۔ ذرا تصور کریں کہ جب یہ سنِ شعور کو پہنچا ہوگا تو اس نے دنیا اور خود اپنے بارے میں کیا سوچا ہوگا۔ اپنی زندگی کا جو کچھ حصہ اس نے گزارا تھا وہ خفیہ ماحول تھا اور یہ خوف لاحق رہتا تھا کہ کسی وقت بھی اس کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے اور بالکل بچپن کی یادوں میں اس نے اپنے آپ کو سرخ ٹوپیاں اوڑھے اپنے لوگوں سے گھرا ہوا پایا ہوگا جو اس کا حد درجہ احترام کرتے اس کے سامنے عجز و انکسار سے رہتے اور اس کے لفظ لفظ کو پورا کرنے کی کوشش کرتے اور خواہشات کو بروئے کار لاتے۔ اور حسن اتفاق کہ اس ماحول میں تراشیدہ بچہ نہ صرف بہت ذہین بلکہ سخت بھی تھا۔

بارہ سال کی عمر میں اسمٰعیل منظر عام پر آ گیا اس طرح کہ قزلباشوں کی ایک قوت اس کے ساتھ تھی۔ جس شہزادے نے اس کے باپ کو قتل کیا تھا جلد ہی اس سے فارغ ہو گیا۔ دوسرے شہزادے اس سے نپٹنے کے لئے آگے بڑھے کہ بارہ سالہ بچے کی بہادری کی بھی کوئی حد ہوگی۔ لیکن یہ بہت سخت جان نکلا۔

۱۵۰۲ء میں اس کی عمر پندرہ سال تھی اسمٰعیل نے اپنے آپ کو ایران کا شہنشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ شہنشاہ یعنی شاہوں کا شاہ۔ یہ وہ لقب تھا جسے ایران کے قدیم بادشاہ استعمال کرتے تھے۔ خلیفہ اور سلطان کا لقب مسترد کرتے ہوتے اسمٰعیل دراصل عرب اور ترک تاریخی روایت سے بھی کٹ رہا تھا اور اپنی فارسی شناخت کی بازیافت کر رہا تھا۔ اپنے ملک کو ایران کہہ کر اس نے فردوسی کے شاہ نامہ میں مذکور بادشاہ کو زندہ کیا تھا۔ اس کی تشہیر کرنے والوں نے اسے یہ بھی باور کرایا تھا کہ وہ زمانہ قدیم کے ساسانی بادشاہوں کی اولاد ہے۔

اسمٰعیل نے بارہ اماموں کے تصور کو سرکاری مذہب قرار دیکر اپنے پڑوسی ممالک سے بھی اپنے آپ کو ممتاز کرلیا۔ اپنے حاشیہ برداروں سے علی الاعلان اول تینوں خلفاء ابوبکرؓ، عمرؓ، اور عثمانؓ کو برا کہنے اور گالیاں دینے کا سلسلہ شروع کردیا۔ ریاستی سطح پر اعلان کیا گیا کہ رسول اللہؐ کے حقیقی جانشین علیؓ تھے اور ان کی اولاد سے جو امام ہوئے وہی مذہبی اعتبار سے کوئی استحقاق اور اختیار رکھتے ہیں۔ حاشیہ برداروں نے یہ پروپیگنڈہ بھی کیا کہ ساسانی النسل ہونے کے ساتھ اسمٰعیل علیؓ کی اولاد بھی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ وہ امام غائب کے ساتھ براہ راست ربط میں ہیں (اور امام غائب تو خدا سے رابطہ میں ہے ہی)۔ صحیح بات یہ ہے کہ اسمٰعیل نے قریب قریب یہ اعلان کردیا کہ امام غائب وہ خود ہی ہے۔ اور صحیح بات تو یہ ہے کہ ابتداء ہی سے جیسی اس کی تربیت ہوئی تھی وہ خود کو امام غائب سمجھتا بھی ہوگا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔

اپنی اس مذکورہ شبیہ پر مضبوطی سے یقین کرنے اور کرالینے کے بعد اس نے اپنے مذہبی تصور کی مختلف علاقوں بالخصوص عثمانی علاقوں میں تبلیغ کرنا شروع کی۔ اس کے نمائندے عثمانی رعایا کو شیعیت تسلیم کرنے اور اسمٰعیل کو اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا اپنا رہنما تسلیم کرنے کی دعوت دیتے۔ اپنے زیرِ دست سنّیوں کو ستانے کی پالیسی پر عمل کیا۔ بعضوں نے اس کے رویّہ سے یہ اخذ کیا کہ بادشاہ کے دماغ میں خلل واقع ہوگیا ہے۔ اور جلد از جلد عثمانی حدوں میں ہجرت کر گئے۔ جو رہے ان میں بہت سے قیدی بنے اور بہت سے قتل کردیئے گئے۔

لیکن یہ بھی جاننا چاہیے کہ عثمانی سلطان سلیم سنگدل (Grim) نے انتقاماً اپنے علاقوں میں شیعہ آبادی کو قید و بند اور قتل کرنا شروع کیا۔ اور نتیجہ کے طور پر جیسے سنی ایران سے اناطولیا کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ شیعہ ایران کی طرف بھاگے۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ صفوی سلطنت میں شیعہ اکھٹے ہوتے گئے اور سنی عثمانی سلطنت میں۔ صفویوں نے اس صورتحال کو جاری رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی بلکہ ہر طرح سے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ انھوں نے یہ بھی کوشش کی فارسی ثقافت شیعی خیالات اور تصورات کی شناخت بن جائے۔ چنانچہ شیعی عقائد اور فارسی قومیت کے اس انضمام نے اس نئی سلطنت کو نظریاتی بنیادیں فراہم کیں اور یہی بنیادیں بعد میں جدید ایران کی شکل میں ابھریں۔

ان کوششوں کے ساتھ صفویوں نے تعزیہ کو ایک قومی ڈرامے کے بطور متعارف کرایا۔ تعزیہ دراصل شیعوں کے جوش و جذبہ پر مشتمل ایک ناٹک ہے جس میں کربلا میں امام حسینؓ کی شہادت کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔ یہ ان خاص عمارتوں سے جنھیں عزا خانہ کہا جاتا ہے ماتمی رسم کی ادائیگی کے بعد باہر نکلتے ہیں۔ روایتاً شیعہ لوگ دسویں محرم کو یعنی جس روز امام حسینؓ شہید ہوئے تھے ایک اجتماعی ماتم کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آرہا ہے، ان ماتمی جلسوں کے دوران کسی میں بھی یہ خواہش پیدا ہو کہ وہ شہادت سے متعلق کوئی واقعہ، کہانی سنائے اور حاضرین کے جذبات کو برانگیختہ کرسکے تو وہ کھڑا ہوکر یہ بیان شروع کردیتا ہے۔ چنانچہ ہر شیعہ شہادت کی ممکنہ تفصیلات اور کہانیوں سے واقف ہوجاتا ہے۔ ان ناٹکوں کی ادائیگی میں واقعات کے بیان کا ایک خاص ڈھنگ

ایجاد کیا گیا ہے جس کا اپنا مقصد جذبات کو ابھارنا اور دکھ درد کی کیفیت کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ ایسی تمام کہانیوں کے مجموعہ کو مرثیہ کہا گیا۔ اسے مختلف انداز میں ٹکڑوں میں تو لکھا گیا لیکن کوئی مکمل تحریری شکل تیار نہ ہوسکی۔ اور ہر سال دسویں محرم کو اور اب کیوں کہ صفوی اقتدار میں تھے اب یہی نہیں بلکہ گلی کوچوں میں اس غم و درد کا اظہار جیسے پھٹ پڑتا اور پھر حکومت کے زیر انتظام ایک بہت بڑے اسٹیج پر یہ سب ختم ہوتا جہاں اس ڈرامہ کو عوام کے سامنے پیش کیا جاتا۔

اسمٰعیل جب ستائیس سال کا ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ بہر حال خدا نہیں ہے یہ سبق اسے عثمانیوں نے اس کے علاقہ پر حملہ کر کے پڑھایا۔ اسمٰعیل بڑی تیزی سے جنگ کے لئے آگے بڑھا۔ دونوں فوجیں تبریز میں جالدیران کے مقام پر آمنے سامنے ہوئیں۔ عثمانی آگ لگا دینے والے ہتھیاروں سے لیس تھے جبکہ صفوی سمجھتے تھے کہ ان کے پاس اس سے بھی بہتر ہتھیار موجود ہے یعنی قدیم طرز کا مذہبی جذبہ اور خدا کی راست رہنمائی میں رہنے والا انکا بادشاہ۔ اس بار گولہ بارود زیادہ موثر ثابت ہوئے۔ سلیم نے اسمٰعیلی فوجوں کو روند ڈالا اور اسمٰعیل کو پژمردہ کر دیا اور دارالسلطنت تبریز اپنے قبضے میں لے لیا۔

جالدیران کی جنگ اتنی ہی اہم تھی جتنی جنگ Hastings، جس کی بدولت انگلینڈ ایک قومی ریاست کی شناخت کے ساتھ ابھرا۔ عام طور پر مورخین نے جالدیران کی جنگ میں عثمانیوں کو فاتح قرار دیا ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو یہ برابر برابر کی جنگ تھی کیونکہ شاہ سلیم تبریز کو شامل رکھنے پر کامیاب نہ رہا۔ سردیوں کے آتے ہی وہ زیادہ محفوظ اناطولیہ کے اندرونی علاقوں میں چلا گیا اور اگلے سال اہل فارس اس پر پھر قابض ہو گئے اور اس کی زمین کو اس قابل نہ رکھا کہ آئندہ کوئی اگر قبضہ کر ہی لے تو اسے زندہ رہنے کے لیے یہ زمین کچھ دینے کے قابل رہے۔ چنانچہ اس جنگ نے عثمانی اور صفوی سلطنتوں کی سرحدیں متعین کر دیں اور پھر آنے والی ریاستوں یعنی ترکی اور ایران کے لئے معروف سرحدیں بن گئیں اور آج بھی ہیں۔

جالدیران کی شکست سے دل برداشتہ اسمٰعیل واپس گیا تو وہ ایک ٹوٹا ہوا آدمی تھا۔ اس شکست نے اس کو اپنی شناخت پر از سر نو غور کرنے کا موقع دیا۔ چنانچہ اس نے اپنی عمر کے بقیہ سال گوشہ نشینی میں گزارے جس میں وہ کائنات پر غور فکر کرتا اور مذہبی شاعری کرتا۔ لیکن بادشاہ کی دلگیری اور افسردگی کے باوجود اسمٰعیل کی سلطنت نہ صرف باقی رہی بلکہ ارتقاء کی جانب گامزن رہی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے لائق اور طویل العمر حکمراں ملتے رہے۔

یہ اب بلا شک وشبہ ایک فارسی سلطنت تھی لیکن اس کو اصل عروج اسمٰعیل کے پرپوتے شاہ عباس کے زمانہ میں حاصل ہوا۔ شاہ عباس اعظم ۱۶۲۹ء میں فوت ہوا اور کوئی بیالیس سال تک حکومت کی۔ فوج کو گولہ بارود اور توپوں سے آراستہ کیا۔ اس کے دور میں سرکاری مدد سے قائم ہونے والے کارخانے جن میں ٹیکسٹائل، سیرامک، کپڑے اور کارپیٹ کی صنعتوں نے زبردست ترقی کی۔ یہ اشیاء دور دراز علاقوں جیسے مغربی یوروپ،

افریقہ اور ہندوستان تک جاتی تھیں۔

مصوری ورنگ آمیزی کا فن اور خاص طور پر فارسی طرز کی چھوٹی تصاویر، نزاکت سے بنائے گئے جنگلی مناظر جن کے حاشیے پھولوں اور جیومیٹری کے ڈیزائن سے مزین ہوتے یہ سب صفوی دور میں اپنے عروج کو پہنچے۔فن خطاطی کو عالم اسلام میں ایک پاکیزہ اور متبرک فن کی حیثیت حاصل تھی کیونکہ قرآن کریم لکھنے کا عمل بھی اس فن سے متعلق تھا وہ بھی اسی دور میں اپنے کمال کو پہنچا۔آرٹ کی یہ دونوں شکلیں خصوصی طور پر آراستہ کتابوں میں سامنے آئیں۔اس دور کی سب سے زیادہ معیاری اور بلند مقام پر پہنچ چکا اس طرز کا آرٹ فردوسی کے شاہنامے میں جو اس نے ایک صفوی بادشاہ کے لئے لکھا، سامنے آیا۔جس میں ۲۵۸ تصاویر اور ساٹھ ہزار خطاطی کی جیومیٹری کی لائینیں ہیں جو مختلف مصوروں نے تیار کی تھیں۔دیکھا جائے تو اس میں ایک مکمل میوزیم سمودیا گیا ہے۔

صفویوں کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار فن تعمیر میں اپنے عروج کو پہنچا۔مثلاً عثمانیوں کی عظیم الشان اور زبردست مساجد اور مینار وگنبدوں کے برخلاف صفویوں نے ہوادار ڈھانچوں پر مشتمل تعمیرات میں جن میں چمکدار دیدہ زیب ٹائلوں کا استعمال کیا جن سے عظیم الشان مساجد بھی ایسی لگتیں جیسے پھولوں اور روشنی کے امتزاج سے بنی ہیں۔

اور فن تعمیر اگر صفوی آرٹ کا بلند ترین اظہار تھا تو شہروں کی تعمیر میں اس فن کی ماورائیت کا اظہار پایا جاتا تھا۔صفویوں کا دارالسلطنت بار بار بدلتا رہا۔اس میں اس خطرہ کوزیادہ دخل تھا کہ کہیں عثمانی شہر کو تباہ نہ کردیں۔ البتہ جس شہر کو بھی صفویوں نے اپنایا اسکی از سر نو تعمیر کی جس میں جمالیات کو اہم مقام حاصل تھا۔۱۵۹۸ء میں اصفہان کو بطور دارالسلطنت منتخب کرنے کے بعد شاہ عباس نے اسے اس طرح تعمیر کیا کہ پورا شہر ایک مربوط ہیرا نظر آتا۔جس میں عوامی اسکوائرس یعنی مستطیل نما چوک، باغات، مساجد، بلند وبالا مکانات، تالاب، محلات اور عوامی عمارتیں، جو بڑی بڑی شاہراہوں سے جڑی ہوئی تھیں ان کی بہتات تھی۔

مجحوب ناظرین نے اس شہر کو دیکھ کر ایک کہاوت ایجاد کی ''اصفہانِ نصفِ جہاں''، یعنی اصفہان نصف دنیا۔مطلب یہ تھا کہ اگر اصفہان نہیں دیکھا تو گویا آدھی دنیا سے بے بہرہ رہے۔

صفویوں اور عثمانیوں میں واضح اختلاف تھے لیکن دونوں حکومتوں میں مخاصمت کے باوجود ایک تہذیبی یگانگت کی ڈور نے ان دونوں کو جوڑ رکھا تھا۔ان دونوں میں فرق ایسا ہی تھا جیسا کہ انگلینڈ اور فرانس میں بلکہ شاید اس سے بھی کم۔ایک مسافر استنبول سے اصفہان کا سفر کرتا یا اصفہان سے استنبول کا تو اسے کم وبیش دونوں مقامات پر یکسانیت نظر آتی۔یہ بڑی غیر معمولی بات ہے کہ دو ایسی طاقتور اور انتہائی ممتاز سلطنتیں تقریباً ایک ہی وقت میں ایک دوسرے سے اتنا ملی ہوئی قائم ہوئیں اور باقی رہیں۔لیکن انتہائی حیرت انگیز بات یہ بھی ہے کہ تقریباً اسی دور میں ایک عظیم مسلم طاقت ابھری جو اپنی وسعت، اپنے امتیاز اور شان وشوکت میں انہیں جیسی تھی۔یہ سلطنت مغلوں کی تھی جو بالآخر برما،

ہندوستان کو پار کرتی ہوئی نصف افغانستان تک پھیلی جہاں وہ سلطنت صفویہ کی سرحدوں سے مل جاتی تھی۔

مغل (۹۰۰ تا ۱۲۷۳ھ)

مغل ہر اعتبار سے طاقت اور دولت میں عثمانیوں کے ہم پلّہ تھے۔آج دنیا کی بیس فیصد آبادی جس علاقہ میں آباد ہے اس پر مغل حکمراں تھے جس میں آج کا افغانستان، پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش اور برما شامل ہیں۔جس شخص نے اس عظیم سلطنت کی بناڈالی وہ شاہ اسمٰعیل صفوی کا ہم عصر بابر تھا جس کے معنی شیر کے ہوتے ہیں اور ایک اعتبار سے وہ صفوی بچہ سے زیادہ غیر معمولی تھا۔

بابر تیمور لنگ اور چنگیز خاں کی نسل سے تھا۔کون جانے کہ واقعی خونی رشتہ کیا تھا البتہ اتنا ضرور ہے کہ بابر نے اس رشتہ کو بہت سنجیدگی سے لیا تھا اور اس طرح اسے زندگی بھر کے لئے ایک مشن مل گیا تھا۔بابر کا باپ ایک چھوٹی سی ریاست فرغانہ کا حکمراں تھا جو آج کے افغانستان میں شمال کی طرف ہے۔جب اس کا انتقال ہوا اور بابر نے تخت سنبھالا تو اس کی عمر محض بارہ سال تھی۔

ایک سال کے اندر اس کی سلطنت باقی نہ رہی اور اس میں کوئی تعجب کی بات یوں نہیں کہ اس وقت اس کی عمر محض ۱۲ سال تھی۔لیکن اس نے اپنے آپ کو دوبارہ منظّم کیا اور مشہور شہر سمرقند پر قبضہ کرلیا جو کبھی تیمور لنگ کا دارالسلطنت ہوتا تھا۔اور پھر یہ شہر بھی اس سے چھن گیا لیکن پھر وہ فرغانہ کی طرف گیا اور اسے فتح کرلیا۔لیکن پھر اس کے دشمنوں نے یہ شہر اس سے جیت لیا۔پھر اس نے دوبارہ سمرقند فتح کیا۔اس بار صرف ۲۴۰ سپاہیوں کی مدد سے اس نے یہ کارنامہ انجام دیا البتہ قبضہ برقرار نہ رکھ سکا۔اب وہ اٹھارہ سال کا ہو چکا تھا۔بابر نے دو سلطنتوں کو آگے پیچھے جیتا اور کھویا لیکن وہ اب افغانستان کے پہاڑوں میں اپنی ماں، بہنوں اور چند سو ساتھیوں کے ساتھ بھٹک رہا تھا۔تین سال وہ اور اس کا گروہ جنگلوں میں گھوما پھرا اور ایک نئی سلطنت کی تلاش جاری رکھی۔بادشاہی کے فن سے وہ آگاہ تھا اور البتہ بادشاہ کے لقب کا متلاشی۔

ایک بچہ عمر میں اپنے سے بڑے جنگجوؤں کو جو اپنے گھروں سے باہر تھے سالہا سال تک سنبھالے رہے یہ کوئی آسان نہیں تھا۔جب تک کہ انہوں نے اسمیں کچھ دیکھا نہ ہو۔اور یقیناً بابر دوسروں کی ہمت کو پست کردینے کی حد تک توانا اور صحت مند تھا۔قصہ مشہور ہے کہ وہ دونوں بازوؤں سے مکمل صحت مند آدمیوں کو تھامے ندی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک چھلانگ سکتا تھا۔اس طرح کے پہلوان نما آدمی بالعموم فنون لطیفہ میں دلچسپی اور رومانوی طبیعتوں کے نہیں ہوتے۔جبکہ بابر میں یہ صفات موجود تھیں۔اپنی مہمات کے دوران بابر اپنے پاس ایک ڈائری ضرور رکھتا تھا اور اپنی زندگی کے آخر میں اس نے اپنی خودنوشت لکھی جو ترکی لٹریچر کی کلاسک مانی جاتی ہے۔پھر جب اس کے پوتے نے اسے فارسی زبان میں ترجمہ کرادیا تو وہ زیادہ معزز اور اعلیٰ درجہ کی زبان ہونے کی بنا پر یہاں بھی اسے بڑی شہرت ملی۔اس کتاب میں بابر نے اپنے آپ کو انتہائی

ایمانداری سے ظاہر کیا ہے مثلاً ایک اہم شکست کے بعد وہ لکھتا ہے کہ ''میں آنسوؤں پر قابو نہ پاسکا اور چیخ کر رو دیا'' کیا سخت آدمی اس بات کو تسلیم کر لیتا ہے۔ پھر اس نے اپنی شادی کا تذکرہ کیا ہے جو بزرگوں کی پسند سے کی گئی تھی اور اپنی بیوی کے لئے ہر ممکن کوشش کے باوجود کسی قسم کے جوش وخروش نہ ہونے کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے پاس ہفتہ میں ایک بار یا زیادہ سے زیادہ دوبار جاتا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ اس کی ماں اسے ڈانٹتی ہے۔ پھر وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ایک لڑکا جسے اس نے بازار میں دیکھا تھا۔ ''جوانی کے جذبہ اور خواہش نے مجھے ایک قسم کے دباؤ میں ڈال دیا جس کی وجہ سے میں کھلے میں گلیوں اور سڑکوں پر گھومتا پھرتا پھلوں اور انگوروں کے باغات میں چلا جاتا تھا۔ دوستوں اور اجنبیوں کے ساتھ بھی میں مہذّب رویہ اختیار نہ کر پاتا۔'' ے اس طرح یہ مستقبل کا عظیم بادشاہ ہمیں اپنی جوانی کے جذبات اور اپنی کمزوریوں سے متعارف کراتا ہے۔ لیکن یہ وہی شخص ہے جو دوبار سمرقند کو فتح کر چکا ہے اور اس سے دستبردار ہو چکا ہے۔

بھٹکتے پھرتے بابر اور اس کے ساتھی ایک بلند پہاڑ تک پہنچے تو دیکھا کہ نیچے وادی میں ایک خوبصورت شہر ٹکا ہوا ہے۔ بابر ایک بار پھر عشق میں مبتلا ہو چکا تھا۔ لیکن اس بار یہ شہر کابل کے عشق میں گرفتار ہوا تھا۔ لیکن بابر کہتا ہے کہ یہ عشق یک طرفہ نہ تھا۔ کابل نے بھی انھیں جذبات سے اسے خوش آمدید کہا۔ یہاں کے شہری اپنے بادشاہ سے نفرت کرتے تھے۔ انہوں نے بابر سے درخواست کی کہ وہ ان کا حکمراں بن جائے۔ کیا یہ ایک فاتح کا نامعقول سا پروپیگنڈا نظر نہیں آتا؟ ممکن ہے کہ یہی ہو لیکن اتنا میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں بابر کے تئیں کابل کی محبت آج بھی جاری ہے۔ عوام کے لئے اس نے بلندی سے نظر آنے والا باغ بنایا تھا وہ آج بھی عوام کا من پسند پارک ہے اور اس باغ میں بابر کی قبر ایک انتہائی مقبول مقبرہ ہے۔

بابر ۱۵۰۴ء میں کابل کا بادشاہ بنا اور اس طرح اب اس کے پاس ایک بنیاد تھی۔ اسکے دل میں سمرقند کا خیال ایک بار پھر آیا لیکن اس کو وہیں جھٹک دیا۔ اس کے مشیروں کے خیال میں اب جنوب کی سمت کوشش کرنا چاہئے تھی کہ دوسرے بہت سے ترک منگول فاتحین بھی کوشش کر چکے تھے۔ چنانچہ بابر دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوا۔ دہلی کا سلطان پانی پت کے میدان میں ایک لاکھ سپاہیوں کے ساتھ مدّ مقابل ہوا۔ دس کا سو سے مقابلہ تھا۔ اس میں خاصا داستانوی مواد ہے۔ مزید برآں سلطان کے پاس ہزار ہاتھی بھی تھے۔ لیکن بابر کے پاس بھی کچھ نیا تھا۔ گولہ بارود، نئی ٹکنالوجی پرانی جسمانی طاقت پر غالب ہوئی۔ بابر نے سلطان کو ایک تباہ کن شکست سے دوچار کر دیا اور یوں بابر دہلی پر قابض ہو گیا۔ عثمانیوں اور صفویوں کی طرح بابر اپنے دشمنوں پر بھاری پڑا کہ وہ نیزوں اور تیروں سے لڑ رہے تھے۔ جبکہ بابر گولیوں اور توپ کے گولوں سے۔ اور یوں تیر اور گولہ بارود سے لیس تیسری مسلم سلطنت اب نقشہ پر اپنی جگہ بنا چکی تھی۔

صفویوں سے زیادہ مغلوں کو یہ فائدہ ہوا کہ ان کی نسل میں طویل العمر اور ذہین جانشین ملتے رہے۔ اس کے اولین دوسوسال محض چھ جانشینوں کے حصّہ میں آئے۔ ان میں زیادہ تر جذبہ اور شوق سے سرشار

رومانٹک اور آرٹ کے شائقین تھے اور تین ملٹری میں ذہانت رکھتے تھے۔ ایک نظم وانصرام میں کمزور تھا لیکن اس کی بیوی نور جہاں نے تخت کے پیچھے سے حکمرانی کی۔ نور جہاں اس اعتبار سے کسی بھی بہترین مغل کے ہم پلّہ تھی۔ ایک تیز فہم تاجرہ، شاعرہ اور آرٹ کی سرپرست اور ایک غیر معمولی طور پر کھیلوں کی شوقین اور مزید اپنے وقت کی انتہائی تیز وطرّ ار سیاستداں۔

ابتدائی چھ جانشینوں میں سے محض ایک ناکارہ نکلا جو بابر کا اپنا بیٹا تھا۔ اس مدہوش رہنے والے شخص نے محض دس سال کے اندر وہ پوری سلطنت گنوادی جو اس کے باپ نے تعمیر کی تھی۔ جب وہ فرار ہوتے ہوئے افغانستان کے پہاڑوں سے گزر رہا تھا تو اس کی محبوب بیوی کے یہاں ایک بچہ کی پیدائش ہوئی جو آئندہ اکبر اعظم اور اپنے زمانے کا غیر معمولی بادشاہ ہونے والا تھا۔

انگلینڈ کی ملکہ الزبتھ کا ہم پلّہ اور ہم عصر۔ اکبر کے باپ نے کسی طرح سے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت بحال کرلی۔ اس وقت شہزادہ اکبر کی عمر بارہ سال کی ہورہی تھی۔ اس کے کچھ ہی دن بعد ایسا ہوا کہ اس کے باپ نے اذان کی آواز سنی تو وہ اپنی لائبریری میں زینہ کے بالکل اوپر کھڑا ہوا تھا۔ اسے یکا یک احساس ہوا کہ زندگی کا رخ بدلنا چاہیے چنانچہ وہ جلد از جلد نیچے اترا اور یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب وہ ایک پرہیز گار انسان کی طرح زندگی گزارے گا کہ اس کا پیر پھسل گیا اور وہ نیچے آگرا۔ اور اس دوران گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ جس کے نتیجہ میں اس کا مذکورہ کم عمر بیٹا تخت پر بٹھا دیا گیا۔

اکبر نے اپنے دادا کی سلطنت کو مستحکم کیا۔ اسے وسیع کیا اور نظم وضبط قائم کیا۔ اس سلسلہ میں اکبر نے جتنا کچھ کیا وہ اسے ایک عظیم بادشاہ بنانے کے لیے کافی تھا لیکن اس نے اس کے علاوہ جو کچھ کیا اس سے اندازہ ہوا کہ وہ ایک فاتح کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا۔

ابتداء میں اس نے اپنی سلطنت کی کمزوریوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کا مختصر سا گروہ پورے ملک پر حکمرانی کررہا تھا اور اس دوران محمود غزنوی کے دور سے کوئی پانچ صدیاں قبل ہندوؤں کو تاراج کرنے، لوٹ کھسوٹ اور انہیں قتل کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ اکبر نے اس صورتحال کو سختی سے بدلنے کی کوشش کی اور اس کے لیے ایک اصول کو نافذ کیا جو صلح کل کہلاتا تھا۔ اور اس سلسلہ میں اپنے خلوص کے اظہار کے لیے اس نے ایک ہندو سے شادی کی اور اعلان کیا کہ اس کا پہلا بیٹا سلطنت کا وارث ہوگا۔

اکبر نے حکومت کے تمام ادارے اور ذمہ داریاں مسلمانوں کے مساوی ہندوؤں کے لئے بھی کھول دیں۔ ایک ٹیکس جو ہر اس ہندو کو ادا کرنا ہوتا تھا جو مذہبی اداروں اور مقامات کی زیارت کرنے کے لئے جاتا اور یہ گذشتہ تمام مسلمان حکمرانوں کے دور سے چلا آرہا تھا۔ اکبر نے اسے ختم کردیا۔ جزیہ بھی ختم کردیا جو قرآن کے مطابق ہر غیر مسلم پر عائد کیا جاتا تھا جو اسلامی مملکت میں رہتے تھے۔ ان دو ٹیکسوں کی جگہ اس نے زمینی جائداد کے ہر مالک پر ٹیکس لگایا چاہے وہ کسی بھی مرتبہ کا شہری ہو۔ بظاہر اس وقت دنیا میں کوئی حکومت اشرافیہ پر کوئی ٹیکس

نہ لگاتی تھی۔ اکبر نے یہ روایت توڑ دی۔ اس نے فوج کو حکم دیا کہ ہر مذہبی مقام کی حفاظت کی جائے محض مذہب اسلام کے متعلق مقامات کی نہیں۔

اس عظیم مغل بادشاہ نے فوج کی مستقل اشرافیہ کو بھی ختم کر دیا جس پر اس سے قبل کے حکمراں انحصار کیا کرتے تھے اور ایک ایسا انتظامی ڈھانچہ قائم کیا جس میں ہر ذمہ دار ایک مخصوص وقت ہی کے لیے مقرر کیا جاتا تھا اور اس مدت کے خاتمہ پر اسے کسی اور ملازمت میں مقرر کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو اکبر وہ پہلا حکمراں ہے جس نے مشروط میعاد (Term limit) کے تصور کو متعارف کرایا اور اس طرح اس سلسلہ کی جڑ کاٹ دی جس کی وجہ سے ماضی میں علاقائی طالع آزما ابھرتے رہتے تھے اور حکمرانوں کے لیے یہ پریشانیوں کا باعث بنتے تھے۔

پیدائش اور تربیت کے لحاظ سے ایک مسلمان اکبر یقیناً اپنے آپ کو ایک مسلمان بادشاہ ہی سمجھتا تھا لیکن وہ دوسرے مذاہب کے بارے میں بڑی گہرائی سے سوچتا تھا۔ اس نے معروف ہندوؤں، عیسائیوں، یہودیوں، جینیوں، زرتشتی مذہب کے ماننے والوں اور بدھوں اور دوسروں کو دربار میں بلایا کہ وہ اپنے خیالات کی وضاحت کریں اور بحث کریں اور بادشاہ صرف سنے گا۔ آخر کار اکبر اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہر مذہب میں سچائی کے عناصر پائے جاتے ہیں اور کوئی ایک مذہب مکمل سچائی کی نمائندگی نہیں کرتا۔ چنانچہ اس نے ان تمام سے اچھی تعلیمات کو جمع کیا اور اپنے مذہب کو دینِ الٰہی یعنی خدا کے مذہب کا نام دیا۔

اس مذہب کے بنیادی عقائد میں اوّل خدا کی وحدانیت اور تمام قدرتوں اور طاقتوں کا منبع ہونا، دوسرا کائنات کا واحد مربوط اکائی ہونا جو یہ ظاہر کر رہی ہے کہ اسکا خالق ایک ہے، تیسرا مذہبی فریضہ یہ ہے کہ کوئی کسی کو نقصان نہ پہنچائے اور چوتھا طریقہ یہ کہ ہر شخص کسی مکمل شخصیت کو اپنا نمونہ عمل بنائے۔ ان شخصیتوں میں محمد رسول اللہ ایک شخصیت تھے شیعی امام بھی ایسی ہی شخصیت ہیں۔ اکبر نے یہ بھی کہا کہ میں خود بھی ایک ایسی ہی ذات ہوں۔

اس نئے مذہب کے تئیں جوش کے اظہار میں اس نے ایک نئے شہر کی تعمیر اسی کے نام سے منسوب کر دی۔ سرخ پتھر سے تعمیر فتح پور سیکری ایک ریگستان میں اکبر کے دل پسند صوفی بزرگ کے مزار کے جلو میں بن کر کھڑی ہوئی۔ اصل عمارت ایک پرائیوٹ ہال تھا جو عوام سے ملاقات کی غرض سے بنایا گیا تھا۔ ایک واحد بڑا کمرہ جس کی چھت بلند بالا گنبد نما تھی جس میں فرنیچر کے اعتبار سے بس ایک لمبا ستون تھا جو ارد گرد میں دیواروں کے سہارے بالکنی سے منسلک تھا۔ اکبر اس ستون کے اوپر بیٹھتا اور جو لوگ بادشاہ کے سامنے کوئی عرضداشت کرنا چاہتے۔ بادشاہ ان سے بالکنی میں بیٹھے ہوئے مخاطب ہوتا اور درباری افراد اور باقی لوگ جو سننا چاہتے وہ نچلے فرش سے سنتے۔

اس کا کریڈٹ اکبر کے جاہ و جلال اور اس کی دلفریب شخصیت کو جاتا ہے کہ اس کے مذہب کے خلاف

کسی نے بغاوت نہ کی۔ لیکن مذہب جڑ نہ پکڑ سکا جس کا یہ بتانا مقصود تھا کہ مسلمان کے لیے محض مسلمان ہونا کافی نہیں اور ہندو کے لیے محض ہندو ہونا کافی نہیں ہے۔ فتح پور سیکری کا شہر بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ پانی کے ذرائع خشک ہوئے چنانچہ شہر غیر آباد ہو گیا۔*

لیکن یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اکبر کے تصورات خود بخود پیدا نہیں ہو گئے تھے۔ بابر کے زمانہ سے اسلام اور ہندومت کے بہترین اجزا پر مشتمل کسی مخلوطہ کے لئے ایک تحریک ہندوستان میں جاری تھی جس کے لئے تصوف نے ہی راہ ہموار کی تھی۔ ۱۴۹۹ء میں ایک شخص نانک کو ایک تجربہ ہوا جس کے زیر اثر اس نے اعلان کیا ''نہ کوئی ہندو ہے نہ کوئی مسلمان۔'' گو کہ وہ پیدائشی ہندو تھا لیکن وہ تصوف سے متاثر ہوا اور اپنی زندگی کو ذات پات کے تصور کے خلاف جنگ کے لیے وقف کر دیا۔ اس نے ایک روحانی طریقہ کار کی روایت کا آغاز کیا جو استاد سے مبتدئ تک براہ راست پہنچ جاتی تھی جس میں ہندو اور مسلمان بزرگوں کے خیالات کی گونج تھی۔ گرونانک کے پیروکار آخر کار ایک مذہب کی شکل میں سکھ کہلائے۔

گرونانک کے ایک ہم عصر کبیر، جو پڑھے لکھے نہ تھے ایک ہندو بیوہ کے یہاں پیدا ہوئے اور مسلمان نورباف (جولاہا) کے یہاں پلے بڑھے۔ ان کی زبان سے گیت نکلنا شروع ہوئے جن سے ایسے عشق کا اظہار ہوتا تھا جس میں تصوف اور ہندومت کی چاشنی پائی جاتی تھی۔ لکھنے والوں نے ان کو لکھ کر ریکارڈ کر لیا۔ ان کے یہ گیت آج بھی محفوظ ہیں۔

عوامی سطح کے صوفی اور سنت مغل دور میں جوش وجذبہ کے گیتوں سے مقامی روایت کو مالا مال کر رہے تھے اور درباری شعراء فارسی زبان میں ایک پیچیدہ اور مابعد الطبعیاتی شاعری کی روایت کی تشکیل کر رہے تھے۔ اور اسی دوران مغل فنکار چھوٹی چھوٹی تصویروں اور نقوش ومصوری سے مزین کتابوں کی فارسی روایت کو اپنا رنگ دیکر آگے بڑھا رہے تھے۔

مغلوں کی تخلیقی قوتوں کا عروج فن تعمیر میں ظاہر ہوا۔ جس میں عثمانی دور کی ٹھوس پر شکوہ بزرگی اور صفویوں سے ہواداری اور ہلکا پن لیکر مغل فن کو ایک روپ دیا گیا تھا۔ پانچواں مغل بادشاہ شاہ جہاں اس میدان میں غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اپنے زمانہ میں وہ ایک عادل بادشاہ کہلاتا تھا لیکن اس کے فوجی اور سیاسی کارنامے کم ہی لوگوں کو یاد ہیں۔ لوگ جس چیز کے لئے اسے یاد کرتے ہیں وہ دراصل اس کی بیوی ممتاز محل کے

---

* فتح پور سیکری شہر آگرہ سے کوئی ۲۳ میل (۳۷ کلو میٹر) کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس شہر کو مغل بادشاہ اکبر نے ۱۵۶۹ء میں صوفی بزرگ سلیم چشتی کے اعزاز میں آباد کیا تھا۔ کتاب کے مصنف کو یہاں غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ شہر آج بھی اپنی تمام خوبصورت عمارتوں کے ساتھ موجود ہے۔ دارالسلطنت کی حیثیت میں یہ شہر ۱۵۶۹ء سے ۱۵۸۵ء تک قائم رہا تا آنکہ اکبر نے دارالسلطنت لاہور منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ فتح پور سیکری مغل فن تعمیر کے بہترین نمونہ کے طور پر آج بھی محفوظ ہے۔ سرخ پتھر سے بنی اس کی خوبصورت عمارتوں میں بلند دروازہ، جامع مسجد، صوفی بزرگ سلیم چشتی کا مقبرہ، دیوان عام، دیوان خاص، عبادت خانہ، مریم زمانی کا محل، نوبت خانہ، پنج محل، وغیرہ آج بھی قابل دید ہیں۔

تئیں شدید محبت کے اظہار کے طور پر محل کے زیور کی تعمیر ہے۔ ممتاز محل کا انتقال شاہ جہاں کے اقتدار کے ابتدائی دور ہی میں ہوگیا تھا۔ غمزدہ بادشاہ نے آئندہ بیس سال اس کے مقبرہ کی تعمیر میں لگائے۔ تاج محل ہنرمندی اور کمال وخوبی کا واحد اور نرالا شاہ کار ہے جو عالمی سطح پر اتنا ہی مشہور ہے جتنی ڈاونسی کی مونالیزا یا مائکل اینجلو کی Sistine chapel۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس بےنظیر فن پارے کی نقشہ گری اور تعمیر کے پیچھے جو فنکار چھپا ہوا ہے وہ دن کے اوقات میں سلطنت کے امور دیکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ تاج محل کی تعمیر میں بہت سے ماہرین اور فنکار شامل تھے لیکن یہ بادشاہ ہی تھا جو اس کی تمام تر تعمیراتی تفصیلات کی نگرانی کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں اس کی نظر استادانہ تھی۔[8]

شاہ جہاں کے بیٹے اورنگ زیب میں، جو اس سلسلہ کا آخری عظیم مغل بادشاہ تھا وہ اس نوع کی فنکارانہ صلاحیتوں سے بہت دور تھا۔ موسیقی، شاعری اور مصوری اسے سرد کر دیتی تھی۔ اس کا ذوق دراصل مذہب تھا۔ اور سب سے زیادہ چڑ اسے جس بات سے تھی وہ ہر معاملہ میں برداشت کی اُس روایت سے تھی جس کی آبیاری اس کا خاندان کئی صدیوں سے کرتا آرہا تھا اور جو اب ہندوستان کا چلن بن چکا تھا۔ اپنے باپ کی حکمرانی کے خاتمہ کے قریب اس نے اپنے باپ سے بھی جنگ کی اور طاقت کے زور پر حکومت پر قبضہ کرلیا۔ بوڑھے باپ کو ایک قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا جس کے کمرہ میں محض ایک ہی کھڑکی تھی اور وہ بھی اتنی اونچی کہ باہر کا کچھ بھی نظر نہ آسکے۔ پوری زندگی بادشاہ نے اسی چھوٹے سے کمرہ میں گزاری۔ انتقال کے بعد جب جیل کے نگراں اعلیٰ نے اس کمرہ کا معائنہ کیا تو دیکھا کہ ایک چھوٹا سا آئینہ ایک دیوار میں فٹ تھا معلوم ہوا کہ اس آئینہ کے ذریعہ شاہ جہاں باہر کی دنیا کو دیکھ لیا کرتا تھا اور اس بلند کھڑکی سے باہر کی جو چیز وہ دیکھ سکتا تھا وہ تاج محل تھا۔

اسلام کو پوری مغل سلطنت میں نافذ کرنے کا خیال اورنگ زیب کے ذہن پر مسلط تھا۔ وہ ایک ملٹری نابغہ تھا ویسا ہی جیسا کہ اس کا پردادا اکبر اور اکبر ہی کی مانند اس نے اونچاس سال حکومت کی۔ اس طرح اسے وقت اور اختیار دونوں ہی حاصل تھے جن کے ذریعہ وہ برصغیر میں گہری تبدیلیاں لاسکتا تھا۔

جو تبدیلیاں اس نے چاہیں اور جن کے لیے اس نے محنت کی وہ پردادا اکبر اعظم کے بالکل برعکس تھیں۔ جزیہ دوبارہ نافذ کر دیا۔ ہندوؤں پر ایک خاص ٹیکس نافذ کیا۔ اپنی فوج کے ذریعہ تمام نئے ہندو مذہبی مقامات کو تباہ کرادیا۔* ہندوؤں کو حکومتی عہدوں سے نکال دیا اور جنوبی ہند میں جو نیم آزاد راجپوتوں کی حکومتیں تھیں ان کے خلاف جنگ کی تاکہ وہ مکمل طور پر مغلوں کے زیر اثر آجائیں اور مسلم علماء کی انتظامیہ ان میں دخل ہو سکے۔

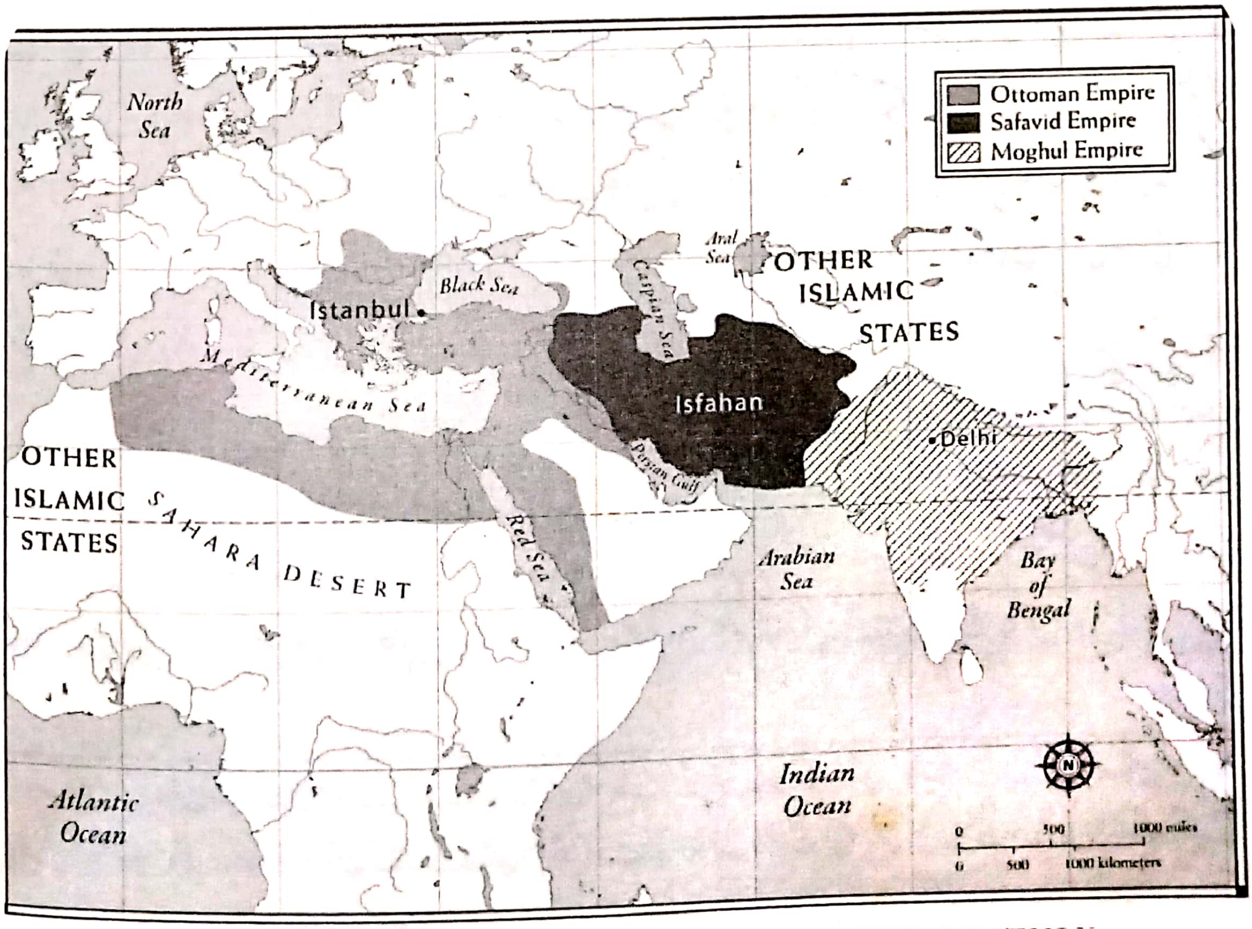
---

* ہندوؤں کے مذہبی مقامات کی تباہی کے بارے میں فاضل مصنف نے پوری بات نہیں لکھی۔ یقیناً منادر تباہ کئے گئے لیکن صرف وہ جو عیاشی اور ظلم کا اڈہ بن گئے تھے اور جن کے بارے میں متاثرین سے بادشاہ تک شکایت پہنچ جاتی تھی۔ متعدد مندروں کی دیکھ ریکھ کے واسطے اورنگ زیب نے بہت سی جائدادیں وقف کیں۔ جن کی دستاویزیں اور قانونی تحریریں آج بھی محفوظ ہیں۔

اورنگ زیب نے سکھوں کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی۔ گرونانک بہت سخت امن پسند تھے۔ لیکن اورنگ زیب کے عمل نے سکھوں کو ایک جنگجو گروہ میں تبدیل کر دیا اور اس وقت سے آج تک لمبا چاقو رکھنا ہر مذہبی سکھ کے لئے لازمی ہے اور ہر مذہب پسند سکھ مرد اس پر عمل کرتا ہے۔

حالانکہ عظیم مغل بادشاہوں کا یہ آخری کردار بہت شدت پسند تھا لیکن تاریخ میں مغل حکمرانی ایک شعلہ فشاں دور نظر آتی ہے۔ جب اس کا عروج تھا یعنی ۱۶۰۰ء میں تو یقیناً یہ دنیا کی عظیم ترین اور انتہائی طاقتور سلطنتوں میں شمار ہوتی تھی۔ ۱۶۰۰ء کے قریب کوئی سیاح جزائر انڈونیشیا سے ہوتے ہوئے بنگال اور ہندوستان سے گذرے اور ہندوکش کے دامن تک اور دریائے آمو کے شمالی میدانوں سے گذرتا ہوا فارس آجائے۔ عراق اور ایشیا مائنر سے گذرتے ہوئے بلقان تک جائے اور یہیں سے یا بحر اسود سے گذر کر کاکیشیا کے علاقہ تک اور جنوب کی طرف عرب اور مصر اور مراقس کے مغرب میں سفر کرے تو اس پورے سفر میں اسے بالعموم ایک مانوس دنیا نظر آئیگی۔ جس میں ایک ہی تہذیب رواں ہوگی۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کے سیاح کو سان فرانسسکو سے لندن اور پورے یوروپ میں ایک طرح کی تہذیب سے سابقہ پیش آتا ہے البتہ کہیں جرمن رنگ ہے کہیں سوئیڈن کا رنگ نمایاں ہے اور کہیں اسپین، برطانیہ اور ڈچ رنگ۔

البتہ سترھویں صدی کے سیاح کو عالم اسلام میں مختلف رسم ورواج ملتے۔ مختلف ریاستیں ملتیں لیکن ان کے باوجود وہ سرحدیں عبور کرتا اور مختلف حکومتی کارکنوں کو اپنے سفری کاغذات پیش کرتا اور جہاں بھی جاتا اسے متعدد مشترک عوامل کارفرما نظر آتے۔



سترہویں صدی کی تین اسلامی سلطنتیں

ان تینوں عظیم سلطنتوں اور انکے زیر اثر علاقوں میں اسے نظر آتا کہ ترکوں کو عام طور پر سیاسی اور ملٹری برتری حاصل ہے۔(بلکہ حکمراں صفوی خاندان بھی نسلاً ترک تھا اور قزلباش بھی ترک تھے)۔اس دنیا میں سیاح جہاں بھی جاتا معلوم ہوتا کہ تعلیم یافتہ لوگ عام طور پر فارسی زبان سے واقف ہیں اور اس قدیم لٹریچر سے بھی جو اس زبان میں موجود ہے۔ ہر جگہ اس کو عربی زبان میں اذان کی آواز سنائی دے گی اور ہر اس وقت جب لوگ کوئی مذہبی فریضہ انجام دیں گے اس وقت بھی عربی زبان اس کے کانوں میں پڑے گی۔

جہاں کہیں بھی یہ سیاح گیا اور محض ان تین عظیم سلطنتوں ہی میں نہیں بلکہ اسلام کی دور دراز جغرافیائی حدوں مثلاً انڈونیشیا، اور مراقش، پوری معاشرت میں ایسے اصول ضابطے اور اس طرح کی سفارشی اسناد لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اور پوری معاشرت میں سرایت کئے ہوئے تھے جو سرحدوں سے ماوراتھے۔ ہر معاشرہ میں اس کے علماء کی ایک طاقتور جماعت موجود تھی اور ان علماء کو کوئی منتخب نہ کرتا تھا بلکہ حصول علم کے لیے بھی انکی داخلی جذباتی توانائی ہی انھیں مہمیز کرتی تھی۔اور یہ علماء عام لوگوں کی زندگی میں بااثر تھے۔ ہر جگہ اس سیاح کو تصوف اور صوفی بھی نظر آتے۔ معاشرہ میں تاجروں کو بلند مقام پر پایا لیکن یہ افسروں اور عدالتوں سے منسلک لوگوں سے ذرا کم اہمیت کے سمجھے جاتے تھے۔عدلیہ اور اسکے حکام معاشرہ میں اپنا ایک علیحدہ لیکن اہم وجود رکھتے تھے۔

عام جگہوں پر گزرتے ہوئے سیاح کو عورتیں بہت کم نظر آئیں۔اس پورے سفر میں انڈونیشیا سے مراقش تک معاشرہ بحیثیت مجموعی دو دائروں میں سمٹا ہوا نظر آیا۔ایک عوامی دوسرا نجی دائرہ اور عورتوں نے اپنے آپ کو نجی دائروں ہی میں رکھا۔جبکہ عوامی دائرہ پر پورا پورا کنٹرول مردوں کا تھا۔

اس دنیا کے عوامی دائرہ میں سیاح نے جو بات نوٹ کی وہ یہ تھی عورتیں خرید وفروخت کرتے ہوئے ،ملاقاتوں کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے اور کچھ ایسا لباس پہنے ہوئے جس سے وہ نظر نہ آسکیں ضرور نظر آئیں۔بعض عورتیں ایسی بھی نظر آئیں جن کے چہرے کھلے تھے تو وہ سمجھ گیا کہ یہ عورتیں ذرا کم تر درجہ جیسے کسان عورتیں، خادمائیں، اور کسی قسم کی مزدور پیشہ عورتیں ہیں۔عورتیں جو کچھ بھی تھیں ان کے بازو، ٹانگیں اور سینہ کا درمیانی شگاف ظاہر نہیں ہوتا تھا۔مزید یہ کہ وہ ایک قسم کے کپڑے سے سر بھی ڈھکتی تھیں۔

مردوں کا لباس ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے تبدیل ہوتا رہا۔لیکن سیاح جہاں بھی گیا اس نے مردوں کو سرڈھکے دیکھا۔کپڑے ڈھیلے اور ایسے نہیں جن سے جسم کی بناوٹ ظاہر ہوتی ہو۔اور مزید یہ کہ وہ اوپر سے کوئی ایسا کپڑا اور پہنتے کہ جب وہ نماز کی ادائیگی میں سجدہ ریز ہوں تو ان کے اندر پہنے ہوئے کپڑے نظر نہ آتے۔

اس دنیا میں ہر طرف فن خطاطی کو بڑی عزت وشرف سے دیکھا جاتا تھا۔مصوری میں حقیقت نگاری (بمقابلہ تجریدی اور زیبائشی) محض اتفاقیہ تھی بجز زیبائشی کتابوں میں۔الفاظ چاہے تحریری ہوں یا تقریری، اہمیت کے حامل تھے انہیں تسلیم کیا جاتا تھا۔

جہاں جہاں سے یہ سیاح گزرا اس نے دیکھا کہ ہر شہر دیہاتوں کا مجموعہ ہے۔جسمیں بڑی سڑکیں

ہیں۔کوئی شہر یونانی طرز پر مربع کی شکل میں نہیں پایا گیا تھا۔ ہر آبادی کا اپنا ایک بازار ہر شہر کی اپنی ایک شاندار مسجد تھی جس میں مینار اور گنبد تھے جنکی تزئین بالعموم چمکدار ٹائلوں سے کی گئی تھی۔

اگر سیاح کو کسی اجنبی سے گفتگو کا موقع ملے تو اسے محسوس ہوگا کہ اس کے اور اس اجنبی کے درمیان بہت سے اساطیری حوالے مشترک ہیں۔ مثلاً دونوں ابراہیمی روایت کی اہم شخصیات سے واقف ہیں آدم، داؤد، موسیٰ، نوح اور اسی طرح دوسرے۔ دونوں محض محمد کے بارے میں ہی نہیں بلکہ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کے بارے میں نہ صرف واقف ہیں بلکہ ان کے بارے میں اور کچھ ان کی شخصیات کے بارے میں رائے بھی رکھتے ہیں۔ تاریخ کے بڑے واقعات کا علم بھی مشترک ہے۔ مثلاً عباسیوں کے بارے میں اور یہ بھی کہ سنہرا دور شاید عباسیوں کا دور تھا اور انہیں یہ بھی معلوم کہ منگول کون تھے اور انہوں نے کیسی تباہی مچائی تھی۔

۱۶۰۰ء میں دنیا کے کسی بھی حصہ کا عام آدمی یہی سمجھتا تھا کہ دولت اسلامیہ اور اس سے ملحق سرحدی علاقے ہی دراصل ''دنیا'' ہیں یاشکاگو یونیورسٹی کے مورخ مارشل ہگسن (Marshal Hodgson) کے بقول ''ہمارے دور کی سولہویں صدی میں مریخ سے آیا ہوا کوئی مسافر یہی سوچتا کہ انسانی آبادی بس مسلمان ہونے ہی کو ہے''۔[9] لیکن مریخی کو غلط فہمی ہوتی۔ یقیناً تاریخ کے دھارے نے رخ بدل لیا اور اس میں صلیبی جنگوں اور یورپ میں جو کچھ ہوا اسکا بڑا دخل ہے۔

باب : ۱۱

اوراس دوران یورپ میں

(۶۹۸ تا ۱۰۰۸ھ، ۱۲۹۱ تا ۱۶۰۰ء)

آخری بار صلیبیوں کا حملہ مصر پر ہوا اور ۱۲۹۱ء میں مملوک نے انہیں نکال باہر کیا لیکن یورپ میں یہ جدوجہد آنے والے سالوں میں کافی دن تک باقی رہی۔ کچھ تو مذہبی جوش میں مبتلا فوجی گروہ تھے جو رومن چرچ کے زیر اثر پیدا ہوئے تھے۔ مثلاً Templars بین الاقوامی بینکرس بن گئے۔ Knights-Hospitaller نے Rhodes کے جزائر پر قبضہ کرلیا اور پھر اپنے مرکز کو مالٹا منتقل کر دیا اور یہاں سے بحری قزاقوں کی طرح سرگرمیاں کرتے رہے۔ بحر روم سے گزرنے والے مسلمان جہازوں کو لوٹتے اور پریشان کرتے۔ ایسے ہی ایک گروہ Teutonic Knights نے Prusia کے خاصے حصے پر قبضہ کرلیا جن کی حکمرانی پندرہویں صدی تک باقی رہی۔

اوراس دوران یورپی مسلسل اس کوشش میں رہے کہ عالم اسلام پر اور حملے کیے جائیں۔ اور حملے ہوئے بھی لیکن ان میں پہلا جیسا جوش وخروش نہ تھا۔ اور کچھ تو آتے آتے ہی ختم ہو گئے اور بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنا رخ ہی بدل لیا۔ جنہیں تاریخ میں شمالی صلیبی (Northern) کہا جاتا ہے انہوں نے Slavs اور بالٹک قومیتوں کے بت پرستوں کو نشانہ بنایا۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی جنگیں ان یورپی فرقوں کے خلاف بھی ہوئیں جنکے بارے میں یہ خیال تھا کہ یہ گمراہ فرقے ہیں۔ پوپ نے اس سلسلے میں جوش وخروش پیدا کیا اور مختلف بادشاہوں نے اسے عملی جامہ پہنایا۔ ایسی جنگوں کو بھی صلیبی جنگ کہا گیا۔ مثلاً فرانس میں ایک طویل صلیبی جنگ ایک مسیحی فرقہ Albigensians کے خلاف ہوئی۔ پھر لائبریا کے خلاف ہوئی جسمیں عیسائیوں نے ۱۴۹۲ء تک صلیبی جنگ جاری رکھی تا آنکہ غرناطہ سے مسلمانوں کا مکمل صفایا ہو گیا۔

صلیبی جنگوں کی روح کافی دنوں تک ذہنوں پر حاوی رہی جسکی ایک وجہ اصل صلیبی جنگیں تھیں جو مسلمانوں کے خلاف لڑی گئیں۔ انہوں نے مشرق کے تئیں دروازے کھول کر بعض نئے امکانات اور ان کے لئے ترغیب پیدا کر دی تھی۔ مثلاً ہندوستان سے آنے والی اشیاء کے لئے یورپ میں رغبت پیدا ہوئی۔ اسی طرح یہاں سے اور آگے کے جزائر جنھیں یورپیوں نے Indies کہا، کی اشیاء بھی متعارف ہوئیں۔ مثلاً ہندوستان کی ایک چیز جس سے یورپی متاثر ہوئے وہ یہاں کی شکر تھی۔ ملیشیا اور انڈونیشیا کی کالی مرچ اور جائفل اور اسی طرح کے دوسرے مسالے تھے، High MiddleAge کے باورچی جن کے استعمال میں بڑے مشاق تھے۔ وہ جو کچھ بھی تیار کرتے اسمیں گرم مصالحے ضرور ڈالتے چاہے وہ کوئی ذائقہ دار شے یا میٹھی ڈش ہی کیوں نہ ہو۔[1] مسئلہ یہ تھا کہ صلیبی جنگوں نے ان اشیاء کی اشتہا تو پیدا کر دی لیکن یہ بھی ہوا کہ عیسائی تاجروں کے

تئیں ایک نفرت بھی پیدا ہوئی جو مصر سے آذر بائجان تک یکساں تھی اور ظاہر ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے عیسائی تاجروں کے لیے ان علاقوں میں آنا جانا آسان نہ تھا۔ یہ بھی ممکن نہ تھا کہ وہ ان اشیاء تک براہ راست پہنچ جاتے اور مسلمان دلالوں کو نظر انداز کر دیتے۔ کیونکہ راستہ مسلم علاقے سے گزرتا تھا۔

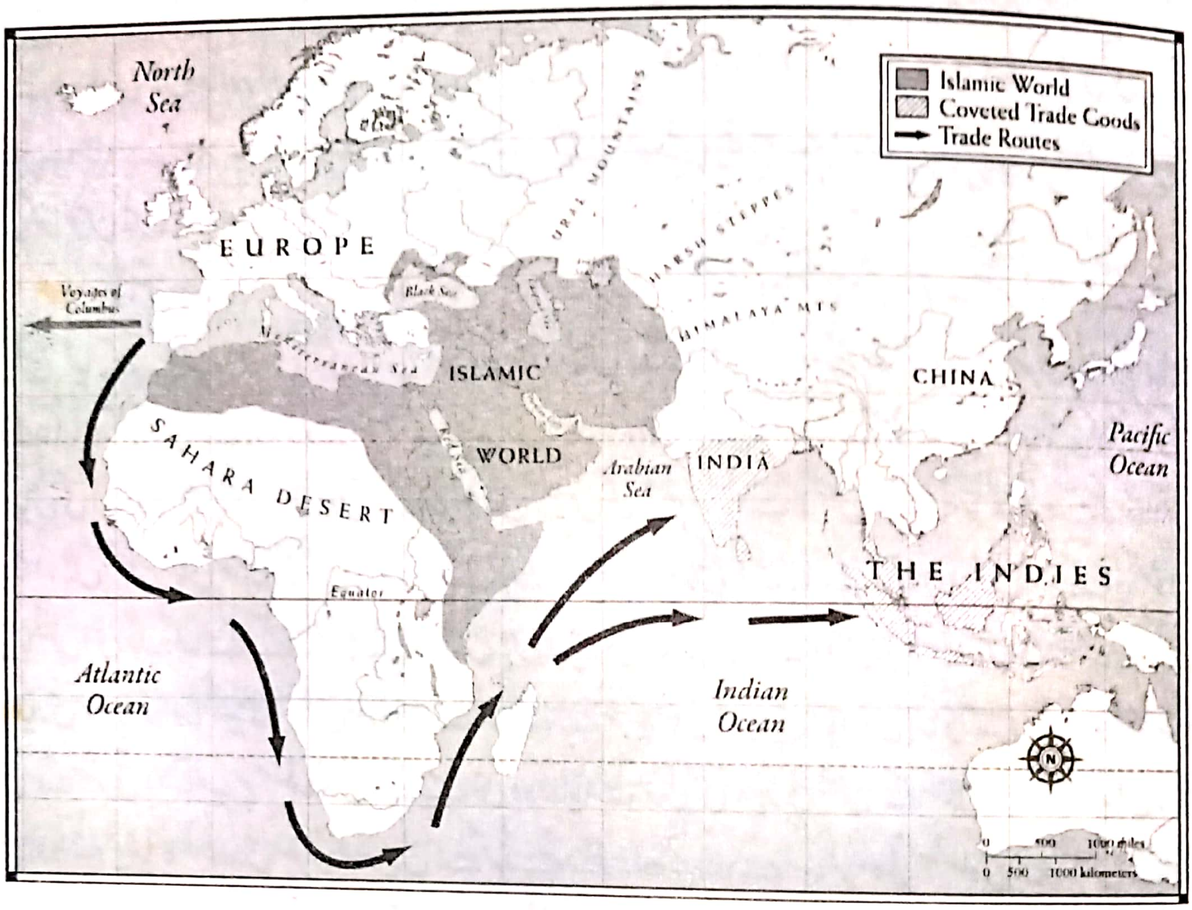
یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ میں مارکو پولو نے چین کا سفر کیا تھا۔ لیکن وہ اور اس کے ساتھیوں نے اس سفر میں نامناسب اور رواج سے ہٹ کر طریقے اختیار کیے تھے۔ یورپیوں کو اس پر تعجب تھا کہ وہ نہ صرف چین گیا بلکہ واپس بھی آ گیا۔ زیادہ تر لوگوں کو مارکو پولو کے اس دعویٰ پر یقین نہیں تھا کہ وہ واقعی چین کا سفر کر چکا ہے۔ اس کی سفری مہمات پر مشتمل کتاب ''The Millions'' کے بارے میں یورپیوں کا خیال تھا کہ اس میں لاکھوں جھوٹ بیاں کئے گئے ہیں۔ بحر اسود کے مشرقی کنارے مسلمانوں کے قبضہ میں تھے، کاکیشیا کے پہاڑوں پر مسلمان قابض تھے اور کیسپین کا بحری ساحلی سلسلہ بھی ان کی ملکیت تھا۔ بحر احمر اور اس تک پہنچنے کے تمام راستے مسلمانوں کی حکمرانی میں تھے۔ یورپی تاجروں کی مجبوری یہ تھی کہ وہ ہندوستان اور Indies کے تجارتی سامان شام اور مصر کے مسلمان تاجروں ہی سے خرید سکتے تھے جو ظاہر ہے کہ ان اشیاء کی قیمت میں اس حد تک اضافہ کر کے ہی فروخت کرتے تھے جتنا مارکیٹ میں ممکن ہوتا۔ اور خاص طور پر عیسائی تاجر، صلیبی جنگوں میں مسلمانوں پر جنکے ظلم وستم کی یادیں ختم نہیں ہوئی تھیں ان کے لئے مسلمانوں کے رویہ میں تاجرانہ نرمی بھی شاید نہ آتی ہو۔ اور پھر یہ بھی کہ فرنگی عیسائیوں نے منگولوں کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف اتحاد قائم کر لیا تھا۔

اس ماحول میں مغربی تاجر کیا کرتے؟

ایسی صورتحال میں صلیبی روح کا گرمایا ہوا لہو تلاش وجستجو کی تحریک میں ظاہر ہوا۔ مسلمان ان پیچیدہ راستوں پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ تو گئے جو دنیا کے قدیم بازاروں کو باہم مربوط رکھتے تھے لیکن صدیوں تک ان کے حکمران اور عوام اس امر سے غافل بیٹھے رہے کہ یورپی لوگ بحری اسفار کے سلسلہ میں زبردست تجربہ اور ہنر پیدا کر رہے تھے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ صلیبی جنگوں کے بعد یورپیوں میں شمالی علاقوں سے وابستہ سمندری راستوں سے حملہ کرنے والے Viking بھی شامل تھے جو بحری راستوں میں گہرے تجربات رکھتے تھے اور شمالی بحر اوقیاس کو اپنی Dragon boats کے ذریعہ پار کر کے Green Land تک پہنچ چکے تھے۔ انہیں کی ایک لہر انگلینڈ پر حملہ آور ہوئی جہاں ان کو Northern کہا جانے لگا جو بتدریج Norman بن گیا اور جس علاقے میں یہ بسے وہ نارمنڈی کہلایا۔

لیکن یہ کام محض Viking ہی نے نہیں کیے۔ ہر وہ شخص جو اسکینڈ ینا وا اور جنوبی یورپ کے درمیان اکثر وبیشتر سفر کرتا اس کو ایسے جہاز تیار کرنا ہی ہوتے تھے اور انہیں بڑے بڑے طوفانی سمندروں اور شمالی اٹلانٹک کے بلند سمندروں میں ان جہازوں کو سنبھالنے اور محفوظ رکھنے کا گر سیکھنا ہی ہوتا تھا۔ چنانچہ مغربی یورپ کے لوگوں کے لئے سمندر کوئی مسئلہ نہ تھا۔ جب ایسے منجھے ہوئے لوگ رعایا میں موجود ہوں تو بادشاہوں کے عزائم کا بلند ہو جانا فطری بات ہے۔ چنانچہ کئی بادشاہوں نے سوچا کہ ایسے راستے تلاش کیے جائیں کہ یورپ اور

مشرقی ایشیا کا پورا خشک علاقہ نظر انداز ہو جائے اور یوں وہ مسائل ہی نہ رہیں جو مسلمانوں کی وجہ سے پیدا ہوتے تھے۔ اور اس طرح انہوں نے ہندوستان اور دوسرے جزائر تک پہنچنے کے لیے سمندری راستہ تلاش کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔



یورپیوں کی ہند کے لیے بحری راستوں کی جستجو

یورپی اشرافیہ میں ایک بڑا نام پرتگال کے پرنس ہنری کا ہے جس نے مذکورہ بالا کوششوں کی کفالت میں بھرپور تعاون کیا۔ گوکہ وہ خود ایسی کسی جستجو میں راست شامل نہیں ہوا لیکن اس کے باوجود اسے مغرب میں Henry the Navigator کہا جاتا ہے۔ پرنس ہنری کا شاہ پرتگال سے گہرا تعلق تھا لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ وہ یورپ کے امیر ترین لوگوں میں سے تھا۔ ایک بحری کپتان کی اس نے مالی کفالت کی کہ وہ افریقی ساحل کو راستہ کی تلاش میں کھنگالے۔ پرنس ہنری کے خطوط اور دعووں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو صلیبی سمجھتا تھا اور موروں (اسپینی مسلمان) کے خلاف فتوحات حاصل کر کے اپنے آپ کو عظیم عیسائی بادشاہ کی حیثیت میں متعارف ہونے کی خواہش رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ حق کی حفاظت کے لئے نفوس یکجا ہوں۔[2] اس کے ملاحوں اور جہاز رانوں نے ایسے بہت سے نفوس ان سیاہ رنگت اجسام میں تلاش کئے جن کا اپنا غلامی کا کاروبار بھی تھا۔ چنانچہ یہ ہوا کہ ہنری نیویگیٹر اب ہنری غلاموں کا تاجر میں بدل گیا۔ غلاموں کی تجارت کے ساتھ جب پرتگیزی جنوب کی جانب بڑھے تو مختلف طرح کی تجارتی اشیاء سے ان کا سابقہ پیش آیا

جس میں سونے کی دھول، نمک، شتر مرغ کے انڈے، مچھلی کا تیل۔۔۔اور ظاہر ہے کہ فہرست طویل ہوتی گئی ۔نئی نئی تجارتی اشیاء کے برابر ملتے رہنے کے نتیجے میں صلیبیوں کے خواب معیشت میں پیوست ہو گئے ۔اور انھیں کی وجہ سے یورپ اپنے دَور کی دریافت میں آکر کھڑا ہو گیا۔شاید سب سے زیادہ ڈرامائی دریافت ۱۴۹۲ء میں ہوئی جب کرسٹوفر کولمبس بحر اوقیانوس سے ہوتے ہوئے بھٹک کر امریکہ جا پہنچا۔ وہ ہندوستان پہنچنے کے لئے راستے کی تلاش میں تھا اور اس کے اس سفر کی کفالت اسپین کے فرمانروا فرڈی نینڈ اور ملکہ ازابیلا نے کی تھی ۔اور عیسائی بادشاہ نے آیبیریا کے مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ کرتے ہوئے انہیں مکمل طور پر اس علاقے سے نکال کر اسپین میں متحدہ عیسائی حکومت قائم کی تھی۔

کولمبس جب جزائر غرب الہند پہنچا تو مشہور ہے کہ اسے لگا کہ وہ انڈیز یعنی جنوب مشرقی ایشیا کے جزائر میں پہنچ گیا ہے۔ جب اس کی غلطی واضح ہوگئی تو ہندوستان کے مشرق میں واقع جزائر کو جزائر شرق الہند (East Indies) اور کریبین کے جزائر کو جزائر غرب الہند یعنی (West Indies) کہا جانے لگا۔ اکثر مسلمانوں کو اس بڑی کامیابی کی زیادہ خبر نہیں تھی ۔عثمانیوں کے رکارڈ میں کولمبس کی عظیم دریافت کا محض سرسری سا تذکرہ ہے۔ حالانکہ ۱۵۷۰ء میں بعض عثمانی نقشہ نویسوں نے دنیا کے بہت سے واضح اور صحیح نقشہ بنا لیے تھے اور دونوں امریکہ ان نقشوں میں بالکل اسی جگہ دکھائے گئے تھے جہاں وہ واقع ہیں۔ یہ وہی زمانہ ہے جب اسپین، میکسیکو میں نئی سلطنت بنانے کی تیاری کر رہا تھا اور انگلینڈ، فرانس اور دوسرے ممالک نے مزید شمال میں اپنی آبادیاں بسالی تھیں۔اسی دوران عالم وسطیٰ کے مشرقی اختتامیہ پر مسلمانوں نے پہلے ہی وہ دریافت کر لی تھی، یورپی جس کے متلاشی تھے۔مسلمان تاجر ملیشیا اور انڈونیشیا کا سمندری سفر کئی صدیوں سے کر رہے تھے۔اور بہت سے مسافر صوفی سلسلوں سے متعلق تھے اور اس طرح اس علاقے میں پہلے یورپی کی آمد سے بہت قبل اسلام ایسٹ انڈیز میں قدم جما چکا تھا۔

خاصی دلچسپ بات یہ ہے کہ پرتگیزی، اسپینی، انگریز، ڈچ اور دوسری شمالی یورپی اقوام میں جستجو اور کھوج کا جوش وخروش پیدا ہونے سے قبل جنوبی یورپ کے لوگ پہلے ہی سمندر میں اپنے پرانے تجربہ کی بدولت اپنی پوزیشن مستحکم کر چکے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ انکی تہذیب کا ارتقاء ہی سمندری اسفار کے درمیان ہوا تھا اور انکی جہاز رانی کی صلاحیتیں اور تجربہ کی تاریخ رومی، ان سے پہلے یونانی، ان سے قبل مائسینی، اور ان سے قبل کریٹیائی اور فونسین تک پہنچتی تھی۔

چودھویں صدی عیسوی میں Genovese اور* Venetians کے درمیان بحر روم کے راستے تجارتی مقابلہ آرائی ہو رہی تھی۔ان کے پاس زبردست بحری بیڑہ تھا اور پانی میں اطالوی سخت مزاحمت کر سکتے تھے۔ Venetians قسطنطنیہ میں زبردست تجارت کرتے تھے اور جب عثمانیوں نے قبضہ کر لیا تو انہوں نے بڑا جرأتمندانہ اقدام کیا اور استنبول میں تجارتی آفس کھولا۔

---

* اٹلی کا ایک بندرگاہ شہر جنیوا (Genova) اور معروف شہر وینس (Venice) کے باشندوں کی طرف اشارہ ہے۔

بحر روم کی تجارت نے اٹلی کو مالا مال کر دیا جس کے نتیجہ میں شہری ریاستیں قائم ہوئیں یہ ریاستیں محض Venice اور Genoa میں ہی نہیں تھیں بلکہ Florence,Milan اور دوسرے شہروں میں بھی تھیں۔ اٹلی میں زمین کے بجائے پیسہ اب اشرافیہ کا نشان بن گیا۔ تاجروں کے ہاتھوں میں طاقت آنے لگی۔ Medicis of Florence اور Sforzas of Milan جیسے خاندانوں نے ملٹری اشرافیہ اور جاگیرداروں کی جگہ لے لی۔ دولت میں بڑی تیزی سے ہوتا ہوا اضافہ، کچھ کر گزرنے کا بڑھتا ہوا رجحان، شہری آبادی میں رنگارنگی، چھوٹے چھوٹے مطلق العنان گروپوں میں شان وشوکت کا بڑھتا ہوا رجحان، شہرت اور عزت کے حصول کی تیز تر تمنا ان سب نے مل کر ایسی زبردست تحریک اور جوش وخروش پیدا کر دیا تھا کہ شاید تاریخ میں ایسا کہیں دیکھنے کو نہیں ملا۔ کوئی فنکار یا آرٹسٹ جس کے اندر اپنے شاہ پارے فروخت کرنے کی صلاحیت ہو تو اس زمانہ کی اٹلی میں وہ کوئی بھی معرکہ سر کر سکتا تھا۔ اس کی صلاحیتوں کی سرپرستی کرنے کے لیے متعدد ممکنہ سرپرستوں میں مقابلہ آرائی ہو جاتی تھی۔ ڈیوک، کارڈینل بلکہ پوپ بھی ایسے فنکاروں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے مقابلہ آرائی میں شامل ہو جاتے تھے۔ مثال کے طور پر Michelangelo اور Leonardo da vinci جیسے فنکار بھی اسی طرح درباروں سے متعلق ہوئے تھے۔ بس شرط یہ تھی کہ ان کے فن پارے نہ صرف انتہائی خوبصورت ہوں بلکہ بڑے رتبہ کی علامت کا اظہار کرتے ہوں۔ اٹلی سے آرٹ، اختراعات، تخلیقی صلاحیت اور کامرانیوں کے سوتے پھوٹ پڑے اور اس وجہ سے اسے اطالوی نشاۃ ثانیہ کہا گیا۔

اس دوران کتابیں بھی فیشن میں آ گئیں۔ دورِ تاریکی میں سوائے مذہبی لوگوں کے شاید ہی کوئی پڑھنا جانتا ہو اور مذہبی لوگ محض بائبل پڑھتے اور مذہبی شعائر کی ادائیگی کی خاطر پڑھنا سیکھتے تھے۔ مثلاً شارلیمن کے زمانہ میں جرمن نژاد عیسائی مذہبی ذمہ داروں کے یہاں لاطینی ایک متبرک زبان مانی جاتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس زبان میں مذہبی شعائر ادا ہوتے تھے اور یہ تصور تھا کہ خدا یہی زبان بولتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر لاطینی زبان بگڑ گئی تو ہماری دعائیں خدا کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ چنانچہ انہوں نے اس زبان کی حفاظت کی خاطر ان مظاہر پرستوں مثلاً Cicero کی زبان، ان کے تلفّظ اور اس کی ساخت وگرامر میں مہارت حاصل کی تا کہ پرانی زبان محفوظ رہ سکے۔ وہ اس امر کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ وہ جو کچھ کہیں خدا تک پہنچ جائے۔ Cicero کو پڑھتے ہوئے وہ اس بات کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے تھے کہ مصنف کیا کہہ رہا ہے۔ توجہ تو محض اس کے انداز اور ادائیگی پر رہتی مبادا ان کے بت پرستانہ یا مظاہر پرستانہ تصورات زبان کو ناپاک نہ کر دیں۔ اس کے نتیجہ میں یہ ایک مردہ زبان بن گئی جو محض رسومات کی ادائیگی کے لیے مناسب تھی۔ خیالات کے اظہار اور تبادلہ خیالات کے لیے یہ زبان مناسب نہ ہو سکی۔[34] البتہ کتابوں اور اسی طرح کی چیزوں کے احترام کے نتیجہ میں بعض چرچوں اور مونٹیسریز کے تہہ خانوں اور نیچے کے کمروں میں یہ چیزیں محفوظ رہیں۔

پھر بارہویں صدی میں جب عیسائی علماء اور اسکالرز اندلس آنے جانے لگے تو بہت سی ایسی کتابوں سے

انکا سابقہ پڑا جو یونانی مسوّدوں کے عربی ترجموں سے لاطینی میں ترجمہ ہوئی تھیں اوران میں خاص طور پر ارسطو اور افلاطون کی کتابیں تھیں۔ زیادہ تر یہ کام طلیطلہ (Toledo) میں ہوا تھا جہاں ترجمہ ایک صنف کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ یہ کتابیں مغربی یورپ پہنچیں اور یوں ان کی رسائی چرچ اور مونیٹسر یز کی لائبریریوں میں بھی ہونے لگی۔

اندلس میں عربی زبان میں جو کتابیں ملیں ان میں مسلمان فلسفیوں مثلاً ابن سینا اور ابن رشد کی شرحیں تھیں۔ ان کی مرکزی توجہ یونانی فلسفہ اور وحی اسلامی میں یگانگت کی تلاش تھی۔ بظاہر اس مسئلہ میں عیسائیوں کو کوئی دلچسپی نہ تھی چنانچہ مسلمانوں نے یونانی فلسفہ اور وحی کی یگانگت کے سلسلہ میں جو کام کیا تھا اس سے صرف نظر کرتے ہوئے انہوں نے اس فلسفہ اور عیسائیت میں یگانگت کی تلاش کو مرکز توجہ بنایا۔ اس کوشش کے نتیجہ میں وہ پرشکوہ عالمانہ فلسفہ سامنے آیا جو ٹامس اکیوناس، ڈونس اسکوٹس (Duns Scotus) اور دوسرے فلسفیوں کی محنت کا نتیجہ تھا۔ قدیم یونانی فلسفہ سے مسلمانوں کا تعلق یورپی کلچر کی تاریخ میں بالکل مٹا دیا گیا۔

اب یورپی اسکالرز نے مونیٹسر یوں پر توجہ مرکوز کی کیونکہ انکی لائبریریوں میں کتابیں موجود تھیں اور پھر مستقبل کے طلبہ نے بھی مونیٹسر یوں سے وابستہ ان اسکالرز سے استفادہ کے لئے یہاں آنا جانا شروع کیا۔ جن اسکالرز کے پاس پیسہ نہ تھا لیکن مطالعہ کا شوق تھا وہ درس وتدریس کے ذریعہ اپنی ضروریات پوری کرتے۔ انہیں مونیٹسر یوں سے وابستہ علمی مجالس تشکیل ہوئیں جو بتدریج یورپ کی اوّلین یونیورسٹیوں کی شکل میں نتیجہ خیز ہوئیں۔ ان میں اولین نوٹرڈیم کیتھڑڈل پیرس میں قائم ہوئی۔ اور دوسری علمی مجلس بالآخر یونیورسٹی آف ناپلس (University of Naples) تھی۔ پھر انگلینڈ میں آکسفورڈ یونیورسٹی قائم ہوئی اور جب یہاں کے اسکالرز میں اختلافات لڑائی کی شکل اختیار کر گئے تو ایک گروپ طیش میں آ کر کیمبرج چلا گیا اور اپنی ایک علیحدہ علمی مجلس قائم کر لی۔

یونیورسٹیوں کی ان ابتدائی شکلوں سے وابستہ اسکالرز کو جب یہ اندازہ ہوا کہ مستقبل کے طلباء کا علمی معیار اتنا نہیں کہ وہ باقاعدہ مطالعہ کر سکیں تو انھوں نے ابتدائی کورس کا ایک سیٹ تیار کیا تا کہ طلباء آغاز کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ ان کورسوں میں علم فصاحت، گرامر، منطق اور ارتھمیٹک جیسے مضامین شامل تھے۔ اور ان کا مقصد محض یہ تھا کہ طلباء کو پڑھنا لکھنا اور غور کرنا آ جائے۔ جن طلباء نے یہ کورس کامیابی سے پاس کر لیا وہ Baccalaureates کہلائے جو لاطینی زبان کی ابتداء کرنے والوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس طرح اب وہ واقعی پیش نظر مضامین مثلاً دینیات، فلسفہ، علم الادویہ یا قانون کی تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن آج Baccalaureates کی ڈگری لبرل آرٹس کالج سے چار سالہ گریجویشن کرنے کے بعد ہی ملتی ہے۔

یورپ میں دولت آئی تو کچھ لوگ ہمہ جہت ہو کر مطالعہ اور لکھنے پڑھنے میں لگ گئے اور کچھ لوگ آرٹ میں دلچسپیاں لینے لگے۔ یونانی خیالات تو پس منظر میں تھے ہی کہ نئے خیالات نے یورپیوں کے ذہن وتصورات میں جگہ بنانی شروع کر دی۔ یونانیوں نے کہا تھا ''انسان ہی ہر چیز کا آئینہ ہے'' چنانچہ مظاہر پرستوں کے

مندروں میں خدا مختلف دیوی دیوتاؤں کا مجموعہ تھا جو انسان نما تھے اور ان کا آپسی اور انسانوں کے ساتھ ربط وتعامل ڈرامائی طرز پر ہوتا تھا۔ یونانیوں کی عالم فطرت میں دلچسپیاں بڑی گہرائی تک گئی تھیں اور ایسا ہی کچھ انسان کے موجود لمحے بھی ان کی توجہ کا مرکز تھے۔ انہوں نے عالم فطرت کے مظاہر میں پائے جانے والے سلسلوں اور یکسانیت کے امتیازات کو سمجھنے اور انکا ادراک حاصل کرنے میں بڑی کامیابیاں حاصل کی تھیں جو ان مظاہر کی تشریح کرنے کے لئے پہلا قدم ہوتی ہیں۔ چنانچہ یورپیوں کا قدیم یونانی لٹریچر اور افکار کا مطالعہ لامحالہ انہیں فطرت اور اس کے مظاہر کی طرف لے گیا اور زمین پر پائی جانے والی حیات کے رازوں کو سمجھنے اور انہیں منکشف کرنے میں ان کی دلچسپیاں بڑھنے لگیں۔ سرگرمیوں کا یہ رخ چرچ کے مروّجہ فکر سے ہم آہنگ نہیں تھا جو زوال روم کے بعد عہد وسطیٰ کی عیسائیت پر غالب تھا اور جس کے مطابق یہ مادّی کائنات ایک شر تھی۔ اس دنیا میں زندگی کا اصل مقصد صرف وہ تگ ودو تھی جو بس یہاں سے انسان کو نکالنے میں کامیاب کرادے۔ مطالعہ کے لیے آخرت ہی صحیح موضوع تھا اور اس سلسلہ میں پڑھنے اور مطالعہ کے لیے صرف وحی الٰہی اور اس کی تفسیریں ہی کافی تھیں۔ لیکن منظر عام پر آنے والے یہ نئے انسان دوست اسکالرز اپنے آپ کو عیسائی افکار وخیالات کا مدّ مقابل نہیں سمجھتے تھے اور نہ ہی وہ الحاد کی طرف جارہے تھے۔ لیکن چرچ کے ارباب حل وعقد کو ان کے افکار وخیالات میں خطرہ کی بو آئی اور انہوں نے یہ اندازہ کرلیا کہ ہوا کا رخ کیا ہے۔

واضح رہے کہ عیسائیت کا ارتقاء زوال پذیر روم کے پس منظر میں ہوا تھا۔ اس میں مراتب کی جو درجہ بندی پائی جاتی تھی اس میں رومی سلطنت کی درجہ بندی کے اثرات واضح تھے۔ چنانچہ جب شاہی نظم ٹوٹا تو باقی بچے ہوئے چرچ کے نظم نے اس کی جگہ خود بخود لے لی اور اس خلا کو پر کیا اور تہذیبی زندگی کی معاونت کے لئے اس کا اپنا قالب بتدریج غالب ہوتا گیا۔ بازنطینی بادشاہ کیونکہ شاہانہ درجہ بندی میں اعلی ترین مقام کا حامل ہوتا تھا وہ خود بخود ہی عیسائی درجہ بندی میں اعلی ترین مقام پر فائز سمجھا جانے لگا، مختلف بشپ اس کے زیرِ اثر تھے اور جس طرح گورنر اس کے تحت تھے چرچ کا ہیڈ بھی اس کا ماتحت تھا۔ مسیحی مذہب کے عقائد کی تدریج تمام بشپ مل کر اس میٹنگ میں کرتے تھے جو وقتاً فوقتاً اسی مقصد سے بلائی جاتی تھی اور ان کی اصلاح بھی اس نوع کی میٹنگ میں ہوتی۔ البتہ بادشاہ اس سلسلہ میں آخری اختیار رکھتا تھا۔

عیسائیت اور رومی سلطنت میں اتنا گہرا تعلق تھا کہ جب سلطنت دو حصوں میں ٹوٹ گئی تو چرچ بھی تقسیم ہوگیا۔ مشرق میں بادشاہ کو اب بھی مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ مغرب میں بادشاہ کا لقب بھی ختم کردیا گیا۔ سیاسی سطح پر پورا براعظم چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگیا جن پر اکثر وبیشتر جنگجو سرداروں کی حکمرانی تھی۔ اور اس طرح چرچ ہی وہ واحد ادارہ باقی بچا جو اس پورے علاقے کی ثقافتی یکسانیت اور اتحاد کو باقی رکھ سکتا تھا۔ ثقافتی یکسانیت کے تحت مختلف زبانیں بولنے والے لوگ اور مختلف ریاستوں کے رہنے والے آپس میں ربط قائم کرسکتے تھے اور ایک سے دوسرے علاقے میں سفر کرسکتے تھے۔ ان مقاصد کے تحت دیکھا جائے تو چرچ میں

یکسانیت، عقائد کا عالمگیر سطح پر قابل فہم ہونا اور قابل تسلیم ہونا ضروری تھا۔ اس مقصد کے لیے چرچ بڑی سنجیدگی سے گمراہیوں کو عقیدہ سے نکال ڈالنے کے لیے متحرک ہو گیا۔

صلیبی جنگوں کے زمانہ تک تو مغربی یورپ ایسے لوگوں کو قتل کی سزا دیتا ہی تھا جو گمراہ ہوتے تھے۔ اور اس کا طریقہ یہ تھا کہ جن لوگوں کے عوام میں دیے گئے بیانات عقیدہ کی اس وقت کی تشریح کے خلاف ہوتے انہیں کھنٹیوں پر لٹکا دیا جاتا اور نیچے سے آگ لگا دی جاتی۔

جب عام زندگی پر چرچ کی پکڑ اور مضبوط ہوئی تو روم کا بشپ مغربی یورپ کی ایک اہم شخصیت بن گیا۔ عام لوگ اسے پوپ کہنے لگے کیونکہ وہ اسے عیسائیوں کے باپ کے مانند سمجھتے تھے۔ مشرق میں قسطنطنیہ کا اسقف سب سے بڑی شخصیت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اسقف اور بھی بہت تھے البتہ وہ ان تمام مساوی اہمیت کے حامل اسقفوں میں اولین تھا۔ مغربی یورپ میں پوپ کو تمام بشپوں کے اوپر اقتدار حاصل ہو گیا۔ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں کیتھولک حلقوں میں یہ بات چل نکلی کہ پوپ معصوم ہے یعنی اس سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔

اس دوران چرچ کی یہ کوشش رہی کہ اس کے اثرات پورے براعظم اور اندرون تک وسیع ہو جائیں اور اس طرح گاؤں گاؤں اور شہر شہر کے محلوں میں ایک پادری اور ایک چرچ ہوتا جو ایک ہی انداز میں ایک طرح کی رسومات اور ایک جیسی زبان میں ادا کرتا۔ درجہ بندی باقاعدہ طور پر مزید منظّم ہو گئی۔ ہر راہب ایک بشپ کو جوابدہ تھا۔ ہر بشپ ایک آرچ بشپ کو پھر کارڈینل کو اور کارڈینل پوپ کو جوابدہ تھے۔

لیکن جب صلیبی جنگیں ماند پڑنے لگیں تو یہ درجہ بندی ٹوٹنے لگی۔ یہاں وہاں جو ریفارمرس تھے انہوں نے چرچ کی اس اہمیت اور طاقت پر سوال اٹھانا شروع کر دیئے۔ چودھویں صدی میں آکسفورڈ کے ایک پروفیسر John Wycliffe نے انجیل کا ترجمہ عام انگریزی زبان جسے لوگ انتہائی عامیانہ اور پست زبان سمجھتے تھے میں کر کے پوری عیسائی دنیا کو ایک سکتے میں مبتلا کر دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عام آدمی یہ جان سکے کہ کتاب اس سے کیا مطالبہ کرتی ہے۔ چرچ کے ذمہ دار یہ سمجھنے کو تیار نہ تھے اور یہ برداشت نہ کر سکے کہ عام آدمی کو آخر بائبل سمجھنے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ ان کے لیے پہلے ہی سے ایسے پادری موجود ہیں جو یہ کام ان کے لیے کرتے ہی ہیں۔

Wycliffe نے آگے بڑھ کر یہ بھی کہا کہ پادریوں کو تو غربت اختیار کرنی چاہیے جیسے پیغمبر ہوا کرتے تھے اور یہ کہ جو زمین چرچ اور مونیٹسری کو عطیہ میں دی گئی ہے اسے واپس لے لینا چاہیے اور اسے دوسرے دنیاوی مقاصد میں استعمال کرنا چاہیے۔ اس طرح کے خیالات چرچ کے لئے بڑے ہی توہین آمیز تھے لیکن Wycliffe کے سیاسی روابط بڑے گہرے تھے۔ اس کے خلاف کوئی کاروائی تو نہ ہو سکی اور وہ اپنی فطری عمر زندہ رہا، لیکن اس کی موت کے کوئی چار دہائی بعد پوپ نے اس کی ہڈیاں قبر سے نکلوائیں ان کو ریزہ ریزہ کرایا اور ایک دریا میں پھیلا دیا۔ گویا غم وغصہ ابھی تک باقی تھا۔

اور یہ یوں بھی باقی رہا کہ Wycliffe کے خیالات ختم نہیں ہو گئے تھے۔ مثلاً محض ایک نسل بعد

Bohemian پادری Johann Huss نے Wycliffe کے خیالات اپناتے ہوئے کہا کہ بائبل پر ہر ایک کا حق ہے کہ اسے وہ اپنی زبان میں پڑھے۔اس نے ترجمہ کے ایک عظیم الشان پروجیکٹ کا آغاز کیا اور جب چرچ نے اس کے خلاف قوانین کے حوالے سے اس کے عمل کو غلط قرار دیا تو اس نے بائبل کے حوالے ان کے سامنے رکھ دیے اور اعلان کیا کہ چرچ کاونسل پر بائبل فتحیاب ہے۔ یہ بات چیت زیادہ آگے بڑھ چکی تھی۔ چنانچہ Huss کو گرفتار کرلیا گیا اور اسے شعلوں کی نظر کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ اس کے ذریعہ کیے گئے بائبل کے ترجموں کی وہ تمام کاپیاں بھی جلا دی گئیں جنھیں وہ عوام میں پھیلا رہا تھا۔مختصر یہ کہ عیسائیت نے اپنے اصلاحی سفر کے آغاز میں وہ کیا جو اسلام نے ابتدائی صوفی حلاّج کے خلاف کیا تھا۔

مذہب میں ضابطہ پرستی متعارف ہونے کے نتیجہ میں چرچ طاقتور ہوا اور پورا یورپ ثقافتی یگانگت کے نتیجہ میں متحد ہو گیا۔لیکن یہ اُس بنیادی تجربہ سے انسان کو متعارف نہ کرا سکا جو مذہب کی علّت وجود ہے۔تھیولوجی کے ایک جرمن پروفیسر مارٹن لوتھر نے بڑی باقاعدگی اور باریک بینی سے مذہب کے اسی فسادِ فکر پر انگلی رکھی۔ مارٹن لوتھر دراصل قصور گناہ کی اذّیت میں مبتلا تھا۔ وہ چاہے کتنے بھی اچھے کام کر ڈالے وہ بہرحال دوزخ کی طرف گامزن تھا۔مسیحی تصور میں بعض رسومات انسان کو گناہوں سے پاک کر دیتی تھیں لیکن لوتھر کے مطابق ایسا ہو نہیں رہا تھا۔اس نے ہر کوشش کی روزہ رکھا، خود تازیانہ زنی کی، ربط باہمی اور نفس کشی و توبہ اور اس کے بعد پھر جب پادری یہ بتاتا کہ وہ اب پاک ہو چکا ہے تو اسے اس کی بات پر یقین نہ آتا۔پس وہ اپنے دل میں جھانک کر دیکھتا تو لگتا کہ وہ اب بھی ناپاک ہے۔اس کے دل میں اب بھی گناہ موجود ہے وہ محسوس کرتا۔

پھر ایک روز لوتھر کو بڑی گہری بصیرت کا تجربہ ہوا۔اس کی نجات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسے یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ محفوظ ہو گیا ہے۔ جب تک یہ یقین نہ ہو تو پادری کچھ بھی کہتا رہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر اسے یہ یقین ہو جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ پادری کیا کہہ رہا ہے۔اس کے نتیجہ میں ایک بہت بڑا سوال اٹھ گیا، پادری کی ضرورت ہی کیا ہے؟ وہ ہمارے درمیان ہی کیوں ہو؟

اس یقین نے لوتھر کو گرفتار کرلیا کہ نجات پنشن کے مانند نہیں ہے جو ملازمت کے نتیجہ میں حاصل ہو جاتی ہے۔یہ تو ایک انعام ہے جسے صرف قبول کیا جا سکتا ہے اور وہ بھی صرف اعمال کے ذریعہ جو کہ ایک داخلی عمل ہے۔اس کا تعلق سعی، اور خارجی اعمال یا واقعات سے نہیں۔

اس داخلی بصیرت سے لیس جب لوتھر نے اپنے اردگرد کی دنیا پر غور کیا تو دیکھا کہ لاتعداد اعمال کے ذریعہ نجات کی تلاش میں عوام مشغول ہیں۔اور افسوسناک بات یہ کہ اعمال کا تعین ایسے افراد کرتے ہیں جو مالدار اور ایک منظّم، ضابطہ پرست بڑا گروہ ہے جو رومی چرچ سے منسلک ہے۔اس صورتحال نے اسے دہشت اور کراہیت سے بھر دیا۔اس لیے کہ اسے جو بصیرت ملی تھی اس کے مطابق عوام کی یہ تمام کوششیں بے کار جاری تھیں۔ وہ اعمال جو چرچ نے متعین کیے تھے ان میں زیادہ پریشان کن اور تکلیف دہ عمل وہ تھا جس کے مطابق

جب کوئی گناہوں سے توبہ کر لیتا تو اس کی دنیاوی سزا معاف کر دی جاتی تھی جس کے بارے میں چرچ کا یہ دعویٰ تھا کہ اسے اس کا اختیار حاصل ہے کہ قیمتی امداد یا چندہ کے عوض دنیاوی سزا کو معاف کر سکتا ہے۔ یہ روایت صلیبی جنگوں کے زمانے سے شروع ہوئی تھی جب پوپ نے اس عنایت کا اعلان کیا کہ جو لوگ کافروں سے جنگ کے لیے عہد کریں ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے اور انہیں کوئی سزا بھی نہ دی جائے گی۔ پھر جب یہ حکومتیں ختم ہوئیں اور کوئی امکان باقی نہ رہا تو یہ عنایت نامے زر بطور چندہ کے عوض ملنے لگے۔ اس صورتحال میں جب کہ انتظامیہ بہت وسیع ہوگئی ہو اور اخلاقی بگاڑ پھیل رہا ہو اس وقت یہ ہی ممکن ہے کہ کسی دور دراز کے پادری نے خود ہی چندہ وصول کر کے کسی گناہ گار کو یہ عنایت نامہ دیا ہو۔ جو بھی ہو اس کو ذرا مارٹن لوتھر کے زمانہ میں جا کر دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ عنایت نامہ عطا کرنے کا پورا عمل محض فساد زدہ نہیں رہ گیا تھا بلکہ کفارہ سے بچنے اور جنت میں داخل ہونے کا ایک آسان راستہ بن گیا تھا۔

جنت میں داخل ہونے کے لئے لوگ رقم ادا کریں یہ تو انتہائی خراب بات ہے ہی۔ لیکن لوتھر کو اس پورے عمل میں اس سے بھی بری بات نظر آئی۔ اگر نجات کا حصول انسان اور خدا سے براہ راست تعامل کا متقاضی ہے تو چرچ کا رشوت لیکر اس دروازے کو کھول دینا جس کے بند رکھنے کا انہیں کوئی اختیار نہیں۔ محض فساد نہیں بلکہ بدترین چوری اور بدترین دھوکہ ہے۔

۱۵۱۷ء کی ایک رات کو لوتھر نے ایک اشتعال انگیز دستاویز تیار کر کے Wittenberg کے چرچ کے گیٹ پر ٹھوک دی۔ جس میں چرچ کی کارستانیوں پر ۹۵ نظریات اور ۱۹۵ اعتراضات شامل تھے۔ لوتھر کی اس تحریر نے راتوں رات سنسنی پھیلا دی اور یوں پروٹیسٹینٹ انقلاب کی چنگاری پھوٹ پڑی۔

پروٹیسٹنٹ اصلاحات کوئی ایک چیز نہ تھی۔ ایک بار لوتھر نے دروازے کھولے تو یہ جوش مختلف سمتوں میں پھیلنے لگا۔ متعدد مصلحین نے علیحدہ علیحدہ تحریکات شروع کیں اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف فرقے بن گئے جن میں ہر ایک کے نظریات میں انکے مزاج کا رنگ واضح تھا۔ البتہ چار نکات ان سب میں مشترک تھے۔

- ☆ نجات محسوس کی جا سکتی ہے۔ جیسے 'اب' اور 'یہاں' کا تجربہ
- ☆ نجات کا حصول صرف ایمان ہی کے ذریعہ ممکن ہے
- ☆ خدا سے تعلق کے لیے کسی انسانی واسطے کے ضرورت تھی
- ☆ مذہب کے متعلق ہر وہ چیز جس کی انسان کو ضرورت ہے وہ اسے بائبل میں مل جائیگی اسے جاننے کے لئے لاطینی جاننا ضروری ہے اور نہ ہی چرچ کونسل کے نتائج و ہدایت اور نہ ہی راہبوں اور علماء کے بیانات۔

ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو پروٹیسٹنٹ اصلاحات اسی طرح کی بے اطمینانی کا شاخسانہ تھیں جنھوں نے اسلام میں تصوف کی بنا ڈالی تھی*۔ (وضاحت اگلے صفحے پر) البتہ مغرب میں کوئی غزالی نہ اُبھر سکا جو راسخ العقیدگی اور انسان کی ذاتی مذہبی دریافتوں کا مرکب تیار کر سکتا۔

ایک دوسرے اعتبار سے دیکھیں تو پروٹسٹنٹ اصلاحات ابن حنبل اور ابن تیمیہ کی تحریکوں سے مماثلت رکھتی نظر آتی ہیں جو تصوف سے بالکل مختلف ہیں۔ مسلمان اسکالرز کی طرح پروٹیسٹنٹ مصلحین نے عقائد کی تقسیم میں بعد کے تمام اضافوں کو غیر قانونی قرار دیا اور بنیادی منبع یعنی بائبل سے راست تعلق قائم کرنے کی اپیل کی۔

لیکن بنیادی طور پر پروٹیسٹنٹ تحریک میں اس جیسا بالکل نہ ہوا جیسا اسلام میں ہوا تھا۔ پروٹیسٹنٹ میں پوپ اور چرچ کے خلاف بغاوت ہوئی تھی لیکن اسلام میں نہ تو پوپ تھا اور نہ ہی چرچ کہ ان کے خلاف بغاوت کی جاتی۔ مغرب میں مذہبی مصلحین نے کیتھولک چرچ کے غلبے کو تسلیم نہیں کیا اور نہ ہی وہ اس لئے اُٹھے تھے کہ موجود چرچ کے بجائے کوئی نیا چرچ قائم کریں۔ ان کا اصل مسئلہ فرد کی اہمیت تھا۔ اس جستجو میں وہ خود عیسائیت کے خلاف کھڑے نظر نہیں آتے کیونکہ عیسائیت اپنی اصل کے اعتبار سے تو ہے ہی فرد کے لئے یعنی فرد کی نجات کے لیے۔ لیکن اسلام تو ایک معاشرہ کے لیے تھا یعنی جماعت اور کمیونٹی کس طرح کام کرے۔ کوئی ایسی تحریک جو ایک فرد کو مرکز توجہ بنائے اور فرد کے مذہبی عمل کی آزادی کو محفوظ کرنے کی کوشش کرے کہ وہ جس طرح اور جیسے بہتر سے بہتر طریقے سے چاہیں اس پر عمل کریں یہ بنیادی طور پر اسلام کے بنیادی عقیدہ کی خلاف ورزی ہوگی۔

فرد کا استحقاق جو پروٹیسٹنٹ تحریک نے یقینی بنایا تھا اس کے نتائج مذہبی دائرہ سے کہیں زیادہ باہر محسوس کیے گئے۔ چرچ کے غلبہ کے توڑنے کا ایک مطلب ہوا ہر چرچ کے غلبہ کا خاتمہ۔ یہ درست ہے کہ سولھویں و سترہویں صدی کے پروٹیسٹنٹ مصلحین کے پیش نظر مذہبی جدوجہد ہی تھی۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ ہر فرقہ فرد اور خدا کے رشتہ کے بارے میں ایک واضح اور محدود تصور رکھتا تھا۔ غالباً ان مصلحین نے یہ نہ سوچا تھا کہ وہ ایمانیات کے میدان میں عوام کو بالکل ہٹ کر سوچنے کی حوصلہ افزائی کررہے ہیں اور سوچنے کی یہ آزادی تخلیقیت سے جاملتی ہے۔ نجات کی جستجو کو فرد کا دائرہ کار کہکر دراصل وہ فرد کو یہ استحقاق دے رہے تھے کہ خدا کے بارے میں وہ جس طرح چاہیں سوچیں چہ جائیکہ مصلحین کا منشاء کچھ بھی ہو۔ فرد کے حق کو خدا کے دائرہ میں تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کسی بھی دائرہ اور کسی بھی چیز کے بارے میں آزادانہ سوچ رکھنے کا حق رکھتے تھے۔

اصلاح کے اس پہلو نے جب یونانی فکریات کے ساتھ تعامل کیا تو مظاہر پرست لاطینی مصنفین اور کچھ عرب مفکرین کے ساتھ ہی یہ تعامل ہوا اور اس کے نتیجہ میں ایک مشترکہ بارآوری ہوئی۔ انفرادی طور پر جب یہ سوچا گیا کہ ہم خود اپنے طور پر نجات حاصل کرسکتے ہیں تو دراصل وہ خدا کی فطرت اور اس کی دنیا کے بارے میں آزادانہ طور پر سوچ رہے تھے۔ ان کے ادھورے سوالات اور پنہاں رازوں کے متعلق کوئی رائے قائم کررہے تھے اور ان ادھورے خیالات اور ادھورے جوابات کو ملا کر ایک راستہ قائم کرنے کے لیے نئے طریقے ڈھونڈ رہے تھے۔

* اسلام میں تصوف کی ابتدا کے پس منظر میں اس زمانہ کا بڑھتا ہوا تعیش اور دنیا پرستی، دنیاداری اور اخلاقی بے راہ روی تھی جبکہ پروٹسٹنٹ تحریک کے پس منظر میں مسیحی مذہبی مقتدرہ کا عام عیسائیوں، ان کی معاشرت اور زندگی پر بڑھتا ہوا غلبہ تھا۔ تصوف مذہب سے بڑھتے ہوئے فاصلہ کا شاخسانہ تھا تو پروٹسٹنٹ مذہب کی ایک خاص شکل کے بڑھتے ہوئے غلبہ کا۔ پروٹسٹنٹ فکر کتاب سے راست تعلق قائم کرنے کی خواہش کا نتیجہ تھی جبکہ تصوف کتاب سے نہیں بلکہ تصوف کے نمائندوں سے قربت کا داعی تھا دونوں میں یہ فرق واضح رہنا چاہیے۔

اگر چرچ اب بھی اتنا ہی بااثر ہوتا اور ہر جگہ ہوتا تو ان نئے آنے والے تصورات کے بارے میں یہ سوال ضرور اٹھتا کہ ان کی توجیہ کس طرح ہوگی؟ ایمان، عقیدہ سے کس طرح میل کھاتا ہے؟ کوئی اگر یہ سوال کرتا کہ اوپر سے گرنے والی ہر چیز نیچے ہی کیوں آتی ہے اوپر کیوں نہیں جاتی تو ہر کسی کے اندر کا چرچ فوراً ہی یہ سوال کرتا کہ اس سوال کا جواب میرے اچھا عیسائی بننے میں کیا مدد کرے گا"۔ یہ سوال ایک بھاری سامان کی مانند ہے جسے ہر وقت اور ہر جگہ انسان اگر لئے لئے پھرے تو اس کی رفتارِ فکر کی حد اس بوجھ سے ہی متعین ہوگی۔

اس سامان سے آزادی حاصل کر لینے کے نتیجہ میں ہی کوپرنیکس یہ کہہ سکا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور اس انتہائی سادہ لیکن جرأت مندانہ مفروضہ نے ستاروں اور سیاروں کی حرکت سے متعلق تمام تر سوالات کے جواب دے دیئے۔ بس جو سوال رہ گیا وہ یہ تھا کہ خدا نے اس کائنات کو اپنی بہترین تخلیق کو چھوڑ کر کسی اور کے گرد گھومنے کے لیے کیوں کہا؟

اگر سوال کا یہ دوسرا حصہ ہمارے پیش نظر نہ ہو تو پہلے سوال کے بارے میں ہم زیادہ بہتر اور آسان انداز میں کام کر سکتے ہیں۔ فطرت کے بہت سے راز ایسے ہی تھے جن کی تشریح کہیں زیادہ آسان ہوگئی جب ہم نے اپنی تشریح کو عقیدہ کے احکامات سے علیحدہ رکھا۔

بہت سے مفکرین اس طرزِ فکر کو عقیدہ کے منافی نہیں سمجھتے۔ وہ بس یہ سوچتے ہیں کہ عقیدہ ایک چیز ہے اور فطرت کی تشریح دوسری چیز۔* یہ دو علیحدہ علیحدہ میدانِ تحقیق ہیں اور انہیں کہیں ملنا نہیں ہے۔ فطرت کی

* بنیادی طور پر بحث دراصل عقیدہ کے Scope اور عقلِ انسانی کے دائرہ کار سے متعلق ہے۔ قرآنی فکر میں ایک اہم بات یہ ہے کہ عقائد انسانی فطرت کا حصہ تو ہیں لیکن ایک ایسی بنیادی انسانی ضرورت کی طرح جس کی عقلِ انسانی نہ تو تشکیل کر سکتی ہے اور نہ اس کے مشتملات کی بابت کوئی رائے قائم کر سکتی ہے اور اسی ضرورت اور انسانی عقل کی نارسائی کی بنا پر اللہ نے اسے اپنے ہی ذمہ رکھا ہے۔ چنانچہ قرآن ان بنیادی عقائد کی وضاحت خود کرتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بقیہ وہ تمام میدان جن کے بارے میں قرآن خود کچھ نہیں کہتا بلکہ عقلِ انسانی کے لئے مکمل طور پر کھول دیتا ہے کہ وہ اپنے مشاہدہ اور تجربہ وغیرہ کی روشنی میں رائے بھی قائم کر سکے اسے بدل بھی سکے۔ ان دونوں میدانوں کو سمجھنا اور ان کے فرق کو جان لینا انتہائی ضروری ہے۔ اس فرق کو نہ سمجھ پانے کی بنا پر کیتھولک اور پروٹسٹینٹ میں اختلاف ہوا تھا۔ اسلام میں نہ صرف قرآن ان میدانوں میں امتیاز قائم کرتا ہے بلکہ احادیثِ رسول بھی اس کی وضاحت کرتی ہیں۔ رسول اللہ کا یہ فرمان کہ تم دنیا کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہو اسی طرف اشارہ کرتا ہے اور کھجور کی کاشت سے متعلق آپ کی حدیث ہو یا دورانِ حمل بیویوں سے مجامعت اور ہونے والی اولاد کی صحت و تندرستی سے متعلق ایک خیال پر احبابِ رسول کا ایرانی اور رومی شہسواروں کا حوالہ۔ یہ دونوں اس طرح کے معاملات میں تجربہ اور مشاہدہ کی بالاتری ثابت کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی واضح رہنی چاہیئے کہ اس وضاحت کے باوجود اسلامی تاریخ میں ایسا ہوتا رہا ہے کہ عالمِ فطرت کی تحقیق و جستجو کے دوران ہم نے عقائد کی اپنی تشریح کو حاوی کر لیا ہے اور اس طرح تحقیق کے سفر کو روک دیا ہے۔ اس سلسلہ میں امام غزالی کا یہ نقطہ نظر بھی سامنے رہنا چاہیئے کہ اگر کوئی تحقیق قرآنی حکم سے ٹکراتی نظر آتی ہے اور یہ علمی معیار سے معتبر بھی ہے تو ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ شاید قرآن کے منشاء کو ہم ابھی سمجھ نہیں سکے ہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ خود ہماری تحقیق میں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہو تو امید ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ دور ہو جائیگی۔ چنانچہ ہر تحقیق کو حتمی نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ تحقیق چاہے عالمِ فطرت کی ہو یا قرآن کے فہم سے متعلق عالمِ فطرت کی تحقیق تو یقیناً زماں و مکاں کی قید میں ہوتی ہی ہے لیکن فہمِ قرآن بھی اس سے آزاد نہیں ہوتا۔ اس وضاحت کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو عقائد کی دنیا ایسا بوجھ نہیں بنتی جسے اتارے بغیر کائناتِ فطرت کا آزادانہ مطالعہ ممکن نہ ہو۔ عالمِ اسلام میں سائنس کا ارتقاء اسی فضا کا نتیجہ تھا۔ لیکن بعض تشریحات اور وضاحتوں نے خاص طور پر غزالی کے بعد ایسی صورتحال پیدا کر دی تھی جو بتدریج انھیں نتائج تک پہنچی جن سے مغرب گذرا تھا۔ اور یوں کتاب کی تشریح سے تحقیق و جستجو کو منسلک کر کے فکری آزادی محدود ہوگئی۔

جستجو کو عقیدہ کے دائرہ کار سے باہر کرنے کے عمل نے اہل یورپ کو چونکا دینے والے اور حیرت میں ڈالنے والے سائنسی نظریات سے آشنا کرایا اوراس طرح تحریک اصلاح کے بعد کی دو صدیاں دریافتوں اور اختراعات کی صدیاں بن گئیں۔

مثلاً فرانسس بیکن اور رینے دکارت نے ارسطو کے طرز تحقیق کو الٹ دیا اور سائنسی طریقہ کار (سائنٹیفک میتھڈ) کی وضاحت کی۔انہوں نے اور بعض دوسرے مفکرین نے کائنات کے میکانکی ماڈل کی بنیادیں تلاش کیں اور انہیں مستحکم کیا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ ہر کسی طبعی واقعہ کے پیچھے طبعی جواز ہوتے ہیں۔دکارت اور گلیلیو نے اس ارسطاطیسی تصور کہ ہر چیز مٹی، ہوا، پانی اور آگ سے مل کر بنی ہے کو بھی غلط ثابت کیا اوراس کی جگہ مادّہ کی ایٹمی تھیوری پیش کی جو آگے چل کر جدید کیمسٹری کی بنیاد ثابت ہوئی۔

Andreas Vesalius نے پہلی بار جسم انسانی کی اِناٹمی کا نقشہ تیار کیا اور William Harvey نے دوران خون کی دریافت کی۔ان کی اور دوسری تحقیقات نے جدید میڈیسن کی بنیاد ڈالی Antonie Van Leeuwenhoek نے مائیکرو آرگنزم کی دنیا دریافت کی جو Pasteur کو بیماریوں کی Germ Theory کا تصور پیش کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔ Robert Boyle کے کام کا آغاز ہوا جو مشہور زمانہ Thermodynamics کے چار اصولوں کی دریافت کی بنیاد بنا۔اس تحریک کا مطلب تھا کہ کسی بھی سسٹم میں انرجی کے کام(work) میں تبدیل ہونے کے پیچھے چار اصول کارفرما ہیں اور سسٹم میں خرگوش کے Digestive tract سے لے کر اس کائنات کی پیدائش تک کے تمام واقعات شامل ہیں۔

اور ان تمام میں سب سے بڑے سائنسدان آئزک نیوٹن کو ہم نہیں بھلا سکتے جس نے Differential Calculas ایجاد کیا اور محض تین فارمولوں کے ذریعہ اس دنیا میں سنگریزوں سے لے کر سیاروں تک کی حرکت کی تشریح، زمین کی قوت کشش کا اصول دریافت کیا جس کے ذریعہ سماوی اجسام کی حرکت کی تشریح ہوسکی۔گوکہ اس کام کا آغاز کوپرنیکس اور گلیلیو کر چکے تھے۔روشنی کے بارے میں ذرّات کا نظریہ بھی اور Spectrum کی دریافت کا کریڈٹ بھی نیوٹن ہی کو جاتا ہے۔کسی سائنسدان نے اس وقت تک اتنا کام نہیں کیا تھا اوراس کے بعد سے آج تک بھی اتنا کام کرنے والا کوئی سائنسداں پیدا نہیں ہوا۔لیکن اس نے اپنے تمام کاموں میں جس پر سب سے زیادہ فخر کیا وہ اس کا تا حیات غیر شادی شدہ رہنا تھا۔ہے نا دلچسپ؟

لیکن یہ بھی ایک معمّہ ہے جس پر غور کرنا چاہیے کہ مذکورہ بالا مغربی سائنسداں جن نتائج پر پہنچے تھے ان سے کہیں پہلے مسلم سائنسداں ان نتائج کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔مثلاً دسویں صدی میں رازی، گیلن کے چار رطوبتوں (Humors) پر مشتمل تصور علاج کو مسترد کر چکا تھا۔گیارہویں صدی میں ابن سینا حرکت کے تصور کا ریاضی سے تجزیہ کر چکا تھا جس میں نیوٹن نے چھ صدیاں بعد کامیابی حاصل کی۔تیرہویں صدی میں Vesalius سے کوئی تین صدیاں قبل ابن نفیس نے بتایا تھا کہ جسم میں خون کا دوران کس طرح ہوتا ہے۔ابن

الہیثم جس کا انتقال ۱۰۳۹ء میں ہوا Spectrum دریافت کر چکے تھے۔ سائنٹفک میتھڈ کی تشریح کر چکے تھے اور تجربہ و quantification کو سائنسی تحقیق کی بنیاد تسلیم کر کے اس کو مستحکم کر چکے تھے۔ گویا ابن الہیثم نے نیوٹن اور دکارت کو صدیوں قبل ہی دریافت کر لیا تھا۔ مادہ کے ایٹمی تصور کی وضاحت بھی مسلم سائنسداں کر چکے تھے جس سلسلہ میں انہوں نے ہندوستانی سائنسدانوں سے استفادہ کیا تھا۔ اور کچھ نے کائنات کے میکانیکی ماڈل کی وضاحت بھی کی جو انہوں نے چینیوں سے لیا تھا۔

اہم تربات دریافتیں نہیں تھیں جو مغرب میں ہو رہی تھیں بلکہ انکا باقی اور جاری رہنا، ان کا جمع ہوتے رہنا اور ان کا باہم مددگار ہونا تھا جس کے نتیجہ میں بالآخر ایک ایسا مکمل اور باہم مربوط طریقہ کہ دنیا کو کس طرح دیکھیں اور اس کا کس طرح مطالعہ کریں اور کس طرح اسے سمجھیں تشکیل پایا۔ یعنی دنیا کا سائنسی پہلو واضح ہوتا گیا جس کے نتیجہ میں بعد میں مغرب زبردست اور دھماکہ خیز ٹکنولوجیکل دریافتیں اور ترقیاں کر سکا۔ یہ سب کچھ مغرب میں کیوں ہوا؟ مشرق میں کیوں نہیں؟

شاید ایک بات تو یہ کہ مسلمانوں کے یہاں یہ دریافتیں ایسے وقت ہوئی تھیں جب ان کا معاشرتی ڈھانچہ کمزور ہو رہا تھا جبکہ مغرب کی دریافتوں کا زمانہ وہ ہے جب وہ ایک طویل شکست و ریخت سے گزر کر اصلاح کی جانب گامزن تھے۔ اور مذہبی تحریک اصلاح نے اندھی تقلید کے غلبہ کی کمر توڑ دی تھی اور فکر انسانی آزاد ہو رہا تھا اور انسان آزاد ہو کر غور و خوض کرنے کی طرف مائل ہو رہا تھا۔

پروٹسٹینٹ تحریک اصلاح نے دراصل یورپ کے انقلاب میں اہم ترین رول ادا کیا۔ لیکن اس کے ساتھ یورپ میں ایک اور بڑی تبدیلی ''قومی ریاستوں'' کی شکل میں نمودار ہوئی تھی جو بظاہر تو ایک سیاسی تنظیمی نوعیت کا انقلاب تھا۔ یہ دونوں تحریکیں دراصل ایک دوسرے کی معاون بن گئیں کیونکہ جب لوتھر نے چرچ کے خلاف آواز اٹھائی اور اس کے احکام سے بغاوت کی تو تحریک اصلاح کے حامیوں نے مختلف بادشاہوں کے یہاں پناہ لی۔ یہ بادشاہ چرچ سے پہلے ہی باہم دگر تھے کہ کسی بھی جگہ آخری اختیار کس کو حاصل ہے۔ مذہبی انتظامیہ کو یا سیکولر انتظامیہ کو۔ تحریک اصلاح کے نتیجہ میں پورے یورپ میں تشدد پھوٹ پڑا جو بالآخر ۱۵۵۵ء میں Peace of Augsburg پر ختم ہوا۔ جس کے نتیجہ میں نبرد آزما پارٹیاں ایک نشان راہ اصول پر متفق ہو گئیں کہ ہر بادشاہ کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ چرچ روم سے وابستہ رہے یا کسی دوسرے عیسائی فرقہ میں شامل ہو جائے۔ Augsburg کا معاہدہ محض ایک جنگ بندی ہی ثابت ہوا۔ اختلافات پھر بھڑک اٹھے اور یوں ایک تیس سالہ جنگ نے جو اصلاً ایک قسم کی خانہ جنگی تھی، پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ کونسا مذہب حتمی طور پر تسلیم کیا جائے۔ جب ۱۶۴۸ء میں Westphalia کے مقام پر ایک معاہدہ کے تحت خانہ جنگی ختم ہوئی تو Augsburg کے امن معاہدہ کی تصدیق ہو گئی۔ چنانچہ انفرادیت کو مستحکم کرنے کے ساتھ تحریک اصلاح نے کل یورپی نظریہ کی جگہ ایک ایسے سسٹم کو تسلیم کیا جس کے تحت چرچ ریاست کے باہمی تعاون کے ذریعہ قوم پرستی

کی حمایت کریں گے۔

قومی ریاستوں کا اوّلین تصور انگلینڈ اور فرانس میں پنپنا شروع ہوا تھا جن کے بادشاہ ۱۳۳۷ء سے ۱۴۵۳ء میں کوئی سو سال تک جنگ کرتے رہے تھے۔ یہ کوئی مستقل جنگ نہ تھی البتہ ایسی مہمات کا سلسلہ تھی جن کے درمیان امن بھی قائم ہو جاتا تھا۔ جنگ سے پہلے ''انگلینڈ'' اور ''فرانس'' نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی۔ بس ایک علاقہ تھا جس میں اشرافیہ کے کچھ ایسے لوگ جو اپنے ہی جیسے دوسرے اشرافیہ کے ساتھ ایک قسم کے الحاق میں منسلک تھے۔ عہد وسطیٰ کی سلطنتیں مثلاً Carolingians کی سلطنت بعض علاقوں کا مجموعہ ہوا کرتی تھی۔ بادشاہ ہونے کا مطلب بس اتنا تھا کہ ان علاقوں سے ٹیکس وصول کیا جائے اور ان کے عوام سے سپاہی بھرتی کئے جائیں۔ یہ بادشاہ جب چاہتے اپنے علاقوں کو اِدھر اُدھر کر لیتے۔ تجارت بھی کرتے اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے لئے جنگ بھی کرتے بالکل ان چھوٹے بچوں کی طرح جو کھلونوں کی خاطر یا کسی کھیل میں ہار جیت کے لئے لڑ پڑتے ہیں۔ ایک ہی بادشاہ کے تحت ہوں یا دو علاقوں کے درمیان مشترک بادشاہ۔ عوام میں اس بنا پر کوئی خاص یگانگت اور یکجائی کا احساس نہ پایا جاتا تھا۔ اور یہ تصور کے دونوں کسی ایک بادشاہ کی رعایا ہیں ناپید تھا۔

البتہ اس قسم کا احساس یگانگت اور اشتراک باہمی کے جذبات مذکور بالا سو سالہ جنگ کے دوران پنپنے شروع ہوئے۔ یہ کچھ اس طرح ہوا کہ فرانس کے علاقے میں یہ لوگ فرنچ بولتے تھے اور انگلینڈ میں لوگ انگریزی بولتے۔ فرانس کے لوگ ان زیر جنگ علاقوں کے لوگوں سے زیادہ قربت محسوس کرنے لگے جو فرنچ بولتے تھے۔ اور انگریزی بولنے والی فوجوں سے اپنے آپ کو زیادہ ممتاز سمجھتے۔ اسی طرح انگریز فوجیوں میں یہ احساس ہوا کہ ہمارے باپ بھی اسی طرح کی مہمات میں بہت پہلے شریک رہے ہوں گے اور ممکن ہے کہ آئندہ دنوں میں ہمارے بیٹے بھی اس طرح شریک ہوں جیسے ہم آج شریک ہیں۔ اس ایک طرح کی ہم مقصدیت نے ایک طرح کی ٹیم اسپرٹ پیدا کی اور یوں زبان کی بنیاد پر آپسی یگانگت میں اضافہ ہوا۔ اس دوران بادشاہ کی حیثیت محض سب سے بڑے اشرافیہ سے بڑھ کر قوم کے ایک جسمانی اظہار کی ہوگئی۔

سو سالہ جنگ کی ابتداء بڑے اور اہم شرفاء، ان کے سرداروں اور ان کے بار برداروں کی معیت میں ہوئی جو سامان ڈھونے کے لیے ساتھ آئے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ یہ بار بردار مخالف فوجوں کے بار برداروں پر کوئی تیر چلا دیتے۔ یہ تیر اصل سپاہیوں کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے تھے کیونکہ وہ اوپر سے نیچے تک دھات کے بنے سوٹ سے لیس ہوتے تھے۔ لیکن اس سو سالہ جنگ کے دوران انگلش لمبی کمان کی ایجاد ہوئی جس کی مار زیادہ سخت اور پہلے کے مقابلہ میں زیادہ دور تک وار کر سکتی تھی۔ اور زرہ بکتر میں بھی داخل ہو سکتی تھے۔ تیر و کمان رکھنے والے وہ سپاہی جو خاصے پیچھے کھڑے ہوتے تھے وہ مخالف فوج کے سپاہیوں کو اس سے پہلے کہ وہ حملہ کے لیے تیار ہوں بیکار کرنے لگے۔

اس وقت سے جنگوں کا دار و مدار سپاہیوں کی تعداد پر نہیں رہا اور یوں فوجی سردار بتدریج غیر اہم یا بیکار

ہوتے گئے ۔ جاگیروں میں سیاسی سرگرمیاں ذاتی تعلقات سے چلتی تھیں ۔ جیسے جیسے نظامِ جاگیرداری ختم ہوا، جاگیردار بھی ختم ہونے لگے اور جو دولت ان کے ہاتھ میں تھی اور جس کی بدولت وہ بڑی بڑی ذاتی افواج جنگ اور مختلف کاموں کے لئے جمع کر سکتے تھے وہ بھی بالآخر ختم ہونے لگا۔ اس طرح ایک طرف بادشاہ بطور مظہر قوت متعارف ہوا کیونکہ وہی جنگ کی خاطر فنڈ اکھٹا کرنے میں سب سے زیادہ مؤثر تھا اور دوسری طرف اسے یہ کام اپنے فوجی سرداروں کی مدد سے کرنا ہوتا تھا۔ اس طرح انگلینڈ میں شرفاء کی وہ میٹنگ جو بادشاہ نئی جنگوں کے لیے فیصلہ کرنے کے لیے بلاتا تھا اب وہ پارلیامنٹ میں کی جانے لگی۔ انگریز بادشاہ پارلیامنٹ کی مرضی کے بغیر کسی ٹیکس کے فیصلہ کو صادر نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح سے انگلینڈ کے اندر جمہوری روایت مستحکم ہونے لگی۔ لیکن ابھی تو بہت کچھ ہونا تھا۔ ۱۴۰۰ء کی شاہی شان وشوکت کی افضلیت کے پس منظر میں اتنا بھی ایک بڑی خبر تھی ۔

قومی ریاستوں کے ابھرنے سے پہلے مضبوط سیاسی نظم کا اظہار مختلف علاقوں کے ڈھیلے ڈھالے نظم سے ہوتا تھا جو کسی حد تک آزاد تھیں اور اختیارات کی تقسیم مختلف سطحوں پر مختلف ذمہ داریوں کی شکل میں کی گئی تھی۔ لیڈر اپنی ذمہ داریوں کی بجا آوری درمیانی واسطوں کے ذریعہ کرتا تھا۔ وہ جو بھی حکم دیتا وہ انھیں درمیانی واسطوں سے گزر کر آگے بڑھتا اور اس دوران اس میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ہوجاتیں ۔ یہ اس لئے ہوتیں کہ یہ مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوکر پہنچتا تھا۔ پہنچانے کے اس عمل میں مقامی عادات اور روایات کو سامنے رکھتے ہوئے بعض تبدیلیاں شامل ہوجاتیں۔ ایسا بھی ہوتا کہ یہ بالکل پہنچتا بھی نہیں تھا کہ لوگ یا تو اسے بھول جاتے یا پہچاننے سے انکار کر دیتے ۔ لیکن یہ صورتحال اس وقت ہوتی جب یہ پیغام اپنے بالکل آخری مرحلہ یعنی متعلقہ افراد تک پہنچ رہا ہوتا۔ چنانچہ عظیم ترین فرمانروا کی دھاڑ بھی ہلکے سے شور میں بدل جاتی جب وہ کسی معمولی سی آبادی، چھوٹے سے گاؤں اور دور دراز علاقوں میں آباد چھوٹی آبادیوں یا سرحدی علاقوں میں پہنچتا۔ لیکن ایک قومی ریاست میں جہاں سب ہی لوگ تقریباً ایک ہی زبان بولتے اور سمجھتے اور یہاں آفیسروں کا ایک ہی سلسلہ اوپر سے نیچے تک نافذ کرنے کا ذمہ دار ہوتا۔ تقریباً ہر شخص ایک ہی سطح پر ہوتا اور بادشاہ کی پالیسیاں بغیر کسی تبدیلی یا انحراف کے اس کی سلطنت کے ہر کونے اور ہر چپے میں پہنچتیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ۱۳۵۰ء یا ۱۴۰۰ء میں انگلینڈ اور فرانس کچھ اس قسم کے ممالک ہو چکے تھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس وقت وہ اس معیار کی طرف بڑھ رہے تھے اور کچھ یہی حال شمال یورپ کی دوسری ریاستوں کا تھا۔ قومی ریاستوں کے ابھرنے کے نتیجے میں ایک اہم فائدہ یہ ہوا کہ اب واحد اور مربوط ایسی ریاستی پالیسیاں بنانا ممکن ہوگیا جو سب لوگوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو متاثر کرسکیں ۔ یہ وہ لوگ تھے جو ابھی تک اپنے آپ کو رعایا کے بطور ہی سمجھتے تھے لیکن وہ اب بتدریج شہریت کی طرف گامزن تھے ۔ چنانچہ مغرب نے جب مشرق کی طرف بڑھنا شروع کیا تو یہ بنیادی طور پر ایک قومی ریاست کا عمل تھا جو بہت سی سلطنتوں سے اس طرح گزری جیسے ہلکی پھلکی بریڈ سے سخت اور تیز چاقو گزر جائے۔

انڈیز کے لئے ایک سمندری راستہ کی تلاش Crussades کے راست نتیجہ میں اس وقت شروع ہوئی تھی جب یورپ میں قومی ریاستیں ابھر رہی تھیں۔ پروٹیسٹینٹ تحریک اصلاح کے نتیجہ میں فرد تاریخ کے اسٹیج پر ایک اہم کردار بن کر ابھر رہا تھا اور یہی وہ زمانہ ہے جب انفرادیت اور کلاسیکل علوم کے باہمی اشتراک کے نتیجہ میں جدید سائنس کی آمد آمد تھی۔

۱۴۸۸ء میں ایک پرتگیزی جہاز راں Barthlomew Diaz نے Cape of Good Hope تک کا چکّر لگا کر یہ ثابت کر دیا کہ ایک جہاز بحر اوقیانوس سے ہوتے ہوئے بحر ہند تک جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اس راستہ سے بہت سے جہاز نکلنا شروع ہو گئے۔ لیکن ۱۴۹۲ء میں کرسٹوفر کولمبس نے بحر اوقیانوس سے گزر کر مغرب کی طرف جاتے ہوئے دو بڑے براعظموں کو دریافت کر لیا تھا جو ابھی تک دنیا کو معلوم نہ تھے اور اس طرح متعدد جہازوں کا امریکہ آنا جانا شروع ہو گیا۔

کیونکہ کولمبس کے اس سفر کی اسپین نے کفالت کی تھی تو اسی ملک کو امریکہ کی دولت کا فائدہ حاصل ہوا۔ اور اس طرح تھوڑے عرصہ ہی کے لئے سہی اسپین یورپ کا امیر ترین ملک بن گیا۔ اسپین نے امریکی کانوں سے اتنا سونا نکالا اور اتنی آزادی سے وطن بھیجا کہ یورپ کا سونے کا بازار ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ لیکن اس صورتحال نے اسپین کی معیشت کو تباہ کر دیا اور یوں بالآخر اسپین یورپ کا غریب ترین ملک بن کر رہا۔

امریکی سونے نے پورے یورپ کی ہیئت کو بھی برباد کیا اور یہ اس وقت ہی ہوا جب مغربی یورپ میں قومی ریاستیں اپنی شناخت بنا رہی تھیں۔ قومی ریاستیں ایک فرد واحد کی طرح ہی ہوتی ہیں اور فرد کی طرح عمل پیرا ہوتی ہیں۔ قومی ریاستیں بن جانے سے قبل انگلینڈ کا کوئی آدمی یہ امید نہ کر سکتا تھا کہ انگلینڈ کبھی ایک امیر ملک ہو جائے گا یا ایسا ہونے پر کسی کو ذاتی طور پر فخر محسوس ہوگا۔ وہ شاید یہ تو سوچ سکتا تھا کہ اس کے علاقے سے دولت کا گزر ہو، وہ خود اپنے شہر، اپنے خاندان اور خود اپنے بادشاہ کی دولت میں اضافہ کا خواہش مند تو ہو سکتا تھا لیکن انگلینڈ؟ انگلینڈ کیا چیز ہے؟ لیکن اب جن علاقوں میں لوگ اجتماعی طور پر یعنی ایک قوم کی طرح سوچنے لگے تھے تو یہ فطری تھا کہ وہ ایسی پالیسیوں کے بارے میں بھی سوچیں کہ ان کے ذریعہ قوم کو فائدہ پہنچ سکے۔ اس طرح کی ایک پالیسی Mercantilism یعنی تجارتی نظام کے اصولوں کے متعلق تھی۔

یہ ایک سادہ سا تصور تھا۔ بنیادی نکتہ یہ تھا کہ کسی قوم کی معیشت افراد کی معیشت جیسی ہے۔ ایک شخص جو خوب دولت حاصل کرتا اور خرچ بہت کم کرتا ہے وہ دولت مند ہو جاتا ہے! اور یہ بالکل طے شدہ بات ہے۔ ایک فرد کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ آنے والی دولت اسے سونے کی شکل میں ملے۔ زیادہ سے زیادہ سونا اکٹھا کرو اور بس! مغربی یورپ کے عوام میں یہ سوچ عام ہو گئی کہ اپنے ملک میں زیادہ سے زیادہ سونا لاؤ اور اسے ملک سے باہر کم سے کم یا بالکل نہ نکلنے دو۔ اور انہوں نے دیکھا کہ یہ کس طرح کیا جا سکتا ہے مثلاً بہت سی چیزیں اپنے دوستوں اور پڑوسیوں کو فروخت کریں محض گولڈ کے لیے اور خریدیں...... کچھ نہیں۔

زیادہ فروخت کرنے کے لیے زیادہ بنانا بھی تو ضروری ہے۔اور اگر آپ کچھ ہی نہ خریدیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ خود کفیل ہیں۔لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی قوم بس فروخت ہی کرتی رہے اور خریدے کچھ نہیں اور کبھی بھی نہیں۔خام مال کہاں سے آئے گا؟ یہاں آ کر Mercantilism کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے یہ جڑا ہوا تھا قوم پرستی سے، جو جڑا تھا پروٹیسٹینٹ کی تحریک اصلاح سے، جو انفرادی عزائم وقومی مزاج سے، نشاۃ ثانیہ کی انسان دوستی سے۔مذکورہ عزائم بحری قوتوں سے ایک دوراہے پرمل گئے اور یوں دنیا کو کھوجنے کی خواہش کے عملی جامہ پہننے کا موقع مل گیا۔

دیکھا آپ نے ان سب کے پیچھے بہر حال صلیبی جنگیں تھیں۔

یہ تمام مذکورہ بالا ترقیاں اور خواہشات وغیرہ ۱۶۰۰ء میں اپنے عروج پر پہنچ رہی تھیں۔یہ وہ وقت تھا جب یورپ میں بحریات کے ماہر موجود تھے۔بہت تیزی سے یہ لوگ قومی ریاستوں کی شکل میں منظّم ہو رہے تھے۔وہ اس کائنات کے بارے میں سائنسی نقطہ نظر سے غور کرنے لگے تھے۔ان کے پاس امریکی براعظموں سے لایا ہوا سونا موجود تھا جو خرچ ہونے کے لیے تیار تھا۔معاش کے بارے میں بلند خواب دیکھ رہے تھے اور ابتدائی سرمایہ دارانہ مہم انفرادیت پسندی کی خوبیوں سے مسلح ہو رہی تھی۔

لیکن سمجھ سے ذرا بالا ہے یہ بات کہ اس دور میں جو کچھ ہو رہا تھا اس وقت کا عالم اسلام اس سے ناواقف تھا۔جبکہ اسی وقت میں مغل تہذیب ہندوستان میں عروج پر پہنچ رہی تھی۔صفوی کلچر فارس میں روبہ ترقی تھا اور عثمانی دور کا ایشیا مائنر، میسوپٹامیہ، لیوانت اور حجاز اور شمالی افریقہ بھی ابھی اپنے عروج سے گزر رہا تھا۔اور پھر یہ دونوں دنیائیں بغل گیر ہونے لگیں اور آپس میں رِل مِل گئیں۔

باب : ۱۲

مغرب کا مشرق کی طرف سفر

(۹۰۳ تا ۱۲۶۶ھ، ۱۵۰۰ تا ۱۸۰۰ء)

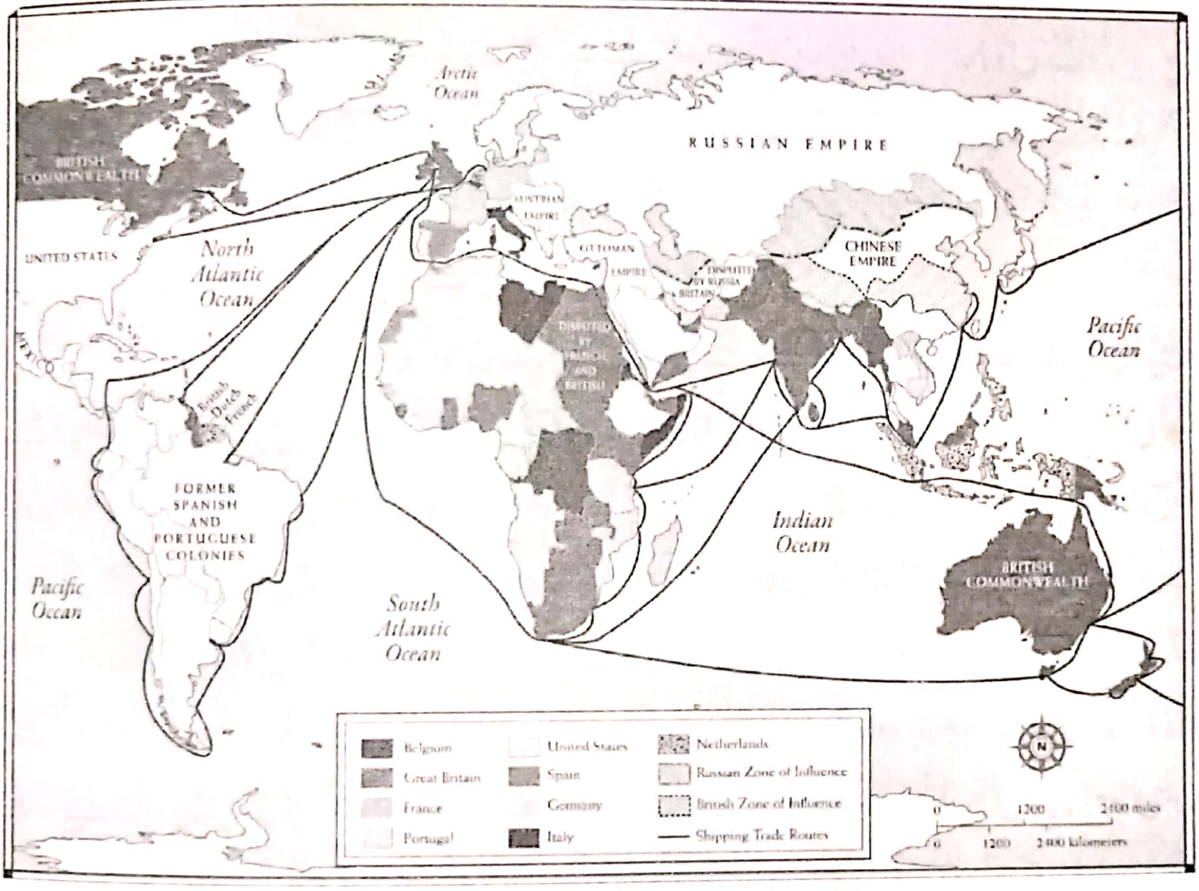
۱۵۰۰ اور ۱۸۰۰ عیسوی کے درمیان مغرب نے سمندروں کو چھان مارا اور جہازوں کے ذریعہ پوری دنیا کا سفر کیا۔ نئی نئی بستیاں بسائیں، جغرافیائی، ثقافتی اور فکری اعتبار سے نئے نئے علاقوں پر غالب ہوئے، بعض علاقوں پر محض قابض ہوئے اور مقامی آبادی کو بالکل بے دخل کر دیا۔ چنانچہ شمالی امریکہ اور آسٹریلیا اسی انجام سے دوچار ہوئے۔ عملاً ان علاقوں میں نئے یورپ آباد ہو گئے۔

بعض دوسرے علاقوں میں انہوں نے مقامی آبادی سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ جیسے تھے انہیں ایسے ہی رہنے دیا البتہ حکمران اشرافیہ بن کر رہے اور تمام اہم وسائل و ذرائع پر قابض ہو کر ان کے استعمال پر مکمل طور پر اجارہ داری قائم کر لی۔ آبادی کا ایک حصہ ان کا خدمتگار بن کر رہا اور باقی مخالفت اور دباؤ کے ماحول میں جس طرح بھی بہتر سے بہتر حال میں رہ سکتے تھے رہے۔ جنوبی امریکہ اور صحارئ افریقہ میں ایسی ہی صورتحال تھی۔

دوسرے علاقوں مثلاً چین اور عالم اسلام کے قلبی علاقوں میں یورپیوں کا مقابلہ ایسے لوگوں سے تھا جو بہت منظّم، دولتمند اور ٹکنولوجی کے اعتبار سے ترقی یافتہ معاشروں کے افراد تھے اور بظاہر اپنے طور پر قائم رہ سکتے تھے۔ ایسے علاقوں میں مقامی افراد اور نو واردوں کے تعامل میں عیاری اور نزاکت کا عمل دخل رہا۔ خصوصی طور پر عالم اسلام میں اس اعتبار سے ایک خاصہ پیچیدہ نفسیاتی ڈرامہ نظر آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی مغرب پہلے ہی مسلمانوں کے ساتھ الجھنے کی ایک تاریخ رقم کر چکا تھا اور دوسرے یہ کہ وہ عالم اسلام میں اس وقت آنا شروع ہوئے جب تین عظیم اسلامی سلطنتیں دنیا کی بڑی اور ذہانت و تیزیِ طبع کے اعتبار سے اپنے عروج پر تھیں۔

البتہ یہاں ایک بات واضح رہنی چاہیے کہ یورپیوں کا عالم اسلام میں داخلہ کسی اعتبار سے دو تہذیبوں کا ٹکراؤ نہ تھا جیسا کہ ۱۹۹۰ء کے دوران یہ اصطلاح استعمال کی گئی۔ نو آبادیانے کے اس دور میں یورپی تہذیب نے کبھی بھی اسلامی تہذیب کے خلاف جنگ کا اعلان نہیں کیا۔ ان کا یہ رویہ اور اس کا فہم دراصل بعد میں پیش آنے والے واقعات کی تفہیم کی اصل کنجی ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ ۱۵۰۰ء کے بعد یورپی جب مشرقی اسلامی علاقوں میں آئے تو اصلاً ان کے مقاصد تجارت سے متعلق تھے۔ سوال یہ ہے کہ خطرہ کس میں زیادہ ہے؟ عوام جنگ کے بجائے تجارت پسند کرتے ہیں۔ تجارت امن کی مترادف کیوں سمجھی جاتی ہے؟

مزید یہ کہ یورپی لوگ بہت زیادہ تعداد میں نہیں آئے۔ پہلی یورپی مہم کا جو قافلہ ہندوستان آیا وہ پرتگیز اشرافیہ کے ایک رکن واسکوڈی گاما کا تھا جس میں صرف چار جہاز تھے اور محض ۱۷۱ افراد پر مشتمل جہاز کا عملہ تھا۔ یہ لوگ ۱۴۹۸ء میں مغربی ساحل پر کالی کٹ کے مقام پر اترے تو مقامی ہندو راجہ سے اجازت مانگی کہ کیا وہ یہاں رہ کر کچھ چیزیں خرید سکتے ہیں اور کچھ چیزیں فروخت بھی کر سکتے ہیں؟ حکمراں نے کہا کہ یقیناً۔ وہ کیوں اجازت نہ دیتا؟ اگر یہ اجنبی یہاں سے کپڑا، خام کپاس، شکر اور جو بھی خریدنا چاہیں تو آخر اس سے انکار کیوں کیا جائے؟ بہرحال اس کے لوگوں کو تجارت کرنا ہی تھی اور اپنا مال فروخت کرنے سے انکار کریں تو انھیں پیسہ



مغربی استعمار: بحری قوت کے حصول کے لیے عالمی کوششیں

کیسے حاصل ہوگا؟

پرتگیزیوں کو وہاں کے مسلمانوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن فوراً نہیں بلکہ کچھ وقت گزرنے کے بعد۔ لیکن مسلمان خود بھی دخل انداز ہی کی حیثیت میں تھے اور بہت جنوب میں تھے۔ پرتگیزیوں کو مقامی ہندو آبادی کی خاصی تعداد کی حمایت حاصل ہوگئی اور انہوں نے گوا کے علاقے میں ایک چھوٹی سی آبادی اور قلعہ تعمیر کرلیا۔ خود پرتگیزیوں کے پاس تو ایسی چیزیں نہیں تھیں جنھیں وہ یہاں فروخت کر سکتے البتہ ان کے پاس دولت ضرور تھی جس سے مقامی چیزیں خرید سکتے تھے۔ اور کچھ سال گزرنے کے بعد وہ یہاں اور زیادہ تعداد میں آئے اور یورپی معیشت میں امریکہ سے آنے والے سونے کے سیلاب کے سبب گوا بتدریج ہندوستان میں ایک مستقل

پرتگیزی نقش بن گیا۔

پھر یورپ کے دوسرے علاقوں سے اور تاجر ہندوستان آئے۔ فرانسیسیوں نے پونڈیچری میں ایک تجارتی مرکز قائم کیا اور اسی طرح برطانویوں نے مدراس[1] میں اپنا ایک مرکز قائم کیا۔ ڈچ لوگوں کا آنا خاصا مختصر تھا۔ البتہ باہر سے آنے والی قومیتوں میں اپنے تجارتی مفادات کو لیکر آپسی اختلافات لڑائی کی شکل اختیار کر گئے۔ لیکن اس سلسلہ میں ہندوستانیوں نے کچھ خاص دلچسپی نہیں دکھائی۔ ظاہر ہے کہ انہیں اس میں کیا دلچسپی تھی کہ کون جیتے یا کون ہارے۔ اس زمانہ میں شمالی ہند میں بابر اپنی سلطنت قائم کر رہا تھا اور اس وقت کی بڑی کہانی وہی تھی اور چھوٹے چھوٹے تاجروں کا اپنے تجارتی مفادات کی حفاظت کے لئے ساحلوں پر چھوٹے قلعہ بنانا اس وقت کوئی بڑا معاملہ نہ تھا۔ چنانچہ سولہویں صدی کے دوران عالم اسلام پر یورپی اقوام کوئی خاص اثر نہ ڈال سکی تھیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ تمام آنے والے یورپی تاجر نہ تھے بلکہ کچھ تجارتی مشیر کی حیثیت میں آئے تھے اور تکنیکی صلاح کار کی شکل میں بھی۔ ۱۵۹۸ء میں دو انگریز بھائی Anthony Sherley اور Robert فارس پہنچے جو صفوی عہد میں شاہ عباس کے تحت اس وقت اپنے سنہرے دور سے گزر رہا تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ امن کے ساتھ آئے ہیں اور شاہ عباس کے لیے ایک اچھے سودے کی تجویز ان کے پاس ہے۔ وہ فارس کو توپیں اور گولہ بارود فروخت کرنا چاہتے تھے اور انہوں نے اپنی مصنوعات کے لیے تکنیکی تعاون کا بھی یقین دلایا کہ ان کے آدمی یہاں آئیں گے اور شاہ کے آدمیوں کو ان ہتھیاروں کے استعمال کی تربیت بھی دینگے۔ ملٹری حکمت عملی بھی سکھائیں گے جو ان ہتھیاروں کے ساتھ مناسبت رکھتی ہوگی اور یہ بھی بتائیں گے کہ اگر یہ ہتھیار ٹوٹ جائیں تو انہیں کیسے جوڑا جائے یا ٹھیک کیا جائے وغیرہ۔

شاہ عباس نے جو کچھ سنا اسے پسند کیا۔ صفوی عہد کا فارس اپنی پڑوسی حکومتوں کے مقابلہ ملٹری ٹکنالوجی میں پیچھے تھا۔ قزلباشوں کو گولہ بارود پسند نہیں تھا وہ ابھی تک جنگوں میں تیر کمان اور تلواریں ہی استعمال کر رہے تھے اور جنگ Chaldiran میں انہیں اس کی قیمت بھی چکانی پڑی تھی۔ اور اب ان کے قابل نفریں عثمانیوں کی کوشش تھی کہ فارس کو ہتھیار نہ پہنچ پائیں۔ چنانچہ ایک دور دراز یورپی ملک سے نہ صرف ہتھیار بلکہ مہارت بھی اگر مل جائے تو اس سے بہتر کوئی موقع صفویوں کے پاس نہ تھا۔ انگریز لوگ اپنے کام سے واقف تھے اور محض چند لوگ تھے وہ بھی بہت دور سے آئے ہوئے تھے۔ اور اہل فارس کو کوئی نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ بات طے ہوگئی اور یوں صفوی فوجوں میں اعلی مشیروں کی حیثیت سے انگریزوں کو جگہ دینے کی روایت شروع ہوگئی۔

البتہ صحیح بات یہ ہے کہ مسلمانوں اور مغرب کے لوگوں کے درمیان یہ تعلقات ہمیشہ ہی پرامن نہیں رہے۔ ترکان عثمان اور یورپی عیسائیوں میں صدیوں سے جنگیں ہوتی رہی تھیں۔ ان کی مغربی سرحدوں پر واقع علاقہ دونوں دنیاؤں کا گرم خِطّہ تھا۔ جنگ ہو رہی ہو اور چاہے وہ شدید ہی کیوں نہ ہو دوسرے علاقوں میں تجارت چلتی رہتی تھی۔ کیونکہ ان جنگوں کی صورتحال جنگ عظیم دوئم جیسی مکمل جنگ کی نہیں تھی۔ یہ جنگیں ان

علاقوں تک ہی محدود رہتی تھیں جہاں وہ واقع ہو رہی تھیں۔ ایک مقام پر جنگ چل رہی ہوتی تو محض چند میل دور معمول کی تجارت چلتی رہتی۔ آپسی تناؤ میں یقیناً نظریاتی ابعاد ضرور پائی جاتی تھیں جو صلیبی دور کی باقیات تھیں یعنی عیسائیت مقابلہ اسلام کا مسئلہ تھا۔ لیکن عملاً صورتحال یہ تھی جب بھی کوئی جنگ بھڑکتی تو وہ دو بادشاہوں کے درمیان کسی علاقہ پر عملداری یا قبضہ سے متعلق ہوتی۔ عثمانی سلطنت میں بہرحال لاتعداد عیسائی اور یہودی آباد تھے اور یہ لوگ عثمانی فوجوں کا حصہ بھی تھے۔ جو جنگوں میں اس لئے حصہ نہیں لیتے تھے کہ وہ بڑے محبِّ وطن تھے بلکہ اس لئے کہ وہ اس کی تنخواہ پاتے تھے اور یہ انکی ذمہ داری تھی۔ اس طرح کی جنگوں میں یہ عین ممکن تھا کہ دوسرے لوگ خرید وفروخت کرتے رہیں۔

سترہویں صدی تک محض ویانا کے ہی نہیں بلکہ فرانس، انگلینڈ، جرمنی، ڈچ اور یورپ کے دوسرے لوگ بھی تجارت کی خاطر عالم اسلام میں آنے جانے لگے تھے۔ ان کے پاس تجارت کے لئے سونا اور بندوقیں ہوتی تھیں۔ ان تجار نے جس طرح کی تجارت کا آغاز کیا تھا اس کے نتیجہ میں عثمانیوں کی عظیم اور زبردست طاقت ایک وقت میں بدہیت وجود بن کر رہ گئی جسے یورپیوں نے یورپ کا مرد بیمار اور کبھی مشرق کا مسئلہ کہا۔ لیکن یہ پروسیس اتنا کم رفتار البتہ نفوذ کرنے والا اور تہذیب کی سطح پر اتنا پیچیدہ تھا کہ تاریخ کا مطالعہ اس بڑھتے ہوئے تنزل کو یورپی نفوذ سے وابستہ اور آسانی سے اس پر منحصر نہیں کر پاتا۔

اس سلسلہ میں پہلی خاص بات جس پر غور کرنا چاہیے وہ ہے کہ کیا نہیں ہوا؟ فوجوں کی شکست کے بعد بھی عثمانی سلطنت شعلوں کی نذر نہیں ہوگئی تھی۔ کافی عرصہ کے بعد جب یہ تقریباً جاں بلب تھی یا ایک بے جان لاشہ بننے کے قریب تھی کہ دشمن ادھر آئیں اور اسکی تکّہ بوٹی کریں۔ اس حالت میں بھی عثمانیوں کی افواج میں یہ صلاحیت باقی تھی کہ وہ شدید نقصان پہنچا سکتے تھے۔

مورخین نے دو جنگوں کی شناخت کی ہے جس میں شکست نے عثمانیوں کے اختتام کا آغاز کیا تھا حالانکہ ترکوں نے اس وقت ان پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ ایک تو جنگ Lepanto تھی جو ۱۵۷۱ء میں ہوئی جس میں Venetians اور ان کے اتحادیوں نے مل کر ترکوں کے بحری بیڑے کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔ اس فتح نے یورپ کو یقین دلا دیا تھا کہ ترک اب ختم ہو جائیں گے۔

البتہ استنبول میں وزیر اعظم نے اس شکست کو ڈاڑھی کے شیو کرنے کے مترادف قرار دیا تھا کہ تھوڑے وقت میں ایک نئی اور بڑی ڈاڑھی پھر نکل آئے گی۔ چنانچہ عثمانیوں نے اس سے بڑا اور جدید تر بیڑا تیار کر لیا جس میں آٹھ جہاز اتنے بڑے تھے کہ اس سے پہلے بحر روم نے اتنے بڑے جہاز نہ دیکھے تھے۔ محض چھ ماہ کے اندر اندر انھوں نے مشرقی بحرِ روم واپس لے لیا، قبرص فتح کیا اور سسلی کے ساتھ بھی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی۔ تعجب ہوتا ہے کہ ہم عصر ترک مورخین نے جنگ Lepanto کو اس وقت تاریخ کا رُخ بدلنے والی جنگ کی اہمیت نہیں دی۔ کوئی ایک صدی کے بعد ہی یورپ کا بحری غلبہ واضح طور پر سامنے آیا اور اس غلبہ کی اہمیت سمجھ میں آسکی۔

دوسرا اہم ملٹری وقوعہ ذرا پہلے ہوا تھا لیکن کافی دن کے بعد اس سلسلہ کا دوسرا واقعہ ہوا۔ پہلے والا تو سلیمان اعظم کا ویانا کو لے پانے میں ناکامی تھی۔ عثمانی مغرب کو دھکیلنے میں کبھی رکے نہ تھے اور ۱۵۲۹ء میں وہ ویانا کے پھاٹک تک پہنچ چکے تھے۔ لیکن آسٹریا کے مشہور شہر کا محاصرہ کرنے میں سلطان کو بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ سردی آجانے کی بنا پر سلطان نے سوچا کہ اس بار ویانا کو چھوڑ دیتے ہیں اور آئندہ اسے فتح کریں گے۔ لیکن سلیمان کے لئے آئندہ نہ آسکا اور دوسرے مسائل کھڑے ہو جانے سے اس پر توجہ نہ رہی۔ ظاہر ہے کہ سلطنت بہت وسیع تھی اور اس کی سرحدیں بہت طویل تھیں جن پر اکثر و بیشتر مسائل کھڑے ہوتے رہتے تھے۔ سلیمان نے ویانا کے لئے دوبارہ کوشش نہ کی۔ لیکن سلطان کے ہم عصروں نے اسے کسی کمزوری پر محمول نہیں کیا۔ ویانا کی فتح ہمیشہ پیش نظر کاموں میں شامل رہی کہ بس ذرا فرصت ملے تو یہ کام انجام دیا جائے۔ وہ جنگوں میں بھی مشغول تھا اور فتوحات بھی حاصل کر رہا تھا اور اس کی حکومت اتنی کامیاب تھی کہ کوئی اول فول کہنے والا بے وقوف ہی یہ کہہ سکتا تھا کہ عثمانی اب کمزور ہو چکے ہیں اور ویانا نہیں لے پائیں گے۔ یہ بہر حال کوئی ملٹری کی شکست نہیں تھی بلکہ صورت یہ تھی کہ وہ اس طرح کی زبردست فتح حاصل نہ کر سکے تھے جیسا کہ بالعموم انہیں حاصل ہوتی رہی تھیں۔

البتہ جب مورخین ماضی کے ان واقعات کا تجزیہ کرتے ہیں تو واضح طور پر ویانا کا نہ لے پانا ایک موڑ ثابت ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب سلطنت اپنی وسعت کے اعتبار سے عظیم ترین مقام پر پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد اس میں مزید اضافہ نہیں ہوا۔ یہ حقیقت بالکل واضح تھی کہ اس وقت بھی سلطنت ہمہ وقت حالتِ جنگ میں ہی رہتی تھی۔ کبھی یہاں کبھی وہاں اور خبریں اکثر فتوحات ہی کی آرہی تھیں۔ عثمانی کہیں جنگ ہار بھی رہے ہوں گے لیکن وہ جنگیں جیت بھی رہے تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ ہار زیادہ رہے تھے اور جیت کم رہے تھے؟ کیا وہ بڑی جنگیں ہار رہے تھے اور نسبتاً غیر اہم اور چھوٹی جنگیں جیت رہے تھے؟ یہ سوال اصل ہے اور اس کا جواب واضح تھا یعنی شکستوں کا پلڑا بھاری تھا۔ لیکن جو لوگ تاریخ کے اس لمحہ کا حصّہ ہوں اور تاریخ کے ساتھ خود بھی شناوری کر رہے ہوں وہ وقت کے دھارے سے الگ ہو کر جائزہ نہیں لے سکتے۔ کس جنگ کی اہمیت کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ اسے کس طرح جانچا جائے؟ کچھ لوگوں نے پریشانی محسوس کی اور آواز بھی بلند کی لیکن ایسا تو اکثر ہوتا ہی ہے۔ اور ویسے بھی ۱۶۰۰ء میں عثمانی سلطنت سمٹ نہیں رہی تھی۔

بدقسمتی سے نہ سکڑنا سلطنت عثمانی کے لئے کافی نہ تھا۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس سلطنت کی بنیادوں میں وسعتِ مسلسل کا عنصر ابتدا ہی سے تھا۔ مستقل اور بالعموم فتح و کامرانی پر مبنی سرحدوں پر جنگ اس کے پیچیدہ اندرونی میکنزم کو جاری رہنے کے لئے ایک ضرورت بن چکی تھی۔

سب سے پہلے تو یہ کہ وسعت پزیری اس کی آمدنی کا ذریعہ تھی جس سے کوئی بھی حکومت صرف نظر نہیں کر سکتی۔ جنگ تحفظ کا ذریعہ بھی ہوتی ہے جس میں بہت سے داخلی مسائل اور دباؤ کا بوجھ بہہ جاتا ہے۔ مثلاً کسانوں کے مسائل اگر حل نہ ہو پا رہے ہوں تو وہ بھوکے اور نامراد ہو کر حکومت کے لئے مسئلہ نہ بنیں گے۔ بلکہ

جنگ ان کی آمدنی کا ایک مترادف ذریعہ بن کر سامنے آجائے گی۔ جنگ کریں کہ مال غنیمت حاصل ہو اور پھر کچھ تجارتی کاموں میں اس آمدنی کو لگا دیں۔

ایک بار جب وسعت پذیری رک جائے گی تو یہ تمام اندرونی مسائل اٹھ کھڑے ہونگے۔ جن کے پاس زمین کے بغیر آمدنی کا ذریعہ نہ ہو وہ شہروں کی طرف رجوع کریں گے۔ اگر کوئی صلاحیت ہے بھی تو ضروری نہیں ہے کہ وہ فوراً ہی استعمال میں آجائے۔ مخصوص انجمنیں ہی مصنوعات کی تیاری کا نظم کرتی تھیں اور وہ اجازت نامے محدود لوگوں کو ہی دے سکتی تھیں۔ گویا ان انجمنوں کی رکنیت کھلے عام نہ تھی۔ نتیجتاً شہر کی طرف آنے والوں کی ایک بڑی تعداد بے روزگار ہوگئی اور اس کے ساتھ شاکی اور برہم بھی۔ توسیع رک جانے سے بہت سے ایسے نتائج سامنے آنے لگے۔

تیسرا مسئلہ یہ تھا کہ توسیع رک جانے سے ترکوں کی قدیم ''دیوی شری'' روایت یعنی غلاموں کا حصول رک گیا جو مختلف اداروں میں داخل ہو کر ان کی انتظامیہ اور انہیں باقی رکھنے کے لیے ضروری تھے۔ جانیسری پر ایک اہم پابندی یہ تھی کہ وہ شادیاں کر کے جانشیں پیدا نہیں کریں گے۔ اس طرح انتظامیہ میں ہمیشہ تازہ خون آتا رہا۔ لیکن جہاں توسیع رکی یہ رسم بھی جمود کا شکار ہونے لگی۔ جانیسری شادی کرنے لگے اور پھر وہ عام لوگوں کی طرح اپنے بچوں کے مستقبل کے لئے وہی کرنے لگے جو عموماً کیا جاتا ہے۔ بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت اور ملازمتوں کے مواقع کی تلاش و جستجو۔ یہ بالکل فطری تھا لیکن اس کے معنی یہ بھی ہوئے کہ ینی چری اب مستقل اور موروثی اشرافیہ ہوگئے۔ اس کے نتیجہ میں سلطنت کا جوش و جذبہ بتدریج ختم ہوگیا۔ کیونکہ اب انتظامیہ اور سلطنت کے دوسرے ضروری امور کے چلانے کے لئے ماہرین اور پختہ کارکنوں کا انتخاب صرف جانیسری سے وابستگان میں صلاحیتوں کا ابتدائی اظہار دیکھ کر نہیں بلکہ امراء اور بااثر والدین کے کند ذہن بچوں سے بھی ہونے لگا۔

کسی نے بھی اس جمود کو دسیوں سال قبل سلیمان اعظم کے ویانا کے ناکام محاصرہ میں نہیں دیکھا۔ اور وہ دیکھ بھی کیسے سکتے تھے؟ یہ نتائج اتنے بالواسطہ اور اتنا دور جا کر اپنی علّت کے ساتھ وابستہ ہوتے تھے کہ عام آدمی اس جمود کو معاشرتی خرابیوں کا ایک ایسا حصہ سمجھ لیتا تھا جس کی وضاحت اور تعریف ممکن نہیں ہوتی اور مذہبی طبقہ اسے محض اخلاقی زوال کے پس منظر میں دیکھتا ہے اور اس صورتحال سے نکلنے میں وہ پرانی اخلاقی قدروں کی بحالی جیسے ڈسپلن اور بزرگوں کا احترام وغیرہ سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

پھر سلیمان کی ناکامی کے بعد کے اقدامات تھے۔ ۱۶۸۳ء میں ویانا کے حصول کی پھر ایک کوشش ہوئی اور عثمانی پھر ناکام رہے اور محض ناکام ہی نہیں رہے بلکہ یورپی اتحاد نے انہیں کچل دیا۔ دیکھا جائے تو یہ ناکامی بھی ایسی ہی تھی کہ عثمانی بس فتح نہ کر پائے تھے۔ لیکن عثمانی اشرافیہ کو اب یہ اندازہ ہونے لگا تھا کہ وہ شکست کھا چکے ہیں اور کچھ بنیادی خرابی در آئی۔

اور یوں انہوں نے اپنی عسکری قوت کو پھر زندہ کرنے اور مستحکم کرنے کا ایک مضبوط فیصلہ کرلیا۔

انہوں نے بڑی آسانی سے یہ تسلیم کرلیا کہ اعلی سلطنت کی استعداد کا انحصار بڑی فوج اور اسلحہ پر ہے۔ وہ نظر نہ آنے والی قوتیں جو سلطنت کو کھوکھلا کر رہی تھیں ان سے مقابلہ کے لئے انہوں نے عسکری فصیل قائم کرنے کی کوشش کی۔ عسکری قوت میں اضافہ کے لئے بے انتہا دولت کی ضرورت تھی اور اس پہلو سے پہلے ہی حکومت دباؤ میں تھی۔

اس دباؤ کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ یورپی تاجر معیشت میں اس طرح دخیل ہو گئے تھے کہ وہاں پہلے سے چلی آرہی قیود اور توازن کا نظام غیر مؤثر ہونے لگا تھا۔ جنگ لیپانٹو کو چھوڑیں، ویانا کے ناکام محاصرہ کو چھوڑیں، سلطنت عثمانیہ کو زیر کرنے میں اہم ترین رول فوجوں کا نہیں بلکہ تاجروں کا رہا۔

یہاں کچھ تفصیلات میں جانا ضروری ہے۔ عثمانی سلطنت میں مختلف اشیاء کی پیداوار میں انجمنیں مؤثر تھیں اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ یہ انجمنیں (Guilds) صوفی سلسلوں سے بھی وابستہ تھیں۔ یہ انجمنیں اپنے ممبروں کی مقابلہ آرائی کے منفی اثرات سے حفاظت کرتی تھیں۔ مثلاً ایک انجمن صابن تیار کرنے میں اجارہ داری رکھتی تھی جبکہ دوسری کو جوتے بنانے میں اجارہ داری حاصل تھی۔ انجمنیں اپنی اس اجارہ داری کے باوجود اشیاء کی قیمتوں کو من چاہے طریقوں سے بڑھا نہیں سکتی تھیں۔ کیونکہ حکومت نے اشیاء کی قیمتوں کی ایک حد مقرر کر رکھی تھی جس سے زیادہ کسی سے وصول نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ریاست عوامی مفادات کی حفاظت کرتی اور انجمنیں اپنے ممبروں کے لئے توازن قائم کرتیں اور نظام چلتا رہتا تھا۔

پھر مغربی لوگ اس نظام میں دخیل ہونا شروع ہوئے۔ انہوں نے صابن اور جوتوں کو براہ راست فروخت کر کے انجمنوں کا مقابلہ نہیں کیا۔ کیونکہ حکومت اس کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ نہیں! بلکہ انہوں نے چیزیں خریدنے میں دلچسپی دکھائی اور خاص طور پر خام مال خریدنے میں۔ مثلاً اون، گوشت، چمڑہ، لکڑی، تیل، دھاتیں اور اسی طرح کی دوسری اشیاء بلکہ یہ کہا جائے کہ جس چیز پر بھی ان کا ہاتھ پڑتا وہ اسے خریدنا چاہتے۔ سپلائی کرنے والوں نے بڑی خوشی سے یہ کام کیا اور حکومت کو بھی اطمینان تھا۔ کیونکہ اس طرز کی تجارت سے ملک میں سونا آرہا تھا اور ظاہر ہے کہ سونا کوئی بری چیز نہ تھی۔ لیکن بدقسمتی سے یورپی تاجر جو چیزیں خرید رہے تھے ان کی ضرورت انجمنوں کو بھی اپنی مصنوعات کی تیاری میں پڑتی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ خام مال فروخت کر کے تو سونا حاصل ہوتا تھا جبکہ انجمنیں اسے خرید کر محض منافع ہی حاصل کرتی تھیں اور منافع کی حدیں حکومت نے قیمتوں پر کنٹرول کے ذریعہ محدود کر رکھی تھی۔ اور یہ فرق اتنا تھا کہ محض اپنی مصنوعات کا حجم بڑھا کر اسے پورا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے لئے ضروری خام مال انہیں مہیا نہیں تھا۔ غیر ملکیوں نے خام مال خرید کر باہر بھیجنا شروع کیا تو مقامی صنعتوں کے لئے مسائل کھڑے ہو گئے۔ گھریلو صنعتیں کمزور ہونے لگیں۔

عثمانی آفیسروں نے گو اس صورتحال کو محسوس کیا اور بعض مخصوص خام مال پر جن کی گھریلو صنعتوں کو ضرورت رہتی تھی بیرونی لوگوں کو فروخت کرنے پر پابندی لگا دی۔ لیکن اس طرح کے قوانین نے ناجائز طریقوں کو ہوا دی۔ جب اون کا خام مال فروخت کرنا ایک جرم ٹھہرا تو اس کام کو مجرمین ہی انجام دیں گے۔ اور یوں بلیک مارکیٹ معیشت پنپنے لگی اور کالا بازاری معیشت کے ماہرین بن کر نو دولتیوں کی ایک کلاس ابھرنے لگی۔ یہ لوگ

معاشرہ میں باعزت نہیں تھے اور کیونکہ یہ دولت کے حصول کے لئے قانون توڑتے تھے تو انہیں آفیسروں کو رشوت دینا ہوتا تھا جس کے نتیجہ میں بدعنوانی میں اضافہ ہونے لگا۔ اس طرح معاشرہ میں رشوت لیکر دولتمند ہونے والے آفیسروں کی شاخ وجود میں آئی۔

اس طرح ایک کثیر تعداد ایسے افراد کی ہوگئی جس کے پاس غیر قانونی دولت تھی لیکن وہ کسی قسم کی پیداوار میں اضافہ کی وجہ سے نہیں آئی تھی۔ یہ وہ رقم تھی جو بڑی آزادی سے عثمانی معیشت میں یورپی لوگوں کے ذریعے داخل ہورہی تھی اور جس کا ذریعہ امریکہ سے آنے والا سونا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ عثمانی نو دولتیے اپنی یہ دولت کہاں خرچ کریں؟ شفافیت کے ساتھ صنعتی اداروں میں یہ دولت لگ نہیں سکتی تھی کہ بہت جلد ریاست کی نظر میں آجاتی اور پریشانی کا باعث ہوتی۔ چنانچہ انہوں نے وہی کیا جو آج کے امریکہ میں ڈرگ مافیا کرتا ہے۔ انہوں نے اسے آزادی سے سامان تعیش پر خرچ کرنا شروع کر دیا۔ عثمانی دور میں یہ سامان مغرب سے آنے والی اشیائے صرف تھیں جو خاموشی سے رقم ادا کر کے خریدی جاسکتی تھیں۔ اس صورتحال سے عثمانیوں کی صنعتی پیداوار کی صلاحیتوں کی بتدریج حوصلہ شکنی ہونے لگی۔ یورپی اشیاء کے لئے یعنی وہاں کی صنعت کے لئے مارکیٹ وسیع ہوتا گیا اور وہ سونا جو یورپ سے عثمانی سلطنت میں آرہا تھا وہ اب واپس یورپ جانے لگا۔

عثمانی معیشت میں بیرونی ممالک سے کیش آنا اس وقت شروع ہوا جب مقامی صنعتی پیداوار گرنے لگی تھی اور اس کے نتیجہ میں افراط زر کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ یعنی پیسہ موجود لیکن اشیاء کم۔ میں نے یہی صورتحال شمالی کیلی فورنیا کے بعض دیہی علاقوں میں دیکھی ہے جہاں مرجوانا کی پیداوار سے بعض لوگوں کی دولت میں بے تحاشا اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ علاقے جہاں بظاہر کوئی معاشی سرگرمی نہ ہو وہاں عام لوگ BMW ڈرائیو کرتے نظر آتے ہیں۔ عام رہائشی مکانات ایک ملین ڈالر میں بکنے لگے اور بالآخر ڈبل روٹی کی قیمت بھی بعض اشراف زدہ گروسری اسٹورس میں بڑھ گئی۔

افراطِ زر کسے تکلیف میں مبتلا کرتا ہے؟ انہیں جن کی تنخواہیں متعین ہوتی ہیں۔ آجکل متعین آمدنی کا مطلب کم آمدنی ہوتا ہے اور فوراً ہی پنشن پر گزارہ کرنے والوں کا خیال آتا ہے جو سوشل سیکیورٹی اور فلاح پر گزارا کرتے ہیں۔ اہل خانہ اور چھوٹے چھوٹے خاندان اور گروہ اپنے بزرگوں اور بیماروں کا خیال خود ہی کرتے ہیں۔ لیکن عثمانی معاشرہ میں متعین آمدنی والوں کا مطلب تنخواہ دار سرکاری افسران ہوتا تھا بلکہ اس کا مطلب خاص طور پر وہ افسران تھے جو کورٹ سے متعلق تھے۔ جو بیکار اور ہوا بھرے ہوئے لوگ تھے لیکن اشرافیہ کا حصّہ تھے۔ یہ متعین آمدنی والے بھی اپنے خوابوں سے زیادہ امیر ہوگئے تھے۔ اتنے امیر جتنا Lydia کا آخری بادشاہ Croesus*۔ لیکن امیر ترین لوگ بھی اس وقت خطرہ محسوس کرنے لگتے ہیں جب ان کی قوت خرید کم ہونے لگتی

---

* کروسیس (Croesus) Lydia کا بادشاہ تھا جو ۵۵۶ قبل مسیح میں ایشیا مائنر کے مغرب میں واقع ایک طاقتور سلطنت ہوا کرتی تھی۔ بادشاہ کی امارت اور دولتمندی ایک ضرب المثل بن چکی تھی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

ہے۔ ۱۹۲۹ء میں جب امریکہ کا اسٹاک مارکیٹ کریش ہوا تو کچھ ایسے بینکرس تھے جنہوں نے اپنی بلند بالا عمارتوں کی کھڑکیوں سے چھلانگ لگادی تھی اور جب وہ راستے میں آگرے تب بھی ملین ڈالر کے مالک تھے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ان کے پاس دولت کتنی تھی اصل مسئلہ یہ تھا کہ ان کے ٹارگیٹ سے کتنا کم ان کے پاس تھا۔ اسی طرح عثمانی معاشرہ میں کورٹ سے وابستہ افراد جو متعین آمدنی پر تھے انہیں لگا کہ اب انہیں اپنی پیٹیاں کسنی پڑیں گی جو ظاہر ہے کہ انہیں پسند نہ تھا اور اس طرح انہوں نے اپنی آمدنی میں اضافہ کے لیے ان اداروں پر اپنا اختیار چلانا شروع کر دیا جن پر ان کا اختیار تھا۔

کورٹ کے وابستگان کا اختیار کہاں چلتا تھا؟ مملکت کی قانونی اور انتظامی کارکردگی میں ان کی پہنچ تھی۔ جب کوئی اختیار نہ ہو سوائے اس کے کہ وہ ضرورت مندوں کو متعلقہ اداروں تک پہنچا دیا کریں تو وہ اپنے اس اختیار کا استعمال لوگوں کو لیجانے سے انکار کے ذریعے بھی کر سکتے تھے۔ چنانچہ ان افسران نے لوگوں کو آسانیاں فراہم کرنے کے بجائے روکنا شروع کر دیا...... بس ایک راستہ کھلا تھا رشوت دو اور آسانیاں حاضر ہیں۔ پوری عثمانی سلطنت میں کاغذی کارروائی ایک ڈراونا خواب بن کر رہ گئی۔ راستہ آسان کرنے کے لئے ایک شخص کو رشوت دینی ہوتی تھی جو وہاں کے ان لوگوں سے واقف تھا جو متعلقہ افراد کو جانتے تھے اور جو وہاں کے لوگوں کو رشوت دے کر کام کرا سکتے تھے۔

پوری مملکت میں آفس کے کام جیسے چپک کر رہ جاتے۔ اس سے نپٹنے کے لئے ریاست نے تنخواہوں میں اضافہ کیا تا کہ افسران رشوت لینے کی ضرورت محسوس نہ کریں۔ لیکن ریاست کے پاس اضافی سرمایہ نہیں تھا اور بالخصوص وہ سرمایہ جو حقیقی پیداوار سے آتا ہے اور خاص طور پر صورتحال اس وقت سے خراب ہوگئی تھی جب سے سلطنت میں توسیع بند ہو چکی تھی۔ چنانچہ تنخواہوں میں اضافہ کے لیے اس کے علاوہ چارہ نہ تھا کہ کرنسی چھاپی جائے۔

کرنسی چھاپنے کے نتیجہ میں افراط زر بڑھتا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں ہم وہیں جا پہنچتے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ عثمانی حکومت نے بدعنوانیاں ختم کرنے کے لیے جو جو اقدامات کئے صورتحال مزید ابتر ہوتی چلی گئی اور بالآخر حکومت نے ہاتھ اٹھا لیے اور طے کیا کہ اس کام کے لیے کچھ مشیروں کی خدمات اجرت پر لی جائیں۔ جن مشیروں کو انہوں نے مقرر کیا وہ انتظامیہ سے متعلق تھے یا ٹیکنیکل مہارت رکھتے تھے اور ان علاقوں سے تھے جن کے بارے میں یہ تصور تھا کہ وہ جانتے ہیں۔ یعنی مغربی یورپ سے۔

شاید کوئی روشن فکر اور تیز طبع مختار کل دولت عثمانیہ کے اس صورتحال میں پہنچنے کی وجوہات واضح کر سکتا تھا۔ لیکن مستقل کاموں اور سلطنت کی وسعت نے شاہی خاندان کی زندگی اور وہاں کے کلچر کو ایسا بنا دیا تھا جس میں سلطان محمد فاتح اور سلیمان اعظم جیسی شخصیتوں کا پیدا ہونا ممکن نہ رہا تھا۔ بالخصوص کورٹ میں توسیع ہو چکی تھی اور یہ اتنا بھاری بھرکم ہو چکا تھا کہ اب اس سے کسی بار آوری کی توقع نہیں رہی تھی۔ یہ معاشرہ کی کمر پر ایک بدنمائی سوار ہو گئی تھی جسے ڈھویا جا رہا تھا۔

اس بدہیئتی کی اصل نشانی شاید حرم سلطانی تھا جو استنبول میں قائم تھا۔ مسلمانوں میں اس سے قبل کی خاندانی حکومتیں بھی حرم رکھتی تھیں لیکن عثمانی حرم اپنی وسعت کے اعتبار سے بے مثال تھا، اتنا بڑا حرم اس سے قبل چین کے منگ خاندان کی حکومت میں ہی دیکھا گیا تھا۔

جو علاقے عثمانیوں نے فتح کیے تھے وہاں کی ہزار ہا خواتین عظیم الشان Seraglio کی غلام گردش میں رہتیں۔ گو کہ غالب فِضا دولت اور عیش وعشرت سے معمور تھی لیکن ان خواتین کی اکثریت چھوٹے چھوٹے کابکوں میں رہتیں جو بھول بھلیّوں کا حصہ تھے۔ حرم کی ان عورتوں کو زیبائش کی ضروریات مہیا کی جاتیں اور حسن کی افزائش کے لئے ہر ضروری چیز مہیا کی جاتی تھیں۔ ان کے پاس آرائش و جمال کے علاوہ کوئی اور کام نہیں تھا۔ مطالعہ کے مواقع اور کچھ سیکھنے یا دستکاری وغیرہ کے مواقع بالکل مفقود تھے کوئی ایسا کام نہیں تھا جو انہیں بیزاری کی اس زندگی سے نجات دلا سکے۔ جواہرات سے مزّین چھوٹے چھوٹے کمروں میں یہ عورتیں دراصل قیدی تھیں۔

عالم اسلام میں عورتوں کی یہ خانہ نشینی سینکڑوں سالوں سے پنپ رہی تھی۔ معاشرہ کی یہ عام صورتحال نہ تھی۔ یہ صرف اشرافیہ کا حال تھا۔ دیہاتی علاقوں میں کبھی کبھی مسافروں کو اب بھی کھیتوں وغیرہ میں کام کرتی ہوئی عورتیں نظر آجاتیں یا جانوروں کو سڑک کے کنارے ہنکاتی نظر آجاتیں۔ شہری علاقوں میں ذرا نچلے طبقہ کی عورتیں عام بازاروں میں تجارت کرتی مل جاتیں۔ گھریلو ضروریات کی اشیاء خریدتے ہوئے یا دستکاری کے نمونے گلی گلی بیچتی بھی مل جاتیں۔ مڈل کلاس کی خواتین جائداد کی مالک تھیں، اپنی تجارت کا انتظام کرتیں اور ملازموں کی نگرانی اور ہدایت دیتی نظر آتیں۔ البتہ عورتوں کا عوامی سطح پر نظر آنا ان کے مردوں کا کم درجہ پر فائز ہونے کا غمّاز تھا۔

عالی مرتبت مرد اپنے اس مرتبہ کا اظہار عورتوں کو عوامی مقامات سے دور رکھ کر کرتے تھے اور انہیں اپنے گھروں کے نجی حصوں میں رکھتے تھے۔ اس کے پیچھے نفسیاتی کیفیت میرے خیال میں یہ تھی کہ ایک مرد کی عزت یعنی یہ حال کہ وہ اپنے ساتھی مردوں میں سر اٹھا کر رہ سکے اس میں سمجھی جاتی تھی کہ اس سے وابستہ خواتین دوسرے مردوں کی شہوانی توجہ کا مرکز نہ بن سکیں۔ عورتوں کی خانہ نشینی کا جواز بالآخر یہی ہے اور اس طرح کے کلچر اور ماحول میں چھوٹے مقام کے حامل مرد پر بھی یہی دباؤ رہتا ہوگا کہ وہ بھی کسی طرح اپنی عورتوں کو ایسی نظروں سے محفوظ رکھے تا کہ اس کے ساتھی مرد اسے بری نظروں سے نہ دیکھیں۔

لیکن سلطان کے حرم کے بارے میں زبردست مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ عام استعمال میں بھی اور مغربی مستشرقین کے یہاں اسے شہوت پرستی کے معنی میں لیا گیا ہے اور کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ حرم کی زندگی میں صبح سے شام تک شہوت پرستی ہی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ممکن کیسے تھا۔ سلطان ایک فردِ واحد تھا اور حرم کی عورتوں کو کوئی اور سوائے محافظین کے، دیکھ ہی نہ سکتا تھا۔ اور یہ محافظین مخنّث خواجہ سرا ہوا کرتے تھے۔ کچھ لوگوں کو یہ پڑھ کر تعجب ہوگا کہ سلطان اپنے تفریحی اوقات عورتوں ہی کے درمیان نہ گذارتا

تھا۔ ایک مخصوص خواجہ سرا کی ذمہ داری تھی کہ کسی ایک عورت کو شب بسری کے لئے سلطان تک پہنچائے اور وہ بھی بڑی راز داری سے اور مناسب انداز سے چھپا کر رات کے اندھیرے میں۔ گویا حرم ایک ایسا ادارہ تھا جہاں سیکس کی اجازت اور اس کی روک تھام وانسداد خاصے پراسرار طور پر آپس میں بندھے ہوئے تھے[2]۔

خواجہ سرا آزادی سے حرم اور باہر کی دنیا میں گھوم پھر سکتے تھے اور اس طرح حرم کی خواتین کے لئے وہ آنکھ کان اور ہاتھ تھے اور باہر کی دنیا کے بارے میں معلومات اور اس دنیا میں کسی ممکنہ تبدیلی کے لئے ان خواتین کا واحد ذریعہ۔ سلطان کے بچے بشمول لڑکے حرم میں ہی رہتے تا آنکہ وہ بارہ سال کی عمر کو پہنچ جاتے تو پھر عام لوگوں کے ساتھ انکا ملنا جلنا ممکن نہ رہتا اور نہ ہی زندگی اور سن بلوغت کے عمومی مذاق سے انکا واسطہ رہتا۔ اور جب اس ماحول سے گزرا ہوا کوئی شاہزادہ تخت پر بیٹھتا تو وہ خاص انداز میں معاشرہ کا عُضوِ معطّل ہوتا جس کی اصل صلاحیت اس میں پرکھی جاتی کہ حرم کی سازشوں کی بھول بھلیوں میں وہ کس طرح اپنا راستہ بناتا ہے۔

سازشوں کی ان بھول بھلیوں میں بڑے بڑے مفادات چھپے رہتے تھے جب کوئی ایک شاہزادہ آئندہ کا سلطان نامزد ہو جاتا تو دوسرے بہت سے شاہزادوں کی مائیں اپنی امیدیں آخر تک نہ توڑتی تھیں کہ ممکن ہے حالات بدلیں اور میرا بیٹا تاج پہن لے (ظاہر ہے کہ اس کے نتیجہ میں پوری سلطنت میں ان کی اہمیت بہت بڑھ جاتی تھی) چنانچہ مائیں اور انکی اولادیں سازشیں رچتیں اور ممکنہ امیدواروں کو راستہ سے ہٹانے کی ہر ممکن کوشش کرتیں اور یہ کوششیں کبھی قتل تک پہنچ جاتیں۔ یہ کوششیں سلطان کی وفات تک جاری رہتیں۔ یہ اندرون خانہ سازشیں بیرون خانہ محاذ آرائی تک پہنچ جاتیں اور جو شہزادہ اس جدوجہد میں کامیاب ہو جاتا اور تخت سنبھالتا تو وہ صرف اپنے لئے نہیں بلکہ حرم میں عورتوں اور خواجہ سراؤں کے اس دھڑ کے لئے بھی ہوتا جس نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس ماحول میں پلا بڑھا شاہزادہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کائنات کا مقتدرِ اعلیٰ بننے کا اس کا امکان کم ہی ہے اور زیادہ امکان یہ ہے کہ وہ پختگی اور بلوغ تک پہنچتے ختم ہی ہو جائے۔

اس سسٹم کے نتیجہ میں ایسے سلاطین تخت نشیں ہوئے جو کمزور تھے، بیوقوف تھے اور سنکی کجروی کا شکار تھے۔ لیکن یہ سچائی ایسی نہ تھی کہ اپنی ذات میں عثمانیوں کے زوال کا سبب بن جاتی کیونکہ جب یہ سسٹم پختگی تک پہنچا اس وقت سلطنت کو سلاطین نہیں چلا رہے تھے۔ سلطان کی قوت نفاذ تو سلیمان اعظم کے بعد ہی کمزور ہونا شروع ہو چکی تھی۔ عثمانی سلطنت میں وزیر اعظم اب مرکزِ قوت بن چکا تھا۔

البتہ بے سود کورٹ اور عثمانیوں کا زبردست حرم، سلطنت میں مزاحم ہوتا تھا۔ اس پر خرچ بے تحاشا ہوتا اور اس سے فائدہ بہت کم۔ بلکہ فائدہ بالکل ہی نہیں۔ بلکہ یہ اس قابل ہی نہ تھا کہ فیصلے کر سکے۔ وزیر اور دوسرے افسروں کی ذمہ داری تھی کہ وہ حکومت چلائیں۔ کورٹ کو کاندھوں پر اٹھائے پھریں اور مزید یہ کہ اس کی روزمرہ کی ضروریات بھی پوری کریں۔ اس صورتحال نے پورے عمل کو انتہائی سست اور بے فائدہ بنا کر رکھ دیا تھا۔

۱۶۰۰ء اور ۱۸۰۰ء کے درمیان صفوی سلطنت بھی پیچیدگیوں کا شکار تھی۔ یورپی لوگ صورتحال سے

فائدہ اٹھانے کے لیے موجود تھے۔ لیکن اصل میں سلطنت کے اندرونی تضادات نے اسے دونیم کر دیا تھا۔ پہلے پہل تو شاہی خاندان میں جو گھن لگتا ہے وہی ہوا۔ ناز ونعم اور عیش وعشرت میں پلے شاہ زادے جب تخت سنبھالتے تو بدچلن اور سست رو ہوتے اور جب بھی ایسا بادشاہ وفات پاتا تو باقی حق داروں میں طاقت واختیار کے لئے زور آزمائی شروع ہو جاتی۔ جو کامیاب ہوتا وہ اس قابل نہ رہا ہوتا کہ ہو چکے نقصان کی بھرپائی کر سکے۔ اس طرح سنہرا دور نقرئی دور میں بدلا۔ نقرئی دور کانسے میں اور پھر مٹی اور کیچڑ۔ صفوی جب اول اول اقتدار میں آئے تو انہوں نے اسلام کی ممتاز شناخت اختیار کرتے ہوئے شیعیت کو ریاستی مذہب قرار دیا۔ یہ ابتداً تو ریاست کے لئے فائدہ مند تھا کیونکہ اسکے نتیجہ میں قومی سطح کا اتحاد قائم ہو گیا جو فارس جیسے جغرافیائی اعتبار سے وسیع وعریض ملک کے استحکام کے لئے ضروری تھا۔ لیکن سنّیوں میں بے اطمینانی پھیل گئی اور جب بعد میں مرکز کمزور ہوا تو ان میں بغاوت ہونے لگی اور علیحدگی اختیار کرنے لگے۔

شیعیت کو ریاستی مذہب کا درجہ دینے کا ایک اور منفی نتیجہ نکلا۔ شیعی دینی علماء کے اندر ایک خطرناک رجحان اپنی ذاتی اہمیت اور انا کا پیدا ہونا شروع ہوا جس کا خصوصی اظہار مجتہدوں میں ہوا۔ یہ وہ مذہبی اسکالرز تھے جو بنیادی دینی فیصلے کرنے کے مجاز تھے اور جنہیں بعد میں آیت اللہ کہا جانے لگا۔ مجتہدین نے یہ دعویٰ کیا کہ فارس اگر شیعی مملکت ہے تو بادشاہ ان کی اجازت ہی سے حکومت کر سکتا ہے کیونکہ مجتہدین ہی امام غائب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بدشگونی یہ تھی کہ ان علماء کا کسانوں اور تاجروں پر گہرا اثر تھا اور یہی لوگ دراصل فارس کی مڈل کلاس بناتے تھے۔ اس صورتحال میں بادشاہ کے لئے بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اگر وہ علماء کے رول کو تسلیم کرتا ہے تو اصل اقتدار اس کے ہاتھ میں نہیں رہے گا اور اگر وہ علماء کو نظر انداز کر دیتا ہے تو اس کی حکومت عوامی مقبولیت سے محروم رہے گی۔

اس صورتحال میں بادشاہ نے دوسرا راستہ یعنی علماء کو نظر انداز کرنے کا متبادل اختیار کیا۔ لیکن جس بادشاہ کو قانونی جواز حاصل نہ ہو وہ اسے کسی اور ذریعہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ ان حالات میں صفویوں کے پاس کیا متبادل تھا؟ چنانچہ انہوں نے فوج کو استعمال کیا۔ اب ایک اور بڑا مسئلہ سامنے تھا۔ فوجی معاملات میں تربیت کے لئے انہوں نے یورپی فوجی مشیروں کو مقرر کر رکھا تھا۔ بالآخر یہ ہوا کہ یورپی عیسائی ماہرین کی نگرانی میں صفوی فوج علماء کے خلاف صف آراء ہوتی گئی اور کیونکہ علماء کے اثرات عوام پر بڑے گہرے تھے اس لئے فوج اور عوام میں شدت کا اختلاف مستقبل کی پریشانیوں کا اعلانیہ بن گیا۔

اٹھارویں صدی کا اختتام ہوتے ہوتے تاج پر قبضہ کی یہ جدوجہد خونخواری کی حدوں کو چھونے لگی تو متحارب گروپوں نے ملک کے مختلف علاقوں پر قبضہ جما لیا۔ فارس ٹوٹنے لگا تو سنی صوبوں نے مرکز سے علیحدگی اختیار کر لی اور پڑوس میں رہنے والے سنی ازبک اور افغانوں نے علیحدہ بادشاہت اختیار کر لی اور یوں زبردست نقصان کا باعث بنے۔

جب صورتحال ذرا واضح ہوئی اور فضا تحلیل ہوئی تو معلوم ہوا کہ صفوی جا چکے تھے اور انکی جگہ ایک دوسری خاندانی بادشاہت نے لے لی۔ یہ نیا خاندان جسے خاندان قاجار کہا جاتا ہے وہ بس برائے نام کوئی ۱۳۱ سال تک ایران پر حکمران رہا (یورپی لوگ اسے اب بھی فارس کہتے تھے، جبکہ مقامی لوگوں نے اسے ایران کہنا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ نام کی یہ تبدیلی کسی ایک خاص وقت میں نہیں ہوئی اور دونوں ہی نام قدیم تاریخ میں پائے جاتے ہیں)۔ قاجار حکمرانی میں صفوی دور کے پریشان کن مسائل تسلیم شدہ مان لئے گئے اور عمومی حالات کا حصہ بن گئے۔ قومی فوج میں یورپی مشیروں اور آفیسروں کی بڑی تعداد بیری ہوئی تھی۔ علماء اور حکومت میں ٹھنی رہی۔ کورٹ میں بیرونی اثرات سے نالاں علماء نے اپنے آپ کو اسلام اور روایتی اسلامی ثقافت کے محافظ کے طور پر پیش کیا اور مڈل کلاس اب بھی اسلامی ثقافت سے جڑی ہوئی تھی۔ بادشاہ بالعموم کمزور، کاہل، طالع آزما اور تنگ نظر تھے۔ اس صورتحال میں یورپی ڈور ہلاتے اور یہ کٹھ پتلیاں ان کے پسندیدہ طریقوں سے کام کرتیں۔

یورپیوں نے کبھی بھی فارس پر حملہ نہیں کیا اور اس کی زمین پر کوئی لڑائی نہیں لڑی۔ وہ تو صرف اپنی مصنوعات فروخت کرنے، خریدنے، کام کرنے اور مدد کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ اور یہ لوگ اسی حالت میں تھے جب ٹوٹ پھوٹ اور خلفشار شروع ہوا تھا۔ اور جیسا کہ وائرس موقع کی تلاش میں رہتا ہے وہ جسم پر نظر رکھتا ہے اور جیسے ہی خود حفاظتی نظام کمزور پڑتا ہے وہ اس میں داخل ہو کر پھلنے پھولنے لگتا ہے۔ افتراق پذیر معاشرہ میں جہاں جہاں کمزوری آئی یورپی وہیں جا داخل ہوئے اور جیسے جیسے یہ افتراق بڑھتا گیا یہ زیادہ مضبوط ہوتے گئے اور بالآخر یہ حکم دینے کی پوزیشن میں آ گئے۔

یورپیوں کو یہ پتہ ہی نہ چلا کہ وہ فارس پر قابض ہو گئے ہیں۔ اسکی بڑی وجہ یہ تھی کہ 'وہ' کا بظاہر کوئی وجود ہی نہ تھا۔ مغربی لوگ یہاں مختلف ممالک سے آئے تھے اور اہل فارس ان کے دشمن نہیں تھے بلکہ ان کی سرگرمیوں کا پس منظر بن گئے تھے۔ دشمنی تو ان کی آپس کی تھی۔ مختلف یورپی ممالک سے آئے ہوئے لوگ مثلاً برطانوی، فرنچ، روسی، ڈچ اور اسی طرح دوسرے ممالک کے لوگ جہاں جہاں خلا ہوتا وہاں جس گروہ کو موقع ملتا وہ اس خلا کو پورا کرتا اور کوشش کرتا کہ دوسرا گروہ فارس کو فتح نہ کر سکے۔ دشمنی آخر کار برطانیہ اور روس میں قائم ہو گئی اور اس مقابلہ آرائی کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ مزید مشرق میں ہونے والی ہنگامہ خیزی سے واقف ہوں یعنی وہ تیسری اور آخری عظیم اسلامی سلطنت جو مغلوں کا علاقہ تھا۔

مغلیہ سلطنت میں بنیادی اختلافی مسئلہ ہمیشہ سے ہندو بمقابلہ مسلم رہا تھا۔ اکبر اعظم نے ایک قسم کی مصالحت کی گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے پڑپوتے اورنگ زیب نے ان تمام پالیسیوں کو الٹ دیا۔ راسخ العقیدہ اسلام کو سختی سے نافذ کیا۔ ہندوؤں کے ساتھ تفریق جاری کی۔ چھوٹے چھوٹے ہندو گروہوں جیسے سکھوں کو دبانا اور بالعموم تحمل اور رواداری کی جگہ جبر و تشدد کی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن اس کے باوجود اس تنگ نظر اور مجنونانہ جوش کے حامل بادشاہ کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ اورنگ زیب ایک زبردست

ذہین اور قابل شخص تھا چنانچہ اس نے نہ صرف اپنی سلطنت کو باقی رکھا بلکہ اس کی توسیع بھی کی۔لیکن اپنے پورے دور میں وہ اختلاف اور بے چینی کے بیج بوتا رہا جو پھٹ پڑنے والا ہی تھا اور بالخصوص جب اس کے بعد کم تر صلاحیت کے حامل جانشین برسر اقتدار آنے والے تھے۔

ان کم صلاحیت کے حکمران کی آمد اورنگ زیب کے فوراً بعد ہی شروع ہوگئی۔اور جو جوان کے بعد آئے وہ کمزور ترین تھے۔اقتدار کے پہلے دوسو سالوں میں کل چھ حکمراں رہے جبکہ بعد کے پچاس سالوں کے دوران حکمرانوں کی تعداد آٹھ تھی۔اولین چھ حکمرانوں مین پانچ عالمی تاریخ میں غیر معمولی طور پر ذہین قرار پائے اور آخری آٹھ سب کے سب بونے ٹھہرے۔

ان بونوں کی حکمرانی کے پچاس سالوں میں ہندو مراٹھا بادشاہ جنوب میں ابھرے۔سکھ ایک جنگجو قوت بن گئے۔نوابوں یعنی مسلمان صوبائی گورنروں نے مرکزی احکامات سے صرف نظر کرتے ہوئے آزادانہ کام کرنا شروع کردیا۔درحقیقت پورا ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگیا اور ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسرے گروہوں میں جھڑپیں ہونے لگیں اور یوں عوام کے لئے زندگی میں بے یقینی بڑھنے لگی۔

اس دور انتشار میں پرتگیزی، ڈچ، فرانسیسی اور انگریز ملک کے کناروں پر منڈلاتے رہے۔اور ساحلی علاقوں میں قائم مراکز کے ذریعہ تجارتی سرگرمیاں جاری رہیں۔ابتداء میں تو پرتگیزوں کا اس تجارت پر غلبہ تھا پھر ڈچ نے انہیں ہر جگہ گھیر لیا۔اور جنوب مشرقی ایشیا اور فارس کے ساحلی علاقوں میں قلعے اور تجارتی مراکز قائم کیے۔ پرتگیزوں کو انہوں نے اچھے بحری جہازوں اور بڑی بندوقوں کے ذریعہ شکست دی۔پھر فرانسیسی آئے اور انگریز آئے جنہوں نے ۱۶۳۹ء میں مدراس میں ایک قلعہ تعمیر کیا۔بمبئی جسے آج ممبئے کہتے ہیں انگریزوں کے زیرنگیں اس وقت آیا جب ان کے بادشاہ نے ایک پرتگیزی شاہزادی سے شادی کی اور اس خاتون کے ساتھ جہیز کے ایک حصہ کے طور پر ممبئی بھی آیا۔اس کے بعد انہوں نے خلیج بنگال میں ایک کالونی بسائی جو بڑھ کر کلکتہ ہوگئی۔

یورپی اقوام جو اسی زمانہ میں مشرقی ایشیا کے علاقوں میں آئیں تو انہوں نے عالمی تاریخ میں کچھ ایسا کیا جو نہ صرف نیا تھا بلکہ اس سے قبل کسی نے نہیں کیا تھا۔وہ کوئی فوجی کمانڈر یا سپاہی نہ تھے نہ ہی وہ بادشاہ کے سفیر کی حیثیت سے یہاں آئے تھے اور نہ ہی وہ حکومتوں کی نمائندگی کرتے تھے۔وہ تو نجی کمپنیوں کے ملازم تھے لیکن یہ کمپنیاں ذرا مختلف قسم کی تھیں۔یہ Joint Stock holding تھیں جو آج کارپوریشن کہلاتی ہیں۔

اس طرح کی پہلی کمپنی ۱۵۵۳ء میں قائم ہوئی جب چالیس انگریز تاجروں نے پچیس پچیس پاؤنڈ جمع کرکے ہندوستان جانے کے لئے بحری راستہ کی تلاش کی کفالت کی۔اس مہم میں انہوں نے ہندوستان کے بجائے ماسکو دریافت کیا (مزید نہ پوچھیں)۔اس دریافت سے خاصا منافع ملا اور جب یہ خبر عام ہوئی تو اس بظاہر ''روسی کمپنی'' میں اور لوگوں نے بھی شامل ہونا چاہا۔چنانچہ جن لوگوں نے متعیّن فیس جمع کی انھیں کاغذ کی ایک سلپ مل گئی اور طے پایا کہ کمپنی جب بھی کوئی ایسی مہم کرے گی تو ہونے والا منافع ادا کی گئی فیس کی مناسبت

سے ادا کر دیا جائیگا۔ یہ بھی کہا گیا کہ اگر کوئی چاہے تو اس کاغذ کی سلپ کو کسی ایسے دوسرے فرد کو فروخت بھی کر سکتا ہے جو زیادہ منافع کی امید رکھتا ہو۔ بس اس طرح اسٹاک مارکیٹ کی پیدائش ہوئی۔

۱۶۰۰ء کے قریب تین بہت بڑی بڑی قومی سطح کی کمپنیاں قائم کی گئیں یہ یورپ میں کارپوریشنز کا اولین خاکہ ہے۔ یہ کمپنیاں انگریزوں، ڈچ اور فرانسیسیوں نے بنائی تھیں اور انھیں ایسٹ انڈیا کمپنی کہا گیا۔ یہ ایک محدود ذمہ داریوں کی کارپوریشنز تھیں جن میں حصوں کے مالک پرائیویٹ لوگ تھے۔ ہر کمپنی کا مقصد مشرقی ایشیا میں کی جانے والی تجارت سے منافع حاصل کرنا اور کمپنی کے شراکت داروں کو دولت مند بنانا تھا۔ ہر کمپنی کی نگہداشت ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز کرتا تھا۔ ہر کمپنی کو باقاعدہ طور پر اپنے ملک کی قومی حکومت کی طرف سے اجازت نامہ ملا ہوا تھا۔ ہر کمپنی کو اس کی اپنی حکومت کی طرف سے اسلامی مشرق سے تجارت کے سلسلہ میں کامل اختیار یعنی اجارہ داری حاصل تھی، دراصل فارس، ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا کے علاقوں میں منافع کی غرض سے اصل کام یہی کمپنیاں انجام دیتی تھیں۔

ہندوستان میں کوئی دوسو سال کے دوران یورپی کمپنیوں نے یہاں کی معیشت کو بالکل ہی بدل کر رکھ دیا۔ بالکل اسی طرز پر جس طرح سلطنت عثمانیہ میں ہوا تھا۔ بنگال میں جہاں انگریزوں نے دوسری کمپنیوں کو نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی نے مقامی دستکاری کی صنعت کو بالکل تباہ کر دیا۔ لیکن یہ بربادی اسے مشکل ہی سے نظر آتی تھی۔ کمپنی محض اتنا کرتی تھی کہ خام مال بہت اچھی قیمتوں پر مقامی لوگوں سے خریدتی۔ عوام کو اس خام مال سے اپنی مصنوعات بنانے کے مقابلے میں زیادہ منافع اسے فروخت کر دینے میں ملتا۔ جیسے جیسے مقامی معیشت ذرا بہتر ہوئی تو بنگالی لوگ برطانیہ پر مکمل طور پر منحصر ہوتے گئے اور بالآخر انکے معاون اور اطاعت گزار ہو گئے۔

جب کارپوریشنز پہلی بار ہندوستان آئیں تو مغل بادشاہوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے انہیں مقابلہ آرائی کا سامنا تھا لیکن جب سلطنت کمزور ہو گئی اور انتشار کا شکار ہو گئی تو مرکزی حکومت کی حیثیت روز بروز غیر اہم ہوتی گئی۔ انگریزوں نے سوچا کہ مرکزی حکومت کے بجائے ابھرتے ہوئے مقامی حکمرانوں سے بہتر تعلقات قائم کرنا چاہییں۔ لیکن یہ بھی آسان نہ تھا۔ صحیح مقامی حکمرانوں کو پہنچانا ضروری تھا کیونکہ اگر وہ غلط حکمرانوں کے ساتھ مل بیٹھتے تو نقصان بھی ہو سکتا تھا۔ برصغیر کی سیاست کے بارے میں غلط اندازہ سے کمپنی کو مالی نقصان ہو سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہ سوچا کہ مقامی حکمرانوں میں غلبہ کے لئے جو کشمکش ہو رہی ہے اس کے نتائج کو کنٹرول کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے کمپنی نے پرائیویٹ فوج رکھنا طے کیا تاکہ اپنے حلیفوں کی مدد کی جا سکے۔ یہاں بھی جیسا کہ فارس میں ہوا تھا انگریزوں کا مقابلہ مقامی آبادی سے نہیں بلکہ دوسری یورپی اقوام سے تھا جو یہی کام خود بھی کرنا چاہ رہی تھیں۔ اپنے مقامی حلیفوں کی مدد کے پس منظر میں یورپی اقوام آپس میں قائم مقام ہو کر جنگ کر رہی تھیں۔ اس طرح پرتگیزوں نے سب سے پہلے شکست کھائی اس کے بعد ڈچ نکل

گئے (یہ محض ہندوستان سے نکلے تھے۔ جنوب مشرقی ایشیا میں وہ غالب رہے) اور ہندوستان میں اب انگریزوں اور فرانسیسیوں میں مقابلہ تھا۔

یہاں سے کوئی آدھی دنیا دور شمالی امریکہ میں بھی آخری مقابلہ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں ہی تھا۔ چند درجن یورپیوں میں کچھ جھڑپیں ہوئیں تو واقعات کا ایسا سلسلہ شروع ہو گیا جس کے نتیجے میں پورا ہندوستان برطانیہ کی کالونی بن گیا۔ اس کا آغاز ۱۷۵۴ء کے موسم بہار میں ہوا جب ایک برطانوی فوجی میجر جارج واشنگٹن دریائے اوہایو (Ohio) تک کے علاقہ کا سروے کر رہا تھا۔ اس دوران ایک فرانسیسی اسکاوٹ پارٹی سامنے آ گئی کچھ شاٹ فائر ہوئے جس کے نتیجہ میں ایک ورجینیائی اور دس فرانسیسی مارے گئے اور اس طرح عالمگیر سطح پر فرانس اور برطانیہ میں تنازع کھڑا ہو گیا۔ جس میں برطانیہ کی اکثر اقوام کود پڑیں۔ شمالی امریکہ میں اس تنازع کو فرانسیسی اور ہندوستانی جنگ (French and Indian War) کہا گیا، یورپ میں اسے سات سالہ جنگ (Seven Year war) اور خود ہندوستان میں اسے Third Carnatic war کہا گیا۔[۳]

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ہندوستان میں یورپی حریف دو نیابتی جنگیں (Proxy war) کرناٹک کے علاقہ میں جو آج کے مدراس کے شمال میں ہے لڑ چکے تھے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اپنے مقامی حلیف کو تخت پر بٹھایا جا سکے۔ برطانیہ اور فرانس کے مابین دونوں جنگیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی رہنمائی اور نگرانی میں لڑی گئی تھیں۔ ۱۷۵۶ء میں بنگال کے نواب سراج الدولہ نے کلکتہ کے قلعہ کو فتح کر لیا۔ جون کی ایک شدید گرم رات میں کسی نے چونسٹھ برطانوی شہریوں کو ایک زیرِ زمین قید خانہ میں بند کر دیا جس میں ہوا کا گذر نہ تھا یہ بات طے تھی کہ کوئی ان قیدیوں کو وہاں سے نکال کر انہیں گھروں کو بھجوا دیگا لیکن اس دوران ضروری اشارے نہ مل سکے اور قیدی رات بھر اسی عقوبت خانہ میں رہے اور صبح تک ان میں سے تینتالیس مر چکے تھے۔

یہ خبر بڑی تیزی سے انگلینڈ پہنچ گئی اور پریس میں دیوانگی چھا گئی۔ انہوں نے نواب کے اس عقوبت خانہ کو Black hole of Calcutta کا نام دیا۔ یہ کہانی جتنی بار دھرائی گئی عقوبت خانہ سکڑتا گیا اور قیدیوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ یہاں تک یہ تعداد ۱۴۶ تک بیان کی گئی اور مرنے والوں کی تعداد ۱۲۳ بیان کی گئی۔ کہانی سے برطانوی عوام میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ہندوستان میں رابرٹ کلائیو نام کا ایک شخص جو کبھی کمپنی میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اب وہ کمپنی کی پرائیوٹ فوج میں شامل تھا بدلہ لینے کی غرض سے کلکتہ کی طرف روانہ ہوا۔ نواب کو معزول کر کے حکومت اس کے چچا کے سپرد کر دی (اسے جنگ پلاسی کہا جاتا ہے) اس میں ہوا یہ تھا کہ نواب کے محافظ کو بڑی رشوت دے کر اسے گھر جانے کے لئے کہا اور یوں نواب کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔

لیکن اب بھی انگریزوں نے اپنے آپ کو حکمراں نہیں کہا بلکہ اس چھوٹے سے صوبے کا حکمراں بھی نہیں کہا۔ سرکاری اعتبار سے بنگال ایک مغل صوبہ ہی رہا اور یہاں کی حکومت بھی بنگال ہی رہی۔ کلائیو اس صوبائی حکومت کے محض ایک ملازم کی حیثیت ہی میں رہا، اس نے خود اپنی تنخواہ تیس ہزار پاؤنڈ سالانہ طے کی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے آپ کو بنگال کی حکومت کے مشیر کی حیثیت اختیار کر کے محفوظ کرلیا۔اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ انتظامیہ میں بہتر کارکردگی کی خاطر کمپنی نے طے کیا کہ مغل حکومت کی طرف سے مقرّرہ ٹیکس کی وصولیابی کا کام وہ خود کرے گی۔مزید انہوں نے یہ بھی طے کرلیا کہ مقامی طور پر وہ خود ہی خرچ بھی کریگی اور اس کے پیش نظر بھی بہتر کارکردگی ہی تھی۔ کیونکہ یہ رقم پہلے مرکز جائے اور پھر اخراجات کے لئے واپس آئے اس میں کوئی حکمت نہ تھی۔اور یہ بھی ضروری ہوا کہ کمپنی کی ایک پرائیویٹ فوج ہو جس کے ذمہ حفاظت کے علاوہ قانون کی بالا دستی قائم رکھنا تھی۔ کمپنی کا دعویٰ یہی تھا کہ وہ بنگال پر بہتر حکومتی انتظام کرتی ہے اور ایک فیس کے عوض ضروری خدمات مہیا کر رہی ہے۔

ابتدائی چند سال بنگالیوں کے لئے سخت تھے۔کمپنی نے روزمرہ کے انتظامی معاملات مقامی ہاتھوں میں دے رکھے تھے اور اپنی توجہ صرف کمپنی کے تجارتی معاملات پر مرکوز رکھی،اس کا مطلب یہ تھا کہ کمزور حکومت کی ذمہ داری عوام کے مسائل حل کرنا تھی۔ جبکہ طاقتور کمپنی تمام تر منافع حاصل کرنے کی حقدار تھی۔عوام کے مسائل سے اس کا کوئی لینا دینا نہ تھا کیونکہ وہ کمپنی تھی حکومت نہ تھی۔کمپنی کے شکاری آفیسروں نے بنگال کو نچوڑ لیا اور شکایت کرنے پر انہیں حکومت سے بات کرنے کے لیے کہا جاتا۔ بنگال کے وسائل کی اس لوٹ کھسوٹ نے محض دو سال کے اندر بنگال کو قحط سے دوچار کر دیا جس میں بنگال کی ایک تہائی آبادی کام آ گئی۔ایک اندازے کے مطابق یہ کوئی ایک کروڑ کے قریب افراد تھے۔[۴] قحط سے کمپنی کے لئے بھی مسائل کھڑے ہوئے اور ان کے مفادات کو بھی نقصان پہنچا۔لیکن یہ سیاسی معاملہ تھا کہ جب ایک درخت سوکھنے لگے تو اس کے سہارے چڑھنے والی بیل بھی متاثر ہو جاتی ہے۔

اس مرحلہ پر برطانوی حکومت نے دخل انداز ہونے کا فیصلہ کیا۔ پارلیامنٹ نے ہندوستان کے لئے ایک گورنر جنرل مقرر کیا۔ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنی نگرانی میں لیا اور برصغیر میں اپنی افواج بھیج دیں۔آئندہ سو سالوں میں برطانیہ کی دو افواج ہندوستان میں رہیں۔ایک جان کمپنی (John Company) کے سپاہی تھے جن کی ذمہ داری کارپوریشن سے متعلق تھی اور دوسری ملکہ وکٹوریہ کی کمپنی (Queen's Company) جو تاج برطانیہ کے لئے کام کرتی تھی۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ صرف آفیسرز ہی یورپی ہوتے تھے رائفلیں اٹھانے اور سینہ پر گولیاں کھانے کا کام مقامی سپاہی کرتے۔

بنگال میں کلائیو نے یہ مثال قائم کی جس پر بعد میں دوسری ریاستوں میں بھی عمل کیا گیا کہ جہاں جہاں ضرورت ہو کمپنی کے مفادات کی حفاظت کے پیش نظر برطانیہ کو اختیار ہوگا کہ وہاں کے حکمرانوں کو معزول کر دے اور نئے حکمران مقرر کرے۔۱۷۶۳ء کے بعد یہ اختیار پورے ہندوستان کے لئے حاصل ہو گیا کیونکہ فرانس سات سالہ جنگ ہار گیا جس کے نتیجہ میں اسے برصغیر چھوڑ دینا پڑا۔

برطانیہ میں جلد ہی ایک قانون پاس کیا گیا کہ کسی بھی ہندوستانی ریاست میں جہاں کے حکمران کی

وفات ہو جائے اور اس کے جانشینوں میں کوئی مرد نہ ہو تو وہ ریاست تاج برطانیہ کی ملکیت قرار پائے گی اور اس طرح برطانوی حکومت بتدریج بہت سی ہندوستانی ریاستوں کی راست نگراں ہو گئی۔ بعض دوسری ریاستوں میں انہوں نے اپنے نمائندہ بٹھا دیے جو ان کی مرضی اور مفادات کے تحت حکمرانی کرتے تھے۔ اس طرح ہندوستان ان ریاستوں کا ایک مجموعہ بن گیا جو راست نگرانی میں تھیں یا بالواسطہ طور پر زیر حکومت تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بتدریج برصغیر کی بڑی طاقت بن کر مغلوں کے جانشین کے طور پر ابھرنے لگی۔

جس دوران برطانیہ ہندوستان پر اپنا تسلط مضبوط کر رہا تھا اسی وقت شمالی امریکہ میں اسے اپنی کالونی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ جنرل کارنوالس جس کے بارے میں امریکن تاریخ میں مشہور ہے کہ ایک بار جارج واشنگٹن نے یورک ٹاؤن میں اس کی پٹائی بھی کر دی تھی ہندوستان کا دوسرا گورنر جنرل بنا کر بھیجا گیا جس نے ہندوستان میں برطانوی غلبہ کو مستحکم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ صرف امریکی تاریخ کی روشنی میں دیکھیں تو کارنوالس ایک شکست خوردہ شخص تھا لیکن پورا امکان ہے کہ دنیا سے جاتے ہوئے وہ اپنی خدمات پر فخر کرتا ہوگا۔ ہندوستان کو اس کے زمانہ میں تاج برطانیہ کے ایک ہیرے کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ کالونیوں میں اس کی قیمت اور اہمیت سب سے زیادہ تھی اور اس کی بدولت ہی برطانیہ کو عالمی غلبہ بھی حاصل ہوا تھا۔

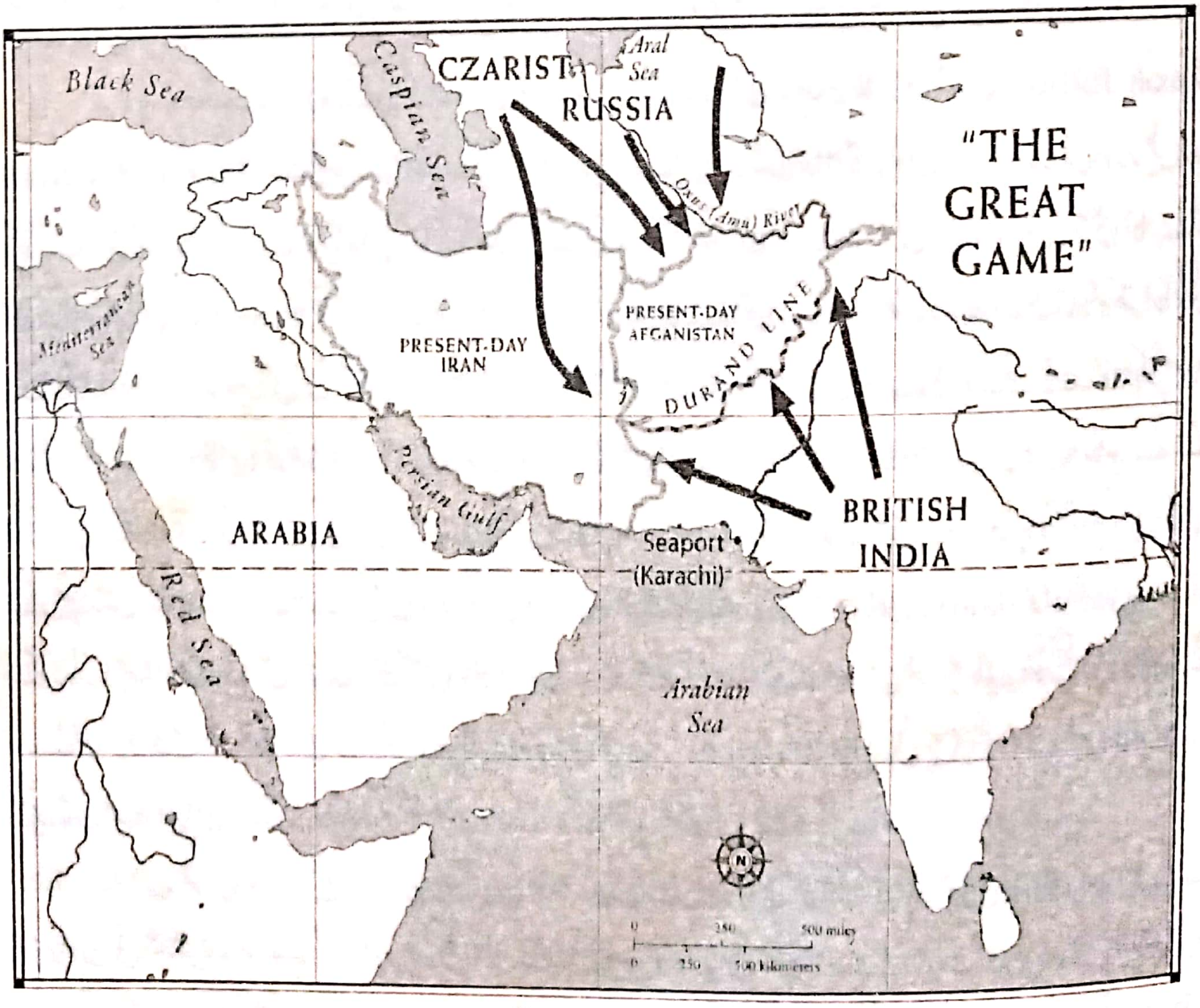
برصغیر کے لامحدود وسائل کی مدد سے برطانیہ اپنی استعماری مہمات افریقہ اور اس سے دور تک وسیع کر سکا۔ چنانچہ اس ہیرے کو کسی ممکنہ خطرہ کا سامنا ہوتا تو برطانیہ بہت حساس ہو جاتا۔ اور اس طرح کا خطرہ واقعی سامنے آنا شروع ہو گیا جیسے ہی اٹھارویں صدی ختم ہو کر انیسوی صدی میں داخل ہوئی اور روس نے اپنے اپنے توسیع پسندانہ عزائم کا اظہار کرنا شروع کیا۔

جب ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کیا تو راسخ العقیدہ عیسائیت ایک انتشار کا شکار ہو گئی تھی۔ قسطنطنیہ ایک ''نیا روم'' اور راسخ العقیدہ عیسائیوں کی دنیا کا دل تھا۔ دل کے بغیر عقیدہ کیسے قائم رہ سکتا ہے۔ اس صورتحال میں ماسکو کا ڈیوک آگے بڑھا اور اس شگاف کو بھرنے کی کوشش کی۔ یہ شخص Ivan the third نے اپنے دارالسلطنت کو تیسرا روم (Third Rome) یعنی راسخ العقیدہ عالم عیسائیت کا نیا دل ہونے کا اعلان کر دیا۔ اُس کا پوتا Ivan the Terrible نے سیزر کا خطاب اختیار کر کے قدیم روم کی شاہی روایات سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا (روسی زبان میں اس کا تلفظ زار تھا۔ ۱۶۰۲ء اور ۱۷۲۵ء کے درمیان ایک زار Peter the Great نے ایک زبردست فوج کی تشکیل کی اور ماسکو کے مشرق میں اپنی سلطنت کی توسیع کرنا چاہی۔ ۱۷۶۲ء میں جب Catherine the great جس کا تعلق رومانوف خاندان سے تھا برسر اقتدار ہوا تو سلطنت بحر کیسپین سے بھی آگے جا پہنچی بلکہ کوہ یورال سے بھی آگے، سائبیریا کے اندر اور وہ تمام میدانی علاقے جو ہندوستان، فارس، عراق اور ایشیا مائنر کے شمال میں تھے۔

Catherine نے جلد ہی متنبہ کر دیا کہ روس محض مشرق کی سمت ہی نہیں بلکہ جنوب کی طرف بھی جا سکتا

ہے۔ کیتھرین کی فوجوں نے عثمانیوں کے خلاف کاروائی شروع کی تا کہ ایک طرف تو بحر اسود (Black sea) پر قبضہ ہو سکے اور دوسری طرف ترکوں کو یورپ سے باہر کر دیا جائے۔ ترکوں سے جنگ تو ٹھیک تھی لیکن برطانیہ کو یہ پسند نہ تھا کہ روسی فوجیں فارس تک پہنچ جائیں بلکہ اس سے بھی خراب یہ بات کہ پہاڑوں کے وہ سلسلے جن میں افغان آباد ہیں ان کے قبضہ میں چلے جائیں۔ کیونکہ اس کے نتیجہ میں تاج برطانیہ کا ہیرا روس کے نشانہ پر ہوگا۔ ہندوکش کے پہاڑ اور فارس کے بلند میدان صدیوں سے ہندوستان کی حفاظت کرتے رہے تھے۔ برطانوی لیڈروں نے طے کیا کہ روسی پیش قدمی کو ہر محاذ پر روکنا چاہیے اور اس طرح بڑے کھیل کا آغاز ہوا۔

بڑے کھیل (The Great Game) کی اصطلاح دراصل ایک برطانوی ناول نگار Rudyard Kipling نے برطانیہ عظمیٰ اور روس کے درمیان اس کشمکش کے لئے استعمال کی تھی جو اُس علاقہ پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے شروع ہوئی تھی جو روسی سلطنت کے شمال سے برطانوی سلطنت کے جنوب تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ تمام علاقہ جو کسی زمانہ میں صفویوں کا فارس، وہ تمام علاقے جو افغانستان میں ہیں اور پاکستان کا بڑا حصہ اور وہ تمام علاقے جو ماضی کی سوویت ریپبلک کا حصہ تھے یعنی ترکمانستان، ازبکستان، کرغستان اور تاجکستان۔ یہ سب مل کر وہ اسٹیج بن رہا تھا جس پر یہ بڑا کھیل کھیلا جانے والا تھا۔



عظیم کھیل یا گریٹ گیم؟

یہ واقعتاً کوئی کھیل نہ تھا۔ ڈرامہ کہنا غلط ہوگا۔ لیکن یہ کوئی جنگ بھی نہ تھی۔ اتفاقیہ لڑائیاں ضرور ہوئیں کچھ قتل عام بھی ہوئے۔ یہاں وہاں ظلم و زیادتیاں بھی ہوئیں۔ لیکن بڑا کھیل دراصل سازشوں، دھمکیوں، سازباز، فوجوں کی باقاعدہ نقل و حرکت، چابکدستی، سیاست اور رشوت اور پیش نظر علاقے کے عوام کو خراب کرنے پر مشتمل تھا۔ مقابلہ یورپ کی دو عظیم طاقتوں کے درمیان تھا اور ان علاقوں کی آبادی تقریباً تمام کی تمام مسلمانوں ہی پر مشتمل تھی جو شطرنج کے مہروں کی علامت تھے۔

ایران کے قاجار بادشاہوں نے یہ سوچا کہ یورپی ٹکنولوجی اور جانکاری کو اپنے یہاں لاکر وہ شاید اپنے ملک کو ازسر نو مستحکم اور طاقتور بنالیں گے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کس سے حاصل کی جائے۔ ان کے سامنے یورپی بھی تھے۔ روسی سفراء بھی اپنی خواہش کے ساتھ دباؤ ڈالے ہوئے تھے اور برطانوی سفراء اور تجّار اپنی کوشش کررہے تھے۔ فرانسیسی، جرمن اور سویڈن کے لوگ بھی موجود تھے۔ یورپیوں کے مقابلہ میں قاجار کے پاس کچھ نہ تھا بلکہ ان کا وجود بھی انہیں کا منت کش تھا۔ اس بات کا امکان تھا کہ وہ کچھ آزادی استعمال کرتے ہوئے ایک یورپی کو دوسرے کے خلاف استعمال کرتے اور فائدہ اٹھا کر انہیں پورے اختیارات دے کر استحصال کا موقع نہ دیتے لیکن یہاں ایران کے بادشاہوں نے دوسرے امکانات دیکھے۔ اور انہیں مکمل معاہدے فروخت کردیے اور اس کے عوض اپنی جیب کے لئے رشوتیں لیں۔ اس طرح انہوں نے اپنی معیشت غیر ملکیوں کے ہاتھوں نیلام کردی۔

ایک حد سے زیادہ بے باک رعایت یہ تھی کہ ایک جرمن نژاد برطانوی شہری Baron Jullius deReuters کو بلاشرکت غیرے اختیار دیا گیا کہ وہ پورے ایران میں ٹرام گاڑیوں کے لئے لائن اور ریل روڈ بچھائے، بلاشرکتِ غیرے اختیار دیا گیا کہ معدنیات کے لئے کھُدائی کرے جنگلوں سے عمارتی لکڑی نکالے۔ اور یہ اختیار بھی دیا کہ ملک کا قومی بینک قائم کرے اور اسے چلائے بھی۔ یہ تمام اختیارات اسے شاہ کو نقد ادائیگی کے عوض اور اس وعدہ پر بھی کہ مستقبل میں تھوڑی رائلٹی ملکی خزانہ میں جمع کرائی جائے گی، ملے تھے۔ عوام کو معلوم ہوا تو مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس طوفان کا کوئی خاص اثر نہ ہوا ہوتا البتہ اتنا ہوا کہ روس اس معاہدے کے مخالفوں کے ساتھ ہوگیا جس کی اپنی وجوہات تھیں۔ اس دباؤ میں بادشاہ جھک گیا اور وہ معاہدہ ختم کردیا۔ جس کے نتیجہ میں معاہدے کے تحت ایران کو چالیس ہزار پاؤنڈ کا جرمانہ Baron Reuters کو ادا کرنا پڑا۔ شاہ کے لئے اچھا ہوا کہ یہ اسکی جیب سے نہیں بلکہ ایران کے خزانہ سے ادا ہوا۔ اور اس طرح ملک اور ٹیکس ادا کرنے والے عوام کو بڑی رقم برطانوی لارڈ کو مفت میں اور کچھ بھی نہ کرنے کے لئے ادا کرنی پڑی۔ البتہ اس معاہدہ کے نتیجہ میں اسے ایران کے قومی بینک کو کنٹرول کرنے کے اختیارات مل گئے۔ [5]

اس طرح کی حرکتیں بار بار ہوتیں۔ معاہدوں کے نتیجہ میں کسی نہ کسی بدعنوان بادشاہ اور اس کے عزیزوں کی جیبیں گرم ہوجاتیں اور یورپی حکومت یا کمپنیوں کو ایرانی معیشت کے کسی نہ کسی پہلو میں اختیار مل جاتا۔ اگر کبھی یہ معاہدے کالعدم ہوتے جیسا کہ ہوا بھی تو اس کی قیمت ایرانی عوام کو ادا کرنی پڑتی۔ ایرانی

شہریوں کو معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔انتہائی کمزور عوام پر قاجار بادشاہوں کے اختیارات بہت تھے وہ اپنے عوام کو جیل میں ڈال سکتے تھے ان پر ظلم توڑ سکتے تھے اور قتل بھی کرا سکتے تھے۔

یورپیوں کے نقطہ نظر سے ملک کی جو کتر بیونت ہو رہی تھی اور جو کچھ انھیں مل رہا تھا وہ تو مال غنیمت تھا۔ان کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ کونسا یورپی ملک اس مال کو ہتھیا سکے گا اور مستقبل میں اسے جاری رکھنے کی پوزیشن میں ہوگا۔اس سلسلہ میں دونوں مدمقابل یعنی برطانیہ اور روس کیونکہ برابر کی قوتیں تھیں بالآخر ایران کو اپنے مفادات اور اختیارات کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کرنے پر راضی ہوگئیں۔روس کو شمال میں لوٹ کھسوٹ کے اختیارات ملے اور برطانیہ کو وہی اختیارات جنوب میں۔اس تقسیم کے نتیجہ میں ایران کی شمالی اور جنوبی سرحدیں مستحکم ہوگئیں اور مشرق کی طرف بھی ایک خط کھینچ گیا اور یوں افغانستان کے ساتھ ایران کی سرحد متعین ہوئی۔

اس دوران مشرق میں کوہستانی علاقہ ہندوکش اور اس کے شمال میں بڑے میدانوں میں بھی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔یہاں ایک قبائلی سردار احمد شاہ بابا نے سرکش افغان قبائلیوں کو متحد کر کے ایک بڑی سلطنت تراش لی تھی جو کبھی کبھی ہندوستان میں بھی پھیل جاتی تھی۔اس طرح کی سلطنتیں اور بھی تھیں لیکن احمد شاہ کی سلطنت اس سلسلہ کی آخری تھی۔احمد شاہ کے جانشینوں کو دو عظیم قوتوں سے نبرد آزما ہونا تھا جو شمال اور جنوب سے اکثر و بیشتر دباؤ ڈالتی رہتی تھیں۔روس اپنے جاسوس اور ایجنٹ افغانستان بھیج کر بادشاہ یا ان سرداروں کو جو بادشاہ کے خلاف کامیاب بغاوت کر سکتے تھے اپنے ساتھ الحاق کے لیے آمادہ کرنا چاہتا تھا یہی برطانیہ کی کوشش بھی تھی۔

برطانیہ نے دو بار حملہ کیا اور افغانستان پر قبضہ کرانا چاہا۔مقصد روس کو روکنا تھا لیکن ہر بار افغانیوں نے انہیں باہر ڈھکیل دیا۔پہلی اینگلو افغان جنگ ۱۸۴۱ء میں ختم ہوئی جس میں افغانیوں نے پوری فوج اور جو بھی برطانوی ساتھ تھے جنگ کے علاقے سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے سب کو قتل کر دیا۔اس کے بدلے کے طور پر تھوڑے عرصہ کے لیے برطانوی فوج واپس آئی اور کابل کے بڑے بازار کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا۔

برطانیہ ابھی اس شکست کے زخموں کو چاٹ رہا تھا کہ ہندوستان میں غدر پھوٹ پڑا۔یہ ۱۸۵۷ء میں سپاہیوں کی بغاوت سے شروع ہوا جس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز افسروں نے ان سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ بندوق کے کارتوسوں کو گائے اور سور کی چربی کے مکسچر سے چکنا کریں۔لیکن یہ حکم ہر طرح سے پریشان کن تھا۔سپاہیوں کی اکثریت یا تو ہندو تھی یا مسلمان۔ہندوؤں کے لئے گائے مقدس تھی اور اس کی چربی سے چکنا کرنے کا حکم بے حرمتی کے مترادف تھا۔مسلمانوں کے لئے سور حرام تھا اس لئے اس کی چربی ان کے لئے مکروہ اور نفرت انگیز تھی۔

ایک دن پوری رجمنٹ نے اپنی بندوقوں کو لوڈ کرنے سے انکار کر دیا۔جو آفیسر انچارج تھا اس نے سخت فیصلہ لیا اور پوری رجمنٹ کو جیل میں ڈال دیا جس کے نتیجہ میں پورے شہر میں فساد بھڑک اٹھا۔بظاہر برطانوی آفیسروں کو یہ اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ اس نوعیت کے کارتوس سپاہیوں کے جذبات کو برانگیختہ کر سکتے ہیں۔یہ سمجھ نہ پانا دلالت کرتا ہے کہ انگریزوں کی معلومات مقامی آبادی کی روایات سے متعلق کتنی کم تھیں۔ثقافتی

معلومات میں یہ کمی یورپیوں کی آمد سے قبل کبھی نہیں دیکھی گئی۔ حالانکہ ہندوستانی فوجیں مختلف قومیتوں اور ملتوں کے افراد سے مل کر بنی تھیں۔ مسلم ترک، مسلم اہل فارس اور ہندی بولنے والے ہندو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہی لڑتے تھے۔ یہ آپس میں لڑ پڑتے تھے اور ایک دوسرے پر برانگیختہ بھی ہوتے تھے لیکن جانتے تھے کہ دوسرے کون ہیں۔ مغلوں کی فوج میں اُردو نے ابھرنا شروع کیا جو ہندی، فارسی اور ترکی سے مل کر بنی تھی۔ لیکن انگریزوں کی رہنمائی میں کوئی نئی زبان نہ بن سکی۔ اور نہ ہی انگریزی زبان کسی مقامی زبان سے مل سکی کیونکہ انگریز آفیسر ایک علیحدہ سطح پر رہتے تھے۔

کارتوس کو چکنانے کے سلسلہ نے ایک بڑا مقصد جسے اکبر اعظم بھی حاصل نہ کر سکا تھا وہ حاصل کر لیا یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد۔ سپاہیوں کی بغاوت پھیل کر عظیم ہندوستانی غدر (۱۸۵۷۔۱۸۵۸) کی شکل اختیار کر گئی جس کے دوران ہندو اور مسلمانوں نے برطانوی آبادی والے علاقوں پر حملے کئے اور یہ حملے پورے ملک میں پھیل گئے۔ مسلمانوں نے اسے جہاد کہا اور جس طرح انہوں نے منظّم انداز میں یہ کام کیا اس سے اندازہ ہوا کہ یہ کسی موقع کی تلاش میں تھے۔ جو کارتوس کے مسئلہ نے فراہم کر دیا تھا۔ غدر کے لئے خاصی تیاری کی گئی تھی۔

کافی تیاری لیکن ناکافی۔ کیونکہ برطانوی فوجوں نے بہت جلد ہی اس بغاوت کو کچل دیا اور پھر آپے سے باہر ہو گئے کوئی ایک مہینہ تک ہندوستانی شہروں کو لوٹتے رہے۔ خوفزدہ شہریوں کو گھروں سے نکالتے اور گلیوں میں قتل کر ڈالتے۔ کم از کم ایک واقعہ ایسا ہوا جس میں انہوں نے مقامی آبادی کو ایک گڑھے کے کنارے قطار میں کھڑا کیا اور دس دس کے گروپ میں سب کو گولی مار دی تا کہ وہ بآسانی گڑھے میں گر جائیں اور ان کی تدفین آسان ہو۔[۶] ایک برطانوی مورخ سر چارلس کروستھویٹ نے اس فاتحانہ مہم کو برطانوی ''الائڈ'' *Iliad کی طرح پیش کرتے ہوئے اُسے نسل کا پرشکوہ اظہار کہا ہے۔

ایک بار جب بغاوت مکمل طور فرو کر دی گئی تو برطانیہ نے تمام تکلفات ختم کر دیے۔ آخری قابل رحم مغل بادشاہ کو جلاوطن کر دیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی کارکردگی محض نجی کمپنی کے مقام تک محدود کر دی۔ تاج برطانیہ نے ہندوستان کو براہ راست اقتدار میں لے لیا۔ نوے سال پر محیط اس راست برطانوی اقتدار کو راج کہا گیا۔

برطانوی رہنما ہندوستان کو تاج برطانیہ کا ہیرا تصور کرتے تھے۔ اور اب وہ اور زیادہ حاسدانہ انداز سے اس کی حفاظت پر کمربستہ ہو گئے۔ ۱۸۷۸ء میں جب انہیں یہ اندازہ ہوا کہ روس پھر افغانستان میں دلچسپی لے رہا ہے تو انہوں نے کابل پر قبضہ کی پھر کوشش کی۔ لیکن ایک بار پھر وہ صحیح اندازہ نہ کر سکے کہ پہاڑی

---

* Iliad ایک یونانی رزمیہ نظم ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ Homer کی تخلیق ہے جس میں Trojan کی جنگ میں سپاہیوں کی پرشکوہ داستان بیان کی گئی ہے۔

علاقوں کو جہاں آپس میں متحارب قبائل آباد ہوں فتح کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ مطلب یہ نہیں ہے کہ علاقہ کو فتح کرنا مشکل تھا جیسا کہ یورپ فتح کے معنی سمجھتے ہیں۔ برطانیہ عظمیٰ بآسانی چہل قدمی کرتے ہوئے کابل پہنچ جاتا، کسی مطیع وفرمانبردار کو تخت پر بٹھاتا اور اپنا ایک سفیر مقرر کر دیتا کہ وہ وقتاً فوقتاً اسے ہدایت دیتا رہے۔ عام حالات میں فتح اسی کو کہتے ہیں لیکن برطانویوں کو محسوس ہوگیا کہ افغان سرداروں کو جھکا لینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ جن لوگوں کو یہ جھکا لیتے وہ ان کے ہاتھوں میں رہ کر ٹوٹ تو جاتے لیکن مکمل طور پر ان پر انحصار کرنے لگتے۔ آلہ کار نہیں بن پاتے جبکہ عوام پہاڑوں میں رہنماؤں کے بغیر گوریلاؤں کی طرح رہنے لگتے۔ دوسری اینگلو افغان جنگ نے اس وقت ناگوار رخ اختیار کیا جب برطانوی سفیر کواگناری (Covugnari) مارا گیا۔ دیہاتوں کی سطح پر تباہ کن جنگ پھوٹ پڑی اور بالآخر برطانیہ کو مجبور ہو کر برصغیر واپس آنا پڑا۔

اس دوسری جنگ کے پس منظر میں برطانوی اور روسی حکومتوں نے محسوس کرلیا کہ پہاڑی علاقوں پر قابض رہنا مشکل کام ہے اور دونوں ہی متفق ہوگئے کہ افغانستان کا پورا علاقہ دونوں سلطنتوں کے درمیان بفر قرار پائے۔ روس آمو دریا کے جنوب سے آگے نہ بڑھے گا اور برطانیہ اس فرضی لائن کے شمال سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کریگا۔ یہ فرضی خط ایک برطانوی ڈپلومیٹ مورٹیمر ڈیورانڈ نے ریگستان کے علاقہ میں کھینچا تھا۔ ان خطوط کے درمیان کا علاقہ افغانستان ہوگیا۔ افغان بادشاہوں نے ماضی میں ممکن ہے کہ وسیع و عریض علاقے فتح کیے ہوں لیکن اب ان کے لیے اندرونی فتوحات کے مواقع تھے یعنی قبائل کی فتح۔ اور ہر چھوٹی وادی کی فتح تا آنکہ یہ تمام علاقہ بتدریج ایک کمزور سے مرکزی کنٹرول میں آجائے جس کا ہیڈ کوارٹر کابل میں ہو۔

لیکن روسیوں نے مکمل طور پر اس خواہش کو چھوڑا نہیں کہ اس علاقے سے ہوتے ہوئے ایک بندرگاہ کے ذریعہ بحر ہند کے گرم پانیوں تک پہنچ سکتے۔ اور برطانیہ بھی روسیوں کی نیت پر ابتدائی شبہ کی پرورش کرتا رہا اور اس طرح عظیم کھیل جاری رہا۔

عظیم کھیل کے مغرب میں ایک اور ڈرامہ کھیلا جارہا تھا۔ یورپی سیاست کی ایک اور توسیع عالم اسلام جس کا اکھاڑا بن رہا تھا۔ اس کے بڑے کھلاڑی برطانیہ اور فرانس تھے جو منتشر ہورہے عثمانی سلطنت کے صوبوں کے لئے لڑ رہے تھے۔ یورپیوں کے لئے اصل سوال یہ تھا کہ یورپ کی روبہ ترقی قومی ریاستوں میں غالب کون رہے۔ میسوپٹامیہ، لیوانت، مصر اور بقیہ شمالی افریقہ نسبتاً غیر اہم مشرقی اجزاء تھے اس عظیم کھیل کے محض مشرقی سوال کی اہمیت؟

'مشرقی سوال' کی اہمیت انقلاب فرانس کے نتیجہ میں زیادہ بڑی تھی۔ یہ ایک ایسا انقلاب تھا جس سے یورپ کے تمام شاہی خاندان خوفزدہ تھے کیونکہ جو تصورات اس کے نتیجہ میں پنپ رہے تھے وہ ان کے قانونی جواز کے انکاری تھے۔ چنانچہ بادشاہتیں انقلابیوں کو کچلنے کے لئے متحد ہوگئی۔ انہوں نے سوچا تھا کہ یہ زیادہ مشکل نہ ہوگا کیونکہ خود فرانس اس انقلاب کے نتیجہ میں خاصی افراتفری کا شکار ہوگیا تھا لیکن یہ اندازہ غلط نکلا۔ انقلابیوں کو

کچلنا اتنا ہی آسان نکلا جتنا بھڑوں کا چھتا آسان ہوتا ہے اور صورتحال مزید خراب اس وقت ہوگئی جب اس انقلاب سے نپولین بونا پارٹ برآمد ہوا۔ جس کی رہنمائی میں فرانس یکا یک ممکنہ فاتح عالم بن کر ابھرا۔ برطانیہ عظمیٰ نے نپولین کے خلاف اپنی فوجیں کھڑی کر دیں اور اس جدوجہد کا ایک اظہار مصر میں رونما ہوا۔

مغربی مورخین بتاتے ہیں کہ نپولین ۱۷۹۸ء میں چونتیس ہزار فوجیوں کے ہمراہ مصر پہنچا۔ لارڈ نیلسن بھی اس کے تعاقب میں وہاں تھا۔ دریائے نیل میں ایک بحری جنگ میں فرانسیسی شکست کھا گئے۔ نپولین اپنی فوج کو چھوڑ کر خاموشی سے نکل گیا اور فرانس پہنچ کر وہاں کا تختہ پلٹ دیا۔ اب وہ فرانس کا حکمراں تھا پہلے سے زیادہ طاقتور اور جنگ جاری رہی۔

لیکن مصریوں کا کیا بنا؟ وہ کون تھے؟ ان کا کیا رول رہا تھا؟ کیا انہوں نے نپولین کی آمد کو سراہا تھا۔ ان کی مدد کی تھی۔ کیا انہیں فتح کر لیا گیا تھا۔ کیا فرانس اور برطانیہ کی جنگ میں انہوں نے کوئی حصہ لیا تھا؟ اور جب یورپیوں نے مصر چھوڑا تو کیا ہوا؟ مغربی مورخین ان سوالات پر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ اور محض فرانس و برطانیہ کے جھگڑے پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے مصری تھے ہی نہیں۔

لیکن وہ یقیناً وہیں تھے۔ جب نپولین پہنچا تو مصر برائے نام ہی سہی عثمانی سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔ نپولین نے اہرام مصر کے سایہ میں مصری اصل فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے اسے محض ایک دن میں ختم کر دیا۔ بقیہ تو صرف صفائی کی کاروائیاں تھیں۔ اصل جنگ اس وقت شروع ہوئی جب برطانوی آ گئے۔ اور ظاہر ہے کہ معرکے یورپین اقوام کے درمیان تھے۔ برطانوی بحری بیڑے نے نپولین کے تقریباً تمام جہازوں کو نیل میں ڈبو دیا۔ کوئی ایک سال تک وہ مصر کے حکمراں کی طرح رہا لیکن اس دوران طاعون پھیلا جس سے اس کی فوج تباہ ہوگئی۔ ملک میں افراتفری پھیلی۔ باغیوں نے حملے بھی کئے۔ فرانسیسی سپاہیوں پر بھی اور مقامی نتظامیہ پر بھی۔ برطانیہ نے مزید فوجیں بھیجیں اور ترکوں کو اکسایا کہ وہ مصر پر حملہ کر دیں۔ نپولین نے اس کے جواب میں شام پر حملہ کر دیا اور جافا شہر میں ہزاروں لوگوں کا قتل عام کیا۔ گو کہ بالآخر وہ فرانس واپس لوٹ گیا۔ لیکن اس دوران مصر لڑکھڑا چکا تھا۔ ایک عثمانی فوجی آفیسر صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اقتدار پر قابض ہوگیا۔ اس کا نام محمد علی تھا جو بنیادی طور پر ایک ترک تھا۔ جس کی پیدائش البانیا میں ہوئی تھی۔ اس نے خود کو مصر کا گورنر ہونے کا اعلان کر کے یہ تاثر دینا چاہا کہ وہ استنبول میں موجود سلطان کے لئے کام کر رہا ہے جبکہ یہ بات سب پر عیاں تھی کہ وہ گورنر نہیں بلکہ آزاد اور خود مختار بادشاہ تھا۔

محمد علی نے دیکھ لیا تھا کہ نپولین کتنی آسانی سے مصر آ گیا تھا اور وہ اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ جلد از جلد مصر کو ٹھیک کرنا چاہیے اور جو کچھ فرانس اور برطانیہ میں ہو چکا ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے تاکہ آئندہ کوئی نپولین یا کوئی لارڈ نیلسن اتنی آسانی سے مار پٹائی کرنے والے گروہ کی طرح مصر میں داخل نہ ہو سکیں اور اسے اسکول کے کھیل کے میدان کی مانند استعمال نہ کر پائیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ نپولین کی کامیابی کا راز کیا تھا؟ ٹھیک ہے محمد علی کو یہ معلوم تھا کہ نپولین نے فرانسیسی

مذہبی علماء اور ان کی اجارہ داری کو ختم کر دیا ہے۔ زیر چرچ چل رہے اسکولوں کو بند کر دیا ہے اور ان کی جگہ ایک سیکولر نظام تعلیم رائج کیا ہے۔ محمد علی نے مصر میں بھی ایسا کرنے کا ارادہ کیا۔ علماء کی ریاستی مالی سرپرستی بند کر دی گئی۔ رفاہی اداروں کی ریاستی مالی امداد بند کر دی گئی۔ اسی طرح مذہبی اسکولوں اور مسجدوں کی مالی امداد بھی بند کر دی گئی۔ حکم دیا کہ تمام مذہبی ادارے جن زمینوں پر قابض ہیں ان کی ملکیت کے کاغذات جمع کرائیں جو ظاہر ہے کہ وہ نہ کر سکتے تھے کیونکہ ان کی ملکیت تو قرون وسطی کے دور سے چلی آ رہی تھی یعنی کوئی تین چار سلطنتوں سے بھی پہلے۔ چنانچہ علی کی حکومت نے اس زمینوں کو واپس لے لیا۔ مصر میں اب بھی اپنے زمانہ کے شرفاء مملوک موجود تھے۔ جو اس عہد میں ٹیکس ادا کرنے والے جاگیردار تھے۔ لیکن علی نے دیکھا کہ یورپ میں حکومت براہ راست ٹیکس وصول کرتی ہے چنانچہ سربرآوردہ مملوک کو ایک رات دعوت طعام پر مدعو کیا اور تمام کو قتل کرا دیا۔ اور پھر زور و شور سے جدید سڑکیں، جدید اسکول اور دوسرے جدید ادارے بنانے کا پروگرام شروع کیا۔ یہ جو کچھ شروع کیا گیا وہ آنے والے دنوں کے لئے نمونہ تھا کیونکہ آئندہ صدی میں ایسے پروگرام بار بار شروع کئے گئے۔

یہ ترقیاتی پروگرام جو اچانک شروع ہوئے تو مصر دیوالیہ ہو گیا۔ اور حکومت قائم رکھنے کے لئے محمد علی کو بیسہ قرض لینا پڑا۔ ظاہر ہے کہ یہ قرض اسے یورپی بینکوں سے ہی مل سکا جنھوں نے یہ شرط عائد کی کہ ان کی ایجنسیوں کو یہ حق دیا جائے کہ وہ حکومت کے ترقیاتی پروگراموں پر نظر رکھیں اور انتباہ کر سکیں کہ پیسے کا استعمال غلط تو نہیں ہو رہا۔

اس دوران محمد علی کی کارگزاریوں سے عثمانیوں کو بے چینی ہو رہی تھی۔ ایک اور حرکت یہ کہ وہ شام پر کچھ مطالبات کر رہا تھا۔ وہ پہلے ہی سے اتنا کمزور ہو چکے تھے کہ خود سے اسے کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے چنانچہ انہوں نے برطانیہ سے مدد طلب کی۔ برطانیہ نے یہ شرط رکھی کہ وہ اس وقت ہی اس معاملہ میں ہاتھ ڈالیں گے جب ترکی اپنے یہاں برطانیہ کو کچھ رعایتیں دینے کے معاہدہ پر دستخط کر دے گا۔ انہوں نے یورپی اقوام کا ایک کنسورٹیم بنایا کہ جو چاہیں اس اتحاد میں شامل ہو جائیں۔ اور جب سب کچھ ہو چکا تو محمد علی کو مصر میں محدود کر کے اسے پورا تحفظ مل چکا تھا لیکن اس پورے علاقے میں طاقتور یورپیوں ہی کو بالا دستی حاصل رہی۔ اب مشرق کا سوال صرف یہ تھا کہ کون سی یورپی قوم بحر روم کے مشرق کی حفاظت کرے گی۔

اس پورے علاقہ میں کیونکہ مصر سب سے قیمتی انعام تھا اور برطانیہ و فرانس دونوں ہی یہاں کی حکمرانی کے دعویدار تھے۔ محمد علی نے قانونی طور پر اپنے خاندان کو یہاں کا حکمراں تسلیم کرا کے محفوظ کر لیا۔ اقتدار اس کے بیٹوں، پوتوں اور اسی طرح نیچے کی طرف گامزن رہا اور چند دہائیوں میں مصر کے ان گورنر بادشاہوں، یعنی خدیو* نے برطانیہ کو مصر میں ریلوے لائن بچھانے کا ٹھیکہ دیا اور پھر فرانس کو تسکین دینے کی خاطر سویز کی تعمیر کی ذمہ داری سونپی جو ایک بہت بڑا ٹھیکہ تھا۔ برطانیہ کا اس پر غضبناک ہونا فطری تھا چنانچہ اس کی تسلی کے لیے مصری

---

* سلطنت عثمانیہ میں مصر کے وائسرائے کو خدیو کہا جاتا تھا یہ سلسلہ ۱۸۶۷ سے ۱۹۱۴ تک جاری رہا۔

نیشنل بینک قائم کرنے اور اس کی ملکیت برطانیہ کے سپرد کردی۔ ظاہر ہے کہ بڑے بڑے معاوضوں کے عوض میں ہوا تھا۔ جو ذاتی خزانہ کا حصہ بن گئے...... دیکھا صورت حال کہاں جارہی تھی۔

اس درمیان محمد علی کے جانشینوں کو خیال آیا کہ مصر کا مستقبل کپاس کی پیداوار سے ہے۔ معلوم ہے کہ ٹیکسٹائل پہلا کاروبار تھا جسے یورپ میں صنعتی شکل ملی تھی۔ چنانچہ کپاس کے بازار پر حریصانہ توجہ ہونے لگی اور ویسے بھی دادی نیل بہترین کپاس پیدا کرتی تھی۔ ۱۸۶۰ء میں عالمی سطح پر کپاس کی قیمتیں اچانک بڑھ گئیں۔ اس وقت کا خدیو جو مشرقی دنیا کا ایک کھلنڈرا اور خرچیلا شخص تھا وہ اپنی ذات اور ملک کے لئے دولت کے بڑے بڑے خواب دیکھنے لگا۔ چنانچہ اس نے یورپی بنکوں سے بے تحاشا قرض لیا۔ مقصد تھا کپاس کی صنعت کو جدید انڈسٹری میں بدل ڈالنا۔ بے تحاشہ بڑھی ہوئی قیمتوں پر اس نے مشینیں خریدیں اور امید تھی کپاس فروخت کر کے یہ قرض واپس ہو ہی جائے گا۔ امید تھی کہ مصر ہمیشہ کپاس فروخت کرتا رہے گا۔

لیکن کپاس کی قیمت میں اچانک ہونے والا اضافہ بس ایک لمحاتی چمک تھی جو دراصل امریکہ میں سول وار شروع ہو جانے کی بنا پر ہوئی تھی۔ سول وار کی بنا پر کپاس آنی بند ہوئی تو یورپی ٹیکسٹائل ملوں کی دھاگہ کی تیاری کے لئے دوسرے ذرائع تلاش کرنے پڑے۔ سول وار ختم ہوئی، کپاس کی قیمتیں گریں اور مصر تباہ ہو گیا اور اب بینکرز اور مالی مشیر مصر کی طرف دوڑے۔ اس صورتحال سے نپٹنے کے لئے ہر مصری آفیسر کے پاس اپنا ایک مشیر تھا۔ لیکن مشرق کا سوال اب بھی باقی تھا۔ صورتحال سے نپٹنے کے لئے فرانس اور برطانیہ دونوں ہی تیار تھے کہ مصر پر مکمل غلبہ کون حاصل کرے۔

اس سلسلہ میں برطانیہ کو ذرا برتری حاصل تھی اور یہ سمجھتے ہوئے فرانس نے اس بات کے لئے بھرپور کوششیں شروع کردیں کہ اگر مصر نہیں تو مزید مغرب میں اسے جو برتری حاصل ہے اسے ہر طرح باقی رکھا جائے۔ انقلاب فرانس کے انتشار کے زمانہ میں الجیریا کے دو یہودی خاندانوں نے فرانس کو اپنی فوجوں کے کھانے کی ضروریات کے لئے آٹھ ملین فرانک کی قیمت پر اشیاء خورد ونوش فراہم کی تھیں۔ جب نپولین کو زوال آیا اور فرانس نے پھر بادشاہت اختیار کرلی تو فرانس نے یہ قرض واپس کرنے سے انکار کردیا۔ چنانچہ اس صوبہ کے عثمانی گورنر نے اس سلسلہ میں فرانس کے قونصل جنرل Pierra Duval سے اس سلسلہ میں وضاحت طلب کی۔ ڈووال نے جواب میں کہا کہ فرانس عربوں سے پیسہ سے متعلق بات نہیں کرتا۔ گورنر نے ڈووال کے منہ پر تھپّڑ ماردیا...... ایک زوردار ضرب تھی۔ فرانس کے وقار پر یہ ضرب کاری تھی۔ فرانسیسی پریس میں ''ضرب کاری کا معاملہ'' کے عنوان سے اس کی تشہیر ہوئی۔ اس پر کوئی نہیں ہنسا۔ ذلّت اور بدزبانی کے اور بھی واقعات کا تبادلہ ہوا اور تناؤ بڑھتا گیا۔ ادھر یہ سب ہورہا تھا فرانس میں بادشاہت اور آزاد فکر کے ہمنواؤں میں جھڑپیں شروع ہوگئی تھیں۔ بادشاہت کے علمبردار جو اس وقت حکمراں تھے انہوں نے سوچا کہ اس وقت اگر تیزی سے کوئی کامیاب فوجی مہم سر کرلی جائے تو اس کے اثرات پھیلے ہوئے اندرونی اضطراب پر بھی پڑیں گے۔ نپولین یہ پہلے

ہی ظاہر کر چکا تھا کہ اس سلسلہ میں عرب بہت کمزور ہیں۔ اور بڑی آسانی سے انہیں شکست دی جاسکتی ہے چنانچہ ۱۸۳۰ء میں الجیریا پر فرانس نے حملہ کر دیا۔ ؎

یہ مہم بہت جلد سر کر لی گئی۔ فرانس کی توقع کے عین مطابق گورنر ناپلس فرار ہو گیا۔ اپنی تمام جائیداد اور مال ومتاع چھوڑا اور ملک کو لیڈر کے بغیر۔ فرانس کو الجیریا سے کوئی سو ملین فرانک کی یافت ہوئی۔ جس کا آدھا فرانسیسی خزانہ میں پہنچا اور بقیہ نصف سپاہیوں اور افسروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ حکومت ختم ہوئی تو الجیریا میں اقتدار کا خلا پیدا ہو گیا اور ہم جانتے ہیں کہ فطرت کو یہ صورتحال کس قدر ناپسند ہے۔ بجائے اس کے کسی کو اپنی طرف سے حکمراں بنایا جاتا اور اپنا نمائندہ بنا کر کٹھ پتلی حکومت چلاتا فرانس نے فیصلہ کیا کہ الجیریا کو فرانس کا حصہ مان لیا جائے اور اس طرح تین نئے صوبے فرانس کی قومی حکومت کا حصہ بن گئے۔ دوسرے الفاظ میں فرانس نے الجیریا کے ساتھ کالونی کا رویہ نہیں اختیار کیا بلکہ اسے اپنا حصہ قرار دیا۔ ایک کمیٹی قائم کی گئی تاکہ اس کے ذریعہ زمینیں فرانسیسیوں کو فروخت کی جائیں اور وہ وہاں رہ کر اس صوبہ کی ترقی کے لئے کام کریں۔

الجیریا میں بھی جہاں فرانس نے کھلم کھلا حملہ کیا تھا بیرونی ممالک کے لوگ سیلاب کی طرح امنڈ پڑے۔ ان مہاجروں نے مقامی آبادی سے جنگ نہیں کی۔ انہوں نے کوئی اسی فیصد زمین باقاعدہ خریدی اور ایک بالکل نئی معیشت کا آغاز کیا جس کا مقامی لوگوں کی معیشت سے کوئی مقابلہ نہ تھا بلکہ اسے نظر انداز ہی کر دیا گیا تھا۔ الجیریائی عرب آزاد تھے کہ جو زمین ان کے پاس بچی تھی اس پر جو چاہیں کاشت کریں اور اسے الجیریائی بندگاہوں کے ذریعہ دوسرے ممالک بھیجیں اگر وہ اس کا کرایہ برداشت کر سکیں۔ اپنی مصنوعات دنیا کے بازار میں فروخت کریں اگر انہیں خریدار مل جائیں۔ جو وہ نہیں کر سکتے تھے۔ اور اگر چاہیں تو ان زمینوں کو چھوڑ کر شہروں میں آباد رہیں۔ اور وہاں رہ کر تجارت کریں بشرطیکہ ان کے پاس اس کے لئے سرمایہ ہو جو ظاہر ہے کہ ان کے پاس نہ تھا۔ اور یہ بھی کہ اگر انہیں فرانسیسی افسروں سے تجارت کرنے کا لائسنس مل جائے جو بہت سی قانونی وجوہات کی بنا پر اکثر ملتا نہیں تھا۔

چنانچہ الجیریائی عرب روایتی انداز میں محض آپس ہی میں خرید وفروخت کرتے تھے اور باقی ملک عالمی سطح اور یورپ کے مارکیٹ کا حصہ ہو کر جدید ترین اور یکساں انداز میں تجارت کرتا تھا۔

اگر کسی الجیریائی سے یہ دریافت کیا جاتا کہ کیا وہ اسی فیصد زمین کی فرانسیسی خریداروں کو فروخت کی حمایت کرتا ہے تو یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوتا اور اگر کسی کو اس فیصلہ کا سامنا ہوتا تو یقیناً اس کا انکار ہی کرتا۔ لیکن کسی کو یہ موقع ہی نہیں دیا گیا کہ اسی فیصد ملک کو فروخت کر دینے کے لئے اس کی مرضی معلوم کی جائے۔ ہر مالک جو اپنی جائیداد فرانسیسی کو بیچتا تھا اس کو محض یہ فیصلہ کرنا تھا کہ جائیداد کا ٹکڑا وہ اس ایک ہی فرانسیسی کو فروخت کرے۔ اس کا امکان تھا کہ اسی فیصد ملک بیرونی لوگوں کو فروخت کر دینے کی مخالفت کی جاتی کیونکہ ایک خاص ٹکڑا ایک خاص خریدار کو فروخت کرنے کی آزادی نے بہرحال کچھ امکانات روشن رکھے تھے۔

اگلی ایک صدی میں الجیریا میں فرانسیسیوں کی تعداد سات سو ہزار تک پہنچ گئی۔ وہ زیادہ تر زمینوں کے مالک تھے اور خود کو الجیریائی ہی سمجھتے تھے کیونکہ وہ اسی زمین پر پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والدین بھی یہیں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ایک بات پریشان کن تھی کہ ان کے ساتھ ساتھ کوئی پانچ ملین عرب بھی یہیں رہتے تھے جن کی یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ لوگ کہاں سے آئے ہیں اور یہاں پر کیا کر رہے ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کے پاس کوئی کام نہیں ہے اور وہ لوگ جس معیشت پر منحصر تھے وہ تقریباً مکمل طور پر اس معیشت سے بالکل علیحدہ تھی جس میں فرنچ الجیریائی مشغول تھے۔

۱۸۵۰ء تک وہ تمام علاقہ جو ایک وقت دارالسلام کہلاتا تھا، یوروپیوں کے کنٹرول میں تھا۔ ان ممالک میں وہ اشرافیہ کی طرح رہتے تھے۔ وہ مقامی لوگوں پر یا تو براہ راست حکمرانی کرتے یا یہ فیصلہ کرتے کہ کون حکمراں ہو۔ وسائل و ذرائع پر ان کا حکم چلتا تھا۔ پالیسی طے کرنے میں بھی ان کا ہی حکم آخری تھا۔ عوام کی روزمرہ کی زندگیوں پر ان کا پہرہ تھا۔ مصر، ایران اور ہندوستان جیسے ملکوں کے کلبوں میں مقامی لوگوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ یورپی لوگوں کو یہ غلبہ کسی بڑی جنگ یا کسی بڑی سطح کے حملہ کے بغیر ہی مل گیا تھا۔ یورپیوں کے علم میں بھی نہ تھا کہ ایک جدوجہد ہوئی تھی۔ اور جس میں وہ کامیاب رہے تھے لیکن مسلمان اسے سمجھتے تھے کیونکہ جب آپ کسی سخت چٹان کے نیچے ہوں تو اس سے صرف نظر کرنا بہت مشکل ہوتا ہے بہ نسبت اس کے آپ اس کے اوپر ہوں۔

باب : ۱۳

اصلاحی تحریکات

(۱۱۵۰ تا ۱۳۳۶ھ، ۱۷۳۷ تا ۱۸۱۸ء)

ایک طرف مسلم دنیا اُتھل پتھل سے گزر رہی تھی دوسری طرف اس دوران اور اس کے متوازی مسلم دنیا ہی میں ایک دوسری کہانی جنم لے رہی تھی۔ اس کہانی کی جڑیں بنیادی طور پر فکریات میں پیوست تھیں۔ اس کا آغاز ۱۸۰۰ء سے قبل ہوا اور اس کے کافی عرصہ بعد تک یہ جاری رہی۔ اس کے نتائج دنیا کو آج تک ہلائے ہوئے ہیں۔ اس کہانی میں اصل کردار ان تحریکوں کا ہے جو مسلمانوں کی اصلاح اور ان کے احیاء کے لئے برپا ہوئیں اور پورے عالم اسلام میں اس وقت ہی ابھریں جب یورپ اس پورے علاقے کو تہہ وبالا کر چکا تھا۔

یہ دو کہانیاں ہیں جو آپس میں جڑی ہوئی تو ہیں لیکن ایک جیسی نہیں ہیں۔ مسلمانوں کی حالت جو سابق سے چلی آ رہی تھی اسے ایک قسم کے عمومی چیلنج کا سامنا تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ ۱۷۰۰ء تک مسلم دنیا میں روحانیت بھی اصولوں، ضابطوں اور نظم کا بالکل ایسے ہی شکار ہو گئی تھی جیسے قرون وسطی کے یورپ میں عیسائیت کو کیتھولک چرچ نے کیا تھا۔ مسلم قانون کا ایک پورا نظام اس طرح اور اس کمال کے ساتھ مرتب کر لیا گیا تھا کہ شاید کچھ بچا ہی نہ تھا کہ کوئی تازہ دم کچھ کرنے کی ہمت پیدا کر سکے۔ تخلیقی قوتوں کے اظہار کے لیے کچھ بچا نہ تھا۔ ذات ہو یا معاشرہ ایک نقطے سے لے کر پورے وجود پر شریعت کو منطبق کر کے بتایا جا چکا تھا۔ علماء کی قوت اور ان کی اثر انگیزی تہہ در تہہ مضبوط ہو گئی تھی۔ صوفی سلسلے اداروں کی شکل اختیار کر چکے تھے اور رہنمائی کی ہر سطح پر فائز لوگوں کا اتفاق تھا کہ ''اجتہاد کے دروازے بند ہو چکے ہیں''۔

یاد رکھیے کہ اجتہاد کے معنی ''عقل کی بنیاد پر آزادانہ غور وفکر'' کے ہیں۔ اس میں کتاب سے انحراف نہیں بلکہ یہ کتاب کے منشاء پر خلاّقانہ غور وفکر سے عبارت ہے۔ مسلمان علماء نے ایک بار اس کی اجازت دے دی تھی کہ اجتہاد ان مسائل میں کیا جا سکتا ہے جو بہت واضح طور پر قرآن میں بیان نہیں کئے گئے۔ پھر کہا گیا کہ قرآن اور حدیث میں بیان نہیں کئے گئے۔ اور پھر یہ کہا گیا کہ قرآن، حدیث اور اس کام میں جو گذشتہ علمائے معتبر نے انجام دیا۔ ان میں بھی کوئی ہدایت نہیں ملتی۔...... اور اس طرح اٹھارویں صدی آتے آتے اہم علماء اس بات پر متفق ہو گئے تھے کہ جب کوئی غیر معیّن اور قرار ناپذیر مسئلہ بچا ہی نہیں اور ہر چیز اور ہر بات پر رائے آ چکی، ہر قسم کی تیاری کی جا چکی اور تفصیلات واضح ہو چکیں تو عام آدمیوں کو اب آزادانہ غور وفکر کی ضرورت نہیں

رہی۔ انہیں اب کچھ نہیں کرنا بس اصولوں کی پیروی کرنا ہے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اصولوں کی پیروی روح کی پیاس کو بجھا نہیں پاتی جس کی جستجو انسان مذہب میں کرتا ہے۔ اسلام کے اصولوں اور ضابطوں میں بندھنے کے نتیجہ میں اس کے تئیں رویوں میں ویسی ہی تفصیحکی فضا اور بے اطمینانی پیدا ہوئی جس کا سامنا عیسائیت کو تھا اور نتیجہ میں پروٹسٹنٹ تحریک برپا ہوئی تھی اور ہوا بھی یہی کہ اٹھارویں صدی کے نصف سے ہی پورے عالم اسلام میں اصلاحی تحریکیں پھوٹ پڑیں۔

لیکن ان تحریکات میں عیسائیت کی پروٹسٹنٹ تحریک کا انداز نہ تھا۔ چنانچہ ان کا کوئی بھی نتیجہ سامنے نہ آیا جیسا عیسائیت کی اصلاح کے ساتھ آیا تھا۔ انفرادیت عقیدہ کی اہمیت اختیار نہ کرسکی۔ مذہب اور قومیت کا امتزاج نہ ہوسکا۔ (بجز ایک اعتبار سے ایران میں) چرچ اور ریاست کی علیحدگی بھی یہاں دیکھنے کو نہ ملی۔ دنیا کی سیکولر اور مذہبی دائروں میں تقسیم کے سلسلہ میں کوئی فکری خاکہ نہ بن سکا۔ مغرب کے دورِ تنویر کی طرح یہاں آزاد خیالی کا اچانک کوئی سیلاب نہ آیا۔ اور اس طرح کوئی جمہوری سائنسی یا صنعتی انقلاب نہ آسکا۔

ایسا کیوں نہ ہوسکا ؟

ٹھیک ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ کچھ مسائل جنہوں نے پرونسٹنٹ تحریک کو برپا کیا تھا یہاں وہ کھڑے ہی نہ ہوئے تھے۔ ان کی چرچ سے بغاوت ہوئی تھی۔ اسلام میں کوئی چرچ ہی نہ تھا۔ پروٹسٹنٹ تحریک نے پوپ کے اختیار پر حملہ کیا تھا اسلام میں پوپ ہی نہ تھا۔ پرونسٹنٹ کہتے تھے کہ خدا اور انسان کے درمیان پادری ایک واسطہ ہے جبکہ اسلام میں ایسی کوئی چیز نہ تھی۔ علماء تھے تو ان کا رول وکیلوں جیسا تھا نہ کہ پادری کا۔ پرونسٹنٹ کا زور اس پر تھا کہ خدا اور اس کی پرستش کرنے والے فرد کے درمیان براہ راست تعلق ہو۔ مسلمانوں کی عبادتی رسومات اسی پر زور دیتی تھیں۔

لیکن اس کے باوجود بھی یورپ اور یورپی اقوام کو ہم نظر انداز نہیں کرسکتے۔ مسلمانوں کے یہاں اصلاح کے سلسلہ میں جو کچھ ہوا اس میں ان کا بھی رول تھا۔ اگر منظرنامہ یوروپیوں سے خالی ہوتا تو مسلمانوں کی اصلاحی تحریکات ممکن ہے کہ کوئی اور رخ اختیار کرلیتیں۔ یورپی اصلاحی تحریکات خالص یورپی پس منظر میں وقوع پذیر ہوئی تھیں۔ یعنی پروٹسٹنٹ تحریک کے حامیوں نے کیتھولک عقائد اور اعمال کو چیلنج کیا تھا۔ وہ ان مسائل سے نبرد آزما تھے جو ان کے معاشرہ میں درپیش تھے۔ کسی بیرونی ثقافتی چیلنج کے خلاف عیسائیت کی حفاظت نہیں کر رہے تھے۔ ۱۵۱۷ء میں بعض مغربی عیسائیوں کو یہ فکر لاحق ہوئی تھی کہ مسلمانوں کے پاس دل و دماغ کو مسخر کرنے والا پیغام موجودہ عیسائیت کے پاس نہیں۔ لیکن ایسا نہ ہوا کہ عیسائی نوجوان اسلام قبول کرنے لگے ہوں۔ یہ بات درست ہے کہ ترک دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ لیکن وہ ان کے رہائشی کمروں تک نہیں پہنچے تھے اور بیڈروم سے تو وہ یقیناً بہت دور تھے۔ ترکوں کی طرف سے عیسائیوں کی جسمانی صحت کو خطرہ تھا نہ کہ ان کی روحانی صحت کو۔

مسلمان دوسری کشتی میں سوار تھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ ابتداء ہی سے اسلام میں سیاسی

اور عسکری کامیابی کو عقیدہ کی دلیل اور وحی کے ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اس عمل کا آغاز ابتدائی دور کی اور علامتی اہمیت کی حامل جنگوں یعنی بدر اور اُحد سے ہوا تھا جب ان کے نتائج کو دینیاتی معنی میں پیش کیا گیا۔ نیز رفتار، وسعت پذیری اور فتح اور سچّائی کے باہمی تعلق نے جو معجزاتی فضا پیدا کی وہ سینکڑوں سال تک باقی رہی۔

پھر منگولوں کے ذریعہ تباہی ہوئی جس نے مسلم ماہرین دینیات کو اپنے مفروضوں پر نظر ثانی کرنے کے لئے مجبور کیا۔ جس کے نتیجہ میں ابن تیمیہ جیسے مصلح پیدا ہوئے۔ لیکن منگولوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کمزوری بالکل واضح طور پر قابل فہم تھی۔ منگول قتل و غارت گری کی صلاحیتوں سے اچھی طرح آراستہ تھے لیکن وہ کسی فکر اور نظریہ کے بغیر ہی آئے تھے۔ اور جب خون بہانے میں مستور جوش وخروش محض زخم لگانے تک محدود ہو گیا تو جیسا کہ عام طور پر ہوتا آیا ہے انسان کو فکر اور معنی کی ہُوک ستانے لگی۔ منگولوں کے پاس ایسی کوئی چیز نہ تھی جو اس ہُوک کا مداوا کر سکتی چنانچہ وہ خود ہی بدل گئے۔ اور بالآخر اسلام کامران ہوا۔ اس نے منگولوں کے وجود کو اپنے میں غرق کر لیا۔ اسی طرح جیسے پہلے ترکوں کو اور ان سے پہلے اہل فارس کو کر چکا تھا۔

اسلام میں شامل ہونے کے نتیجہ میں منگولوں کی خونخواری اور خون کی پیاس کم نہیں ہوئی۔ تیمور لنگ نے شاید یہی ثابت کیا تھا۔ لیکن کم از کم یہ ہوا کہ ان نئے حکمرانوں کے زیر سایہ پرانی جستجو دوبارہ شروع کرنے کا موقع مل گیا۔ گو کہ اپنی تباہ شدہ دنیا سے دھواں بھی اٹھنا بند نہ ہوا تھا۔ اللہ والوں کی امت کی تعمیر نو اور اسے عالمگیر بنانے کی کوششیں پھر شروع ہو گئیں۔

لیکن نئے حکمرانوں کے ساتھ یہ معاملہ نہ تھا اور یورپی جب مسلم علاقوں میں آئے تو وہ کسی بے یقینی کا شکار نہیں تھے وہ اپنے طرز حیات کے بارے میں پُر یقین تھے اور حقیقت کے اپنے تصورات کی روشنی میں چیزوں کو دیکھتے اور پرچار بھی کرتے۔ انھوں نے اسلام کو چیلنج کرنے سے زیادہ اس سے صرف نظر زیادہ کیا البتہ صرف مشنریوں نے ہی مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کی کوششیں کی۔ کہیں اسلام سے رابطہ ہوتا تو وہ کسی بحث ومباحثہ میں نہ پڑتے (مشنریز ہمیشہ بحث ومباحثہ سے گریز کرتے ہیں) بلکہ صرف مسکرادیتے جیسے بچے کے ہاتھ میں کھلونا دے کر قدیم لوگوں کی متبّرک نشانیوں کو دیکھ کر کوئی مسکرادے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ مسلمان صاحبان ذوق کے لئے کتنی غصہ دلانے والی بات ہوتی ہوگی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس حالت میں مسلمان کر بھی کیا سکتے تھے۔

اگر مسلمانوں اور عیسائیوں کو کوئی ایسا پلیٹ فارم مل بھی جاتا جہاں تبادلہ خیالات ہوسکتا ہوتو یہ مسلمانوں کو درپیش پہیلی کے کام کا نہ تھا کیونکہ دسویں صدی میں اسلام کو درپیش چیلنج عیسائیت سے نہیں بلکہ اس سیکولر اور انسان پرستی پر مبنی ورلڈ ویو سے تھا جو پروٹسٹنٹ اصلاحات کے نتیجہ میں ابھرا تھا۔ یعنی وہ معجون مرکب جسے آج اکثر جدیدیت کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی کمزوری اور یورپیوں کی طاقت کی وجہ واضح نہ تھی۔ یہ خالص عسکری برتری کا سوال نہ تھا۔ اس لئے کہ پورے غلبہ تک پہنچنے میں غیر ملکیوں نے قتل و غارتگری کا سہارا بہت ہی کم لیا تھا۔ بلکہ اکثر ایسا بھی

ہوا کہ نئے حکمرانوں نے اپنے آپ کو باقاعدہ حکمران کے طور پر بھی پیش نہیں کیا۔ اور خود کو اسطرح رکھا کہ اکثر مسلمانوں کے بادشاہ ان کے اپنے مقامی لوگ ہی رہے۔ ان کی اپنی پرانی سرکاری عمارتیں ویسی ہی رہیں اور پرانے مسلم افسران اب بھی دستاویزوں پر پرانی مُہریں ہی لگاتے۔ بعض اوقات دارالسلطنت بھی وہی تھے اور ان کی شان وشوکت بھی پہلے کی طرح قائم تھی۔ دارالسلطنت میں محل، محل میں تخت اور تخت پر بالعموم شاہ، سلطان، نواب، خان وخدیو جو بھی استعمال ہوتا ہو یا پھر کوئی مقامی حکمراں جو اپنی دولت اور شان وشوکت کی بنا پر پرانے حکمراں جیسا ہو۔

ایران میں بیرونی ممالک کے یہ گماشتے حکمراں طبقہ کے اردگرد چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ لیکن محض مشیر کار کی حیثیت میں۔ ترکی میں وہ مشیروں کی حیثیت سے تنخواہیں لیتے تھے۔ مصر اور لیوانت کے علاقوں میں وہ محافظوں کی حیثیت میں تھے۔ ہندوستان میں بھی جہاں برطانوی حکومت نے گورنر جرنل مقرر کر دیا تھا یا ملٹری اور پولیس جو امن وامان قائم رکھنے کا کام کرتی تھیں بالعموم مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں اور دوسری مقامی اقوام پر مشتمل تھیں۔ اس صورتحال میں مسلمان یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ خود ان کی حکومت نہیں ہے۔

اس سب کے باوجود اٹھارویں صدی کا آخر آتے آتے مسلمانوں کو خوف وہراس کے ساتھ محسوس ہوا کہ وہ مفتوح ہو چکے ہیں۔ بنگال سے لے کر استنبول تک وہ بیرونی قوتوں کے محکوم ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو میں ان کی خدمت گذاری اور اطاعت میں مصروف ہیں۔ اپنے شہروں، اپنے دیہاتوں، اپنے محلوں بلکہ اپنے گھروں میں بھی ان کے محکوم ہیں اور یہ بیرونی لوگ ایسے نہ تھے کہ محض کسی پڑوسی ملک سے آئے ہوں۔ بلکہ ان کی روایتیں مختلف، مذہبی رسومات مختلف، لباس مختلف، سر ڈھانکنا (یا بالکل نہ ڈھانکنا) بھی مختلف، گھر بھی انہوں نے مختلف بنائے تھے۔ ان کی انجمنیں اور محفلیں بھی مختلف تھیں۔ یہ لوگ سور کھاتے، شراب پیتے، ان کی خواتین عوام میں آتی جاتیں۔ اور اپنے چہرے کھلے رکھتیں۔ وہ ان باتوں پر قہقہے لگاتے جن میں کوئی مزاح نہ ہوتا اور ان باتوں میں انہیں مزا نہیں آتا جو دلوں کو خوش اور مسرور کرنے والی ہوتیں۔ بے ذائقہ کھانا کھاتے، ایسی موسیقی سنتے جو کانوں کو شور وہنگامہ جیسی لگتی۔ اور اپنے خالی اور تفریحی اوقات حقیقت سے دور اور بے مقصد کاموں میں گذارتے جیسے کرکٹ اور تاش۔

اس صورتحال میں وہی سوال پیدا ہوا جو منگولوں کے ذریعہ لائی گئی تباہی کے نتیجہ میں اٹھا تھا۔ مسلمانوں کی فتوحات اور ان کے پروجیکٹ کی وسعت پذیری کا مطلب اگر وحی کی سچائی کا ثبوت ہے تو موجودہ بیرونی اقوام کی مسلمانوں پر کامیابی اور مسلمانوں کی نامرادی ان کے عقیدہ کے بارے میں کیا ثابت کرتی ہے؟

عالم اسلام پر مستقل لٹکے ہوئے سوال کے پس منظر میں اسلام کے احیاء کے لیے اٹھنے والی تحریکات اور مسلمانوں کی طاقت کے از سرنو حصول کی ضرورت کو علیحدہ نہیں کیا جا سکا۔ انہیں یہ بتانا تھا اور اس کی وضاحت کرنا تھی کہ جو صداقت وہ پیش کر رہے تھے کس طرح تاریخ کو اپنے رخ پر واپس لائے گی؟ ان کی تجاویز اور

تحریک کس طرح امت کی شان وشوکت اور عزت ووقار کی کو واپس لائے گی۔ وہ کس طرح مسلمانوں کو تاریخ کے نقطۂ آخر کی طرف گامزن کرے گی۔ یعنی ایک ایسی امت کی تعمیر وتشکیل جو عمل، دردمندی اور خدا پرستی سے اسی طرح عبارت ہو جیسی اپنے اس بنیادی سنہرے لمحہ میں مدینہ میں برپا ہوئیں تھی اور مدینہ کا وہ سنہرا لمحہ اس پوری دنیا کو پھر منوّر کردے۔

بہت سے مصلح آئے اور بہت سی تحریکیں برپا ہوئیں لیکن ان سب کو ہم تین پریشان کن سوالوں کے ممکنہ جوابوں کے حوالے سے تقسیم کر سکتے ہیں۔

ایک جواب میں کہا گیا کہ اسلام کو نہیں بلکہ مسلمانوں کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ بدعتوں، بیرونی اثرات اور ردّوبدل نے دین کے چہرہ کو مسخ کر دیا ہے اور یوں کوئی بھی صحیح اسلام پر عمل کر ہی نہیں پا رہا۔ مسلمانوں کو کرنا یہ چاہیے کہ مغربی اثرات سے اسلام کو پاک کریں اور صحیح بنیادی شکل میں اسے بحال کریں۔

دوسرا ردعمل یہ تھا کہ مغرب صحیح ہے۔ مسلمان پرانے اور ناکارہ مذہبی تصورات میں پھنس گئے ہیں۔ انہوں نے اسلام کو جاہل علماء کے ہاتھ میں دے دیا ہے جن کو یہ پتہ ہی نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے دین کو مغربی طرز پر جدید بنائیں کہ اس میں توہمات اور طلسمی سوچ باقی نہ رہے۔ اور یہ ایک ایسے اخلاقی نظام کی حیثیت میں ابھرے جو سائنس اور سیکولر کاموں سے ہم آہنگی رکھتا ہو۔

ایک تیسرا ردعمل یہ تھا کہ اسلام تو دین حق ہے لیکن ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہمیں مغرب سے کچھ سیکھنا بھی ہے۔ اس نقطہ نظر سے مسلمانوں کو دین کی اصل روح کا احیاء اور اسے مستحکم کرنا چاہیئے۔ اپنی تاریخ اور روایات کے احیاء کی کوشش بھی کرنا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ مغرب نے سائنس اور تکنالوجی میں جو کچھ حاصل کیا ہے اسے بھی اپنانا چاہیئے۔ اصلاح کے اس طرز میں مسلمانوں کو چاہیئے کہ خود کو جدید بنائیں لیکن یہ عمل ان کا اپنا ہونا چاہیئے۔ سائنس مسلمانوں کے دین سے نہیں ٹکراتی اور جدید ہونے کا مطلب مغرب میں ڈھل جانا نہیں ہے۔

یہ تینوں ردعمل تین مصلح شخصیتوں کے پیکروں میں ڈھلے ہوئے ہمیں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ملتے ہیں۔ عبدالوہاب عرب میں، سرسید احمد علی گڑھ ہندوستان میں اور سید جمال الدین افغانی جن کا مقام پیدائش تو بہت یقینی نہیں لیکن ان کے اثرات کو ہر جگہ محسوس کیا گیا۔ کسی بھی اعتبار سے صرف یہی تین شخصیتیں نہیں تھیں اور نہ ان کے خیالات ایک دوسرے کی ضد تھے۔ اصل میں یہ اصلاح کی دو مختلف سطحوں پر کام کر رہے تھے ان کے ہم عصروں اور ان کے شاگردوں نے ایک دوسرے کے خیالات سے فائدہ بھی اٹھایا۔ لیکن اس کے باوجود یہ تین شخصیتیں اصلاح اور اسلام کے احیاء کے بارے میں تین مختلف نقطہائے نظر کی نمائندگی کرتی ہیں۔

وہابیت:- عبدالوہاب کی پیدائش 1703 میں نجد میں ہوئی تھی۔ پیلے رنگ کا یہ ریتیلا ریگستانی علاقہ ہماری چشم تصور میں کچھ اسی طرح سے آتا ہے جب ہم عرب کے بارے میں غور کرتے ہیں۔ عبدالوہاب ایک قاضی کے بیٹے تھے اور ان کی پرورش ایک چھوٹے سے نخلستانی شہر میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم کے دوران جب

محسوس ہوا کہ عبدالوہاب کو قرآنیات میں زیادہ دلچسپی ہے تو انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے مدینہ بھیج دیا گیا۔ جہاں ان کے ایک استاد نے انہیں ابن تیمیہ کے کام سے متعارف کرایا۔ یہ وہی شامی النسل ماہر دینیات ہیں جنہوں نے منگولوں کی تباہی و بربادی کے دوران کہا تھا کہ مسلمانوں کو اللہ کی مدد حاصل نہیں رہی۔ اور انہیں اگر اللہ کی توجہ درکار ہے تو اس راہ پر چلنا ہوگا جس پر اولین جماعت چلی تھی اور خود کو اللہ کی مدد کا مستحق ٹھہرایا تھا۔ نوجوان عبدالوہاب ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کیونکہ شاید وہ خود بھی ایسا ہی سوچ رہے تھے۔ *

مدینہ سے فراغت یافتہ یہ نوجوان جب خلیج فارس میں واقع اس وقت کے کاسموپولٹین شہر بصرہ آیا تو اس دیہاتی نوجوان کو یہاں کا ماحول خاصا پریشان کن محسوس ہوا۔ مختلف الخیالی کا ہنگامہ متعدد مکاتیب فکر، مقدس لفظ کے وافر معانی وتشریحات، بھیڑ بھاڑ، روشنیاں، شور و ہنگامہ ان سب نے مل کر اسے ایک قسم کے خوف میں مبتلا کر دیا۔ اس نے سوچا کہ یہ صورتحال ایک غیر طبعی افزائش اور نمو کی طرح اشارہ کرتی ہے۔ جس نے اسلام کو کمزور کر دیا ہے۔

اس نے وطن واپسی کا فیصلہ کر لیا اور وہیں ریگستان کی سادگی سے معمور ماحول میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بنیادی مقصد دین کو اس کی ابتدائی صاف ستھری شکل میں دوبارہ واضح کرنا اور قائم کرنا تھا۔ اس نے گرجدار انداز میں کہا کہ اللہ واحد ہے اور ہر شخص کو اللہ واحد کی عبادت اسی انداز میں کرنا چاہیے جیسے کہ اللہ کی کتاب چاہتی ہے۔ ہر ایک اُن قوانین کی پابندی کرے جن کی نشاندہی وحی الٰہی کرتی ہے۔ ہر شخص کو چاہیئے کہ بالکل اسی طرح زندگی گزارے جیسے مدینہ کے اولین پاکیزہ نفوس نے محمدؐ کے زمانے میں گذاری۔ اور ہر وہ شخص جو اس پاکیزہ دین کی بحالی میں رکاوٹ بنے اسے راستہ سے صاف کر دینا چاہیئے۔

عثمانیوں کے نزدیک عرب کا پورا علاقہ ان کی ملکیت تھا۔ لیکن اس بنجر زمین میں رہنے والے بدّو جو ادھر ادھر کے نخلستانوں میں آباد تھے اور جانور پال کر اور چھوٹی موٹی تجارت سے اپنے وجود کو باقی رکھے ہوئے تھے وہ ہر طرح کے کنٹرول سے آزاد تھے۔ عبدالوہاب کو اپنے بدّو رفیقوں سے کچھ پیروکار مل گئے جنھیں لے کر ملک کے مختلف علاقوں میں ان مقبروں کو تباہ کرنا شروع کر دیا کہ یہ غیر ضروری احترام اور اظہار تقدس کے مقامات بن گئے ہیں۔ عبدالوہاب کی تعلیم ہی یہ تھی کہ اللہ کے علاوہ کسی فرد یا جگہ کا اسی نوع کا احترام دراصل شرک ہے۔ بالآخر عبدالوہاب قاضی بنا دیئے گئے۔ اور اس پوزیشن سے انہوں نے حنبلی فقہ کو نافذ کرنا شروع کیا۔ ان کے خیال میں اس فقہ میں کسی قسم کی مصالحت اور لچک نہیں تھی۔ ایک دن انہوں نے ایک معروف خاتون کو زانیہ قرار

* اس طرح کی وضاحتوں نے بڑے مسائل کھڑے کئے ہیں۔ اس کا ایک واضح مدعا تو یہ ہے کہ جس طرح سلف نے قرآن کریم کو اپنے فکر و عمل کو محور بنایا تھا ہر دور میں مسلمانوں کا رویہ یہی ہونا چاہیے یعنی جن میدانوں میں قرآن کریم ہمیں وضاحت کے ساتھ کوئی ہدایت دیتا ہے اسے حالات اور وقت کے تقاضوں کے تحت اپنایا جائے اور جن مسائل میں کوئی واضح ہدایت نہیں ملتی اس میں قرآنی اقدار اور مزاج کو بروئے کار لا کر غور و خوض کر کے اپنی راہ متعین کرنا چاہئے۔ اس کا سادہ سے مطلب صرف یہ ہے۔ لیکن مذہبی مقتدرہ نے اسے کہیں کا کہیں پہنچا دیا ہے اور آج یہ اس راہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس مقتدرہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر منسلک علماء متعین کرتے ہیں۔

دے کر سنگساری کی سزا دے دی۔ نتیجہ میں ان کے خلاف لوگوں کی ایک بھیڑ اکٹھی ہوگئی۔ اور انہیں قاضی کے مقام سے ہٹانے کا مطالبہ کرنے لگی۔ کچھ لوگ مار ڈالنے کی بات بھی کر رہے تھے۔ عبدالوہاب اس شہر سے فرار ہو گئے اور ایک دوسرے نخلستانی شہر درعیہ کا رخ کیا۔

وہاں کے مقامی حکمراں محمد ابن سعود نے بڑے جوش سے استقبال کیا۔ ابن سعود ایک چھوٹے سے قبیلہ کا سردار تھا لیکن اس کے عزائم بلند تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ جزیرہ نما عرب متحد ہو جائے۔ متحد ہو جانے سے اس کا منشاء یہ تھا کہ وہ اس جزیرہ نما کو فتح کر لے۔ عبدالوہاب جیسے دُھن کے پکّے اور یک رُخے مبلغ میں ابن سعود کو ایک ایسا ساتھی میسّر آ گیا جس کی اسے ضرورت تھی۔ عبدالوہاب کو بھی ابن سعود میں اپنی امیدیں بر آتی نظر آئیں۔ چنانچہ ان دونوں نے ایک معاہدہ کیا۔ ابن سعود نے یہ وعدہ کیا کہ وہ عبدالوہاب کو ملک کی سب سے مقتدر مذہبی شخصیت تسلیم کرے گا اور اس کے وِژن کو ملک بھر میں قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ عبدالوہاب نے یہ عہد کیا کہ وہ ابن سعود کو مسلمانوں کا سیاسی قائد یعنی ان کا امیر تسلیم کرے گا اور اپنے پیرو کاروں کو اس کے ساتھ مل کر جہاد کرنے کا حکم دے گا۔

یہ معاہدہ ثمر آور ثابت ہوا۔ بعد کے چند دہوں میں ان دو افراد نے مل کر سعودی وہابی حکمرانی کے تحت جزیرہ نمائے عرب کے تمام بدوّؤں کو متحد کر دیا۔ جب بھی یہ کسی بدّو قبیلہ کے پاس جاتے اور وہ ان سے ضد اور انحراف کا اظہار کرتا تو تین بار کہتے کہ اسلام قبول کرو۔ اسلام قبول کرو۔ اسلام قبول کرو اگر یہ تنبیہ تینوں بار ٹھکرا دی جاتی تو حکم تھا کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ وہاب نے سپاہیوں کو یہ بتایا تھا کہ وہ لوگ جو تم سے مقابلہ پر آئیں انہیں قتل کر دو۔ اللہ نے اس کی اجازت دی ہے کیونکہ یہ کافر ہیں۔

اسلام قبول کرنے کی دعوت عام بدوؤں کو پریشان کر دیتی کیونکہ یہ تمام بدو تو اپنے آپ کو مخلص مسلمان ہی سمجھتے تھے۔ لیکن جب محمد بن عبدالوہاب اسلام قبول کرنے کا حکم دیتے تو اصل میں وہ اسلام کے اس فہم کو قبول کرنے کی بات کہتے تھے جس کی وہ خود تعلیم دے رہے تھے۔ انہوں نے اسے وہابیت نہیں کہا تھا۔ کیونکہ انہوں نے ابن تیمیہ کی طرح یہی کہا تھا کہ میں انہیں اصلی اور صاف ستھرے اسلام کی طرف بلا رہا ہوں جو بیرونی اثرات سے پاک اور بگاڑ سے پاک ہے۔ وہ اختراعی یا بدعتی نہیں بلکہ ان کے سخت مخالف تھے۔

عوام ان کے خیالات کے قائل تو ہوئے لیکن ان کے نقطہ نظر کو اسلام کی ایک خاص تشریح سمجھا اسلام نہیں اور اس طرح ان کے پورے کام کو وہابیت کہنے پر انہیں کوئی عار نہ تھا۔ اس اصطلاح کا استعمال ان لوگوں نے بھی کیا جو ان کے نقطہ نظر کے حامل تھے اور صحیح تسلیم کرتے تھے۔

۱۷۶۶ء میں ابن سعود کو قتل کر دیا گیا لیکن ان کا بیٹا عبدالعزیز تخت نشیں ہوا اور اپنے والد کے مشن یعنی جزیرہ نمائے عرب کو عبدالوہاب کی فکر کے جھنڈے تلے متحد کرنے کی کوششوں کو جاری رکھا۔ ۱۷۹۲ء میں خود ابن عبدالوہاب کا بھی انتقال ہو گیا۔ انہوں نے بیس بیوائیں اور لاتعداد بچے چھوڑے۔ ابن وہاب کی زندگی

تقریباً پوری اٹھارہویں صدی کو محیط ہے۔ جس زمانہ میں ابن عبدالوہاب اپنے صاف ستھرے اور پاکیزہ اسلام کے تصور کو نافذ کر رہے تھے اس وقت انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ ملکر برطانیہ عظمٰی کی تشکیل کر رہے تھے۔ اور اسی زمانہ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ وجود میں آئی تھی۔ انقلاب فرانس نے مردوں کے حقوق (حقوق انسانی) کا اعلامیہ جاری کیا تھا۔ موزارٹ (Mozart) موسیقی پر اپنی کتابوں کا مکمل مجموعہ تیار کر رہا تھا اور جیمس واٹ (James Watt) نے بھاپ سے چلنے والا انجن دریافت کیا تھا۔

ابن عبدالوہاب کے انتقال کے بعد عبدالعزیز نے خود کو ان کا بھی جانشیں بنا ڈالا۔ امیر تو تھا ہی اب مذہبی اقتدار بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ۱۸۰۲ء میں عزیز نے کربلا پر حملہ کیا۔ یہ جگہ شیعوں کے لیے متبرک مقام رکھتی تھی۔ کیوں کہ اس مقام پر حسین نواسہ رسول شہید کئے گئے تھے۔ شیعہ حضرات اس مقام پر آ کر اپنے اخلاص کا اظہار کرتے تھے تو اس وقت بہت سے لوگ امام حسین کی شہادت کی یاد تازہ کرنے کی غرض سے یہاں جمع ہوئے تھے۔ لیکن ابن عبدالوہاب کی اُن مجرموں کی اس فہرست میں جنہوں نے اسلام میں بیرونی چیزیں داخل کیں اور اسلام کی شکل مسخ کی تھی شیعہ سب سے بڑے مجرم تھے۔ چنانچہ کربلا فتح کر لینے کے بعد وہاں مقیم کوئی دو ہزار شیعہ قتل کر دیے گئے۔

۱۸۰۴ء میں عبدالعزیز نے مدینہ فتح کیا جہاں اس کی فوجوں نے فوراً ہی ان گنبدوں کو گرا دیا۔ جو صحابہ کرام کی قبروں پر اٹھائی گئی تھیں۔ یہاں سے سعودی، وہابی فوج مکہ پہنچی جہاں اس جگہ کو مسمار کر دیا گیا جس کے بارے میں تصور تھا کہ یہاں رسول اللہؐ کی پیدائش ہوئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ کوئی محمد رسول اللہؐ کے سلسلہ میں بت پرستی کا شکار نہ ہو جائے۔ جب تک عبدالعزیز بن سعود کا قیام مکہ میں رہا اس موقع کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے وقتاً فوقتاً بہت سادگی اور عجز و انکساری سے وہ کعبہ میں عمرہ کی رسومات ادا کرتے رہے۔

پھر ۱۸۱۱ء میں سعودی وہابی اتحاد ایک نئی مہم کی طرف راغب ہوا۔ اس بار اس کا نشانہ ایشیا مائنر یعنی عثمانی سلطنت کا قلب تھا۔ اور اب آخر کار سلطان نے وہابی تحریک پر توجہ دی اور ان ابھرتے ہوئے بدّوؤں سے نپٹنے کے لئے سلطان نے مصر کے خدیو محمد علی سے تعاون مانگا۔ چنانچہ محمد علی اپنی منظّم اور جدید ہتھیاروں سے لیس فوج لے کر عرب پہنچا اور ۱۸۱۵ء میں جس سال واٹرلو میں نپولین کا سورج غروب ہو رہا تھا ابن سعود کو کچل دیا اور عثمانی اقتدار مکہ، مدینہ پر بحال کر کے ان دونوں شہروں کو ہر پہچان کے زائرین کے لئے کھول دیا۔ اس کے بعد عبدالعزیز بن سعود کے جانشین بیٹے کو استنبول روانہ کر دیا تا کہ وہ عوامی بھیڑ کے تمسخر کا نشانہ بنے اور بعد میں اس کا سر قلم کر دیا جائے۔

کوئی ایک صدی تک سعودی۔ وہابی اتحاد کے بارے میں زیادہ نہیں سنا گیا لیکن یہ اتحاد ختم نہیں ہوا تھا۔ مقتول سردار کا ایک بیٹا تھا جس نے بچے کھچے علاقہ کو سنبھالا۔ اب وہ پھر سے ایک چھوٹے سے قبیلہ کا سربراہ تھا اور وہابی بھی تھا۔ جہاں جہاں ممکن ہوا اس کا حکم جاری ہوا اور وہابی علماء کو پھلنے اور پھولنے کا موقع ملتا رہا۔

عبدالوہاب کا تو انتقال ہو چکا تھا۔لیکن وہابیت زندہ رہی۔

ان کے اُصول کیا تھے؟:

محمد بن عبدالوہاب کی تصنیفات کو غور سے پڑھیں اور سنجیدگی سے جائزہ لیں تو ان میں وہ چیزیں نہیں پائی جاتیں جو ان سے آج منسوب ہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عبدالوہاب نے سیاسی رسائل نہیں لکھے بلکہ قرآن کی تفسیر لکھی اور اس میں اپنے عقیدہ کی اصطلاحات استعمال کیں۔ان کی تحریروں کا یک رخاپن اور خاص طور پر مسلمانوں کے عقائد،فقہ اور عمل پر ان کی فکریات کسی خارج کے پڑھنے والے کو چھا جانے والی محسوس ہوتی ہے۔ان کا بڑا کام کتاب التوحید ہے جس کے چھیاسٹھ ابواب ہیں۔ ہر باب میں قرآن سے ایک دو آیات لی گئی ہیں۔ ہر آیت کے مطالب کو وہ کھولتے ہیں پھر نتائج اخذ کرتے ہیں کہ ان سے کیا سبق ملتا ہے اور پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ یہ ان کے نقطہ نظر کی کس طرح وضاحت کرتی ہیں۔اس میں مشرق و مغرب اور مغربی اثرات یا مسلمانوں کی کمزوریوں کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ان سے کوئی سیاسی معانی نکالنا ممکن ہے۔عبدالوہاب کے الفاظ کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے دنیا کو صرف اور صرف مذہبی رنگ ہی میں دیکھا۔ان کے نقطہ نظر کے بموجب ان کی پوری دینیات کو دو اصولوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ پہلی کا تعلق توحید کی اہمیت یعنی خدا کی وحدانیت کا اصول ہے اور دوسرا شرک کا ابطال یعنی یہ تصور کہ خدا کی الوہیت میں کوئی اور یا کوئی چیز ذرہ برابر بھی شامل ہے۔

کارل مارکس نے ایک بار کہا تھا کہ میں مارکسی نہیں ہوں اور عبدالوہاب اگر آج زندہ ہوتے تو ممکن ہے کہ وہ بھی کہتے ’’میں وہابی نہیں ہوں‘‘۔ کچھ بھی ہو وہابیت زندہ ہے موجود ہے اور اس میں وہ امور بھی داخل ہو گئے ہیں جو وہاب کی تبلیغی سرگرمیوں سے اخذ کئے گئے یا سعودی سرداروں نے جس طرح انھیں نافذ کیا۔اس کے نتیجہ میں بھی وہابی اصولوں میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ توسیع شدہ وہابیت بتاتی ہے کہ قانون اسلام تھا اور اسلام قانون۔اسے ٹھیک کرنا،اس کو مکمل طور پر سمجھنا اور بالکل ویسے ہی اسے منطبق کرنا ہی دراصل پورا دین ہے۔

عبدالوہاب اور ان کے ساتھی سمجھتے ہیں کہ قانون تو قرآن میں موجود ہے۔سنت یعنی رسول اللہ کی حیات جو احادیث کے ذریعہ منکشف ہوتی ہے وہ دراصل اس قانون کی تفسیر ہے ۔ قرآن انسانی رویوں کو ڈھالنے کے لئے اصول نہیں دیتا بلکہ ان واقعی اعمال کی نشاندھی کرتا ہے جو مسلمانوں کو کرنا چاہئیں۔ یہ انسانی زندگی کی محض شکل نہیں بتاتا بلکہ اس کے مشملات بتاتا ہے۔اللہ کے رسول کی زندگی ایک ایسی اسٹینسل ہے جس کے ذریعہ ہمیں اپنی زندگی کی رنگ آمیزی کرنا ہے۔

رسول اللہؐ کے زمانہ اور بعد کے تین خلفاء کے زمانہ میں مدینہ ایک مثالی جماعت تھی۔یعنی یہ واحد زمان و مکاں تھا جب اور جہاں ہر شخص قانون سے واقف تھا،قانون حاصل کرتا اور مکمل طور پر اس کی پیروی

کرتا تھا۔اسی بنا پر یہ اوّلین جماعت ایک معجزہ کی مانند مستحکم ہوئی اور پھیلتی ہی گئی۔یہی مدینہ وہ اسٹینسل تھا جسے ہر مسلمان کو از سر نو زندہ کرنا ہے۔

زندگی کا مقصد قانون کی پابندی اور معاشرتی وسیاسی زندگی اس لئے کہ اس جماعت کی تشکیل ہو سکے جس میں قانون مشکل ہو۔جو کوئی بھی اس عظیم الشان جماعت کی تشکیل میں مشکلات کا باعث بنے وہ دشمن اسلام۔ جہاد میں شرکت مسلمانوں کے فرائض کا ایک جز تا کہ اسلام کے دشمن شکست خوردہ رہیں۔ جہاد اسی طرح کا مذہبی فریضہ ہے جس طرح نماز اور روزہ اور زکوٰۃ کی ادائیگی، حج کا سفر اور خدا کی وحدانیت کی گواہی۔

اور یہ دشمن اسلام کون تھے؟

وہابی نظریہ کے مطابق جو لوگ اسلام میں اعتقاد نہیں رکھتے تھے وہ تو بلا شک وشبہ دشمن تھے ہی لیکن اہم ترین مجرم نہیں تھے۔اگر وہ پرامن طور پر مسلمانوں کے درمیان رہنا چاہیں تو ان کو اجازت ہوگی اور انہیں برداشت کیا جائے گا۔لیکن اصل پریشانی اور فکرمندی کا باعث وہ دشمن تھے جو کاہلی ارتداد یعنی مذہب سے انحراف، منافقت اور بدعتوں میں ملوث تھے۔

کاہل وہ مسلمان تھے جو موضوع پر گفتگو خوب کرتے تھے لیکن چلنے کی راہ پر نہیں چلتے تھے۔وہ عقیدہ کے منحرف نہیں تھے لیکن جب عبادت کا وقت آئے تو وہ تاش کھیلتے نظر آتے یا سوتے ہوئے۔ان کے لیے سزا ضروری تھی کہ دوسرے مسلمان ان کے عمل سے تنفرّ کریں پھر وہ تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا لیکن پھر اسے چھوڑ دیا تھا۔وہ واجب القتل تھے۔منافق خود کو مسلمان تو کہتے تھے لیکن واقعتاً نہیں تھے۔الفاظ کی حد تک وہ ہمنوا تھے دل کی وفاداریاں کہیں اور تھیں۔ یہ دراصل پانچواں کالم تھے جو کسی موقع پر بڑے خطرناک اور تباہ کن نتائج پیدا کر سکتے تھے۔ان کی منافقت سے جیسے ہی نقاب ہٹے ان کو قتل کر دیا جانا چاہیئے۔اور آخری لیکن سب سے زیادہ کریہہ مجرم بدعتی تھے یعنی وہ مسلمان جو اسلام میں کئی باتیں داخل کر کے اور کسی پہلو میں کوئی تبدیلی کے ذریعہ اسلامی قانون کی شفافیت اور پاکیزگی کو متاثر کر رہے تھے۔وہ لوگ جو ابتدائی پاکیزہ نفوس سے ہٹ کر عبادتی رسوم ادا کرتے تھے یا وہ ایسی رسوم ادا کرتے تھے جو اللہ کے رسول اور صحابہ کرام نے کبھی نہ کی تھیں یا ایسے خیالات کی وکالت کرتے جو قرآن میں موجود نہیں تھے۔ یہ سب بدعتی تھے۔شیعی اور صوفی لوگ اسی گروہ سے متعلق ہیں۔ان کے خلاف جہاد نہ صرف قانون کے مطابق بلکہ فرائض میں داخل تھا، وہابیت جیسی کہ وہ عملی تاریخ میں نظر آتی ہے ان سب کو محیط ہے۔

وہابی رویے اور جوش وخروش عرب سے باہر بہت دور تک پہنچا۔ عالم اسلام کے دوسرے کنارے یعنی ہندوستان کی سرزمین وہابیت کے لیے موزوں ثابت ہوئی۔ عملی طور پر یہ دیکھنے میں آیا کہ متعدد لوگ جو خود کو وہابیت کے قائل کہتے تھے وہ سعودی قبیلہ کی وہابیت کے مختلف پہلوؤں کو ترجیح دیتے۔ مثلاً ہندوستان میں بعض وہابی جہاد کی فرضیت کے منکر تھے۔دوسرے یہ کہتے کہ مرتدوں کا قتل نہیں بلکہ ان سے گفتگو کے ذریعہ قائل

کرنا چاہئے۔اسی طرح کا اہلیت زدوں کو سزا کے بجائے سمجھانا اور تعلیم دینا چاہئے۔اسی طرح منافق کے نفس کا تزکیہ کرنے کی کوشش ہو نہ کہ انہیں قتل کی سزا دی جائے۔اسی طرح دوسری ترمیمات متعارف ہوئیں۔لیکن ہر وہابی قانون کو ہی اسلام کی بنیاد سمجھتا بلکہ کل اسلام یہی تھا۔ان کے نزدیک ماضی کا سنہرا دور ہی ان کے لئے آج بھی اسٹینسل کی مانند تھا جس کے ذریعہ اسلامی زندگی اُبھر سکتی ہے۔یہ ان کا یقین تھا کہ اوّلین جماعت کا احیاء ہی انہیں اللہ کی مدد کا امیدوار ثابت کرسکتا ہے۔اور اسی طرح وہ زندگی و تازگی اور طاقت انہیں حاصل ہوسکتی ہے جو اوّلین چار خلفاء کے دور میں امت کو حاصل تھی۔

عالم اسلام سے باہر سعودی۔وہابی اتحاد کو ایک مختصر دور کا انحراف ہی سمجھا گیا جو کچھ دن کے لئے ظاہر ہوا لیکن جلد غائب ہوگیا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ریگستان عرب کو مسلسل سلگا تا رہا اور دنیا کو اس اتحاد کے بارے میں بیسویں صدی میں بہت کچھ سننے کو ملنے والا تھا جس وقت ایک برطانوی ایجنٹ لارینس آف عربیا نے اس ریگستان کا سفر اختیار کیا۔

علی گڑھ تحریک۔سیکولر موڈرنزم :

سید احمد یا سر سید احمد آف علی گڑھ جو انہوں نے آخر زندگی میں خود کو کہلانا پسند کیا سوچ کے ایک خاص رویہ کی نمائندگی کرتے ہیں جو عالم اسلام کے مختلف علاقوں میں انیسویں صدی میں آزادانہ طور پر اُبھرا۔انہوں نے اسلام کو دوبارہ سے ایک ایسے اخلاقی نظام کی حیثیت سے سوچا جو اپنی قدیم روایت اور روح کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس سیکولر دنیا کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے جس پر یورپ غالب تھا۔

سید احمد ۱۸۱۷ء میں دہلی کے ایک معروف مسلم خاندان میں پیدا ہوئے۔ان کے بزرگ مغلوں کے زمانے میں اہم عہدوں پر فائز تھے۔اب برصغیر پر برطانیہ کی پکڑ گہری ہوتی جا رہی تھی تو سر سید کے خاندان نے نئے نظام کو اپنا لیا تھا۔ان کے دادا نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں اہم ذمہ داریاں نبھائیں۔ایک بار انگریزوں کے لئے قائم ایک اسکول کی نگرانی کی تو دوسری بار برطانوی نمائندے کی حیثیت سے ایران کا سفر کیا۔دوبارہ وہ مغل بادشاہ کے وزیر اعظم کی حیثیت میں رہے۔اس زمانے میں مغل بادشاہ انگریزوں کا پنشن یافتہ ہو چکا تھا اور وزیر اعظم کی ذمہ داری محض اتنی تھی کہ پنشن حاصل کرنے اور اسے جاری رکھنے کے لئے جو ضروری فارم تھا اسے پر کرے۔سید احمد کے والد نے بھی کمپنی کی ملازمت کی اور ان کے ایک بھائی نے ہندوستان کا پہلا اردو اخبار شائع کرنا شروع کیا تھا۔مختصراً سید احمد جدیدیت کے حامل ایک اعلیٰ خاندان سے متعلق تھے۔مغرب کی طرف ملتفت یہ خاندان کسی حد تک برطانوی زندگی سے آگاہ بھی تھا۔

لیکن ان کی والدہ ایک مخلص اور روایتی متقی خاتون تھیں اور لوگ ان کے علم کی وجہ سے ان کا احترام کرتے تھے۔انہوں نے اپنے بیٹے کو مدرسہ میں داخل کرایا۔ان کی زندگی پر سید احمد کے دادا کے برابر والدہ کے بھی اثرات مرتب ہوئے۔اور اس طرح سید احمد جوانی کو پہنچے تو فکر ونظر کے ان دو دھاروں سے اپنی زندگی کو مزین

کر چکے تھے۔ یعنی اپنی ملت سے قلبی وابستگی اور برطانوی ثقافت کے لیے بے حد احترام کے ساتھ انگریزوں کے تئیں عزت و وقار۔ بد قسمتی سے ان کے والد کی اچانک موت کی بناء پر ان کا خاندان مالی پریشانیوں کا شکار ہو گیا۔ اور یوں سید احمد کو تعلیم چھوڑ کر ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ ابتداء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں بطور کلرک رہے لیکن بتدریج ترقی کرتے کرتے منصفی کے عہدہ تک پہنچے جہاں وہ چھوٹے چھوٹے دعوؤں کے مسائل طے کراتے۔ کمپنی کے نظامِ عدل میں یہ ایک ادنیٰ ذمہ داری تھی بلکہ اس طرح کہیں تو زیادہ بہتر ہوگا کہ ایک ایسے کلرک تھے جسے عزت و تکریم سے نوازا گیا۔ وہ اس سے بلند مرتبہ حاصل نہ کر سکے کیونکہ ان کی رسمی تعلیم مکمل نہیں ہو سکی تھی۔ بنیادی طور پر انہوں نے اپنی ذاتی محنت سے ہی علم میں اضافہ کیا تھا۔

لیکن اس کے باوجود جو کچھ بھی انہیں سائنس اور انگریزی لٹریچر مل جاتا اسے پوری سمجھ اور وضاحت کے ساتھ پڑھتے۔ انہوں نے اپنے ہندوستانی دوستوں کے ساتھ مل کر پڑھنے والوں کا ایک گروپ اور بحث و مباحثہ کے لئے کلب قائم کیا اور سائنسی موضوعات پر خطبات کے پروگرام شروع کئے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں وہ برطانیہ کی طرف تھے لیکن بعد میں انہوں نے ایک پمفلٹ بنام "اسباب بغاوت ہند" لکھا جس میں انگریزوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے ان غلطیوں کی نشاندہی کی جو اس بغاوت کی وجہ بنی تھیں۔ یہ پمفلٹ انہوں نے سرکاری افسروں کو کلکتہ اور لندن بھی بھیجا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اور کتاب An Account of the Loyal Mohammadans of India (وفادار ہندوستانی مسلمانوں کا تذکرہ) تصنیف کی جسے ایک انگریز کرنل نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں ان کی کوشش تھی کہ اہل برطانیہ پر واضح ہو کہ ہندوستانی مسلمان ملکہ کی سب سے وفادار رعایا ہیں۔ یہ بھی بتایا اور عالمانہ انداز میں مذہبی علمی حوالوں سے ثابت کیا کہ کیونکہ برطانیہ مسلمانوں کے دینی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا اس لئے دینی اعتبار سے ان کے خلاف جہاد جائز نہیں۔

آخر میں ۱۸۷۴ء میں انہوں نے بنظر خود انگلینڈ دیکھنا چاہا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سید احمد نے ہندوستان کی سرحدوں سے باہر قدم نکالا تھا۔ لندن میں جہاں ان کی تصنیفات کی وجہ سے ان کے تئیں التفات پیدا ہو چکا تھا وہ جس طرح رہے وہ ان کے اپنے وسائل سے کہیں زیادہ تھے۔ وضع دار پارٹیوں میں شرکت و دانشوروں، فنونِ لطیفہ کے خوگروں اور برطانوی اشرافیہ کے ارکان کے ساتھ ان کی بے تکلفانہ ملاقاتیں رہتیں۔ وہاں کے ماحول میں انہوں نے اپنے ثقافتی تشخص کو برقرار رکھا۔ مستقل طور پر مسلمانوں کے لئے مخصوص قبا پہنتے، بڑی ڈاڑھی اور اس زمانہ کی صندوق نما ٹوپی جسے اکثر مذہبی لوگ سروں پر رکھتے تھے اور یوں وہ ہر اعتبار سے پرانے مکتبہ فکر کے مغلیہ اشرافیہ کے مسلمان ذی مرتبت شخصیت نظر آتے۔ خود ملکہ نے انہیں فیتہ لگا کر عزت و تکریم کی اور اس طرح انہیں Companion of the Star of India قرار دیا۔ جس کے نتیجہ میں کافی عرصہ کے بعد وہ خود کو سر سید احمد خان کہلانے لگے۔

پھر ایک روز لندن میں ان کی نظر رسول اللہ کی حیات پر ایک توہین آمیز کتاب پر پڑی۔ جو کسی انگریز نے لکھی تھی۔ اسے پڑھا تو ان کا سکون غارت ہو گیا۔ تمام مصروفیات چھوڑیں خود سیرۃ رسول پر لکھنا شروع کر دیا مقصد اس انگریز کی کتاب کو باطل ثابت کرتا تھا۔ انہوں نے لکھا تو اُردو میں کیونکہ یہ ان کی مادری زبان تھی لیکن کیونکہ ان کے پیش نظر یورپی عوام تھے تو انھوں نے اجرت دے کر ترجمہ کا انتظام کیا۔ وہ ابواب تحریر کرتے اور انگریزی، فرانسیسی جرمنی اور لاطینی میں ترجمہ ہوتا۔ یہ کام بہت وسیع ہو گیا تھا۔ اس لئے تخفیف کرنی پڑی۔ اور آخر کار یہ رسول اللہ پر مضامین کے ایک مجموعہ پر آ کر رکا۔ لیکن اس تخفیف شدہ پروجیکٹ کے مکمل ہونے سے قبل ہی سرمایہ ختم ہو گیا اور ہندوستان چھوڑنے کے سترہ ماہ بعد گھر واپس آنا پڑا۔ خستہ و ماندہ اور جیب بالکل خالی۔

لیکن انگلینڈ نے انھیں بہت متاثر کیا تھا۔ ناقدین کے بقول کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئے تھے۔ انگلینڈ کے مقابلہ میں انہیں اپنا وطن تکلیف دہ حد تک پچھڑا ہوا محسوس ہوا تھا۔ '' انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے نہیں''، انہوں نے لکھا ''میں صحیح کہہ رہا ہوں کہ مقامی ہندوستانی وہ چاہے چھوٹے ہوں یا بڑے، تاجر ہوں یا چھوٹے درجہ کے دکاندار، تعلیم یافتہ ہوں یا ناخواندہ، انگریزوں کے مقابلہ میں تعلیم، طور طریق اور راستبازی کے اعتبار سے ایسے ہی ہیں جیسے ایک گندہ جانور ایک قابل اور خوبصورت مرد کے سامنے ہو''۔

لیکن ان کے اپنے مسلمان بھائی اس مقام تک کیسے پہنچتے؟ وہ اپنی قوم کی بہتری کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ سید احمد کے خیال میں مسئلہ کی ایک وجہ ان کے اسلام کے فہم میں پائی جاتی ہے۔ وہ اساطیریت کے شکار ہیں۔ تو ہم پرستی سے چمٹے ہوئے ہیں اور اسے اسلام سمجھتے ہیں۔ سرسید نے عقیدہ کی اس طرح تشریح کرنی شروع کی جو ہم عصر علماء کے لئے بڑی تکلیف کا باعث بنی۔ مذہب سرسید کے مطابق میدان فطرت کی طرح انسانی جستجو اور کامرانیوں کے لیے کھلا ہوا ہے۔ یہ انسانی زندگی کا ایک ناقابل تقسیم جز ہے۔ فطری انداز میں انسانی معاشرہ میں اس کا ارتقاء ہوا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے فنون لطیفہ، زراعت اور ٹیکنالوجی انسان کے تہذیبی ارتقا کے ساتھ بدلتی رہی ہیں۔

ابتدائی دور کا انسان اخلاقی مسائل کے میدان میں تحقیق و جستجو کی صلاحیتوں سے اتنا آراستہ نہ تھا کہ وہ اپنی فکر و دانش کے ذریعہ اس میدان میں کچھ کر سکے۔ چنانچہ اپنے جذبات پر قابو پانے اور اخلاقی طور پر مضبوط رائے قائم کرنے اور اپنے رویوں کو درست کرنے کے لئے اسے وحی کی ضرورت تھی۔ یعنی بلند ترین مقام سے انبیاء کے ذریعہ آئی ہوئی ہدایت کی ضرورت تھی۔ اور یہ انبیاء اپنے کردار اور شخصی قوت کی بدولت وہ طاقت رکھتے تھے کہ تشریح کے بغیر انسانوں کو عمل کرنے اور تسلیم کر لینے کے لئے راغب کر سکیں۔ لیکن تمام بڑے بڑے مذاہب کی اخلاقی تعلیمات اور ہدایتیں غیر منطقی اور غیر ناطق نہیں۔ وہ عقل کے مطابق ہیں اور عقل انہیں دریافت بھی کر سکتی ہے بشرطیکہ انسانوں نے اپنی عقلی صلاحیتوں کو اس حد تک مکمل کر لیا ہو۔

اسی بناء پر محمد رسول اللہؐ نے اعلان کیا تھا کہ وہ اب آخری پیغمبر ہیں۔ ان کا منشا یہ نہیں تھا کہ اپنے وقت

کے مکہ اور مدینہ میں جن مسائل کے سلسلہ میں انہوں نے فیصلے دیے وہ انسانی عمل کے آنے والے وقتوں کے لئے حرف آخر ہیں۔ وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ انہوں نے ان آخری آلوں (tools) کو متعارف کرادیا ہے جن کے ہمراہ انسان کو ایک اخلاق یافتہ جماعت کی تشکیل اور اس کی جستجو خدا کی طرف سے نئی ہدایتوں کے بغیر اب خود ہی کرنی ہوگی۔ اسلام وحی پر منحصر آخری مذہب اس لئے تھا کہ اس سے عقل پر منحصر مذہب کے زمانہ کا آغاز ہو رہا تھا۔ عقل والے لوگ اب اخلاقی بلندیوں کا حصول صحیح بنیادی اصولوں پر تعقل کے ذریعہ کر سکتے ہیں۔ اسلام انہی صحیح بنیادی اصولوں کو انسانوں کے لئے لایا تھا۔ اور یہ اصول وہی تھے جو عیسائیت اور دوسرے الہامی مذاہب میں پائے جاتے تھے۔ البتہ اسلام میں ایک اہم چیز زائد تھی۔ وہ تھی ان معاملات میں عقل کے استعمال کی تاکید۔ اگر مسلمانوں نے وحی قرآنی کی تعبیر غلط نہ کی ہوتی اور یوں راستہ سے بھٹکے نہ ہوتے تو انسانیت کی اندھی تقلید، توہمات اور کٹر پن سے آزادی حاصل ہو چکی ہوتی۔

سید احمد خفی انداز میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ ہمہ وقت جنت اور جہنم کے اندیشوں کا شکار ہو کر نہ رہ جائیں اور تاریخ میں خدا کی معجزاتی مداخلت کے منتظر نہ رہیں۔ بلکہ اپنے دین کو ایک اخلاقی نظام کی حیثیت میں سوچیں۔ اس نقطہ نظر کے مطابق اچھا مسلمان ضروری نہیں ہے کہ ہر روز کئی گھنٹہ قرآن کی عربی زبان میں تلاوت کرتا ہو۔ ایک خاص قسم کا لباس زیب تن کرتا ہو، اور عبادت کرتا ہو۔ اچھا مسلمان وہ کہلائے گا جو جھوٹ نہ بولتا ہو، دھوکہ نہ دیتا ہو، چوری نہ کرتا ہو اور قتل نہ کرتا ہو اور وہ جو اپنی ذاتی بہترین صلاحیتوں میں اضافہ کی کوشش مستقل مزاجی سے کرتا ہو، دوسروں کے ساتھ اچھے رویّہ سے پیش آئے۔ مسلمان وہ لوگ ہیں جو معاشرہ میں عدل کی جستجو کریں، اپنی جماعتوں، گروہوں اور اداروں میں جن کا رویہ ذمہ دارانہ ہو، جو رحم کریں، خدا پرست اور دردمند ہوں اور سخاوت و احسان سے کام لیں۔

انگلینڈ جانے سے قبل سید احمد نے شمالی ہند کے شہر علی گڑھ میں ایک تنظیم سائنٹیفک سوسائٹی کے نام سے قائم کی تھی۔ یہ تنظیم خطبات کا انتظام کرتی اور ہندوستانی مسلمانوں کو جدید تحقیقات سے ترجمہ کے ذریعہ روشناس کرتی۔ ان ترجموں کی طباعت بھی ہوتی اور ان کے اردو اور فارسی زبانوں میں پیش کرنے کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔ انگلینڈ سے واپسی پر اس سوسائٹی کو سید احمد نے ترقی دے کر یونیورسٹی کی شکل دی جس کے بارے میں انہیں امید تھی کہ وہ عالم اسلام کی کیمبرج ثابت ہوگی۔ مذہبی اور روایتی علوم کے ساتھ ساتھ اس یونیورسٹی میں سائنس اور دوسرے مضامین پڑھائے جاتے۔

حالانکہ بہت سے ہندوستانی علماء نے سید احمد کے خیالات پر سخت تنقید کی۔ لیکن یونیورسٹی نے ترقی کی اور طلباء اس کی طرف راغب ہوتے رہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء اور وہاں کے اساتذہ نے ایک سیکولر تحریک کا بیج بویا جس نے بیسویں صدی آتے مسلمانوں کو تیار کیا کہ وہ ہندوستان سے علیحدگی اختیار کریں اور اپنی ایک علیحدہ قوم کی تشکیل کریں۔ اس جدوجہد نے پاکستان کی شکل اختیار کی۔

سرسید کے خیالات کوئی بڑی تحریک برپا نہ کر سکے لیکن دوسرے مسلم علاقوں کے جدید دانشور اسی طرح کے خیالات پر کام کرتے ہوئے انہی نتائج پر پہنچ رہے تھے۔ ایران میں قاجار کے بادشاہ کے ایک وزیراعظم نے ایک اسکول قائم کیا جس کا نام دارالفنون تھا جس میں تمام مغربی سائنسی علوم، آرٹ، لٹریچر اور فلسفہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس اسکول کے فارغین نے ایران میں جدیدیت کے بیج بونا شروع کئے اور اپنی سوسائٹی کو یورپی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی۔

اسی طرح کی سرگرمیاں عثمانی سلطنت کے قلب میں بھی جاری تھیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں جدیدیت کے حامل ایک گروہ نے تعلیمات کے نام سے حکومتی پالیسی سازی کی فضا ہموار کی۔ جس میں یورپی طرز کے اسکولوں کا قیام، انتظامیہ میں یورپی طرز کو اپنانا، یورپی خطوط پر فوج کی تشکیل نو، سپاہیوں کو یورپی طرز کی ملبوسات کی فراہمی اور سرکاری نوکریوں پر فائز لوگوں کے لیے یورپی طرز کے ملبوسات کی حوصلہ افزائی وغیرہ شامل ہیں۔

جدیدیت پسند اسلامیان

اب ہم انیسویں صدی کے ایک غالب مصلح کی طرف آتے ہیں یعنی جمال الدین افغانی جو آتش فشانی قوت کا مالک تھا۔ افغانوں کے خیال میں ان کی پیدائش ۱۸۳۶ء میں کابل سے کوئی پچاس میل مشرق ایک شہر اسدآباد میں ہوئی جو افغانستان کے صوبہ کنار کا دارالسلطنت تھا۔ ان کا خاندان افغانستان کے حکمراں قبیلہ سے شادی کے ذریعہ رشتہ میں بندھا تھا۔ لیکن انہوں نے اس خاندان کو کوئی ایسا نقصان پہنچایا کہ ان کے اہل خانہ کو راتوں رات ملک چھوڑ کر ایران فرار ہونا پڑا۔ اس وقت جمال الدین ایک چھوٹا سا لڑکا ہی تھے۔

ان کے وطن کے بارے میں الجھن اس بناء پر بھی ہوئی کہ فرار کے بعد ایران کی سرحد کے قریب یہ جس جگہ قیام پذیر ہوئے اتفاقاً اس کا نام بھی اسدآباد ہی تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ الجھن آج بھی باقی ہے کہ جمال الدین واقعتاً کس جگہ پیدا ہوئے اور کس ملک میں؟ یعنی افغانستان میں یا ایران میں۔ افغان اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ خود کو جمال الدین افغان یا جمال الدین افغانی ہی لکھا اور اس بنا پر وطن سے متعلق سوال کو وہ اب قابل غور ہی نہیں سمجھتے۔ ایرانی اسکالرز کہتے ہیں کہ انہوں نے خود اپنی ایرانی شناخت کو چھپانے کے لئے افغانی لکھا اور اس سلسلہ میں وہ بعض دستاویزی ثبوت بھی پیش کرتے ہیں جن کی روشنی میں وہ ایرانی النسل ٹھیرتے ہیں۔ دوسری طرف میں جب افغانستان میں زیر پرورش ہی تھا تو ایسے بہت سے لوگ کابل میں تھے جو ان کے اعزہ اور خاندان کے لوگوں سے واقف تھے اور کہتے تھے کہ ان لوگوں کی زمینیں اب بھی کنار صوبہ میں موجود ہیں میرے لئے تو یہ مسئلہ اس طرح حل ہو جاتا ہے لیکن ممکن ہے کہ میں کیونکہ خود بھی افغان ہوں اس لئے یہ سمجھ رہا ہوں۔

لیکن ایک بات یقینی ہے کہ مسلم حکومتیں ان کو اپنے ملک کا شہری تسلیم کرنے میں احساس تفاخر کا اظہار

ضرور کرتی ہیں۔ لیکن خود ان کے اپنے زمانہ میں ہر حکومت نے انہیں اپنے لئے پریشانی کا باعث سمجھا اور انہیں ملک بدر کیا۔ یہاں میں ان کی ہمیشہ سفر میں گذرنے والی زندگی اور کردار کا مختصراً تعارف کراتا ہوں۔

ان کی پرورش کہیں بھی ہوئی ہو یہ سب کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ انہوں نے کوئی اٹھارہ سال کی عمر میں ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ اس زمانہ میں برطانیہ مخالف جذبات پنپنے لگے تھے۔ اور ممکن ہے کہ جمال الدین ایسے مسلم راہنماؤں سے ملے ہوں جو اس وقت برطانیہ کے خلاف کوئی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ جب ہندوستان میں عظیم بغاوت یعنی غدر ہوا اس وقت جمال الدین مکہ میں تھے۔ لیکن جب برطانیہ نے انتقامی کارروائی شروع کی تو اس وقت وہ واپس آ چکے تھے اور انہوں نے ان کارروائیوں کا بنظر خود مشاہدہ کیا تھا جنہوں نے مشرقی مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ شاید اس سفر ہند نے جمال الدین کے دل کو برطانیہ کی نفرت سے بھر دیا تھا۔ جو زندگی بھر چھایا رہا۔ اور یورپی استعمار سے بالعموم انہیں نفرت ہوگئی۔ ہندوستان سے وہ دوسرے ممالک گئے جن کی تفصیل ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

افغانستان: یہاں انہوں نے بادشاہ وقت کا اعتماد حاصل کرلیا۔ جسے ابھی کچھ عرصہ قبل ہی برطانیہ نے تخت سے ہٹانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ بادشاہ نے اپنے بڑے بیٹے اعظم کی تعلیم کے لئے افغانی کی خدمات مستعار لیں۔ جمال الدین پہلے ہی سے اصلاح حال اور اسلام کی تفہیم نو کے سلسلہ میں تیاریاں کر رہے تھے تاکہ مسلمان اپنا کھویا ہوا مقام اور افتخار حاصل کر سکیں۔ مستقبل کے حکمران کی ذہنی تربیت کرنے کے اس موقع کو انھوں نے اپنے وژن کے حق میں جانا اور یہ سوچا کہ اس طرح میرے خیالات کو نافذ کرنے کے لیے یہ مستقبل کا حکمراں کام آسکے گا۔ چنانچہ انہوں نے شاہزادہ اعظم خاں کی تربیت اسی انداز میں کی اور افغانستان کو ایک جدید ریاست بنانے کے لیے پرعزم کیا۔ بدقسمتی سے اعظم نے اپنے باپ کی وراثت بہت کم عرصہ کے لئے پائی اور اس کے ایک رشتہ کے بھائی نے برطانیہ کے تعاون سے تختہ الٹ دیا۔ برطانیہ کے درمیان میں آنے کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ افغانی کا کوئی شاگرد تخت سنبھالے کیونکہ انہیں اندازہ تھا کہ اعظم کے عزائم کیا ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اعظم کو ایران جانا پڑا۔ جہاں جلاوطنی میں ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ جمال الدین کو بھی یہاں سے فرار ہونا پڑا۔ اور وہ اب ایشیا مائنر کی طرف آئے۔

ترکی: یہاں آکر انہوں نے استنبول یونیورسٹی میں خطبات شروع کیے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ مسلمانوں کو سائنس وغیرہ کے جدید علوم حاصل کرنا چاہئیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کی اسلامی تعلیم وتربیت کے ذریعہ اُن اسلامی اقدار، اسلامی روایات اور تاریخ سے گہری وابستگی کا انتظام کرنا چاہیئے۔ جدیدیت کا مطلب مغربیانہ نہیں مسلمان خود اسلام کے اندر اسلامی جدیدیت کی بنیادیں تلاش کر سکتے ہیں۔ یہ پیغام عوام اور خواص کو متاثر کیے بغیر نہ رہا۔ اب افغانی اس پوزیشن میں تھے کہ وہ عثمانی ترکی میں اچھی پوزیشن حاصل کر سکتے تھے اور یہاں اسلام کے ایک اسکالر کی حیثیت میں زندگی گذار سکتے تھے۔ لیکن پھر یہ ہوا کہ انہوں نے لوگوں کو یہ

بتانا شروع کیا کہ ہر شخص کو قرآن کا فہم خود سے کرنے کی آزادی ہونی چاہیئے ۔ یہ بات بالخصوص علماء کی جابرانہ نگرانی کے پس منظر میں کہی گئی تھی ۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اسلام میں سائنسی ترقیاں نہ ہو پانے کی اصل وجہ علماء ہی ہیں ۔ اس کے نتیجہ میں طاقتور مذہبی مقتدرہ افغانی کی مخالفت ہوگئی اور یوں انہوں نے اس شخصیت کو ملک بدر کرادیا ۔ ۱۸۷۱ء میں اس طرح وہ مصر پہنچے ۔

مصر: مصر پہنچ کر افغانی نے مشہور الازہر یونیورسٹی میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا ۔ یہاں وہ اپنے مشن یعنی اسلام کے ذریعہ جدیدیت کی تلاش میں پھر لگ گئے ۔ اسی دوران انہوں نے افغانستان کی تاریخ پر ایک کتاب بھی لکھی (غالباً اس بنا پر بھی لوگ انہیں افغانی کہتے ہیں) ۔ اس وقت مصر میں محمد علی کے خاندان کی حکومت چلی آرہی تھی ۔ اور اب وہ برطانوی اور فرانسیسی مدد اور اعانت سے بگڑ کر ظالم حکمران ٹولہ بن چکی تھی ۔ چنانچہ افغانی نے امراء کے ظلم کے خلاف بولنا شروع کیا ۔ انہوں نے کہا کہ ملک کے حکمرانوں کو سادہ زندگی گذارنی چاہیئے اور ماضی کے مسلمان حکمرانوں کے طرز پر انہیں عوام کے ساتھ رہنا چاہیئے ۔ انہوں نے پارلیمانی جمہوریت کی بھی وکالت کرنا شروع کردی ۔ یہاں بھی انہوں نے یہی بات دہرائی کہ جدیدیت کا مطلب مغربیانہ نہیں ہے انہوں نے دو اسلامی اصولوں شوریٰ اور اجماع میں جمہوریت کے اسلامی طرز کی بنیادوں کی نشاندہی کی ۔

شوریٰ : ایک مشاورتی کاؤنسل جیسی کسی شکل کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ اس میکنزم کے ذریعہ ابتدائی دور میں کسی مسئلہ پر مسلم رہنما عام مسلمانوں کی رائے معلوم کرتے تھے ۔ اس طرح کی پہلی شوریٰ وہ تھی جو خلیفہ دوئم عمرؓ نے اپنا جانشین تلاش کرنے کی غرض سے تشکیل دی تھی ۔ اس زمانہ میں مسلم کمیونٹی بہت بڑی نہ تھی اور اس کے اہل الرائے کسی خاص مسجد یا اس کے قرب وجوار کی جگہوں میں سما سکتے تھے ۔ اس طرح شورائی جمہوریت کچھ راست جمہوریت جیسی تھی جیسی آج ٹاون ہال میٹنگ میں نظر آتی ہے ۔ کیا وہ نمونہ پورے ملک جیسے مصر میں اختیار کیا جائے ایک اہم سوال تھا ۔

اجماع : اتفاق رائے کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ یہ رسول اللہ کے اس ارشاد سے ابھرا ہے جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ میری امت کسی غلطی پر متفق نہیں ہوسکتی ۔ اس سے علماء نے یہ نتیجہ نکالا کہ جب وہ یعنی علماء کسی دینی یا دینیاتی نکتہ پر متفق ہوجائیں تو اس مسئلہ پر اب کوئی مزید سوال نہیں کیا جاسکتا ۔ مختصر یہ کہ انہوں نے اجماع کو علماء یعنی اپنے اتفاق رائے پر محمول کرلیا ۔ لیکن جمال الدین نے ان دونوں تصورات کو ازسرِ نو واضح کیا اور ان کے انطباق میں توسیع کی ۔ شوریٰ اور اجماع کے تصورات سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اسلام میں عوام کی حمایت کے بغیر حکمرانی کا قانونی استحقاق نہیں ۔

جمہوریت کے بارے میں ان کے خیالات نے شاہ مصر کو مضطرب کردیا ۔ اور اشرافیہ کی اخلاقی حالت کے بارے میں بالخصوص وہ جن کی مالی حالت ایک سطح سے زیادہ اوپر تھی ، ان کے پر جوش خطبات سے یہ گروہ ان

سے بیزار ہو گیا۔ اور ۱۸۷۹ء میں جمال الدین مصر بدر کر دیے گئے۔ اس کے بعد وہ پھر واپس ہندوستان آئے۔

ہندوستان : یہاں سرسید احمد کے کام سے جو آزاد خیالی کی فضا پیدا ہوئی تھی اب وہ خاصی جڑیں پکڑ کر ایک ایسی طاقت بن چکی تھی جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن جمال الدین نے سید احمد کو چاپلوس اور گود میں آ کر بیٹھ جانے والے کتے کی طرح سمجھا۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے اپنی واحد کتاب Refutations of the Materialists میں کیا لیکن برطانیہ والے سید احمد کے خیالات کو پسند کرتے تھے۔ جب مصر میں بغاوت بلند ہوئی تو برطانیہ کا خیال تھا کہ جمال الدین کے خیالات نے وہاں کے لوگوں کو بغاوت پر ابھارا ہے۔ اس کی پاداش میں وہ چند ماہ کے لئے قید میں ڈال دیے گئے۔ جب مصر کی بغاوت ختم ہو گئی تو انہیں آزادی تو ملی لیکن ہندوستان پھر چھوڑنا پڑا۔ اور اب وہ پیرس جانے کے لئے تیار تھے۔

پیرس : اس قیام کے دوران انہوں نے مضامین لکھنے کا آغاز کیا اور انگریزی، فارسی، عربی، اُردو اور فرانسیسی میں انہیں شائع کرایا۔ موصوف نہ صرف ان زبانوں میں گہری استعداد رکھتے تھے بلکہ خوش اسلوبی اور روانی سے لکھ سکتے تھے اور بول بھی سکتے تھے۔ ان مضامین میں انہوں نے اس نکتہ پر توجہ دی تھی کہ بنیادی طور پر اسلام ایک عقلی مذہب ہے اور سائنسی انقلاب کا آغاز دراصل اسلام ہی سے ہوا تھا۔ انہوں نے صاف کہا کہ علماء اور ظالم حکمرانوں کی بدولت مسلم دنیا سائنسی ترقی سے محروم رہی ہے۔ لیکن انہوں نے مزید کہا کہ ہر مذہب کے علماء اور ظالم حکمرانوں کا یہی رول رہا ہے۔ عیسائیت کی مثال سامنے ہے۔ اس زمانہ میں فرانس میں ایک فلاسفر ارنیسٹ رےنن (Ernest Renan) تھا جو یہ لکھ رہا تھا کہ مسلمانوں میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ سائنسی انداز میں غور و خوض کر سکیں۔ (اس نے یہ بھی لکھا کہ چین کی نسل میں ذہانت اور ہنرمندی پائی جاتی ہے جبکہ ان کے اندر عزت نفس نہیں۔ یہودی نامکمل ہیں۔ نیگروز قابل کاشت زمین کی مانند ہیں۔ یورپی فطرتاً سپاہی اور غلبہ والی قوم ہے اور اگر سب لوگ وہی کام کریں جس کے لئے وہ بنے ہیں تو دنیا میں بڑی خوشحالی اور امن قائم ہو جائے گا)! جمال الدین نے سوبورن (کم از کم مسلمان اسے مشہور خیال کرتے ہیں) میں اس فلسفی کے ساتھ ایک مشہور مباحثہ میں حصہ لیا۔ اور یہ دلیل قائم کی کہ عیسائیت کے مقابلہ میں اسلام محض اس بنا پر کم سائنسی لگتا ہے کہ یہ عیسائیت کے بعد آیا اور یوں وہ اپنے ارتقاء کے اعتبار سے قدرے ابتدائی دور میں ہے۔

پیرس میں جمال الدین اور ان کے ایک مصری تربیت یافتہ محمد عبدہ نے مل کر ایک بنیادی نوعیت کے جرنل *The Firmest Bond* (عروۃ الوثقیٰ) کی اشاعت شروع کی۔ کوئی اٹھارہ شمارے نکلے کہ ضروری رقم ختم ہو گئی اور بھی کچھ مشکلات درپیش تھیں تو اسے بند کرنا پڑا۔ لیکن ان اٹھارہ شماروں میں جمال الدین نے اس تصور کی جسے آج پین اسلامزم کہا جاتا ہے بنیادیں فراہم کر دیں۔ انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ بظاہر مقامی نظر آنے والی مزاحمت اور کشمکش جو مختلف مسلمانوں اور یورپی قوتوں کے درمیان مختلف مخصوص مسائل کو لے کر چل رہی ہے۔ جیسے ایران اور روس میں آذربائیجان کے مسئلہ پر، عثمانیوں اور روس میں کریمیا (Crimea)

کے مسئلہ پر، مصر اور برطانیہ میں بینکوں کے قرض پر، فرانسیسیوں اور الجزائر میں اناج کی فروخت کے مسئلہ پر، برطانیہ اور ہندوستانی وافغانی عوام کے بیچ سرحدوں کے مسئلہ پر۔ یہ سب مختلف مسائل نہیں ہیں بلکہ ایک بڑی کشمکش اور ایک بڑے مسئلہ کو لے کر محض دو عالمی وجود یعنی اسلام اور مغرب کی کشمکش ہیں۔ جمال الدین نے ان دو الفاظ کو اس پس منظر میں پہلی بار استعمال کیا۔ اور اس حقیقت کے تاریخی وجود سے انکار ممکن نہیں۔

اس دوران ان کے اور بھی سفر ہوئے۔

یونائیٹڈ اسٹیٹ (USA): یہاں ان کی سرگرمیوں کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں ملتا لیکن یقیناً انہوں نے وہاں اندرون میں جھانک کر ضرور دیکھا ہوگا۔

لندن: چند بار جانا ہوا جہاں ونسٹن چرچل کے والد رینڈولف چرچل سے اور دوسرے برطانوی رہنماؤں سے مصر میں برطانوی پالیسیوں پر ان کا مباحثہ بھی ہوا۔ جرمنی کا سفر بھی کیا اور کچھ وقت روس کے دارالسلطنت سینٹ پیٹرس برگ میں بھی قیام رہا۔ جب ان کا جنرل شائع ہونا بند ہوگیا تو یورپ میں انہیں کوئی کام نہ تھا اس لئے وہاں سے وہ آگے بڑھ گئے !

ازبکستان: یہاں ذمہ داروں سے ملے اور ان سے قرآن کریم شائع کرنے اور اسے زار کے تحت بسنے والے مسلمانوں میں تقسیم کرنے کی اجازت چاہی اور اسی طرح دوسرے اسلامی لٹریچر کے تراجم وہاں کی زبانوں میں شائع کرنے کی اجازت طلب کی جو ایک عرصہ سے وہاں کے مسلمانوں کو مہیا نہیں تھیں۔ ان کوششوں کی بدولت اس علاقے میں اسلام کے احیا میں بڑی مدد ملی۔ اس قیام کے دوران ایک اور کام جو ان کے ذہن میں عرصہ سے پل رہا تھا اس کے لئے بھی انہوں نے راہ ہموار کی۔ وہ تھا یورپی طاقتوں کے آپسی اختلاف کے درمیان کسی ایک طاقت کا ساتھ دے کر مسلمانوں کے لئے کوئی آزاد علاقہ حاصل کرنا۔ مثلاً روس کا ساتھ دے کر برطانیہ سے کچھ حاصل کیا جائے جرمنی کا ساتھ دے کر روس سے اور برطانیہ اور فرانس سے مل کر روس سے کچھ حاصل کیا جائے۔ بعد میں یہی تصورات ان کی حکمتِ عملی کے بنیادی تصورات بنے۔ ۱۸۸۴ء میں وہ آگے بڑھ گئے۔

ایران: ایران میں انہوں نے عدالتوں کے نظام کی اصلاح کے لئے کام کیا جس کے نتیجہ میں وہ مقامی علماء کے آمنے سامنے ہوئے اور یوں صورتحال میں شدید گرمی پیدا ہوگئی اور بہت جلد انہیں وسطی ایشیا جانا پڑ گیا۔ ۱۸۸۸ء میں ایران کے شاہ نصیر الدین نے انہیں پھر ایران آنے کی دعوت دی اور ملک کے وزیر اعظم کا عہدہ پیش کیا۔ نصیر الدین دراصل مقامی علماء کے ساتھ اقتدار و غلبہ کی کشمکش میں الجھے ہوئے تھے اور انہیں امید تھی کہ جمال الدین اس سلسلہ میں معاون ثابت ہونگے۔ جمال الدین ایران آئے ضرور لیکن پرائم منسٹر کی حیثیت میں نہیں بلکہ بادشاہ کے مشیر خصوصی کی حیثیت سے۔ لیکن اس بار انہوں نے علماء کے بجائے خود بادشاہ کو نشانہ بنایا کہ اسی نے یورپی طاقتوں کو معاشی مراعات دیکر ملک کو فروخت کر دیا تھا۔ خود جمال الدین کے قیام کے

دوران اس کی واضح ترین مثال برطانوی کمپنیوں کو تمباکو کی فروخت پر بلا مقابلہ رعایتیں دیا جانا تھا۔ ان مراعات کے نتیجہ میں ایران میں تمباکو کی پیداوار اور اس کی فروخت کے تمام تر اختیارات برطانیہ کو ملنے والے تھے۔ جمال الدین نے تمباکو کے بائیکاٹ کی مہم کا اعلان کر دیا[2] اور یہی حکمت عملی بعد میں دوسرے ممالک میں سیاسی سرگرمیوں کا حصہ بنی۔ (ہندوستان میں مہاتما گاندھی نے بھی یہ حکمت عملی کپاس اور اس کے دھاگوں کے سلسلہ میں استعمال کی) جمال الدین کی خطابت نے ایرانی گلی کوچوں کو احتجاجی جلسوں اور جلوسوں سے بھر دیا جو شاہ کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر شاہ بہت پچھتایا ہوگا کہ اس کی نگاہ اس افغان مصلح پر آخر کیوں ٹکی تھیں۔ جمال الدین نے ایک بڑے آیت اللہ سے اس مسئلہ پر بھی گفتگو کی کہ تمباکو پر دی جانے والی رعایتوں کو غیر اسلامی کیوں نہ قرار دیدیا جائے۔ بالآخر شاہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا۔ سپاہیوں نے انہیں گھر سے نکالا اور افغان سرحد پر چھوڑ دیا اور پھر ۱۸۹۱ء میں جمال الدین افغانی استنبول کے لئے عازم سفر ہوئے۔

استنبول: استنبول میں سلطان حمید نے انہیں گھر بھی دیا اور وظیفہ بھی۔ سلطان نے سوچا تھا کہ جمال الدین کے پین اسلامک تصور سے کچھ سیاسی فائدہ ہو سکے گا۔ جمال الدین نے درس و تدریس، تصنیف اور خطبات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ عالم اسلام کے مختلف علاقوں سے دانشور اور سرگرم کارکنان ان سے ملاقات کرنے آتے اور یہ عظیم دانشور انہیں بتاتا کہ اجتہاد یعنی آزادانہ فکر اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ لیکن اس آزادانہ فکر کی جڑیں قرآن اور احادیث میں پیوست ہونی چاہئیں۔ ہر مسلمان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ قرآن اور حدیث سے براہ راست معنی اخذ کرے لیکن امت مسلمہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اسلام کے ان بنیادی اصولوں کی بنیاد پر ہی یہ کام انجام دے، وحی جن کا احاطہ کرتی ہے۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی، یعنی ان کی کمزوری کی بڑی وجہ، جمال الدین نے کہا، یہ ہے کہ انہوں نے مغربی سائنسی ترقیوں سے منہ موڑ رکھا ہے اور وہاں کے تعلیمی نظام اور معاشرتی علوم کو اپنا رہے ہیں۔ انہیں دراصل اس کے بالکل برخلاف کرنا چاہیے تھا۔ سائنسی علوم کو اپنا لینا چاہیے تھا اور مغربی معاشرتی علوم اور تعلیمی نظام کے لئے اپنے دروازے بند رکھنا چاہییں۔

۱۸۹۸ء میں بدقسمتی سے ایک ایرانی طالب علم نے شاہ نصیر الدین کو قتل کر دیا۔ ایرانی حکومت نے فوراً ہی جمال الدین کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے سلطان حمید سے انہیں حکومت کے ایران کے حوالہ کر دینے کی درخواست کی۔ سلطان نے یہ درخواست تو قبول نہیں کی لیکن اس عظیم مصلح کو نظر بند کر دیا۔ اسی سال جمال الدین کینسر کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور درخواست کی انہیں علاج کی غرض سے ویانا جانے کی اجازت دی جائے۔ سلطان نے یہ درخواست تو قبول نہیں کی لیکن اپنے ذاتی معالج کو ان کے علاج کے لئے متعین کرا دیا۔ معالج نے علاج کے دوران کینسر زدہ نچلا جبڑا نکال دیا۔ جمال الدین اسی سال وفات پا گئے اور انہیں ایشیا مائنر میں دفن کر دیا گیا۔ بعد میں ان کا جسد خاکی افغانستان میں از سر نو تدفین کے لئے لایا گیا۔ انہوں نے اپنے کام کا آغاز جہاں سے بھی کیا ہو اختتام افغانستان میں ہوا۔ اور آج کابل یونیورسٹی کے قلب میں ان کی قبر موجود ہے۔

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ سید جمال الدین افغانی کو کوئی آفیشل مقام حاصل نہ تھا، وہ کسی ملک کے سربراہ نہیں رہے۔ ان کے پاس کوئی فوج نہ تھی، کسی بھی حکومت میں انہیں کوئی سرکاری ذمہ داری نہیں ملی تھی۔ انہوں نے کبھی بھی کوئی سیاسی تنظیم قائم نہیں کی اور نہ ہی کوئی مہم چلائی۔ ان کے ملازمین نہ تھے اور نہ کوئی ان کے ماتحت کام کرنے والا تھا جسے وہ حکم دے سکتے۔ مزید یہ کہ انہوں نے اپنے پیچھے کتابوں کا کوئی سلسلہ یا کوئی ایک کتاب ایسی نہیں چھوڑی جو ان کی مربوط سیاسی فکر کو پیش کر سکے، کوئی اسلامی داس کیپیٹل نہیں۔ یہ شخص خالصتاً دوسروں کے لئے ایک دردسر اور ایک فتنہ انگیز مقرر اور باغی تھا۔ ہاں ایسا ہی تھا یہ شخص۔

اس کے باوجود عالم اسلام پر اس کا زبردست اثر رہا۔ کیسے؟ اس کے شاگردوں کے ذریعہ۔ جمال الدین افغانی نے ایک طرح سے پیغمبرانہ کردار ادا کیا۔ وہ جہاں بھی جاتے ان کی گیرائی اور کرشاتی توانائی لوگوں کو شعلہ بار کر دیتی۔ ان کے تربیت یافتہ محمد عبدہ الازہر یونیورسٹی کے سربراہ اور مصر کے سب سے بڑے مذہبی اسکالر قرار پائے۔ انہوں نے جمال الدین کے سیاسی افکار و خیالات کو ترتیب دیکر کتابیں لکھیں۔

جمال الدین کے ایک دوسرے شاگرد زغلول نے ایک سیاسی پارٹی وفد کے نام سے قائم کی جو آزادیٔ مصر کی قومی تحریک کے طور پر ابھری۔ ایک اور شاگرد جو سوڈان کے مذہبی اسکالر تھے برطانیہ کے خلاف مہدی کی حیثیت سے ابھرے۔ ایران میں ان کی تمبا کو مخالف مہم جس نے سرگرم کارکنوں کی ایک نسل کی تربیت کی تھی انیسویں صدی میں دستوری مہم کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

جمال الدین نے ایک افغان دانشور کو متاثر کیا جن کا نام تارزی تھا اور وہ ترکی میں قیام پذیر تھے۔ جمال الدین کی پیروی میں وہ افغانستان واپس آئے اور پرنس امان اللہ کی تعلیم و تربیت پر مامور ہوئے۔ پرنس امان اللہ افغانستان کے ولی عہد تھے۔ تارزی نے ہونے والے بادشاہ کی تربیت ایک جدید دور کے بادشاہ کی حیثیت سے کی جس نے افغانستان کو ایک آزاد مطلق العنان ریاست میں تبدیل کرا دیا۔ اور یہ خواب جمال الدین کی وفات کے محض بائیس سال بعد پورا ہو گیا۔

ان کے شاگردوں کے بھی شاگرد ہوئے۔ نصب العین اور پیغام بدلتا گیا۔ بعض بنیادی سیاست کرنے والے بن کر ابھرے، کچھ زیادہ ہی قوم پرست ہو گئے، بعض ترقیات کے طرفدار بنے یعنی مسلم ممالک میں صنعتیں قائم ہوں اور ٹکنالوجی آئے اور چاہے کسی بھی قیمت پر آئے۔ محمد عبدہ کے ایک شامی شاگرد رشید رضا نے اسلام کی ان بنیادوں کی وضاحت کی جو ریاست کی بنیاد بنتے ہیں۔ جلال الدین کی دانشوری کی روایت کے ایک اور امین حسن البنا تھے جنہوں نے اخوان المسلمین قائم کی۔ ان کے بارے میں مزید بعد میں۔ مختصراً اس تندوتیز اور پارہ صفت شخصیت کے خیالات کی گونج عالم اسلام کے کونے کونے میں سنائی دی گئی جہاں وہ بے قراری سے سفر در سفر رہا۔

باب : ۱۴

دستوریت، صنعت وحرفت اور قوم پرستی

(۱۱۶۳-۱۳۳۶ھ، ۱۷۵۰-۱۹۱۸ء)

عبدالوہاب، سید جمال الدین افغانی اور سید احمد آف علی گڑھ یہ تینوں ان نقطہائے نظر کی عکاسی کرتے ہیں جو اس سوال کے پس منظر میں ابھرتے رہے تھے کہ عالم اسلام میں غلطی کہاں ہوئی کہ اس حال کو پہنچا، اور اب اس مسئلہ کا حل کیا ہے؟ انیسویں صدی میں ان تینوں نظریوں کی بنیاد پر مختلف رویے سامنے آئے اور مختلف علاقوں میں انھیں پھلنے پھولنے کے مواقع میسر ہوئے۔ لیکن ان سب میں سیکولر جدیدیت کو واضح سیاسی حمایت اور توانائی ملی جسکی وکالت علی گڑھ کے سید احمد نے کی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ سید احمد نے کوئی بہت مضبوط تحریک شروع کی تھی۔ وہ تو عالم اسلام کے ان متعدد سیکولر مصلحین میں سے ایک تھے جن کے افکار میں خاصی مماثلت پائی جاتی تھی ان کے خیالات سے عالم اسلام کیوں اس قدر متاثر ہوا اس کی وجہ عالم اسلام کے قلب میں پائے جانے والے تین محرکات تھے جو عین اس وقت متعارف ہو رہے تھے یعنی صنعت وحرفت کی لہر و دستور پسندی اور قوم پرستی۔

ان میں سب سے زیادہ نتیجہ خیز غالباً صنعت وحرفت کا بڑھتا ہوا رجحان تھا جس نے پوری دنیا کو متاثر کیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں یورپ بہت تیزی سے مصنوعات اور اختراعات سے مالا مال ہوا۔ اس کا آغاز ۱۸۰۰ء میں اسٹیم انجن سے ہوا تھا۔ اکثر و بیشتر ہم ایجادات کے بارے میں اس طرح کہتے ہیں کہ بس وہ اپنے طور پر ہوگئیں اور موجود ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہوتا نہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ کچھ لوگ بہت ذہین اور چالاک ہوتے ہیں اور وہ ایسی چیزیں بنا لیتے ہیں۔ جب کوئی ایجاد مکمل ہوکر ہمارے سامنے آتی ہے تو وہ ایسی بہت سی چھوٹی چھوٹی اختراعات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سب سے اہم چیز معاشرتی پس منظر ہے جس میں کام ہو رہا ہوتا ہے اور اسی سے یہ طے ہوتا ہے کہ کوئی چیز قبول ہوگی کہ نہیں۔

اسٹیم انجن اسی طرح کی ایک مثال ہے۔ ایک وقت میں کیا چیز زیادہ مفید ہے؟ کس چیز سے دنیا میں واضح طور پر تبدیلی آئے گی؟ گوکہ اسٹیم انجن کوئی تین صدی قبل عالم اسلام میں ایجاد ہوا تھا نہ کہ یہ مغرب میں اچانک ظاہر ہوا۔ مسلم دنیا میں تین سو سال تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی کیونکہ یہاں اس کا استعمال کسی بہت بڑی دعوت طعام کے لئے سالم بھیڑ کو ایک ساتھ اور جلد روسٹ کرنے کی خاطر توانائی پہنچانے کے لئے ہوتا تھا۔ اس آلہ کا تذکرہ ترک انجینئر تقی الدین نے ۱۵۵۱ء کی اپنی ایک کتاب میں کیا ہے۔ اس استعمال کے علاوہ کسی اور کام میں اس کا استعمال نہ ہوسکا تو بتدریج اسے بھلا دیا گیا۔

اس طرح کی ایک اور مثال چین کی ہے۔قدیم چین میں دسویں صدی تک وہ تمام ضروری ٹکنالوجی حاصل ہوچکی تھی جوان کی پیداوار کے نظام میں مشینوں کے استعمال کے لئے ضروری تھی اور یوں وہ کثیر مقدار میں پیداوار کرسکتے تھے۔لیکن اس موجود صلاحیت کوانہوں نے اس مقصد کے لئے استعمال نہیں کیا۔ بلکہ دندانے دار گراری پر مشتمل مشینوں کو کھلونے بنانے کے لئے استعمال کیا۔مثلاً انہوں نے بڑی گھڑی کو چلانے کے لئے پانی کے ذریعہ چلنے والا پہیہ استعمال کیا۔اگر انہوں نے اس طرح کی ٹیکنالوجی کومزدوری اور محنت کو کم سے کم کرکے پیداوار بڑھانے والی مشینیں تیار کرنے میں استعمال کیا ہوتا جیسے کہ انیسویں صدی کے یورپ میں ان کا استعمال شروع ہوا تو یقیناً صنعتی انقلاب چین میں آچکا ہوتا۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں نہ ہوا؟ یہ اختراعات اس مقام تک کیوں نہ پہنچیں تا آنکہ مغرب میں انہیں دریافت کیا گیا۔اس کا جواب اس اختراع یا ایجاد میں نہیں بلکہ اس ماحول اور فضا میں ملتا ہے جس فضا میں ایجادات واختراعات واقع ہوتی ہیں یا پیدا ہوتی ہیں، یعنی معاشرتی سیاق وسباق ہی کسی اختراع اور ایجاد کی موزونیت طے کرتا ہے اور اس کے ظہور کا وسیلہ بنتا ہے۔

چین میں جب دندانے دار گراری پر مشتمل مشینری کی ابتداء ہوئی تو وہاں ایک مستعد اور مرکز جو حکومت قائم تھی اور ایک امپیریل منتظمہ معاشرہ کی دیکھ بھال کرتی تھی۔اس منتظمہ کا اصل کام رکارڈ وغیرہ تیار کرنے اور اسے محفوظ رکھنے اور دفاعی امور دیکھنے کے علاوہ عوامی خدمت کے کاموں کومنظم کرنا تھا۔چین کے سیاسی کلچر کا غیر معمولی جوہر قابل اس کی یہ صلاحیت تھی کہ جب اور جہاں ضرورت سے زیادہ مزدور ہوتے ایسی تعمیراتی اسکیموں میں مصروف کردیے جاتے جو بالآخر عوام کی ضروریات کو پورا کررہی ہوتی تھیں۔مثلاً پہلے بادشاہ نے کوئی دس لاکھ لوگوں کو دیوار چین بنانے میں مصروف کرادیا تھا۔بعد کے ایک بادشاہ نے اس سے بھی زیادہ مزدور عظیم نہر کی کھدائی پر معمور کیے جس سے ملک کی دو بڑی دریا باہم مربوط ہوگئیں۔صحیح ہے کہ چین کے پاس ایسی ٹکنالوجی موجود تھی جس کی مدد سے ایسی مشینیں تیار کی جاسکتی تھیں کہ مزدور کم ہوجاتے اور پیداوار میں اضافہ ہوتا لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کون کراتا؟ صرف امپیریل منتظمہ ہی یہ کام کرسکتی تھی لیکن سوال یہ ہے کہ بے تحاشہ مزدور ہوتے ہوئے مزدوروں کو کم کرانے کا خیال کیسے آسکتا تھا۔چین بے حد گنجان آبادی والا ملک تھا اور مزدوری سستی تھی۔اگر مزدوروں کی بہت بڑی تعداد بے مصرف ہوجائے تو نتیجہ میں پیدا ہونے والے معاشرتی انتشار کو کون روک پائے گا۔یہ منتظمہ چین کا واحد ادارہ تھا جو اس ملک کو صنعتی دور کی طرف لے جاسکتا تھا لیکن اس کے پاس اس کام کے لئے ضروری محرک موجود نہ تھا۔

اسی طرح مسلمان موجدین کے خیال میں بھی نہیں آیا کہ اسٹیم کی طاقت کو ایسی مشین بنانے میں استعمال کیا جائے تا کہ کثیر مقدار میں اشیائے صرف تیار کی جاسکیں کیونکہ وہ جس معاشرہ میں رہتے تھے اس میں پہلے ہی سے یہ چیزیں بے تحاشا موجود تھیں۔لاکھوں کی تعداد میں دستکار اور فنکار یہ چیزیں بناتے اور بہت مستعد تجارتی

نظام کے تحت دور دور تک عوام تک پہنچ جاتیں۔ اس کے علاوہ دستکاروں اور فن کاروں کی یہ بڑی تعداد ایسی بے شغل اور مجہول اشرافیہ سے وابستہ تھی جن کے اپنے استعمال کی عام اشیاء موجود تھیں جس کی بنا پر انہیں یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ یہ چیزیں پیدا کی جاتیں چہ جائے کہ کثیر تعداد میں پیدا کی جاتیں۔

ایسا نہیں تھا کہ ان معاشروں میں کچھ فکری خرابیاں تھیں یا ان کا فساد فعل یا فتور فعل تھا کہ جو ٹکنالوجی دنیا بدلنے کی صلاحیت رکھتی تھی اس کی طرف یہ لوگ متوجہ نہ ہوئے۔ بات اس کے برعکس تھی۔ یعنی بات یہ تھی کہ حالات بالکل درست ہوں اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہو تو معاشرہ ایک بڑی سطح کے توازن اور مساوات کے جال میں پھنس جاتا ہے (یہ اصطلاح مورخ Mark Elvin نے استعمال کی ہے)[1] چنانچہ ضرورت ایجاد کی ماں نہیں بلکہ یہ اس عمل کی ماں ہے جو ایک ایجاد کو مصنوعات میں بدلتی ہے۔ اور یورپ کی اٹھارہویں صدی کے آخر میں وہ ماں موجود بھی تھی اور تیار بھی۔

اسٹیم انجن کا ارتقاء، دراصل اسٹیم انرجی سے چلنے والے پمپوں سے جو پرائیویٹ کانوں کے مالک دھروں (Shafts) پر گرنے والے پانی کو نکال کر پھینکنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ کانوں کے یہ مالک ایک اور مسئلہ سے دوچار تھے۔ کانوں سے نکلنے والی کچی دھات نکال کر کس طرح جلد از جلد دریاؤں یا بندرگاہوں تک لے جائیں اور اس مقابلہ میں دوسروں کو کس طرح مات دے سکیں۔ عام طور پر گھوڑا گاڑیوں میں اسے لاد کر پہنچایا جاتا تھا۔ یہ گاڑیاں لکڑی کے بنے مخصوص متوازن راستہ پر دوڑتی تھیں جنہیں ٹرام وے کہتے تھے۔ ایک روز ایک ناخواندہ شخص جس کا نام جورج اسٹیفن (George Stephenne) تھا اور جو کانکنی کا منیجر بھی تھا اس کے ذہن میں بات آئی کہ کیوں نہ اسٹیم پمپ کو ایک گاڑی میں جوڑ دیا جائے اور مناسب گراری جوڑ کر پہیہ چلایا جائے۔ بس دخانی پہیہ گاڑی وجود میں آچکی تھی۔

اس زمانہ میں نجی کاروباریوں کی انگلینڈ میں بہتات تھی جو ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی ہمہ وقت کوششوں میں لگے رہتے تھے۔ اور اپنی مصنوعات کو دوسروں کے مقابلہ پہلے مارکیٹ میں پہنچانے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے۔ جس کسی کے پاس روایتی کے بجائے ریل روڈ کے وسائل ہوتے وہ اپنی تجارت میں آگے بڑھ جاتا تا آنکہ دوسرے بھی اسی وسیلہ کو استعمال کرنے لگتے۔ چنانچہ یہ ہوا کہ ہر تاجر ریل روڈ ہی کو استعمال کرنے لگا اور جن کے پاس ریل روڈ بنانے کے اپنے وسائل تھے انہوں نے بھی اپنے ذرائع تیار کر لئے۔

اس طرح جب جیمس واٹ (James watt) نے اٹھارویں صدی کے آخر تک اسٹیم انجن اور بہتر کر لیا تو یورپ کے ذہین موجدین نے کپڑا تیار کرنے کے لوم کو مشین کے ذریعہ چلانے کے طریقے نکال لئے۔ چنانچہ جس کے پاس پاور لوم تھا اس کی مصنوعات دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ کثیر تعداد میں آنے لگیں اور نتیجہ کے طور پر بہت سے لوگوں کی تجارت ختم ہوگئی تا آنکہ انہیں پاور لوم حاصل نہ ہوگئے۔ چنانچہ سب ہی نے اب پاور لوم ہی استعمال کرنا شروع کر دیئے۔

جس کے پاس سرمایہ تھا اس نے دو پاور لوم حاصل کیئے، کسی نے دس، کسی نے سو اور اس طرح مقابلہ میں آنے والے بہت سے بیکار ہو گئے تو بہت سے زیادہ دولت مند ہوتے گئے۔ جب سرمایہ کی بہتات ہوئی تو یہ سوچا گیا کہ مشینوں کا استعمال اور کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جوتے، فرنیچر، چمچے ان سب کی تیاری میں ایندھن کے ذریعہ چلنے والی دندانے دار گراری والی مشینوں کا استعمال ہونے لگا۔ اور ایک بار شروع ہو جانے کے بعد لگا کہ ہر چیز ان مشینوں کے ذریعہ ہی تیار ہو سکتی ہے۔ اور ہاتھ کے مقابلہ مشینوں سے تیار کی ہوئی مصنوعات نہ صرف مقدار میں کہیں زیادہ تھیں بلکہ سستی بھی تھیں۔ ہر آدمی کی خواہش ہوتی کہ وہ جب میز بنانے کا ہی کاریگر ہے تو اسے اس کا بہت بڑا تاجر ہونا چاہیئے۔

یقیناً اس کے ذریعہ بہت سے تاجر بیکار ہوئے۔ لیکن اُنیسویں صدی کے یورپ اور دسویں صدی کے چین میں یہی بنیادی فرق تھا۔ یورپ کی ذہنیت یہ تھی کہ جن کے پاس سرمایہ تھا وہ سستی اور زیادہ مصنوعات کے حصول کی خاطر مشینری لگاتے ہوئے اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ جو لوگ بے کار ہو جائیں گے ان کا کیا ہوگا۔ ان پر منحصر خاندانوں کا کیا ہوگا اور ان لوگوں کے مسائل کیسے حل ہوں گے جن سے نہ وہ واقف تھے اور نہ ہی ان کے ناموں سے آگاہ۔ تصوّر یہ تھا کہ اس طرح کے معاشرتی اتار چڑھاؤ اور بیروزگاروں سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان پر نظر رکھنا کسی اور کی ذمہ داری ہے۔ صنعتی ترقی کے آگے بڑھنے میں کوئی اخلاقی نقص نظر نہیں آتا بلکہ محض یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ کس طرح ممیّز اور الگ الگ حصوں میں تقسیم تھا۔

صنعتی انقلاب برپا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہاں بعض معاشرتی خصوصیات پائی جاتی ہوں اور اس وقت یورپ میں وہ خصوصیات موجود تھیں۔ اس کے ساتھ صنعتی انقلاب اپنے جلو میں بعض ناگزیر نتائج بھی لاتا ہے اور اس وقت جب یورپ میں مصنوعات کی تیاری پر مشین حاوی ہوگئی تو معاشرہ ان نتائج سے دوچار ہوا۔ چنانچہ معاشرہ، روزمرّہ کی زندگی اور یورپی لوگ بذاتِ خود بدل گئے۔ یہاں کچھ کی نشاندہی کرتے ہیں۔

☆ دیہاتی علاقے خالی ہوئے اور شہروں کا جیسے سیلاب آ گیا۔

☆ اکثریت کی زندگی سے جانور غائب ہو گئے۔

☆ گھڑی اور کلینڈر نے اوقات کے فطری ذرائع کی جگہ لے لی مثلاً سورج اور چاند اس اعتبار سے غیر اہم ہو گئے۔

☆ بڑے خاندانوں کا خاتمہ ہوا اور چھوٹی نیوکلیر فیملی یعنی ایک مرد و ایک عورت اور ان کے بچوں پر مشتمل صنعتی دور کا عالمی سطح پر تسلیم شدہ خاندانی یونٹ ہو گیا، ظاہر ہے کہ اس ضمن میں خصوصی ہدایات جاری نہیں کی گئی تھیں۔

☆ عوام اور مقام میں جو تعلق پہلے تھا وہ نہ رہا کیونکہ نیا معاشی نظام جگہ کی تبدیلی کا تقاضا کرتا تھا۔ لوگوں کو وہاں جانا ہوگا جہاں کام ہوگا۔ اور اچانک کام کہیں بھی مل سکتا تھا۔

☆ اور آخرِ کار سمجھوتا کرنے اور حالات کے تحت بدلنے یعنی پرانی قدروں کو چھوڑنے اور تازہ تصورات کو اپنانے کا رجحان بڑھنے لگا۔ اور اس میں جو زیادہ آگے اور تیز تھا وہی زیادہ اثاثوں کا مالک اور کامیاب مانا گیا۔

نسلوں کے درمیان تعلق کمزور ہو گیا۔ اکثر و بیشتر افراد کو اس کی ضرورت نہ تھی کہ وہ اپنے والدین سے کچھ سیکھیں اور نہ ہی ان کی اپنی صلاحیت اور استعداد ان کے بچوں کے کام آنے والی تھی۔ والدین اپنے بچوں کے لئے جو سب سے بہتر کرا سکتے تھے وہ یہ تھا کہ اپنے طور سے وہ بنیادی صلاحیتیں پیدا کر دیں جو انہیں جُھکنے، سیکھنے اور ڈھل جانے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اس طرح مجموعی طور پر دیکھا جائے تو پڑھنا لکھنا اور ارتھمیٹک وغیرہ ادائے فرض کی خاطر یہ ناگزیر صلاحیتیں ہو گئیں۔

اس صورتحال نے تشویش میں تو مبتلا کیا لیکن یہ تشویش ہلاکت خیز نہ تھی کیونکہ یورپی لوگوں میں (اور امریکیوں میں بھی) رویوں کا ایک ایسا شاکلہ مرتب ہو گیا تھا جس سے وہ ایسی صورتحال سے نپٹ سکے اور اس شاکلہ کی بنیاد تھی ''انفرادیت''، جس کے ارتقا میں مغرب کو صدیاں لگ گئی تھیں۔

جب یورپی عالم اسلام میں آئے تو اپنے ساتھ وہ اشیاء لائے جو صنعتی انقلاب کا آخری عنصر تھیں۔ وہ اپنے ساتھ ارتقائی عمل لیکر نہیں آئے تھے جس کے نتیجہ میں یہ اشیاء وجود میں آئی تھیں۔ مسلمانوں کو بھی اشیاء کی ضرورت تھی اور کسے نہ ہوتی۔ سستا کپڑا مشینوں کے ذریعے بنے ہوئے جوتے۔ باقاعدہ پیک کی ہوئی خشک چیزیں اور کیا کچھ نہیں۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ مسلمان ان اشیاء کو نہ لیتے۔ وہ کوئی بھی مشین مغرب سے خرید کر اسے چلا سکتے تھے۔ وہ مشین خریدتے اسے کھولتے اور سمجھ لیتے کہ کس طرح بنائی گئی ہے اور ویسی ہی مشین خود بنا لیتے۔ ان مشینوں کی تیاری میں ایسی کوئی چیز نہ تھی جسے وہ سمجھ نہ سکتے ہوں۔

لیکن معاشرہ کی تائید کا ہونا ایک الگ مسئلہ تھا۔ صنعتی ارتقاء کے لئے شرط لازم یکا یک درآمد نہیں ہو سکتی۔ اور نہ ہی ہر معاشرہ ان شرائط کو آسانی سے جذب کر سکتا تھا۔ بالخصوص وہ معاشرہ جو مغربی یورپی معاشرہ سے مختلف بنیادوں پر استوار ہوا ہو۔

مثلاً عثمانی معاشرہ میں صنعتی بیداری انجمنوں کی نگرانی میں ہوئی تھی جو صوفی مسلکوں سے گھرے اور دور تک پھیلے ہوئے رشتوں میں بندھی ہوئی تھیں۔ جو اسی طرح سے عثمانی مرکزی اور ریاستی انتظامی مشینری سے بھی منسلک تھیں۔ ہر شخص کی اپنی متعدد قبائلی نسبتیں ہوتی تھیں اور یہ سب ایک ایسے آفاقی مفروضہ کے پیدا شدہ ماحول میں تھا جس میں کچھ کام خالصتاً مردوں کے دائرہ کار میں تھے اور دوسرے عورتوں کے لئے جن کی ایک علیحدہ دنیا تھی سیاست اور اشیاء کی پیداوار سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

لیکن اس کے باوجود پوری دنیا میں، بشمول یورپ اور عالم اسلام، صنعتی انقلاب سے پہلے صنعتکاری کا بڑا حصہ عورتوں کے ہاتھوں میں تھا۔ کیونکہ ہر قیمتی اور ضروری شے گھروں کے قریب یا گھروں میں تیار کی جاتی

تھی۔عورتیں کپڑے بنتی اور لباس تیار کرتیں، جانور پالنے میں عورتوں کا بڑا رول تھا۔گلہ ہو یا کھیت ان کے خام مال کو کارآمد اور قابل استعمال بنانے میں عورتیں ہی موثّر رول ادا کرتی تھیں اور بھی بہت سی دستکاریاں ان کی دلچسپی کا حصہ تھیں۔لیکن جب پورا عمل مشین کے ذریعہ ہونے لگا تو گھریلو صلاحیت دب گئی اور بے شمار عورتیں بے روزگار ہوگئیں۔

یورپ میں ایسی متعدد عورتیں فیکٹریوں میں کام کے لئے جانے لگیں، دکانیں اور آفس میں بھی کام ان کا منتظر تھا۔یورپ کے معاشرے میں عورتوں کے لیے یہ ممکن تھا۔اس سے یقیناً کچھ معاشرتی اور نفسیاتی انتشار تو پیدا ہوا لیکن کیونکہ عورت پہلے ہی عوامی میدان میں رسائی حاصل کر چکی تھی اس لیے گھر سے باہر کام کے لیے جانا اسے مشکل نہ ہوا۔وہ گھر سے باہر گئی اور اسی عظیم تحریک سے جو بہر حال ظہور پذیر ہونی تھی، وہ فلسفیانہ محویت، سیاسی نظریہ سازی اور معاشرتی فعال پذیری پیدا ہوئی جس کے مجموعہ کو آج فیمنزم (نسوانیت) کہا جاتا ہے اور جس کی اصل یہ تسلیم کرنا ہے کہ فرد کے حقوق ہیں اور وہ محترم ہیں۔اور کیونکہ عورت بھی ایک فرد ہے اس لیے مرد اور عورت دونوں کے ایک ہی حقوق ہونا چاہئیں۔

عالم اسلام میں دو دنیاؤں کا تصور پوری طرح سرایت کیے ہوئے تھا ایک عوامی حلقہ جو مردوں کے لیے تھا اور دوسرا عورتوں کا نجی حلقہ۔اس صورتحال میں گھریلو پیداوار جب مشینی پیداوار میں تبدیل ہونے لگی تو مسائل زیادہ ہی گمبھیر ہو گئے، معاشرتی نظم وترتیب میں اس خلل نے بڑا جذباتی صدمہ بھی پہنچایا۔ان تبدیلیوں کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے اولین طور پر یہ ضروری تھا کہ وہ معاشرتی تقسیم تبدیل کر دی جائے جو خاندانی زندگی کی بنیاد پر تیشہ زنی کرنے والی تھی۔اور اس کے نتیجہ میں مردوں اور عورتوں کے تشخص سے متعلق پیدا ہونے والے سوالات کا کوئی جواب نہ تھا۔اور یہ سوالات محض شعور کے نہ تھے بلکہ لاشعور تک پہنچے ہوئے تھے جیسا کہ بعد میں بیسویں صدی میں ثابت ہوا۔لیکن ایک اور بات یہ تھی کہ انجمنوں کی جگہ اگر فیکٹریاں آ جاتیں تو صنعتکاری اور صوفی سلسلہ کا باہمی ربط ٹوٹ جاتا اور ایک مرحلہ میں آ کر محسوس ہوتا کہ جیسے روحانیت اور کام کا رشتہ ختم ہو گیا ہے۔مزید یہ کہ فیکٹریوں کی طرف مراجعت کا ایک اور اثر یہ ہوتا کہ لوگ اب اپنی زندگی کو گھڑیوں سے ترتیب دینے لگتے۔یہ تبدیلی ان کے پانچ وقت کی نماز کی مشغولیت کو بنیادی طور پر متاثر کرتی جو قدرتی نشانیوں سے متعین ہوتی ہے یعنی سورج کی پوزیشن سے نماز کے اوقات متعین ہوتے ہیں۔اس طرح مشینی پیداوار ایک روحانی عمل کے خلاف جارہی تھی۔یورپ کو بھی اس تضاد کا سامنا ہوتا اگر صنعتی انقلاب جاگیردارانہ نظام کے زمانہ میں آیا ہوتا کیونکہ اس وقت لوگوں کے روزانہ کے معمولات Matins یعنی صبح کی عبادات اور Vespers یعنی مغرب کے وقت کی عبادتوں سے متعین ہوتے تھے۔

اس سب کے ساتھ ساتھ صنعتکاری کی اپنی ضرورت یہ بھی تھی کہ معاشرہ کی تنظیم آفاقی نوعیت کی ہو، باہم منسلک فریقوں کے بڑے بڑے نیٹ ورک ہوں جن کی آپسی وفاداریاں دوسری وفاداریوں پر حاوی

ہوں جو محض اینٹوں کے بنے افراد کی کائنات کی طرح راتوں رات فیصلہ کرسکیں۔ ہر معاشی نوعیت کا فیصلہ عقل کی روشنی میں یا پھر انفرادی خودغرضی پر مشتمل ہو اور جوابدہی محض اپنی نیوکلیر فیملی کو ہو۔ ایسا ہونے والا نہ تھا۔ کم از کم ایسا ہونا آسان نہ تھا۔ اور اگر ہوتا بھی تو یہ اچانک نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ ۷۰۰ء سے قائم اور چلی آرہی اسلامی تہذیب کے دریا کو ایک دھارا آکر کاٹ جائے یہ ضروری تھا۔ اس کے باوجود مسلم معاشرے کو اپنی دنیا میں صنعتکاری کی شرائط پیدا کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔ لیکن یہ بھی نہ ہونے والا تھا، بلکہ اس کا امکان شاید اور بھی کم تھا۔ کیونکہ کسی نے بھی ان معاشرتی شرائط کے بارے میں نہیں سوچا۔ انہوں نے مصنوعات، ٹیکنالوجی اور ان میں کارفرما سائنسی اصول کے حصول کے بارے میں ہی سوچا تھا۔

یعنی کسی کو مشینوں کے ذریعہ تیار کردہ اور روزمرہ کے استعمال کی مصنوعات کی تلاش نہیں بلکہ............

شی شی............ کوئی سن نہ لے ہمیں بھی اس طرح کی اصلاحات کی ضرورت ہے جن کی بنا پر انفرادیت پسندی پیدا ہوتی ہے اور اس کے بعد ایک لمبا عرصہ درکار ہے جس میں مذہب پر عقل بتدریج حاوی ہوتی جائے گی اور ایسے سیاسی ادارے ابھریں گے جو آزادی فکر کی حوصلہ افزائی کریں گے تاکہ ہم بھی سائنس کے جدید تصورات تک پہنچ سکیں اور اس کے ساتھ ساتھ مقابلہ آرائی پر مشتمل ایک معاشی نظام برپا ہوگا کہ پرائیویٹ بزنس کرنے والے جب سائنسی ٹکنالوجی کو دیکھیں تو اسے حاصل کرنے کے لیے دوڑ پڑیں گے اور وہ محض چند سالوں میں یورپ سے بالکل آزاد رہ کر ہی یہ اشیاء خود ہی تیار کرنے لگے۔ لوگوں نے کہا کہ نہیں اور سوال کیا کہ اچھی چیزیں ہمیں کب مل پائیں گی؟ یہ بالکل بے کار سی بات ہے کہ پہیہ کی ایجاد دوبارہ کی جائے جو پہلے سے ہی موجود ہے اور چل بھی رہا ہے۔

مارکس اور انجیلیس اور بعض دوسروں نے باقاعدہ طور پر بتایا تھا کہ انفرادیت پسندی کے بعض منفی اثرات پڑتے ہیں۔ لیکن عالم اسلام میں یہ اثرات کہیں زیادہ گہرے اور وسیع ہونگے۔ دیکھا جائے تو استعمال کی اچھی اشیاء کا ہونا وہ چاہے مشینوں کے ذریعہ ہی بنائی گئی ہوں خود ہی اپنے حق میں ایک دلیل ہے۔ کوئی پمفلٹ اسے باطل قرار نہیں دے سکتا اور کوئی مذہبی پرجوش بیان اسے ختم نہیں کرسکتا۔ ''اچھی چیزیں ہیں کچھ لے ڈالیں، چپکے سے کانوں میں کہا گیا۔ اور اصلاً اس خواہش کو سہارا دیا کہ دیکھو اس صورتحال کو بدلنا چاہیے، اور ایران، افغانستان، ایشیا مائنر، مصر، مراقش وغیرہ میں جو لوگ آباد ہیں انہیں کسی حد تک مغربی ہوجانا چاہیے۔ اس طرح صنعتی انقلاب سے آگاہی آہستہ آہستہ مسلم دنیا میں متعارف ہوتی رہی اور سیکولر اصلاحات کی طرف توجہ بھی بڑھتی رہی۔

۱۸۴۰ء کے بعد ایران کو ایک بڑا زیرک اور ذھین وزیراعظم ملا جس کا نام تو مرزا تھا لیکن وہ امیر کبیر یعنی عظیم رہنما کہلایا۔ انہوں نے ایک خصوصی پروگرام ایران کو جدید طرز پر ڈھالنے کے لیے شروع کیا۔ جدید طرز سے مراد ایران کو صنعتی دور کی طرف لے جانا تھا۔ لیکن وزیراعظم یہ سمجھتے تھے کہ اس مقصد کا حصول آسان نہیں

اور یہ ایک پیچیدہ عمل ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ایران محض صنعتی اشیاء ہی حاصل نہ کرے گا۔ مغربی قوتوں کے ہم پلہ ہونے کے لئے جو ایران کو پھاڑ کھانے کے لیے تیار بیٹھیں تھیں۔ ایرانیوں کو مغربی ثقافت کے بعض پہلوؤں کو اپنانا ہوگا۔ کون سے پہلو؟ امیر کبیر نے سوچا وہ تعلیم ہے۔

انہوں نے ایران میں سیکولر اسکولوں کا ایک جال بچھا دیا، طہران سے ذرا باہر ایک یونیورسٹی جس کا تذکرہ ہو چکا ہے دارالفنون کے نام سے قائم کی جس میں طلباء کے لئے بیرونی زبانیں، سائنس ٹیکنیکل مضامین اور مغربی ثقافت کی تاریخ پڑھائی جاتی تھی۔ ایران نے تعلیم کی غرض سے طلباء کو بیرونی ممالک اور خاص طور پر جرمنی اور فرانس بھیجا۔ ان طلباء کی اکثریت ایسے شہری خاندانوں سے متعلق تھی جو مراعات یافتہ تھے یعنی کورٹ سے یا ملکی انتظامیہ سے کوئی تعلق رکھتے تھے۔ دیہاتی یا تاجر خاندانوں یا بلند پایہ مذہبی خاندانوں سے متعلق نہ تھے۔ چنانچہ اس تعلیمی نظام نے ملک میں پہلے ہی سے جو معاشرتی تقسیم چلی آ رہی تھی اس میں اور اضافہ کر دیا۔

سیکولر اداروں سے تعلیم یافتہ گریجویٹ جو ہر سال بڑی تعداد میں فارغ ہوتے انہوں نے ملک کی جدید انتظامیہ اور فوج میں اپنی جگہ بنانا شروع کر دی (جدید یا موڈرن سے یہاں مراد ویسے جیسے کہ یورپ کے لوگ تھے)۔ چنانچہ صنعتکاری نے ایران میں ایک نئی سوشل کلاس پیدا کی جو تعلیم یافتہ سول سروینٹس، فوجی افسران، یونیورسٹی کے طلبہ، اساتذہ، ٹیکنیشینز، پیشہ ور، جو کوئی بھی دارالفنون کا تعلیم یافتہ تھا، اور ہر وہ شخص جو یورپ میں پڑھ کر آتا تھا پر مشتمل تھی۔ اس روز افزوں کلاس نے سیکولر فکر میں اور زیادہ اضافہ کیا اور ایسے افراد کی تعداد بڑھتی گئی جو سوچتی تھی کہ اسلام عقل اور اخلاقی قدروں پر مشتمل ایک نظام ہے چہ جائیکہ محض وحی پر مشتمل، حصول جنت کے لیے ایک دستور العمل۔

دستور پسندی وہ دوسرا محرّک تھا جو ایران میں پیدا ہوا۔ اس نے ایرانیوں کو بھی متاثر کرنا شروع کر دیا تھا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ نئی کلاسیں جو ایران میں بیدار ہو رہی تھیں وہ اس کے لیے اپنے دل و دماغ میں جگہ رکھتی تھیں۔ دستور پسندی جمہوری تصوّر نہیں ہے کیونکہ مطلق العنان ڈکٹیٹر بھی دستور رکھتے ہیں۔ لیکن دستور جمہوریت کی شرط لازم ہے۔ زور اس بات پر ہے کہ معاشرہ ایک مضبوط دائرہ کار میں رہ کر کام کرتا ہے جس میں کارفرما قوانین اور اصول نہ صرف عوام پر بلکہ حکمراں پر بھی نافذ ہوتے ہیں۔ مطلق العنان بادشاہتیں جو عرصہ دراز سے عالم اسلام میں حکمراں تھیں قانون سازی کا پورا پورا اختیار رکھتی تھیں۔ وہ جس وقت کے لیے جو قانون چاہتے اس کے مختار تھے۔ مطلق العنان بادشاہوں میں قانون کی حکمرانی کا یہ طریقہ محض بلند مقام پر فائز حکمراں کے لیے نہیں تھا بلکہ مقامی سطح کے حکمران بھی اسی طرز پر کام کرتے تھے اور اپنی رعایا پر من مانے طریقہ سے قانون نافذ کرتے تھے۔ (اس طرح جمہوریت کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بلند پایہ مقام پر فائز لوگ ایک خاص مرحلے سے گذر کر ہی وہاں پہنچ پاتے ہیں ہر سطح پر عوام کی رائے کا رول ہوتا ہے اور یہ بھی کہ انتخاب کا ہونا جمہوریت کا مترادف نہیں ہے بلکہ یہ محض اس بات کا اظہار ہے کہ جمہوریت پائی جاتی ہے۔

دستور پسندی ایران میں اس لئے بھی داخل ہوئی کہ نئی تعلیم یافتہ کلاس ایران میں پیدا ہو رہی تھی اس کے ساتھ ساتھ ایک نیا دانشور طبقہ بھی بیدار ہو رہا تھا۔ انہوں نے اپنی جدیدیت کو نہ صرف اپنے تصورات سے بلکہ اس زبان سے بھی متعلق کیا جس میں وہ ان تصورات کا اظہار کر رہے تھے۔ ان مصنفین نے اپنی زبان یعنی قدیم فارسی ادب سے بچنا شروع کیا جس میں تکلفات، اور خطابت لسانی کی نمائش اور ترکیبات کی بہتات تھی۔ اس کے نتیجہ میں ایک سادہ اور گھٹیلے پن سے مبرّا زبان ایران میں پیدا ہونی شروع ہوئی جو رزمیہ نظموں اور صوفیانہ شاعری میں نہیں بلکہ طنزیہ ناولوں، سیاسی ناٹکوں وغیرہ میں استعمال ہوتی تھی۔

ایک لٹریری اسکالر حامد دباش نے ایک عجیب و غریب انگریزی ناول The Adventures of Hajji Baba of Ispahan کا حوالہ دیا ہے جسے ایک James Morier سیاح نے لکھا۔ جس میں اس نے یہ ظاہر کیا تھا کہ یہ ناول اس نے فارسی کی اصل سے ترجمہ کیا تھا۔ اس ناول میں Morier نے بیہودہ زبان استعمال کرتے ہوئے فارسی طرز گفتگو کی ہجو کی ہے اور ایرانیوں کو بے ایمان، مسخرہ اور بدذات قرار دیا ہے۔

پھر ۱۸۸۰ء میں ایک حیرت انگیز بات ہوئی۔ ایک مشہور ایرانی ماہر گرامر مرزا حبیب نے بھی حاجی بابا کا فارسی ترجمہ کیا۔ حیرت انگیز طور پر جو انگریزی میں ایک جارحانہ نسل پرست اور ایک بکواس کتاب تھی وہ جب فارسی میں آئی تو ادبی شاہکار بن گئی اور ''جدید فارسی ادب کی نمائندہ آواز بن کر دستوری تحریک کی راہ میں ایک معتبر اور بنیادی متن بن گئی۔ Morier نے مستشرقین کے انداز میں ایرانیوں کی جو تضحیک کی تھی مترجم نے اسے مذہبی علماء اور معاشرے میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کی طرف پھیر دیا اور یوں حاجی بابا ایک فتنہ انگیز سیاسی تنقید بن گئی۔[۲]

سیکولر اور جدید دانشوروں کے آنے کے نتیجہ میں قدیم فارسی لٹریچر اور رومی، سعدی اور حافظ جیسی شاعری اب گرد آلود ہوگئی اور پڑھنے والوں کے یہاں محض نئی ایرانی تصنیفات ہی نہیں بلکہ یورپی مفکرین کی کتابیں جیسے Charles Montesquieu اور August Comte جیسے فلسفی بھی پڑھے جانے لگے جنہوں نے یہ نظریہ دیا تھا کہ سوسائٹی بتدریج بلندی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ مونٹاسکیو نے کہا تھا کہ ریپبلک طرز حکومت بادشاہت اور ڈکٹیٹر شپ کے بعد بہتر اور ترقی یافتہ طرز حکمرانی ہے۔ اگست کامٹے نے کہا کہ جیسے جیسے لوگ زیادہ مہذب ہوتے جاتے ہیں تو مذہب کا ارتقاء ہو کر مابعد الطبعیات اور سائنس کے دور میں آجاتے ہیں۔[۳]

ایران کے جدید دانشوروں نے فیصلہ کیا کہ ہمارے ملک کو بھی ارتقاء کے ان مراحل سے گذرنا چاہئے۔ چنانچہ ان کی بے اطمینانی قاجار بادشاہوں سے شروع ہوئی جو اپنی حکمرانی کی دوسری صدی سے گذر رہے تھے۔ یہ حکمراں ملک کو اپنی ذاتی ملکیت کی طرح استعمال کرتے تھے۔ ایک کے بعد دوسرا حکمراں ملک کی معیشت کو ٹکروں ٹکروں میں بیرونی لوگوں کو فروخت کرتا رہا تھا اور یہ آمدنی ان کے اپنے ذاتی خزانوں کو بھرنے

تفریحات وتعیش اور یورپ میں وقت گذارنے کے لئے استعمال ہوتی تھی۔

جدید سیکولرسٹوں میں بے اطمینانی اور غصہ کی لہر اس وقت عروج پر جا پہنچی جب جمال الدین افغانی نے تمباکو کے بائیکاٹ کی مہم کا آغاز کیا۔ جمال الدین افغانی سبھی مذہبی قلعوں یعنی علماء کو اس تحریک میں شامل کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے اور ان دونوں کے اس الحاق کی بدولت شاہ جھکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ لیکن ایک بار جب شاہ نے یورپیوں سے اپنا معاہدہ ختم کر دیا تو شیعہ علماء یہ سمجھے کہ وہ کامیاب ہو چکے ہیں چنانچہ وہ میدان سے ہٹ گئے۔

باقی سرگرم کارکنان ساتھ رہے لیکن مزید مطالبات پیش کر دیے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ایسا دستور بنانا چاہتے تھے جو بادشاہ کے اختیارات کم کرے اور حکومت چلانے میں عوام کی رائے کو اہمیت دے۔ جمال الدین افغانی جنہیں ملک بدر کر دیا گیا تھا ان سرگرم کارکنوں کی دلجمعی کرتے رہے۔ اب ان لوگوں نے ملک سے پارلمانی جمہوریت قائم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ لیکن شیعہ علماء ان کے مکمل مخالف تھے انکے خیال میں دستور غیر اسلامی شئے تھی کیونکہ ایران کے پاس پہلے ہی سے ایک دستور موجود تھا جو شریعہ کہلاتا تھا۔ انہوں نے جمہوریت کے تصور کا بھی مذاق اڑایا۔ ان کے خیال میں اسلام صرف خاندانی حکمرانی کی اجازت دیتا ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ایران کی طویل جدوجہد جو علماء اور شاہ کے درمیان جاری تھی اس میں اس تیسرے عنصر یعنی جدید سیکولر لوگوں کا اضافہ ہو گیا اور اس طرح یہ خاصی پیچیدگی اختیار کر گئی۔ یہ ایک ایسی جدوجہد تھی جس میں کوئی دو گروہ گٹھ جوڑ کر کے تیسرے کو بے اثر کر سکتے تھے۔ دستور کے معاملے میں علماء اور شاہ ایک ساتھ ہو کر جدید سیکولر گروہ کے خلاف ہو گئے۔

لیکن جدید سیکولر لوگوں کی لہر اس وقت عروج پر تھی۔ ۱۹۰۶ء میں قاچار بادشاہ ظفر الدین آخر کار جھک گیا اور ایک ایسا دستور تسلیم کر لیا جس میں بادشاہ کے اختیارات بہت حد تک کم کر دئے گئے تھے اور پالیمان طرز حکومت تسلیم کر لیا گیا تھا۔ دستور میں پالیمان کو مجلس کہا گیا۔ مجلس کے پہلے ہی اجلاس کے ایک ہفتہ کے اندر بادشاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کے بیٹے محمد علی شاہ نے حکومت سنبھالی۔ ابھی تک یہ واضح نہیں ہو سکا تھا کہ پارلیمنٹ کے اختیارات کیا کیا ہیں۔ مثلاً نہ تو فوج تھی اور نہ ہی پولیس لیکن محض دو سال کے عرصہ میں ایسے بہت سے قوانین مجلس نے منظور کر لیے جن سے اظہار خیال کی آزادی، آزادئ پریس اور آزادئ عوام جیسے حقوق ایرانی عوام کو حاصل ہو گئے۔

تیسرا سال ختم ہی ہوا تھا کہ بادشاہ نے توپوں کا رخ پارلیامنٹ کی طرف موڑ دیا اور اس کے اختیارات ختم کر دیئے۔ کہا گیا کہ "پرانے طرز کو ایک موقع" دینا چاہیے" علماء اور دوسرے روایتی گروہوں نے بادشاہ کے اقدامات پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ ایران کی یہ صورتحال تھی کہ جنگ عظیم اوّل آ پہنچی۔

اس دوران ایک تیسرا یورپی تصور یعنی قوم پرستی، عالم اسلام کے ذہنوں اور قلوب پر اثر انداز ہونے

لگا تھا۔ ایران میں اس تصور پر سب سے کم توجہ دی گئی تھی غالباً جس کی وجہ یہ تھی کہ ایران پہلے ہی سے ایک قوم پرستی پر مشتمل ملک یعنی نیشن اسٹیٹ تھا یا عالم اسلام کے کسی اور ملک کے مقابلہ میں قوم پرستی کے تصور سے بہت قریب تھا۔ ہندوستان میں اس تصور نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی جس کے نتیجہ میں بالآخر پاکستان قائم ہوا۔ لیکن اس تصور کی پذیرائی سلطنت عثمانیہ اور ان علاقوں میں ہوئی جو کبھی اس سلطنت کا حصہ رہے تھے۔

جب میں قوم پرستی کی اصطلاح استعمال کرتا ہوں تو میرا منشاء نظر آنے والی قوم پرست حکومتیں نہیں ہوتیں۔ نیشن اسٹیٹ تو ایک مکمل جغرافیائی حقیقت ہوتی ہے۔ ایک علاقہ جس کی طے شدہ سرحدیں ہیں، ایک حکومت، ایک کرنسی، قوانین کا ایک ڈھانچہ، ایک فوج، ایک پولیس فورس اور اس طرح مزید۔ نیشن اسٹیٹ جیسے فرانس، انگلینڈ، تاریخی حالات کے پیش نظر یکا یک عالم وجود میں آ گئیں۔ ایسا نہیں ہوا کہ قوم پرستوں نے اس تصور پر کام کیا اسے واضح کیا اور پھر تعمیر کی۔

میں جس قوم پرستی کی بات کر رہا ہوں وہ ایک تصور ہے جس کا ارتقاء کسی جگہ نیشن اسٹیٹ بن جانے سے نہیں ہوا۔ بلکہ وہاں ہوا جہاں نیشن اسٹیٹ نہیں بن سکتی تھیں۔ اس تصور نے یہ نہیں واضح کیا تھا کہ، کیا تھا؟ بلکہ توجہ اس پر تھی کہ............کیا ہونا چاہیے؟ جرمن زبان بولنے والوں نے جب انیسویں صدی میں قدم رکھا تھا تو وہاں متعدد ریاستیں اور بادشاہتیں قائم تھیں۔ اسی طرح اٹلی منقسم تھا اور یہ صورتحال جرمنی کے مشرق میں پورے یورپ کی تھی۔ قوم پرستی کے کلّے یہاں پھوٹے تھے۔

اس تصور کی تخم ریزی اٹھارہویں صدی کے ایک جرمن فلسفی جون ہرڈر (Johann Herder) کے خیالات نے کی تھی جس نے دور تنویر کے فلسفی ایمانول کانٹ اور اس جیسے دوسروں پر تنقید کی تھی۔ ان فلسفیوں کے مطابق انسان بنیادی طور پر ایک عقلی وجود ہے اور اخلاقی قدروں کو بالآخر عقل کے طابع ہی ہونا چاہیے اور کیونکہ عقل کے قوانین سب کے لیے یکساں ہیں اور اس میں وقت اور مقام کا کوئی اثر نہیں ہوتا اس لیے تہذیب یافتہ لوگ اپنے جذبات سے نہیں بلکہ عقل سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور آخر کار یکساں آفاقی قوانین اور یکساں فیصلہ کن اقدار کے مقام کو حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

لیکن Herder کا کہنا تھا کہ آفاقی اقدار کا کوئی تصور ہے ہی نہیں۔ نہ تو مثبت اور نہ ہی جمالیاتی اقدار۔ بلکہ اس نے کہا کہ دنیا میں کچھ ثقافتی وجود پائے جاتے ہیں جنھیں اس نے Volks (عوام، لوگ) کا نام دیا۔ ہر ایک کا ایک Volksgeist یعنی ان عوام کا روحانی جوہر ہوتا ہے۔ پھر مشترکہ زبان، رسومات، تاریخ اور اس طرح کے دوسرے بندھن، عوام کے ایک گروہ کو گروہ کا تصور دیتے ہیں اور یوں (Volks) تشکیل پاتا ہے۔ حالانکہ صحیح معنی میں یہ خالصتاً ایک معاشرتی وجود تھا لیکن اس کی ''گروہیت'' محض ایک معاشرتی معاہدہ نہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ ممبران کسی بات پر متفق ہو گئے ہوں اور ایک گروہ بن گیا ہو۔ ذرا یہ اس سے آگے ہے۔ جیسے متعدد Cells آپس میں ملیں اور ایک Organism تیار ہو جائے۔ قوم دراصل ایک متحد وحدت ہے اور یہ وحدت

حقیقی ہے۔ جیسے تتلیوں کا گروہ یا پہاڑوں کا سلسلہ۔ کچھ اس طرح کا تصور تھا Herder کا volks کے بارے میں۔ اور جب وہ volksgeist کی بات کرتا ہے تو وہ مذہبی لوگوں کی طرح روح کی بات کر رہا ہوتا ہے جیسے ماہرین نفسیات ''ذات'' کے بارے میں کہتے ہیں۔ Herder کے خیال میں ہر قوم ایک طرح کے متحدہ روحانی جوہر کی مالک ہوتی ہے۔

Herder یہ کہہ کر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اخلاقی یا جمالیاتی پسند کی کوئی آفاقی یا معروضی حیثیت نہیں۔ اگر انسان کی پہچان محض عقل کی صلاحیت ہی سے ہے تو قدریں ہر شخص کے اندر ہر وقت ایک جیسی نہیں رہتیں۔ جمالیاتی اعتبار سے دیکھیں تو خوبصورتی کے بارے میں ایک ہندوستانی اور جرمن میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن یہ اختلاف صحیح اور غلط کا نہیں ہے۔ ہر پسند دراصل ایک volksgeist کی نشاندہی کرتی ہے اوراس کی صحت کا دارومداراس یقین پر ہے کہ volksgeist کا اظہار پوری ایمانداری سے ہوا ہے۔ قدروں کا اظہار یا قدروں پر مشتمل فیصلے قوموں کی سطح سے بلند نہیں ہوتے۔

Herder یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ ایک قوم دوسری سے بہتر ہے۔ بس مقصود یہ بتانا تھا کہ وہ مختلف ہوتی ہیں اور ایک قوم کو دوسری قوموں کی قدروں سے نہیں جانچنا چاہئے۔ لیکن ایک مقابلتاً نوجوان فلسفی Johann Gottlieb Fichte نے Herder کے تصور کو ذرا آگے بڑھایا اوراس کی اہمیت کے محل کو ذرا تبدیل کیا۔ Fichte اس سے متفق تھا کہ انسانیت جدا جدا قوموں کا کنج نما ہے جس میں ہر قوم اپنی مشترک روح کے ذریعہ بندھی ہوئی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے خیال میں کچھ volks دوسروں پر واقعی فوقیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر جرمن لوگوں کے اندر پیدائشی طور پر آزادی کا تصور دوسروں کے مقابلہ زیادہ ہے۔ ان کی زبان میں فرانسیسی کے مقابلہ میں قوت اظہار زیادہ ہے۔ فرانسیسی ایک مردہ زبان ہے (ظاہر ہے کہ فرانس کے لوگ اس سے اختلاف کرتے)۔

Fichte کا ۱۸۱۴ء میں انتقال ہوگیا۔ گویا اس کے خیالات کے عروج کا زمانہ وہی ہے جب نپولین یورپ کو فتح کر رہا تھا اور جرمنوں پر غالب ہو رہا تھا۔ fichte کے موثر ہونے میں اِن حالات نے یقیناً اہم کردار ادا کیا ہوگا۔ بہت سے جرمن جو نپولین کے تحت زندگی گذار رہے تھے انہیں یہ خیالات بہت اچھے لگے ہونگے کہ جرمن اور فرنچ دو علیحدہ اور مختلف روحیں ہیں اور حالانکہ فرانسیسی اس وقت حکمراں ہیں لیکن جرمن ان سے بہتر ہیں۔

نپولین کے زوال کے کوئی پانچ دہے بعد اور ۱۸۷۰ء میں پروشیائی چانسلر اوٹو ون بسمارک (Ottovon Bismarck) نے چھوٹی چھوٹی جرمن ریاستوں کو متحد کر کے ایک واحد جرمن ریاست قائم کی۔ فرانس میں نپولین کا بڑا بھتیجہ جو اپنے مسخرہ پن کے لے جانا جاتا تھا یعنی نپولین سوئم جو نپولین کی صلاحیتوں کے اعتبار سے اس کا نصف اور شیخی خوری کے اعتبار سے دوگنا تھا، Bismarck نے اسے ایسے اکسایا کہ فرانس نے اس جرمن ریاست کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ نتیجہ کے طور پر بجلی کی سی تیزی سے بسمارک فرانس پر چھا گیا

اور ایک مہینہ کے اندر پیرس فتح کر لیا۔ تحقیر آمیز شرائط فرانس سے منظور کرائیں اور اس کے ساتھ ساتھ سرحد کے وہ دو صوبے جرمنی میں ملا لیے جو وسائل کے اعتبار سے بہت مضبوط تھے۔

جرمن قوم پرستی جو شکست اور ہتک کے احساس کے زیر سایہ پیدا ہوئی تھی اس فتح کے نتیجہ میں اسے اور غذا ملی۔ فاتحانہ احساس تفاخر نے جرمن قوم کے خیالی مستقبل کو گویا پر لگا دیئے۔ جرمن تصور volksgeist کو وہاں کے آرٹسٹ قدیم المانوی توہمات میں تلاش کرنے لگے۔ ویگنر (Wagner) نے جرمنوں کے قومی تفاخر کو عبارت آرائی اور لفاظی کے ذریعہ ناٹکوں میں پیش کیا اور مورخین نے ایک ایسا توہماتی بیانیہ تیار کیا جس میں جرمن نسل کی جڑیں قفقاز کے پہاڑوں کے قبائل میں بیان کی گئیں۔ جرمن قوم پرستی کے تصور کو جرمنی کے اعلیٰ تعلیم کے مقتدر ترین ادارے جمینزیم کے پروفیسروں میں بڑی قبولیت حاصل ہوئی۔ معروف فلسفیوں جیسے Treitschke Heinrich von نے تدریس کے دوران بتانا شروع کیا کہ قومیں دنیا کی معتبر ترین معاشرتی وجود ہیں اور انسانی زندگی کا اعلیٰ ترین اظہار ہیں۔ ایک ایسا رزمیہ جس میں اس تمنا کا اظہار تھا کہ جہاں جہاں جرمن زبان بولی جاتی ہے وہ تمام علاقے متحد ہو کر ایک جرمن قوم کی تشکیل کریں گے تیار ہوا۔ بڑی قوموں کے وحشی قوموں کے علاقوں پر اپنی مرضی غالب کرنے کو تقدیر کا جرأت مندانہ اظہار کہا گیا اور اس طرح استعماریت کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ان کے شاگرد اسی ولولے اور جوش سے سرشار تھے۔ بطور انجینئر، استاد اور اسی طرح دوسرے پیشوں سے وابستہ ہو کر وہ معاشرہ کا حصہ بنے اور اس پین جرمن قوم پرستی (Pan-German nationalism) کے وائرس نے جرمن عوام کو متاثر کیا۔

اسی دوران اٹلی میں ایک انقلابی جس کا نام جوزف مازنی Joseph Mazzini تھا قوم پرستی کو ایک سیاسی نظریہ کی حیثیت سے پیش کر رہا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد اٹلی کو بیرونی آسٹریائی حکمرانوں سے نجات دلانا تھا اور اس مقصد کے حصول میں لوگوں کو متحد کرنے اور رکھنے کو واحد ذریعہ سمجھتا تھا۔ سیاسی تجربات نے اسے باور کرایا تھا کہ افراد صرف متحد اکائیوں کی شکل میں ہی کام کر سکتے ہیں اور انھیں چاہیئے کہ اپنی ذاتی شخصیتوں کو قوم پر قربان کر دیں۔ ''میں نہ بولو بلکہ ہم کہو'' اس نے اپنے ملک کے انقلابیوں کو خطاب کرتے ہوئے ایک پمفلٹ ''انسانوں کی ذمہ داریاں'' تحریر کیا۔ ہر ایک کو چاہیے کہ وہ ملک کی تجسیم ہو جائے یعنی اپنے جسم میں ملک کو اتارے''[۱۳] مازنی نے قوم پرستی کی بنیاد پر اجتماعی حقوق کا دعویٰ کیا۔ ہر قوم کو ایک خطہ کا حق ہے، اپنے میں سے کچھ کو لیڈر تسلیم کرنے کا حق ہے۔ اپنی سرحدوں کی حفاظت کا حق ہے ان سرحدوں کی وہاں تک توسیع کا حق ہے جہاں اس کی قوم کے وابستگان پائے جاتے ہیں۔ اور اس خطہ میں مکمل آزادی اور مطلق العنانی کا حق ہے۔ اس نے کہا کہ صحیح اور مہذب طریقہ یہی ہے کہ ایک قوم کے لوگ ایک مستقل خطہ پر مشتمل ریاست میں رہیں تا کہ کسی کو اجنبیوں کے درمیان زندگی نہ گذارنی پڑے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں قوم پرستانہ تحریکوں نے پہلے جرمن اور پھر اٹلی کو متاثر کیا۔ اور پھر

یہ وائرس ان ممالک سے باہر مشرقی یورپ تک پہنچا جہاں مختلف الاصل قومیں الگ الگ زبانیں بولتی ہوئی اور مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والی اور اپنی ابتدا کے بارے میں مختلف قصّوں کو ساتھ لئے اپنے وجود کا اس طرح احساس دلاتی رہتی تھیں جیسے وہ دو خستہ حال سلطنتوں کا یعنی عثمانی سلطنت اور آسٹریائی ہنگریائی کا ثقیل حصہ ہوں۔ ان دونوں سلطنتوں نے ان قوم پرستوں کو اپنی ہی سرحدوں میں پوری طرح دبانے کی کوشش کی لیکن انہیں صرف اتنی کامیابی ملی کہ وہ خفیہ طریقہ سے کام کرنے لگے۔ یورپی کارٹون نگاروں نے ان کی کچھ ایسی تصویر پیش کی جیسے مضبوط اور ٹھوس داڑھی رکھے ہوئے مردوں کے ہاتھوں میں بم نما گیند اور اوپر سے اور کوٹ پہنے ہوئے دلچسپ تصور ضرور تھا۔ لیکن قوم پرستی کی جو حقیقی دہشت گرد تحریکیں یورپ میں ابھریں ان کی تصویر، اتنی دلچسپ نہ تھی۔۔ اصل میں یہاں سے قوم پرستی کی تحریک عالم اسلام میں پہنچی۔

یورپ سے فارغ ہونے سے پہلے دو اور قوم پرستانہ تحریکوں کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ جو اہم تھیں اور مغرب میں پروان چڑھی تھیں۔ ایک عثمانی سلطنت کو براہ راست متاثر کرنے والی تھی اور دوسری کی اہمیت بعد میں سامنے آنے والی تھی۔ یہ تحریک دراصل شمالی امریکہ میں تشکیل پائی جہاں ایک نیا ملک بننے جارہا تھا۔ یہ نیا ملک اس وقت وجود میں آیا جب تیرہ برطانوی نوآبادیات کے باشندوں کی کالونیوں نے اپنے سمندر پر گھر کی حکومت کے خلاف بغاوت کرادی اور آزاد ہونے کا عندیہ دیا۔ لیکن یہ متحدہ کنفیڈریشن ایک قومی ریاست کی شکل، سول وار (جو ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء تک چلی) کے بعد ہی حاصل کرسکی۔ اس جنگ سے پہلے ریاستہائے متحدہ کی اصطلاح انہی متحدر ریاستوں کے لیے بولی جاتی تھی۔ جنگ کے بعد یہ ریاستہائے متحدہ United state اس کا آفیشنل نام قرار دیا۔[۵] غلامی کے مسئلہ نے سول وار کو ہوا دی۔ صدر لنکن کی دلیل میں یونین کی بقا کو اہمیت حاصل تھی اور جنگ تھی بھی اسی لئے۔ صدر لنکن نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جنگ یہ امتحان لینے کی غرض سے لڑی گئی ہے کہ جو قوم تصور آزادی اور عوام کی حکومت، عوام کے ذریعہ اور عوام کے لئے، کے نعرہ سے تشکیل پائی ہے کیا وہ ایک قوم کی حیثیت سے باقی رہ سکتی ہے؟ صدر لنکن اور دوسرے سیاست دانوں، مورخین، فلسفی، مصنفین، مفکرین اور شہریوں نے جس طرح قومیت کے تصور کی نقشہ گری کی تھی وہ اس نظریاتی تصور سے مختلف تھی جس نے یورپ کو متاثر کیا تھا۔ ایک مشترک مذہب، تاریخ، روایتوں، رسومات، نسل یا نسلی تشخص کے بجائے انہوں نے کہا کہ محض افراد کا مجموعہ اور ان کی کثرت بھی مشترکہ اصولوں اور عمل کے ساتھ مشترکہ وفاداری کے ذریعہ ''ایک عوام'' بن سکتے ہیں۔ یہ قوم پرستی بعض نظریات کی بنا پر تھی جنھیں کوئی بھی اختیار کرسکتا تھا چونکہ نظری اعتبار سے کوئی بھی اس کا ممبر بن سکتا تھا یعنی اس کے ممبر ہونے کے لیے یہ ضروری تھا کہ کوئی وہاں پیدا ہوا ہو۔

ایک نومولود ملک نے اس سول وار کی بدولت یہ اعلان کردیا کہ قوت دراصل کہاں پنہاں ہوتی ہے۔ امریکی سول وار ایسی پہلی جنگ تھی جس میں محض ایک شخص نے محض ایک نکتہ پر لاکھوں افراد پر مشتمل فوج کو کمانڈ کیا۔ پہلی جنگ جس میں کوئی ڈھائی لاکھ فوجی ایک ہی میدان میں لڑے، پہلی جنگ جس میں صنعتی ٹکنالوجی

جیسے ریل روڈ، پن ڈبی، پروڈوشین گنوں نے فیصلہ کن رول ادا کیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس جنگ میں متحدہ ریاستیں ایک دوسرے کے خلاف جنگ کر رہی تھیں اور کسی اور کے لئے فوجی خطرہ کا باعث نہ تھیں لیکن کوئی سوچ سکتا تھا کہ اگر یہ مل جائیں گی تو کتنی زبردست فوجی قوت کی مالک ہوں گی؟

دوسری طرف یورپی قوم پرست تحریک جو عالمی تاریخ پر مرتب ہونے والے نتائج کی حامل تھی اور اس وقت مسلمانوں کے لئے بڑی اہم تھی وہ صیہونیت تھی۔ یہ تحریک اپنی دلیل اور اپیل کے اعتبار سے تو ویسی ہی قوم پرست تحریکوں کی طرح تھی جو جذبات اور تصورات کے آمیزے سے انیسویں صدی کے یورپ میں ابھری تھیں۔ Herder کے اس نقطۂ نظر سے کہ قوم زبان، تاریخ، اور کلچر کی یکسانیت سے تشکیل پاتی ہے اس تحریک کو اتفاق تھا۔ اسے مازنی کا یہ خیال بھی اچھا لگا تھا کہ قوم کو خود حکمرانی کا حق ہے اور اس مقصد کے لیے ایک خطہ زمین اس کے لئے ضروری ہے۔ Treitschke کے اصول کو بھی اس تحریک نے اپنایا کہ کسی قوم کو نہ صرف یہ حق حاصل ہے بلکہ یہ اس کی تقدیر کا حصہ ہے کہ اپنی قوم کے تمام لوگوں کو اس خطۂ زمین میں آباد کرے جو ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہوں اور اس کے لئے اگر ضرورت پڑے تو دوسروں کو اپنے علاقے سے نکال بھی دے۔ سیاسی صیہونیت کے بانی نے کہا کہ اگر جرمن ایک قوم ہیں، اگر اطالوی لوگ ایک قوم ہیں اور اگر فرانسیسی ایک قوم ہیں تو خدا کی قسم یہودی بھی ایک قوم ہیں اور انہیں بھی وہی حقوق ملنے چاہییں جو ان قوموں کو ملے ہیں۔

لیکن انیسویں صدی کی قوم پرست تحریکوں اور صیہونیت میں ایک بنیادی فرق تھا جرمن، اطالوی، اور سربیائی اور دوسروں نے قوم پرستانہ حقوق کا دعویٰ ان زمینوں پر کیا تھا جن میں یہ آباد تھے۔ جب کہ یہودیوں کے پاس کوئی خطۂ ارض نہیں تھا۔ یہ لوگ گذشتہ دو ہزار سال سے بے زمین اقلیت کی طرح دوسری اقوام کی ریاستوں میں رہ رہے تھے۔ لیکن ایک دو ہزار سالہ بے وطنی کی زندگی میں یہودی آپس میں مربوط رہے تھے اور یہودیت کے تحت ایک حساس تشخص کو برقرار رکھا تھا جس میں مذہب کو جتنا دخل تھا اتنا ہی کلچر اور تاریخ کو بھی تھا۔ انیسویں صدی کے یورپ میں یہ بالکل ممکن تھا کہ ایک شخص چاہے عامل نہ ہو اور نہ ہی اس کی بنیادوں پر اسے ایمان ہو لیکن وہ یہودی رہ سکتا تھا۔ یہودیوں کے مذہبی و تاریخی بیانیہ کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ ''خدا نے یہ وعدہ کیا ہے کہ کنعان کا خطہّ (Hebrews) ابراہیم اور ان کے قبیلے کی خلف کو ملے گا۔ خدا کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کرنے اور اس کے احکام کی پابندی کرنے کے انعام کے بطور اس بیانیہ کے تحت یہودیوں نے اس انعام کو زندہ رکھتے ہوئے اس موعود خطۂ ارض جس پر عرب آباد تھے اپنے استحقاق کا اظہار کیا۔ یہ خطہ اس وقت عثمانی ترکوں کی حکومت کا حصہ تھا۔ انیسویں صدی میں بہت سے یورپی صیہونی سیکولر تھے لیکن اس موعود خط ارض کا حصول بحر روم کے مشرقی ساحل پر یہودی ریاست کی ایک بنیادی دلیل بن گیا۔

۱۸۹۷ء میں ایک آسٹریائی جرنلسٹ تھیوڈور ہرزل نے سیاسی صیہونیت کا پہلا سیاسی آرگن عالمی صیہونی کانگریس قائم کی تھی۔ لیکن صیہونیت پہلے ہی سے موجود تھی اور اس کے تصورات ابتدائی ۱۸۰۰ میں جڑیں

پکڑنے لگے تھے۔ اس زمانہ کے یورپ میں قوم پرستی کے تعین سے جو مختلف طرح کی باتیں سامنے آتی رہتیں تھیں یہودی دانشوروں کی یہ آواز بھی تھی کہ ہمیں فلسطین جا کر بسنا چاہیے اور ضروری نہیں ہے کہ دوستانہ انداز میں ہی ہو۔ مثلاً Fichte کا خیال تھا کہ یہودی کبھی بھی جرمن ثقافت میں شامل نہیں ہو سکتے چاہے وہ پیدائش سے ہی جرمن زبان کیوں نہ بولتے ہوں۔ اگر وہ جرمنی میں رہیں گے تو وہ ریاست میں ایک ریاست کی مانند ہوں گے۔ چنانچہ اس نے مشورہ دیا تھا کہ یہودیوں کو چاہیے کہ ''اپنی تقدیر فلسطین میں تلاش کریں''۔

لیکن فلسطین میں ہمیشہ سے مقامی یہودی آباد رہے تھے۔ البتہ ۱۸۰۰ء میں وہ آبادی کا بہت تھوڑا سا حصہ تھے یعنی عربوں کی ۹۷٪ کے مقابلہ میں محض ۲ء۵٪ فیصد۔ لیکن ۱۸۸۰ء میں ہی جب یورپی یہودی فلسطین میں آنا شروع ہوئے تو ان کی آبادی بڑھ کر ۶٪ ہوگئی ہجرت کی پہلی لہر میں جسے یہودی پہلی Aliyah کہتے ہیں کوئی تیس ہزار یہودی فلسطین میں آ کر بسے اور آبادی کی نسبت پھر تبدیل ہوئی پہلے مہاجرین دراصل اصولی قسم کے شہری دانشور تھے جو محض تحریکی جوش میں آ کر بس رہے تھے انہوں نے خود کو کسان تصور کیا تھا۔ گو کہ وہ اس فن کی بنیادوں سے بھی واقف نہ تھے۔ مسائل سے دوچار ہوئے تو ان مہاجرین کی اکثریت یورپ واپس لوٹ گئی اور اس طرح پہلا aliyah ناکام ہوگیا۔ یہ صورتحال تھی کہ جب پہلی جنگ عظیم برپا ہوئی تھی۔

یہ تینوں یورپی تحریکات یعنی دستور پسندی، قوم پرستی اور صنعتکاری جب آہستہ آہستہ عثمانی سلطنت تک پہنچی تو وہاں ان کے اثرات تباہ کن تھے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انیسویں صدی کے دوران عثمانی دنیا سکڑنے لگی تھی جس کے نتیجہ میں پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ الجیریا فرانس کا حصہ بن چکا تھا۔ برطانیہ عظمیٰ مصر کو تقریباً لے چکا تھا۔ ویسے تو بحر روم میں مصر کے شمال کا ساحلی علاقہ عثمانیوں کا تھا جیسے جزیرہ نمائے عرب اور عراق عثمانی علاقے تھے لیکن یہاں بھی عثمانی یورپیوں کے سامنے جھکتے جا رہے تھے۔ اس دوران یورپی علاقوں پر کنٹرول بھی کمزور ہو چلا تھا۔ یہ قدیم سلطنت جو ابھی کچھ عرصہ قبل دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی اب ایک ایسی دیوہیکل مخلوق کی مانند ہوگئی تھی جس کے کنارے جھڑ گئے ہوں اور صرف جسم بچا رہ گیا ہو، لیکن سانس لے رہی تھی اور زندہ تھی۔

یہ زندہ تھی لیکن مغرب کی تجارتی قومیں جنہیں ان کی حکومتوں کا بھرپور تعاون حاصل تھا یہاں پوری آزادی کے ساتھ کام کر رہی تھیں۔ انیسویں صدی کے نصف اول کے دوران عثمانیوں سے ان کے تعلقات کو ایک لفظ Capitulation یعنی دباؤ تسلیم کرنے یا ماننے کے فعل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس لفظ کو باعث خفت کے حوالے سے بھی سمجھا جا سکتا ہے لیکن پہلے پہل اس کے یہ معنی لینا صحیح نہ ہوگا۔

یہ سلسلہ اس وقت شروع ہوا تھا جب سلطنت اپنے عروج پر تھی اور اس وقت Capitulation اس تناظر میں تھا کہ عظیم سلطنت نے یورپ کے چھوٹے چھوٹے اور بے توقیر تاجروں کو جنھوں نے حکومت سے تجارت کرنے کی درخواست کی تھی چند مراعات دے دی تھیں ان کے مطابق اشیائے تجارت کی فہرست میں جن

کے نام نہیں تھے ان کی تجارت نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس صورتحال کو Capitulation کس بنیاد پر کہا جائے؟ لاطینی زبان میں اس کے معنی فہرست بنانے کے ہیں۔ چنانچہ Capitulation تجارتی سرگرمیوں کی وہ فہرست تھی جس کی اجازت یورپی لوگوں کو دی گئی تھی۔

اس دوران جو جنگیں ہوئی تھی ان میں کوئی بھی ایسی نہ تھی جس نے طاقت کے توازن کو بگاڑ دیا ہو اور جس کے نتیجہ میں Capitulation کے معنی ''عظیم عثمانی آقاؤں کی طرف سے جذبہ ترحم کے ساتھ اجازت ناموں کی عطاء'' سے بدل کر ''شرمناک رعایتیں جو فاتحانہ انداز میں عثمانی افسروں کو مجبور کر کے حاصل کی گئیں''۔ ہو گئے ہوں۔ البتہ ۱۸۳۸ء میں صورتحال بدل چکی تھی اور اس وقت Capitualtion کے معنی بدل گئے تھے۔ عثمانیوں نے یورپیوں کے ساتھ معاہدہ Balta Limon پر جب دستخط کئے تو یورپی حکمرانوں کے کنسورٹیم نے محمد علی کے خلاف مدد کا وعدہ اسی شرط پر کیا کہ یورپ سے جو چیزیں عثمانی سلطنت میں آئیں گی ان پر محصول کم لگے گا لیکن سلطنت سے جو چیزیں یورپ جائیں گی ان پر زیادہ محصول لگایا جائیگا۔ معاہدہ میں یہ بھی شامل تھا کہ عثمانی تاجر اجارہ داری قائم نہیں کریں گے جبکہ یورپیوں کو سلطنت میں یہ حق حاصل ہوگا۔ ان Capitulations کا مقصد ایک ہی تھا کہ عثمانی اپنی زمین پر بھی یورپی تاجروں کے ساتھ مقابلہ آرائی نہ کر سکیں۔

Balta Limas میں معاہدے کے چند دنوں بعد ہی عثمانی حکومت نے اپنے کمزور ہوتے ہوئے بازوؤں کو اور حرکت دی اور کچھ قوانین منظور کئے تا کہ عثمانی سوسائٹی کی دوبارہ تعمیر کی جاسکے اور وہ یورپیوں کا مقابلہ کر سکے۔ بالکل اسی طرح کے اقدامات اس وقت ایران میں بھی کئے جارہے تھے۔ عثمانی سلطنت میں اس طرح کے اقدامات کو تنظیمات یعنی تنظیم نو کے لئے اقدامات کہا گیا۔ ان کا آغاز ۱۸۳۹ء کے ایک اعلان سے کیا جسے بہت ہی شاندار ٹائٹل دیا گیا تھا ''ایوان شاہ گل سے فرمان عالی شان''۔ ۱۸۵۶ء میں دوسری دستاویز ''فرمان شاہی'' جاری کی گئی اور پھر ۱۸۶۰ میں تیسری دستاویز برائے اصلاح جاری کیگئی۔

انہیں دیکھا جائے تو تنظیمات کے تحت درج ذیل اصلاحات کی گئیں۔

☆ فرانسیسی طرز پر ایک نئی سرکاری مشینری کا قیام
☆ شرعی عدالتوں پر سیکولر عدالتوں کو فوقیت
☆ فرانس کے نپولین حکمنامہ کی بنیاد پر فوجداری عدالت کے ضابطے
☆ نئے تجارتی قوانین جو آزاد تجارت کو فروغ دیں۔ جن کے نتیجہ میں یورپیوں کو وہ آزادی حاصل ہوگئی کہ وہ عثمانی سلطنت میں آزادانہ اصول طے کریں
☆ جبری بھرتیوں پر مبنی Prussian نظام کے تحت فوج کا قیام جس نے دیوشری نظام کو ختم کر دیا
☆ نسل اور مذہب کی تفریق کے بغیر عثمانی رعایا کی عزت زندگی اور جائداد کی ضمانت
☆ برطانوی طرز اور انھیں کے نصاب کے تحت عوامی سیکولر اسکول قائم کئے اور روایتی اسکول جسے علماء

چلاتے تھے انہیں تبدیل کر دیا گیا۔

☆ ٹیکس حاصل کرنے کی حکومتی نگرانی میں ایک ایجنسی کا قیام جس نے روایتی ٹیکس فارمرز کو ختم کر دیا جو ایک کمیشن کی بنیاد پر ٹیکس حاصل کرتے اور حکومت کو جمع کر دیتے تھے۔

بظاہر یہ اصلاحات اچھی نظر آتی ہیں اور خاص طور پر جان و مال اور عزت و آبرو کی ضمانت۔ اِن ضمانتوں کا حامی کون ہو سکتا تھا؟ لیکن یہ اعلان واضح رہے کہ صرف یورپیوں کے لئے تھا۔

انیسویں صدی کے ترک مسلمان شہری کی جگہ ذرا خود کو دیکھیں تو محسوس ہو جائے گا کہ ان اصلاحات میں جو داخلی خوبی ہے اسے اس حقیقت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ یورپیوں کی طرف سے عثمانی افسروں کو ہدایت دی گئی تھیں۔ حقیقتاً ایسا ہی ہوا تھا۔ ایک مورخ Jams L. Gelvin کے مطابق شاہی فرمان دراصل برطانوی سفیر Stratford Canning نے عثمانی افسروں کو املا کرا دیا تھا اس ہدایت کے ساتھ کہ اس کا ترجمہ کرا دیا جائے اور عوام میں اس کی تشہیر کر دی جائے۔[6] ایوان شاہ گل سے فرمان عالی شان! بہت سے عثمانی مسلمانوں کے نزدیک یہ اصلاحات نہیں بلکہ اس بات کا ثبوت تھیں کہ ان کی زندگیوں پر کوئی اجنبی طاقت حاوی ہوتی جا رہی ہے۔

لیکن تمام عثمانی مسلمانوں نے ایسا محسوس نہیں کیا۔ ایشیا مائنر میں مصلحین کی بڑھتی ہوئی تحریکات، ہندوستان، افغانستان اور ایران میں ترکی کی طرز کی تحریکوں نے تنظیمات کو قبول کیا۔ ان کے خیال میں یورپیوں کو شکست دینے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ انہیں ان ہی کے میدان میں شکست دی جائے جس کے لئے یہ ضروری تھا کہ یورپ کی طاقت ور دنیا میں جو تصورات کارفرما ہیں انہیں اپنایا جائے۔

لیکن علماء اس میں حائل تھے، تنظیمات ان کے مفادات سے ٹکراتی تھیں۔ تعلیم کا علماء کے ہاتھ سے نکل جانا شرعی عدالتوں کی جگہ سیکولر عدالتوں کا قیام، اسلامی قانون کی جگہ فرانسیسی قانون کا نفاذ۔ ان اصلاحات نے نہ صرف یہ کہ علماء کے ہاتھ سے تمام اختیارات چھین لئے بلکہ یہ سوال بھی کھڑا کر دیا کہ اب آخر علماء کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ان کی طرف سے مزاحمت تو ہونا ہی چاہیے تھی لیکن عوام میں اب بھی ان کی اخلاقی بالادستی قائم تھی اور عدالتوں میں وہ اب بھی موثر تھے۔

بہت جلد سلطان اور اس کے مشیروں نے محسوس کیا کہ وہ سیکولر جدیدیوں کے شور وغل اور اسلام کے پرانے حامیوں کی دہائیوں کے درمیان پھنس گئے ہیں" دونوں کی تگ ودو کے درمیان کورٹ کبھی اِدھر جھکتی اور کبھی اُدھر۔ یورپی سیکولر جدید ذہن کے لوگ یورپی طرز کی اصلاحات کے لئے اب زیادہ کرختگی سے دلیل دینے لگے تو دوسری طرف روایتی گروہ اور زیادہ تندی اور ضد کے ساتھ ردعمل کا اظہار کرتے۔ جب سیکولر لوگ فیکٹریوں اور مشینوں کے استعمال کی وکالت کرتے تو علماء کا ردعمل یہ ہوتا کہ عثمانی افراد ٹائپ رائٹر کا استعمال کرتے ہیں، رسول اللہؐ نے تو انہیں استعمال نہیں کیا تھا۔

سیکولر لوگ کچھ وقت غالب رہے۔ ۱۸۷۶ء میں انہوں نے سلطان کو دستور نافذ کرنے کے لئے مجبور کر دیا جسے مشرق کا انقلاب فرانس کہا گیا۔ چند سال تک روز افزوں کمزور ہوتی ہوئی سلطنت عثمانیہ ایک دستوری بادشاہت کی طرح چلتی رہی۔ اس مختصر دور میں جدید طرز پر ملک کو لانے کے لیے تمام ہم خیال لوگ جن میں ترک مسلمان، عرب مسلمان، یہودی، راسخ العقیدہ عیسائی اور آرمینیا کے لوگ جو مختلف نسلوں اور مذاہب سے متعلق تھے ساتھ ملکر جوش وخروش کے ساتھ ایک نئی دنیا کی تعمیر کے لیے کام کرتے رہے۔

لیکن پرانے لوگوں نے پلٹا کھایا، جدید طرز فکر کے لوگوں کو مات دے کر سلطان ایک بار پھر مطلق العنان ہو چکا تھا۔ پینڈولم پھر نیچے کی طرف گھوم گیا کیونکہ اصلاحات کام نہیں کر پا رہی تھیں۔ ایشیا مائنر کے ترک مسلمانوں نے دیکھا کہ ان کا معیار گر رہا ہے۔ ان کی آزادی سکڑ رہی ہے۔ اب وہ بیرونی طاقتوں کے مقابلے میں جن کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا زیادہ مجبور نظر آ رہے تھے۔

لیکن ان کے پاس اس بیرونی دنیا کا ایک اپنا حصہ خود ان کی اپنی سرحدوں میں موجود تھا یعنی آرمینین کمیونٹی۔ حقیقت یہ ہے کہ آرمینین ترکوں سے زیادہ یورپی نہیں تھے۔ وہ نامعلوم وقت سے یہاں رہتے چلے آئے تھے اور آج بھی وہیں رہتے تھے۔ ان کی اپنی غیر یورپی زبان تھی، روایات تھیں اور تاریخ تھی۔ وہ کہیں دور سے نہیں آئے تھے بلکہ ترکوں کے مقابلہ میں زیادہ مقامی تھے۔

لیکن وہ عیسائی تھے اور ہر طرف سے مسلمانوں سے گھرے ہوئے تھے اور مزید یہ کہ اس زمانہ میں جب کہ شرمناک شرائط پر مغرب کے تجارتی مفادات کے لئے جنگ جیت جانے کی بنا پر یورپ کے لوگوں کو سلطنت کے اندر داخل ہونے کی قوت حاصل ہو چکی تھی اور مقامی لوگوں کے مفادات کے خلاف یورپیوں کو منافع کمانے کے مواقع مل رہے تھے آرمینیا کے لوگ خود کو بڑی کشمکش میں پا رہے تھے۔ عثمانی لوگوں کو ترقی کا ایک راستہ تھا کہ وہ یورپیوں کے لئے کام کریں، ان سے مل کر تجارت کریں یا ان کے ساتھ حصہ داری کریں۔ لیکن جب یورپی لوگوں نے اس طرح کے تجارتی امکانات میں حصہ داری کے بارے میں سوچا تو انھوں نے مسلم ترکوں کے بجائے آرمینیائی عیسائیوں کو ترجیح دی۔ اور اس طرح بیرونی لوگوں نے حکومت سے تجارتی معاملات طے کرتے ہوئے جو مفادات حاصل کئے تھے وہ اب مقامی لوگوں میں ترکوں کے بجائے آرمینیائی نسل کو پہنچنے لگے۔ یہ سوچ کم از کم ان مسلمانوں میں پائی جاتی تھی جو غربت کی طرف پھسلتے جانے کی وجہ سے آزردہ خاطر تھے۔

اس وقت آرمینی سلطنت عثمانیہ میں پرسکون زندگی گذار رہے تھے۔ لیکن غیر ترک ہونے کی بناء پر انہیں حکمراں اشرافیہ اور ملٹری میں کوئی مقام نہیں مل سکتا تھا۔ اسی بنا پر بڑی زمینوں کی ملکیت اور ٹیکس دہندہ زراعت جیسی مراعات بھی انہیں حاصل نہ تھیں۔ اس لئے بہت سے آرمینائی عام تجارت اور سرمایہ کی تجارت میں اپنی پوزیشن مستحکم کر چکے تھے۔

سرمایہ کی تجارت یعنی سرمایہ قرض دینا۔ یہ تجارت ایک عرصہ سے اچھی نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھی،

اور قرضوں پر سود حاصل کرنے کو سختی سے قرآن نے بہت واضح انداز میں منع کیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے قرون وسطیٰ کے مسیحی یورپ میں Usury کا مطلب مذہبی قانون کے مطابق بہت زیادہ وصول کرنا ہی نہیں بلکہ ہر طرح سے زیادہ وصول کرنا سود تھا۔ ایک سوال یہ ہے کہ سرمایہ کی تجارت کے خلاف فضا کیوں خراب تھی؟ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ عام آدمی قرض دینے کو ایک کارِ خیر سمجھتا تھا۔ یہ کوئی تجارت نہ تھی۔ قرض کوئی اس وقت دیتا تھا جب اس کا پڑوسی پریشانی میں مبتلا ہو اور اسے قرض کی ضرورت ہو۔ اس پس منظر میں دیکھیں تو سود لینا کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا اور اس کا استحصال کرنا ہے۔ لیکن قرض کی ضرورت اکثر و بیشتر ہوتی ہے اور ابتدائی دور کی جاگیردارانہ معیشت میں بھی لیا جاتا تھا۔ لیکن یہ اس وقت ہی ہوتا تھا جب کوئی مصیبت آتی تھی جیسے کسی لوہار کی دکان میں آگ لگ گئی اور اس کا سارا سامان جل کر راکھ ہو گیا۔ کسی مشہور عالم کا انتقال ہو گیا اور اس کے خاندان کے پاس اس کی تجہیز و تکفین کے لئے پیسہ نہیں ہے۔ کوئی شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس ضروری رقم جمع نہیں ہو سکی۔ کوئی بہت بری طرح بیمار ہو گیا۔ لوگ اس وقت ہی ساہوکار کا رخ کرتے تھے جب بڑی شدید ضرورت میں ہوتے۔ اور اس وقت بھی ان کو یہ توقع ہوتی تھی کہ کوئی نیک اور شریف آدمی انہیں بغیر سود قرض کی رقم فراہم کر دے گا۔ جس انتہائی ضرورت میں وہ قرض لیتے وہ قرض دینے والے کی شرائط کو منظور کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے اور اس کے نتیجہ میں خفگی اور آزردگی میں اضافہ ہی ہوتا۔ اور اگر قرض لینے اور قرض دینے والا ایک ہی کمیونٹی کے ہوتے یا رشتہ داری اور وفاداری وغیرہ کا تعلق ہوتا تو یہ اس ناراضگی میں اضافہ کا باعث ہوتے۔ لیکن قرض لینے کے لئے لوگ اس کے پاس ہی جاتے ہیں جو غیر ہوتے ہیں ورنہ پہلے سے موجود دشمنی میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور سب سے خراب صورت حال وہ ہوتی ہے جب قرض دینا ایک خاص گروہ یا کمیونٹی کا کاروبار بن جاتا اور وہ کمیونٹی اس سے پہچانی جاتی۔ یورپ میں یہ مقام یہودیوں کو حاصل تھا اور سلطنت عثمانیہ میں آرمینیائی اس سے پہچانے گئے۔

اس صورت حال میں جب ایک بار تعلقات تناؤ کا شکار ہوتے تو بتدریج یہ بھولنا بہت مشکل نہ تھا کہ ترک اور آرمینیائی صدیوں سے ایک ساتھ پرامن طور پر رہ رہے تھے۔ محض تین نسلیں قبل ان دونوں قوموں میں دشمنی پرانے زمانے کی چیز رہی تھی۔ عثمانیوں کا یہ اصول کہ مختلف گروہ الگ الگ علاقوں میں خود اپنی انتظامیہ میں رہیں، کا مطلب یہی تھا کہ ہر ایک کو ثقافتی آزادی حاصل رہے۔ اس میں برداشت کا اظہار تھا۔ اس کے نتیجہ میں ہم آہنگی پیدا ہوئی تھی۔ لیکن اب یہی پالیسی ایک کمی بن گئی۔ کیونکہ اس کے نتیجہ میں قومیں علیحدہ علیحدہ ہوئیں اور بدقسمت آرمینیائی آسانی سے پہچانے جانے لگے اور ان پر توجہ آسانی سے مرکوز ہو جاتی۔ اس طرح ملت سسٹم یعنی مختلف قوموں کی آزادانہ حیثیت پہلے سے موجود اختلافات میں اضافہ کا ذریعہ بن گیا۔

۱۸۹۴ء اور ۱۸۹۶ء کے درمیان اناطولیہ میں آرمینیا مخالف فسادات پھوٹ پڑے۔ ترک دیہاتیوں نے آرمینیوں کا قتل عام کرنا شروع کر دیا بالکل ایسے ہی جس طرح مشرقی یورپ اور روس میں یہودیوں کا قتل عام

ہوا۔ اور قتل عام کا یہ پاگل پن جب کم ہو گیا تو معلوم ہوا کہ کوئی تیس لاکھ آرمینیائی مارے جا چکے ہیں اور یہ پاگل پن ویسے ہی کم نہیں ہوا بلکہ اس وقت کم ہوا جب یورپ نے سلطنت عثمانیہ پر دباوڈالا کہ وہ کچھ کرے اور کیونکہ یورپی طاقتوں کا دباؤ ڈالنا ترکوں کے غصہ کی ایک وجہ تھی چنانچہ اس دباؤ نے غصہ کے نفسیاتی وجود میں اضافہ ہی کیا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا کہ ایک بچہ کو پڑوس کی زیادتی سے بچانے کیلئے والدین درمیان میں آجائیں اور جب آپسی لڑائی رک جائے تو والدین پھر اپنے کام میں لگ جائیں اور بچے کو تنہا دیکھ کر پڑوس کے شرارتی اس پر پھر غصہ نکالنے لگیں۔

اس دوران سلطان نے کیونکہ دستور منسوخ کر دیا تھا، طاقت دونوں گروہوں یعنی پرانے محافظین اور نئے چیناوں میں ہی منقسم رہی۔ سیاسی جدوجہد چلتی رہی اور توازن بے رحمی سے لوگوں کی طرف جھکتا گیا کیونکہ یہاں بھی ایران کی طرح رجحان جدیدیوں کی طرف تھا۔ ۱۹۰۰ء آتے آتے ایک پوری نسل ایسی آچکی تھی جو دستور کے دوبارہ نفاذ کے لئے دباؤ ڈال رہی تھی اور چاہتی تھی کہ ان کا اپنا انقلاب فرانس واپس آجائے۔

سیاسی اعتبار سے فرحت بخش ہونے کے باوجود یہ وقت خاصے تذبذب اور انتشار کا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ ایک تحریک کو چلانے والے قوم پرست تھے دوسرے سیکولر جدیدیت والے تھے، اور لاکھوں آزاد دستور پسند تھے۔ اصل میں متعدد نظریات اور تحریکیں آپس میں مل گئی تھیں اور مربوط بھی ہو رہی تھیں۔ اتنا وقت انہیں نہیں مل پایا تھا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ کون سے نظریات ایک ساتھ چل سکتے ہیں اور کون سے بالکل نا قابل تعاون ہیں۔ وہ تمام جو پرانے محافظوں کے خلاف تھے خود کو دولت عثمانیہ کا ایسا شہری سمجھتے تھے جن کا متحدہ مملکت کی تعمیر و تشکیل میں برابر کا حصّہ ہو۔ نوجوانوں کی طرح یہ سب اس لئے ساتھ ہو گئے تھے کہ ملک کے رہنماؤں کو کچھ نظر نہ آرہا تھا اور یوں بھی کہ یہ سب بڑی شدت سے جدیدیوں کو چاہتے تھے۔ جدیدیے چاہے کسی بھی طرح کے ہوں۔

سرگرم کارکنوں کی اس نئی نسل نے خود کو ینگ ٹرکس کہلوانا شروع کیا۔ اس نام کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ واقعی نوجوان تھے۔ زیادہ تر کی عمریں بیس سال کے قریب تھیں۔ مسلم معاشرہ میں معمر بزرگوں کو احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ بوڑھے آدمی قابل احترام ہیں۔ چنانچہ پرانے سسٹم کے حامیوں کو پرانا بزرگ کہہ کر یہ نوجوان خود کو ان سے ممتاز کرنا چاہتے تھے۔ گو کہ ینگ ترکوں میں خاصے اختلافات تھے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو متحد رکھا تا آنکہ وہ آخری خلیفہ پر حاوی ہو گئے۔ خلیفہ عبدالحمید ثانی کوئی ذی عقل آدمی نہ تھا ۱۹۰۸ء میں اسے مجبور کر دیا گیا کہ وہ دستور کو نافذ کرے اور پرانے خلیفہ کی حیثیت میں رہے۔

سلطان کو زیر کیا ہی تھا کہ جلد ہی انہیں اندازہ ہوا کہ وہ ایک نہیں بلکہ متعدد تھے۔ مثلاً ایک گروپ پوری سلطنت کے مرکزی اقتدار کو کم کرنا چاہتا تھا اقلیتوں کے حقوق کو یقینی بنانا چاہتا تھا اور حکومت میں عوام کو زیادہ نمائندگی کے حق میں تھا۔ ان لوگوں کو حکومت سے بہت جلد نکال دیا گیا۔ دوسرے گروہ نے ترک قوم پرستی کو اپنا لیا۔ ۱۹۰۲ میں چھ میڈیکل کے طالبعلموں کے ذریعہ قائم یہ گروہ منظّم گروہ کی طرح متحد ہوا اور اس نے ایک عسکری

پارٹی کی حیثیت اختیار کرلی جسے Comittee for Union and Progress یعنی CUP کہا گیا۔
CUP کے خیالات کو عوام میں مقبولیت حاصل ہوتی گئی۔ بادشاہت کے مخالف بہت سے ترک، بہت سے Young Turks، تعلیم وسول انتظامیہ کے لوگ، یونیورسٹی کے طلباء و دانشور اور بہت سے ادیب جنہوں نے یورپ میں قوم پرستی کے سلسلہ میں ہونے والے مباحثوں میں وہاں کے فلسفیوں کے خیالات کو پڑھا تھا اور جرمن واطالوی قوم پرستوں کی جدوجہد سے واقف تھے انہوں نے قوم پرستی کو بادشاہت سے نجات حاصل کرنے کا اپنا راستہ مان لیا۔ اس گرانبار، پرانے طرز کی کثیر ثقافتی سلطنت کے عثمانی تصور سے چھٹکارا حاصل کرو اور اس کی جگہ ذرا ایک لاغر اور صاف ستھری، دوسرے درجے کی ہی سہی لیکن خاص طور پر ایک ترکی ریاستی مملکت قائم کرو۔ یہ ان کا تصور تھا۔ عرب صوبے کیونکہ اس میں فٹ نہیں ہوتے تو انہیں کاٹ دیا جائے۔ لیکن ان نئے ترک قوم پرستوں نے یہ خواب ضرور دیکھا کہ اناطولیا کو وسط ایشیا کے ان علاقوں سے منسلک کر دیا جائے جو ماضی میں ترکوں کے آباؤاجداد کا وطن تھے۔ انہوں نے ایک ایسی ترک ریاست کا خواب دیکھا جو باسفورس سے قزاقستان تک وسعت پذیر تھی

ترک قوم پرست دانشور دلیل دینے لگے کہ عیسائی اقلیتیں بالخصوص آرمینیائی ترکی میں اشرافیہ کی مانند زندگی گذارتے رہے اور اندرون خانہ روسیوں، مغربی یورپیوں اور مشرقی یورپی ممالک سے مل کر ریاست کے ساتھ دشمنی کا رویہ اختیار کرتے رہے تھے۔

ترک قوم پرستوں کی اس نئی نسل کے مطابق قوم بقیہ ہر تشخص پر حاوی ہے۔ ان کے خیال میں قومی روح کسی ایک عظیم اور شان دار شخصیت کے سپرد کی جاسکتی ہے۔ یہ تصور براہ راست جرمن فلسفیوں سے مستعار تھا۔ ایک مصنف ضیا گوکپ نے لکھا کہ ہیروز اور نابغہ روزگار افراد ہی کی قیمت ہے اور انفرادی طور پر عام لوگ کسی قدر و قیمت کے حامل نہیں۔ اس نے اپنے ترک ساتھیوں سے کہا کہ کبھی حقوق کی بات نہ کریں۔ حقوق نہیں بلکہ اصل چیز ذمہ داریاں ہیں۔ ذمہ داری یہ کہ قوم کی آواز کو سنیں اور مطالبات پورے کریں۔[ے]

قوم پرستی کا یہ انداز جس میں شدت اور عسکریت کی بو آتی تھی کچھ مسحور کن ضرور تھا لیکن طلاطم خیز بھی تھا۔ اور یہ طلاطم ظاہر ہونے لگا تھا۔ اور کافی عرصہ سے ظاہر ہوتا رہا تھا۔ بلغاریہ آزاد ہوا۔ بوسنیا ہرزی گووینا نے عثمانی سلطنت سے علیحدگی اختیار کی تو اسے Habsurgs (بادشاہ کا نام) نے آسٹریا ہنگری کی سلطنت میں شامل کرلیا۔ ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں کوئی دس لاکھ مسلمان بے گھر ہوئے اور اناطولیہ میں نئے گھروں کے متلاشی ہوئے۔ یہ علاقہ خود بھی ایک بڑی آبادی کا علاقہ تھا۔ سلطنت ختم ہو رہی تھی اور نظام ٹوٹ رہا تھا۔ پھر عثمانیوں نے Crete بھی کھو دیا جس کی کوئی آدھی آبادی مسلمان تھی اور تقریباً سبھی ہجرت پر مجبور تھے۔ اس معاشرتی خلل نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جس میں ذہنی کشمکش و انتشار مزید تیزی سے سرایت کرنے لگا۔

قوم پرستی کے اس شور وغوغا نے دوسرے گروہوں میں بھی حرارت پیدا کر دی۔ چنانچہ عربی قوم پرستی

بھی اپنے وجود کا احساس دلانے لگی۔ آرمینیا کے لوگوں نے اپنے ترک ساتھیوں کے ہاتھوں جو ظلم سہا تھا اس کے نتیجہ میں قوم پرستی کے اس دور میں انہیں بھی ایک علیحدہ ریاست کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور جس کا مطالبہ بھی انھوں نے کردیا۔ یہ سب جو مختلف تشخص اب ابھر رہے تھے اُنہی قوم پرستانہ نظریوں کی بازگشت تھے جو اس وقت مشرقی یورپ میں زور پکڑ رہے تھے۔

۱۹۱۲ء میں بلقان کی جنگ میں البانیا اور مقدونیہ سلطنت عثمانیہ سے نکل گئے۔ یہ استنبول سے باہر یورپ میں عثمانی سلطنت کا آخری حصہ تھے۔ اس فوجی شکست نے سلطنت عثمانیہ کو بے اطمینانی، خلفشار اور ہتک وآزردگی کے آخری تشنج سے دوچار کردیا تھا جو ایشیا مائنر کے علاقہ میں دیکھنے میں آیا۔ اس طرح کے خلفشار بالعموم انتہائی منظم گروہوں کے لئے بہت معاون ہوتے ہیں جیسا کہ پانچ سال بعد بالشویک نے روس میں اسے ثابت کیا۔ استنبول میں اس طرح کا منظم گروہ (CUP) Union and Progress Community تھی۔

۲۳ رجنوری ۱۹۱۳ء میں CUP نے حکومت کا تختہ پلٹ دیا، وزیر قتل کردئے سلطان کو جلاوطن کردیا گیا، حکومت کے تمام رہنماؤں کو نکال دیا گیا۔ باقی تمام پارٹیاں غیر قانونی قرار پائیں اور عثمانی ترکی میں ایک پارٹی حکومتی نظام ہی صحیح قرار پایا۔ اس پارٹی کے تین بڑے ذمہ دار ابھر کر سامنے آئے۔ طلعت پاشا، انور پاشا اور جمال پاشا۔ سلطنت عثمانیہ کی باقیات پر ان تین افراد کی حکمرانی تھی جب یورپ میں وہ سول وار پھوٹ پڑی جس کے خدشہ کا اظہار بہت پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔

یورپ میں اسے عظیم جنگ کہا گیا۔ البتہ عالم وسطی کو یہ ابتداءً سول وار سی لگی کیونکہ جرمنی اور آسٹریا بالمقابل فرانس، برطانیہ اور روس صف آرا ہو گئے۔ اور پھر باقی تقریباً سبھی یورپی ممالک اس میں کود پڑے یا کھینچ لئے گئے۔

مسلمانوں کا کوئی مسئلہ نہ تھا لیکن CUP والوں نے سوچا کہ اگر وہ جنگ ختم ہونے سے قبل جیتنے والے کا ساتھ دیں تو فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اکثر لوگوں کی طرح انہوں نے سوچا کہ یہ جنگ محض چند ماہ چلے گی کیونکہ یورپ کی بڑی طاقتیں نئے ہتھیار کافی دن سے اکٹھا کرتی رہی تھیں۔ ہتھیار اتنے خطرناک تھے کہ ان کے خلاف بہت دن تک کھڑے رہنا ممکن ہی نہ تھا۔ چنانچہ اندازہ یہ تھا کہ اچانک خونریزی برپا ہوگی اور اس دوران جو ابتدا کرنے کی ہمت کرے گا اور آخر تک جمارہے گا وہی فاتح ہوگا۔

CUP کے تجزیہ نگاروں کے مطابق جرمنی کو فتح ملنے والی تھی جو بہرحال یورپی براعظم کا سب سے زیادہ مضبوط صنعتی ملک تھا۔ فرانس کو یہ پہلے ہی زیر کر چکا تھا اور مرکزی یورپ پر قابض تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جرمنی اپنی سرزمین سے اپنی اعلیٰ و معیاری ریلوے لائن کے ذریعے فوجیں اور ہتھیار ہر محاذ پر بھیجنے کی پوزیشن میں تھا۔ ویسے بھی جرمنی کا ساتھ دیکر ترک اپنے پرانے دشمنوں روس اور برطانیہ سے بدلہ بھی چکا رہے ہونگے۔

جنگ کو آٹھ ماہ گذر گئے، روسی فوجیں سلطنت کی شمالی سرحدوں تک پہنچ چکی تھیں کہ CUP

لیڈروں نے اس بدنام زمانہ قانون کا اعلان کیا جسے Deportaion Act کہا جاتا ہے۔ سرکاری طور پر اس کا مقصد یہ تھا کہ آرمینیائی آبادی کو ان سرحدی علاقوں سے ہٹا کر سلطنت کے اندر کسی جگہ پر منتقل کیا جائے تاکہ یہ لوگ روس کے ساتھ ملکر کوئی ساز باز نہ کرسکیں۔ آج کی ترک حکومت بھی یہی اصرار کرتی ہے کہ Deportation Act خالصتاً حفظ ماتقدم کے لئے تھا جو جنگ کے نتیجہ میں نافذ کرنا پڑا تھا۔ وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ کچھ قتل ضرور ہوئے تھے لیکن کیونکہ سول وار جاری تھی تو یہ عین ممکن تھا۔ اور مزید یہ کہ شدت دونوں کی طرف سے برتی گئی۔ یہ سرکاری نقطۂ نظر ہے اور ابھی تک کوئی بھی حکومت اس سے ہٹی نہیں ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ جنگ جاری تھی، روسی آرہے تھے کچھ آرمینی روسیوں کے ساتھ مل کر سازشیں کررہے تھے۔ کچھ آرمینیوں نے ترکوں کو قتل کیا تھا۔ اور ۱۹۱۵ء کی اس شدت کے پس منظر میں وہ نفرت بھی تھی جو ۱۸۹۰ء کے نسلی صفائی سے ہونے والی فسادات سے پیدا ہوچکی تھی (اقوام متحدہ نسلی صفائی کی تعریف یوں کرتی ہے ''کسی علاقے میں نسلی یک رنگی کو زبردستی نافذ کرنے کی ایسی کوشش کہ غیر مطلوب گروہ اس علاقہ سے نکل جائیں یا انہیں قتل کردیا جائے اور اکثر و بیشتر ایسی ظالمانہ کاروائیاں کی جائیں جن کے خوف سے یہ لوگ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوں'')۔

بیرون ترکی بعض اسکالرز کو شک ہے کہ ۱۹۱۵ء میں نسلی صفائی سے بھی بدتر کچھ ہوا تھا۔ حالانکہ نسلی صفایا کسی بڑے جرم سے کم نہیں۔ Deportation Act یعنی جلاوطنی کا قانون طلعت پاشا، اور انور پاشا اور کچھ بے نام رہنما جو CUP کے خفیہ سیل کے ممبر تھے کی ان کوششوں کا آغاز تھا جن کے ذریعہ آرمینیائی ایشیا مائنر نسل کی ترک علاقوں سے نہیں بلکہ شاید اس زمین سے جڑ کاٹ دینا چاہتے تھے۔ جن کو کہیں اور بسایا جارہا تھا انہیں در اصل زبردستی وہ جگہ چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تھا اور اس عمل میں اتنی سخت گیری برتی گئی تھی کہ بہت سے لوگ جاں بحق ہوگئے تھے۔ مختصراً یہ نسل کشی تھی (اقوام متحدہ کے مطابق کسی نسلی گروہ کو نہ صرف ایک خاص علاقہ سے بلکہ فی الجملہ ختم کرنے کی کوشش) متعین طور پر کتنے لوگ مارے گئے یہ اختلافی ہے۔ لیکن یہ دس لاکھ سے زیادہ تھے۔ یہ تباہی طلعت پاشا کی نگرانی میں ہوئی تھی کیونکہ وہ اس وقت وزیر داخلہ تھے اور بعد میں عثمانی ترکی کے وزیر اعظم بھی مقرر ہوگئے تھے اور اس منصب پر وہ جنگ عظیم اول کے خاتمہ تک برقرار رہے۔

ایک ترمیم پسند ترک مورخ Taner Akcam نے CUP سے وابستہ ایک ڈاکٹر جو اس وقت جب یہ قتل عام ہورہا تھا کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ہر چیز سے پہلے تمہاری قومیت ہے...... مشرقی آرمینیائی اتنے پرجوش تھے کہ اگر وہ اپنے علاقہ میں برقرار رہتے تو ایک بھی ترک یا ایک بھی مسلمان وہاں زندہ نہ رہتا...... چنانچہ میں نے خود کو سمجھایا کہ دیکھو ڈاکٹر راشد دو ہی راستے ہیں یا تو وہ تمام ترکوں کا صفایا کردیں گے یا ان ترکوں کے ذریعہ ان کا صفایا ہوجائے گا۔ میں ان دونوں کے درمیان فیصلہ کئے بغیر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ میری ترکیت میرے اندر کے ڈاکٹر پر غالب آگئی اور میں نے خود سے کہا، بجائے اس کے وہ ہمیں ختم کردیں، ہم انھیں ختم کردیتے ہیں۔[8]

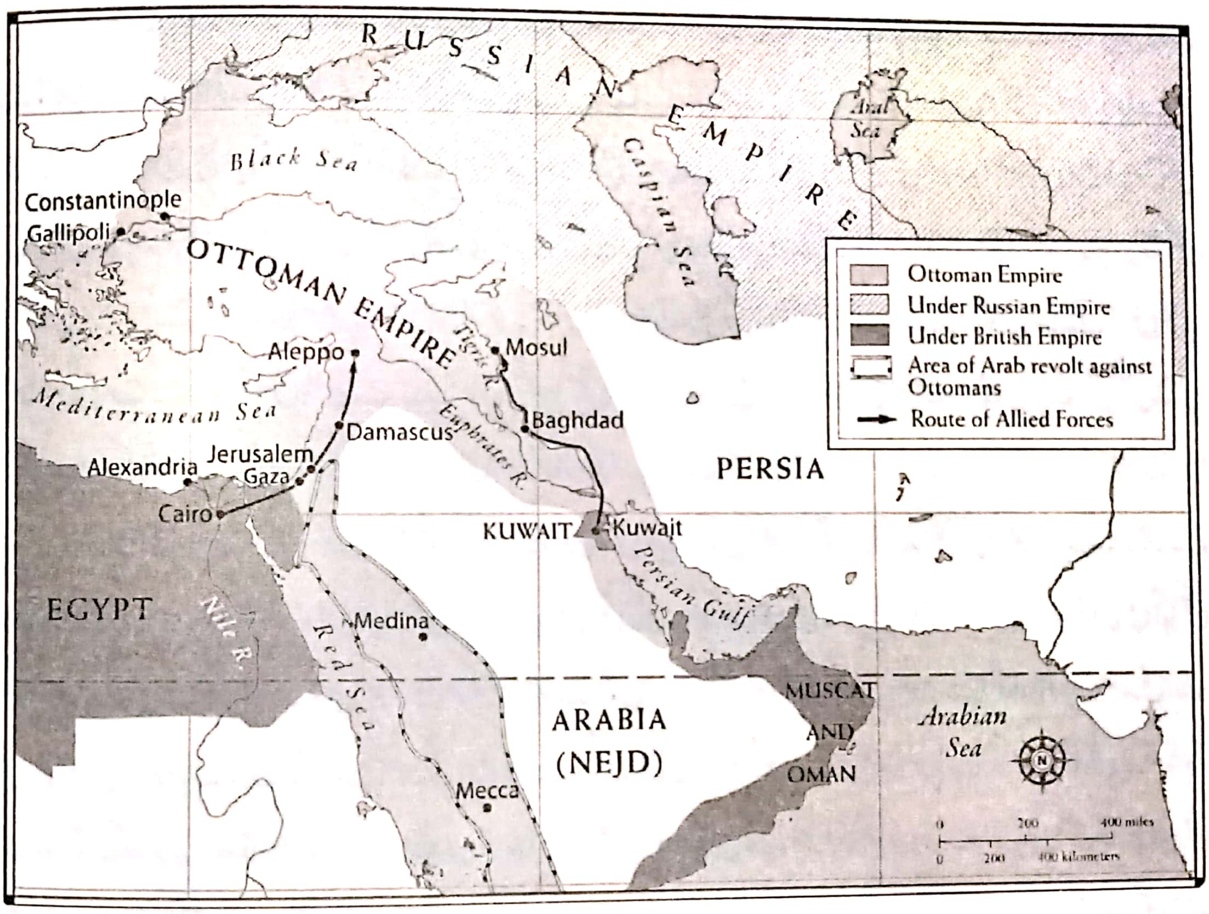
لیکن CUP کا اندازہ بالکل صحیح نہ تھا۔ ایک تو یہ کہ جنگ جلد ختم نہ ہوسکی۔ بجائے اس کے ایک زبردست قسم کی بمباری سے فوجوں کو ختم کردیا جاتا جنگ کا محاذ میلوں دور تک پھیل گیا جس میں لاکھوں فوجی ایک دوسرے کے سامنے خندقیں کھودتے ہوئے سیکڑوں میل تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان خندقوں کے درمیان جنگ بھڑکتی رہی اور پھر ایسا ہوا کہ محض چند گھنٹوں میں دسیوں ہزار لوگ مر گئے لیکن اس طرح کی جنگ میں کتنا علاقہ فتح کیا یا کتنا کھودیا اکثر اس کی پیمائش محض انچوں میں ہوتی۔ یہ یورپین تھیٹر تھا۔

اس تعطّل کو توڑنے کے لئے برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ اصل قوت پر پشت سے حملہ کرے۔ چنانچہ انہوں نے ایشیا مائنر کے علاقہ سے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ پہلے ترکوں کو کمزور کردیا جائے۔ چنانچہ متحدہ افواج جزیرہ نما Gallipoli پر حملہ آور ہوئیں جہاں سے انہیں توقع تھی کہ وہ استنبول پر حملہ کرسکیں گی، لیکن یہ حملہ ناکام ہوا اور متحدہ افواج ذبح کردی گئیں۔ لیکن برطانیہ والے عثمانیوں کی دوسری کمزوریوں کا بھی استعمال کرنا چاہتے تھے۔ تمام عرب صوبوں میں بغاوت پنپ رہی تھی، قوم پرستوں نے ترکوں سے آزادی کا یہ اچھا موقع جانا۔ قدیم قبائلی انسیت نے عثمانی نظم ونسق پر طعن و تشنیع کرنا شروع کی۔ عربوں نے مستقبل میں بادشاہت کے خواب دیکھے۔ برطانیہ نے اس صورتحال کو اپنے لئے بہتر جانا۔

دو خاندان جو اس دور میں ممتاز نظر آئے ان میں ایک ابن سعود تھے جو اب بھی عبدالوہاب سے جڑے ہوئے تھے اور دوسرا ہاشمی خاندان تھا جس کی مکہ پر حکمرانی تھی۔ گوکہ سعودی۔ وہابی حلقہ اثر سکڑ کر بدوؤں کی قبائلی حکومت تک محدود ہو گیا تھا۔ لیکن حکومت مرکزی عرب میں موجود تھی اور اب بھی یہ حکومت اٹھارہویں صدی کے اس خاندان کے ایک سربراہ محمد بن سعود کی اولاد کے ہاتھوں میں تھی جنھوں نے عبدالوہاب کے ساتھ مل کر معاہدہ کیا ہوا تھا۔ گذرے اوقات میں ان دونوں خاندانوں میں شادیوں کے ذریعہ گہری رشتہ داریاں بھی قائم ہوچکی تھیں اور سعودی شیخ اب وہابی سلسلہ کا بھی مذہبی رہنما بن چکا تھا اور ابن عبدالوہاب کی اولاد میں اب بھی اس علاقے کے بڑے بڑے علماء پائے جاتے تھے۔ برطانیہ نے ایک اینگلو انڈین ایجنٹ کو سعودی شیخ سے ملاقات کے لئے بھیجا یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا کوئی معاہدہ ممکن ہے؟ انہوں نے بھرپور کوشش کی کہ ترکوں کے خلاف ان کے جذبات برانگیختہ ہوں اور انہیں سرمایہ بھی فراہم کیا اور ہتھیار بھی کہ وہ ترکوں پر حملہ کردیں۔ ابن سعود نے محتاط انداز میں اپنا ردعمل ظاہر کیا لیکن مزید تبادلہ خیال کے نتیجہ میں ابن سعود اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر وہ ترکوں کو کوئی نقصان پہنچا سکا تو اس کے انعام کے طور پر کچھ نہ کچھ اسے ملے گا اور وہ نقصان میں نہ رہے گا۔

ہاشمی سردار کا نام حسن ابن علی تھا جو کعبہ کا متولی بھی تھا۔ وہ اپنے لقب شریف سے معروف تھا اور رسول اللہ کے راست خاندان بنو ہاشم سے تھا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ بنو امیہ کے خلاف بنو عباس کی جدوجہد میں بھی ہاشمی خاندان سے وابستگی نے اہم رول ادا کیا تھا۔ یہ وابستگی اہمیت اور احترام سے دیکھی جاتی تھی اور اس وقت مکہ کا حکمراں اس قابل احترام خاندان سے وابستہ ایک فرد تھا۔

لیکن شریف حسین کے لئے مکہ کافی نہ تھا۔اس نے میسوپٹامیا سے لے کر عرب تک کی حکومت کا خواب دیکھا تھا اور سوچا تھا کہ شاید برطانیہ اس کی مدد کر سکے گا۔ برطانیہ نے پوری خوشی کے ساتھ شریف مکہ کو سوچنے کا موقع دیا کہ وہ اس کی مدد کر سکتے ہیں اور کریں گے چنانچہ انہوں نے ایک خاصا جاذب نظر ملٹری جاسوس آفیسر اس کے پاس بھیج دیا۔ یہ ایک زمانے میں آثار قدیمہ کا ماہر تھا اور اس کا نام کرنل ٹامس ایڈورڈ لارینس تھا۔عربی زبان سے واقف اور اس لباس کا رسیا جو عرب عام طور پر پہنتے تھے۔اس کی انہیں عادتوں کی بنا پر اسے لارینس آف عربیہ کہا جانے لگا تھا۔

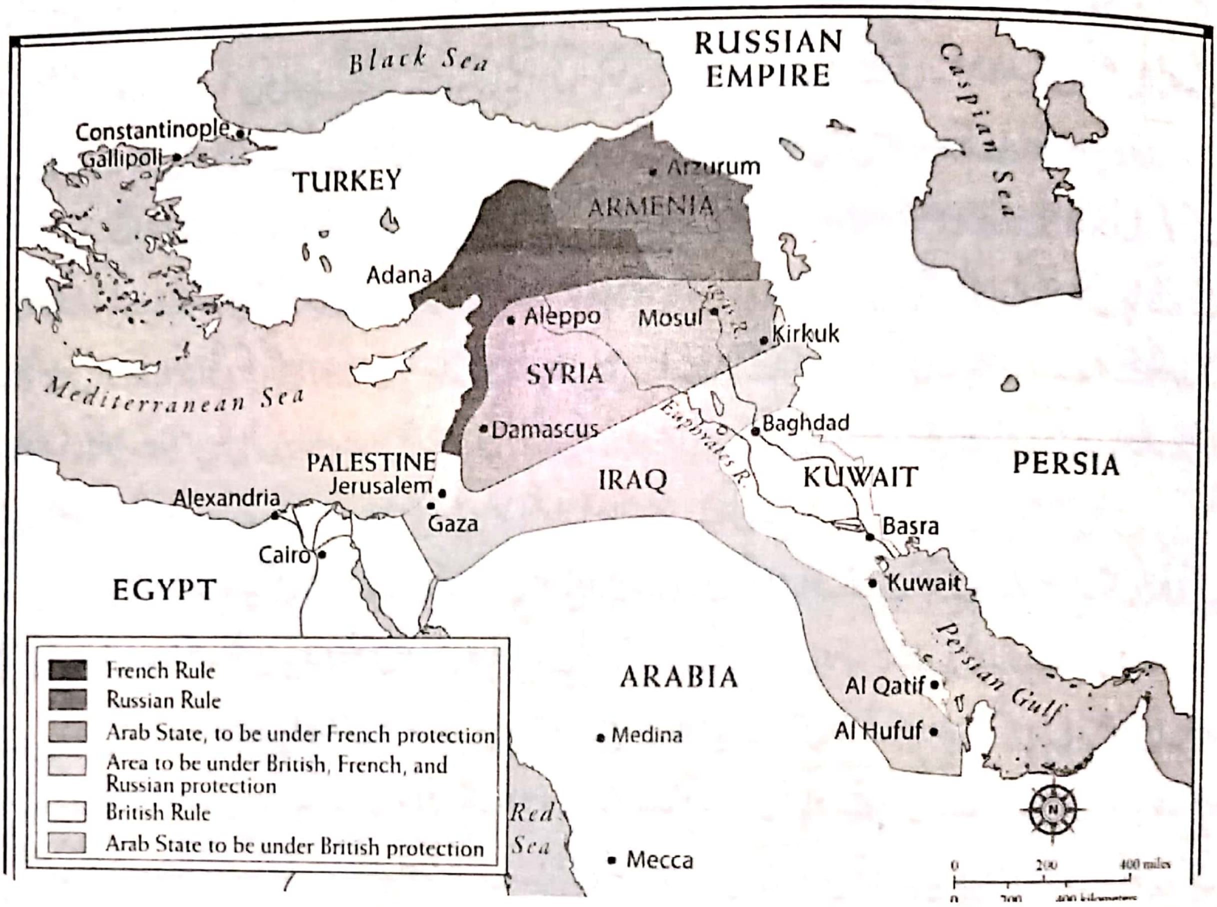


جنگ عظیم اول اور عربوں کی بغاوت

پیچھے مڑ کر دیکھیں تو بآسانی نظر آجاتا ہے کہ برطانیہ والے کیسی کیسی مصیبتیں مول لے رہے تھے۔ ہاشمی اور سعودی دو طاقت ور قبیلے تھے اس وقت کے عربیہ میں۔ دونوں کی یہ خواہش تھی کہ عرب پر ترکوں کی حکمرانی ختم ہو جائے اور اس لئے دونوں ایک دوسرے کو دشمن سمجھتے تھے۔ برطانیہ کے ایجنٹس دونوں کیمپوں میں جا رہے تھے دونوں دعوی کر رہے تھے اور دونوں کو یہ یقین دلا رہے تھے کہ برطانیہ والے ان کی بادشاہتیں تقریباً انہیں علاقوں میں جہاں وہ آباد ہیں، قائم کرنے میں پوری پوری مدد کریں گے۔ بس عثمانیوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا ہے۔ برطانیہ کو اس کی کوئی پرواہ نہ تھی کہ آخر کار اس علاقہ کا حکمراں کون ہوتا ہے۔ ان کو تو بس فوری مدد درکار تھی تا کہ ترکوں کی طاقت کم ہو جائے، اور اس طرح وہ جرمنوں کو مار کر ان کے گھروں کو بھگا دیں گے۔

پھر یہ صورتحال ہوئی کہ ہاشمی خاندان برطانیہ کی مدد کے لئے آگے بڑھا اور عرب میں ترکوں کے

خلاف بغاوت پھیلانے کی کوشش کی۔ حسین کے دو بیٹے جو لارینس کے ساتھ کام کر رہے تھے اپنے علاقے سے ترکوں کو نکالنے میں کامیاب رہے اور برطانیہ کے دمشق اور بغداد پر قبضہ کی راہ ہموار کر دی۔ یہاں سے برطانیہ والے عثمانیوں پر دباؤ ڈال سکتے تھے۔



اسکائس- پکوٹ معاہدہ

اس دوران جب برطانیہ کے ایجنٹ عربوں کے دونوں خاندانوں سے ملکر وعدے کر رہے تھے اس وقت دو یورپی ڈپلومیٹ Mark Sykes اور Francois George - Pikot راز دارانہ طور پر ملاقتیں کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک نقشہ اور ایک پنسل اور سامنے چائے کی پیالی تھی۔ مسئلہ یہ فیصلہ کرنا تھا کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد مقبوضہ علاقہ فاتح ممالک میں کس طرح تقسیم کیا جائے۔ یہ لوگ اس پر متفق ہو گئے کہ کون سا حصہ Sykes کے برطانیہ کو ملے گا اور کون سا Picot کے فرانس کو اور روس کے مفادات کیا ہوں گے۔ عربوں کو کون سا حصہ ملے؟ تعجب! کہ اس کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا گیا تھا۔

ان کے یہ فیصلے خطرات کا پتہ بھی دے رہے تھے۔ لیکن ذرا ٹھہریں! جس طرح دن رات کے TV بلیٹن میں کہا جاتا ہے۔ ابھی کچھ باقی تھا۔ فلسطین اور اس کے قرب کی آبادیوں میں قوم پرستی نے جڑیں پکڑ لی تھیں۔ مصر بھی اس کا شکار ہو گیا تھا لیکن اس کا کوئی تعلق دو عرب خاندانوں یعنی سعودی اور ہاشمی عزائم سے نہیں تھا۔ اصل میں قوم پرستی سیکولر موڈرنسٹ لوگوں کی پسند تھی۔ تمام پیشہ ور افراد، حکومتی کارکنان، اور ابھرتی ہوئی شہری بورژوا دستور پسندی اور صنعتکاری کے حق میں تھے۔ فلسطین اور شام کے ان قوم پرستوں کا مدعا محض ترکوں

اور یورپیوں سے ہی آزادی نہ تھی بلکہ وہ ہاشمیوں اور سعودیوں سے بھی آزادی چاہتے تھے۔

پھر ایک آخری مسئلہ اور خاصا مشکل مسئلہ اور تھا اور شاید یہ بڑی مشکل سے قابو میں آنے والا مسئلہ تھا۔ یہودیوں کا مسئلہ جو یورپ سے آکر فلسطین میں بس گئے تھے۔ یورپ میں پنپنے والی یہودی مخالف تحریک جس کی بنا پر صہیونیت کو پنپنے کا موقع ملا تھا وہ اب بڑھتی ہی جارہی تھی اور جیسے جیسے یورپ جنگ کے دہانے کی طرف بڑھ رہا تھا یہودیوں کی زندگی یورپ میں مزید مشکل ہورہی تھی۔ اس کی وجہ سے فلسطین میں یہودی آبادی بڑی تیزی سے بڑھنے لگی۔ ۱۸۸۳ء میں یہ محض ۴ فیصد تھی اب جنگ عظیم اوّل آتے آتے بڑھ کر ۸ فیصد ہوگئی اور جب یہ جنگ ختم ہوئی تو اس میں ۱۲ فیصد تک اضافہ ہوچکا تھا۔

۱۹۱۷ء میں برطانوی وزیر خارجہ آرتھر جیمس بالفورڈ نے Lord Lionel Rothschild کو ایک خط لکھا جو ایک برطانوی بینکر تھا اور معروف صہیونی بھی۔ اس شخص نے یہودیوں کی فلسطین اور عراق جانے کے لئے بڑی حوصلہ افزائی کی تھی اور اس سلسلہ میں خود اپنے سرمائے سے بھی مدد کی تھی۔ بالفورڈ نے اسے لکھا کہ برطانوی حکومت اس خیال کو اہمیت دیتی ہے کہ فلسطین کو یہودیوں کے قومی وطن کی حیثیت میں مستحکم کیا جائے اور اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنے بہترین عزائم استعمال کرے گی۔

بالفورڈ نے یہ بھی صراحت کی کہ وہاں موجود غیر یہودی اقوام اور مذہبی حقوق کے سلسلہ میں کوئی منفی کام نہیں کیا جائے گا۔ لیکن یہ کہ دونوں قومیں وہاں کس طرح رہیں گی اس کی وضاحت بالفورڈ نے نہیں کی۔

خلاصہ کے طور پر اور اس کا خلاصہ کیا جانا چاہیے، برطانیہ نے اسی علاقہ کا وعدہ ہاشمیوں، سعودیوں اور یورپی صہیونیوں سے کیا، جب کہ اس علاقہ میں دوسرے عرب لوگ بھی آباد تھے جن کے اپنے قومی جذبات اور تشخص تیزی سے ابھر رہا تھا۔ برطانیہ اور فرانس نے بھی خفیہ طور پر یہ طے کرلیا تھا کہ یہ پورا موعود علاقہ آپس میں تقسیم کرلیں گے۔ اس سلسلہ میں مختلف نوعیت کی وضاحتیں بہ اقرار اور بہ انکار وغیرہ سامنے آتی رہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی صورتحال یہی تھی جو بیان کی گئی اور یقیناً اس کے نتیجہ میں مستقبل دھماکہ خیز ہوگا یہ بات یقینی تھی۔

لیکن آنے والے دنوں کے بارے میں ایک مثبت بات یہ تھی کہ یہ مستقبل میں ملفوف تھے۔ اس وقت تو جنگ ایک مسئلہ تھی جو جاری تھی۔ اور برطانیہ اور فرانس نے قلیل مدت کے لئے ہی سہی جو کھچڑی پکائی وہ بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ CUP نے وہ سب کچھ لٹادیا جو ایشیا مائنر کے باہر اس کے قبضہ میں تھا۔ فلسطین، شام کا بڑا حصہ اور میسوپٹامیا برطانیہ کے لئے چھوڑنا پڑا۔ اور یورپ میں اس کے حلیفوں کے لئے بھی جنگ کے نتائج خراب ہی تھے ۱۹۱۸ء میں جرمنی نے بلا شرط ہتھیار ڈال دیے اور ترکی کے تینوں پاشاؤں کو اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ بڑی پریشانیوں میں گھر چکے ہیں۔ طلعت، انور، اور جمال استنبول میں گرفتار کئے جانے سے محض چند لمحے قبل فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ طلعت تو برلن چلے گئے جہاں ۱۹۲۱ء میں ایک آرمینی نے اسے قتل کردیا۔ جمال جارجیا چلے گئے جہاں وہ بھی ۱۹۲۲ء میں ایک آرمینی کے ہاتھوں قتل ہوئے اور انور نے وسطی ایشیا میں بالشویک کے خلاف تحریک شروع کردی۔ جہاں سرخ فوج سے نکلی ہوئی ایک ٹکڑی کے آرمینی بالشویک کمانڈر نے اسے ۱۹۲۱ء میں قتل کردیا۔ Committee of Union and Progress اس طرح انجام کو پہنچی۔ حکومت تو انھوں نے انتہائی خراب چلائی لیکن ان کے خاتمے کے بعد جیسی تھی وہ بھی نہ رہی سلطنت عثمانیہ کا تن مردہ بلا حکومت تھا۔

باب : ۱۵

سیکولر موڈرنسٹ کا عروج

(۱۳۳۶ تا ۱۳۵۷ھ، 1918 تا ۱۹۳۹ء)

1919ء تک صورت حال یہ تھی کہ ایشیا مائنر، فرانس اور اٹلی کی فوجیں بس گھسٹ ہی رہی تھیں۔ یونانی فوجیں قوم پرستوں کی قیادت میں عظیم تر یونان کے خواب دیکھنے لگی تھیں اور عثمانی سلطنت کے قلب تک پہنچ رہی تھیں۔ استنبول میں برطانوی افواج موجود تھیں۔ اس صورت حال میں پورے اناطولیا کے علاقے میں مزاحمتی تحریک ابھرنے لگی تھی جو ایک عقابی چہرہ اور بڑی تیز اور چبھ جانے والی آنکھوں والے جرنل کے گرد متحد ہو رہی تھیں۔ یہ جرنل مصطفیٰ کمال تھا جو بعد میں اتاترک یعنی ترکوں کا باپ کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس کے جرنیلوں نے تمام بیرکوں سے فوجوں کو نکال باہر کیا اور ۱۹۲۳ء میں ایک نئی قومی ریاست ترکی کی پیدائش کا اعلان کر دیا۔

ترکی عثمانی سلطنت کا نیا روپ تھا۔ اتاترک نے عثمانی ماضی کو بالکل ختم کر دیا۔ اس نے سلطنت ہی کو ختم کر دیا اور ایشیا مائنر سے باہر کے کسی علاقہ کا دعویٰ نہیں کیا۔ کیونکہ وہ ایسے علاقے چاہتا تھا جہاں یکسانیت اور یک رنگی پائی جاتی ہوتا کہ ملک کا تصور قابل فہم ہو سکے۔ بعد ازاں ترکی ایک ایسی ریاست ہو گیا جس کی سرحدیں بالکل واضح اور نا قابل تغیر ہونگی جس کے اندر ترک نسل کی اکثریت رہے گی اور جن کی زبان بھی ترکی ہو گی۔ اس نئے ملک میں اسلام ہر عوامی پالیسی سے خارج ہوگا اور صرف ایک ذاتی معاملہ کی حیثیت میں رہے گا۔ اس طرح وہ بطور مذہب ترقی کر سکے گا اور اسی طرح دوسرے مذاہب کو ترقی کے مواقع میسر ہوں گے۔ لیکن یہ اس وقت تک ہی ہے جب تک اس کے ماننے والے دوسروں کے لیے پریشانی کا باعث نہ ہوں۔

اس طرح ترکی عالم اسلام کا وہ پہلا ملک تھا جس نے اپنے آپ کو ایک سیکولر ملک قرار دیا اور مذہب اور سیاست کی علیحدگی ریاستی پالیسی کا باقاعدہ حصہ بنی۔ اسلام کا مرتبہ کم کر دینے کے بعد یہ ضرورت بہر حال تھی کہ ملک کو متحد رکھنے کے لیے کوئی اصول ہو۔ چنانچہ اتاترک نے ایک ایسی ہی پالیسی وضع کی جس میں چھ اصولوں کو مقدس تسلیم کیا گیا تھا۔ اس میں قوم پرستی، سیکولرزم، اصلاح کا اصول، ریاست کا اصول، عوام کی مملکت کا اصول اور جمہوریت کا اصول شامل تھے۔ ترک ان اصولوں کو اب بھی کمالزم کہتے ہیں اور اس کی بعض تشریحات بلکہ خصوصی طور پر ابتدائی چار اصول جنگ عظیم اول کے خاتمہ کے بعد عالم اسلام کے تقریباً ہر علاقے میں قبول ہونے لگے۔

اتاترک کی قوم پرستی کا CUP کی عسکریت زدہ قوم پرستی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ گو کہ دونوں کی جڑیں

ماضی کے ینگ ٹرکس ہی میں پیوست تھیں۔ البتہ ینگ ٹرکزم ایک وسیع تر تحریک تھی جس میں آزاد دستور بندی (Liberal Constitutionalism) جیسے فاشزم کے عناصر موجود تھے۔ اور اتاترک کی لچک دار ثقافتی قوم پرستی بھی جو حریت پسندی اور فراخ دلی کے مقاصد سے ابھری تھی۔

اصل میں ثقافتی قوم پرستی کے تصور ہی کی بنا پر اتاترک نے ترکی زبان کو دوسری ان زبانوں پر، جو دولت عثمانیہ میں موجود تھیں فوقیت دی۔ ترکی زبان کے مختلف لہجے اور اسلوب جو سلطنت عثمانیہ کے مختلف علاقوں میں بولے جاتے تھے ان کے لئے بتدریج ایک معیاری اسلوب اور لہجہ کے لیے راہ آسان کر دی۔ اس کا تعلق کورٹ میں بولی جانے والی ادبی ترکی سے نہ تھا بلکہ گلی کوچوں میں عوامی ترکی سے تھا اور وہ ایک صاف ستھری زبان تھی۔ کچھ پر جوش لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ ترکی زبان میں جو عربی اور دوسری زبانوں کے الفاظ در آئے ہیں انہیں نکال دینا چاہیے تو اتاترک نے یہ کہہ کر ان کی زبانیں بند کر دیں کہ ترکی تمام زبانوں کی ماں ہے چنانچہ جو دوسری زبانوں کے الفاظ آ گئے ہیں اس کا مطلب ہے کہ وہ الفاظ اپنے گھر میں واپس آئے ہیں۔ البتہ ترکی ایک طویل عرصہ سے عربی رسم الخط میں لکھی جاتی رہی تھی اتاترک نے اس کی جگہ لاطینی زبان کے حروف کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

اتاترک بنیادی طور پر ایک جدید ذہن کا آدمی تھا چنانچہ اس نے بادشاہ یا سلطان کے القاب استعمال نہیں کیے۔ ایک نیا دستور تحریر کرایا۔ ایک پارلیامنٹ قائم کی اور ریپبلکن طرز کی حکومت قائم کی۔ جس کا وہ خود صدر تھا۔ پارلیمنٹ جمہوریت جو اس نے قائم کی وہ آج تک قائم ہے۔ لیکن بلا تکلف کہنا چاہیے کہ اتاترک کی زندگی میں کوئی دوسرا شخص بیلٹ باکس کے ذریعہ اس کی جگہ نہیں لے سکتا تھا اور ویسے بھی وہ ترکوں کا باپ تھا۔ کوئی اپنے باپ کو آفس سے نکالنے کے لئے ووٹ نہیں ڈالتا۔ حالانکہ وہ کوئی ملٹری ڈکٹیٹر نہیں تھا۔ اس کے حکمراں گروہ کو جُنٹا کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ اتاترک ملٹری کے ذریعہ برسر اقتدار آیا تھا۔ چنانچہ اس کے نزدیک ڈسپلن کی اہمیت واضح تھی۔ وہ ملک کے لوگوں کو اس ڈسپلن کے وژن کی طرف لے جانا چاہتا تھا اور ملٹری کے براہ راست اور انتہائی مضبوط اداروں کے ذریعہ اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اُس کا وژن کیا تھا؟ ترکی میں علماء کے اقتدار کو ختم کرنا۔ معاشرتی زندگی میں اسلام کو فیصلہ کن کردار ادا کرنے سے خارج کر دینا اور معاشرہ کے مسائل کے لئے سیکولر نقطۂ نظر دینا۔ مغربی پس منظر میں یہ اقدامات اسے ایک معتدل حکمراں بنا دیتے ہیں۔ لیکن اسلام کے پس منظر میں دم بخود کر دینے والا انتہائی انتہا پسند شخص۔

آیئے پہلے اس کا ایجنڈا دیکھتے ہیں۔ عوامی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے عورتیں آزاد تھیں اور اس مقصد کے لئے اس نے نئے قوانین نافذ کیے جس کے تحت عورتوں کو ووٹ دینے کا حق، حکومتی سطح کا منصب، جائداد رکھنے کا حق، تعدّد ازدواج، غیر قانونی جہیز کا خاتمہ شادیوں میں روایتی رسوم و رواج کی حوصلہ شکنی اور قرآن وحدیث کے بجائے سوئس کوڈ پر مشتمل طلاق کے لیے قوانین۔

اس نے نقاب اور سر ڈھکنے کو بھی غیر قانونی قرار دیا۔ اور عورتوں اور مردوں کے لیے لباس بھی متعین کیا جس میں اب فیز (Fez) استعمال نہیں ہو سکتا تھا۔ صافے اور داڑھیاں بڑی سختی سے روکی گئیں۔ ڈربی طرز کے ہیٹ کے استعمال پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔ اسی طرح گیند پھینکنے والوں اور بیس بال کھیلنے والوں کے کیپ کی اجازت دی گئی۔ اتاترک خود سوٹ اور ٹائی کا استعمال کرتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ اس کے ہم وطن بھی یہی لباس استعمال کریں۔

مذہبی حلقہ کو دکھ ہوا جب یہ فیصلہ سامنے آیا کہ سرکاری تقریبات میں بال روم رقص خاطر مدارات اور مہمان نوازی کے ایک ذریعہ کے طور پر پروگراموں کا حصہ ہوگا۔ لیکن مذہبی حلقہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اتاترک کا سروکار محض کام سے تھا اور اسے کر ڈالنے کے لیے اس کے پاس طاقت تو تھی ہی اثر ونفوذ بھی تھا۔ پارلیامنٹ اسے ہر حال میں تعاون دے رہی تھی بلکہ یہ قانون پاس ہو گیا کہ عوامی مواقع پر قرآن عربی میں نہیں بلکہ ترکی میں پڑھا جائے گا۔ ہر مخلص کے نزدیک یہ فیصلہ اسلام سے گستاخی اور اس کی بے حرمتی تھا۔ پارلیامنٹ نے اس وقت بھی اس کا ساتھ دیا جب چھٹی کا دن جمعہ کے بجائے اتوار کر دیا گیا۔ اتاترک کی حکومت نے مدرسے بند کر دیئے، صوفیوں کی انجمنیں بند کر دیں اور اوقاف ختم کر دیئے جو فلاحی کاموں کے لیے قدیم دور سے چلے آ رہے تھے۔ اس کی جگہ ریاستی خدمت خلق اسکیم شروع کی۔ ۱۹۲۵ء میں اپنے لائے ہوئے انقلاب کے لیے ایک اور اہم جھٹکا دینے والا اعلان کیا۔ خلافت کا خاتمہ۔

یہ کوئی بہت بڑی خبر نہ تھی۔ عملاً صدیوں قبل ہی خلافت ختم ہو چکی تھی۔ لیکن یہ جو استنبول اور سندھ کے درمیان دنیا آباد تھی اس میں خلافت کو بڑی اہمیت حاصل تھی یہ ایسی ہی تھی جیسے مغربی دنیا میں قدیم روم کی اہمیت تھی۔ خلافت جیسی بھی قائم تھی اس میں ایک عالمی برادری کا تصور موجود تھا۔ مغرب میں روم کی روح جنگ عظیم اول تک سرایت کیے رہی اور کچھ کچھ نظر بھی آتی تھی۔ مثلاً Austro Hungarin Empire جو Holy Roman Empire کی آخری شکل تھی اور اسی طرح جنگ سے پہلے کے جرمن اور روسی حکمرانوں کے القاب سے بھی اس کی یاد تازہ ہوئی تھی۔ مثلاً Kaiser اور Czer دونوں ہی Caesar یعنی قیصر کے تغیرات تھے۔ روم تو صدیوں قبل ختم ہو چکا تھا۔ لیکن رومیوں کی آفاقی ریاست کا تصور اب جنگ عظیم ہونے تک مکمل طور پر ختم نہیں ہو سکا تھا۔ یہی بات خلافت کے لیے بھی اتنی ہی صحیح تھی۔ جب اتاترک نے خلافت ختم کی تو دراصل اس نے ایک تصور کو ختم کیا تھا اور اسی بنا پر یہ ایک بڑا جھٹکا تھا عالم اسلام کے لیے۔

یا کم از کم روایتی لوگوں کے لیے تو یہ ایک بڑا سانحہ تھا ہی لیکن اس کی کسے پرواہ تھی۔۔ ان کے پاس اب طاقت تو تھی نہیں۔ اتاترک آنے والی کم از کم نصف صدی تک کے لیے اپنی طرز کا واحد مسلم لیڈر تھا۔ ایران نے اس نوع میں اپنا علیحدہ نمونہ پیدا کیا تھا۔ جنگ کے بعد آخری قاجار بادشاہ کو ایک جنگلی انقلاب کا سامنا تھا۔ یعنی جمال الدین افغانی کے پیروکاروں نے ایک گوریلا طرز کی بغاوت شروع کر دی تھی۔ بادشاہ کے پاس دو

طرح کی فوجیں تھیں ایک سویڈش افسروں کی کمان میں تھی اور دوسری روس کے کرائے کے افسروں کی[1]۔ بادشاہ یہ اندازہ بھی نہ کر سکا کہ اسے اصل خطرہ جنگل کی راہ سے آنے والے گوریلوں سے نہیں بلکہ ان بیرونی لوگوں سے تھا جن کا اس نے سہارا لے رکھا تھا۔ جب بالشویک کارکن گوریلوں میں شامل ہونے لگے تو برطانوی اعصاب کمزور ہونے لگی۔ روس میں ابھی لینن برسر اقتدار آیا تھا اور یہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ اس طرح کی سرگرمیوں میں اضافہ ہو چنانچہ یہ سمجھتے ہوئے کہ بادشاہ کمزور ہے وہ کوئی کارروائی گوریلوں اور بالشویک کے خلاف نہ کر سکے البتہ ایک ایرانی کرنل سے ساز باز کر کے بادشاہ کو معزول کر دیا۔

یہ کرنل جس کا نام رضا پہلوی تھا ایک سیکولر موڈرنسٹ تھا اور اتاترک کا ایرانی ماڈل تھا البتہ فرق یہ تھا کہ اس کے یہاں جمہوریت کا کوئی استعمال نہ تھا۔ (کچھ سیکولر موڈرنسٹ اسے ضروری سمجھتے تھے)۔ ۱۹۲۵ء میں اس کرنل نے خود کی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور رضا شاہ پہلوی کہلایا۔ یہ ایران میں ایک نئے خاندان کی حکمرانی کا آغاز تھا۔ تخت سے اس نے اسی طرح کی اصلاحات کا اعلان کیا جو اتاترک کر چکا تھا۔ مثلاً ایک مخصوص لباس، سر ڈھانکنے والے اسکارف، نقاب، صافے، ڈاڑھی وغیرہ عام شہریوں کے لیے ممنوع قرار دے دیئے گئے۔ جو علماء رجسٹرڈ تھے وہی نئے ایران میں ان چیزوں کو استعمال کر سکتے تھے۔ لیکن انہیں ایک لائسنس لینا ضروری تھا۔ جو یہ بتائے کہ وہ واقعی عالم ہیں (اور وہ یہ کیسے حاصل کر سکتے کہ اسلام میں ایسا کوئی سلسلہ نہ تھا جو لوگوں کو clerics بناتا ہو)۔ اس کے باوجود کوئی شخص اگر صافہ باندھے نظر آجائے اور اس کے پاس لائسنس نہ ہو تو سڑک پر ہی اسے پیٹا جا سکتا تھا اور جیل میں ڈالا جا سکتا تھا۔

ایسا ہی سب افغانستان میں بھی ہو رہا تھا جہاں ۱۹۱۹ء میں ایک تندخو اور عجلت پسند نوجوان امان اللہ تخت نشین ہوا۔ ینگ ترک کا پر جوش حامی اور چاند جیسے چہرے پر خاص انداز کی مونچھیں لیے اس شخص نے افغانستان کو ایک دستور دیا جس کی خاص بات عورتوں کی آزادی واُبھرتے ہوئے سیکولر اسکولوں کو بھرپور مالی مدد۔ درباری لباس جس میں نقاب نہ تھا۔ داڑھی اور سر پر صافہ بھی نہ تھا۔

مجھے یہ بات بہت دلچسپ نظر آئی کہ کوئی پچاس سال بعد جب اسلام پسند برسر اقتدار آئے تو انہوں نے بھی لباس کے بارے میں ایسا ہی کیوں کیا۔ مثلاً افغانستان اور ایران میں جو لباس نافذ کیا گیا وہ آزاد خیالوں کا مخالف تھا۔ مثلاً عورتوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ سر پر اسکارف پہنیں۔ اور بغیر ڈاڑھی کے عوامی پروگراموں میں شرکت کرنے پر مردوں کو پیٹا گیا۔ پٹائی اور قید یہ دونوں اصول ایسے تھے جو ہر پارٹی نے لباس کے ضابطے کو توڑنے پر نافذ کیے۔

ہندوکش سے استنبول تک وسیع اس خطہ کے تینوں حکمرانوں نے حکومت کی قوت نافذہ کو سیکولر موڈرنسٹ ایجنڈے کے نفاذ کے لیے استعمال کیا۔ دارالسلام کے دوسرے حصے اب بھی شاہی حکمرانوں کے زیر سایہ تھے لیکن آزادی کے لیے زبردست کوششیں جاری تھیں جن کی قیادت سیکولر موڈرنسٹ کے ہاتھوں ہی

میں تھی۔ مثلاً ہندوستان میں سب سے زیادہ معروف مسلم لیڈر ایک خوش اخلاق و نرم خو برطانوی تعلیم یافتہ وکیل محمد علی جناح تھا۔

مختصراً سیکولر موڈرنزم ۱۹۲۰ء کے زمانہ میں پورے عالم اسلام میں ایک سیاسی نظریہ کی حیثیت سے ابھرا تھا اور ایک کے بعد ایک ریاست اس کی جھولی میں جا کر گر رہی تھی۔ میں نے اسے سیکولر ماڈرنزم کہا ہے حالانکہ یہ اصطلاح مکمل طور پر اس کی کفالت نہیں کرتی۔ کیونکہ اس میں سیکولرزم، موڈرنزم، قوم پرستی، ریاست پسندی، نشوونما پسندی یہ تمام پہلو شامل ہیں۔ لیکن کوئی اصطلاح ان سب کی متحمل ہونے سے قاصر ہے۔ شاید اتنا کہنا کافی ہو کہ یہ رویوں اور افکار کا ایک عظیم دریا ہے جس کے ابتدائی دور میں سید احمد آف علی گڑھ، امیر کبیر آف ایران، استنبول کے ینگ ترک، اور ایسے بے شمار دانشور، تعلیم یافتہ کارکنان، پیشہ ور، مصنفین، اور سرگرم کارکنان جو گزشتہ ایک صدی سے عالم وسطیٰ میں ابھرنے والی مڈل کلاس سے وابستہ تھے، اس نقطۂ نظر کی تعبیر میں شریک رہے۔ اچانک مسلم معاشرہ کو احساس ہوا کہ وہ تو مغرب ہی کے راستے پر چل پڑے ہیں۔ لیکن وہ بہت پیچھے ہیں اور مغرب کو جا پکڑنے کے لیے انہیں بے جگر ہو کر کام کرنا ہوگا، اور اس کے لئے انہیں کچھ خصوصی پروگرام شروع کرنے ہوں گے تا کہ جلد سے جلد یہ مقصد حاصل کر سکیں۔ مثلاً جمہوریت ایک پروگرام تھا اور اس کے تحت ہنگامی پروگرام برائے ترقی و نشوونما ضروری تھا۔

ایران اور افغانستان میں شہریوں پر پابندیاں نافذ کی گئیں لیکن ان کا مقصد ترقی کے ایجنڈے پر عمل درآمد کرانا تھا۔ ان دونوں ممالک کے بادشاہوں نے اپنے ملک میں سڑکیں، بند، پاور پلانٹ، فیکٹریاں، ہاسپٹل اور آفس کی عمارتوں کی تعمیر کا پروگرام شروع کیا۔ دونوں ممالک نے ایرلائنس قائم کیں، کمپنیاں قائم کیں۔ اخباروں کا آغاز ہوا (حکومت کی نگرانی میں)، قومی ریڈیو اسٹیشن شروع ہوئے۔ دونوں حکومتوں نے عورتوں کی آزادی کے لیے پالیسی وضع کی اور ان کے لیے عوامی دائروں کو کھول دیا۔ دونوں چاہتے تھے کہ ان کے ملک جلد از جلد مغربی ہو جائیں لیکن اپنے اس ایجنڈے اور خود اپنی رعایا کی آزادی میں انہیں کوئی رشتہ یا تعلق نظر نہیں آتا تھا۔ ظاہر ہے ان کا وعدہ عوام کی آزادی کا نہیں بلکہ خوش حالی اور خودداری کا حصول تھا۔

اس نکتہ پر یہ کہنا کہ دنیا کے ایک تاریخی بیانیہ کی حیثیت سے اسلام کا رول ختم ہو گیا تھا بظاہر ایک معقول نقطۂ نظر معلوم ہوتا تھا۔ غلط لیکن معقول۔ مغرب کی سمت سے آنے والی لہروں نے مسلم معاشرہ کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ بڑے گہرے کرب کا شکار تھا معاشرہ اور ایسے شکوک پیدا ہو گئے تھے جو بڑے ہی تڑپا دینے والے تھے۔ سیکولر موڈرنسٹ نے مسلم معاشرہ کے روحانی خلفشار کو مغربی دھاروں کے ہم دوش کر کے دور کرنے کی کوشش کی۔ غلط رائے قائم نہ کریں کیونکہ ان رہنماؤں کی اکثریت خود کو اب بھی مسلمان ہی خیال کرتی تھی اور بس یہ کہ مسلمان کون ہیں، اس کے بارے میں کچھ نئے تصورات اپنا رکھے تھے۔ اکثریت اب بھی اپنے لوگوں پر مغربی طاقتوں کی اجارہ داری کو ختم کرنے کی جدوجہد کرتی تھی۔ یہ جدوجہد وہ جدید سیکولر انقلابیوں اور استعمار مخالفوں کے طرز

پر کرتے تھے نہ کہ ایک بڑی امت سے وابستہ ایسے مسلمانوں کی طرح جو اسلام کو دنیا تک پہنچانے کے لیے خدا کی طرف سے خود کو مامور سمجھتے ہیں۔ یہ سیکولر موڈرنسٹ طبقہ اشرافیہ اپنے حصول کی کوششوں میں معیار اور پیمانہ مغربیوں کا ہی استعمال کرنا چاہتا تھا۔ لیکن واضح رہے کہ اس طرح لاشعوی طور پر اس نے مغربی مفروضوں اور اس کے حیطہ فکر و عمل کو تسلیم کر لیا تھا۔

لیکن ایسا بھی نہیں کہ انہیں عوامی حمایت حاصل نہ ہو۔ عالم وسطی میں ہر جگہ روایتی مذہبی اسلام جامد اور غیر متحرک تھا۔ مات کھا چکا تھا اور مغلوب تھا۔ تعلیم یافتہ لوگ پرانے طرز کے علماء کو شیخ چلی سمجھتے تھے۔ علماء یعنی کتاب اللہ کے لفظ پرست و معجزات کے تاجر، کٹر ایمان والے۔ ان کے بارے میں یہ تصوّرات صدیوں سے دارالسلام میں غالب تھے۔ اور انہوں نے اس کے علاوہ کیا ہی کیا تھا۔ فرسودہ سوسائٹی جو ایک کار بھی نہ بنا سکتی ہو اور ہوائی جہاز کی اختراع نہ کر سکے اور وہ مغرب کی قوت کا مقابلہ کرنے اٹھے، ان کی ناکامی نے ان کے نقطۂ نظر کو بے وقعت ثابت کر دیا تھا اور عوام کی کثیر تعداد اب دوسروں کو موقع دینے کے لیے تیار تھی۔ مستقبل سیکولر موڈرنسٹ کا تھا۔ یا دیکھنے میں تو کم از کم ایسا ہی لگتا تھا۔

لیکن سیکولر موڈرنسٹ ہی وہ اصلاحی تحریک نہ تھی جو عالم اسلام میں انیسویں صدی میں ابھری۔ اور بھی کچھ لہریں ابھر رہی تھیں۔ مثلاً وہابیوں کے بارے میں کیا کہنا ہے؟ سید جمال الدین کے شاگرد کیا کر رہے تھے؟ ان تحریکات کو راسخ العقیدہ یعنی کٹر اسلام یا پرانے طرز کے مذہبی قدامت پسند سمجھنے کی غلطی نہیں کرنا چاہیے۔ بالکل جدید لوگ تھے ایسے ہی جیسے سیکولر موڈرنسٹ اور صورت حال کو بدلنے کے لیے اتنے ہی مضطرب اور خواہاں۔

بلکہ وہابی بھی جب ماضی بعید میں تاریخ کے ایک افسانوی لمحہ کی طرف اپیل کر رہے تھے تو وہ بھی موجودہ حال کو ٹھکرایا ہوا اور گذری ہوئی بارہ صدیوں کو مردہ ہی سمجھتے تھے۔ وہ اب بھی جزیرہ نما عرب میں ہی سانس لیتے تھے بلکہ انہوں نے تو وہاں اقتدار حاصل کیا ہوا تھا اور سعودی عربیہ قائم کر چکے تھے۔ (مزید بعد میں) عربیہ سے باہر تعلیم یافتہ اور نئی مڈل کلاس میں وہابی حصولیابیاں قابل ذکر نہیں تھیں۔ البتہ انہوں نے دیہی اور نسبتاً پریشان حال لوگوں اور مسجدوں کو اپنی دعوت کا نشانہ ضرور بنایا اور ان لوگوں میں بالخصوص ہندوستان میں یہ دعوت ضرور ذہنوں کو متاثر کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہوئی۔ جب وہ اس شاندار ماضی کے احیاء کی دعوت دیتے اور بتاتے کہ اس کا احیاء اسے اولین قائم کرنے والی جماعت سے رجوع کے ذریعہ ہو سکتا ہے تو عام کمزور طبقہ کے لوگ سمجھتے تھے کہ کس دور کا حوالہ دیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ بات واضح نظر آتی تھی کہ خود ان کے شرفا مسلم طریقہ حیات سے کتنا دور جا چکے ہیں لیکن ماضی پر اظہار تفاخر کرتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی کمزوریوں کا الزام انہیں کو جاتا۔ اگر وہابیوں کے اس تجربہ کو درست مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ دیہاتیوں کی غربت کی اصل وجہ شہروں کے رہنے والے صاحب ثروت لوگ تھے۔

۱۸۶۸ء میں ہندوستان کے بعض کٹر وہابیوں نے ایک دینی مدرسہ دیوبند کے مقام پر قائم کر لیا تھا۔

پچاس سال تک اس مدرسہ سے داعیوں کی ایک بڑی تعداد برصغیر کے مختلف علاقوں میں جاتی رہی اور ہندوستانی طرز کا وہابزم پھیلاتی رہی۔ پھر ۱۹۲۰ء میں ان قلندر ہندوستانی وہابیوں نے اپنی قوت کی چمک سے افغانستان کو بھی متاثر کرنا شروع کر دیا۔

شاہ امان اللہ نے تخت سنبھالنے کے بعد برطانیہ سے آزادی کا اعلان کر کے اور سرحدوں پر فوجیں بھیج کر اپنے ملک کو یکا یک اتنا بڑا مقام دے دیا تھا کہ لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں۔ جنگ تو نتیجہ خیز نہ رہی لیکن گفت وشنید سے انہوں نے افغانستان کی آزادی حاصل کر لی۔ اور اس طرح وہ پہلا اور واحد مسلمان بادشاہ بن گیا جس نے یورپ کی سب سے بڑی قوت سے ٹکرا کر آزادی حاصل کی تھی۔ یہ دیکھ کر ہندوستانی مسلمانوں نے وفور مسرت سے شاہ امان اللہ کو نئے خلیفہ کی حیثیت میں مشتہر کرنا شروع کر دیا۔ لیکن شاہ امان اللہ اس لبادہ کو اوڑھ لینے کا روادار نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ نے دیوبندیوں کو دھوکہ دیا اور اُنہیں تمام اقدامات کا اعلان کر دیا جو اتاترک نے کیے تھے۔ ہندوستانی وہابیوں نے قسم کھائی کہ اس غدار کو زیر کر کے دم لیں گے۔

اور یہ کام انہوں نے کر بھی دیا۔ لیکن اپنے طور پر نہیں، برطانیہ کی مدد سے۔ یہ عجیب وغریب بات ہے کیونکہ امان اللہ اپنی ثقافت اور طور طریق میں دیوبندیوں کی بہ نسبت برطانیہ کے زیادہ قریب تھا یوروپیوں کے آئیڈیل امان اللہ کے آئیڈیل تھے۔ لیکن شاید اسی بنا پر یورپی امان اللہ کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ سامراج مخالف کیا ہوتا ہے۔ وہ لینن کو دیکھ چکے تھے۔ لیکن وہ دیوبندیوں کو ابھی نہیں پہچان پائے تھے۔ لمبی داڑھیاں اور سر پر صافے رکھے دین کے ان داعیوں نے برطانیہ کے قریب آ کر فرسودگی کی تمام علامتیں ان پر واضح کر دیں اور دکھا دیں اور وہ یہ سمجھ گئے کہ یہ لوگ ہمارے کام کے ہیں۔ چنانچہ برطانیہ نے دیوبندیوں کی امان اللہ مخالف مہم کی پیسہ اور بندوق سے بھرپور مدد کی اور بہت جلد مقامی انتہا پسند ملاؤں کی مدد سے دیوبندیوں نے افغانستان کو شعلہ بار کر دیا اور ۱۹۲۹ء میں امان اللہ عبرت ناک جلاوطنی گزارنے پر مجبور ہو گیا۔

اسی شور وغوغا اور انتشار کے دوران ایک واقعی فرسودہ قزاق جو خود کو صقہ کا بیٹا کہلواتا تھا، افغانستان کے دارالسلطنت پر قابض ہو گیا۔ اس قزاق نے کوئی نو ماہ تک حکومت کی جس کے دوران اس نے ''خالص'' اسلامی طرز پر حکومت کی اور امان اللہ نے جو جو اصلاحات کی تھیں انہیں ختم کر دیا اور پورا خزانہ بھی صاف کر دیا۔ جنہیں یہ معلوم ہے کہ گزشتہ صدی کے آخر میں طالبان نے افغانستان میں کیا کیا تھا انہیں صقہ کے بیٹے کی غارت گری میں پوری تفصیل نظر آ جائے گی۔ جب یہ دور ختم ہوا تو افغان اتنے پریشان اور مایوس تھے کہ وہ کسی انتہائی سخت حکمراں کی خواہش کرنے لگے۔ چنانچہ برطانیہ نے پرانے شاہی خاندان سے ایک ایسا شخص منتخب کیا جو ان کے کام کا تھا۔ افغانستان پر اب سنگ دل ظالم نادر شاہ کی حکومت تھی۔

یہ نیا بادشاہ بھی سیکولر موڈرنسٹ تھا لیکن ذرا اعتدال پسند۔ وہ بڑی آہستہ روی سے ملک کو اتاترک ہی کے راستے پر لے گیا اور اس طرح کہ ایک طرف تو برطانیہ والوں کو اندیشے لاحق نہ ہوئے اور دوسری طرف

افغانستان کو فکری اور ثقافتی اعتبار سے ساکت کر کے مقامی دیوبندیوں کو بھی دلاسہ دیتا رہا۔

وہابزم پر ہم اتنا ہی کہتے ہیں۔ آیئے اب دیکھیں کہ جمال الدین افغانی نے اصلاح کی جو جوت جگائی تھی اس کا کیا ہوا۔ کیا وہ ختم ہوگئی۔ نہیں! بالکل نہیں! جمال الدین کے فکری کام کو ان کے شاگرد محمد عبدو نے آگے بڑھایا جو مصر کی اعلیٰ درجہ کی شہرت رکھنے والی اور ہزار سال پرانی الازہر یونیورسٹی میں درس دیتے تھے۔ عبدہ نے اپنے استاد کے جستہ جستہ کام کو یکجا کر کے ایک جدید اسلامی نقطہ نظر کی تشکیل کی۔ عبدہ کے دوست اور شاگرد رشید رضا نے تحقیق کو جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ ایک جدید ریاست کس طرح اسلامی طرز پر قائم کی اور رکھی جاسکتی ہے۔

پھر حسن البنّا منظر عام پر آ گئے اور یہ جمال الدین کی شاید سب سے اہم فکری اولاد ہیں۔ یہ مصری اسکول ٹیچر فلسفی سے زیادہ ایک سرگرم کارکن تھا۔ ۱۹۲۸ء میں اس نے ایک کلب بنام اخوان المسلمین قائم کیا۔ ابتداء میں تو یہ بوائے اسکاؤٹ (Boy Scouts) کا مسلم نمونہ تھا لیکن مسلمانوں کے لیے ایک اہم واقعہ تھا جو اس وقت بظاہر زیادہ قابل توجہ نہیں سمجھا گیا تھا۔

حسن البنّا سوئز کینال کے علاقے میں رہتے اور وہیں اسکول میں پڑھاتے بھی تھے۔ یہ علاقہ ایسا تھا کہ روز ہی مشرق و مغرب کی کشمکش ان کے سامنے آتی رہتی تھی۔ یورپ اور مشرق میں ان کی کالونیوں کی تمام ہی تجارت اسی نہر کے راستے سے ہوتی تھی جو مصر کا بڑی تیزی سے ترقی کرنے والا موڈرن علاقہ تھا۔ ہر گزرنے والا جہاز ایک فیس مصر کو ادا کرتا تھا۔ ایک یورپی فرم جس میں برطانیہ اور فرانس کی حصہ داری اس فیس کا ۹۷ فیصد اپنے پاس رکھتی۔ چنانچہ اس علاقہ میں بیرون ملک کاری گروں کی بہتات تھی اور یوں یہ چھوٹی سی پٹی دو دنیاؤں کو ملانے والا سب سے واضح نشان بن گیا تھا۔ دکانوں، ریستوران، کیفے، ڈانس ہال، بار اور اسی طرح کی دوسری خدمات یورپیوں کے لیے مہیا تھیں۔ ایک دوسرا سلسلہ بازار اور کافی گھروں کا تھا۔ جہاں ادنیٰ درجہ کے مصری آتے جاتے رہتے تھے۔ گویا دو دنیائیں آپس میں بندھ تو گئی تھیں لیکن بالکل مختلف تھیں۔

حسن البنّا نے اپنے ہم وطنوں کو بڑی سنجیدگی سے یورپی زبانیں اور ان کے طور طریقوں کو سیکھنے کی کوشش کرتے دیکھا جو مغربی دنیا میں داخل ہونے کے بڑے غلامانہ انداز میں مغربی رنگ میں رنگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مقصد چاہے چھوٹی چھوٹی نوکریوں کا حصول ہی کیوں نہ ہو مصریوں کے مغرب کے تئیں اس رشک نے حسن البنّا کی عزت نفس کو بری طرح مجروح کر دیا۔ چنانچہ اخوان المسلمون قائم ہوئی تاکہ مسلمانوں کا آپسی رشتہ مضبوط ہو، وہ ملیں جلیں اور اپنی ثقافت کے بارے میں استعداد بڑھائیں اور اس طرح اپنی عزت نفس میں اضافہ کریں۔ اسکول کا وقت نہ ہوتا تو یہ نوجوان اخوان کے مراکز میں آجاتے اور وہاں کھیلوں میں تو حصہ لیتے ہی اس دوران اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق لیکچرز سنتے۔ حسن البنّا خود اور ان کے اساتذہ یہ خدمت انجام دیتے۔

آخر کار ان لڑکوں کے والد اور بڑے بھائی بھی ان کے پروگراموں میں شرکت کرنے لگے چنانچہ اخوان نے ان لوگوں کے لیے شام کے اوقات میں پروگرام منعقد کرنا شروع کیے۔ ان میں اتنی دل چسپی بڑھی

کہ مزید مراکز کھولنے پڑے۔ ۱۹۳۰ء کے نصف تک محض لڑکوں کے کلب سے جس کا آغاز ہوا تھا وہ اب اتنی بڑی ہوگئی کہ مردوں کے لیے ایک سماجی تنظیم بن گئی۔

یہاں سے آہستہ روی سے اس نے ایک سیاسی تحریک کا رخ اختیار کرلیا۔ ایک ایسی تحریک جس نے سیکولر اسلام اور مصر کی اپنی مغرب زدہ اشرافیہ کو ملک کا دشمن اول قرار دیا۔ یہ قوم پرستی کی مخالف تھی جو اس وقت سیریا، لیبیا اور مصر کی آزادی کے حصول میں قوت محرّکہ بنی ہوئی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کو اس کے بجائے ایک بڑی امت تشکیل کرنے کی دعوت دی۔ ایک نئی حکومت کا تصوّر دیا جس میں تمام مسلمان متحد ہوکر رہیں۔ یہ وہی بات تھی جو جمال الدین افغانی نے پین اسلامزم (Pan Islamism) کی دعوت دیتے ہوئے امت کو جدید کرنے اور مغرب سے بچنے کی دعوت دیتے ہوئے کہی تھی۔

اخوان المسلمین کا ارتقائی دور وہی ہے جب USA گریٹ ڈپریشن (Great Depression) کے دور سے گزر رہا تھا۔ اس زمانے میں نازی، جرمنی پر حاوی ہورہے تھے اور لینن سویت یونین پر اپنی گرفت مضبوط کررہا تھا۔ مصر سے باہر کوئی بھی اخوان کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ یہ کوئی خفیہ تنظیم تھی بلکہ اس لئے کہ یہ مصر کی اشرافیہ میں کم ہی لوگ اس سے جڑے تھے۔ اور بیرونی صحافت کو اس سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ بلکہ مقامی اخبار بھی اس کے متعلق کم ہی جانتے تھے اور بیرونی اخبار بالکل بھی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ اخبار اس کے بارے میں کیا اور کیوں شائع کرے؟ یہ زیادہ تر کام کاج والے ان غریبوں کی تنظیم تھی جو شہروں میں رہتے تھے اور بیرون سے آنے والے ان مزدوروں کی بھیڑ پر کم ہی توجہ دیتے تھے جو بوجھ اتارنے اور چڑھانے کا کام کرتے، خدمات مہیا کرتے اور ٹپس جو وہاں بخشش کہلاتی تھی کی بھیک مانگتے رہتے تھے۔

جیسے مغربیانے اور صنعت کاری کا عمل آگے بڑھا تو مصری شہری غریبوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور اس نتیجے میں اخوان کی سیاسی شناخت بھی بہت تیزی سے ابھرتی گئی۔ اور بتدریج ایک وبا کی طرح اس طرح پھیلی کہ جیسے چھوٹی سطح کی بغاوت کا آغاز ہوگیا ہو۔ سیکولرزم پر مغربی اثرات کے خلاف آگ بگولا مصری عوام اپنے جدیدیت پسند اشرافیہ کو برا بھلا کہتے۔ اپنی حکومت کے سخت خلاف اور اور عالم اسلام میں تمام قوم پرست حکمرانوں کے خلاف۔ بلکہ جمہوریت کے بھی ناقد کیونکہ اس میں مغربی قدروں کا اظہار ہوتا تھا۔

تیس کی دہائی کے آخر میں صورت حال یہ تھی کہ پوری مسلم دنیا کے سیکولر لیڈر چاہے وہ برسر اقتدار ہوں یا آزادی کی تحریک کے رہنما بنے ہوئے ہوں دو طرح کے دباؤ میں پھنس چکے تھے۔ یورپی سامراج انہیں اوپر سے سخت دباؤ میں تو رکھتا ہی تھا اسلام پسند متحرک گروہ انہیں اندر سے پریشان کیے ہوئے تھا سوال یہ تھا کہ اس صورتحال میں یہ رہنما کیا کرتے؟

اس طرح دباؤ کے دوران سیاست داں بالعموم یہ کرتے ہیں کہ اپنی حمایت بڑھانے کے لیے کسی ایسے جذباتی مسئلہ کی پناہ لیتے ہیں جو عوام میں مقبول ہو۔ اور اس طرح کے جذبات عام طور پر مذہب سے متعلق ہوتے

ہیں۔ لیکن مذہب جذبات کا ڈھیر تھا جسے سیکولر موڈرنسٹ استعمال نہ کر سکتے تھے کیونکہ اسی چیز سے تو وہ اپنے معاشرہ کو دور رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ اس کے بجائے انہوں نے دو دوسرے جھنڈے بلند کیے۔ ایک تو ترقی اور نشو و نما سے متعلق تھا جو مادّی خوش حالی کا ضامن تھی اور دوسرا قوم پرستی کا تھا جس کی وہ نمائندگی کر رہے تھے۔ مثلاً ایران میں پہلوی خاندان نے ایران کا تعلق قبل از اسلام ایران سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اسی طرح افغانستان میں نادر شاہ نے ہر کوشش کی کہ پشتو زبان کو قومی زبان تسلیم کر لیا جائے۔ حالانکہ پشتو بولنے والے اقلیت میں تھے۔ ہر جگہ قوم کے شاندار ماضی، اس کی عظیم ثقافت اور قابل فخر تاریخ کے باجے بجائے گئے۔

قومی جذبات کی کوئی کمی نہ تھی۔ اس وقت عالم وسطیٰ میں اس نام سے بہت کچھ اچھل کود ہو رہی تھی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اکثر قومی ریاستیں نئی تھیں یعنی اس سے قبل ان کا وجود نہ تھا۔ مثلاً افغانستان کو برطانیہ اور روس نے مل کر پیدا کیا تھا۔ کچھ عرصہ قبل تک ایران مختلف حصوں پر مشتمل ایک سلطنت تھی نہ کہ کوئی ملک۔ ترکی اس بنا پر ایک قومی ریاست تھی کہ اتاترک نے ایسا کہہ دیا تھا۔ رہا ہندوستان تو سوال یہ تھا کہ آغاز کہاں سے کریں؟

لیکن زیادہ مشکلات اس معاملہ میں عرب میں تھیں۔ دیکھتے ہیں کہ ایسا کیوں تھا؟ جنگ عظیم اوّل کے بعد فاتحین کی ایک میٹنگ فرانس کے مقام Versailles میں ہوئی مقصد یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اب دنیا کا نقشہ کیسا ہو۔ امریکہ کے صدر Woodrow Wilson نے اپنے ملک کی کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے نئی دنیا کے لیے چودہ نکاتی نقطہ نظر پیش کیا تھا جو ان لوگوں کو بڑا امید افزا لگا تھا جو استعمار کے تحت رہ رہے تھے اور ان کے ممالک کو کالونی بنا لیا گیا تھا۔ عربوں کے لیے اس میں سب سے بڑا اہم اور پر جوش نکتہ وہ تھا جس میں عوام کی خود حکمرانی کے حقوق کی بات کہی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ سب قابل احترام ہیں اور سب کے ساتھ صلح صفائی سے رہنا اور انہیں جگہ ملنا چاہیے۔ ولسن نے ایک غیر جانبدار League of Nations قائم کرنے کی بھی تجویز رکھی تھی جس کا کام بین الاقوامی مسائل میں فیصلہ کرنا اور انہیں نافذ کرانا تھا۔ ان مسائل کی ایک مثال ان عربوں کا مسئلہ تھا جو ماضی کی عثمانی سلطنت میں رہتے تھے۔ Versailles میں صلح کاروں کا کام اسی نوع کی ایک تنظیم کی تشکیل تھا۔

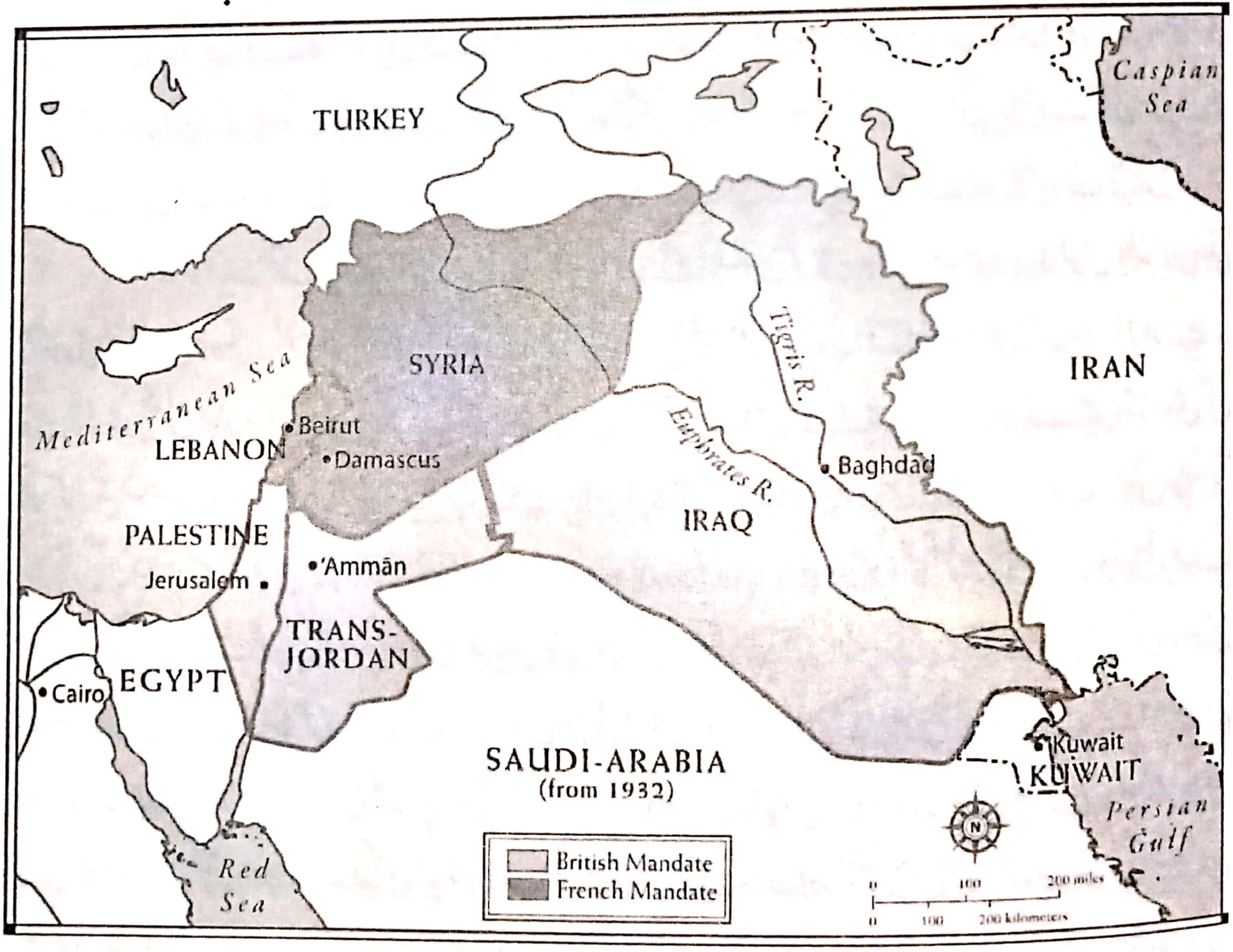
لیکن انتہائی حیرت اس وقت ہوئی جب اس تنظیم میں امریکہ نے شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ لیگ جب بن گئی تو یوروپ کے فاتحین نے اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً لیگ نے اس فیصلہ کی توثیق کی کہ عربوں کو خود حکمرانی کا حق ملنا چاہیے۔ لیکن عملاً انہوں نے Sykes-Picot معاہدہ کے تحت اس علاقہ کو برطانیہ اور فرانس میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم کی دستاویز میں اس علاقہ کو وہ Territories کہا گیا جو ایسے لوگوں سے آباد ہیں جو دنیا کے سخت حالات میں اپنے طور پر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی ذمہ داری اور سرپرستی ان لوگوں کو دی جائے جو اپنے تجربہ کی بنیاد پر ذمہ داری اٹھا سکتے ہیں"۔ مختصر یہ کہ "عرب ابھی بچے تھے اور یوروپ کے لوگ پختہ تھے اور یہ ذمہ داریاں اس وقت تک نبھائی جائیں گی جب تک بچے بڑے نہ ہو

جائیں اور اپنا انتظام خود نہ کر سکیں۔ یہ الفاظ ان لوگوں کے لیے استعمال کئے گئے جو تاریخ کا مسلم بیانیہ اگر اب بھی کارفرما ہوتا تو انہیں خود تہذیب کے معمار کی حیثیت میں قابل احترام ٹھہراتا۔ جواب بھی اپنے بارے میں یہی تصور رکھتے تھے۔[۲]

فرانس کو شام اور شرق اوسط میں باقی سب کچھ برطانیہ کو مل گیا۔ فرانس نے اپنے حصہ کے دو ٹکڑے کیے ایک سیریا اور دوسرا لبنان۔ لبنان ایک مصنوعی ملک تھا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس علاقے میں موجود عیسائیوں کو عددی برتری حاصل ہو جائے۔ ان عیسائیوں کو فرانس اپنی خصوصی آسامی سمجھتا تھا۔

برطانیہ عظمٰی کو بھی اپنی آسامیوں کو مطمئن کرنا تھا ان میں مکّہ کا ہاشمی خاندان تھا جس نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر کے برطانیہ کی بڑی مدد کی تھی۔ چنانچہ عثمانی دور کے تین صوبوں کو ملا کر ایک ملک عراق کی تشکیل کی گئی اور ہاشمیوں میں سے ایک کو اس کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ یہ خوش قسمت آدمی فیصل تھا یعنی شریف مکہ کا دوسرا بیٹا۔

فیصل کا ایک بڑا بھائی عبداللہ تھا کیونکہ یہ مناسب نہیں لگتا تھا کہ چھوٹا بھائی ایک پورے ملک کا مالک



عالم عرب کی تقسیم کا فرمان

ہو اور بڑے بھائی کو کچھ نہ ملے۔ چنانچہ اس بھائی کیلئے بھی برطانوی جاگیر سے ایک ملک نکالا گیا اور اس کا نام اُردن رکھ دیا گیا۔

لیکن بدقسمتی سے ان دونوں بیٹوں کے باپ کے پاس کچھ نہ تھا کیونکہ ۱۹۲۴ء میں برطانیہ کی دوسری

آسامی عبدالعزیز ابن سعود نے کچھ مذہبی لڑاکوں کی مدد سے مکہ فتح کرلیا تھا۔ ارض مقدس پر قبضہ کیا اور بوڑھے سردار اور قبیلہ کو نکال باہر کیا۔ ابن سعود نے جزیرہ نما کا کوئی ۸۰ فیصد علاقہ فتح کرلیا۔ صرف یمن، عمان اور کچھ ساحلی چھوٹی امارات ان سے باہر رہیں۔

یوروپی قوتوں نے اسے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ اس کے پاس بھی کچھ وعدے موجود تھے۔ IOUs تھیں۔ ابن سعود نے اپنے قبضے والے علاقے کو ۱۹۳۲ء میں ایک نیا خودمختار ملک بنام سعودی عربیہ کا اعلان کردیا۔

اس دوران برطانیہ عظمیٰ خود اپنی خدا ترسیوں کا شکار ہوا اور مصر کی آزادی، مقتدر اعلیٰ اور خودمختاری کا اعلان کردیا۔ البتہ بعض شرائط لگا دیں۔ پہلی یہ تھی کہ مصریوں کو اختیار نہ ہوگا کہ وہ اپنی طرز حکومت تبدیل کریں یعنی بادشاہت باقی رہے گی۔ دوسری یہ کہ مصریوں کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ وہ اپنے واقعی حکمرانوں کو تبدیل کرسکیں یعنی ان کا موجودہ شاہی خاندان برقرار رہنا چاہیے، تیسرا یہ کہ مصر میں برطانوی قومیں برقرار رہیں گی اور ان کی زمین پر فوجی اڈے قائم رہیں گے۔ اور چوتھی یہ کہ مصریوں کا نہر سوئز پر کوئی حق نہ ہوگا اور انہیں بغیر کسی احتجاج کے یہ ان کے سپرد کردینی چاہیے۔ پانچویں شرط یہ تھی کہ برطانیہ اور فرانس پر مشتمل پرائیوٹ کمپنی سویز کے مصروف ترین سمندری راستے سے آنے والی فیس اکٹھا کرتی رہے گی اور اس کے بڑے حصہ کو یورپ بھیجے گی۔

مصر کو ایک منتخب پارلیامنٹ ملے گی لیکن اس کے فیصلوں کو قاہرہ میں موجود برطانوی افسروں کی منظوری ضروری ہوگی۔ بس ان نکتوں کو چھوڑ کر مصر مکمل طور پر خودمختار ہے۔ اقتدار اعلیٰ کا مالک اور آزاد ہے۔ بہت جلد اور مکمل طور پر آزادی کی تحریک چل پڑی برطانیہ سخت ناراض تھا کیونکہ ایک آزاد ملک میں آزادی کی تحریک کی ضرورت کیا تھی۔ کیا انہیں یہ تحریر ملی نہیں۔ بظاہر ایسا ہی لگتا تھا۔

شام میں فرانس کو کچھ مخالفت کا سامنا ہوا۔ سوبورن (Sorbonne) کا تعلیم یافتہ ایک عیسائی عرب مصنف مائیکل افلاک عرب قوم پرستی کی نظریاتی بنیادوں پر کام کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ عربی جن کی مادری زبان ہے ان میں ایک خاص روح ہے۔ یہ روح عربی زبان اور اس علاقہ کی تاریخ کا مرکب ہے۔ انیسویں صدی کے یورپ میں جس طرح قوم پرست تحریکیں اٹھیں اور اس بنیاد پر انہوں نے قومی حکومتیں قائم کیں اسی طرح کا مطالبہ مائیکل افلاک نے بھی کیا کہ عرب اقوام کی بھی ایک واحد اور مستقل قومی ریاست ہونا چاہیے جس پر عربوں ہی کی حکومت ہو۔

افلاک حالانکہ عیسائی تھا لیکن اس نے عرب ازم کے تصور میں اسلام کو مرکزی اہمیت دی۔ البتہ یہ اہمیت تاریخی اعتبار سے تھی۔ اس نے کہا کہ اسلام نے عربی روح کو تاریخ کے ایک لمحہ میں بیدار کیا تھا اور آفاقی سطح پر عدل وارتقاء کے عمل میں اس نے قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔ چنانچہ ہر عرب کو، وہ چاہے کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو، اسلام کا احترام کرے۔ کیونکہ یہ عربی روح کی پیداوار تھا۔ اصل اہمیت عربی روح کی ہے نہ کہ

اسلام کی۔ ہماری کوشش یہ ہو کہ ہم اس کو بیدار کریں اور یہ بیداری اسلام میں نہیں بلکہ عرب قوم میں تلاش کریں۔ افلاک ایک سخت سیکولر اور جدیدیت کا حامل شخص تھا۔ ۱۹۴۰ء میں اس نے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر اپنے وژن کی بارآوری کے لیے ایک سیاسی جماعت کی تشکیل کی تھی جسے انہوں نے 'بعث' یعنی ''پیدائش نو پارٹی'' کا نام دیا تھا۔

یورپی فرمان کے مطابق چار ممالک کی نقشہ گری ہو چکی تھی۔ پانچواں ملک آزادانہ طور پر ابھرا اور یوں مصر کو نام نہاد آزادی دے دی گئی۔ لیکن ایک مسئلہ لاینحل تھا کہ فلسطین کا کیا کیا جائے۔ خود حکومتی کا اصول تو یہ کہتا تھا کہ فلسطین کو اسی طرح ایک آزاد ملک کی حیثیت ملے اور حکمرانی بھی۔ لیکن یہاں سوال یہ تھا کہ خود حکومتی کا تصور یہاں کیسے نافذ ہو یعنی اس علاقہ میں خود سے مراد کیا ہے۔ کیا صدیوں سے آباد عرب جو آبادی کا ۹۰ فیصد ہیں یا یہودی جن کی اکثریت یورپ سے آ کر یہاں آباد ہوئی تھی اور وہ بھی کوئی دو دہے قبل۔ البتہ کوئی دو ہزار سال قبل ان کے آباواجداد اس علاقے میں آباد تھے۔ یہ سوال خاصا مشکل تھا۔

عربوں کے لیے یہ سوال واضح تھا کہ ایک اور عرب ملک کا اضافہ ہو۔ یورپ سے آئے ہوئے یہودیوں کے لیے بھی یہ سوال واضح تھا۔ قانونی طور پر کچھ بھی ہو زمین کا یہ قطعہ یہودیوں کو ملنا چاہیے کیونکہ وہ بے گھر ہیں کوئی ان کا وطن نہیں ہے۔ مزید یہ کہ انھیں صرف فلسطین ہی کو اپنا علاقہ کہنے میں کچھ معنویت ہے۔ برطانیہ کے علاوہ بالفور نے ان سے ایک یادگار وعدہ بھی کر رکھا تھا۔

برطانیہ نے اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ بلکہ آنے والے واقعات پر چھوڑ آیئے، دیکھیں کہ کیا ہوا۔

ایک دل چسپ پہلو یہ ہے سیکولر موڈرنسٹ کس طرح قوم پرستی کے تصور کے تحت غیر واضح بلکہ مشکوک قومیتوں کو متحد رکھ سکے جب کہ خود ان کے یہاں ایسی آوازیں اٹھ رہی تھیں جن میں جغرافیائی اور نسلی امتیازات کے پرے ایک عرب قوم کے تصور کو ابھارا جا رہا تھا۔ اور دوسری طرف وہابی اور اسلام پسند کہتے تھے کہ نسلی تشخص اور قوم پرستی کی سیاست جائے جہنم میں ہم تو مسلمان ہیں اس لیے خلافت قائم کریں گے۔

اس صورت حال میں سیکولر موڈرنسٹ کی کامیابی کا انحصار دو چیزوں پر تھا۔ کیونکہ یہ لوگ ترقی و نشوونمائی کا جھنڈا اٹھائے پھرتے تھے اس لیے ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ یہ کر کے دکھائیں اور عوام کو کچھ ملتا ہوا نظر آئے یعنی اس کے نتیجے میں انہیں ترقی اور خوش حالی حاصل ہو۔ دوسری چیز یہ تھی کہ انہوں نے آزادی کی پوری جدوجہد قوم پرستی کی بنیاد پر کی تھی۔ اس لیے انہیں واقعی اور مکمل آزادی اپنی قوم کو دینی چاہیے تھی۔

پہلی جنگ عظیم کے کئی دہائیوں بعد بھی وہ اپنے اس مقصد کو حاصل ہوتا ہوا نہ دیکھ سکے۔ ان کی ناکامی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ صدر ولسن کی چودہ نکاتی بیان بازی کے باوجود اس کا کوئی امکان نہ تھا کہ مغربی طاقتیں مسلم دنیا پر اپنی گرفت کو ڈھیلا کریں گی۔

اس کا کوئی بھی امکان یوں نہ تھا کہ اس وقت ہر مغربی طاقت دوسری طاقت کو صنعت کاری کے میدان

میں پیچھے چھوڑنا چاہتی تھی۔ مغربی طاقتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں تباہی و بربادی سے بھی گریز کرنے کو تیار نہ تھیں۔ اس سلسلہ میں جو نظریات ان کی معاونت کر رہے تھے ان میں کمیونزم، فاشزم، نازی ازم، جمہوریت شامل تھے۔ مفادات واضح اور صاف تھے۔ اور فتح کا انحصار صنعتی طاقت پر تھا جس کا انحصار پیٹرولیم پر تھا اور دنیا کے پیٹرول کا بڑا حصہ اس زمین کے نیچے تھا جس میں مسلمان آباد تھے۔

پیٹرول کا پہلا ذخیرہ انیسویں صدی کے آخر میں پنسلوانیا اور کنیڈا میں دریافت ہوا تھا لیکن اس وقت ان دریافتوں پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی کیونکہ اس زمانے میں پیٹرول بس اس لیے اہم تھا کہ اس سے مٹی کا تیل ملتا تھا۔ جو صرف روشنی کرنے کے کام آسکتا تھا۔ حالانکہ اس زمانہ میں عام لوگ وہیل مچھلی کے تیل کو اس مقصد کے لیے زیادہ استعمال کرتے تھے۔

۱۹۰۱ء میں ایران میں بڑا آئل فیلڈ دریافت ہوا جو ایک برطانوی متلاشی William Knox D'Arcy کو ملا تھا۔ اس نے فوراً ہی قاجار بادشاہ سے تیل نکالنے کے مکمل اختیارات ایک کیش رقم کے عوض خرید لیے۔ یہ رقم پوری کی پوری بادشاہ کی جیب میں گئی اور ۱۶ فیصد رائلٹی ایرانی تیل کی فروخت سے ہونے والے منافع پر حکومت کو بعد میں ادا کی جاتی۔ یہاں یہ قابل ذکر ہے کہ یہ رائلٹی تیل کی مقدار پر نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ D'Arcy نے حکومت کو آمدنی کی کوئی گارنٹی نہیں دی کہ ایران کو تیل سے کتنی آمدنی ہوگی۔

وہ کیسا بادشاہ رہا ہوگا جو اپنے ملک کی تمام معلوم اور نا معلوم معدنیات ایک سیلانی کو کچھ کیش کے عوض فروخت کردے گا اور پھر ایسے بادشاہ کو وہاں کے عوام آخر کیوں نہ اٹھا پھینکیں۔ اس کا پہلا جواب ہے روایات۔ یعنی قاجار بادشاہ گزشتہ کوئی سو سالوں سے یہ حرکتیں کرتے رہے تھے۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ بادشاہ کے خلاف تمبا کو تحریک ابھی کچھ عرصہ قبل ہی ختم ہوئی تھی اور عوامی جدو جہد کی بنا پر بادشاہ کا یہ معاہدہ بے کار ہو گیا تھا جو برطانیہ کے مفاد میں کیا گیا تھا۔ یہ جدو جہد زبردست تھی اور ظاہر ہے کہ عوام تھک گئے تھے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ تیل اس وقت تک بہت اہم دریافت نہیں مانی گئی تھی۔ یہ تو اس وقت تمبا کو جیسا بھی نہیں تھا بلکہ وہیل مچھلی کے تیل سے بھی فروتر تھا۔ ایک چوتھی وجہ بھی تھی کہ اس وقت کارکنان اپنے ملک میں ایک دستور اور پارلیمان کے لیے کوشاں تھے۔ پوری جدو جہد اسی کے لئے وقف تھی۔ چنانچہ تیل کا معاہدہ متوجہ ہی نہ کر سکا۔

اس وقت جب ایران اپنا تیل تحفتاً دے رہا تھا تیل کی اہمیت اسے زمین سے آسمان پر پہنچانے ہی والی تھی۔ کیونکہ اسی دوران Intrernal Combustion Engine کی نئی دریافت ہوئی تھی۔ External Combustion Engine مثلاً اسٹیم انجن ابھی ایسی چیز سے چلائے جاتے تھے جو جلتی ہو۔ لیکن یہ نئی دریافت یعنی Intrernal Combustion Engine صرف صاف ستھرے پیٹرول ہی کی بدولت چل سکتی تھی۔

۱۸۸۰ء کی دہائی میں ایک جرمن موجد نے اس طرح کے انجن کو ٹرائی سائیکل چلانے میں استعمال کیا

تھا۔ ٹرائی سائیکل نے ترقی کر کے ایک کار کی شکل اختیار کر لی اور ۱۹۰۴ء تک کاریں مقبول ہونے لگی تھیں اور یورپ اور امریکہ میں اتنی مقبول ہو رہی تھیں کہ پرانی سڑکوں کی جگہ ان کے لیے نئی سڑکیں تعمیر کی جانے لگی تھیں۔ اس کے کچھ ہی دن بعد ٹرینیں بھی تیل سے چلنے لگیں۔ ۱۹۰۳ء میں ہوائی جہاز بھی بنا لیا گیا اور پھر سمندروں میں چلنے والے جہاز بھی تیل سے چلنے لگے۔

پہلی جنگ عظیم میں ٹینک پہلی بار استعمال ہوئے۔ پہلی بار تیل کی قوت سے لیس سمندری افواج اور پہلا ہوائی جہاز جس نے ایٹم بم پھینکا تھا بھی تیل کی بدولت تھا۔ جنگ ختم ہوئی تو تیل کی اہمیت اتنی بڑھ چکی تھی کہ کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ پیٹرولیم سے چلنے والی جنگ کی مشینری بہت تیزی سے ترقی کرے گی اور جو بھی دنیا کے تیل پر قابض ہوگا گویا دنیا پر قابض ہوگا۔

لیکن ایران پر یہ حقیقت بہت دیر میں واضح ہوئی۔ William D"Archy اپنا مراعات شدہ ایرانی لائسنس پہلے ہی کسی برطانوی کمپنی کو فروخت کر چکا تھا (یہ برطانوی کمپنی آج بھی Birtish Petrolium (BP) کے نام سے موجود ہے۔ ۱۹۲۳ء تک ونسٹن چرچل کے مطابق برطانیہ کو ایرانی تیل سے چالیس ملین پاؤنڈ کا منافع ہوا جب کہ خود ایران کو محض دو ملین ملے تھے۔[۳]

اس دوران برطانوی کمپنی اور Royal Dutch Shall اور بعض امریکیوں نے مل کر ایک بہت بڑی کمپنی Turkish Petrolium Company کی بنیاد رکھی جس کا مقصد سلطنت عثمانیہ کے صوبوں میں تیل کی تلاش تھی اور خاص طور سے ان صوبوں میں جو خلیج فارس سے ملحق تھے۔ جب یہ بڑی کمپنی کھدائی کے لیے تیار ہوگئی تو یہ علاقہ برطانوی اختیار میں تھا۔ اس وقت ہی برطانیہ نے عراق کو ہاشمی خاندان کے اقتدار میں دے دیا۔ چنانچہ فوراً ہی تیل کے کنسورٹیم نے شاہ فیصل سے گفت وشنید کی اور شاہ نے بڑی خوشی کے ساتھ عراقی تیل پر مکمل اجارہ داری اس کمپنی کو دے دی۔ جب گفت وشنید چل رہی تھی تو عراقیوں کو توقع تھی کہ کم از کم ۲۰ فیصد ایکیوٹی شیئرس انہیں کمپنی میں دیئے جائیں گے۔ لیکن وہ صفر فیصد حصص پر راضی ہو گئے۔ جس کے تبادلہ میں فی ٹن تیل پر کچھ فیس ملتی۔ ظاہر ہے کہ اس فیس کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا کہ وہ تیل کو کس نرخ پر فروخت کریں گے یا کمپنی کا منافع کتنا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ یہ شرائط معاہدہ کے ابتدائی بیس سال کے لیے تھیں۔ کمپنی کی ایکیوٹی یورپی طاقتوں اور امریکہ میں تقسیم ہوگی اور اس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا تو وہ اس پر تھا کہ کس ملک کو کتنا حصہ ملے گا۔ ۱۹۲۷ء میں جب یہ تمام مسائل طے کیئے جا چکے تو کمپنی نے عراق کے وسیع وعریض تیل کے میدانوں سے پہلا میدان دریافت کیا۔[۴]

نو سال بعد عبدالعزیز بن سعود نے اپنی سرزمین میں تیل کی دریافت کا جشن منایا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سعودی عرب میں دنیا کے سب سے زیادہ تیل کے ذخائر موجود ہیں۔ سعودیوں نے اپنے میدان سے تیل نکالنا شروع ہی کیا تھا کہ دوسری جنگ عظیم برپا ہوگئی جس کے نتیجہ میں تیل کی اہمیت اور اس کی قیمتیں کہیں سے

کہیں پہنچ گئیں۔ جنگ کے دوران ہی امریکی صدر Franklin Delano Roosevelt نے ابن سعود سے ملاقات کی اور دونوں نے ایک معاہدہ پر اتفاق کر لیا جس پر وہ آج تک پوری ایمانداری سے قائم ہیں، حالانکہ یہ معاہدہ کسی سرکاری معاہدہ کی شکل میں اپنا وجود نہیں رکھتا۔ اس معاہدہ کی رو سے امریکہ کو سعودی تیل کے ذخائر تک بلا روک ٹوک رسائی حاصل ہے جس کے نتیجہ میں سعودی شاہی خاندان کو وہ تمام ہتھیار ملیں گے جن کی سعودی حکمرانوں کو اقتدار میں رہنے کے لئے ضرورت ہوگی۔ اس طرح اس معاہدہ میں نہ صرف سعودی بلکہ وہابی منتظمہ بھی شامل تھی۔ بالواسطہ طور پر ریاستہائے متحدہ امریکہ اور وہابی تحریک کی اس مفاہمت کے نتیجہ میں امریکی فوج وہابی اصلاحی تحریک کی بھی گارنٹی اور ضمانت دے رہی تھی۔ اور دوسری جنگ عظیم کے آغاز تک وہابی اور دارالاسلام کی دوسری اسلامی تحریکیں سیکولر موڈرنسٹ پر مکمل حملہ کی تیاری کر رہے تھے۔

باب : ۱۶

جدیدیت کا انتشار

(۱۳۵۷ تا ۱۳۸۵ھ ۱۹۳۹ تا ۱۹۹۴ء)

تاریخ کی بدترین خونریزی جیسے خون کا لاوا پھٹ پڑا ہو ۱۹۳۹ء میں شروع ہو کر کوئی چھ طویل سالوں تک چلتی رہی جس میں ایک بار پھر جرمنی، فرانس اور برطانیہ سے نبرد آزما تھا۔ ایک بار پھر امریکہ دیر سے شامل ہوا اور نتیجہ تک پہنچنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ یقیناً اس بار کچھ نقشہ بدل گیا۔ روس اب سوویت یونین بن چکا تھا لیکن آخر میں خون کی ہولی وہیں رکی جہاں سے جنگ عظیم اول میں آغاز ہوا تھا۔ پرانی سامراجی سلطنتیں ضرب کاری کا شکار ہوئیں اور طاقت کے پرانے گٹھ جوڑ فرسودہ ہو گئے۔ برطانیہ جنگ سے باہر آیا تو بھوکوں مر رہا تھا۔ فرانس تباہ ہو چکا تھا۔ جرمنی تباہ ہو کر منقسم ہو چکا تھا۔ توپوں اور گولیوں کی گھن گرج بند ہوئی تو دیکھنے میں آیا کہ دو سپر پاور پورے گلوب پر سوار ہو چکی ہیں اور دونوں جلد ہی ان تھرمونیوکلیر ہتھیاروں سے لیس ہو رہی تھیں جو پوری انسانی نسل کو ختم کر سکتے تھے۔ دنیا کی تاریخ کا اگلا باب ان دو طاقتوں کی مقابلہ آرائی ہی سے عبارت ہے۔

تاریخ کے دونوں بیانیے دو قطبی سرد جنگ کی جدوجہد کے نیچے دبے ہوئے جاری رہے جس میں اسلام بطور عالمی تاریخی بیانیہ بھی شامل تھا۔ آزادی کی بھوک جو جنگ کے زمانہ میں تمام کالونیوں، مسلم یا غیر مسلم، میں پیدا ہو چکی تھی اب نقطۂ ابال تک پہنچ رہی تھیں مصری فوجی افسروں میں باغیانہ تیور نظر آرہے تھے۔ چین میں چیانگ کائی شیک کی حکومت کے خلاف ماؤزے تنگ کی کمیونسٹ بغاوت شروع ہو چکی تھی کیونکہ چیانگ کائی شیک کے بارے میں تصور یہ تھا کہ وہ مغرب کی کٹھ پتلی ہے۔ ویتنام میں ہوچی منہ جو اپنی تیس سالہ جلاوطنی سے ویٹ منہ (Viet Minh) منظّم کرنے کے لیے واپس آچکے تھے فرانسیسیوں پر حملہ آور ہوئے۔ انڈونیشیا میں سوئیکارنو نے اپنے ملک کو ڈچ کی غلامی سے آزادی کا اعلان کر دیا۔ پوری دنیا میں قومی آزادی کی تحریکیں کھر پتوار کی طرح پیدا ہو گئی تھیں اور مسلم ممالک کی یہ تحریکیں ایسی ہی تھیں جیسی غیر مسلم ممالک میں۔ کچھ اور بھی ہو رہا تھا لیکن یہ واضح تھا کہ اسلامی بیانیہ اب غیر مسلم بیانیہ کے ان پہلوؤں سے مل رہا تھا جو مشترک تھے۔

جغرافیائی اعتبار سے بہت سی قومیں جو آزادی کی جدوجہد کر رہی تھیں ان کی سرحدیں سامراجی قوموں نے طے کی تھیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو ان قوموں کی یہ جدوجہد دراصل یورپیوں کی طرف سے شروع ہوئی تھی۔ افریقہ میں سب صحارا کے علاقہ میں شاہ بیلجیم نے جتنا حصّہ بھی فتح کر لیا تھا وہ کانگو کہلایا (بعد میں اس کا نام زائر ہو گیا)۔ جرمنی نے جتنا علاقہ فتح کیا وہ کیمرون کہلایا۔ اسی طرح برطانیہ نے مشرقی افریقہ اور کینیا فتح کیے تھے۔ جن علاقوں کو نائجیریا کا نام دیا گیا ان میں کوئی دو سو نسلیں بسی ہوئی تھیں جو پانچ سو سے زیادہ زبانیں بولتی

تھیں جن میں ایسی بہت سی تھیں جو آپس میں سمجھ میں بھی نہ آتی تھیں۔ لیکن کیونکہ دنیا اب ملکوں سے پہچانی جاتی تھی اس لیے ان کو بھی اب ملک کے بندھنوں میں بندھنا ضروری ہو گیا۔ نائجیریا کا نقشہ اور اس کا رقبہ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اسے کالونی بنانے والی یورپی طاقتوں کے درمیان خاصی کشاکش رہی ہوگی۔

شمالی افریقہ میں قومی آزادی کے راہنماؤں نے الجیریا، ٹیونیشیا اور لیبیا کو علیحدہ ملک کے بطور تسلیم کرلیا۔ ان کی آزادی کی تحریکیں ہر ملک کی جغرافیائی حدود تک ہی محدود تھیں تینوں تحریکیں بالآخر کامیاب تو ہوئیں لیکن بہت بڑی قیمت چکا کر۔ الجیریا کی فرانس سے آزادی کی آٹھ سالہ جدوجہد میں ایک ملین لوگ لقمہ اجل بنے۔ کل آبادی اس وقت نو ملین تھی کتنی بھیانک جدوجہد رہی ہوگی۔[1]

مسلمانوں کے غلبہ کے دوران جو مسائل پائے جاتے تھے آزادی کے بعد بھی یہاں وہاں ان کی بازگشت سنی جاتی رہی۔ لیکن مسلم بیانیہ کا بڑا ہی ڈرامائی اظہار برصغیر ہندوستان میں ہوا۔ سب سے بڑی اور ہر اعتبار سے مکمل کالونی نے آزادی حاصل کی۔ جنگ سے پہلے ہی اس نئے ملک نے برطانوی سامراج سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد کی تھی۔ ایک عظیم تر قومی آزادی کی تحریک میں ایک دوسری قومی تحریک پیدا ہو چکی تھی جس نے مسلم اقلیت کے لیے ایک علیحدہ ملک کا دعویٰ کر دیا تھا۔ بالکل جس لمحہ انڈیا وجود میں آیا (۱۵ راگست ۱۹۴۷ء) اس وقت ہی ایک بالکل نیا دو لختی ملک وجود میں آیا بالکل ایسا جیسے گھوڑے کی زین پر دو خُرجیاں لٹکی ہوں۔ یعنی ہندوستان کے مشرق و مغرب میں اس نو زائدہ ملک کے دو حصے۔ اس تقسیم نے برصغیر میں زبردست خوف و ہراس کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں رفیوجیز کا ایک سیلاب سرحدوں کے آرپار اپنے ہم مذہبوں کے پاس ممکنہ حفاظت کی خاطر حرکت پذیر ہوا۔ اس بلاخیزی کے دوران محض چند ہفتوں کے اندر لاکھوں لوگ ذبح کر دیے گئے۔ لاتعداد بے گھر ہوئے لیکن اس شدید ضرب کے باوجود تقسیم نے جو مسائل پیدا کیے ان کا حل نہ نکل سکا۔ مثلاً کشمیر ایک کھلونا بنا رہا۔ غالب مسلم اکثریت کے اس علاقہ کا بادشاہ علیحدہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ کشمیر کدھر جائے ہندوستان کی طرف یا پاکستان کی طرف۔ برطانیہ کا فیصلہ تھا کہ دیکھیں کہ وقت کیا دکھاتا ہے۔ چنانچہ یہ مسئلہ آج تک حل طلب ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد صرف یہی نہیں ہوا کہ کالونیاں ختم کی جانے لگیں بلکہ قومی حکومتوں کا تصور غالب ہونے لگا۔ گو کہ اس وقت ملکوں کی شکل میں دنیا تقسیم ہوئے کوئی سو سال ہی ہوئے ہوں گے لیکن ۱۹۴۵ء سے ۱۹۷۵ء کے دوران کوئی سو مزید ممالک پیدا ہو گئے اور زمین کا ایک ایک انچ کسی نہ کسی قوم کی ملکیت ٹھہرا۔[2]

بدقسمتی سے ''قوم پرستی'' بطور ''تصور'' اور بطور ''حقیقت'' میں بس کسی حد تک ہی مماثلت باقی رہی۔ بہت سے قیاس کردہ ممالک کی سرحدوں میں متعدد چھوٹے چھوٹے ممالک کو ٹھونس دیا گیا جن میں ایسی نسلی اقلیتیں آباد تھیں جن کی خواہش تھی کہ وہ بھی آزاد ہوں اور ان کی بھی اپنی حکومتیں ہوں۔ ایسا بھی ہوا کہ سرحدوں کے پار لوگ یہ سوچتے رہے کہ ہمیں ایک ساتھ ہی ہونا چاہیے تھا۔ ترکی، عراق اور شام ایک ایسے علاقے کو کاٹ کر بنائے گئے جہاں کے لوگ نہ تو عربی بولتے اور نہ ہی ترکی بلکہ 'کرد' زبان بولتے ہیں جو فارسی زبان سے خاصی دور جا کر ہم رشتہ ہو جاتی ہے اور فطری طور پر ان کردوں کا یہ احساس تھا کہ انہیں کسی ایک ملک کا حصہ ہونا چاہیے تھا جو ان تینوں میں سے کوئی بھی نہ تھا۔

بعض علاقوں میں ایک علیحدہ ملک کی حیثیت میں ان کا وجود سوالیہ نشان بنا رہا۔ چنانچہ عراق، لبنان اور اردن ابھی تک مستحکم نہ ہوئے تھے۔ سرحدیں موجود تھیں، حکومتیں بھی مختلف تھیں۔ لیکن کیا ان کے عوام خود کو کوئی علیحدہ قوم سمجھتے تھے؟ یہ واضح نہیں تھا۔

صدر امریکہ oodrow Wilson کے چودہ نکاتی بیان کے بعد عالم عرب میں خود حکومتی کا تصور بڑی تیزی سے ابھرا تھا۔ لیکن یہ خاصا پیچیدہ تصور تھا۔ لفظ 'خود' سے مراد وہ جسے تمام ارکان نے تسلیم کر لیا ہو۔ جہاں جہاں عرب آباد تھے وہاں کی قوم پرست حکومتوں کو مضبوط کرنے کی بھرپور کوشش کی جا رہی تھی۔ جیسے لیبیا، ٹیونیشیا، شام اور مصر۔ لیکن سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ ان میں بڑا 'خود' کون ہے۔ کیا یہاں کوئی شامی قوم موجود تھی؟ یہ سب کو معلوم ہے کہ نقشہ پر شام کا ملک یورپیوں نے پیدا کیا تھا۔ کیا کوئی اردنی قوم ہو سکتی ہے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ جو لوگ عراق میں رہتے ہیں ان کی حکمرانی اس وقت تک ہی قائم ہے جب تک ان کے حکمراں عربی بولتے رہیں گے؟

لیکن سب سے اہم علاقہ جہاں قوم پرستی کے تصور اور قومی ریاست کی حقیقت میں اختلاف پیدا ہو رہا تھا وہ فلسطین کا علاقہ تھا۔ جو بہت جلد اسرائیل کی شکل اختیار کرنے والا تھا۔ جنگ عظیم دوئم سے قبل اور اس کے بعد بھی نازیوں نے پورے یورپ سے جس طرح یہودیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی تو صہیونیوں کے مہلک ترین خدشات صحیح ثابت ہونے لگے تھے اور ویسے بھی یورپ میں یہودی مخالف صرف نازی ہی نہ تھے بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ دوسری بہت سی آوازوں میں ان کی آواز سب سے بلند اور کریہہ ترین تھی۔ ان خطرات کے پیش نظر یہودیوں کے لیے ایک ملک اور وطن کو اخلاقی جواز مل رہا تھا۔ اٹلی کے فاشسٹوں نے وہاں کے یہودیوں پر شدید ترین مظالم ڈھائے۔ فرانس پر جرمنی نے جو کٹھ پتلی حکومت قائم کی تھی اس نے جرمنی کی خواہش پر وہاں کے یہودیوں کو شکار کیا۔ پولش اور دوسری مشرق یورپی اقوام نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ یہودیوں کے موت کے کیمپ چلانے میں مدد کی۔ برطانیہ عظمیٰ کا یہودیوں کے خلاف اپنا کردار تھا۔ اسپین، بیلجیم بلکہ یورپ کا کوئی بھی ملک یہودیوں کے خلاف انتہائی گھناونے جرائم کے بارے میں معصومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ لاکھوں یہودی یورپ میں پھنس کر رہ گئے اور وہیں کام آئے۔ اور جو بچے وہ جہاں بھی کھلا راستہ نظر آیا بھاگ کھڑے ہوئے۔ کشتیوں سے بھرے یہودی دنیا کے سمندروں کی طرف بڑھتے ہوئے جائے قیام کے متلاشی! لیکن خود امریکہ نے یہودی مہاجرین کے لیے ایک کوٹا مقرر کر دیا۔ مطلب صرف یہ نہ تھا کہ ایک واحد ملک آخر کس طرح ایک ہی گروہ کے مہاجروں کو اپنے یہاں جگہ دے بلکہ اس امریکی پالیسی میں یہودیوں کی مخالفت کے اثرات بھی موجود تھے۔

ایک جگہ جہاں یہودی بھر سکتے تھے وہ فلسطین تھی۔ وہاں پہلے آنے والے مہاجرین نے زمینیں خرید کر آبادیاں قائم کر رکھی تھیں اور آبادی کے لیے ضروری سامان اور ضروریات بھی مہیا کر رکھی تھیں۔ محفوظ رہنے کی امید کے ساتھ رفیوجیز نے فلسطین کی سمت رخ کیا اور تمام مشکلات کا شجاعت اور بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے ایک نئی قوم کی تعمیر کے لئے اپنے پرکھوں کی سرزمین میں آ کر بسنے لگے۔ یہودیوں کی طرف کی کہانی کچھ اسی طرح تھی۔

عربوں کی طرف سے کہانی کچھ مختلف تھی۔ ایک عرصہ سے عرب بیرون سے آنے والوں کے دوتہی غلبہ

میں زندگی بسر کرتے رہے تھے۔ پہلی تہہ ترکوں کی تھی اور دوسری ترکوں کے یورپی آقاؤں کی پھر پہلی عالمی جنگ کے دوران امریکی صدر کے چودہ نکاتی پروگرام کے تصور خود حکومتی کے باوجود ان کے علاقہ میں نوآبادکار یورپی بڑی تعداد میں آکر بستے رہے جن کا نعرہ تھا ''آبادی سے خالی علاقہ ان لوگوں کے لیے جن کے پاس علاقہ نہیں''۔[۳] یہ بڑا چونکا دینے والا نعرہ تھا خاص طور پر ان لوگوں کے لئے جو اس علاقے میں آباد تھے ''جو انسانوں سے خالی تھا''۔

یورپ سے آنے والے ان مہاجروں نے زبردستی زمینوں پر قبضہ نہیں کیا بلکہ جہاں وہ آباد ہوئے ان زمینوں کو انہوں نے خریدا تھا۔ بلکہ ان مالکوں سے خریدا تھا جو موجود نہیں تھے۔ اور اس طرح وہ مقامی بے زمین کسانوں کے درمیان رہنے لگے اور یوں مقامی لوگوں کو اپنی بے دخلی کا دوگنا احساس ہوا جب انہوں نے غیروں کو اپنے درمیان رہتے دیکھا۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے اور بعد میں جو کچھ الجیریا میں ہوا وہی فلسطین میں دوہرایا گیا۔ الجیریا میں فرانسیسی مہاجرین نے مقامی لوگوں سے زمینیں خریدیں اور ایک متوازی معیشت کھڑی کر دی جس میں مقامی لوگوں کا کوئی رول نہ تھا اور وہ عضوئے معطل ہو کر رہ گئے۔ ۱۹۴۵ء تک فلسطین میں یہودی آبادی عربوں کے تقریباً برابر ہوگئی۔ اگر آبادی میں اس اضافہ کو امریکی تناظر میں دیکھیں تو کہا جائے گا جیسے امریکہ میں 150 ملین افراد محض دس سال میں آکر آباد ہو جائیں تو دشواریاں اور بدامنی ہونا ہی تھی۔

یورپی بیانیہ کے پس منظر میں یہودی مظلوم تھے۔ عربوں کے بیانیہ کے اعتبار سے وہ آبادکار تھے۔ اور مقامی آبادی کے ساتھ وہی رویہ تھا جو یورپیوں کا رہا تھا۔ ۱۹۶۲ء کی بات ہے کہ ایک جرمن صہیونی Mosrs Hess نے سیاسی صہیونیت کے لیے حمایت حاصل کرنے کی کوششوں کے دوران کہا تھا ''مڈل ایسٹ میں یہودی جو مملکت قائم کریں گے وہ اس علاقہ میں مغرب کے شاہی مفادات کی نگراں ہوگی اور مشرق کے تہذیب نا آشنا لوگوں کو مغربی تہذیب کے ثمرات سے آگاہ کرے گی''۔[۴] بہت اہم صیہونی Theodor Herzl نے لکھا تھا کہ ''فلسطین میں یہودی ریاست ایشیا یورپ کی فصیل کا کام انجام دے گی اور بربریت کے خلاف تہذیب کی فوجی چوکی''۔[۵] ۱۹۱۴ء میں Chaim Weitzmen نے مانچسٹر کے Guardian اخبار کو ایک خط میں لکھا کہ اگر فلسطین میں یہودی آباد ہو سکے تو ہم بیس تیس سال میں ایک ملین یہودی وہاں آباد کر دیں گے۔ وہ اس ملک کو ترقی دیں گے، تہذیب واپس لائیں گے اور سوئز کینال[۶] کے لئے ایک بہت محفوظ حصار بنا دیں گے۔ عربوں نے اس صہیونی پروجیکٹ کو بہت باریک پردے میں یورپی آبادکاری اور استعمار کے نئے رُخ کی حیثیت میں دیکھا اور یہ محض خیالی پرواز نہیں تھی۔ صہیونیوں نے بھی اسے اس طرح دیکھا یا کم از کم استعماری طاقتوں کو اسی طرح پیش کیا۔ چونکہ انہیں دراصل اس پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے یورپ کی حمایت درکار تھی۔

۱۹۳۶ء میں فلسطینی عربوں میں فسادات اور ہڑتالیں پھوٹ پڑیں جنھوں نے برطانیہ کو یہ باور کرایا کہ حالات قابو سے باہر ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ عربوں کو مطمئن کرنے کے لیے انہوں نے ایک بھونڈا طریقہ استعمال کیا۔ ایک حکم نامہ جاری کیا گیا جس کے تحت فلسطین میں مزید یہودیوں کی آبادکاری محدود کر دی گئی۔ لیکن یہ حکم نامہ ۱۹۳۹ء میں آیا جب کہ دوسری جنگ عظیم بھڑکنے والی تھی اور نازیوں کے یورپی یہودیوں پر مظالم پوری طرح ظاہر ہو چکے تھے۔

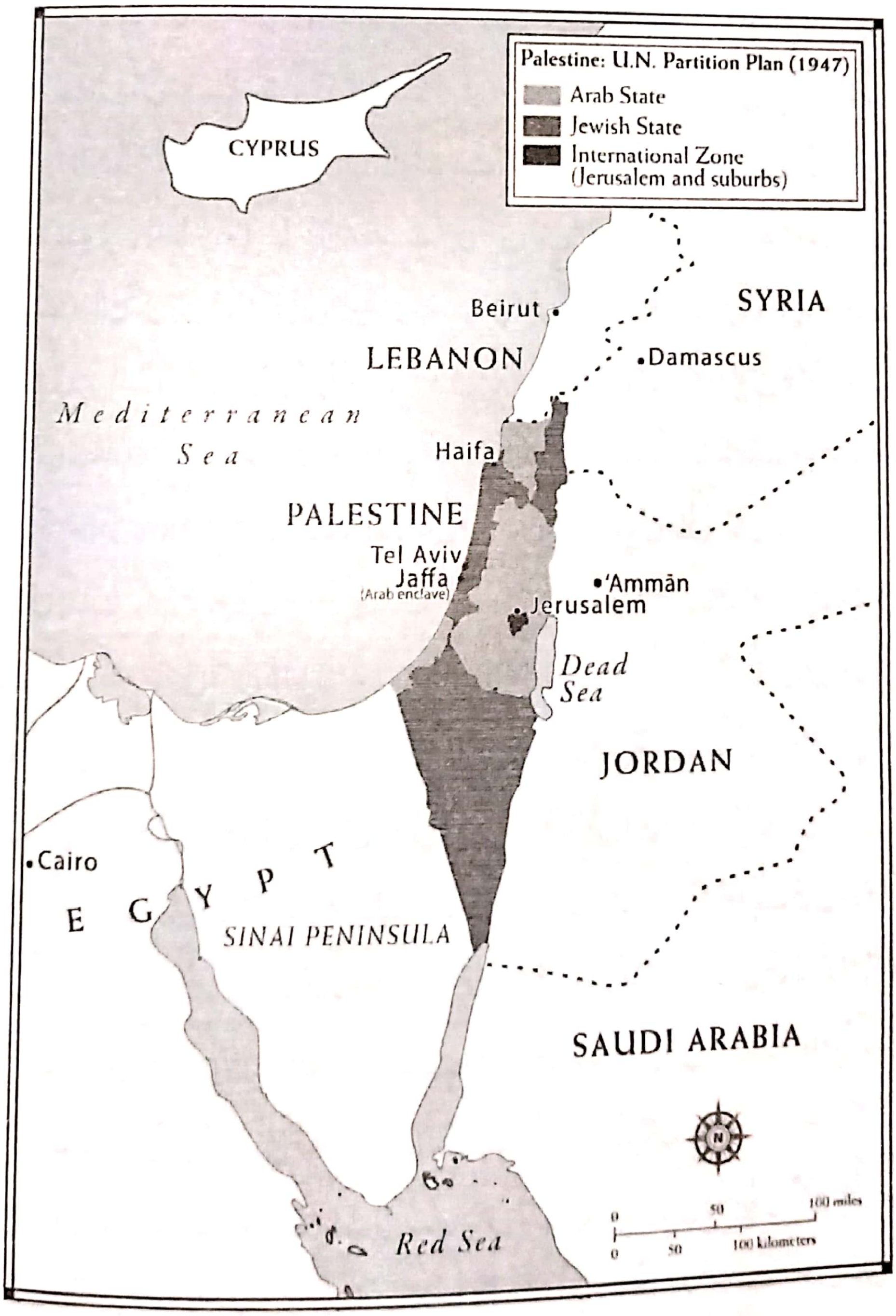
چنانچہ اس صورت حال میں اس کا امکان نہیں تھا کہ یہودی اس حکم نامہ پر عمل کر سکیں گے ویسے بھی یہ خودکشی کے مترادف ہوتا۔ اس کے بجائے یہودیوں میں جنگ جوؤں کے متعدد گروہ پیدا ہو گئے اور کیونکہ یہ بے دخل ہو گئے تھے اس لیے انہوں نے برطانوی سلطنت کے خلاف وہ طریقہ کار استعمال کیا جو ایک کمزور گروہ طاقتور سے مقابلہ آرائی کے دوران کرتا ہے۔ یعنی مارو اور بھاگو کی حکمت عملی، تخریب کاری، کہیں کہیں قتل، جہاں عوام زیادہ آتے ہوں وہاں پر بم مار دینا مختصراً دہشت گردی۔ ۱۹۵۶ء میں ایک خفیہ یہودی جنگ جو گروپ Hanganah نے یروشلم میں King David Hotel پر بم مارا جس کے نتیجے میں کوئی نوے لوگ مارے گئے۔ یہ ۱۹۸۸ء تک ہونے والی دہشت گردانہ کارروائیوں میں عام انسانوں کے جانی نقصان کے اعتبار سے سب سے بڑی دہشت گردانہ کارروائی تھی۔ لیبیا کے ایک دہشت گرد گروپ نے اسی سال Pan Am کی فلائٹ ۱۰۳ جو اسکاٹ لینڈ کے اوپر پرواز کر رہی تھی تباہ کر دی جس میں ۲۷۰ لوگ جاں بحق ہو گئے تھے۔ نازیوں کے ظلم کی ہولناکیوں نے یہودیوں کی ایک محفوظ جگہ اور وطن کے لیے راہ ہموار کی اور وہ اب فلسطین میں پناہ گزین کی حیثیت سے نہیں بلکہ استحقاق کی بنا پر آ رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ بھیک نہیں مانگ رہے ہیں بلکہ اس علاقے میں رہ رہے ہیں جس میں ان کے آباؤ اجداد ۱۳۵ء تک رہتے چلے آئے تھے اور جلاوطنی کے دوران بھی ان کی واپسی کی امیدیں بندھی ہی رہی تھیں۔ یہودیت کی مذہبی رسومات میں بالخصوص ان کے عید کے موقع پر ”اگلے سال یروشلم میں“ ایک خصوصی پروگرام ہوا کرتا تھا۔ یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ خدا نے یہ متنازعہ علاقہ دراصل Habrews اور ان کی اولاد کو دیا تھا اور اس کا وعدہ اس نے ابراہیم سے کیا تھا۔ البتہ عربوں کا یہ کوئی مذہبی طور پر اہم علاقہ نہ تھا اور نہ ہی ان کے مذہب میں کوئی ایسی ہدایات پائی جاتی تھیں۔

دوسری جنگ عظیم ختم ہونے پر امریکہ نے آئندہ امن و امان قائم رکھنے اور اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے ایک اسکیم تیار کی جس کا ایک حصہ United Nations تھی۔ فلسطین ان مسائل میں سے تھا جو اس اقوام متحدہ کو حل کرنا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں ایک تجویز کے تحت اس متنازعہ علاقہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں دو نئی قومیں وجود میں آئیں۔ اس میں باہم متقابل ان دونوں فریقوں کو تین تین ایسے حصے دیے گئے جو آپس میں بڑے عجیب و غریب طریقے سے ملے ہوئے تھے۔ یروشلم کو ایک بین الاقوامی شہر قرار دیا گیا جو ان دونوں قوموں میں سے کسی کا نہ تھا۔ دونوں مملکتوں کا کل رقبہ تقریباً برابر ہی تھا۔ اقوام متحدہ اس فیصلہ کے ذریعہ دراصل یہ کہہ رہی تھی کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے اس سے بحث نہیں بس دو حصہ کر دو اور آگے بڑھو۔ یہ حل ایسا ہی ہے جو معمر لوگ دو بچوں کی آپس کی لڑائی ختم کرانے کے لیے کرتے ہیں۔

لیکن عربوں کو اس سے اختلاف تھا۔ ان کے خیال میں صحیح بات کہیں درمیان میں پائی جاتی تھی۔ ان کے خیال میں ایک خالص یورپی مسئلہ کے لیے ایک یورپی حل لادا جا رہا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یورپیوں نے دوسرے یورپیوں پر جو مظالم ڈھائے ان کے لیے عربوں سے کہا جا رہا ہے کہ وہ قربانی دے کر کفارہ ادا کریں۔ اس علاقے کے ہر طرف جو عرب ممالک تھے انہیں اس نقطۂ نظر سے ہمدردی تھی اور یہ ان کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

لیکن باقی دنیا کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور جب یہ مسئلہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں رکھا گیا تو غیر مسلم ممالک کی بڑی اکثریت نے اس تقسیم کے حق میں رائے دی۔

عربوں کی اکثریت کے اس معاملہ میں کوئی ذاتی مفادات وابستہ نہ تھے۔ مثلاً اسرائیل قائم ہو جانے سے کسی عراقی کسان کا کوئی نقصان نہ ہوتا اور نہ ہی کسی مراقشی دوکاندار کے لیے تجارت میں کوئی رکاوٹ کھڑی ہو رہی تھی لیکن عربوں کی اکثریت بلکہ مسلمانان عالم کی اکثریت اس سلسلہ میں جذباتی تھی کہ فلسطین کس کا ہو۔ کیوں؟ اس لیے کہ اسرائیل کا اس طرح وجود میں آنے کا مطلب یہ تھا کہ مغربی طاقتیں کسی بھی علاقہ میں جا کر اور وہاں کی زمین پر قبضہ کے ذریعہ کوئی نیا ملک کھڑا کر سکتی ہیں۔ اور اس صریح بے ایمانی اور ظلم کے خلاف مسلمانوں کے علاوہ کوئی ملک



اسرائیل اور فلسطین

ایسا نہیں جو آواز بلند کر سکے۔ اسرائیل کا وجود مسلمانوں، عرب و غیر عرب پر اور ایشیا و افریقہ کے ممالک پر یورپی غلبہ کی نشانی تھا۔ وادیٔ سندھ سے لے کر استنبول تک عام انسانوں کا یہی نقطۂ نظر تھا اور یہی احساس تھا۔

۱۵ رمئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیل نے اپنے وجود کا اعلان کر دیا۔ فوراً ہی عرب فوجوں نے تین اطراف سے حملہ کر دیا۔ لیکن توقع کے برخلاف اسرائیل نے تباہی مچادی اور مصر و شام اور اردن کی فوجوں کو تباہ کر دیا۔ اور اس طرح اسرائیل نہیں بلکہ فلسطین مردہ پیدا ہوا۔ جنگ ختم ہوئی۔ اس جنگ کو اسرائیل نے جنگ آزادی کہا اور عربوں نے جنگ تباہی اور بربادی قرار دیا۔ اس کے نتیجے میں کوئی سات سو ہزار عرب بے گھر ہو گئے اور پردیسی عرب ممالک میں رفیوجیز کی حیثیت میں رہ گئے۔ جو زمین فلسطینیوں سے بسنے والی تھی اس کے بڑے حصہ پر اردن قابض ہو گیا۔ عرب پناہ گزینوں کی اکثریت دریائے اردن کے مغربی کنارے پر آباد ہو گئی جہاں وہ غصہ میں ابلتے رہتے۔ گوشت بناتے اور کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں جا کر اس علاقے پر حملہ آور ہو جاتے جو کبھی انکا ہوا کرتا تھا۔

۱۹۴۸ء کی اس جنگ کے نتیجہ میں عربوں نے فوجی شکست سے زیادہ تعلقات عامہ کے میدان میں شکست کھائی۔ معروف عرب رہنما مسلسل اسرائیل کے حق وجود سے انکار کرتے رہے۔ لیکن اس کے پس منظر میں ان کی بنیادی دلیل دراصل قوم پرستی کے نظریے میں ہی پیوست تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ صیہونی اسرائیل کا وجود چاہتے ہیں۔ فلسطین کے عرب چاہتے ہیں کہ فلسطین کا وجود ہو اور کیونکہ یہ دونوں اپنے وجود کو ایک ہی علاقے میں چاہتے ہیں۔ چنانچہ دونوں میں کوئی قائم نہیں ہو سکتا۔ ایک قوم کا حق وجود دراصل دوسری قوم کے حق وجود سے انکار پر مبنی ہے۔ لیکن نازیوں نے جو نسل کشی کی تھی اس کے پس منظر میں یہ کہنا کہ اسرائیل کو قائم رہنے کا کوئی حق نہیں ہے ایسا لگتا تھا کہ یہودیوں کو باقی رہنے کا حق نہیں ہے۔

صورت حال مزید خراب اس وقت ہوئی جب ایک معروف عرب نے نازیوں کی یہودی دشمنی کی توثیق کر دی۔ یہ یروشلم کے مفتی تھے جو دوران جنگ نازی جرمنی میں رہے تھے اور اب منبر اور اپنے ریڈیو کو اپنے نسل پرستانہ خیالات کے پر جوش اظہار کے لیے استعمال کرتے تھے۔ پوری دنیا کی رائے و میڈیا کا رپورٹ کرنے کا انداز اور عربوں اور مفتی جیسوں کی مبالغہ آرائی نے عربوں کے مسئلہ کو نازی ازم سے خلط ملط کر دیا اور بالخصوص مغربی عوام اس سے متاثر ہوئے۔ عربوں نے نہ صرف اپنے علاقے پر دعویٰ کے حق میں دلیل کو شدید نقصان پہنچایا بلکہ لوگ یہ سوچنے لگے کہ ایسے لوگوں سے تو علاقے چھن ہی جانے چاہئیں۔ کچھ اس طرح کی نفسیات اور احساسات تھے جو یہود مخالف یورپی تحریک کے پس منظر جانے جاتے تھے۔ لیکن ان بیرونی بنیادوں کو مسلمانوں پر تھوپا جا رہا تھا۔

۱۹۴۸ء کی قطعی ناکامی کے عمل میں مصری افواج میں شامل ایک شخص جمال عبدالناصر بھی تھا۔ ناصر جنوبی مصر میں پیدا ہوا تھا۔ اور ایک معمولی ڈاکیہ کا بیٹا تھا۔ لڑکپن میں بھی اپنے ہم وطنوں کو یورپ کے لوگوں کی

غلامی کرتے دیکھ کر اسے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ وہ عمر جس میں عام نوجوانوں کا دل چسپ ترین مشغلہ لڑکیوں کے ساتھ وقت گزارنا ہوتا ہے، ناصر اپنی قوم کے وقار اور عزت کے لئے مغموم رہتا تھا۔ اس سلسلے میں وہ کچھ کر سکے اس کے امکانات تو تاریک تھے لیکن جب قومی فوج میں کچھ آفیسروں کی آسامیاں پر کرنے کے لیے فوجی اسکولوں میں داخلے کے لیے جگہ خالی ہوئیں تو ناصر نے اس موقع کا پورا فائدہ اٹھایا اور بتدریج فوج میں کرنل تک ترقی کر گیا۔

۱۹۴۸ء کی شکست نے اس کے دکھ کو اور گہرا کر دیا تھا۔ جس کا الزام اسنے ملک کے بادشاہ کے سر رکھا اور کوئی سو آفیسروں کو ساتھ لے کر بادشاہ کے خلاف سازش کرتے ہوئے اسے بے دخل کر دیا اور مصر کو ایک جمہوری ریاست قرار دیا۔ ہوا یوں کہ ۱۹۵۲ء میں گرمیوں کی ایک صبح یہ آفیسر بڑی سختی اور تیزی سے حرکت میں آئے اور بغیر خون خرابے کے انقلاب آ گیا جس میں محض دو اموات ہوئیں۔ بادشاہت ختم ہو چکی تھی۔

بادشاہ سے چھٹکارہ قدرے آسان مرحلہ تھا۔ بڑا مرحلہ برطانیہ کو ملک بدر کرنا تھا جس کے لیے ناصر کو مناسب ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ سرد جنگ اس زمانہ میں زوروں پر تھی ناصر کسی ایک عالمی طاقت سے ہتھیار لے سکتا تھا۔ چنانچہ ناصر نے امریکہ سے درخواست کی لیکن امریکہ نے مصر اور ناصر میں کوئی ایسی چیز نہ دیکھی جو کمیونزم کو محدود کرنے کے امریکی عزائم میں ان کے لیے کارآمد ہو اور انہیں اس نوجوان آدمی پر بھروسہ بھی نہیں تھا کہ بعد میں یہ ہتھیاروں کا کیا کرے گا۔ درخواست رد کر دی گئی۔ ناصر نے سوویت روس سے ہتھیار مانگے تو انھوں نے ہتھیاروں کے پہاڑ مصر میں لا کر ڈال دیے۔ اس کے نتیجے میں امریکہ کی پریشانی لازمی تھی اور یوں انہوں نے اسے سنجیدگی سے لیا۔ سرد جنگ کے خاص حالات میں امریکیوں نے فیصلہ کیا کہ مصر ایک اہم علاقہ ہے۔ چنانچہ ناصر کا دل جیتنے کی خاطر انہوں نے اسوان کے مقام پر دریائے نیل پر دنیا کا سب سے بڑا بند بنانے کی پیش کش کی جس کے نتیجے میں نہ صرف کاشت کاری کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی بلکہ بجلی بھی پیدا ہوگی اور مصر بہت جلد دنیا کی صنعتی ترقی یافتہ اقوام میں شامل ہو جائے گا۔ یہ ایک دم بخود کر دینے والی پیش کش تھی اور قوم پرستوں کے خوابوں کی تعبیر بھی۔

لیکن جب ناصر نے اس کی تفصیلات دیکھیں تو مجوزہ امدادی خاکہ میں امریکی فوجوں کے لیے مصر میں اڈے اور مصری مالیات پر امریکی نگرانی بھی شامل تھی۔ یوں ناصر کو اندازہ ہوا کہ بہت باریکی سے پھر استعمار اس کے ملک کو قبضہ میں لینا چاہ رہا ہے۔ ناصر نے اس مدد کو نامنظور کر دیا لیکن اسوان ڈیم کا جو خواب اس نے دیکھ لیا تھا اسے ترک نہیں کیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اپنے ملک کے مفادات کو فروخت کیے بغیر وہ اسوان ڈیم کے لیے سرمایہ کہاں سے لائے۔

پھر اسے اس کا جواب نظر آ گیا۔ سوئز نہر سے کوئی نوے ملین ڈالر سالانہ کی آمدنی ہو رہی تھی جس میں مصر کو محض ۶ء۳ ملین ڈالر ہی ملتے تھے۔ گویا مصری ترقی کے لیے سرمایہ اس نہر میں پوشیدہ تھا جو زیادہ تر یورپ کی

طرف بہہ رہا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء میں ناصر نے اچانک نہر سوئز پر فوجیں اتار دیں اور نہر قبضہ میں کر لی۔

یورپ میں غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ برطانوی سیاستدانوں نے ناصر کو دوسرا ہٹلر قرار دیا کہ وہ ایک پاگل آدمی ہے جو دنیا پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ فرانسیسیوں نے کہا کہ سوئز نہر کو چلانے کے لیے مصریوں میں کوئی صلاحیت نہیں اور اب عالمی تجارت ختم ہو جائے گی۔ دونوں ملکوں نے اسرائیل کو اکسایا کہ وہ مصر پر حملہ کرے ناصر کو قتل کر دے اور سوئز کینال پر ازسر نو قبضہ کرے۔

لیکن قبل اس کے کہ اسکیم عملی جامہ پہنے امریکی صدر آئزن ہاور کو اس اسکیم کا علم ہوا تو وہ غصہ سے آگ بگولا ہو گیا۔ کیا یورپیوں کو اس کا اندازہ نہیں ہے کہ سرد جنگ جاری ہے؟ کیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی چھوٹی سی سازش کے نتیجہ میں پورا مشرق وسطیٰ سوویت یونین کے زیر اثر چلا جائے گا۔ چنانچہ آئزن ہاور نے یورپ کو حکم دیا کہ سوئز کینال مصر کے حوالہ کریں اور گھر واپس چلے جائیں۔ امریکہ کا غلبہ جلد یا بدیر اب اتنا ہو چکا تھا کہ یہ حکم مانے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

عربوں نے اسے ناصر کی ایک بہت اہم فتح قرار دیا اور آئندہ گیارہ سالوں تک کالونیاں ختم کرنے کی عالمی مہم کا ہیرو ناصر تھا، عربوں کے اتحاد کا پیامبر اور اسلامی سوشلزم کا مظہر۔ اسلامی سوشلزم سے مراد طبقات سے آزاد ایک سوسائٹی کا قیام تھا جس میں طبقے مارکس کی فکر کے مطابق آپس میں ٹکرا کے کے ختم نہ ہوتے ہوں بلکہ اسلامی طرز پر طبقوں کے آپسی تعاون کے نتیجہ میں ختم ہوتے ہوں۔ یہ دراصل سوشلزم کی ایک زوردار وضاحت تھی جو سیکولر جدّت پسند مسلمانوں نے اپنے نقطہ نظر کی حیثیت میں پیش کی تھی۔

اس طرح ناصر نے اسوان ڈیم بنایا اور اپنی قوم میں برقی رو دوڑا دی۔ ہندوستان کے جواہر لال نہرو، انڈونیشیا کے سوئیکارنو، سری لنکا کی بندارانائکے سابق یوگوسلاویہ کے مارشل ٹیٹو اور دنیا کے دوسرے لیڈروں کے ساتھ مل کر Non-Aligned Movement قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ غیر وابستہ رہ کر دو عالمی طاقتوں کے درمیان جاری کش مکش سے بچا جائے۔

ناصر کے عظیم کارنامے اور گلوبل سطح پر اس کے بڑھتے ہوئے وقار کے نتیجے میں گھر پر اس کے چاہنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ اور یہ محض مصر میں نہیں تھا بلکہ مصر کے باہر بھی ہر طبقہ اور ملک کے عربوں میں والہانہ طور پر اس کی کرشماتی شخصیت کے قائل لوگ موجود تھے۔ مقرر کی حیثیت سے کوئی اس کا ہم پلہ نہ تھا۔ جب وہ بولتا تو (جو اسے ریڈیو پر بولتے ہوئے سنتے تھے) عرب کہتے کہ جیسے وہ ہمارے ساتھ ہمارے کمروں میں بیٹھا ہوا ہے۔ ہر شخص سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہا ہے اور ہر ایک کو گفتگو میں شریک کر رہا ہے کہ جیسے مشورہ کرتا ہو کہ اس سلسلہ میں کیا کرنا ہے اور ایسا محسوس ہوتا کہ مسئلہ عام لوگوں کے لیے اہم ہے اور سب لوگ اس میں شریک ہیں۔

ناصر کی ان کامیابیوں نے اسے کچھ بڑے خواب دکھانے شروع کر دیے۔ مثلاً ایک آزاد اور اقتدار اعلیٰ

کا مالک۔ مصر سے آگے اس نے Pan Arab قوم کے بارے میں سوچا۔ بالکل یہی مقصد سیریا میں البعث پارٹی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۵۸ء میں مصر اور سیریا نے ایک بڑا ملک United Arab Republic قائم کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی تین سال بعد سیریا اس سے نکل گیا جو ناصر کے لیے ہمت شکن ثابت ہوا۔

اس دوران اخوان المسلمین ابھی موجود تھی۔ ۱۹۵۲ء میں انہوں نے بادشاہ کو بے دخل کرنے میں ناصر کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ لیکن جیسے ہی ناصر کی سیکولر حکومت نے کام کرنا شروع کیا وہ اس کے مخالف ہو گئے۔ بلکہ اسے قتل کرنے کی بھی کوشش کی۔ ناصر نے اخوان کے خلاف اقدام کرتے ہوئے اس کے رہنماؤں کو جیل میں ڈال دیا۔ جہاں انہیں بڑی اذیتیں دی گئیں۔

حسن البنا جو اخوان کے مؤسس تھے ناصر کے آنے سے قبل ہی قتل کیے جا چکے تھے۔ اور ان کی جگہ ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں اخوان کی زمام کار تھی جو مضطرب تھا، ذہین و تیز طبع تھا۔ سرگرداں رہنے والا، فکرمند دانشور اور مجنونانہ حد تک جوشیلا تھا اس کا نام تھا سید قطب۔ قطب کی طرز فکر کی تعمیر میں اس دو سالہ تجسّس اور طلب آگہی سے بھرپور قیام امریکہ کا بڑا حصہ ہے جو انہوں نے حکومت مصر کی جانب سے امریکی تدریسی طریقوں کے مطالعہ کے لیے بھیجے جانے پر ایک ٹیچرس ٹریننگ کالج کالیریڈو کے مقام گریلی (Greeley) میں گزارا۔ مادّہ پرستی کا زور انہیں امریکہ میں نظر آیا اس نے انہیں امریکہ کے تئیں بڑی کراہیت پیدا کر دی۔ ابھرتی ہوئی انانیت اور شہوت پسندی نے انہیں بڑے اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ مثلاً خود چرچ کے پروگراموں میں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے رقص باہمی کے مناظر، بے لگام آزادی اور جنسی طور طریقوں نے ان کے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا۔

قطب جب اپنے مطالعہ کے بعد واپس لوٹے تو وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ امریکہ ایک شیطانی قوت ہے اور اسے بہرحال نیست و نابود ہو جانا چاہیے۔ انہوں نے سیاسی مضامین لکھنے شروع کیے اور بتایا کہ اسلام نہ صرف دوسرے مذاہب مثلاً عیسائیت اور بدھ ازم جیسے مذاہب کا ایک مکمل متبادل ہے بلکہ دوسرے نظریات جیسے کمیونزم اور جمہوریت کے مقابلہ میں بھی کہیں بہتر متبادل رکھتا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو ایک عظیم عالمی امت کے قیام کی دعوت دینی شروع کر دی۔ اس دعوت کو جب اس طرح سمجھا گیا کہ یہ دراصل مصر کی زمام حکومت پر قبضہ کی دعوت ہے تو انہوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ یعنی اس کا مطلب تھا کہ اگر تم یہی سمجھ رہے ہو تو ٹھیک ہے ایسا ہی ہے۔

ناصر نے اس شخص کو قید کر لیا جو بعد میں ایک بڑی غلطی بن کر سامنے آیا۔ اسی دوران ایک مظلوم اور آفت رسیدہ قیدی کے جذبات کے زور میں قطب نے ایک انتہائی آتش افروز کتاب المعالم فی الطریق (Milestone) تصنیف کی۔ اس کتاب میں انہوں نے جمال الدین افغانی کے جدید Pan Islamic تصورات کی ایک اساسی تشریح پیش کی ہے۔ انہوں نے اس قدیم تصور جس میں دنیا کو دارالسلام اور دارالحرب میں تقسیم کیا گیا تھا اسے ایک جدید قالب عطا کرتے ہوئے زندہ کیا۔ سید قطب کوئی بڑھا نکلنے والے نہ تھے۔ ان کی

نثر ٹھنڈی ٹھنڈی اور بڑی نپی تلی ہوتی تھی۔ وہ اپنے الفاظ کو بڑی باقاعدگی سے چنتے اور اس طرح متوازن، سلیس روانی اور تسلسل سے بھرپور جو زبان ان کے قلم سے نکلتی اس سے وہ ہر مسلمان کو جہاد کی طرف دعوت دیتے جو محض غیر مسلموں کے خلاف نہیں بلکہ ان مسلمانوں کے خلاف بھی تھا جن کی اسلام کے تئیں وفاداری مذبذب تھی یا وہ دشمنانِ اسلام کے آلۂ کار بن گئے تھے۔ قطب کی رہنمائی میں اخوان نے حکومت مصر، شام، عراق اور اردن و لبنان کے خلاف اصلاً ایک طرح کی جنگ چھیڑ دی بلکہ یہ جنگ ان تمام جدت پسندوں کے خلاف تھی جو ان حکومتوں کی حمایت کرتے تھے۔

مصر میں کوئی جمہوری عمل موجود نہیں تھا جس کے ذریعہ اخوان کے نچلے طبقات پر بڑھتے ہوئے اثرات کو ساتھ لیا جا سکتا۔ چنانچہ ناصر نے ان اثرات سے نپٹنے کے لیے پولیس کی طاقت کے ذریعہ مظاہروں کو کچلنے کی کوشش کی اور ممکنہ سازشوں کو دبا دینے کے لیے خفیہ پولیس کا استعمال کیا۔ ناصر کے لیے اخوان اور قطب اس لیے بھی زیادہ جھلاہٹ کا باعث تھے کہ خود اس کے خیال میں اس سے بڑے مسائل سامنے تھے۔ مثلاً شام، اردن اور عراق کے حکمرانوں کے نزدیک ناصر کی عوامی مقبولیت قابل حسد تھی یہ لوگ ہر وہ عمل کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے جو ناصر کے مقام کو منفی طور پر متاثر کر سکے۔ بعث کے کارکنوں نے عربوں کے درمیان ناصر کے مقام کو چیلنج کر رکھا تھا جن کا دعویٰ تھا کہ پان عرب تصورات کے حامل اصل قوم پرست تو وہ ہیں نہ کہ ناصر۔ اور پھر مصر میں کمیونسٹ بھی تھے۔ سرد جنگ کے دور عروج میں کمیونسٹوں کو روسی مدد سب کو معلوم تھی جس کی بنا پر وہ ہر اس ملک میں جہاں یہ پائے جاتے تھے کسی باقاعدہ باغی گروہ سے بھی زیادہ خطرناک تھے۔ ان کے علاوہ عالم عرب میں قدیم فکر کے حامل اور نسلی بادشاہت کے حامیوں کی تعداد بھی موجود تھی جو ہر اس عمل کی مخالفت کرتی تھی جس کا کریڈٹ ناصر کو جاتا ہو۔

۱۹۶۳ء میں ناصر نے ایک بڑی غلطی یہ کی کہ یمن میں جاری جنگ میں شامل ہو گیا۔ وہاں قبائلی بادشاہت کے خلاف ایک سوشلسٹ پارٹی نے جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ ناصر نے محض تھوڑی سی فوجیں بھیج کر سوشلسٹوں کی علامتی حمایت کا اعلان کر دیا۔ لیکن جیسے ہی مصری افواج وہاں پہنچیں سعودی حکومت نے سرمایہ اور ہتھیاروں سے بادشاہت کے ہم نواؤں کی مدد کرنا شروع کر دی اور ناصر نے محسوس کر لیا کہ وہ ایک دلدل میں پھنس گیا ہے جس سے وہ کئی سال تک نکل نہ سکا۔

سید قطب اس دوران جیل میں قید کے دوران اپنی دعوت عام کرتے رہے۔ ناصر مختلف سمتوں سے ناکامی کی بو سونگھ رہا تھا اور مایوسی کا شکار تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس چھوٹی سی مکھی کو بہت زیادہ پالنا صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ اگست ۱۹۶۶ء میں اس نے وہی اقدام کر ڈالے جو عام طور پر لوگ کرتے ہیں۔ جن کے پاس طاقت بہت زیادہ ہوتی ہے اور اصولوں اور قوانین کو درمیان میں لا کر روکنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ سید قطب کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ لیکن اس طرح کہ دور دراز تک پھیلے ہوئے ان کے مداحوں اور شیدائیوں کے خوفناک حد تک مضبوط

جال کے لیے وہ شہید قرار پائے۔

محض تین ماہ بعد شام اور اسرائیل کے درمیان جھڑپیں شروع ہوگئیں جو آئندہ چھ ماہ میں زیادہ خوفناک شکل اختیار کر گئیں اور خون خرابا بھی زیادہ ہونے لگا۔ اس وقت شام پر بعث پارٹی کی حکومت تھی جو جدید سیکولر فکر کے حاملین میں ناصر کے سب سے بڑے مخالف مانے جاتے تھے۔ اور اسرائیل سے مقابلہ کرنے کے نتیجے میں عالم عرب میں ان کی مقبولیت ناصر کے مقابلے میں بڑھتی جا رہی تھی اور غریب الدیار فلسطینی جو کیمپوں میں آباد تھے ان میں شام کی مقبولیت افزونی تھی۔

چنانچہ عالم عرب کا ہیرو ناصر اس وقت خود اپنے عرب اور مسلمان عوام میں محصور ہو چکا تھا۔ ہمعصر سیکولر اور جدید عرب مخالفین نے اسے گھنا دیا تھا۔ ایک نہ ختم ہونے والی جنگ نے جو وہ دوسرے عربوں کے خلاف لڑ رہا تھا اسے مختصر کر دیا تھا۔ صورتحال کو بدلنے کے لئے اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا اور یہ اپنے عربوں کے خلاف نہیں ہوسکتا تھا۔ نہ تو عرب حکومتوں کے خلاف اور نہ ہی کسی گروہ یا تحریک کے خلاف۔

۱۹۶۷ء کے موسم بہار میں عالم عرب اس صورتحال سے دوچار تھا۔ مسلمانوں کے نقطہ نظر سے اس صدی کا اہم ترین سانحہ یعنی اسرائیل کی عربوں کے خلاف چھ روزہ جنگ سے ذرا پہلے کے حالات کچھ اس طرح تھے۔

باب : ۱۷

دھارا رخ بدلتا ہے

(۱۳۶۹ تا ۱۴۲۱ھ ، ۱۹۵۰ تا ۲۰۰۱ء)

مئی ۱۹۶۷ء میں ناصر نے اسرائیل کے خلاف جنگی لفاظی شروع کردی۔ بحراحمر میں اسرائیلی آمد ورفت کو روک دیا جب کہ یمن میں اس کے ستر ہزار بہترین فوجی پھنسے ہوئے تھے۔ ان حالات میں ناصر کوئی عسکری کارروائی کرنے کے حالت میں نہیں تھا۔ لیکن بیان بازی سے تو کوئی روک نہیں سکتا اور یہ بھی ہوتا ہے کہ سخت بیان بازی بھی کبھی کارگر ہو جاتی ہے۔

لیکن بعض اوقات اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ۵/جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے مصر اردن اور شام پر بیک وقت حملہ کردیا۔ اس حملہ کی کوئی پیشگی انتباہ بھی نہیں تھی۔ یہاں پیشگی انتباہ کی اصطلاح کو اسکے اصل معنی میں لینا شاید صحیح نہ ہو کیونکہ عربوں اور اسرائیل میں جنگ کا ماحول مہینوں قبل سے زور پکڑ رہا تھا۔ لیکن کوئی بھی عرب ملک اس جنگ کی توقع نہیں کررہا تھا اور جون کی اس صبح میں کوئی بھی اس کے لیے تیار نہ تھا۔

ابتدائی ۲۴ گھنٹوں میں اسرائیل نے مصر کی تمام تر فضائی طاقت کو جو اس وقت زمین پر موجود تھی ختم کر دیا تھا۔ اور باقی پانچ دنوں میں اسرائیل نے ان تمام علاقوں کو فتح کرلیا تھا جن کی نشاندہی اقوام متحدہ نے بطور فلسطینی ریاست کے کررکھی تھی۔ اب یہ ریاست فلسطین نہیں بلکہ مقبوضہ علاقے قرار پائے۔ جن پر اسرائیلی حکومت تھی لیکن آبادی کی اکثریت فلسطینیوں کی تھی۔ ساتویں دن جب جنگ ختم ہوئی تو دنیا آئندہ کے لیے بالکل بدل چکی تھی۔

یہ خیال آسکتا ہے کہ کوئی فتح اتنی فیصلہ کن نہیں ہوتی اور جنگ بھی ایسی جو ایک ہی جیسے گروہوں میں لڑی گئی ہو۔ لیکن ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے جس طرح عربوں کو شکست دی وہ دور جدید میں سب سے زیادہ فیصلہ کن جنگ تھی۔ عرب بالکل بھی متحد نہ تھے بلکہ شدید اختلافات کے شکار اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے بے تاب تھے۔

چھ روزہ جنگ نے ناصر کو بدنام کردیا اور اس کا مقام ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا اور چار سال کے اندر اندر وہ موت کے اندھیروں میں ڈوب چکا تھا۔ اگر ناصر واقعی کسی متحدہ عرب بلاک کا لیڈر رہتا تو ممکن ہے کہ اس نے عربوں کو اسرائیل کے ساتھ امن کے ساتھ رہنے پر تیار کرلیا ہوتا۔

لیکن عربوں کا تو وجود ہی نہ تھا۔ ناصر تو اور دوسرے کئی عربوں کے ساتھ لیڈر شپ کے امیدواروں میں سے ایک تھا۔ ویسے بھی مختلف قسم کے تصورات عالم عرب میں پھل پھول رہے تھے۔ ناصر ان میں سے ایک سیکولر جدیدیت کا علمبردار تھا۔ اسرائیل کا حملہ دراصل اس تصور پر حملہ تھا اور ناصر کی شکست دراصل عرب دنیا میں

سیکولر ماڈرنزم اور مغربیت کی شکست تھی۔ ناصر کے زوال کے بعد ناصرازم ختم ہوا یعنی پرانا سیکولر موڈرنزم اور اسلامی سوشلزم ڈھیر ہوگئے۔اس کے نتیجے میں جو خلاء پیدا ہوا اس میں جگہ بنانے کے لیے دوسرے بعض اوقات زیادہ خطرناک تصورات منتظر تھے۔

جنگ کے نتیجے میں جو پناہ گزین اسرائیل کی سرحدوں پر جمع ہو گئے تھے اب انہیں یہ امید نہ رہی کہ عرب ملکوں سے کوئی ان کے مسائل حل کرے گا۔ چنانچہ انہوں نے خود اختیاری کی پالیسی اختیار کرلی۔ یہ تمام پناہ گزین جواب ایک ملین سے زیادہ ہو چکے تھے واقعتاً سب فلسطینی تھے۔ان کے گہرے مشترک تجربات اور تاریخ نے انھیں ایک قوم کی شکل دے دی تھی اور وہ اب قدیم تصور قوم کے مطابق بھی ایک قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔اب یہ لوگ بے گھر افراد تھے اور ان میں ایسے متعدد گروہ موجود تھے جو کسی بھی حیثیت میں ایک فلسطینی ریاست کا قیام چاہتے تھے۔ان گروہوں میں سب سے بڑا گروہ بتدریج ایک مخلوط اتحاد کی شکل اختیار کر گیا جسے Palestine Libration Organisation یعنی PLO کہا گیا۔ یہ ۱۹۶۴ء میں قائم ہوا جس کا اصل مقصد عربوں کی فلسطینیوں کے مسائل سے نپٹنے میں مدد کرنا تھا۔ چھ روزہ جنگ کے بعد فلسطینیوں نے اس کا پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ایک جز وقتی انجینیئر اور کل وقتی انقلابی یاسر عرفات اس کے لیڈر کی حیثیت سے ابھرا۔ PLO ایک طرح کی حکومت تھی جس کے تحت فلسطینیوں نے اسرائیل کے خلاف ایک طویل جنگ کی منصوبہ بندی کرلی۔اس چندروزہ جنگ کا پہلا نتیجہ یہ تھا۔

ناصر کے انتقال نے لیڈر شپ کا جو خلاء پیدا کیا اس نے دوسری تحریکات کے لیے دروازے کھول دیے جن میں ایک عرب قوم پرستی کی بنیادوں پر قائم مائیکل افلق (Michel Aflaq) کی تحریک تھی۔اس پارٹی نے شام کی سوشلسٹ پارٹی کے ساتھ مل کر بعث سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد ڈالی تھی جس میں ریاست سوشلزم کے لئے اور عوام عرب قوم پرستی کے تئیں وقف تھے۔ چھ روزہ جنگ کی ناکامی سے آزردہ اور شکوہ سنج فوجیوں کی بڑی تعداد بعث پارٹی کی طرف راغب ہوگئی۔اس پارٹی میں کیونکہ قوم پرستی اور سوشلزم کا غیر صحت مند امتزاج اچھی حالت میں نہ تھا، فوجیوں کی شمولیت نے اس میں فوجی اور جنگ جویانہ رجحانات کو شامل کر دیا۔اور اس طرح جس پارٹی کا آغاز آزادروی وکشادہ دلی اور جدت پسندی جیسے مقاصد سے ہوا تھا اور جو عورتوں کے حقوق کی بحالی، مذہبی اقلیتوں کے مساوی حقوق، آزادئ اظہار، شہری آزادی، جمہوریت اور خواندگی جیسے ترقی پسند اہداف کے لیے اٹھی تھی وہ قوم پرستی پر مشتمل ارتقاء میں اس طرح سکڑی کہ اس میں مطلق العنانی اور ایک پارٹی کی حکمرانی اصولی درجہ اختیار کرتے گئے۔ بعث پارٹی کے تمام تر مذکورہ اہداف بس ایک نعرہ اور شور میں گھل گئے۔ ''ہماری قوم! ہماری قوم میں فیکٹریاں، صنعتیں اور بم'' ہونا چاہئیں۔ چھ روزہ جنگ سے پہلے ہی اس پارٹی نے شام میں اقتدار سنبھال لیا تھا۔اور جنگ کے بعد اس پارٹی کی دوسری شاخ نے عراق پر قبضہ کرلیا جو بتدریج ایک پولیس ریاست کا چہرہ اختیار کرنے لگی اور بہت جلد اس کا سربراہ صدام حسین کو ہونا تھا۔ابتدائی زمانہ میں یہ دونوں بعث

پارٹیاں عوام میں مقبول ہو چکی تھیں جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ عرب عوام اسرائیل سے خوفزدہ تھے جس نے ان کے قومی افتخار کو چھ روزہ جنگ کے دوران خاک میں ملا دیا تھا اور چاہتے تھے کہ کوئی اٹھے اور ان کے کھوئے ہوئے وقار کو قائم کردے۔ لیکن مقبولیت آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی جیسے جیسے عوام اور مڈل کلاس کے لوگوں نے محسوس کیا کہ اس پارٹی کی بنیادوں میں سوائے حصول طاقت کے کوئی اور اعلیٰ مقصد نہیں پایا جاتا۔ اس چھ روزہ جنگ کا یہ دوسرا نتیجہ تھا۔

تیسرا انجام اور تھا جو بڑی بدشگونی کا حامل قرار پایا۔ اس چھ روزہ جنگ نے عالم اسلام میں سیکولر جدت پسندوں اور انیسویں صدی کی وہابی تحریک اور سیاسی اسلام کے حامل مختلف خیالات رکھنے والے گروہوں کے درمیان کشمکش کو ایک نیا رخ دے دیا۔

سعودی عربیہ میں وہابی ایک ریاست پر پہلے ہی سے قابض تھے۔ گو کہ ایک طویل عرصہ سے مصر عالم عرب کا مرکز ہونے کا دعویٰ کرتا رہا تھا لیکن سعودی عربیہ بھی اس اہمیت کا دعویدار ہو سکتا تھا۔ جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ عالم اسلام کے اہم ترین مقامات یعنی مکہ اور مدینہ سعودی عربیہ میں ہی تھے۔ مصر میں کسی بھی قسم کی کمزوری سعودی عربیہ کے مفاد میں یعنی اس کی طاقت میں اضافہ کا ذریعہ تھی۔ لیکن کونسی طاقت؟ تیل نے وہابیوں کو دولت عطا کی اور امریکی ہتھیاروں نے عسکری طاقت۔ مصر داخلی طور پر منتشر تھا۔ چنانچہ سعودی عربیہ نے اپنی دولت کا استعمال عالم اسلام میں مشنری سرگرمیوں میں اضافہ کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مذہبی مدارس قائم کیے گئے۔ مساجد کی تعمیر، ائمہ کا تقرر، رفاہی وفلاحی اداروں کا قیام جن کی پہنچ دیہاتوں کے غریب اور ضرورت مند مسلم عوام تک تھی۔ پھر افریقہ کے صحارا کے علاقہ سے لے کر افغانستان جنوبی پشتونوں اور پاکستان تک وسیع تھی جہاں پہلے ہی لاکھوں کی تعداد میں وہابی پائے جاتے تھے۔

دوسری طرف اخوان المسلمین تھی۔ جنگ میں شکست کے نتیجہ میں عوام نے ناصر کو بالکل ہی بھلا دیا اور اس کے بجائے وہ ان تحریکوں اور جماعتوں کی طرف دیکھنے لگے تھے جو ناصر کی مخالفت کرتی رہی تھیں اور ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان حالات میں اخوان نے پھلنا پھولنا شروع کر دیا اور یہ اب مصر کی سرحدوں سے باہر شام، اردن، عرب امارات اور بقیہ عرب ممالک میں قائم ہو چکی تھی۔ مزید یہ کہ اس سے پھوٹنے والی شاخیں بھی پھیلنا شروع ہو گئیں جن میں ایک سے بڑھ کر ایک سیاسی ہونے کا دعویٰ کرتی تھی۔ انہیں میں سے ایک شاخ مصر کی اسلامی جہاد تھی جسے ایک شخص الظواہری نے قائم کیا جو بعد میں مشہور زمانہ جہادی اسامہ بن لادن کی سرپرست بنی۔

بعض مفکرین جو سید قطب سے متاثر تھے انہوں نے یہ درس دینا شروع کر دیا کہ جہاد نہ صرف یہ کہ ہر مسلمان پر فرض ہے بلکہ یہ اسلام کا چھٹا رکن ہے۔ یعنی عبادت، حج، روزہ، زکوٰۃ اور عقیدہ توحید کی طرح۔ اس نقطۂ نظر کے حاملین میں کچھ پرجوش مثلاً فلسطینی عبداللہ عظام نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ جہاد میں شرکت ایک مسلمان کو دوسرے مسلمانوں سے ممیز کرتی ہے۔ عبداللہ عظام نے جہاد افغانستان میں سوویت روس کے

خلاف حصہ لیا۔ ان کے جہادی عقیدہ کے مطابق جو بھی عسکری جدو جہد سے فرار اختیار کرے وہ نا قابل معافی جرم اور اسے جان سے مار ڈالنا چاہیے۔[۲] ان تند خو اور سنگ دل انقلابیوں کو ''اسلامی'' کے بجائے جہادی کہنا چاہیے۔ ان کا نقطۂ نظر عام مسلمانوں کی اکثریت کو اپنی طرف راغب نہ کر سکا۔ کیونکہ یہ نقطۂ نظر اسلام سے کسی بھی طرح متعلق نظر نہیں آتا۔ یہ اسلامی نظریے کی ایک شاخ تو ہو سکتی ہے جو خود اسلام کے سیاسی پہلو کا ایک حصہ ہے اور مزید یہ کہ اسلام کا سیاسی پہلو مکمل اسلام کا ایک جز ہے نہ کہ کل۔

بحیثیت مجموعی چھ روزہ جنگ نے کیا حقیقی تبدیلی پیدا کی؟ اسرائیل کو مقبوضہ علاقے مل گئے جو ملک پر کسی ممکنہ حملہ کے خلاف ایک قسم کی رکاوٹ کا رول ادا کر سکتے تھے۔ لیکن انہیں علاقوں میں اسرائیل کو روز افزوں بغاوتوں کا سامنا ہوا جو انتفاضہ کے نام سے مشہور ہیں۔ جن کے جواب میں اسرائیل نے مزید ظالمانہ کارروائیاں کیں۔ مسلسل ہوتے رہنے والے تصادم جو سالہا سال سے جاری ہیں انہوں نے نہ صرف ملک کی قوت اور توانائی کو نچوڑ دیا ہے بلکہ اقوام عالم کے درمیان اسرائیل کے اخلاقی وجود کو بھی متاثر کیا ہے۔

دوسری طرف اس جنگ نے PLO کو خالص فلسطینی اور بنیاد پرستی کی طرف دھکیل دیا۔ بعث پارٹی مضبوط ہوئی اور اخوان المسلمین مزید طاقتور ہوتی گئی اور آنے والے سالوں میں متعدد جہادی گروہوں کی پیدائش کا باعث بنی۔ جن میں ایک گروہ دوسرے سے بڑھ کر جوشیلا تھا۔ جنہوں نے نہ صرف معصوم لوگوں کے خلاف بلکہ ہر اس کے خلاف جو ان کے راستے میں آیا خطرناک کارروائیاں کیں۔ بلکہ بتدریج یہ حملے ہر اس کے خلاف ہوتے تھے جو نہیں مل جاتا۔ وہ معصوم ہوتا تو اور بھی آسان ہو جاتا اور اس طرح یہ جدو جہد وہ رخ اختیار کر گئی جسے آج دہشت گردی کہا جاتا ہے۔ مختصراً چھ روزہ جنگ عالمی امن کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی اور خود اسرائیل کے لیے بھی اس میں کوئی بھلائی نہ تھی۔

دوسری جنگ کے بعد عالم عرب میں یہ بیانیہ قسط وار جاری ہوتا رہا۔ میں ذرا تھوڑا پیچھے جا کر اہل فارس کو دیکھتا ہوں کہ یہ بیانیہ وہاں کس طرح ظاہر ہوا۔ وہاں بھی ایک اہم اور انتہائی مرکزی اہمیت کا حامل واقعہ رونما ہوا جس نے چھ روزہ جنگ کی طرح دنیا کو متاثر کیا۔ عالم اسلام میں امریکہ ایک ضدی اور منہ زور طاقت کے روپ میں ابھرا۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد ہی مسلم ممالک نے امریکہ کو سنجیدگی سے لینا شروع کیا تھا۔ ان کا یہ پہلا تاثر بڑا مثبت تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکہ کی استطاعت، کارکردگی، نئی نئی اشیاء ہر سطح پر بہم پہنچانے کی صلاحیت، عسکری قوت، اور بالخصوص وہ عظیم اقدار مثلاً آزادی، عدل، جمہوریت جن کا وہ دعویدار تھا ان سب نے مل کر عالم اسلام میں امریکہ کی پوزیشن کو بڑا ہی مضبوط کر دیا تھا۔ امریکہ کی یہ دلیل کہ اس کا سسٹم دنیا کے غریبوں کو ظلم و استحصال سے نجات دلانے کی صلاحیت رکھتا ہے سب ہی کو متاثر کرنے والی تھی۔ امریکی نظریہ ساز جمہوریت کو کچھ اس طرح پیش کرتے کہ جو لوگوں کو مذہبی تحریکوں میں نظر آتی اور یوں دوسری نظری قوتیں

جوانسانوں کو معاشرتی سطح پر منظّم کرنے اور مستحکم کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی ان کے ساتھ امریکہ کی مقابلہ آرائی شروع ہوگئی۔ان قوتوں میں کمیونزم اور فاشزم تھے تو اسلام بھی تھا۔ مذہبی مسلمانوں نے امریکہ کی اخلاقیات کو مسترد کر دیا لیکن سیکولر اور جدت پسند مسلمانوں کو اس میں بڑی بہتری کا سامان نظر آیا ان کے نزدیک امریکی اقدار اور اسلام میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔

جب صدر ولسن کے چودہ نکات اپنا وجود کھو بیٹھے تو مسلمانوں نے امریکہ کو نہیں بلکہ یورپ کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں میں صدر روز ولٹ نے ونسٹن چرچل کے ساتھ مل کر اٹلانٹک چارٹر کا اعلان کر کے ایک بار پھر دنیا میں امریکی اخلاقی قیادت کو ابھارا۔اس اعلان کا بنیادی خیال دنیا کے تمام ممالک کی آزادی اور انہیں جمہوریت کی طرف چلانا تھا۔ چرچل نے بعد میں کہا کہ وہ اس کا یہ مطلب نہیں سمجھتا تھا۔لیکن امریکی رہنماؤں نے اس چارٹر سے اپنے آپ کو منسلک رکھا۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ جنگ کے خاتمہ کے فوراً بعد امریکہ نے Universal Declaration of Human Rights یعنی حقوق انسانی کا عالمگیر اعلانیہ تیار کرنے میں رہنمایانہ کردار ادا کیا جسے اقوام متحدہ نے اپنی طرف سے شائع کیا۔ یہ اس کا ثبوت تھا کہ امریکہ ہر جگہ سیاسی آزادی اور جمہوریت کا علمبردار تھا۔

ایرانیوں کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگا۔ جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد ایرانیوں میں جو سیکولر جدت پسند افراد تھے وہ چاہتے تھے کہ اس پروجیکٹ پر ایران میں باقاعدہ کام ہو اور خاندانی ظالمانہ حکومت کی جگہ ایک مقامی جمہوریت برسر اقتدار آئے۔کئی دہائیوں سے رضا شاہ پہلوی اس پروجیکٹ کے آڑے آتا رہا تھا۔لیکن بالآخر اس کا خاتمہ ہوا کیونکہ نازیوں کا ساتھ دینے کے نتیجہ میں اتحادیوں نے اسے اقتدار سے ہٹا ہی دیا۔اس کے نتیجہ میں ایرانیوں کو یہ موقع حاصل ہوگیا کہ وہ ۱۹۰۶ء کے دستور کو نافذ کریں۔ پارلی منٹ کی بازیافت ہو اور حقیقی انتخابات کا انعقاد ہو اور وہ پرانی سیکولر جمہوریت قائم کرسکیں جس کا وہ ایک عرصہ سے خواب دیکھتے رہے تھے۔

بڑی امیدوں کے ساتھ ایرانی قوم نے انتخاب میں حصہ لیا اور ایک جدید سیکولر شخصیت محمد مصدق بطور وزیر اعظم کے ہاتھوں میں اپنے ملک کی باگ ڈور دے دی۔ مصدق نے قوم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ملک کی سب سے بڑی دولت یعنی تیل پر مکمل کنٹرول حاصل کرلے گا۔ چنانچہ آفس سنبھالنے کے فوراً بعد اس نے برٹش پٹرولیم کے ساتھ کیے گئے پٹہ کو ختم کر کے ایران کی آئل انڈسٹری کے قومیانے کا اعلان کردیا۔

امریکہ کی سینٹرل انٹلی جنس ایجنسی یعنی CIA فوراً ہی ''پاگل آدمی مصدق'' کو روکنے کے لئے حرکت میں آگئی (امریکی وزیرِ خارجہ، جون ڈکیس نے اسے پاگل آدمی کہا تھا)۔ چنانچہ اگست ۱۹۵۳ء کے آخر میں ایرانی فوج کی ایک ٹکڑی نے ایک خون آشام بغاوت کردی جسے CIA نے سرمایہ فراہم کیا تھا۔نتیجہ میں ہزاروں ایرانی گلی کوچوں میں مارے گئے اور ان کے سیاسی رہنما کو نظر بند کردیا گیا جس سے پھر کبھی اسے آزادی نصیب نہ ہوسکی۔خالی جگہ پر رضا شاہ پہلوی کے بیٹے کو ملک کا بادشاہ بنا دیا گیا۔اسے بھی رضا شاہ پہلوی ہی کا نام دیا گیا

۔نوجوان بادشاہ نے امریکہ کے ساتھ ایک معاہدہ پر دستخط کر دیے جس کے تحت ایرانی تیل کا انتظام ایک بین الاقوامی کنسورٹیم کے حوالہ کر دیا گیا۔

ایران میں اس طرح تختہ پلٹنے کے نتیجہ میں ایرانی قوم میں اس امریکی دھوکہ دہی کے خلاف کیا جذبات پیدا ہوئے انہیں سمجھنا ذرا بھی مشکل نہیں اور یہ محض ایران تک محدود نہیں تھے بلکہ پورے عالم اسلام میں اس کے خلاف غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ جب کوئی تین سال بعد امریکی صدر آئزن ہاور کی مداخلت سے نہر سویز مصر کو واگذار ہوگئی تو امریکہ کی عوامی شبیہ میں ذرّہ برابر بھی بہتری نہیں آسکی۔ عام مسلمان اس سے ذرا بھی متاثر نہ ہو سکے اور پورا سہرا ناصر کے سر رہا۔ اس کی بنیادی وجہ وہ گہرا نقصان تھا جو امریکہ نے CIA کے ذریعہ ایران میں بغاوت کے نتیجہ میں اٹھایا تھا۔ پورے عالم اسلام میں بلکہ ان تمام علاقوں میں جو کسی نہ کسی طرح استعمار کے زیر اثر رہتے تھے یہ تصور عام ہو گیا کہ استعماری پروجیکٹ ختم نہیں ہوا ہے بلکہ اب برطانیہ کی جگہ امریکہ نے لے لی ہے۔ اسلامی بیانیہ کے اعتبار سے ایران میں جدوجہد اصلاً سیکولر اور دین پسندوں کے درمیان تھی۔ اسلام کیسے زندہ ہو؟ مسلمانوں کی قوت کس طرح بحال ہو؟ اور مغرب کے بڑھتے ہوئے وزن کو کیسے کم کیا جائے؟۔ اب جو بھی واقعات رونما ہوئے ان کے پس منظر میں یہی سوالات اور مقاصد کارفرما تھے۔ لیکن اب ایران ایک عالمی بیانیہ کا بھی حصہ بن چکا تھا اور یہ بیانیہ اب بڑی عالمی طاقتوں کے درمیان اس کرہ ارض پر غلبہ کے لئے ہونے والی رسّہ کشی سے عبارت تھا۔ اس پس منظر میں جو بھی ہوا اس کے پیچھے تیل کی سیاست کے ساتھ سرد جنگ سے عبارت حکمت عملی بھی کارفرما رہی تھی۔ پورے شرق اوسط میں بھی یہی سب کچھ ہوتا رہا اور اس صدی کے خاتمہ تک پورا دارالسلام انہیں دو طرح کے مسائل سے جوجھتا رہا۔

ایران کے مشرق میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ عظیم کھیل یعنی Great Game کا ہی حصہ تھا۔ فرق اگر تھا بھی تو محض ظاہر میں۔ زاروں کے زیر سایہ روس کا جو رویہ رہا تھا وہی رویہ اب سوویت روس کا تھا۔ اور اسی طرح کچھ عرصہ قبل جو کردار برطانیہ عظمی ادا کرتا تھا اس مقام پر آج اقوام متحدہ امریکہ براجمان تھا۔ ان کی سرگرمیوں کی حرکیات ایک ہی نوعیت کی تھیں۔ یعنی سازش اور منصوبہ بند انداز میں مسحور کرنا۔ دباؤ ڈالنا، تشدّد کی دھمکیاں اور پھر واقعی خون خرابہ۔

البتہ اب اس حرکیات کے عوامل کا پیمانہ اور تناسب بڑھ چکا تھا۔ عظیم کھیل کا آغاز وہیں سے ہوا جہاں روسی سلطنت برطانوی سلطنت سے نبرد آزما ہوئی۔ سرد جنگ میں اصل کارفرمائی امریکہ کی تھی جو نہیں چاہتا تھا کہ سوویت اثرات میں وسعت ہو۔ اور بالخصوص اس پس منظر میں کہ نئی نئی قومی ریاستیں تشکیل پا رہی تھیں جن میں کوئی بھی ریاست ریاستہائے متحدہ امریکہ یا سوویت روس کی حاشیہ بردار ہوسکتی تھی۔ اس لئے اس سرد جنگ کے محاذ دنیا کے کسی بھی حصہ میں کھل سکتے تھے۔ کوئی بھی ملک ان دونوں قوتوں سے مدد حاصل کرسکتا تھا۔ ایک بڑی قوت حکومتوں کی مالی مدد کرتی تو دوسری حکومت مخالف گروہوں کو ہتھیاروں کی فراہمی کرتی۔

اس عظیم کھیل کا مرکزی میدان جنگ افغانستان، ایران اور وسط ایشیا تھا اور اسی علاقہ میں کھیل کھیلا جاتا رہا۔ انیسویں صدی سے روسیوں کی یہ خواہش رہی تھی کہ وہ افغانستان پر تسلط کے ذریعہ خلیج فارس تک رسائی حاصل کرسکیں تا کہ انہیں گرم پانیوں میں بحری راستوں کی سہولت حاصل ہوسکے اور ان کی بحری فوج کو راستہ اور تجارتی مواقع مل جائیں۔ روسیوں کے بعد سوویت روس کے بھی یہی عزائم تھے بس ان میں زیادہ گہرائی پیدا ہوگئی تھی۔ اب ماہرین ارضیات یہ دعویٰ کررہے تھے کہ دنیا کا ۶۵ فیصد تیل یہیں خلیج فارس اور اس کے قرب وجوار کی مسلم ریاستوں اور شمالی افریقہ کی مسلم ریاستوں میں پایا جاتا ہے۔ (اور بقیہ تیل کا زیادہ تر حصہ وسط ایشیا کے مسلم ممالک یعنی افغانستان کے شمال میں موجود ہے۔ یہ بعد میں معلوم ہوا) صنعتی ترقی کیونکہ بڑی تیزی سے نئے نئے علاقوں میں وسعت پذیر تھی، تیل کی اہمیت بڑھتی ہی جارہی تھی۔

گوکہ تیل نے عالم اسلام کی سیاست پر زبردست اثر ڈالا تھا۔ لیکن اس کا معاشرتی اثر اس سے کہیں زیادہ تھا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد مسلم ممالک بری طرح سے پٹہ داری کے معاہدہ کے ذریعہ قزاقی اور غارتگری کا شکار ہوئے تھے اب یہ ممالک بتدریج ان معاہدوں پر از سر نو گفت وشنید کے ذریعہ بہتر شرائط منوا رہے تھے ۱۹۵۰ء تک تیل فروخت کرنے والے ممالک آمدنی کا پچاس فیصد تک حاصل کرنے لگے تھے۔ اور یوں ان ممالک میں اس وقت سے دولت کی ریل پیل ہونے لگی تھی۔

اگر ان ممالک میں جمہوری ادارے قائم ہوتے تو دولت میں یہ یکا یک اضافہ بالکل دوسری طرح کا اثر ڈالتا۔ جمہوری اداروں کی بدولت یہ دولت آبادی کے ہر حصہ تک پہنچتی اور یقیناً وہاں ہر سطح کے لاکھوں افراد کی صلاحیتوں اور تخلیقی قوتوں کے پھلنے پھولنے میں معاون ہوتی اور یوں ان ممالک میں ایک ثقافتی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوتا۔

لیکن شاید وقت اور حالات اس طرح کے اداروں کے لئے مددگار نہ تھے۔ ابھی تک یہ مسلم ممالک اور مسلم معاشرہ اپنی عظمت رفتہ میں گم اور احساس زیاں میں ڈوبا ہوا تھا۔ حکمراں اشرافیہ اس تصور میں گرفتار تھی کہ ماضی کی عظمت کو ایک بار پھر زندہ کرنے کے لئے ڈھانچہ میں جدید اساسی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ وہ جلد از جلد مغرب کے برابر ہونا چاہتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ اس مقصد کو پانے کے لئے ریاست میں قوت پر مرکزی کنٹرول اور کامل اختیار کے بغیر وہ حاصل نہیں ہوسکتا جو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس کا انتظار نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ اس ڈھانچہ کو فطری ارتقاء کا موقعہ دیں اور نہ ہی وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے عوام کو ترقی کرنے کے لئے ان کی اپنی رفتار اور ان کے اپنے طریقوں پر ہی چھوڑ دیا جائے۔ اسلامی معاشرہ ترقی کی تلاش میں ہر ہر لمحہ پیچھے جارہا تھا اور ان کے خیال میں جدید ڈھانچہ مہیا کرنا ایک فوری ضرورت تھی جو جلد از جلد پوری ہونی چاہیے تھی۔

تیل کی دولت سے وہ اس ضرورت کو فوری طور پر حاصل کرسکتے تھے۔ اس دولت سے مالا مال ممالک میں حکمراں اشرافیہ نے جو دولت اکھٹا کی وہ اب داستانوں کا حصہ بن چکی ہے۔ چھوٹے ممالک اور ایرانیوں نے

یہ مکروہ دولت محض عیش وتفریح کے لئے دنیا کے تفریحی مقامات اور جوئے خانوں میں اڑائی۔لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے بہت بڑے پیمانہ پر'ترقی' کے پروجیکٹ پر بھی دولت خرچ کی جیسا کہ وہ سیکولر جدت پسند کی حیثیت میں سوچتے رہے تھے۔اور خود یہ ایک بہت بڑی کہانی کا موضوع ہے۔ایک کے بعد دوسرے ملکوں نے قومی اسکولوں کا سسٹم قائم کیا۔پاور پلانٹ نصب کیے گئے۔آفسوں کے لئے بلند بالا عمارتیں تعمیر ہوئیں۔قومی فضائی کمپنیاں قائم ہوئیں قومی ٹیلی ویژن مراکز کا قیام عمل میں آیا، ریڈیو اسٹیشن اور روزنامہ اخبارات نکلنے لگے۔

ایک کے بعد دوسرے ملک میں حکومتوں اور افسروں نے ترقی کے ان بڑے بڑے پروگراموں کو نافذ کیا جن کے نتیجہ میں ان اداروں کو قائم کرنے اور چلتے رہنے کے لئے ملکوں کو ایک نئی تعلیم یافتہ نسل اور ٹیکنیکل افراد کی بڑی ضرورت پیدا ہوگئی۔یہ معاشرہ میں ایک نئی کلاس بن کر ابھری۔اس کلاس کو Technocracy بھی کہا گیا جو اصل میں تنخواہوں پر منحصر ایک طبقہ تھا اور یہ تنخواہیں ریاست ادا کرتی تھی۔اور حکومت کو یہ دولت ان بیرونی ممالک کی کمپنیوں سے ملتی تھی جو ان کا تیل خرید رہی تھیں۔حکومت کسانوں سے اب بھی ٹیکس وصول کرتی تھی، گلہ بان، گڈریے، دستکار، تاجر اور دوسرے کامگار اب بھی حکومت کو ٹیکس ادا کرتے تھے لیکن یہ رقم اتنی نہ تھی کہ وہ ان تنخواہ دار ملازموں یعنی Technocracy کی ضروریات کو پورا کرسکتی۔روایتی معیشت سے پیداوار تھی ہی نہیں اور ظاہر ہے کہ ترقی اور ارتقاء کے اپنے عزائم کو بروئے کار لانے کے لئے حکومت اس روایتی معیشت سے ہونے والی آمدنی پر انحصار نہیں کرسکتی تھی۔

جب ایک بار حکمراں اشرافیہ کا آمدنی کے لئے اپنے مقامی ٹیکس دھندگان پر انحصار نہ رہا تو انہیں حکومتی کام چلانے کے لئے آبادی کے اس حصہ کے حلیفوں کی ضرورت بھی نہ رہی۔اس سے قبل خالص مطلق العنان حکومتیں بھی مقامی آبادی میں اپنے لئے حلیف تلاش کرنا ضروری سمجھتی رہی تھیں۔لیکن تیل کی دولت سے مالا مال مسلم حکومتیں عوامی احساسات سے بالکل بے بہرہ ہوگئیں۔عوامی کلچر اور ثقافت سے بہت دور ہو جانے کے نتائج کی انہیں کوئی پرواہ نہ تھی۔لیکن ان کے لئے اہمیت کے حامل جدید معیشت کے وہ کارپرداز تھے جو ملک میں آتے جاتے رہتے تھے۔ان کے ساتھ بنا کر رہنا اور صلح کئے رہنا اس حکمراں اشرافیہ کے لئے بہت ضروری تھا۔اس طرح ملک کو جدید یانے کے عمل نے وہاں کے معاشرہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ایک وہ جو حکمرانوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور فیصلہ سازی میں معاونت کرتے تھے یعنی Governing Club اور باقی دوسرے تمام افراد۔

گورننگ کلب چھوٹا موٹا نہ تھا۔اس میں ٹیکنوکریسی شامل تھی جو محض ایک گروہ نہ تھی بلکہ ایک کلاس تھی۔ اس میں حکمراں اشرافیہ بھی شامل تھی جس میں خاندانی حکمرانیوں میں شاہی خاندان کے افراد اور ان کے دور دراز کے اعزہ واقارب شامل تھے۔یہ حکومتیں اگر جمہوری ہوتیں تو حکمراں جماعت اور اس کے ساتھ لگے رہنے والے افراد اس میں شامل ہوتے۔جو بھی ہو ان ممالک میں حکمرانوں کے یہ کلب آبادی کا انتہائی مختصر حصہ تھے۔لیکن ان دو حصوں یعنی حکمراں کلب اور بقیہ تمام آبادی کے درمیان تمیز روز بروز بڑھتی ہی جاتی تھی۔

کلب کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہم ایک پر جوش مقصد کو حاصل کرنے یعنی ملک کی تقدیر بدلنے میں مشغول ہیں۔ جو اس کلب سے باہر تھے وہ غیر متحرک طور پر حالات کی تبدیلی کے نتیجہ میں مستفید ہو رہے تھے۔ بس یہ تبدیلیاں انہیں تبدیل کر رہی تھیں۔ معلوم ہوتا کہ اچانک ان کے قریب کوئی ہسپتال بن رہا ہے اور انہیں اب صحت کی بہتر سہولیات حاصل ہو سکیں گی۔ انہیں اچانک معلوم ہوتا کہ ان کے قریب ایک پختہ سڑک بننے والی ہے۔ ظاہر ہے کہ اب وہ قریب کے شہر آسانی سے جا سکیں گے۔ لیکن حکمراں کلب کے باہر کے لوگوں کا جدید یانے کے اس عمل میں کوئی حصہ نہ تھا۔ نہ جینے میں اور نہ ہی مرنے میں۔ فیصلہ سازی میں ان کی شراکت نہ تھی۔ یہ دولت جو بڑی تیزی سے آ رہی تھی یہ کہاں اور کس طرح خرچ ہوگی ان کی آواز کو اس میں دخل نہ تھا۔ ملک میں جو تبدیلیاں آ رہی تھیں ان میں ان لوگوں کا کوئی سیاسی رول نہیں تھا۔

خود ان کے اپنے ذاتی خوابوں اور مقاصد کے حصول پر اس جدید یانے کا کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ بلکہ دراصل ہوا یہ کہ تیل فروخت کرنے والا ملک اور اس کے حکمراں تو مالا مال ہوتے گئے لیکن ان کے عوام کی غربت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔

زیادہ تر لوگوں کو امید بس یہی ہوتی کہ وہ بھی ملک کی ترقی سے اپنا حق بس اس طرح حاصل کر سکتے ہیں کہ سرکاری اسکولوں میں بچوں کو تعلیم دلا سکیں اور پھر کسی ٹیکنیکل لائن میں مہارت حاصل کر کے وہ بھی ٹیکنوکریسی کا حصہ بن جائیں۔ جس نے بھی یہ راستہ اختیار کیا وہ بالآخر ایک ایسا شخص بن گیا۔ جو سوٹ پہنے ہوئے کام کرتا نظر آیا اس کی روزمرہ کی زندگی مغربی لوگوں کے طرز پر ہوگئی۔ اوقات گھڑیوں سے متعین ہونے لگے اور خاندان نیوکلیر یعنی شوہر بیوی اور دو بچوں پر مشتمل اور تفریحات میں شراب، نائٹ کلب، اور اوپیرا تک بھی بات پہنچ سکتی تھی۔ بچے راک اور رال سنتے، جنس مخالف کے ساتھ dating کرتے اور خود ہی زندگی کے ساتھی پسند کر لیتے۔

اور جو شخص یہ راستہ اختیار نہ کرتا وہ اکثر و بیشتر معاشرہ میں اپنے روایتی لباس سے پہنچانا جاتا جیسے شلوار قمیص وغیرہ یا جو بھی لباس وہ روایتی طور پر پہنتے آئے تھے۔ ان کی روزمرہ کی سرگرمیاں دینی فرائض کی ادائیگی اور اس کے اہتمام سے متعین ہوتیں۔ وہ جب اپنے خاندان کی بات کرتے تو ان کے سامنے وسیع تصور ہوتا، جس میں قریب و دور کے اعزاء اور اقرباء بھی شامل ہوتے جن سے وہ پیچ در پیچ رشتوں اور تعلقات میں بندھے ہوئے تھے۔ شادی کے معاملات عموماً وہ خود نہیں بلکہ والدین اور خاندان کے دوسرے بزرگ طے کرتے۔

مغربی ممالک کے سفراء اور سیاست کاروں کو ان لوگوں سے ملنے جلنے میں آسانی ہوتی جو مغربی رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے یعنی مغربی لباس اور طرز اپنائے ہوئے ہوتے ثقافتی یک رنگی کی بنا پر ان لوگوں سے تعلقات رکھنا آسان ہوتا۔ دوسرے متوازی کلچر کے حاملین سے وہ شاذ و نادر ہی ملتے۔

سوٹ پہننے والوں کے لئے ایسے مکانوں میں رہنے کا زیادہ امکان ہوتا جن میں جدید طرز کے

باورچی خانے وبجلی کی سہولیات اور پانی کا جدید نظام موجود ہوتا اور غسل خانہ جدید طرز کے ہوتے ۔جن کو یہ سہولیات میسر نہ ہوتیں ان کے مکانوں میں آباواجداد کی طرح باورچی خانے، حمام وغیرہ پرانے طرز کے ہوتے جن میں اکثر وبیشتر پانی کی نکاسی کا کوئی بہتر انتظام نہ ہوتا تھا۔توانائی کا عام ذریعہ کوئلہ ،لکڑی یا کسی قسم کا تیل تھا جسے جلا کر گرمی یا روشنی حاصل ہوتی۔

جو لوگ قوم کی حکومتی ٹیم یعنی کلب میں شامل تھے ان کی آمدنی بین الاقوامی سطح کی معیشت کے مطابق ہوتی۔ پیچھے رہ جانے والوں کے لئے گھریلو معیشت سے زیادہ حاصل نہ ہوتا جس سے وہ یا تو دیہاتی زندگی گزار سکتے تھے یا پھر شہروں کی کچی آبادیوں اور خستہ حال علاقوں میں رہ سکتے تھے۔

یہ صورتحال محض تیل سے مالا مال ملکوں ہی کی نہ تھی بلکہ ان علاقوں میں وہی کچھ ہو رہا تھا جن کے یہاں تیل تو نہیں تھا لیکن سرد جنگ کے حالات میں وہ خصوصی اہمیت اختیار کر گئے تھے۔مصر، افغانستان اور پاکستان جیسے ممالک کو ترقی وارتقاء کے نام پر سرمایہ کا سیلاب حاصل تھا جس کا مقصد انہیں سرمایہ مہیا کرنے والوں کی طرف کھینچنا تھا۔سڑکوں اور ہسپتال، اسکول، ہوائی اڈے، ہتھیار، پولس کے لئے آلات، جس چیز کی ضرورت ان حکمراں اشرافیہ کو ہوتی اسے خریدنے کے لئے عطیات اور قرضے ان بیرونی ممالک سے آسانی سے مل جاتے۔ گو کہ آمدنی تیل جیسی تو نہ تھی لیکن روایتی معیشت سے حاصل ہونے والی آمدنی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی۔ اس طرح باہر سے آنے والی آمدنی نے حکمراں طبقہ کو اپنے عوام سے اور دور کر دیا کیونکہ انہیں حکومتی کاروبار چلانے کے لئے اس طبقہ سے حاصل ہونے والے ٹیکسوں پر مبنی آمدنی پر انحصار نہ تھا۔انہیں خوش رکھنے اور ان پر توجہ دینے کی بھی انہیں ضرورت نہ تھی۔اس دولت نے ان ممالک میں دو علیحدہ علیحدہ دنیائیں آباد کر دی تھیں۔

معاشروں میں یہ تقسیم اتنی واضح اور صاف تھی کہ کوئی بھی اس کا مشاہدہ بآسانی اور چشم بینا سے کر سکتا تھا۔ کیسابلانکا سے کابل تک صورتحال یہ تھی کہ ہر بڑا شہر دو حصوں میں منقسم تھا۔ایک اندرون شہر یا پرانا شہر جو کہیں قصبہ یا مدینہ کہلاتا جس میں وہ لوگ رہتے جو بچھڑ گئے تھے۔ایک دوسرا جدید حصہ جہاں دنیا کے ساتھ معاملات طے ہوتے۔شہر کے ان دونوں حصوں کے مکینوں کے لباس بھی مختلف ہوتے۔ان حصوں کی بودوباش بھی مختلف ہوتی، طرز رہائش اور عمارتوں کی تعمیر بھی مختلف طرز پر ہوتی۔ ہر دو آبادیوں کی شعوری سطح بھی الگ ہی ہوتی۔اس طرح کی تقسیم تو شاید ان تمام ممالک میں رہی ہوگی جو کبھی یورپ کی کالونی رہے تھے۔لیکن مسلم ممالک میں یہ تقسیم بہت واضح اور محسوس کی جا سکتی تھی۔

یہ بھی صحیح ہے کہ تیز رفتار ترقی کی بدولت خود یورپ بھی اسی طرح کی تقسیم کا شکار ہوا اور وہاں کے معاشرہ میں بھی دو طرح کی کلاسیں پیدا ہو گئی تھیں۔لندن میں جدید اور خیرہ کن تجارتی مرکز بھی تھا اور اس کا سستا متبادل بھی موجود تھا۔اس کے پُر رونق اور متموّل علاقے بھی تھے اور کچی وخستہ حال آبادیاں بھی تھیں۔لیکن یہ تقسیم زیادہ تر معاشی خلیج کی بنا پر تھی۔مالدار بہتر تھے۔بہتر لباس پہنتے، آسائشوں کے ساتھ رہتے، اچھے اسکولوں

میں جاتے ،اور اپنی گفتگو اور طرز ادا میں ان کی تعلیم کا اثر پایا جاتا۔لیکن یہ طبقہ امراء،غریبوں کے ایک امیرانہ اظہار سے زیادہ نہ تھا۔

لیکن مسلم دنیا میں یہ فرق صرف معاشی نہ تھا بلکہ ثقافتی بھی ہو گیا تھا۔جس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے احساس محرومی نے ان میں نو آبادیاتی استعمار کے خلاف غم وغصہ اور آزردگی پیدا کر دی تھی۔اور یہ غم وغصہ اپنے حکمراں اشرافیہ کے تئیں تھا جو کبھی کبھی عوامی شورش و بدامنی کی شکل اختیار کر جاتا اور کیونکہ ان ثقافتی طور پر منقسم ممالک میں جمہوری ادارے تھے ہی نہیں کہ ان کے ذریعہ اختلافات کو سلجھانے کی کوشش کی جاسکتی حکمراں انہیں سنجیدگی سے نہ لیکر قوت وطاقت کے ذریعہ ان شورشوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتے۔اور اس طرح وہ رول جو کالونی کے زمانے میں برسر اقتدار بیرونی قوتیں ادا کرتی تھیں وہی رویہ اب ہم قوم اور مقامی حکمران اشرافیہ نے اپنا لیا تھا۔مراقش سے مصر اور پاکستان تک جیلیں سیاسی مخالفین سے بھری ہوئی تھیں۔یہ ثقافتی اور سیاسی تنازعہ جتنا زیادہ ایران میں واضح تھا اور کسی ملک میں نہ تھا۔شاہ رضا پہلوی جس نے مصدق کی بے دخلی سے فائدہ اٹھایا تھا وہ اتاترک کی طرز کا ایک سیکولر جدیدیت پسند تھا۔لیکن اتاترک بنیادی طور پر جمہوریت پسند لیکن جابرانہ رویہ کا حامل تھا۔شاہ ایران بنیادی طور پر ایک مطلق العنانیت کا حامل اور جابرانہ ذہنیت رکھتا تھا۔اس نے خفیہ پولیس SAVAK کے نام سے بنائی کہ اس کی مدد سے ملک پر اپنی گرفت کو مضبوط کرتا رہے۔

شاہ اور اس کی ایجنسیوں کے بڑھتے ہوئے ظلم وتشدد نے ماحول کو اس کے خلاف کرنے میں مدد کی اور مخالف جدوجہد زور پکڑنے لگی۔اس مخالفت میں جمال الدین افغانی کی روح کارفرما تھی جس کی نظریاتی اساس کو سوبورن (فرانس) کے تعلیم یافتہ مسلمان سوشلسٹ دانشور ڈاکٹر علی شریعتی نے استوار کیا تھا۔شریعتی نے اسلامی جدیدیت کے ایک تصور کی نقشہ گری کرتے ہوئے مغربی طرز (Westoxification) کو مسترد کیا اور اسلامی روایت پر مشتمل ایک ترقی پذیر سوشلزم کی بنیادوں کی تلاش کا کام کیا۔مثال کے طور پر شریعتی نے کہا کہ یہ جو اسلام میں توحید پر اتنا زور ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسلام اس زمین پر رہنے والے تمام انسانوں میں ہم آہنگی اور وحدت کا پرتو دیکھنا چاہتا ہے۔جدید دور میں شرک انسانوں کو تقسیم کرتا ہے اور انہیں دولت اور نسل کی بنیادوں پر منتشر کر دیتا ہے اور اسی بنا پر یہ اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے۔شریعتی کے خیال میں حج کے موقع پر جن تین بتوں پر سنگ باری کی جاتی ہے وہ دراصل سرمایہ داری ،استبدادیت اور ریاکاری ومنافقت کے بت ہیں۔ انہوں نے اسلامی روایتوں اور قصائص کو انقلاب کی حمایت میں اور اقتدار کے خلاف عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے استعمال کیا۔مثلاً حسین کی معاویہ کے خلاف جدوجہد کو حصول آزادی ،عدل اور نجات کے لئے انسانی جدوجہد کی علامت کے طور پر پیش کیا۔اگر حسین ستّر کے قریب انسانوں کو ایک زبردست حکومت کے خلاف کھڑے ہو جانے پر تیار کر سکے تو چند سو افراد پر مشتمل انقلابیوں کے ایک خفیہ گروہ کو شاہ اور اس کے حمایتیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے میں کوئی تکلّف نہیں ہونا چاہیے۔[۳]

چنانچہ اسلامی سوشلسٹ تحریک مجاہدین خلق کے نام سے ایک خفیہ مزاحمتی تحریک بن کر اٹھی۔ ۱۹۵۰ء کے نصف سے ۱۹۷۸ء کے ایرانی انقلاب تک یہی تحریک شاہ کے خلاف جدوجہد کرتی رہی تھی اور SAVAK کے خلاف خفیہ جنگ کرتی تھی۔ مجاہدین خلق جنہیں بعض اوقات اسلامی مارکسٹ بھی کہا گیا شاہ کی کارروائیوں کا نشانہ بنے۔ انہیں قتل کیا گیا، پھانسی دی گئی، قید کر دیا گیا اور سخت ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔ شاہ یہ سمجھتا تھا کہ اس طرح وہ مزاحمت کو کچل دے گا۔ مزاحمت کرنے والے ان مردوں اور عورتوں نے جو ظلم سہے وہ ایک داستان ہے یہ صفحات جس کے بیان کے متحمل نہیں۔

لیکن اسی دوران ایران میں ایک بالکل مختلف نوعیت کی مذہبی مزاحمتی تحریک سر اٹھا رہی تھی۔ جو کٹر مذہبی مقتدرہ سے اٹھی اور جس کا مکمل اظہار ایک سخت مذہبی رہنما آیت اللہ خمینی میں ہوا۔

سنّیوں میں وہابیوں کی طرح خمینی نے کہا کہ مسلمان صحیح اسلام سے بہت دور ہٹ گئے ہیں۔ وہ اسلام جو قرآن اور رسول اللہﷺ کی روایات کی لفظی تفہیم سے اور شیعوں کے اماموں سے سامنے آتا ہے۔ خمینی کی شاہ پر تنقید اس کے ظلم و ستم پر نہیں تھی بلکہ اس جدیدیت کی بنیاد پر تھی جو اس کے ذریعہ ملک میں پھیل رہی تھی مثلاً مغربی لباس کی ترغیب، عورتوں کے حقوق، نائٹ کلبوں کو ایران میں عام کرنا وغیرہ۔

خمینی نے شیعی روایات کی بنیاد پر ایک نیا اور بنیادی سیاسی نظریہ تشکیل دیا جسکے مطابق حکمرانی اور اس کی طاقت امام غائب کے ایک منتخب نمائندے کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے اور اس نمائندے کی پہچان یہ ہوگی کہ وہ اپنے تبحرِ علمی کی بنا پر اپنے ہم عصروں سے بہت آگے ہوگا اور دوسرے علماء اس کا احترام کریں گے۔ ایسا شخص فقیہ ہوگا اور قانون سازی کا استحقاق بھی اسے حاصل ہوگا۔ خمینی نے کہا کہ دورِ جدید میں وہ شخص میں خود ہوں۔

شاہ نے ۱۹۶۴ء میں خمینی کو ملک بدر کر دیا لیکن انہوں نے اپنے ہمسایہ ملک عراق کو اپنا مسکن بنایا اور اس مرکز سے انہوں نے ایران کے جوشیلے اور وفادار لوگوں کی روز بڑھتی ہوئی تعداد کو ہدایت دینا شروع کیں۔

۱۹۶۷ء کی چھ روزہ عرب اسرائیل جنگ کے نتیجہ میں مسلمانوں کا یہ یقین اب مستحکم ہو چلا تھا کہ امریکہ ایک نیا استعمار ہے اور وہ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر اسرائیل کی معاونت سے حملہ آور ہے۔ اسرائیل کی قوت کا انحصار امریکی ہتھیاروں اور اس کی مدد پر تھا۔ یہ یقین اس وقت اور مستحکم ہو گیا جب ناصر کے جانشین انور سادات نے ۱۹۷۳ء میں ایک یہودی مذہبی دن کے موقع پر اسرائیل کے خلاف چوتھی جنگ چھیڑ دی۔ اس بار ابتداء میں مصری فوجوں نے وسیع کامیابیاں حاصل کیں لیکن اسرائیل کو امریکہ سے فوراً ضروری ہتھیاروں کی کھیپ مہیا ہو گئی جس نے رخ پھر پلٹ دیا اور یوں پھر اسرائیل ہی کامیاب رہا۔

اس عرب اسرائیل جنگ کے زمانہ میں OPEC ممالک اپنے عمومی مسائل مثلاً تیل کی قیمتوں کا تعین اور پیداواری مسائل میں اشتراک وغیرہ جیسے مسائل پر غور و خوض کرنے والے تھے۔ OPEC کا قیام ۱۹۶۰ء میں عمل میں آیا تھا اور اس کے بارہ اراکین میں نو مسلمان تھے۔ جس وقت ان ممالک کے ذمہ دار اس تنظیم

کے ایجنڈے پر بات چیت کر رہے تھے اس وقت ان کے اپنے ممالک میں عوام امریکہ اور اسرائیل کے ذریعہ عربوں کی ہزیمت پر احتجاج کر رہے تھے۔ OPEC اس وقت کوئی سیاسی رجحان نہیں رکھتی تھی لیکن ۱۹۷۳ء کی میٹنگ میں ممبران نے طے کیا کہ تیل کو بطور ہتھیار استعمال کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ان تمام ممالک کو جو اسرائیل کے حامی تھے تیل کی فراہمی پر پابندی لگا دی۔

اس فیصلہ کے نتیجہ میں تمام صنعتی ممالک میں زبردست ہڑبڑاہٹ کی لہر دوڑ گئی۔ Oregon جہاں میں اس زمانہ میں رہتا تھا گیس کی سپلائی پر راشن لگا دیا گیا اور ایک دن چھوڑ کر ہی ملنے لگی۔ گیس حاصل کرنے والے کا نمبر اس طرح متعین ہوتا کہ ان کا لائسنس نمبر Odd ہے یا Even۔ مجھے یاد ہے کہ ہم سردی کے زمانے میں سورج نکلنے سے قبل جا کر لائن لگاتے تھے تاکہ نمبر آ سکے اور گیس مل جائے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ میرا نمبر آتے آتے گیس ختم ہو گئی۔ میں سوچتا کہ شاید تہذیب کا دور ختم ہو رہا ہے اور یہ تجربات ہمیں آئندہ کی صورتحال کا اندازہ کرا رہے ہیں۔ اور سبھی لوگ اس صورتحال سے دوچار تھے۔ OPEC کی تیل پر پابندی نے تیل کی قیمت تین ڈالر فی بیرل سے بڑھا کر بارہ ڈالر فی بیرل کر دی تھی۔ اور آج جب میں یہ لکھ رہا ہوں۔ ۱۳۰ ڈالر فی بیرل تک پہنچ چکی ہے۔

میڈیا اپنے پرانے انداز میں حرکت میں آیا اور تیل کے مالک عربوں کو ایسے نقصان رساں انسانوں کی طرح پیش کرنے لگا جو پوری دنیا پر قبضہ جمانے کے لئے سازش کر رہے ہیں۔ عربوں کی یہ تصویر جواب پُراسرار طور پر بنائی جا رہی تھی بالکل اسی کی نقل تھی جو کوئی سو سال قبل یورپ کے سیاسی مخالفوں نے یہودیوں کے خلاف استعمال کی تھی اور جس میں یہودیوں کے ایک مفروضہ گروہ پر جسے انہوں نے 'ذیون کے بڑوں' کا نام دیا تھا، دنیا پر قابض ہونے کی سازش رچنے کا الزام لگایا گیا تھا۔

تیل پر کامیاب پابندی نے OPEC ممالک کو اپنی اہمیت کا احساس دلایا۔ گو کہ یہ پابندی چند ماہ باقی رہی لیکن اسکا خاتمہ ان ممالک کے اپنے وسائل پر مزید کنٹرول کے حصول کی شکل میں ہوا۔ جس کے نتیجہ میں ان ممالک کی اشرافیہ مزید دولتمند ہوتی گئی اور مسلمان معاشروں میں جو تقسیم پہلے سے چلی آ رہی تھی وہ اور گہری اور وسیع ہوتی گئی۔

اس دوران دارالاسلام میں متحرک سیکولر قوتیں اپنے اپنے ملبوس کو جدید یانے کی کوششوں میں لگی رہیں اور بین الاقوامی قوتوں سے مقابلہ کرتی رہیں۔ لیکن ان ممالک میں پیچھے رہ جانے والی آبادی کا بڑا حصّہ جو مسلمانوں کے احیاء کے لئے کوشاں تھا اور ہر ملک میں اسے دبایا جا رہا تھا اور جس میں اسلام کے سیاسی احیاء کے پُرجوش حامی مثلاً سلفی، وہابی، دیوبندی، جہادی وغیرہ شامل تھے وہ نمو پذیر رہا اور فروغ پاتا رہا۔ اس گروہ نے صورتحال کے پیش نظر اس دنیا کو دو گروہوں میں منقسم پیش کیا۔ ایک وہ جو پُرامن اور انصاف کا علمبردار اور دوسرا وہ جو مسلسل جنگ کرتے رہنے کا قائل۔ ایک میں مسلمانوں کے درمیان بھائی چارگی کی فضا پائی جاتی تھی اور دوسرا

گروہ ظاہر پرستوں کی طرح ہوس اور لالچ کا شکار تھا۔

جن لوگوں کے درمیان ان تصورات اور تجزیوں کو پیش کیا جاتا وہ جب حالات کو دیکھتے تو یہ دنیا ایسی ہی نظر آتی۔ یعنی دو گروہوں میں منقسم اس تقسیم کو محسوس کیا جانا ذرا بھی مشکل نہ تھا۔ اس سے انکار کوئی نابینا ہی کر سکتا تھا۔ اور جب جہادیوں نے یہ پیش گوئی کرنا شروع کی کہ اب ان دو قوتوں میں الٰہی فیصلہ کے تحت مہم جوئی کا آغاز ہونے والا ہے یعنی جو محمدؐ پر اتاری گئی۔ وحی کے وفادار ہیں اور روگردانی کرنے والے نہیں ہیں اور وہ جو شیطان کے حامی ہو گئے ہیں اور مسلمانوں کو اللہ سے دور کرنے کی کوششوں میں شامل ہیں ان میں مقابلہ آرائی ہو کر رہے گی تو وہ لوگ جو ان منقسم معاشروں میں رہتے تھے سمجھ گئے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی ہر صبح اپنی بڑھتی ہوئی محرومیوں کے مناظر اور احساس کے ساتھ ہوتی جبکہ ٹیلی ویژن اسکرین انہیں قصبوں اور شہروں میں ایسے افراد بھی دکھاتا جو بالکل دوسری دنیا میں آباد تھے۔ ایسی دنیا جہاں دولت تھی، وسائل تھے اور تصور میں آنے والی ہر سہولت تھی۔ محروم دنیا کے لوگ اس پیش گوئی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور جوش سے معمور یہ تصور کرنے لگے کہ شروع ہونے والی جدوجہد انہیں زمین بھی عطا کرے گی اور جنت بھی اور وہ ان خدا دشمن اشرافیہ کو اکھاڑ کر پھینک دیں گے۔

لیکن مغربی دنیا میں ۱۹۷۰ء تک اس بڑھتے ہوئے اور دھماکہ خیز غم وغصہ پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ مغرب اپنے غالب عالمی تاریخی بیانیہ کی روشنی میں یہ سمجھتا رہا کہ اس طرح کے لوگ دراصل گزرے زمانہ کی باقیات ہیں جو بتدریج ختم ہوتی جائیں گی جوں جوں ترقی پذیر ممالک ترقی یافتہ ہوتے جائیں گے اور ظالم وجابر حکمراں اپنے رویے کو غلط تسلیم کر کے جمہوریت کی راہ ہموار کرنے میں معاونت کریں گے۔ تعلیم عام ہونے کے نتیجہ میں غیر عقلی اعتقاد کی جگہ سائنس مقبول ہو جائے گی اور محدود سطحی جذبات کے بجائے غیر جانبدار اور جذبات سے ماوراء عقلی رویّہ انسانوں کے راہنما ہوں گے۔ اس غالب نقطہ نظر کے مطابق مسلم ممالک اور اسی طرح دوسرے مقامات کے لوگ جس صورتحال سے گزر رہے تھے اس کی وجہ انکی معاشرتی خستہ حالی نہیں بلکہ ان کے تصورات اور خیالات تھے۔ اور پھر یوں ہوا کہ عالم اسلام کے سیکولر اور جدیدیت پسند بکھرنا شروع ہو گئے۔

آغاز پاکستان کے ذوالفقار علی بھٹو سے ہوا۔ ایک شائستہ اور برکلے کا تعلیم یافتہ پاکستانی وزیر اعظم بائیں بازو کے خیالات سے ذرا متاثر اور سیکولر خیالات کی حامل پیپلز پارٹی کا رہنما تھا۔ ۱۹۷۷ء میں ایک اسلام پسند فوجی جرنل ضیاء الحق نے اس کا تختہ پلٹ کر قید کر دیا اور بہت جلد پاکستان کے دیوبندی اس کے سر کا مطالبہ کرنے لگے۔ ایک نقلی عدالت نے غیر واضح جرائم کی بنیاد پر موت کی سزا سنادی اور یوں بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ تیرہ سال قبل مصر میں سید قطب بھی اسی انجام سے دوچار ہو چکے تھے۔

اس کے بعد شاہ ایران کا زوال تھا۔ ۱۹۷۸ء میں بائیں بازو کے سیکولر، اسلامی سوشلسٹ اور خمینی کے شیعہ انقلابیوں کے اتحاد نے شاہ کو ملک بدر کرایا اور ایک لمحہ کے لئے یہ لگا کہ مجاہدین خلق اور ان کے جدیدیت

پسند اتحادی ایران میں ایک ترقی کی طرف مائل حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس کی بنیاد ان کے نئے نظریہ اسلامی سوشلزم پر ہوگی۔

لیکن خمینی نے بڑی عیاری اور چالاکی سے دوسرے تمام سیاسی فریقوں کو انقلاب ایران میں مات دے دی۔ چار نومبر ۱۹۷۹ء کو خمینی سے وابستہ نوجوان طلبہ کے ایک گروہ نے امریکی سفارتخانہ پر قبضہ کر کے چھیاسٹھ امریکیوں کو غلام بنالیا۔ امریکہ کے خلاف کوئی ایک سال تک جاری رہنے والے اس مقابلہ میں خمینی نے اپنے مقامی مخالفوں کو کمزور کرنے اور اپنی گرفت مضبوط کرنے میں استعمال کیا[۲۲]۔ لیکن شاید خمینی کی کامیابیوں کو ان کی چالاکی اور کامیاب حکمت عملی کی بنیاد پر نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ خمینی کی زبان اس دور کے ایرانی عوام کے جذبات اور اندرونی احساسات کی عکاسی کرتی تھی۔ اس کے ذریعہ سیکولر جدت پسندوں کی اپنائی ہوئی راہ کو ٹھیک تو نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن ان تمام تحریکوں کو جو اس راہ پر گامزن تھیں ختم کیا جاسکتا تھا اور اسلام کو ایک اور موقع دیا جاسکتا تھا۔ جو بھی ہو ۱۹۸۰ء میں خمینی نے ایران کو ایک اسلامی رِپبلک کا رخ دے دیا۔ اب یہ اسلامی رِپبلک ایران کے انتہائی کٹر شیعی علماء کے زیر حکمرانی تھی۔

اس کے بعد افغانستان کے جدت پسند کا زوال تھا۔ ان کی ناکامی کا آغاز اس وقت ہی ہو گیا تھا جب ان کے انتہائی شدید سیکولر مقاصد کو ایک تھوڑے عرصے کے لئے کامیابی مل گئی تھی۔ کمیونسٹوں کے ایک مختصر گروہ نے ۱۹۲۰ء سے قائم نادر شاہ کی خاندانی بادشاہت کا تختہ الٹ دیا جس کے نتیجہ میں اس خاندان سے وابستہ جو بھی شخص اس وقت فرار نہ ہو سکا قتل کر دیا گیا۔ پھر سوویت یونین نے حملہ کیا اور افغانستان کو براہ راست اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ لیکن بائیں بازو کی طرف یہ جھکاؤ نہ صرف لمحاتی تھا بلکہ بے معنی بھی تھا کیونکہ اس کے نتیجہ میں پورے ملک میں قبائلی سطح تک ایک زبردست بغاوت پھیل گئی۔ اس آٹھ سالہ سوویت مخالف گوریلا جدوجہد کے نتیجہ میں اسلام کے پرجوش حامیوں کو تمام تر قوت حاصل ہوگئی۔ اور محض اتنا ہی نہیں بلکہ دیہاتوں سے ابھری اس بغاوت نے پوری مسلم دنیا سے اسلام کے پرجوش حامیوں کو افغانستان کی طرف کھینچا۔ جسمیں عالم عرب کے جہادی اور پاکستان کے دیوبندی بڑی تعداد میں شامل تھے۔ ان سب کے پیچھے خلیج فارس کے تیل سے مالا مال اور وہابی نظریات کے حاملین کی دولت تھی۔ افغانستان کے میدان جنگ میں جنھوں نے اوّل اوّل خون کا مزہ چکھا اُن میں اسامہ بن لادن بھی شامل تھا۔

حقیقت میں بیسوی صدی کی آخری دہائیوں میں سیکولر جدت پسندوں کو ہر جگہ ناکامی ہی حاصل ہوئی۔ الجیریا میں سیکولر حکومت، اسلامی سالویشن پارٹی کی جدوجہد کا نشانہ بنی۔ فلسطین میں PLO کو اسلامی حماس کے لئے جگہ خالی کرنا پڑی اور اسلامک جہاد نام کا ایک جنگجو گروپ بھی اس علاقہ میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ لبنان کے جنوبی علاقوں میں جہاں فلسطینی مہاجرین آباد تھے اسرائیل کے متعدد حملوں کے نتیجہ میں وہ علاقہ خالی کر گئے بیروت کو تباہ کر دیا اور PLO کا ہیڈ کوارٹر ٹیونیشیا منتقل ہو گیا۔ لیکن اس کے نتیجہ میں شیعی

شدت پسندوں کی حزب اللہ کو ابھرنے کا پورا موقع ملا اور نتیجہ کے طور پر ملک کے نصف جنوب میں وہ عملاً حکمراں ہوگئی اور اسرائیل کے لئے وہ اتنی ہی تباہ کن ثابت ہوئی جتنی PLO ہو سکتی تھی۔

شام اور عراق میں اخوان المسلمون بعث پارٹی کے ساتھ ایک شدید جدو جہد کرتی رہی۔ یہ انتہائی خونی جدو جہد مغرب میں مکمل طور پر نظر انداز کردی گئی تھی۔ بعث پارٹی اسلامی بغاوت کو انتہائی شدید اقدامات کے باوجود ختم نہ کرسکی۔ حالانکہ شام کے اس وقت کے صدر حافظ الاسد نے حماۃ (Hama) کی خاصی بڑی آبادی کو مکمل طور پر ختم کردیا تھا۔

اسی طرح عراق کا حکمراں صدام حسین ایک سیکولر جدیدیت پسند تھا اور اسلام کے حامیوں کا زبردست مخالف۔ ۱۹۸۰ء میں خمینی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اس نے ایران پر براہ راست حملہ کردیا۔ شاید اس کا اندازہ تھا کہ اس وقت اندرونی خلفشار کی بنا پر یہ وقت مناسب ہے اور غالباً ایران کا تیل اس کی گرفت میں آسکتا ہے اور شاید یہ وجہ بھی تھی کہ اسے خمینی سے خطرہ لاحق تھا۔ کیونکہ خمینی یہ اعلان کر چکے تھے کہ وہ اس انقلاب کو جو ایران میں آیا ہے دوسرے ممالک میں بھی پہنچائیں گے۔ عراق اِس اعتبار سے موزوں تھا کہ وہاں شیعہ آبادی کی اکثریت اس انقلاب کے لئے زیادہ زرخیز تھی۔ صدام حسین کا مقصد جو کچھ بھی رہا ہو یہ جنگ دونوں کے لئے انتہائی تباہ کن ثابت ہوئی۔ دونوں ممالک کے نوجوانوں اور لڑکوں کی ایک پوری نسل اس جنگ کی نذر ہوگئی۔ جنگ عظیم اول کے بعد اتنی بڑی فوجیں ایک دوسرے سے نبرد آزمانہ ہوئی تھیں اور انتہائی معمولی مقاصد کی خاطر اتنی آسانی اور لاپرواہی سے انسانوں کا خون بہا تھا۔ اس پوری جنگ کے دوران امریکہ، عراق کو ہتھیار اور سرمایہ کی فراہمی کرتا رہا تھا کہ عراق آخر وقت تک جب تک ایک عراقی بھی باقی رہے جنگ کرتا رہے۔ امریکہ کا بنیادی مقصد ایران کو مکمل طور پر کھود دینے کے بعد اس علاقہ میں سوویت روس کو قدم جمانے سے روکنا تھا۔ عراقیوں کی مدد سے وہ ایران کو کمزور اور سوویت روس کو آگے بڑھنے سے باز رکھنا چاہتا تھا۔ اس عظیم تباہی اور بربادی میں دو مختلف بیانیے یعنی مغربی اور مسلم بیانیہ پوری طرح کارفرما نظر آتا ہے۔ ایک بیانیہ اب بھی سیکولر جدیدیت کے خلاف اور بنیادی اسلام کی طرف رجوع کا داعی نظر آتا ہے اور دوسرا عظیم عالمی طاقتوں کی رقابت اور تیل پر کنٹرول سے عبارت لیکن جمہوریت اور مطلق العنانی سے متعلق بیان بازی سے مزین۔

ایران عراق جنگ ۱۹۸۸ء میں اس طرح ختم ہوئی کہ کوئی بھی فاتح نہ تھا۔ البتہ اگر یہ دیکھیں کہ اس جنگ کے نتیجہ میں ایران کا وجود باقی رہا تو ایران کو فاتح کہا جائے گا۔ البتہ عراق کو تباہی کا سامنا تھا اور اس بے مقصد خون خرابے کے نتیجہ میں اس کا خزانہ بالکل خالی ہو چکا تھا۔ صدام کوئی دو سال تک اپنے زخموں کو چاٹتا رہا اور پھر ۱۹۹۰ء میں اس نے اپنے ہونے والے نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کی۔ صدام نے ایک ایسا اقدام کیا جس سے یا تو دوگنا فائدہ ہوتا یا بالکل ہی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ یعنی اس میں کسی مزید نقصان کا امکان نہ تھا۔ پڑوسی ملک کویت پر قابض ہوکر اس نے وہاں کے تیل کو اس بھرپائی کے لئے استعمال کرنا چاہا۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ

امریکی سفیر April Gillespie نے صدام کو یقین دلایا تھا کہ اس کوشش میں امریکہ اس کا ساتھ دے گا۔

اس کے برخلاف امریکہ نے ۳۴ ممالک پر مشتمل اپنی قیادت میں ایک اتحاد تشکیل کیا اور اپنے پرانے حلیف پر ایک زبردست حملہ کر دیا جو Desert Storm کے نام سے مشہور ہے۔ زبردست بمباری کے نتیجہ میں عراق کا تمامتر انفرااسٹر کچر تباہ ہو گیا اور صدام کے وہ قابل رحم فوجی جو بصرہ کی طرف لوٹ رہے تھے آگ لگانے والے بموں کا شکار ہو گئے۔ جس شاہ راہ سے وہ واپس آ رہے تھے اسے شاہ راہ موت کہا گیا۔ اس بار عراق کی شکست قطعی مکمل اور غیر مبہم تھی۔ لیکن جنگ کے اختتام پر صدام حسین اب بھی برسر اقتدار تھا اور اس کے اصل ملٹری دستے جو Republican Gurds کہلاتے تھے موجود تھے جن میں یہ صلاحیت باقی تھی کہ وہ کسی مقابل کو کچل سکیں جیسا کہ مغرب کے ہاتھوں شکست کے بعد ہونے والی بغاوت کو انہوں نے کچل ڈالا تھا۔

جنگ کے بعد اقوام متحدہ نے عراق پر پابندیاں عائد کر دیں جن کے نتیجہ میں عام عراقی شہری اس زمانہ یعنی ۱۹۹۰ء میں اس سرزمین کے کمزور اور غریب ترین درجہ تک پہنچ گئے تھے۔ آمدنی ۹۵ فیصد تک کم ہو گئی بیماریاں پھیلیں اور دواؤں کی خریداری بھی ممکن نہ رہی پابندیوں کی بنا پر دوسو ہزار سے زیادہ اور کم از کم نصف ملین بچے براہ راست ان پابندیوں کی بنا پر موت کا شکار ہوئے۔ اقوام متحدہ کے ایک کارکن Denis Halliday نے یہ کہہ کر استعفیٰ دے دیا کہ پانچ ہزار بچے ہر ماہ موت کا شکار ہو رہے ہیں میں کسی ایسے پروگرام کی نگرانی نہیں کر سکتا جس میں اتنی اموات ہوتی ہوں۔[5] عراقی عوام جو گذشتہ کئی سالوں سے جنگ اور پولیس اسٹیٹ کے درمیان پس رہے تھے اب مزید بلکہ نا قابل تخیّل مکروہ حالات کا شکار ہو گئے۔ عراقی معاشرہ کا وہ واحد حصہ جس پر ان پابندیوں کا زیادہ اثر نہیں ہوا تھا وہ بعث پارٹی سے وابستہ طبقہ اشرافیہ اور صدام حسین اور اس کے ساتھی تھے جنہیں ان پابندیوں کے ذریعہ اصلاً سزا دینا مقصود تھا۔

مشرق کی طرف سوویت یونین کو جس نے افغانستان پر عراق کے ایران پر حملہ سے کوئی ایک سال قبل حملہ کیا تھا افغانستان خالی کرنا پڑا جس کے سال بھر بعد عراق نے بھی ایران چھوڑ دیا۔ گو کہ افغانستان میں کمیونسٹ تین سال بعد تک مزید حکمراں رہے لیکن جب وہ بالآخر زیر ہوئے تو اس وقت سوویت روس کا پورا نظام منتشر ہو رہا تھا۔ مشرقی یورپ میں اس کی بخیہ ادھڑ رہی تھی، اس سے وابستہ جمہوریتیں اور خود روس بھی آزادی کا اعلان کر رہی تھیں اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہا جب یہ سوال ہی ختم ہو گیا کہ آزادی کس سے حاصل کی جائے۔

ایک امریکی قدامت پسند مورخ فرانسس فوکویاما نے لکھا کہ سوویت یونین کا بکھر جانا محض اس بات کا اعلانیہ نہ تھا کہ اب سرد جنگ ختم ہو جائے گی۔ بلکہ یہ دراصل تاریخ کا اختتام تھا۔ آزاد و سرمایہ دارانہ جمہوریت فاتح ہو گئی تھی اور اب کوئی نظریہ اس پوزیشن میں نہ تھا کہ اسے چیلنج کر سکے۔ اب تھوڑا بہت صفائی کا کام بچا تھا جبکہ پوری دنیا واحد سچائی کی طرف عازم سفر ہو چکی تھی۔ مصنف نے یہ نظریہ اپنی ایک کتاب *The End of History and the Last Man* میں پیش کیا تھا۔

دوسری طرف جہادی اور وہابی ان ہنگامہ خیز واقعات سے دوسرے ہی نتیجے پر پہنچ رہے تھے۔ ایران میں یہ خیال عام تھا کہ اسلام نے شاہ ایران کو گرایا اور امریکہ کو نکل جانے پر مجبور کیا ہے۔ افغانستان کے پس منظر میں یہ خیال عام تھا کہ مسلمانوں نے نہ صرف سرخ فوج کو شکست دی ہے بلکہ سوویت یونین کو بھی بکھیر دیا ہے۔ ان کے پیش نظر جہادیوں کو خود ان واقعات میں ایک تسلسل نظر آیا اور انہوں نے سوچا کہ اولین گروہ نے اپنے وقت کی دو عالمی قوتوں یعنی بازنطینی اور ساسانی سلطنتوں کو شکست سے دوچار کیا تھا کیونکہ خدا اس گروہ کے ساتھ تھا۔ آج کا مسلمان بھی ان دو بڑی طاقتوں کے بالمقابل ہے۔ ایک طاقت کو وہ مکمل طور پر ختم کر چکے ہیں۔ ایک ختم ہو چکی اور دوسری ختم ہونے والی ہے۔ وہابی اور جہادی اس طرح دیکھتے اور سوچتے تھے۔ کیا واقعی تاریخ اپنے اختتام کے قریب ہے؟ امکان کی دنیا سے دور کا خیال۔۔۔۔ البتہ تاریخ بہت دلچسپ ہوتی جا رہی تھی۔

سالہا سال سے وہ اس دنیا کو دارالسلام اور دارالحرب کی اصطلاحوں میں بیان کرتے آئے تھے۔ سالہا سال سے وہ حق و باطل کے درمیان ہونے والے معرکہ کا حوالہ دیتے آئے تھے اور کہتے آئے تھے کہ یہ معرکہ جو شیطان اور خدا کے درمیان ہوگا دراصل ایک عظیم عالمگیر معرکہ ہوگا۔ جو تمام تضادات کو ختم کر دے گا اور تمام فرقوں کو مٹا کر ایک ملتِ واحدہ قائم کرے گا۔ یعنی مدینہ اب آفاقی اور ہمہ گیر ہو جائے گا۔

مغرب کے نزدیک سرد جنگ کے خاتمہ کا مطلب یہ تھا کہ اب امریکہ کو افغانستان پر پیر جمانے کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ ان کے لئے اب وہاں کچھ بچا ہی نہیں۔ امریکہ اور اس کے مغربی حلیفوں نے کھربوں ڈالر کے ہتھیار اور دولت سے اس ملک کو بھر دیا تھا لیکن اب وہ اس سے مکمل طور پر علیحدہ ہو گئے اور ایسے تمام مشوروں کو مسترد کر دیا جن میں کہا گیا تھا کہ وہ کسی عالمی کانفرنس کی ذمہ داری لیں اور امن کے قیام کی کوششوں میں شامل ہوں، کسی سیاسی حل کی ابتدا کرائیں تاکہ یہ ملک پھر سے سول انتظامیہ اور امن کی بحالی کے لئے استوار ہو جائے۔ CIA کے ذمہ دار Milton Bearden نے اس علیحدگی کی وجہ محض چند الفاظ میں بیان کر دی جب اس نے کہا کہ ''افغانستان کے لئے کوئی لیڈ اور گوبر بھی دینے کو تیار نہیں'' مختلف قبائلی فوجیں جنہوں نے سوویت روس سے جنگ کی تھی اب وہ آپس میں حاصل شدہ ہتھیاروں سے لڑ رہے تھے محض اپنے قبضہ کو بڑھانے کے لئے۔ سوویت نے افغانستان کے اندرون کو تباہ کیا تھا۔ اس گوریلا قبائلی جنگ کے نتیجہ میں بڑے بڑے شہر تباہ ہو گئے۔ ۸۰ کی دہائی میں بیرون سے آنے والے جہادیوں نے افغانستان کی جنگ میں حصہ لیا تھا اور اب وہ افغانستان کو مغرب کے خلاف اپنی جدوجہد کا مرکز بنانے لگے۔

پہلا قدم یہ تھا کہ افغانستان میں اولین کمیونٹی کی طرز پر ایک صاف اور خالص معاشرہ قائم کیا جائے جس میں مرد اور عورتیں اور بچے وحی کے الفاظ کے مطابق خدائی قانون کے تحت، جسے وہ خدائی قانون سمجھتے تھے، زندگی گزاریں اور بصورت دیگر سزا کے مستحق ٹھہریں۔ اس بنا پر جہادیوں نے سعودی وہابی سرمایہ کی بنیاد پر طالبان کی تشکیل میں مدد کی۔ یہ پارٹی انتہائی فرسودہ خیالات کی حامل تھی اور افغانستان و پاکستان کی غیر واضح

سرحدوں پر قبائلی علاقوں میں پھیلے ہوئے پناہ گزیں کیمپوں میں تشکیل پائی تھی۔

نتیجہ کے طور پر انہیں جنگجو جہادیوں کے کسی چھوٹے سے گروہ نے افغانستان کے مردہ جسم میں کہیں چھپ کر ایک سازش رچی کہ ایک ہوائی جہاز کو ہائی جیک کر کے نیویارک میں قائم ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور واشنگٹن میں موجود پنٹاگن سے ٹکرا دیا جائے۔

اس روز ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء دنیا کی دو تاریخیں آپس میں ٹکرا گئیں جس کے نتیجہ میں حتمی طور پر ایک بات واضح ہوگئی۔فو کی یاما غلطی پر تھا۔تاریخ ختم نہیں ہوئی۔

بعدازاں

گو کہ تاریخ ابھی کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ پائی اور نائن الیوین اور مابعد واقعات ابھی تک ان مراحل سے نہیں گزر سکے کہ یہ تاریخ کے حصار میں آسکتے۔ ابھی تک یہ صحافیوں ہی کے دائرے میں محدود رہے ہیں اس کے باوجود اس پورے وقوعہ کو دوباہم دیگر بیانیوں کے انقطاع کے مظہر کے طور پر سمجھنے کی کوشش کرنا قبل از وقت نہیں کہا جاسکتا۔

نیویارک شہر اور واشنگٹن پر دہشت گردانہ حملوں کے فوراً بعد محض چند ہی مہینوں کے اندر اندر صدر بش نے امریکہ کو فوجی کاروائی کے لئے تیار کرلیا جس میں اس لفاظی کا استعمال تھا جو ایک طویل عرصہ سے امریکہ اور مغربی دنیا کا موضوع اور مصدر چلا آرہا تھا۔ بش نے کہا کہ دہشت گرد ہماری آزادی اور جمہوریت کی تباہی کے درپے ہیں لیکن ہمیں اپنے خون اور سرمائے سے ہر حال میں ان کی حفاظت کرنا چاہئے۔ یہ نعرے وہی تھے جو تیس کی دھائی میں نازیوں کے خلاف اور پچاس کی دہائی میں کمیونزم کے خلاف بلند کیے گئے تھے۔ اس کے بعد امریکہ اور اس کے شامل اتحادیوں نے عراق میں لاتعداد فوجی اتار دیے جنھیں ایک ایسی جنگ لڑنی تھی جس کی بیان بازی میں ویسی ہی اصطلاحات استعمال کی گئی تھیں جو سرد جنگ اور بیسویں صدی کی عالمی عظیم جنگوں میں استعمال ہوئی تھیں اور جن کا تذکرہ ہم مغربی تاریخی بیانیہ کے باب میں پہلے ہی کر چکے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ نائن الیون کے مرتکبین کیا واقعی مغرب میں آزادی اور جمہوریت کو ختم کرنے کے خواہاں تھے۔ اور کیا آزادی سے نفرت کا جذبہ ہی آج کے جارح سیاسی اسلامی انتہا پسندوں کو تحریک فراہم کرتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو عجیب بات یہ ہے کہ ان جہادیوں کے بیانات خطبات اور گفتگو میں یہ کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ بلکہ اس کی توجہ مخصوص طور پر نہ تو آزادی اور اس کے متضاد پر ہوتی ہے اور نہ ہی جمہوریت اور اس کے متضاد پر بلکہ وہ ادب وتہذیب کے برخلاف انحطاط وزوال پر اور اخلاقی پاکیزگی کے برخلاف اخلاقی بگاڑ اور بدعنوانی پر تنقید کرتے ہیں اور یہ اصطلاحیں مسلم معاشروں پر صدیوں تک مغربی غلبہ کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں گروہی انتشار پیدا ہوا ہے، خاندان ٹوٹے ہیں اور اسلامی اقدار میں فرسودگی کا عمل متعارف ہوا ہے۔ شراب نوشی میں اضافہ ہوا ہے اور مذہب کی جگہ تفریح وتماشہ میں انہماک بڑھتا جارہا ہے، اہل ثروت خدا بیزار ہوتے جارہے ہیں اور غریب اور امیر کے درمیان فاصلے وسعت پذیر ہیں۔

ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ''تم زوال پذیر اور ابتر ہو''، دوسرا اس کے جواب میں کہتا ہے ''ہم آزاد ہیں'' اس طرح حجت اور بحث انتہائی غیر متعلق دلیلوں کے ہجوم میں آگے بڑھتی رہی ہے۔ یہ گروہ اپنے اپنے بیانیہ میں ایک دوسرے کو ایک کردار کے طور پر متعارف کراتے اور قابل نفرت اوصاف سے ان کی شناخت کراتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں خمینی نے امریکہ کو شیطان عظیم کہا اور دوسرے اسلامی انقلابیوں نے بھی اس ٹائٹل کی حمایت کی۔ ۲۰۰۸ء میں یونیورسٹی آف میری لینڈ میں تاریخ کے پروفیسر Jafferey Herf نے اسلام پرستوں کو

جدید دور کے نازیوں کا نام دیا جو قلبی طور پر یہود مخالف اور عورتوں سے نفرت کرتے ہیں۔ عام تجزیہ یہی ہے۔
Herf اور اس جیسے دوسرے لوگ اسلام پسندوں کے عقیدہ کا مطلب ایک ایسے معاشرہ کی طرف دعوت سمجھتے ہیں جس میں لوگوں کے سر قلم کیے جاتے ہیں، ہاتھ کاٹ دیئے جاتے ہیں اور عورتوں پر بوجھ لادا جاتا ہے۔ اور اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ جہاں بھی یہ اسلامی انتہا پسند برسر اقتدار آئے انہوں نے یہ کام انجام بھی دیے ہیں۔ لیکن یہ انتہا پسند مسلمان جھگڑے کی اصل بنیاد جس نے دنیا کو تقسیم کر رکھا ہے اس نقطۂ نظر کو سمجھتے ہیں کہ کیا اس دنیا کا واحد خدا ہے؟ بہت سے خدا ہیں یا خدا ہے ہی نہیں۔ ان کے خیال میں دنیا کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے اگر دنیا خدائے واحد کو تسلیم کرے اور محمدؐ کو خدا کا خصوصی ترجمان۔

مغرب کے سیکولر دانشور ضروری نہیں ہے کہ خدا کے بارے میں اختلاف ہی کرتے ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بھی کوئی اہم سوال ہے۔ ان کے نزدیک بھی اور خود ہمارے نزدیک بھی بنیادی مسئلہ ان طریقوں اور رویوں کی تلاش ہے جو انسانی ضروریات اور مسائل کو اس طرح حل کریں کہ ہر ایک کو یہ احساس ہو کہ وہ اپنے مستقبل کی تعمیر کے فیصلوں میں خود بھی شریک ہے۔ خدا ایک ہے یا بہت یا ہے ہی نہیں یہ سوالات ہمیشہ اختلافی رہیں گے اور انہیں لڑائی اور جھگڑے کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ ان سوالات کا حل بھوک، غربت، جنگ، جرائم، اور اونچ نیچ اور نابرابری، ناانصافی، کرۂ ارض کی حرارت (گلوبل وارمنگ) کم ہوتے ہوئے قدرتی وسائل اور انسانیت کو درپیش ایسے ہی دوسرے مسائل کو ختم نہیں کر سکتا۔ سیکولر نقطۂ نظر کے حامل افراد کی پوزیشن یہ ہے۔

لیکن یہ واضح رہے کہ سیکولر اور مغربیت مترادف اور ہم معنی نہیں ہیں۔ حالانکہ اسلام پسند کچھ اسی طرح سوچتے ہیں۔ ۲۰۰۱ء میں سٹی یونیورسٹی نیویارک کے ایک سروے کے مطابق امریکی آبادی کا ۸۱ فیصد کسی منظم مذہب سے متعلق تھے جس میں ۷۷ فیصد عیسائیت سے وابستہ تھے۔ باقی کی بڑی تعداد خود کو روحانیت پسند کہلانا پسند کرتے تھے۔ ملحدین کی تعداد اتنی کم تھی کہ انہوں نے اسی سروے میں اپنے آپ کو شمار کرانا بھی پسند نہیں کیا۔ آج کی دنیا میں جو جھگڑا ہے وہ مذہب پسندوں اور ان کے مخالفوں کے درمیان ہے ہی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جنگ کے اپنے مذہبی پرستار ہوتے ہیں جو خدا کو سیاست میں مرکزی مقام دیتے ہیں۔ اس میں ممتاز ترین انجیلی عیسائی (Christian Evangelicals) ہیں جنہوں نے ۱۹۷۰ء سے امریکہ کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ طارق علی نے نائن الیون کے بعد ایک کتاب *The Clash of Fundamentalism* تصنیف کی جس میں مصنف کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اسلام اور مغرب کے درمیان پائی جانے والی بے چینی دراصل دونوں گروہوں کے بنیاد پرست انتہا پسندوں کے درمیان بنیادی طور پر ایک مذہبی مناقشہ ہے۔ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ دونوں متقابل گروہ عقیدۃً متصادم نہیں ہیں۔ عیسائی بنیاد پرست ضروری نہیں ہے کہ خداؤں کی تعداد پر اختلاف کریں کیونکہ ان کے نزدیک یہ کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ان کی پوری بحث دراصل اس بات کو تسلیم کرنے سے متعلق ہے کہ عیسیٰ نجات دہندہ ہیں۔ جبکہ کوئی مسلمان کبھی بھی محمدؐ کو نجات دہندہ نہیں کہہ سکتا۔ چنانچہ مسلمان اور عیسائی بنیاد پرستوں میں اصل تنازع توحید

اور عیسیٰ کے نجات دہندہ ہونے کے عقیدہ پر مشتمل ہے۔لیکن ان کی بھی کوئی زیادہ اہمیت نہیں۔ دو الگ گروہ آپس میں گفتگو کرتے ہوئے ان نکات پر بحث کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عالم اسلام ہو یا مغرب مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے ایک ہی قسم کے واقعات کا شکار ہوتے ہیں جن کے نتائج بہت واضح ہیں۔۲۰۰۱ء کے بعد امریکی حکمت عملی طے کرنے والوں کی سرگرمیاں اس خیال پر مرتکز تھیں کہ آج کی دہشت گردانہ سرگرمیاں دراصل قومی ریاستوں میں حصول اقتدار کی کشاکش کے وسیع تر فریم میں سمجھی جاسکتی ہیں۔ ویسے بھی صدیوں پر محیط یورپی جنگیں بھی اسی پس منظر میں ہوتی تھیں۔ بلکہ سرد جنگ کی کشاکش بھی نظریاتی بنیادوں پر قائم حکومتوں کے درمیان ہی تھی۔اسی لئے نائن الیون کے فوراً بعد بش انتظامیہ نے خاص دہشت گردوں کی طرف جو توجہ دی تھی وہ دراصل ان حکومتوں کی متلاشی تھی جو ان دہشت گردوں کی پشت پناہی کرسکتی تھیں۔ چنانچہ امریکی ماہرین اور دوسرے مغربی تجزیہ نگاروں نے ایسے ہی کسی مخالف اور اسی طرح کے کسی ملک کو نشانہ بنانا چاہا جیسا کہ وہ ماضی میں کر چکے تھے۔

چنانچہ ابتدائی توجہ افغانستان اور اسامہ بن لادن پر کرنے کے بعد بش انتظامیہ نے مکمل طور پر صدام حسین اور اس کے عراق کو ایک حکومت کی شکل میں تلاش کرلیا جو دہشت گردی کے اس عمل کو قوت پہنچا رہی تھی اور مغربیوں کے لئے مسلسل خطرہ بنی ہوئی تھی۔ان کی حکمت عملی کے تحت صدام حسین کا خاتمہ اور عراق پر قبضہ کے باوجود دہشت گردی ختم نہ ہوسکی۔ چنانچہ اب ان کا مرکزِ توجہ ایران ہوگیا۔اور اس کے انجام کی روشنی میں بقیہ دوسرے ممالک مثلاً شام، لیبیا، سعودی عربیہ اور پاکستان اور دوسری اقوام کے ساتھ رویہ طے ہوگا کیونکہ ان پر بھی یہی الزام ہے کہ وہ قومی سطح پر دہشت گردوں کی پشت پناہ بنی ہوئی ہیں۔

اپنے مغربی بیانیہ میں پوری طرح رنگی ہوئی پالیسیوں سے یہ عیاں ہے کہ امریکہ کی تشخیص یہ ہے کہ جمہوریت اور انتخابات کے ذریعہ ہی عراق ہو یا افغانستان اور اسی طرح کے دوسرے ممالک میں مقامی مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ایک بار کامیاب انتخابات ہوجائیں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ممالک اب جمہوری ریاستیں بن چکی ہیں اور کم از کم بہتر دنوں کی جانب گامزن ہوگئی ہیں۔

لیکن مجھے مابعد طالبان، افغانستان میں ہونے والے انتخابات بار بار یاد آتے ہیں۔ پورے ملک میں عوام نے اقوام متحدہ کے زیر انتظام ایک بڑی قومی میٹنگ کے لیے اپنے اپنے نمائندے منتخب کیے کہ وہ آئندہ کے لئے ایک جمہوری حکومت، پارلیامنٹ، دستور، صدر مملکت اور وزارت وغیرہ جیسے امور کے متعلق فیصلوں میں حصہ لیں۔کابل کے نواح میں پغمان نام کے ایک مقام پر گرمی کے زمانہ میں میری ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو انتخابات میں حصہ لے چکا تھا۔ مجھے ذرا اس میں شک تھا کہ اس نے واقعی انتخاب میں حصہ لیا ہوگا کیونکہ وہ ایک روایتی گاؤں کا رہنے والا ایسا ہی افغانی نظر آتا تھا جیسے میں نے اپنی جوانی میں دیکھے تھے۔ایک لمبی قمیص، چوڑی پتلون، سر پر پگڑی اور ڈاڑھی، میں سمجھتا تھا کہ اس قسم کے افغانیوں نے انتخابات میں حصہ لینے پر توجہ ہی نہ دی ہوگی چنانچہ میں نے ووٹ ڈالنے کے عمل کے بارے میں اس سے جاننا چاہا۔

ٹھیک ہے جناب، اس نے بتاتے ہوئے کہا کہ شہر سے کچھ لوگ کاغذ کی شیٹ لئے ہوئے ہمارے پاس آئے اور بتایا کہ ہمیں ان پر نشان لگانا ہوگا۔ ہم نے بہت نرمی سے ان کی باتیں سنیں کہ وہ سب دور دراز سے آئے ہوئے تھے اور مناسب نہ تھا کہ ہم ان سے سخت رویہ اختیار کریں۔ کیونکہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ شہری لوگ ہمیں آکر بتائیں کہ ہمارے نمائندے کون ہیں؟۔ انہوں نے جہاں چاہا وہیں ہم نے نشان لگا دیا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا لیڈر آغائی سیّاف کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے؟۔

''لیکن سیاف تک کس طرح پہنچے'' میں نے سوال کیا۔ سیّاف تک پہنچنے کا کیا مطلب؟ اس کا خاندان دوست محمد سے بھی پہلے سے یہاں آباد ہے۔ اس پشتہ پر جا کر دیکھیں تو وادی میں اس کا گھر نظر آجائے گا...... اس علاقہ کا سب سے بڑا مکان ہے۔ ہر عید کے موقع پر جب وہ آتا ہے تو بچوں کو مٹھائیاں تقسیم کرتا ہے اور ہمارے احوال اور مسائل سے بھی واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کسی کو رقم کی ضرورت ہوتی تو وہیں کے وہیں وہ اپنی جیب سے اسے ادا کر دیتا ہے۔ وہ ایک مسلمان ہے۔ تمہیں شاید معلوم ہو کہ میرے بہنوئی کا ایک چچازاد بھائی سیاف کی سالی کا شوہر ہے۔ سیاف ہمارا اپنا آدمی ہے۔

مجھے لگا کہ مغرب کے لوگ جسے جمہوریت کہہ رہے ہیں وہ ایک خارجی بوجھ ہے جسے افغان اپنے کاندھوں پر اٹھانے کے لئے مجبور ہیں۔ اس بوجھ تلے رہ کر انھیں اپنی زندگی کو ہر ممکن حد تک بہتر انداز میں جینا ہے۔ اس شخص میں تاریخ کے دو غیر متعلق دھارے بڑے ہی بھونڈے انداز میں متصل ہو رہے ہیں۔ اور اگر یہ کابل سے ایک گھنٹہ کی مسافت پر واقع اس مقام پر ہو رہا ہے تو پورے ملک میں ایسا ہی ہو رہا ہوگا۔

مغربی نقطۂ نظر سے بعضوں کے نزدیک یہ کوئی غیر معقول بات نہیں کہ پاکستان، اردن، عراق اور افغانستان اور مصر میں مغرب کے ہم خیال حکمرانوں کو سرمایہ فراہم کر کے یہاں جمہوریت فروغ دی جاسکتی ہے۔ آزاد مارکیٹ کی برکتیں الگ ہیں جنہیں بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔ اور بعض لوگ اسے بھی صحیح سمجھتے ہیں کہ اسلامی اقدار کیونکہ پسماندگی پیدا کرتی ہیں جنہیں کچھ سمجھدار لوگ ٹھیک کر سکتے ہیں اور اس عمل میں قوت بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔

لیکن دوسری طرف مسلمانوں کو اخلاقی اور عسکری اعتبار سے کمزور کرنے کے لئے جو فوجی کارروائی خود ان کے ملکوں میں جاری ہے وہ ایک ایسا پروگرام ہے جس سے ہم پہلے ہی سے واقف ہیں۔ مغربی رسومات، قانونی نظام اور جمہوریت ایک ایسے پروگرام کا حصہ محسوس ہوتے ہیں جس میں ایک معاشرہ، فرد اور انفرادی معاشی یونٹ تک خود کار ہو جائے گا۔ جس میں خود کار فیصلے عقل کی روشنی میں ذاتی مفادات کو سامنے رکھ کر کئے جائیں گے اور ایسا لگتا ہے کہ بالآخر اس کے نتیجہ میں ہر مرد، عورت اور بچہ مادّی اشیاء کے حصول میں ایک دوسرے کے مدمقابل ہوں گے۔

ایک طرف تو یہ لگتا ہے کہ ہر صنف کے بہتر حقوق کی بازیابی کے لئے یہ ایک منظّم کوشش کی جارہی ہے جب کہ دوسری طرف ایسا لگتا ہے کہ کچھ طاقتور اجنبی ہیں جو خاندانوں کے نجی معاملات میں مخل ہو رہے ہیں اور اپنی ملّی اور خاندانی وقبائلی شناختوں کو قائم رکھنے کی صلاحیتوں کو ختم کر رہے ہیں۔ مختصر طور پر ایک طرف عوام کے

حقوق کی بازیافت کے ذریعہ انہیں مختار اور مجاز کیا جا رہا ہے وہیں دوسری طرف دیکھیں تو اختیار ختم کرنے کی ایک منظم کوشش نظر آتی ہے۔

جدید دنیا کو جس تصادم نے تباہ کر رکھا ہے اس کی تفہیم میرے خیال میں تہذیبوں کے تصادم (Clash of Civilization) کے ذریعہ سمجھ میں نہیں آتی۔ بالخصوص اس وقت جبکہ ہم یہ سمجھتے ہوں کہ کیونکہ ہم مختلف ہیں اس لئے ہمیں اس وقت تک لڑنا ہے جب تک کہ ہم میں سے ایک ختم نہ ہو جائے۔ میرے خیال میں اس کی تفہیم اس مزاحمت کو سمجھ کر حاصل ہو سکتی ہے جو دو باہم قاطع اور بے جوڑ تاریخوں کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے۔ مسلمان انسانوں کا کسی سمت جاتا ہوا ایک گروہ تھا۔ اسی طرح یورپ کے لوگ اور ان کی شاخیں کسی دوسری طرف جانے والا گروہ ہیں؟ جب ان دونوں گروہوں نے راستہ کاٹا تو اُچھال اور ناہمواریاں پیدا ہوئیں جن کے نتیجہ میں کچھ شور شرابہ اور لوٹ کھسوٹ فطری تھی۔ اور یہ ٹوٹ پھوٹ آج بھی جاری ہے۔

ان دونوں گروہوں کی سمت سفر کا جاننا وہ کم سے کم اور ضروری شرط ہے جس کے بغیر ہم آج کی دنیا میں وسعت پذیر تصادموں کی نظریاتی اساس سے واقف نہ ہو سکیں گے۔ یہ بھی واضح رہے کہ محض جان لینے سے نہ تو رویوں میں شیرینی پیدا ہو سکے گی اور نہ ہی اس سے ذہنوں میں روشنی آئیگی کیونکہ یہاں محض غلط فہمیوں کا مسئلہ نہیں بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ واقعی تضاد موجود ہیں۔ میں نے جب اس کتاب کا آغاز کیا تھا تو میں نے یہ تجویز بعض دوسرے مصنفین کے سامنے رکھی۔ ان میں سے دو نے کہا کہ "مسلم دنیا اور مغرب میں تصادم کو بعض خفیہ ہاتھ تقویت پہنچا رہے ہیں کیونکہ ہر دو عوام ایک ہی جیسے ہیں اور انکی خواہشات بھی ایک ہی جیسی ہیں۔ اگر مغرب کے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ اسلام عیسائیت ہی کی طرح ہے تو یہ تصادم دم توڑ دے گا"؛ ایک نے کہا کہ "یہ لوگ ابراہیم کو بھی مانتے ہیں"۔ اس طرح کے خیالات نیک نیتی پر مشتمل تو ہیں لیکن انتہائی سادہ لوحی پر مبنی ہیں اور زیادہ دیر تک ساتھ نہ دے سکیں گے۔

دوسری طرف بہت سے آزاد خیال مسلمانوں کو میں یہ کہتے ہوئے سنتا ہوں کہ جہاد تو دراصل ایک اچھا مسلمان بننے کے لئے جدو جہد کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے تیئں متعصب افراد ہی جہاد کو متشدّدانہ رویوّں اور عمل سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن اس فکر کے حاملین اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ خود رسول اللہؐ کے زمانہ میں اور بعد کی تاریخ میں بھی جہاد کس معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ جو جہاد کو تشدّد یا قتال سے علیحدہ کوئی عمل خیال کرتا ہے تو اسے جنگوں کا جواز پیش کرنا چاہیے جو اس زمانہ میں لڑی گئیں اور مسلمانوں نے اسے جہاد کہا تھا۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ اس دور کے مسلمانوں نے اُس طرح سوچا اور محسوس کیا ہم جدید دور کے مسلمان جہاد کی ایک نئی تعریف بیان کر سکتے ہیں۔ اور محض جہاد ہی کی نہیں بلکہ اور دوسرے بہت سے تصورات کی بھی۔ لیکن انہیں مسلمانوں کے اس نقطہ نظر بلکہ عقیدہ کے اوپر بھی ذرا محنت کرنی چاہیے جو مسلمان مدّتوں سے کہتے اور سنتے آئے ہیں کہ قرآن، محمدؐ کا پیغمبرانہ کردار، اور اسلام کی اوّلین جماعت کے لوگوں کی زندگیاں، صفات اور ان کے الفاظ بھی اللہ کی رضا کا وہ اظہار تھا جسے زمین پر اتارا گیا تھا۔ کوئی فانی انسان اُس زمان و مکان کے قوانین اور رسومات کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ اسی عقیدہ کی بنا پر تمام مصلحین بھی کہتے

آئے ہیں کہ ہم کوئی نئی بات نہیں کہہ رہے ہیں۔ جو کہا جا چکا ہے اسے بحال کرنا اور تازہ دم کرنا ہی ہماری دعوت ہے۔ انہیں اس کا انکار کرنا لازمی ہے کہ وہ کوئی نئی چیز ایجاد نہیں کررہے اور اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان کی کوششیں تو اصل کی طرف واپسی کے لئے ہیں۔ یہ دراصل ایک جال ہے جس سے مسلم مفکرین کو باہر آنا ضروری ہے۔

مصر کے ایک جدید ماہر دینیات شیخ محمد عبدہ نے ایک مشہور کتاب میں لکھا کہ ''قرآن نے واقعتاً سائنس اور بعض جدید اقدار کی ہدایت دی ہے''۔ بعض قرآنی آیات کے حوالہ سے وہ یہ دکھاتے ہیں کہ قرآن تعدد ازدواج پر یک زوجگی کی حمایت کرتا ہے۔ یہ نقطہ نظر عقل کو اپیل تو کرتا ہے لیکن یہ بھی واضح ہے کہ انکا یہ پورا عمل قرآن میں یک زوجگی کی حمایت تلاش کرنے سے عبارت نظر آتا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا ذریعہ تھا جس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا؟ کیا یہ مشترک انسانی حیات کے عمیق ترین اصولوں پر عقل انسانی کی کارفرمائی نہ تھی؟

معاشرہ میں عورت کا مقام اور اس کا کردار بھی عالم اسلام اور مغرب میں تضاد کی ایک واضح ترین مثال ہے جہاں گتھیوں کو سلجھانے کے لئے خاصی فکری توڑ پھوڑ کی ضرورت ہے۔ ہر دور میں ہر معاشرے نے جنسی کشش میں پوشیدہ طاقت کی معاشرتی تناسب کو تہہ و بالا کرنے کی صلاحیت کو تسلیم کیا ہے اور ہر معاشرے نے اس قوت کو قابو میں رکھنے کے اصول وضابطے وضع کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں اسلامی اور مغربی کلچر میں اختلاف اس نکتہ پر نہیں ہے کہ کیا عورت پر زبردستی کی جاسکتی ہے؟ ہر دو طرف کے نیک نیت خوب سمجھتے ہیں کہ کسی بھی انسان پر زبردستی جائز نہیں ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ بہت سے مسلم ممالک میں ظالمانہ قوانین کا عورتیں بڑی شدت سے شکار ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے یہاں یہ اصول نہیں ہے کہ عورتوں پر زبردستی کی جائے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس اصول کی تجسیم جو مسلم معاشرہ میں تاریخ کے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے ہوتی رہی ہے وہ اس نقطہ نظر کے تحت ہوتی ہے کہ معاشرہ دو میں تقسیم ہے ایک مردوں کا دائرہ ہے اور دوسرا عورتوں کا اور ان دونوں دائروں میں رابطہ صرف نجی دائروں ہی میں ہوسکتا ہے تاکہ عوامی زندگی سے شہوانیت کو خارج کیا جاسکے۔

میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک معاشرتی وحدت کس طرح قائم ہوسکتی ہے جس میں ایک حصہ تو یہ سوچتا ہو کہ دنیا کو دو حصوں یعنی مردوں اور عورتوں کے علیحدہ علیحدہ دائروں میں تقسیم ہونا چاہیے اور دوسرا سوچتا ہو کہ مذکر ومونث پر مشتمل ایک مخلوط معاشرہ ہے جہاں مرد ہو یا عورت ایک ہی راستے پر چلتے ہیں، ایک ہی دکان سے خریداری کرتے، ایک ریستوران میں میں کھانا کھاتے، ایک ہی کلاس روم میں پڑھتے ہیں اور ایک ہی طرح کی ملازمتیں کرتے ہیں۔ تو معاشرہ ایک ہی ہوسکتا ہے۔ ایک ساتھ دونوں طرح کے معاشروں کا قیام ممکن نہیں ہے۔ اس مقام پر آکر میں یہ سوچتا ہوں کہ مسلمان مغرب کی دنیا میں اپنے منقسم دائروں کے تصور کے ساتھ یہاں کے قوانین اور رسم ورواج کے ساتھ کس طرح رہ سکتے ہیں؟ اسی طرح مغربی افراد مسلم دنیا میں اپنی مخلوط صنفی روایت کے ساتھ محض ایک ملاقاتی کی طرح ہی رہ سکتے ہیں۔

میں نے جو سوال اٹھایا ہے میں اس کا کوئی جواب پیش نہیں کر رہا۔ میرا صرف یہ کہنا ہے کہ مسلم مفکرین کو ان سوالات کے ساتھ زور آزمائی کرنی چاہئے۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ یہ کام کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں شدید اسلامی روایات سے ایران نے رخصتی حاصل کی ہے اور یہ امریکیوں کو اپنے ملک سے باہر نکال دینے کے بعد کی دو دھائیوں کے دوران ہوا اور اس طرح ایران نے ثقافتی آزادی حاصل کر لی۔ وہاں بہت سے بے نام مصنفین نے لکھا کہ تاریخ میں منجمد مفکرین کے جمع شدہ خیالات سے صرف نظر کرتے ہوئے ہر نسل کو نئے طرز پر شریعت کی تفہیم کا حق پہنچتا ہے۔ لیکن اس طرح کے اور دوسرے خیالات کو دبایا گیا۔ مغرب میں دبانے کی اس خبر کو ایک اہم خبر بنا کر بطور ثبوت پیش کیا گیا کہ ایران میں جمہوریت کا فقدان ہے۔ لیکن میرے لئے اہم بات یہ تھی کہ عالم اسلام میں اس طرح کے خیالات کم از کم پیش تو کیے جانے لگے۔ اور بالخصوص ایسے علاقوں میں جہاں مسلمان مغرب سے نہیں بلکہ خود اپنے آپ سے کشمکش اور مزاحمت کر رہے ہیں۔

نائن الیون کے بعد بش انتظامیہ نے ایران پر مزید دباؤ کی پالیسی اختیار کی تو بیرونی دھمکیوں کے پس منظر میں ایسے تمام تصورات جو ظاہر میں مغرب سے متاثر نظر آتے تھے اپنا اعتبار کھو بیٹھے کیونکہ انہیں پیش کرنے والوں پر مغرب کا شریک کار ہونے کا الزام بھی بہ آسانی عائد کیا جا سکتا تھا۔ ان حالات میں ایسے تصورات کا کوئی خریدار ملنا بھی مشکل تھا۔ عوام کا قدامت پسندی کی طرف مائل ہونا فطری تھا۔ جیسا کہ ان عوام نے حد سے زیادہ قوم پرست احمدی نجاد کو اپنے ملک کا سربراہ منتخب کر کے ثابت کیا۔

مغرب اور عالم اسلام کے درمیان ایسے متعدد نکات ہیں جن پر بحث ہو سکتی ہے بلکہ مناظرہ اور حجت بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن کوئی بحث اس وقت ہی معنی خیز ہو گی جب دونوں ایک ہی طرح کی اصطلاحیں استعمال کریں اور دونوں ان اصطلاحوں کے ایک ہی معنی بھی سمجھتے ہوں۔ یعنی جب طرفین کے فریم ورک میں اشتراک پایا جائے یا کم از کم وہ یہ ضرور جانتے ہوں کہ دوسرا کس فریم ورک میں بات کر رہا ہے۔ عالمی تاریخ کے گوناگوں بیانیے کم از کم اس نوع کا مذکورہ تناظر پیدا کرنے میں مدد کر سکتے ہیں۔

ہر شخص کو جمہوریت مطلوب ہے۔ کم از کم اس کی اپنی ذات پر اطلاق کی حد تک لیکن اسلام جمہوریت مخالف نہیں بلکہ یہ ایک دوسرا لیکن مکمل تناظر ہے۔ اس تناظر میں جمہوریت بھی ہو سکتی ہے اور ظلم بھی اور ان دونوں کے درمیان بھی کئی حالتیں ہو سکتی ہیں۔

اسی طرح اسلام، عیسائیت اور یہودیت کا مخالف بھی نہیں۔ خالصتاً ایک نظام عقائد کی سطح پر دیکھیں تو عیسائیت کے ساتھ اس کا اشتراک زیادہ ہے اور حجت و دلائل کا میدان مختصر ہے۔ یہودیت کے ساتھ یہ صورتحال کچھ زیادہ ہی ہے۔ مثلاً یہودیوں کے یہاں خورد و نوش کے قوانین دیکھیں یا پاکیزگی اور صفائی کے یا پھر راسخ العقیدہ یہودی مذہب میں جائز جنسی رشتوں کی فہرست دیکھیں تو یہ سب بعینہ وہی ہے جو اسلام میں پائی جاتی ہے۔ پاکستانی مصنف اقبال احمد نے بہت صحیح کہا کہ ''چند صدیوں قبل مسلم، عیسائی ثقافت کے مرکب کے مقابلہ میں مسلم یہودی ثقافت زیادہ سمجھ میں آنے والی چیز تھی''۔

لیکن یہ بات واضح رہنا چاہیے کہ اسلام کو عیسائیت، یہودیت اور ہندومت وغیرہ جیسے مذاہب کی طرح کے مذہب کی ایک شکل سمجھنا نہ صرف مسائل پیدا کرتا ہے بلکہ صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں گمراہ کن بھی ہے۔ اسلام یقیناً ایک مذہب ہے مذکورہ مذاہب کی مانند لیکن عقائد، خدا، کائنات اور اخلاقیات کے اعتبار سے یہ بالکل واضح طور پر ممتاز ہے۔ البتہ اسلام کو جائز طور پر اس سلسلہ میں فٹ کیا جاسکتا ہے جس میں مثلاً کمیونزم، پارلیمانی جمہوریت، فسطائیت اور اسی طرح دوسرے نظریات کو رکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام دوسروں کی طرح ایک معاشرتی پروجیکٹ ہے، ایک ایسا نقطہ نظر ہے جو سیاست اور معیشت کو بھی ایک خاص رخ دینا چاہتا ہے۔ یہ مدنی اور فوجداری قوانین کا ایک مکمل نظام بھی ہے۔

اسی طرح اسلام کو بالکل جائز طور پر ایک ایسی کلاس میں رکھا جاسکتا ہے جس میں چینی تہذیب، ہندوستانی تہذیب، مغربی تہذیب وغیرہ رکھی گئی ہوں۔ اس لئے کہ اسلام میں ثقافتی مصنوعات کی ایک دنیا آباد ہے جس میں آرٹ سے فلسفہ تک، تعمیر سے دستکاری تک اور بظاہر انسانی ثقافتی عزائم کا ہر وہ میدان شامل ہے جسے اسلامی کہا جاسکے۔

اور جیسا کہ میں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام بیک وقت وا ہورہی تاریخوں کے درمیان ایک عالمی تاریخ ہے جو کسی دوسری تاریخ کا کہیں نہ کہیں حصہ بن جاتی ہے۔ اس طرح دیکھیں تو اسلام ایک عظیم بیانیہ ہے جو زمانے کے ساتھ حرکت پذیر ہے۔ لیکن جو مستقل طور پر چودہ صدیوں قبل مکہ اور مدینہ میں نشوونما پانے والی جماعت سے قوت کشید کرتا رہتا ہے۔ اس پوری کہانی میں بہت سے کردار مسلمان نہیں ہیں اور بہت سے واقعات کی کوئی مذہبی حیثیت بھی نہیں ہے۔ یہودی، عیسائی اور ہندو اس داستان کا ایک حصہ ہیں۔ صنعت کاری اس منصوبہ کا ایک حصہ ہے اور اسی طرح اسٹیم انجن اور تیل کی دریافت بھی۔ اگر اس طرح دیکھیں تو اسلام مشترکہ مقاصد کا ایک عظیم شاکلہ ہے جو وقت کے ساتھ اس طرح حرکت پذیر ہے کہ خود اس کے اپنے داخلی مفروضات اسے حرکت میں رکھتے ہیں۔

اور مغرب کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے

تو دنیا کی حقیقی تاریخ کون سی ہے؟ ایک مشہور فلسفی Leibniz نے ایک بار کہا تھا کہ یہ کائنات عناصر پر مشتمل ہے اور ہر عنصر ایک خاص نقطہ نظر کے مطابق ایک مکمل کائنات ہے اور ہر عنصر میں دوسرے تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔ عالمی تاریخ بھی اسی طرح ہے۔ یعنی ایک نقطہ نظر سے انسانیت کی پوری اور مکمل کہانی ہے، ہر تاریخ میں باقی تاریخیں شامل ہیں، تمام حقیقی واقعات مرکزی بیانیے کے اعتبار سے کسی جگہ موجود ہیں چاہے "یہ جگہ" اس پس منظر ہی کا حصہ کیوں نہ ہو جو مغربی شور شرابہ نے پیدا کر رکھا ہے اور جس کے مقابل مذکورہ فلسفی کا خیال اپنی معنویت کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تمام اس دنیا کی حقیقی تاریخ ہے۔ اصل کام بلکہ کبھی نہ ختم ہونے والا کام یہ ہے کہ ان تاریخوں کو مرتب کیا جائے تاکہ ایک واحد مشترکہ تاریخ کے درمیان ایک عالمی انسانی جماعت کی تعمیر ہوسکے۔

نظرے خوش گزرے

محمد ذکی کرمانی

بیسویں صدی کے آخر ہی سے عالم اسلام میں بعض اہم تبدیلیاں آنے لگی تھیں جن میں کچھ کا تعلق تو اس کے اندرون سے اور کچھ کا مغربی دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے تھا۔ ان کے نتیجہ میں جہاں عالم اسلام کی صورتحال متاثر ہوئی وہیں مغرب کے تئیں اس کے رویہ اور خود اس کے تئیں مغرب کے رویہ میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صدیوں قبل صلیبی جنگوں کے پس منظر میں یورپ اور عالم اسلام کے دو تہذیبی دھاروں کے اختلاط کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ بتدریج دورِ جدید کے عظیم بین التہذیبی اختلاط کی شکل میں ظاہر ہوا اور اب شاید اس کا ایک دوسرا رخ سامنے آنے کو ہے۔

عالم اسلام میں دینی احیاء کی وہ تحریکیں یا فکری لہریں جو گھر کے اندرون کو ٹھیک کرنے اور بنیادوں سے اپنے تعلق کو مضبوط تر کرنے سے عبارت تھیں ان کی بعض شاخیں ایسے جنگجو گروہوں کی شکل میں آج موجود ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ دین کا فہم وہی صحیح ہے جو وہ سمجھتے ہیں اور جو ان سے اختلاف کرتے ہیں وہ گمراہ ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ان گروہوں کی جنگجویانہ سرگرمیاں ان گمراہوں'' کی تکفیر اور ان کے قتل سے عبارت ہیں۔ آج کے بظاہر اسلام پرست جنگجو جدید ظالموں کے خلاف نہیں بلکہ مسلم معاشرہ میں ان سے اختلاف کرنے والوں کے خلاف ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اسلام کا تعارف ایک جنگجو مذہب اور مسلمان ایک جنگجو گروہ کی حیثیت سے متعارف ہوئے ہیں۔

فکر تصوف نے ماضی کی شکل میں تو نہیں البتہ دین کو معاشرہ اور تعمیر دنیا کی فکر سے آزاد کر کے ایک بڑی تعداد کو محض ذکر و فکر تک محدود کر دیا ہے۔ اور اس کا اثر عالمی سطح پر بھی نظر آتا ہے جس میں عام مسلمانوں کی کثیر تعداد کے ساتھ خاصے تعلیم یافتہ افراد بھی شامل ہیں۔ البتہ تصوف کے زیر سایہ بعض مابعد طبیعاتی فکریات کے ارتقاء نے عالم اسلام کے ذہین افراد کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس کے علاوہ صوفیانہ افکار کا اظہار ثقافتی و تخلیقی سطح پر بھی نظر آتا ہے۔ دینی مزاج کے حامل تعلیم یافتہ افراد تصوف کی فکریات اور متصوفانہ رویوں میں اسلام سے اپنی عملی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں اس میں صوفی شاعری بالخصوص جلال الدین رومی کا کلام اور ابن عربی کے افکار نے جدید مسلم ذہن کے ساتھ ساتھ مغربی ذہن کو بھی متاثر کیا ہے۔

تحریکات اسلامی کے نام سے اسلام کو زندگی کے ایک مکمل نظام کی حیثیت میں دیکھنا اور اسے سیاسی سطح پر قائم کرنے کے لئے قوت حاصل کرنے کی کوششیں جن کا آغاز بیسویں صدی میں ہو چکا تھا ایک موثر منظم گروہ کی حیثیت سے اپنی اہمیت کھوتی جا رہی ہیں لیکن ایک طرز فکر اور اشیاء و مظاہر کو دیکھنے کے ایک رخ کی حیثیت

میں اس فکر کی قبولیت میں اضافہ نظر آتا ہے۔ ان تحریکوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اکیسویں صدی کا انسان قرآن کے قریب تر آ گیا ہے۔ اور اس کا ایک اہم اثر یہ ہے کہ کائنات اور معاشروں کو درپیش مسائل کے باب میں اسلام کے بیانیوں کا ارتقاء ہوتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ معاشی مسائل کے باب میں اہل اسلام کی کوششیں گوکہ بہت کارگر نہیں البتہ اس میدان کے بیانیہ کی تشکیل کی کوششیں ضرور کہیں جاسکتی ہیں۔ ان کوششوں کے نتیجہ میں گلوبل سطح پر سود کا ظالمانہ پہلو اور بلاسودی قرض ایک قدر کی حیثیت سے ابھرا ہے اور یوں اسلام کی انسان دوستی کا پہلو سامنے آتا ہے۔

گذشتہ چند دہائیوں کے دوران سائنس اور ٹکنالوجی کے ارتقاء اور معاشرہ کے ساتھ ان کے تعلق میں تشدد، ظلم، حق تلفی، وغیرہ کے عناصر کی نشاندہی ہوئی ہے اور اسلام کی وہ قدریں غور وفکر کا موضوع بنی ہیں جنھیں اپنا کر ہی شاید پیدا ہونے والی اس صورت حال سے نپٹا جاسکتا ہے۔

سیاسی سطح پر تقریباً تمام ہی مسلم ممالک میں جہاں جہاں جمہوریت اور پارلیمانی نظام کو اپنایا گیا وہاں بد عنوانیاں بدترین شکل میں سامنے آئی ہیں۔ حکمراں اشرافیہ لوٹ کھسوٹ کرتی رہی ہے اور اس طرح منتخب نمائندوں اور مطلق العنان حکمرانوں میں عملاً کوئی فرق نہیں رہا۔ بعض ایسے ممالک جہاں امانتدار افراد جمہوری طور پر منتخب ہوکر حکومت سنبھالنے میں کامیاب ہوئے ہیں وہاں ترقی کا جدید لیکن مقامی ماڈل اپنا کر بہت کم وقت میں ارتقاء کے طویل مراحل طے کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ البتہ بحیثیت مجموعی عالم اسلام میں آزادئ فکر واظہار پر کہیں حکمراں طبقہ کی جانب سے اور کہیں معاشرہ کے بعض عناصر کی طرف سے پابندیاں نافذ ہیں۔ مذہبی فکر میں شدت پسندی اور تقلید کا رجحان عام ہے۔ لیکن ایسی کوششیں بھی جاری ہیں اور کامیاب ہورہی ہیں جو مذہب میں افہام وتفہیم کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ عورت عملاً پابند ہے گوکہ تعلیم کے حصول کی لہریں بھی رواں ہیں اور خود مذہبی فکری حلقوں میں ایسی موثر آوازیں اٹھ رہی ہیں جو عورت کے آزاد وجود اور اپنی صلاحیتوں کے آزادانہ اظہار کی وکالت کرتی ہیں۔

مغربی دنیا جو شمالی امریکہ، کینیڈا اور یورپی ممالک پر مشتمل ہے بتدریج انسان دوست علم وفن کے ارتقاء کی جویا اور تخلیقی قوتوں کے اظہار کی ضامن اور آزادی اظہار وعمل کی علمبردار اور نئے نئے امکانات کی دنیا بن کر ابھری اور یوں مشرقی دنیا اور بالخصوص عالم اسلام سے کثیر تعداد میں افراد اس دنیا کی طرف راغب ہوتے گئے۔ ریسرچ وتحقیق کے بہترین مواقع کی تلاش میں دنیا کے بہترین ذہنوں کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب رہی اور اس طرح عالمی سطح پر ایک غالب قوم بن گئی۔ لیکن اس آزاد فضا میں مغربی معاشرہ جہاں اپنی جغرافیائی حدوں میں حقوق انسانی کا علمبردار، ظلم کا مخالف اور عدل وانصاف کا گہوارہ بن کر ابھرا اور نہ صرف اپنے شہریوں بلکہ بیرونی افراد کے ناقدانہ رویوں کو کھل کر خوش آمدید کہا۔ وہیں بتدریج دوسرے ممالک میں وہ ایسے افراد اور حکمراں اشرافیہ کا نگہبان بنتا چلا گیا جو اپنے عوام کو یہ اقدار دینے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہ تھے اور اپنے عوام کے حقوق

اوران کے مفادات کی قیمت پر اپنے مما لک میں مغربی مفادات کی ضمانت دے رہے تھے۔ چنانچہ مغرب کی کوششیں یہ رہیں کہ یہ مما لک مغرب کی منڈیاں بنی رہیں۔ یہاں کے وسائل انھیں دستیاب رہیں اوران کی صنعتی وسائنسی ترقی کے لئے وسائل میں کمی نہ آئے۔

خودمغرب کے اندرایک بڑا مسئلہ یہ کھڑا ہوا کہ انسان صرف اپنی صلاحیتوں کے اقرار پراور بیرونِ انسان ہر ذریعہ فکروآ گہی کے انکار کی بنا پر خود پسند ہوتا گیا جس کی بنا پر ایک بڑا اثر وہاں کے خاندانی نظام پر پڑا۔بکھرتے ہوئے خاندان آج مغربی مما لک کی شناخت بن گئے ہیں۔سرمایہ دارانہ نظام کے حاوی ہونے کی بنا پر ترقی کے وہی رخ پنپ پاتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ سرمایہ پیدا کرنے کی ضمانت دے سکیں۔اس نے ریسرچ وتحقیق کے رخ کو یکسر بدل دیا ہے جس کا بنیادی مقصداب انسانی فلاح سے زیادہ سرمایہ میں اضافہ ہے۔ اوراب اعلیٰ ترمقاصد کے حصول کے لئے مغربی انسان کی قربانی کی صلاحیت کمزور ہوتی جارہی ہے۔

ریسرچ وتحقیق پرحکومتیں نہیں بلکہ پرائیویٹ ادارے غالب ہیں اور یوں ماضی کے وہ ادارے جواعلیٰ ترمقاصد کے لئے ریسرچ وتحقیق کی حوصلہ افزائی کرتے رہے تھے۔اب حوصلہ شکنی کا شکار ہوکر بند ہورہے ہیں اورسرمایہ کاری فوری منافع بخش تحقیقات کے لئے مخصوص ہوتی جارہی ہے۔اس کے نتیجہ میں اعلیٰ تعلیمی اداروں بالخصوص مغربی یونیورسٹیوں کا نظام اب بکھرنے لگا ہے۔یونیورسٹیاں اپنی آزادی کھوکر سرمایہ داروں اور صنعتی اداروں کی منت کش ہوتی جارہی ہیں۔

میرے خیال میں مغربی مما لک میں مشرقی لوگوں اور بالخصوص مسلمانوں کے ہجرت کرجانے کی بنا پر دوتہذیبی دھاروں کا جورابطہ ہوا ہے وہ ماضی کی صلیبی جنگوں کے نتیجہ میں ہونے والے رابطے سے خاصا مختلف ہے۔ ماضی کا رابطہ جنگوں کے نتیجہ میں ہوا تھا لیکن موجودہ رابطہ میں دشمنی کی فضانہیں رہی ماضی کے رابطہ میں مغرب عالم اسلام کو کچھ دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔لیکن آج تو مغرب بظاہر تو صرف دے ہی رہا ہے۔لیکن اس کے باوجود وہاں موجود چھوٹے چھوٹے مسلم معاشرے بھی انسانی زندگی کی بعض انتہائی اہم سطحوں پرمغربی انسان کو بہت کچھ دینے کی پوزیشن میں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کی باطنی یاروحانی توانائی کا احیاء، خاندانی نظام کا استحکام،سود کی حرمت کے پس منظر میں ظلم کی مخالفت اور انصاف کی علمبرداری وغیرہ وہ اہداف ہیں جو مغرب کے توانا ذہن کی فعالیت کو نیارخ دیکراسلامی ورلڈ ویو سے متعارف کرکے ایک ایسی تہذیب کوثمر بار کرسکتے ہیں جوآج کی جدیداسلامی تہذیب کہلانے کی پوری پوری حقدار ہوگی۔میرے نزدیک اس خوش خیالی کی بنیادی وجہ مغربی انسان میں اس جنون کا پایا جانا ہے جس کا اندازہ وہ اپنی قدروں کی حفاظت،انسان دوستی اور احترام انسانیت کے لئے آج کررہے ہیں۔اوراپنی حکومتی پالیسیوں کی مخالفت میں پیش پیش ہے۔

نوٹس اور حوالے

باب : ۱

۱۔ Georges Roux کی کتاب *Ancient Iraq* کے صفحہ 148 پر دیکھیں یہ 1980 میں پینگوئن (نیویارک) نے شائع کی ہے۔

۲۔ مثلاً Canon Doyle نے 1886 میں شائع ہوئے اپنے ناول *Study in Scarlet* میں ''Parthian Shot'' کو ''Parting Shot'' کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ یعنی ایسا غیر رسمی اہانت آمیز تبصرہ جو گفتگو کے خاتمہ کے بعد بولنے والے کے رخصت ہونے کے بعد ادا کیا جائے۔

۳۔ گیارہویں صدی کے فارسی شاعر فردوسی نے اپنا مشہور شاہنامہ انھیں داستانوں کی بنیاد پر لکھا ہے۔ یہ دراصل ایک طویل رزمیہ نظم ہے جس کا بڑا کردار کیخسرو ہے جو اپنے عدل کے لئے مشہور ہے۔

باب : ۲

۱۔ یہ اقتباس William Chittick کی ایڈٹ کی ہوئی کتاب: *The Inner Journey: Views from the Islamic Tradition* میں طبری سے لیا گیا ہے۔ یہ کتاب 2007 میں Sand Point, Idaho سے Morning Light Press سے شائع ہوئی۔ اسی کتاب کے صفحہ xi پر دیکھا جا سکتا ہے۔

۲۔ رسول اللہ کے آخری خطبہ کا یہ اقتباس اکبر احمد کی کتاب *Islam Today* کے صفحہ 21 پر موجود ہے جو 1999 میں نیویارک اور لندن سے I.B. Tauris نے شائع کی۔

باب : ۳

۱۔ رضا اسلان کی کتاب *No god but God* کے صفحہ 113 پر دیکھیں۔ یہ کتاب نیویارک سے Random House نے 2006 میں شائع کی ہے۔

۲۔ یہ طبری کا بیان ہے جو *Islam: From the Prophet Mohammad to the Captive of Constantinapole* میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب بعض دستاویزوں کے مجموعہ پر مشتمل ہے۔ جسے Bernard Lewis نے ایڈٹ کیا اور ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ یہ آکسفورڈ اور لندن سے Oxford Univerisity Press نے 1997 میں شائع کی۔

۳۔ یہ خلیفہ ثانی عمرؓ کے اعلانِ یروشلم کا ایک مرکزی حصّہ ہے۔ جو Hugh Kennedy کی کتاب *The Great Arab Conquest* میں صفحہ 92-91 میں موجود ہے۔ اسے نیویارک سے Da Capo Press نے 2007 میں شائع کیا ہے۔

باب : ۵

۱۔ ابن قطیبہ کی نویں صدی کی تاریخ عیون الاخبار جس کے بعض اقتباسات *Islam: from the Prophet Muhammad to the Capture of Constantinapole* میں صفحہ 273 پر دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب 1987 میں نیویارک اور آکسفورڈ سے Oxford Univieristy Press

نے شائع کی۔

۲۔ شیخ عباس نے اپنی کتاب نفاس الهموم کے 14ویں باب میں تیرہویں صدی کے ایک مورخ سید ابن طاوس کی کتاب لھوف کے حوالے سے کہی ہے۔ شیخ عباس کی یہ کتاب 2005 میں Ansariyan Publications نے ایران کے شہر قم سے شائع کی۔

۳۔ G.E. Von Grunebaum کی *Classical Islam* کے صفحہ نمبر 70 کے حوالہ سے، جو شکاگو کے Aldin Publishing Company نے 1970 میں شائع کی۔

باب : ٦

ا۔ دیکھیں Wiet کی کتاب *Baghdad : Metropolis of the Abbasid Caliphate* کے صفحہ 12 سے 24 تک۔

۲۔ دیکھیں Tertius Chandler کی *Thousand Years of Urban Growth and Historical Census* جسے 1987 میں Lewiston اور New Yorks سے St. David's University Press نے شائع کیا۔

باب : ٧

ا۔ یہ ان کی ایک نظم کا میرا پیرایہ بیان ہے جو *Perfurme of the Desert : Inspiration for Sufi Wisdom* میں موجود ہے جسے A Harvey and E. Hanut نے ایڈٹ کیا ہے اور Wheaton Illionois سے Quest Books نے 1999 میں شائع کیا ہے۔

۲۔ محمد زبیر صدیقی کے مضمون "Women Scholars of Hadith" سے لیا گیا ہے جسے *http//www.Jannah.org/sisters/womanhadith.html* پر دیکھا جا سکتا ہے۔

۳۔ مولانا محمد علی کی *The Early Caliphate* کے صفحہ 119 پر جو 1983 میں لاہور کی احمدیہ انجمن اشاعت اسلام نے شائع کی۔

۴۔ غزالی کا مضمون "On the Ettiquettes of Marriage" جو ان کی کتاب *The Revival of the Religious Sciences* کی جلد ۱۲ میں ہے اور *http://www.ghazali.org/works/marriage.html* پر دیکھا جا سکتا ہے۔

باب : ٨

ا۔ Chaim Potok کی کتاب *History of the Jews* کے صفحہ 346-347 تک۔ یہ کتاب 1978 میں نیویارک سے Ballantine Books نے شائع کی۔

۲۔ محمد علی کی *A Cultural History of Afghanistan* کے صفحہ 120-123 تک جو 1964 میں کابل کے Punjab Educational Press نے شائع کی۔

۳۔ یہ بات میرے ایک رشتہ کے بھائی فرید انصاری نے فردوسی کے ایک ہم عصر کی تصنیف سے ایک سطر کا حوالہ دیتے ہوئے بتائی۔ لیکن اسے اس شاعر کا نام یاد نہیں تھا۔ البتہ اسی طرح بلکہ زیادہ واضح عرب مخالف جذبات فردوسی کے شاہنامہ کے آخر میں بھی موجود ہیں۔

باب : ۹

۱۔ ازمنہ وسطیٰ کے یورپ میں انتشار کے اس عمل پر Philip Daileader نے اپنے لیکچرز نمبر 20-17 میں بحث کی ہے جو The Early Middle Ages کے نام سے ایک سمعی سیریز میں پیش کئے گئے ہیں اور جسے Chainttly Virginia کی Teaching Company نے 2004 میں تیار کیا تھا۔ اس کے علاوہ مزید معلومات کے لئے *Columbia Encyclopaedia* کے چھٹے ایڈیشن میں ''Knight'' کے تحت بھی اس بحث کو دیکھا جا سکتا ہے۔

۲۔ دیکھیں امین مالوف کی *The Crusades through Arab Eyes* کے صفحہ 40-38 تک جسے نیویارک کی Schocken Books نے 1984 میں شائع کیا۔

۳۔ مذکورہ بالا حوالہ صفحہ 46

۴۔ Karen Armstrong نے اپنی کتاب Holy War : *The Crusades and their Impact on Today's World.* کے صفحہ 179-178 پر اس کا حوالہ دیا ہے۔ یہ کتاب نیویارک سے Anchor Books نے 2001 میں شائع کی۔

۵۔ مذکورہ بالا حوالہ صفحہ 73

۶۔ مذکورہ بالا حوالہ صفحہ 39

۷۔ David Morgan کی کتاب *The Mongols* کے صفحہ 71-64 پر جو Massachusetts, Malden سے Blackwell نے 2007 میں شائع کی۔

۸۔ مذکورہ بالا کتاب صفحہ 71-64 تک

۹۔ سباح کا فرقہ نظاری اسمٰعیلی فرقے کی شکل میں دوبارہ ظاہر ہوا۔ نئے لوگ شامل ہوئے اور ایک بار پھر طاقت پکڑنے لگا لیکن اس بار یہ ایک پرامن فرقہ تھا۔ اور آج یہ اسلام میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ فرقہ ہے جو تعلیم اور سائنس کے لئے کوشاں ہے۔ اس فرقہ کے لیڈر کو آغا خاں کہا جاتا ہے۔ پاکستان میں آغا خان یونیورسٹی ایک معروف اور مشہور یونیورسٹی ہے جسے اسماعیلی چلاتے ہیں اور عالم اسلام کے موقّر ترین اداروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اب اس فرقہ کی ہر چیز مکمل طور پر بدل گئی ہے۔

۱۰۔ مسلم مورخ رشیدالدین فضل اللہ نے بغداد کی تباہی (1318-1247) کی داستان اپنی کتاب *The Middle East and Islamic Wrold Reader* میں بیان کی ہے۔ حوالہ کے لئے صفحہ 49 دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب 2003 میں نیویارک سے Groove Press سے شائع ہوئی ہے۔

۱۱۔ مملوک فوج ہلاکو خان کی فوج کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بڑی فوج تھی لیکن مقابلہ میں حاصل ہونے والی کامیابیوں نے منگولوں کو راکشش بنا دیا تھا۔

۱۲۔ دیکھیں Morgan کی کتاب صفحہ 146

باب : ۱۰

۱۔ دیکھیں Morgan کی کتاب کا صفحہ 18-16

۲۔ ان دو مذاہب کے اختلاف پر اکبر احمد کی دلچسپ بحث *Islam Today* کے صفحہ 22-21 پر موجود ہے۔

۳۔ محمد ابن الحسین السُّلامی کی تصنیف: *The Book of Sufi Chivalary: Lessons to a son of the Moment.* جو 1983 میں نیو یارک سے Inner Traditions International نے شائع کی۔ یہ کہانیاں مقدمہ کے صفحات ۹ تا ۱۴ میں ملتی ہیں۔ بظاہر لگتا ہے کہ محمدؐ کے بارے میں یہ کہانی ایک پرانی چلی آرہی کہانی سے مستعار لی گئی ہے۔ جو قبل از اسلام ایک بادشاہ نعمان بن منذر سے متعلق ہے۔

۴۔ Alexandar Marks نے 25 نومبر 1997 کے *Christian Science Monitor* میں لکھا ہے کہ رومی کے کلام کا جو ترجمہ The Essential Rumi کے نام سے Coleman Barks نے کیا جو 1995 میں سان فرانسسکو سے Harper Collins نے شائع کیا اس وقت پوری دنیا میں اس کی ڈھائی لاکھ کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔

۵۔ دیکھیں Paul Wittek کی *The Rise of Ottoman Empire* کے صفحات ۳۳ تا ۵۴۔ یہ کتاب 1963 میں لندن سے Royal Aslatic Society of Great Britain and Ireland نے شائع کی۔

۶۔ عثمانی دور کے معاشرہ کی یہ تفصیلات Stanford shaw کی *History of the Ottoman Empire and Modern Turkey* میں صفحات 55 تا 85، 113 تا 138 اور 150 تا 161 پر موجود ہیں۔ یہ کتاب کیمبرج سے 1976 میں Cambridges University Press سے شائع ہوئی ہے۔

۷۔ ظہیر الدین محمد بابر کے 'بابر نامہ' کا Annette S. Beveridge نے 1922 میں انگریزی میں ترجمہ کیا جو لاہور سے، Sange-e-Meel, Publications نے دوبارہ 1987 میں شائع کیا۔

۸۔ Waldemar Hanseen کی کتاب *The Peacock Throne, The Drama of Mogul India* کے صفحات 113 تا 114 اور 493 تا 494 دیکھیں۔ یہ کتاب نیو یارک سے Holt, Rinehart, and Winston نے 1972 میں شائع کی۔

۹۔ دیکھیں Marshal Hodgson کی *Rethinking World History* کا صفحہ 97 جو کیمبرج سے Cambridge University Press نے 1993 میں شائع کی۔

باب : ۱۱

۱۔ دیکھیں C.M. Woolger کا مضمون "Food and Taste Europe in the Middle Ages" جو Paul Freedman کی ایڈٹ کی ہوئی کتاب *Food: The History of Taste* کے صفحہ 175 تا 177 یہ کتاب 2007 میں برکلے سے University of California Press نے شائع کی ہے۔

۲۔ دیکھیں Peter Russel کی *Prince Henry the Navigator* جو لندن سے Hispanic and Luso Brazilian Council نے 1960 میں شائع کی۔

۳۔ Daileader کا لیکچر نمبر 15 بعنوان Early Middle Ages جو 2004 میں Chantilly Virginia سے The Teaching Company نے شائع کی۔

باب : ۱۲

۱۔ برطانیہ عظمی دراصل اسکاٹلینڈ کے شاہ جیمس ششم کے تاج انگلینڈ سنبھالنے کے بعد ہی وجود میں آیا تھا۔ جب شاہ جیمس اور اس کے جانشین نے ان دونوں مملکتوں کے علیحدہ علیحدہ تاج سنبھالے رہے اور پھر 1707 میں قانون اتحاد نافذ کر دیا۔ اس تاریخ کے بعد ہی اسے برطانیہ کہنا صحیح ہے۔

۲۔ عثمانیوں کے حرم کی اندرونی تفصیلات کے لئے دیکھیں Alev Croutier کی تصنیف *Harem : The World behind the Veil* کے صفحات 35 تا 38، 103 تا 105 اور 139 تا 140۔ یہ کتاب 1989 میں نیویارک سے Abbeville Press سے شائع ہوئی۔

۳۔ James Gelvin نے ان عالمی باہمی تعلقات کی نشاندہی اپنی کتاب *The Modern Middle East* کے صفحات 35 تا 60 پر کی ہے۔

۴۔ *Nick Robbins* کا مضمون "" Loot: In Search of the East Indian Company" 2003 میں Open Democracy Net کے لئے لکھا گیا جو *http://www.opendemocracy.net/theme_7-corporations/article_904.jsp.* دیکھا جا سکتا ہے۔

۵۔ Gelvin صفحہ 84 تا 86

۶۔ اس زمانہ میں امرتسر کے ڈپٹی کمشنر Fredrick Cooper کی بھیجی گئی رپورٹ جس کا حوالہ رضا اسلان نے اپنی کتاب *No God but God* کے صفحہ 220 تا 222 پر دیا ہے۔ یہ کتاب 2006 میں نیو یارک سے Random House نے شائع کی۔

۷۔ جمیل ابوالنصر کی تصنیف *A History of Maghrib in the Islamic Period* میں صفحہ 249 تا 257۔ یہ کتاب 1988 میں کیمبرج سے Cambridge University Press نے شائع کی۔

باب : ۱۳

۱۔ Ernest Renan کی کتاب *La Reforme Intellectuele et morale* جو پیرس سے Calmann-Levy نے 1929 میں شائع کی۔

۲۔ حمید وباشی کی تصنیف *Iran : A People Interrupted* کے صفحات 58 تا 59، یہ کتاب 2007 میں نیویارک سے New Press نے شائع کی۔

باب : ۱۴

۱۔ Mark Elvin نے اسے بطور ایک کہاوت کے Pattern of the Chinese Past میں استعمال کیا ہے۔ اس میں اس موضوع پر بھی بحث کی گئی ہے کہ چین میں صلاحیت ہونے کے باوجود چودھویں سے انیسویں صدی تک آخر کس بنا پر بلند مرتبہ کی ٹیکنولوجی کیوں پیدا نہ ہو سکی جبکہ اسی دور میں وہ مالی اعتبار سے بھی ضروری صلاحیت اس کے پاس موجود تھی۔ یہ کتاب 1973 میں لندن .Eyre Methuen Ltd نے شائع کی۔

۲۔ دیکھیں دباشی کی کتاب صفحہ 60 تا 61

۳۔ دیکھیں Gelvin کی کتاب کے صفحہ 129 پر

۴۔ Joseph Mazzini کی کتاب *On the Duties of Man* جسے Franklin نے اپنی کتاب *Readings in Western Intellectual History* میں مکمل طور پر شامل کیا ہے۔ اور صفحہ 561 پر اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب New Heaven اور Connecticut سے Yale Univeristy Press نے 1987 میں شائع کی۔

۵۔ Garry Wills نے اس خیال پر اپنی کتاب *Lincoln at Gettysburg: The Words that Remade America* میں بحث کی ہے۔ یہ کتاب 1993 میں نیویارک سے Simon and Schuster نے شائع کی۔ اس طرح Sheylby Foote نے اپنے ایک ریڈیو مکالمہ میں جو خود میں نے سنا کہا کہ ''سول وار نے 'ہمیں' 'ہیں' سے 'ہے' بنا دیا ہے۔

۶۔ دیکھیں Gelvin کی کتاب صفحہ 82 پر

۷۔ Hamit Bozarslan نے عثمانی سلطنت کے بارے میں *On Line Encyclopaedia of Mass Violence* پر جو *http://www.massviolence.org/Bozarslan-Hamit* میں ہے ضیاء گولکپ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ *Yeni Hayat, Dogru Yol.*

۸۔ Taner Akcam نے صفحہ 175 تا 176 اپنی کتاب *Turk Ulusal Kimligi ve Ermeni Sourunu* میں حوالہ دیا ہے جو 1997 میں استنبول سے Iletisim Yayinlari نے شائع کیا۔

باب : ۱۵

۱۔ دیکھیں Suroosh Irfani کی کتاب *Revolutionary Islam in Iran: Popular Liberation or Religious Dictatorship* کے صفحہ 50 پر جو 1983 میں لندن سے Zed Books نے شائع کی۔

۲۔ لیگ آف نیشنز کے عہد نامہ کی دفعہ ۲۲

۳۔ دیکھو Gelvin کی کتاب کا صفحہ 86

۴۔ Benjamin Shawadran کی کتاب *The Middle East, . and the Great Oil Powers* کے 224 تا 265 پر، جو نیویارک سے Frederick A. Praeger نے 1955 میں شائع کی۔

باب : ۱۶

۱۔ ویب سائٹ *http://countrystudies.us/algaia/48.html:* دیکھیں
یہ شماریات لائبریری آف کانگریس کنٹری اسٹڈیز / ایریا ہنڈ بک کی فیڈرل ریسرچ ڈویژن سے حاصل کی گئی ہیں جو امریکی فوج کے ڈپارٹمنٹ کی سرپرستی میں انجام دی گئی۔

۲۔ Frank Thackery اور John Findling کی کتاب *Events that changed the*

world in twenith century دیکھیں جو West Post اور London سے 1955 میں Green Wood Press سے شائع ہوئی۔ اس میں appendix D بھی دیکھیں جو "States Achieving Independence since 1945." کے موضوع پر ہے۔

۳۔ یہ قول دراصل ایک Playwright یہودی امریکی Israel Zangwill کا ہے۔ اس نے اصل میں 1901 واقعتاً جو لکھا تھا وہ یہ ہے ''فلسطین آبادی کے بغیر ایک ملک ہے اور یہودی ملک کے بغیر ایک آبادی ہیں۔ کسی نے ان الفاظ کو نعرہ کی طرح استعمال کیا یا نہیں، یہ اختلافی ہے۔

۴۔ Benny Morris کی کتاب *Righteous Victims: A History of the Zionist-Arab Conflict,1881-1999* کے صفحہ ۱۴ تا ۱۷، یہ کتاب ۱۹۹۱ میں نیو یارک سے Alfred A. Knopf نے شائع کی۔

۵۔ Theodore Herzl کی کتاب *The Jewish State:An Attempt at a Modern Solution to the Jewish Question* کے چھٹے ایڈیشن کے صفحہ 29 پر دیکھیں۔ یہ کتاب 1904 میں نیویارک سے The Maccabean Publishing Company نے شائع کی۔

۶۔ Nizar Sakhnini نے *al-Awda* کے لئے ویب سائٹ http:// *al-awda.org/winsts2.html.* پر لکھتے ہوئے Weizmann کی کتاب *Trial and Error* سے یہ قول نقل کیا ہے۔ صفحہ 93 تا 208 قابل مطالعہ ہیں۔ 1949 میں نیویارک سے *Harper and Brothers* نے شائع کی۔

۷۔ سید قطب کی کتاب Mileston es اپنی مکمل شکل میں آن لائن دستیاب ہے۔ *http:// ww, youngmuslimsonline.ca/online._library/books/milestones/ hold/index_2.asp.*

باب : ۱۷

۱۔ عرفات کی مختصر اور جامع تاریخ حیات کے لئے دیکھیں

http://nobelprize.org/nobel_prize/peace/laureate/1994/arafat-bio.html

۲۔ Davwid Cook کی کتاب *Understanding Jihad* کا صفحہ 103

۳۔ عرفانی کی *Revolutionary Islam in Iran* صفحات 98 تا 100 اور 121 و 131

۴۔ دباشی صفحہ 164 تا 166

۵۔ ثابت عبداللہ نے اسے *Dictatorship, Imperialism, Chaos: Iraq since 1989.* کے صفحہ 76 سے نقل کیا ہے۔ یہ کتاب 2006 میں نیویارک سے Zed Books نے شائع کی۔

Bibliography

Abdullah, Thabit. *Dictatorship, Imperialism, and Chaos: Iraq Since 1989*. New York: Zed Books, 2006.

Abiva, Huseyin and Noura Durkee. *A History of Muslim Civilization ftom Late Antiquity to the Fall of the Umayyads*. Skokie, IL: IQRA' International Educational Foundation, 2003.

Abu Khalil, As'ad. *Bin Laden, Islam, and America's New "War on Terrorism.* "New York: even Stories Press, 2002.

Abun-Nasr, Jamil M. *A History of the Maghrib in the Islamic Period*. Cambridge: Cambridge University Press, 1988.

Ahmad, Eqbal. *Confronting Empire: Interviews with David Barsamian*. Cambridge, Massachusetts: South End Press, 2000.

Ahmed, Akbar. *Islam Today: A Short Introduction to the Muslim World*. New York and London: I. B. Tauris, 1999.

Alger, Neil. *The Palestinians and the Disputed Territories*. San Diego: Greenhaven Press, 2004.

Ali, ibn Abi Talib. *Nahjul Balagha* [Peak of Eloquence]. Translated by Sayed Ali Reza. Elmhurst, New York: Tahrike Tarsile Qur'an Inc., 1996.

Ali, Maulana Muhammad. *The Early Caliphate*. Reprinted in Lahore, Pakistan: The Ahmadiyya Anjuman Isha'at Islam, 1983. Ali, Tariq. *The Clash of Fundamentalisms: Crusades, jihads and Modernity*. London:Verso, 2003.

Arberry, A. J., translator. *The Qur'an Interpreted*. New York: Macmillan, 1955. Armstrong, Karen. *Holy war: The Crusades and Their Impact on Today's World*. New York: Anchor Books, 2001.

____. Muhammad: *A Biography of the Prophet*. San Francisco: HarperCollins, 1992.

Aslan, Reza. *No god but God*. New York: Random House, 2006.

Catherwood, Christopher. *A Brief History of the Middle East: From Abraham to Arafat*. New York: Carroll and Graf, 2006. 367

Chittick, William. *The Inner journey: Views from the Islamic Tradition*. Sandpoint, Idaho: Morning Light Press, 2007.

Cook, David. *Understanding jihad*. Berkeley, California: University of California Press, 2005.

Croutier, Alev Lytle. *Harem: The World Behind the Veil* New York: Abbeville Press, 1989.

Dabashi, Hamid. *Iran: A People Interrupted*. New York: The New Press, 2007.

Diouf, Sylviane A. *Servants of Allah: Aftican Muslims Enslaved in the Americas*. New York: New York University Press, 1998.

Dunn, Ross. *The Adventures of Ibn Battuta*. Berkeley and Los Angeles: University of California Press, 1989.

Farsoun, Samih and Naseer Aruri. *Palestine and the Palestinians: A Social and Political History*. Boulder, Colorado: Westview Press, 2006.

Finkel, Caroline. *Osman's Dream: The History of the Ottoman Empire*. New York: Basic Books, 2006.

Fischel, Walter J. *Ibn Khaldun in Egypt*. Berkeley, California: University of California Press, 1967.

Fisher, William Bayne, et a! editors. *The Cambridge History of Iran*. Cambridge: Cambridge University Press, 1993.

Frank, Irene and David Brownstone. *To the Ends of the Earth*. New York: Facts on File, 1984.

Fromkin, David. *A Peace to End All Peace*. New York: Owl Books, 2001. First published 1989 by Henry Holt.

Gelvin, James L. *The Modern Middle East: A History*. New York: Oxford University Press, 2005.

Gerner, Deborah J. and Jillian Schwedler. *Understanding the Contemporary Middle* East. Boulder, Colorado: Lynne Rienner Publishers, 2004.

Gettleman, Marvin and Stuart Schaar, editors. *The Middle East and Islamic World* Reader. New York: Grove Press, 2003.

Goitein, S. D. *jews and Arabs: A Concise History ofTheir Social and Cultural Relations.* Mineola, New York: Dover Publication, 2005.

Gordon, MatthewS. *The Rise of Islam*. Westport, Connecticut: Greenwood Press, 2005.

Hansen, Waldemar. *The Peacock Throne: The Drama of Moghul India*. New York: Holt, Rinehart and Winston, 1970.

Heikal, Mohammed. *Iran: the Untold Story*. New York: Pantheon, 1982.

Hiro, Dilip. *The Longest War: The Iran-Iraq Military Conflict*. New York: Routledge, 1991.

__ .War *Without End: The Rise of Islamist Terrorism and Global Response*. Revised edition. London, England: Routledge, 2002.

Hodgson, Marshall. *Rethinking World History*. Cambridge: Cambridge University Press, 1993.

Hourani, Albert. *A History of the Arab Peoples*. Cambridge, Massachusetts: Harvard University Press, 1991.

Howarth, Stephen. *The Knights Templar*. New York: Barnes and Noble, 1982.

Ibn Khaldun. T*he Muqaddimah: An Introduction to History*. Translated by Franz Rosenthal. Edited by N.J. Dawood. Princeton, New Jersey: Princeton University Press, 1969.

Imber, Colin. *The Ottoman Empire*. New York: Palgrave-Macmillan, 2002.

Irfani, Suroosh. *Revolutionary Islam in Iran*; *Popular Liberation or Religious Dictatorship.* London: Zed Books, 1983.

Kamrava, Mehran. *The Modern Middle East: A Political History Since the First World* War. Berkeley and Los Angeles: University of California Press, 2005.

Kennedy, Hugh. *The Great Arab Conquests: How the Spread of Islam Changed the World we Live In*. New York: Da Capo Press, 2007.

— . *When Baghdad Ruled the Muslim World: The Rise and Fall of Islam's Greatest Dynasty.* New York: Da Capo Press, 2005.

Kinross, Lord. *The Ottoman Centuries: The Rise and Fall of the Turkish Empire*. New York: William Morrow, 1977.

Laiou, Angeliki E. and Roy Parviz Mottahedeh, editors. *The Crusades from the Perspective of Byzantium and the Muslim World*. Washington, D.C.: Dumbarton Oaks, 2001.

Lewis, Archibald Ross, editor. *The Islamic World and the "West, AD 622-1492*. New York: John Wiley & Sons, 1970.

Lewis, Bernard, editor and translator. *Islam: From the Prophet Muhammad to the Capture of Constantinople*. New York and Oxford: Oxford University Press, 1987.

Lewis, Bernard. *The Middle East: A Brief History of the Last 2,000 Years*. New York: Simon & Schuster, 1995.

__ . What Went Wrong? Western Impact and Middle Eastern Response. New York: Oxford University Press, 2002.

Lings, Martin. *Mohammed: His Life Based on the Earliest Sources*. Rochester, Vermont: Inner Traditions International, 1987.

Maalouf, Amin. *The Crusades through Arab Eyes*. New York: Schocken Books, 1984.

Mattoudi, Abdul Hakim. *The Hanbali School of Law and Ibn Taymiyah*. London and New York: Routledge, 2006.

Mazzini, Joseph. *On the Duties of Man*. Reprinted in *Main Currents in Western Thought: Readings in "Western European Intellectual History ftom the Middle Ages to the Present*. Edited by Franklin LeVan Baumer. New Haven, Connecticut: Yale University Press, 1978.

Morgan, David. *The Mongols*. Malden, Massachusetts: Blackwell Publishing, 2007.

...alli, Ahmad S. *Moderate and Radical Islamic Fundamentalism: The Quest for Modernity,* ...*l the Islamic State*. Gainesville: University Press of Florida, 1999.

...*ly Caliphate*. London: Smith, Elder & Co. 1883.

...*The Causes and Effects of Political Violence,* ...cFarland & Co., 1997.

... Beacon Press, 1966.

...*e Siyasatnama or Siyar* ... ondon: Routledge & Paul,

...*the Heart* ...nsariyan

...9 by

کتاب کے بارے میں

اسلام اور مغربی تہذیب کی تاریخ کا ایک پر مغز، بصیرت افروز اور چشم کشا تجزیہ جو 9/11 کے واقعات کو زیر بحث لاتے ہوئے اسلامی تہذیب کی تاریخ پیش کرتا ہے جسے اچانک بعض اجنبی تصورات نے آگھیرا ہے اور اب وہ اپنی سمت درست کرنے کی جستجو میں ہے۔ مصنف بتاتے ہیں کہ عالم اسلام اور اس کے افراد، رونما ہونے والے واقعات سے کس طرح متاثر ہوئے اور ان واقعات کا بیان آج کے سیاسی مباحثوں اور تنازعات کی تفہیم میں کس طرح معاون ہے۔ اس کتاب کا ہر صفحہ قاری کی معلومات اور فہم میں اضافہ کرتا ہے۔

مصنف:

تمیم انصاری سان فرانسسکو میں رہتے ہیں اور امریکہ سیکنڈری اسکولوں کے لیے تاریخی نصاب کی متعدد کتابوں کے لیے لکھتے رہے ہیں۔ مشہور کتاب West of Kabul, East of New York کے شریک مصنف کے علاوہ مضامین اور تبصروں کے لیے مشہور ہیں۔

مترجم:

محمد ذکی کرمانی مسلم اکیڈمی فاردی ایڈوانسمینٹ آف سائنس کے سربراہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اعزازی طور پر سینئر سائنس فیلو ہیں۔ سائنس اور اسلام کی جدید بحث میں ایک معروف نام ہے۔

(ناشر)

HIDAYAT
Publishers & Distributors
F-155, Flat No. 204, Hidayat Apartment,
Shaheen Bagh, Jamia Nagar,
Okhla, New Delhi - 110025

₹ 490/-

ISBN 386460158-4
9789386460158